مجموعۂ القاسم

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il- Islamia, Supaul Bihar (INDIA)

جلد ششم ۶ تیری عظمتوں کو سلام

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ سپول بہار کا علمی، دینی، دعوتی فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

کی

تحقیقی، تاریخی اور دستاویزی پیش کش

مجموعہ القاسم

﴿تیری عظمتوں کو سلام - ٦﴾

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبر دار امین ملت

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

ناشـــر

جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : مجموعہ القاسم (تیری عظمتوں کو سلام-۶)

ترتیب : ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم : ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

صفحات : ۱۰۱۵

اشاعت : ۲۰۱۸ء

تعداد : ۲۵۰۰

ناشر : جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار، الہند

﴿ملنے کے پتے﴾

- امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave, Part-I
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11-26981876, 26982907, **Mob.:** +91-9811125434
9899766786, 9931906068, 9931515312, 9708056420
- حرا انٹرنیشنل اکیڈمی، فاربس گنج، ارریہ بہار، الہند
- خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا، ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور بہار، الہند۔ موبائل: 9891763977

انتساب

استاذ الکل مولانا مملوک علی النانوتوی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مجاہد فی سبیل مولانا محمد مظہر النانوتوی بانی مظاہر علوم سہارنپور، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الحدیث اوّل مولانا محمد یعقوب نانوتوی، امیر لشکر میدان شاملی مولانا محمد منیر نانوتوی، کتب فقہ اسلامی کے مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی اور مصلح قوم سر سید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام منسوب کرتا ہوں۔ جن کے جلائے ہوئے چراغ کی لَو سے آج پوری دنیا ڈیڑھ صدی سے روشن ہے، اور جن کے اخلاص کا تاج محل، کتاب وسنت، فقہ اسلامی کی ترویج کے علاوہ اسلامی تحریک، ناموس تحفظ ختم نبوت، مدارس ومساجد اور انسانی خدمات کا وہ روشن باب جن کا شمار ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے تاریخ داں لکھے گا انشاء اللہ۔ یقیناً یہ کارہائے نمایاں ہمیشہ انجام پاتے رہیں گے اور آئندہ بھی مورخ اِن کارناموں کو سنہری حروف میں لکھتا رہے گا۔

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رونق بزم

نمبر شمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
	حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ-حیات وخدمات		۱۱
۱	صاحب قیادت وبصیرت فقیہ العصرؒ	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۱۳
۲	قاضی صاحبؒ ایک خاکہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۶
۳	اتحاد ملت کا عظیم داعی قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	مولانا اسرار الحق قاسمی	۳۶
۴	قطعہ تاریخ وفات	محمد واصف نفیس مظاہری	۴۱
۵	ایسا کہاں سے لائیں تجھ سا کہیں جسے	مولانا محمد رضوان القاسمی	۴۲
۶	مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں!	حقانی القاسمی	۴۶
۷	فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	مولانا حکیم محمد اسلام انصاری	۵۹
۸	قاضی صاحب کے عالمِ اسلام سے تعلقات	امین عثمانی	۶۲
۹	قطعہ	محمد واصف نفیس مظاہری	۶۶
۱۰	حضرت قاضی صاحبؒ ولادت سے وفات تک	زبیر احمد ندوی	۶۷
۱۱	آہ فقیہ زمانہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	محمد ارشد فاروقی	۷۷
۱۲	بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	مولانا کلیم اللہ	۸۴
۱۳	کارواں کا فقیہ اعظم چل بسا	مولانا سلطان احمد القاسمی	۸۸
۱۴	عالم اسلام منبع وعرفاں سے محروم	محمد ضیاء اللہ ضیاء رحمانی	۹۲
۱۵	فکری نقوش: عقل وفراست کا شاہکار	امین عثمانی	۹۴

نمبر شمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
۱۶	قاضی مجاہد الاسلام کا فقہی منہجِ فکر	غطریف شہباز ندوی	۱۰۰
۱۷	قاضی جیؒ کا سفر آخرت	نسیم اختر شاہ قیصر	۱۱۰
۱۸	ایک روشن چراغ بجھ گیا	شاہ قادری سید مصطفیٰ جیلانی	۱۱۵
۱۹	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور 37 سالہ رفاقت	مولانا سید نظام الدین	۱۱۹
۲۰	ایک یادگار سفر-نقوش وتاثرات	مولانا محمد اسلام قاسمی	۱۲۷
۲۱	میرے میر کارواں	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۱۳۳
۲۲	قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	مولانا محمد الیاس مظاہری	۱۳۶
۲۳	متنوع کمالات کے جامع تھے حضرت قاضی صاحبؒ	مفتی عبد اللہ مظاہری	۱۳۸
۲۴	ایک پیکر عزیمت وبطل جلیل کی رحلت	مولانا مشتاق احمد حامد الحسینی	۱۴۲
۲۵	ہند میں فقہ وقضا کا قافلہ سالار	مولانا نور عالم خلیل امینی	۱۴۴
۲۶	اب انہیں ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لے کر	رضوان احمد قاسمی	۱۶۵
۲۷	ملت اسلامیہ پر رب کائنات کا فضل مبیں	مولانا بدر الحسن قاسمی	۱۷۰
۲۸	ملت اسلامیہ کے دھڑکتے دلوں کا ترجمان	عبد الوہاب خلجی	۱۷۸
۲۹	قاضی صاحبؒ اور احیاء اسلام	عابد انور قاسمی	۱۸۵
۳۰	ویراں ہے مے کدہ خم وساغر اداس ہے	شاہد عادل قاسمی	۱۹۲
۳۱	آٹھ سو سال پرانا ایک نادر علمی تحفہ	مفتی محمد فہیم اختر ندوی	۲۰۱
۳۲	مجاہد ملت جاتا رہا	مولانا رضوان احمد ندوی	۲۱۳
۳۳	فقیہ ملت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	محمد وقار الدین لطیفی	۲۱۹
۳۴	مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ایک فرد فرید تھے	مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی...	۲۲۲
۳۵	نتیجہ فکر (نظم)	محمد صبغت اللہ القاسمی	۲۲۶
۳۶	حضرت قاضی مجاہدؒ وقت کا ابن ہمام (نظم)	احمد میرٹھی قاسمی	۲۲۹
۳۷	بوحنیفہ تیمیہؒ کا ترجمان جاتا رہا (نظم)	محمد واصف نفیس مظاہری	۲۳۲

۳۸	شخصی تعارف		۲۳۳
۳۹	مسلم پرسنل لابورڈ کے قیام کی تاریخ اور کارکردگی...		۲۳۶
۴۰	عائلی قوانین کا مجموعہ: تعارف اور پس منظر	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۲۴۵
۴۱	قاضی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر تاثرات (نظم)	ظفر جنکپوری قاسمی	۲۵۱
۴۲	مسلم پرسنل لاء بورڈ تاریخ کے آئینے میں		۲۵۳
۴۳	تھا وہ اپنی ذات میں یک انجمن	محمد واصف نفیس مظاہری	۲۵۶
	حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمہ اللہ- حیات وخدمات		۲۵۷
۴۴	کامیاب مربی، مشہور فقیہ اور عظیم مصنف	مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی	۲۵۹
۴۵	چراغ بادِ صبا نے بجھائے ہیں کیا کیا	نسیم اختر شاہ قیصر	۲۶۸
۴۶	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کا اظہارِ تعزیت		۲۷۴
۴۷	جہدِ مسلسل سے عبارت رہی زندگی	فضیل احمد ناصری القاسمی	۲۷۵
۴۸	یادیں جواں کی آتی ہیں	ڈاکٹر شمیم اختر قاسمی	۲۹۱
۴۹	وہ صاحب جلال نہ جانے کدھر گئے	ادارہ	۳۰۴
۵۰	وہ فقہ وفتاویٰ علم نبی کا نیر تاباں ڈوب گیا (نظم)	مولانا احمد سجاد قاسمی	۳۰۸
۵۱	نیک دل عالم، سہل نگار اہل قلم اور بہت اچھے انسان	مولانا نور عالم خلیل امینی	۳۱۱
۵۲	یہ رتبۂ بلند ملا جس کو...	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی	۳۲۷
	حضرت مولانا سید نظام الدین رحمہ اللہ- حیات وخدمات		۳۳۳
۵۳	سوانحی خاکہ	محمد عارف اقبال	۳۳۵
۵۴	ایک چراغ اور بجھا	مولانا عبدالمتین منیری	۳۳۷
۵۵	مولانا سید نظام الدینؒ- حیات وخدمات	محمد عارف اقبال	۳۴۲
۵۶	لانا پڑا تمہیں کو تمہاری مثال میں	خورشید عالم داؤد قاسمی	۳۵۰
۵۷	...اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی	نور اللہ جاوید	۳۵۶

۵۸	بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	شمس تبریز قاسمی	۳۶۴
۵۹	بحیثیت جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لابورڈ کی خدمات کا جائزہ	محمد وقار الدین لطیفی ندوی	۳۶۸
۶۰	مولانا سید نظام الدین اور ان کا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ندوۃ العلماء سے تعلق	مولانا محمد رابع حسنی ندوی	۳۸۳
۶۱	ایک عظیم قائد اور رہبر شخصیت	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	۳۸۹
۶۲	مسلم اقلیت کے مسائل		۳۹۹
۶۳	مولانا سید رابع حسنی ندوی کا خط		۴۰۲
۶۴	مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کی تاریخ اور کارکردگی کے چند نمایاں پہلو		۴۰۴
۶۵	امّت کے سامنے درپیش مسائل		۴۳۳
	خراج عقیدت		
۶۶	مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڈکودرویؒ	مولانا عبدالرشید ندوی	۴۳۹
۶۷	آہ مولانا عبداللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی	۴۶۱
۶۸	مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ	محمد نوشاد عالم ندوی	۴۸۵
	پیام انسانیت		۴۹۱
۶۹	پیغامات مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری، مولانا حکیم محمد اسلام انصاریؒ، مولانا مفتی احمد دیولوی، مولانا محمد ابراہیم مظاہری، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، قاری اسماعیل بسم اللہ		۴۹۳
۷۰	دل بدست آور کہ حج اکبر است!	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	۵۰۷
۷۱	اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۵۱۰
۷۲	نسل انسانی کی تربیت اور اسلام	مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ	۵۲۶

۷۳	انسانی تمدن کا خلاصہ اسلام کا اصول امن وسلامتی	مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی	۵۳۳
۷۴	انسانیت کے زوال کا سبب	مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۵۳۸
۷۵	اسلام کے مضبوط عقیدے پر ہی ترقی کی راہ ہموار...	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۵۴۴
۷۶	قومیت وصوبائیت اور رنگ وزبان، کاش! ہوتے جو...	مولانا حکیم محمد اختر	۵۵۰
۷۷	دعوتِ ایمان اور پیامِ انسانیت	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۵۶۶
۷۸	لوگوں کے نام انسانیت کا پیغام	علامہ سید سلیمان ندویؒ	۵۷۰
۷۹	اصل پیامِ انسانیت	مولانا عبداللہ عباس ندویؒ	۵۷۲
۸۰	محبت ومساوات کا پیغام عظیم	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب	۵۷۴
۸۱	اسلام میں مزدور کے حقوق وفرائض	مولانا ندیم الواجدی	۵۸۰
۸۲	انسانیت کا احترام انسان کا بنیادی حق	ندیم اشرف	۵۹۰
۸۳	رپورٹ پیام انسانیت کنونشن	حسان جامی قاسمی	۵۹۹
۸۴	سفرنامہ: ڈاکٹر عزیز برنی کی سیماچل سے ذہنی وابستگی	مولانا عبدالقادر شمس قاسمی	۶۸۰
	رمضان کریم		۶۱۷
۸۵	رمضان المبارک اور مدارس اسلامیہ	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۶۱۹
۸۶	رمضان توبہ واستغفار کا موسم	ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی	۶۴۸
۸۷	رمضان مکمل انسانیت نوازی کے اظہار کا مہینہ	ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی	۶۶۳
۸۸	رمضان کریم کی خیر وبرکت	مترجم: مفتی نادر القاسمی	۶۷۲
۸۹	رمضان کریم میں دعاؤں کا اہتمام	ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی	۶۸۷
۹۰	۲۰؍رکعات تراویح: ایک جائزہ	مولانا محمد شفیع قاسمی بھٹکلی	۷۰۴
۹۱	رمضان المبارک میں خواتین کے معمولات	مترجم: مفتی احمد نادر القاسمی	۷۰۸
۹۲	روزہ کے اسرار اور باطنی شرائط	حجۃ الاسلام امام غزالی	۷۲۰
۹۳	اے مومنو! یہ آمدِ ماہِ صیام ہے (نظم)	سرور نگینوی	۷۲۸

مجموعہ القاسم: جلد ششم　　تیری عظمتوں کو سلام

۹۴	فریضہ رمضان اور چھوٹے بچے	ادارہ	۷۲۹
۹۵	روزے سے متعلق احکام ومسائل	ادارہ	۷۳۳
۹۶	شہ پارے		۷۳۶
۹۷	زکوٰۃ اور اس کا مصرف	ادارہ	۷۳۷
۹۸	رمضان کے روزے فرض کرنے کا مقصد	محمد ارشد عالم	۷۴۷
۹۹	اسلام: موبائل فون اور رنگ ٹونز	عبدالجلیل منشی	۷۴۹
	برما اور روہنگیا مسلمان		۷۵۵
۱۰۰	سفرنامہ برما	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۷۵۷
۱۰۱	قاری محمد طیبؒ کے تاریخی سفر کے دلچسپ واقعات	مولانا محمد سالم قاسمی	۷۵۹
۱۰۲	گلہائے تہنیت	محمود داؤد یوسف	۷۷۶
۱۰۳	اعزازیہ		۷۷۸
۱۰۴	مجلس اصلاح نسواں کا ایک دینی اور تاریخی اجتماع		۸۲۲
۱۰۵	روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام: برمی حکومت کے دلخراش مظالم	مولانا محمد صدیق ارکانی	۸۲۸
	متفرقات		۹۳۳
۱۰۶	فساد معاشرہ کے اسباب	مولانا انور جمال قاسمی مظفر پوری	۹۳۵
۱۰۷	786 کا استعمال اور اس کی حقیقت	سلمان عبدالصمد	۹۴۱
۱۰۸	تبلیغی جماعت کا نام القاعدہ سے جوڑنا منظم سازش...	ڈاکٹر شہاب الدین قاقب قاسمی	۹۴۴
۱۰۹	بہشتی زیور اردو میں نسائی ادب کی اولین کتاب	عظیم اختر	۹۴۹
۱۱۰	مغرب کا نیا ایجنڈا: مذاکرات بین المذاہب	مولانا عتیق الرحمٰن	۹۵۴
۱۱۱	شخصیت کی تعمیر میں مسجد کا کردار	حکیم محمد عمر فاروق شیخ	۹۶۲
۱۱۲	تیرے آستاں سے اونچا نہ میرا غبار ہوگا	مولانا محمد یوسف متالا	۹۶۷
۱۱۳	شعلہ بار صحراء میں جنت کی آس ہے ماں	سہیل اختر قاسمی	۹۷۵

۱۱۴	نیکی ضائع نہیں ہوتی	مولانا محمد یوسف انور	۹۷۹
۱۱۵	نیت جس پر تمام اعمال کا دارومدار ہے	ڈاکٹر عمر حیات عاصم سیال	۹۸۲
۱۱۶	حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کی تحریکِ اصلاح	حضرت مولانا اسیرادرویؒ	۹۸۶
۱۱۷	اخلاق وعادات، اوصاف وکمالات	مولانا اسیرادروی	۱۰۰۲
۱۱۸	اعلیٰ اخلاق کا نام اسلام ہے	مولانا ابونصر فاروق	۱۰۱۳

☆☆

فقیہ العصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ

حیات و خدمات

صاحب قیادت وبصیرت فقیہ العصرؒ

● ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

معارف قاسم کا مفکر ملت قاضی مجاہدالاسلام نمبر حاضر خدمت ہے۔ یہ شمارہ ایک ایسی شخصیت کے نام منسوب ہے جن کے سینے میں ہر وقت ملت اسلامیہ کے لئے دھڑکنے والا دل تھا، جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے رات کی نیند، دن کا چین وسکون وقف کر دیا تھا۔ مجھے اس شمارہ کو اسی عبقری شخصیت کے نام موسوم کرتے ہوئے فخر وانبساط کا احساس ہورہا ہے۔ یہ نمبر معیار پر کتنا کھرا اترے گا اس کا فیصلہ تو قارئین حضرات کریں گے اور ہمیں قارئین کا نقد وتبصرہ قبول ہوگا۔ اس خصوصی شمارہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شخصی نقوش، فکری نقوش، یادیں، فقہی تناظر میں خدمات، خراج عقیدت ان عنوانات کے تحت قارئین کرام حضرت مفکر ملت، قاضی شریعت، قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی گوناگوں شخصیت، علمی وفقہی مقام، فقہی خدمات، قاضی صاحب سے وابستہ یادیں، ہندوستانی مسلمانوں کو متحد کرنے کی ان کی کوششیں، مسلمانوں کے مسائل سے قاضی صاحب کی آگاہ وغیرہ کے بارے میں پڑھ سکیں گے۔ اس موقع پر ہمیں اپنی بے بضاعتی کا مکمل اعتراف کرتے ہوئے کہنا پڑ رہا ہے جتنا ہم نے سوچا تھا وہ نہیں کر سکے۔

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، خدمات اور ان کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ بڑے بڑے علماء اور بیرون ممالک کے علماء وفضلا آپ سے فیض یاب ہونے کو باعث افتخار سمجھتے تھے، آپ نے جہاں جنوبی افریقہ میں مسلم پرسنل کی تدوین میں نمایاں خدمات

انجام دی وہیں آپ ماریشش میں مسلم پرسنل لا کی تدوین میں رہنمائی کی اور حکومت کی جانب سے آپ کو اس کے لئے خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ آپ نے نہ صرف مسلمانوں کی قومی وملی مسائل میں قیادت وسیادت کی، بلکہ آپ ایسے ملک میں جہاں اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہے، جہاں سود زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہے اور مسلمانوں کا اس سے بچنا تقریباً ممکن نہیں یہاں پر بھی آپ نے رہنمائی کی کہ مسلمان کس طرح غیر اسلامی معاشرہ میں اس لعنت سے بہت حد تک گریز کرتے ہوئے اپنی تجارتی واقتصادی سرگرمیوں کو جاری رکھیں اور اپنے آپ کو ترقی کی راہ پر پیچھے نہ پائیں۔ اس کے لئے آپ نے ”جدید تجارتی شکلوں“ کے نظام، غیر سودی نظام معیشت، انٹرنیٹ، فری بینکنگ اور جدید نظام سرمایہ کاری پر نئے انداز سے اہل علم کو سوچنے کی دعوت دی، سیمنار اور ورکشاپ منعقد کئے اور گرانقدر علمی مواد یکجا کر کے امت کے سامنے پیش کیا، اصول اور ضابطے مقرر کئے اور اس پر جدید علوم کے ماہرین اور معاشیات کے خبراء سے میٹنگیں کیں اور کئی کمیٹیاں بنائیں اور مکمل اور واضح خیال کا اظہار کیا۔

حضرت قاضی صاحب بڑے درجہ کے عالم دین، مدبر، مفکر، قائد اور ہمہ جہت سوچ رکھنے والے انسان تھے۔ بیک وقت تمام مکتب فکر، مختلف الخیال، اپنے ناقدین ومخالفین کو اپنے اندر سمونے کی طاقت، ملت کے مسائل، مسلمانوں کے خلاف سازش سے آگاہی اور تدارک کی اقدامات کرنے، اپنے ہم عصر علماء کے زخم سہنے کے عادی تھے۔ ان کے اندر وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک صحیح مسلم رہنما میں ہونی چاہیے، لیکن افسوس کہ علماء کا ایک طبقہ جو قاضی صاحب سے کچھ سینئر، کچھ جونیئر اور کچھ ہم عصر تھے اور ہیں انہوں نے قاضی صاحب کی کبھی قدر نہیں کی، ہمیشہ ان کی وسیع المشربی کو ہدف تنقید بناتے رہے، اس کی بہت ساری وجوہات ہوسکتی ہیں، جن میں قاضی صاحب کا بلند وبالا علمی مقام بھی تھا، دلوں کو فتح کرنے کے ہنر سے واقفیت بھی وجہ ہوسکتی ہے بغض وعناد میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ناقدین

نے قاضی صاحب کو جہنمی تک کہہ دیا، حالانکہ کون جنتی ہے کون جہنمی اس کا علم خدا کو ہے، لیکن نعوذ باللہ ناقدین اپنے آپ کو خدا کا ہمسر سمجھ بیٹھے۔

قاضی القضاۃ حضرت موصوف علم، قیادت، بصیرت، ذہانت، دانشوری، قوت گویائی، اور تفقہ فی الدین میں برصغیر میں ایک بے نظیر عبقری انسان تھے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے قیام کے بعد حضرت قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے برصغیر میں برسوں سے ساکت وجامد اور خاموش علم وفقہ کے سمندر میں ہلچل سی پیدا کردی، فقہ اکیڈمی کے سیمناروں میں افتتاحی تقریر اور موضوع کے تعارف پر جب وہ شخص گفتگو شروع کرتا اور کتاب وسنت، اور قواعد اور اصول سے جب مسئلہ کی تصویر پیش کرنا شروع کرتا تو مجمع میں کیا چھوٹا اور کیا بڑا، کیا عرب اور کیا عجم ہر شخص علم ودانش موتیاں بٹورنے کے لئے اپنا دامن پھیلائے بالکل خاموشی سے ٹکٹکی باندھے حضرت قاضی صاحب کی طرف ہمہ تن گوش رہتا، ہندستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہم کے بعد قاضی صاحب کا علم وفقہ کے میدان میں سب سے بڑا علمی کمال یہ ہے کہ انھوں نے علماء کی بہت بڑی تعداد کو علم وتفقہ کی حقیقی روح اور منشاء تک پہنچنے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے کا سلیقہ اور ہنر سکھا دیا، اور صدیوں کے فقہی اور اجتہادی جمود کو توڑنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ آج اگر قاضی صاحب کے اساتذہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت علامہ عبدالحفیظ بلیاوی، علامہ فخر الحسن اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہی موجود ہوتے تو اپنے اس عبقری شاگرد کا استاذ ہونے پر فخر کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاضی صاحب کی وفات مسلمانان ہند کے لئے ایک بڑا خلا ہے جس کا پُر ہونا فی الحال ممکن نظر نہیں آرہا ہے، کیونکہ ایسی کشادہ دل کوئی شخصیت نظر نہیں آرہی ہے، جو تمام مکتب فکر کے افراد کو ساتھ لے کر چلیں۔ خدا ہمیں قاضی صاحب کا بدل عطا فرمائے آمین۔

☆☆

قاضی صاحبؒ ایک خاکہ

● مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

متوسط قد وقامت، جسم لحیم وشحیم، سانولا چہرہ اور اس پر معصومیت کا نکھار، داڑھی کے صرف چند بال پیشانی کسی قدر چھوٹی، آنکھوں سے بلا کی ذہانت آشکار، سر کے بال باوجود سن رسیدہ ہونے کے سیاہ اور کسی قدر گھنے، لباس فقیرانہ، رہن سہن درویشانہ، جسم بیماری میں گھلا ہوا اور دل ودماغ امت کے درد میں حق گوئی میں شمشیر آبدار اور دوستوں کے لئے حریر ودیباج کی طرح نرم وبردبار، گفتگو میں شبنم کی ٹھنڈک اور قندونبات کی مٹھاس اور تقریر وخطابت میں دلوں کو رلانے اور آنکھوں کو نم کرنے والا سوز وگداز، ہر مجلس میں میر مجلس اور ہر محفل میں زیب محفل، سیاست کی رزم ہو یا شعر وسخن کی بزم، علم وتحقیق کی خشک بحث ہو یا تذکیر وموعظت کا موضوع، علماء ذی وقار کی انجمن ہو یا دانشوران کج خیال کا جمگھٹا، ہر میکدہ میں اس طرح نظر آنے والے کہ گویا ساقی ہو نہ کہ میکش اور رہبر ہو نہ کہ راہی، امت پر کہیں کوئی آفت آئے اور سینہ اس کی کسک سے معمور، پتھر جو دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر پڑے چوٹ اس کی آپ کے سینہ پر محسوس، جوہر شناس اور صلاحیتوں کے قدرداں، تعصب، تنگ نظری اور مسلکی گروہ بندی سے ماوراء، رزم حق وباطل میں شمشیر اور حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم، ان شمائل وخصائل کو اپنے ذہن میں ترتیب دیں اور شخصیت، فکر ونظر اور کردار وعمل کی جو تصویر ذہن میں ابھرے اس پر لکھ دیں ''مجاہد الاسلام قاسمی''۔

ملت اسلامیہ ہند کے سب سے باوقار اور متفق علیہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا

بورڈ کے صدر عالی قدر، آل انڈیا ملی کونسل کے بانی اور ذمہ دار اعلیٰ اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی ومؤسس اور سکریٹری جنرل، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ میں ہندوستان کے واحد رکن، رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کے ممبر، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، جھارکھنڈ کے قاضی القضاۃ، الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ، بنگلور کی جانب سے کمیونٹی لیڈر شپ ایوارڈ پانے والے اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کی جانب سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے حامل، ''افمی'' یعنی امریکن فیڈریشن آف مسلمس کی طرف سے سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ یافتہ، ''میسی'' یعنی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی جانب سے بہترین اسلامی شخصیت ایوارڈ حاصل کرنے والے، احکام شریعت اسلامی کی تطبیق کے لئے قائم حکومت کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کی طرف سے فقہی ایوارڈ یافتہ، سعودی عرب، کویت، مصر، عرب امارات، جنوبی افریقہ، امریکہ، برطانیہ، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، بخارا، سمرقند وبرونائی اور مختلف بیرونی ممالک کے دعوتی وعلمی اسفار سے سرفراز، قاضی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے اسے فی الوقت پُر کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔

پیدائش عیسوی سے ۱۹۳۶ء، وطن ہندوستان کی معروف مردم خیز اور علم وعمل سے عطر بیز سرزمین بہار کے ضلع دربھنگہ قصبہ جالہ، جو کہا جاتا ہے کہ خلجیوی کے عہد سے ہی اسلام کی آمد سے سرخرو ہوا، مسلم دور حکومت میں بھی عہدہ قضاء اس خاندان کی شناخت رہا ہے اور اسی نسبت سے جس محلّہ میں آپ کا مکان ہے، وہ قاضی محلّہ کہلاتا ہے، والد ماجد حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ شیخ الہند کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، بہار ہی میں مدتوں حدیث کی اعلیٰ کتابوں کا درس دیا، تدریس کے علاوہ تقریر ومناظرہ میں بھی اپنے عہد کے ممتاز لوگوں میں تھے۔ حضرت شیخ الہند کے بعد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے اصلاحی تعلق رہا، عرصہ تک امارت شرعیہ کے رکن رکین رہے، والد مرحوم کا رشتہ حضرت حاجی منور علیؒ صاحب خلیفہ اجل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر

مکیؒ بانی مدرسہ امدادیہ سے تھا اور حضرت حاجی صاحب سے قرابت بھی تھی۔ والدہ مولوی محمد جمیل صاحب ساکن محلّہ جالہ کی صاحبزادی تھیں، ان کی والدہ بی بی نجوم فاطمہ سید عبدالفتاح صاحب نستہ کی صاحبزادی تھیں، جو اپنے وقت کے معروف صاحب معرفت بزرگوں میں سے تھے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی عربی کی متوسطات کی تعلیم مدرسہ محمود العلوم دملہ، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں آپ کو استاذ الاساتذہ علامہ بلیاویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادیؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور دیگر علماء اور نادرہ روزگار اساتذہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا اور مراسلت، نیز مضامین پر اصلاح کے ذریعہ گاہے گاہے سید القلم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سے بھی آپ نے استفادہ فرمایا۔

دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایماء پر جامعہ رحمانی مونگیر تشریف لے گئے۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۲ء جامعہ رحمانی مونگیر میں عربی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر منتہی کتابوں تک کا درس دیا، پھر چند سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۶۹ء میں امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی خواہش پر دوبارہ ایک سال تدریس کی خدمت انجام دی اور ابوداؤد وغیرہ کے اسباق آپ کے ذمہ رہے، اہم بات یہ ہے، جس توجہ سے آپ نے اونچی کتابیں پڑھائیں اسی انہماک والتفات کے ساتھ ابتدائی کتابوں کے درس کا بھی اہتمام کیا، اسی لئے جن شاگردوں نے آپ سے ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں ان پر بھی آپ کی تعلیم وتربیت کے نقوش اتنے گہرے ہیں جتنی اونچی کتابیں پڑھنے والوں پر۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی جوہر شناس نگاہ نے آپ کی خداداد صلاحیت کو بھانپ کر ایک ایسے وقت میں امارت شرعیہ کے شعبہ قضاء اور اس کا انتظام وانصرام آپ کے حوالہ کیا جب امارت شرعیہ کا سارا نظام عملاً مفلوج ہو گیا تھا اور عرصہ سے دارالقضاء کسی

ایسے صاحب نظر اور فقہ اسلامی کی روح کے شناسا قاضی سے خالی تھا جو اس جلیل القدر عہدہ کی اہمیت کو پورا کرتا ہے، چنانچہ ۱۹۶۱ء مطابق شوال ۱۳۸۱ھ سے اب تک مسلسل آپ بہار واڑیسہ کے قاضی القضاۃ رہے اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے نائب امیر شریعت کے ذمہ دارانہ عہدہ پر بھی فائز رہے۔

آپ کی ملی وقومی خدمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، امارت شرعیہ میں آپ اس وقت آئے جب کام کرنے والوں کو بیٹھنے کے لئے باقاعدہ بوریا بھی میسر نہیں تھا اور امارت کا دائرہ اثر پٹنہ اور صوبہ کے کچھ مخصوص علاقوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، بیت المال خالی تھا، دارالقضاء کا کام پھلواری شریف تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور پورے صوبہ میں صرف ایک دو مقامات پر دارالقضاء قائم تھے۔ آپ کی کوششوں سے موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم تشریف لائے اور انتظام وانصرام کا شعبہ ان سے متعلق ہوا، قضاء کے نظام کی توسیع اور زیادہ سے زیادہ مقامات پر دارالقضاء قائم کئے گئے، آپ نے شبانہ روز جدوجہد کی، اس اہم اور نازک کام کے لئے افراد کار تیار کئے، امارت شرعیہ کا وفد لے کر گاؤں گاؤں پہنچے، قریہ قریہ کو امارت کی تنظیم سے منسلک کیا، مکاتب قائم کئے، لوگوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا اور مدتوں کی مقدمہ بازیاں چند ساعتوں کی کوشش سے ختم ہوئیں، دورہ کے ذریعہ شہر شہر گاؤں گاؤں پہنچے، آپ کی اس جدوجہد کا یہ فائدہ ہوا کہ ہر عام وخاص کی امارت سے وابستگی بڑھی اور امارت کے تمام شعبوں کو استحکام حاصل ہوا، دارالقضاء میں مقدمات کی آمد بڑھی، دارالقضاء میں سوالات کی کثرت ہوئی، بیت المال کو استحکام حاصل ہوا، مسلمانوں میں آپ اپنی تعلیم کے نظم کا مزاج پیدا ہوا اور بہار واڑیسہ میں امارت کی آواز مسلمانوں کے مسائل کے لئے ایک ایسی نمائندہ آواز سمجھی گئی کہ حکومتیں بھی اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوئیں اور ارباب اقتدار کو بھی ان بوریہ نشینوں کی بارگاہ میں حاضری کے سوا چارہ نہ رہا۔

پھر بہار کے خون آشام ہندو مسلم فسادات میں امارت شرعیہ نے مظلوم وستم رسیدہ مسلمانوں کے مالی واخلاقی، سیاسی اور قانونی مدد میں اتنا جرأت مندانہ کردار ادا کیا کہ ہندوستان میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، بھاگلپور کے انسانیت سوز فساد، بلکہ پولیس ایکشن میں امارت اور اس کے ذمہ داروں نے جس طرح اپنی راحتوں کو تج کر دن رات کام کیا، وہ ملت کے لئے خدمت کا ایک نمونہ ہے، ان تمام کاموں میں حضرت قاضی صاحب کی منصوبہ بندی اور اقدامی صلاحیت، خوش تدبیری اور مسلسل انتھک محنتوں اور عملی کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔

”خدمت خلق“ گو امارت شرعیہ کے مقاصد واہداف میں شامل ہے، لیکن عام طور پر یہ کام مقامی ریلیف تک محدود تھا، آپ ہی کی تحریک پر مولانا سجاد ہاسپٹل کا پروگرام بنا، آپ نے اس کی منصوبہ بندی کی، اس کے لئے مناسب وسائل کا نظم کیا اور اپنے رفقاء کے تعاون سے اس کام کو عملی جامہ پہنایا، اس طرح امارت شرعیہ سے انسانی بنیادوں پر خدمت خلق کے کام کی ایک نئی روایت قائم ہوئی، اس وقت الحمد للہ بہار جیسی پسماندہ ریاست میں یہ اسپتال غریب لوگوں کے لئے عصری اور طبی مدد کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے۔

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کا عہد امارت گو مختصر رہا، لیکن خاموشی کے ساتھ ٹھوس اور تعمیری کام کے اعتبار سے یہ امارت کا یادگار عہد ہے، آپ ہی کے عہد میں امارت نے مسلمان نوجوانوں کے لئے ٹیکنیکل تعلیم کی طرف توجہ کی جس کی ابتداء پھلواری شریف میں مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے ہوئی، جس نے سیکڑوں بے روزگار نوجوانوں کے لئے روزگار فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اب دربھنگہ، ساٹھی، کٹیہار اور اڑیسہ میں بھی امارت نے اسی نوعیت کے انسٹی ٹیوٹ قائم کئے ہیں اور کئی جگہ پر اس کی کوشش ہو رہی ہے۔ ٹیکنیکل تعلیم کے اس پورے نظام کے اصل خالق اور منصوبہ ساز اور پھر اس کے لئے مطلوبہ مالی اور افراد وسائل کی فراہمی اصل میں حضرت

قاضی صاحب ہی کی رہین منت ہے اور شاید ہی کوئی حقیقت پسند اور واقف احوال اس سے انکار کر سکے، فسادات کی ہلاکت خیزیوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے موقع پر امارت شرعیہ نے جو بیش بہا خدمات انجام دہی ہیں، اس کے علاوہ شمالی بہار میں کالازار کی بیماری سے نمٹنے کے لئے آپ کی تحریک اور کوششوں سے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام جو میڈیکل کیمپ قائم ہوئے خدمت خلق کے نقطۂ نظر سے وہ بھی ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، جس سے بے شمار غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

نظام قضاء کی توسیع امیر شریعت رابع کا خاص ہدف تھا اور واقعہ ہے کہ اس عہد میں صوبوں اور بیرون صوبہ قضاء کے نظام کو جو وسعت حاصل ہوئی وہ امارت کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اس تحریک میں جہاں امیر شریعت رابع کی توجہات اور موجودہ امیر شریعت سادس کی انتظامی صلاحیتوں کا حصہ ہے، وہیں حضرت قاضی صاحب اس تحریک کے روح رواں، اس کا دماغ اور اس کی زبان بن کر رہے، امیر شریعت رابع نے امیر منتخب ہونے کے بعد خانقاہ رحمانی مونگیر میں تربیت قضاء کا کیمپ قائم کیا، جس میں پوری ریاست سے مقتدر علماء اور ارباب افتاء نے شرکت کی، تربیت قضاء کا دوسرا کیمپ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں منعقد ہوا۔ اس میں صوبہ بہار کے علاوہ مختلف صوبوں اور مکاتب فکر کے اہل علم نے شرکت کی، اس تربیتی کیمپ کی منصوبہ بندی اور علمی اعتبار سے مسائل قضاء کی تفہیم اور کار قضاء کی تربیت کا پورا کام آپ ہی کے ذریعہ انجام پایا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تربیتی کیمپ نے گہرے اثرات ڈالے اور صوبہ بہار کے علاوہ مختلف شہروں میں دارالقضاء کا نظام عملی طور پر قائم ہو گیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے وقتی پروگرام کے ذریعہ مستقل طور پر افراد سازی کا کام انجام نہیں پا سکتا تھا، اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے قضاء وافتاء کی تربیت کے لئے ایک مستقل ادارہ کی تشکیل **”المعهد العالی لتدریب القضاء والافتاء“** کے نام

سے امارت ہی کے زیر انتظام فرائی جو نہایت ہی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور اس وقت تربیت قضاء وافتاء کے لئے پورے ملک کا مرجع بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے تحفظ کی قانونی مدد، دعوت واصلاح، تحفظ شریعت اور کتنی ہی قومی اور اصلاحی خدمت ہے جسے آپ نے امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے انجام دیا ہے۔

قانون شریعت کا جو فہم اور عقلی اور منطقی طور پر اسلام کے قانون معاشرت کو سمجھانے کا جو خدا داد ملکہ آپ کو حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ کے معاصرین میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک میں آپ شروع سے سرگرم رول ادا کرتے رہے ہیں، متبنیٰ بل کا قضیہ ۱۹۷۲ء میں کھڑا ہوا اور امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے موضوع پر دارالعلوم میں قائدین امت اور علماء واہل دانش کا پہلا اجلاس طلب کیا تو اس کی تیاری کے لئے بزرگوں کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور آپ نے تقریباً ایک ماہ دارالعلوم میں قیام کر کے مسلم پرسنل لا کے تمام پہلوؤں پر بحث کا خاکہ مرتب کیا اور ان نکات کو متعین کیا جو مسلم پرسنل لا کے مخالفین کا خاص ہدف ہیں، یہیں سے مسلم پرسنل لا کنونشن ممبئی کی تیاری کا آغاز ہوا جس کی مجلس داعیان کے ایک رکن آپ بھی تھے۔

ممبئی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ پر جو عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، وہ امت کی اجتماعیت کی ایک ایسی مثال تھی کہ خلافت تحریک کے بعد اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس کنونشن کی تیاری اور اس کے لئے فضاء کی ہمواری میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں، پھر بورڈ کی تشکیل کے بعد شروع ہی سے آپ اس کے رکن تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رکین رہے۔ حضرت مولانا رحمانی بورڈ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور آپ نے ان کا دست وبازو بن کر کام کیا اور ہمیشہ اس تحریک کے سب سے مؤثر وکیل اور ترجمان رہے، شاہ بانو کیس کے نتیجہ میں جو تحریک اٹھی اس میں آپ نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ مولانا رحمانی

کے بعد عام رجحان یہی تھا کہ جنرل سکریٹری کے عہدہ کے لئے آپ کی شخصیت ہی سب سے موزوں ترین شخصیت ہے، بابری مسجد کی شہادت کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کے مجروح دلوں پر مرہم رکھنے اور ان کی پست ہوتی ہوئی ہمتوں کو اونچا اٹھانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔

بورڈ کے دوسرے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ کی سنگین اور مسلسل علالت کے باوجود امت اسلامیہ ہند کی نگاہ آپ پر مرکوز تھی اور اس طرح اتفاق رائے سے آپ بورڈ کے تیسرے صدر منتخب ہوئے، بورڈ کی صدارت کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد آپ نے بورڈ کے کردار کو فعال بنانے پر خصوصی توجہ دی ہے، اس کے مرکزی دفتر کو عصری سہولتوں سے آراستہ کیا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ سے متعلق فقہی وقانونی کتابوں پر مشتمل لائبریری بھی قائم کی گئی ہے۔

صدر بورڈ منتخب ہونے کے بعد اجلاس بنگلور میں آپ نے جو خطبۂ صدارت دیا، وہ بورڈ کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہے، اس میں آپ نے سنگھ پریوار کے نمائندوں کو خصوصاً اور عام برادران وطن کو عموماً کھلے اور بے غبار لفظوں میں اسلام کی آفاقی سچائی کو قبول کرنے اور خدا کی آواز پر لبیک کہنے کی دعوت دی، اردو اور انگریزی اخبارات، نیز الیکٹرانک میڈیا نے نہایت نمایاں طریقہ پر حق وراستی کی اس للکار کو پوری اہمیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا۔

ہندوستان میں مختلف جماعتیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں، ان میں بعض جماعتیں تو سیاسی ہیں، بدقسمتی سے ملی مفادات کے مقابلہ سیاسی اور گروہی مفادات کی فکر نے ان میں ایسے فاصلے پیدا کر دئے ہیں جیسے دریا کے دو کنارے، کہ دونوں کے ہاتھوں میں قوم وملت کی سربلندی کا جھنڈا ہے، لیکن ان میں وسیع تر مفادات کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے اور شانہ بشانہ ہو کر آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں، قومی اور ملی مسائل کی ترجمانی کرنے

والی کچھ غیر سیاسی مذہبی تنظیمیں بھی ہیں، لیکن یہ مخصوص مذہبی پس منظر اور نقطۂ نظر کی حامل ہیں، اس لئے وہ مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ کی نمائندگی کرتی ہیں، دوسرے حلقہ کے لوگوں کو ان سے تعلق نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تفسیق اور بعض اوقات تکفیر پر کمر بستہ رہتے ہیں، امت کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جس کو کسی تنظیم یا تحریک سے تعلق نہیں، یہ سیدھے سادھے مخلص اور گروہی تنگ نظریوں سے بلند عام مسلمان ہیں۔

آپ کی نمایاں تعمیری اور تنظیمی خدمات:

مسلم پرسنل لا بورڈ نے تحفظ شریعت کی مہم کی حد تک ان گروہوں کو جوڑا ہے، لیکن امت کے دوسرے سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور معاشی مسائل کو اس نے اپنی کوششوں کا ہدف نہیں بنایا ہے، تاکہ ان مسائل میں فکر ونظر کا اختلاف بورڈ کی وحدت کو متاثر نہ کرے، اسی پس منظر میں ۱۹۶۵ء میں مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی تھی، لیکن افسوس کہ مشاورت کی بعض دستوری خامیوں، تنظیموں کے جماعتی تحفظات اور بتدریج مخلص اور فعال قائدین سے محرومی، نیز بعض اہم جماعتوں کی اس وفاق سے علاحدگی کے سبب مجلس مشاورت ایک کاغذی تحریک بن کر رہ گئی اور قوم وملت کے مسائل کی ترجمانی میں عملاً اس کا کوئی کردار باقی نہیں رہا۔

اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے آل انڈیا ملی کونسل کی ۱۹۹۲ء میں تشکیل فرمائی، جس میں ملک گیر سطح پر مختلف صلاحیتوں کو جمع کیا گیا اور جامع پروگرام کے ساتھ امت کی ہمہ جہت ترقی کو ہدف بنایا گیا، وحدت کلمہ کی بنیاد پر امت کو جوڑنا، جہاں پہلے کوئی اچھا کام ہو رہا ہو اس کو تقویت پہنچانا، جہاں نہیں ہو رہا ہو وہاں براہ راست یا بالواسطہ کام کرنا اور ایک ہی طرح کی کوششیں مختلف سمتوں سے ہو رہی ہوں تو ان کو باہم مربوط کرنے کی کوشش کرنا کونسل کا بنیادی مقصد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملی کونسل کے پلیٹ فارم نے نفرت کے بجائے

وحدت، تصادم کے بجائے تعاون اور امت کی مختلف ضروریات کے لحاظ سے مختلف صلاحیتوں کو ابھارنے اور باصلاحیت نوجوانوں کی ایک تازہ دم ٹیم تیار کرنے کا کام کیا ہے، جس کے دور رس اثرات محسوس کئے جا رہے ہیں، ٹاڈا قانون کی تنسیخ، انتخابی سیاست میں مسلمانوں کا ووٹ متحد کرنے اور مردم شماری کے موقع پر مسلمانوں کو متوجہ کرنے، نیز دینی اور عصری تعلیم میں ان کو آگے بڑھانے اور کسی بھی سیاسی اور مذہبی مسئلہ پر حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا جو کام کونسل نے کیا ہے، وہ ہندوستان کی ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اسی سلسلہ کی ایک ملک گیر کوشش کاروان آزادی اور کاروان اتحاد کی صورت میں ہو چکی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ان تمام کوششوں کے پیچھے جو دل تڑپتا اور جو دماغ سوچتا رہا ہے اور جس کے سخن دل نواز نے سوئے ہوئے کو بیدار اور نہ چلنے والوں کو چلنے پر مجبور کیا ہے وہ آپ ہی کی شخصیت ہے اور یہ آپ ہی کی کوشش ہے جس نے مختلف مسلک ومشرب، مزاج ومذاق اور فکر وذہن کے لوگوں کو دوش بدوش کھڑا کر رکھا ہے، گو آپ کی علالت اور بہت سے علاقوں میں مقرر ذمہ داران کے تساہل کی وجہ سے کونسل کی سرگرمیوں میں اب وہ جوش وخروش نظر نہیں آتا جو ابتدائے قیام کے زمانہ میں تھا، لیکن کونسل کی اہمیت اور ضرورت آج بھی ہے، بہرحال ملی کونسل کے پلیٹ فارم سے جو کچھ کام ہوا ہے، وہ آپ کی ملی خدمات کا ایک زریں باب ہے۔

افراد سازی اور مردم گری آپ کا خاص مزاج رہا ہے، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ میں شروع ہی سے اس کو آپ نے خصوصی اہمیت دی ہے، چنانچہ انفرادی طور پر کتنے ہی قضاۃ ہیں جو آپ سے تربیت پا کر ملک کے مختلف علاقوں میں قضاء کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ماضی قریب میں آپ نے دو ایسے اداروں کی تشکیل کی ہے جس نے دینی مدارس کے فضلاء اور نوجوان علماء کی تربیت میں ایک انقلابی کردار ادا کیا ہے، ان میں ایک تو اسلامک فقہ

اکیڈمی کا قیام ہے جس میں اس وقت ملک بھر کے ذہین اور باصلاحیت اصحاب علم شریک ہیں، اکیڈمی کے ذریعہ دو درجن سے زیادہ نئے اور اہم مسائل پر سمینار ہو چکے ہیں اور ان سمیناروں نے کیسی کیسی صلاحیتوں کو ابھارا اور گمنام اصحاب کو متعارف کرایا ہے اور ایک نیا علمی جوش اور ولولہ عطا کیا ہے اس کی شہادت کے لئے اکیڈمی کے فقہی مجلّات کافی ہیں۔

دوسرے امارت شرعیہ کے تحت ''المعہد العالی لتدریب فی القضاء والافتاء'' کا قیام ہے جس کے تحت قضا اور افتاء کی تربیت کا ایک مستقل اور معیاری انتظام ہو گیا ہے اور اس وقت ملک کے کونہ کونہ اور دوسرے ملک سے اصحاب علم وفضل یہاں آکر کسب فیض کر رہے ہیں۔

یہ دونوں ادارے جو اصل میں آپ ہی کی فکر کا عکس جمیل ہیں، گو ان کی عمر زیادہ نہیں، لیکن کم مدت میں ان اداروں کے ذریعہ افراد سازی کا قابل قدر کام انجام پایا ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں ان کے بہت ہی دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

اس کے علاوہ دینی تعلیم کا فروغ اور اس کے معیار کو بہتر بنانے کی سعی وکوشش آپ کی زندگی کا خاص مشن رہا ہے بہار واڑیسہ میں درجنوں مدارس ہیں جو آپ کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں اور بعض قدیم اور بڑے مدارس تو وہ ہیں جو تمام بنیادی امور میں آپ ہی کے مشورہ سے قدم اٹھاتے ہیں، بہار کے وہ مدارس جو سرکار سے ملحق نہیں ہیں ان کے معیار تعلیم کو اونچا اٹھانے اور نصاب ونظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے زیر سرکردگی آزاد دینی مدارس بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا، اس وقت آپ جامعہ رحمانی میں مدرس تھے۔ آپ نے اس بورڈ کے قیام اور پھر اس کے انتظام وانصرام میں سرگرم رول ادا کیا تھا، مگر افسوس کہ مدارس کی باہمی آویزش کی وجہ سے وفاق زیادہ دنوں تک متحرک نہ رہ سکا۔ پھر آپ ہی کی تحریک پر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور جھارکھنڈ کے تقریباً ڈیڑھ سو مدارس کے نمائندے شریک ہوئے۔ پورے ملک سے مختلف مکتب فکر کے مدارس اور دینی تعلیم کے ماہرین اکٹھا ہوئے اور دینی مدارس کے نصاب ونظام کے سلسلے میں بڑی

مفید تجاویز منظور ہوئیں، نیز ''مدارس اسلامیہ کونسل'' کا قیام عمل میں آیا، آپ ہی اس اجلاس کے محرک بھی تھے اور مجلس استقبالیہ کے صدر اور کرتا دھرتا بھی، لیکن بدقسمتی سے یہ کونسل محض ایک کاغذی ادارہ بن کر رہ گئی اور عملی طور پر اس نے کوئی کام نہیں کیا۔

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ کے عہد میں امارت شرعیہ کے زیر اہتمام پھر بہار کے دینی مدارس کا ایک اہم اجتماع منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں ''وفاق المدارس اسلامیہ بہار'' کی تشکیل عمل میں آئی، موجودہ امیر شریعت اس وفاق کے سرپرست اور آپ اس کے صدر اور روح رواں ہیں، یہ اجلاس اور وفاق اصل میں آپ ہی کی توجہ اور تحریک کا نتیجہ ہے جس میں بہار کے دو سو سے زیادہ آزاد دینی مدارس شریک ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اس وفاق نے بہار کے مدارس کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار کو اونچا اٹھایا ہے اور پورے ملک میں اس کو ایک قابل تقلید وفاق تصور کیا جا رہا ہے۔

آپ نے کل ہند سطح پر بھی مدارس کے نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح وترقی اور حکومت کے ناپاک عزائم سے مدارس کی حفاظت کے لئے دینی مدارس کا وفاق قائم کرنے کی کوشش فرمائیں اور اس سلسلہ میں آل انڈیا ملی کونسل کے تحت دہلی میں ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا، لیکن افسوس کہ بعض حلقوں نے تعاون کے بجائے تصادم اور مخالفت کی راہ اختیار کی اور اس طرح ایک اہم کام جو ہونا چاہیے اور جس سے معیار تعلیم کو اونچا اٹھانے میں بڑی مدد ملتی تشنہ تکمیل رہا۔

اب خود امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے تحت ''دارالعلوم امارت شرعیہ'' کا قیام عمل میں آچکا ہے، جس میں حضرت امیر شریعت کی اور آپ کی اور امارت کے نوجوان وتازہ ذمہ داروں کی فکر اور سعی بلیغ کا بڑا حصہ ہے اور اس وقت، جبکہ بہار میں کسی مرکزی دینی جامعہ کی کمی محسوس کی جا رہی ہے، امید ہے کہ یہ دارالعلوم اس خلا کو پر کرے گا اور بتدریج کم وکیف کے اعتبار سے عروج کمال کو پہنچے گا۔

ایک بہت ہی اہم مسئلہ دیہات اور قریہ ذات میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے بنیادی دینی تعلیم کے انتظام کا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے مکاتب کا قیام اس وقت بڑی دینی جامعات کے قیام سے بھی زیادہ ضروری ہے اور اس کے بغیر آئندہ نسل کے ایمان کی حفاظت اور ان کی اسلامی شناخت کا برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ اس جانب قاضی صاحب کی خاص توجہ ہے اور اس پیغام کو آپ نے امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے دیہات دیہات پہنچایا ہے، ابھی چند سال پہلے آپ نے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام بہار واڑیسہ میں دوسو سے زیادہ مکاتب قائم کئے ہیں، یہ امارت کی بھی اور آپ کی بھی خدمات کا ایک اہم حصہ ہے۔

غرض کہ پورے ملک میں عموماً اور بہار میں خصوصاً دینی تعلیم کے فروغ، مدارس کے استحکام اور نظام تعلیم کی اصلاح وتربیت میں آپ کی کوششوں کا خاص ہدف رہا ہے اور اس سے دوررس فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔

جہاں آپ نے دینی تعلیم کے فروغ میں کوششیں کی ہیں، وہیں مسلمانوں کے لئے ماڈرن ایجوکیشن پر بھی آپ نے پوری توجہ رکھی ہے، آپ نے اپنے قصبہ جالہ ضلع دربھنگہ (بہار) میں ایک بہت وسیع ایجوکیشنل کیمپس قائم کیا ہے جس میں پرائمری اسکول سے لے کر ڈگری کالج اور ٹیچر ٹریننگ کالج تک ہر سطح کی تعلیم کا نظم کیا گیا تھا، افسوس کہ رفقاء کار کی نااہلی اور بے توجہی کی وجہ سے یہ درسگاہ پنپ نہ سکیں، البتہ فی الحال اس کیمپس میں ایک اقامتی انگلش میڈیم ہائی اسکول موجود ہے جو نہایت ہی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور ان درسگاہوں کے قیام نے علاقے میں ایک نئی تعلیم بیداری اور رجحان پیدا کیا ہے۔

ادھر دس پندرہ سالوں میں امارت شرعیہ کے تحت اس کے مرکزی احاطہ میں، نیز پورنیہ، دربھنگہ اور ساٹھی وغیرہ میں مختلف ٹیکنیکل ادارے قائم ہوئے ہیں جس کی وجہ سے بے روزگار نوجوانوں کو روزگار کے مواقع حاصل کرنے میں بڑی آسانی بہم پہنچی ہے۔ ان

اداروں کے قیام اور اس کے لئے وسائل کی فراہمی میں حضرت قاضی صاحب کا بنیادی رول ہے، ملک کے بعض دوسرے علاقہ میں بھی کونسل کے تحت ماڈرن اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے اداروں کے قیام کے لئے آپ پوری قوت کے ساتھ کوشاں ہیں اور جو لوگ پہلے سے اس کام کو کر رہے ہیں ان کی تقویت اور حوصلہ افزائی آپ نے ہمیشہ کی ہے۔

تعلیم کے مسئلہ کو آپ نے ہمیشہ انسانی نقطہ نظر سے دیکھا ہے اور برادران وطن کو قریب کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ جدید تعلیم کے ان اداروں سے جہاں مسلمان بچے استفادہ کر رہے ہیں، وہیں غیر مسلم بچوں کو بھی ان سے استفادہ کے مواقع حاصل ہیں، گویا دینی اور عصری اور مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں سبھوں کے لئے آپ نے علم کی شمع جلائی ہے اور ان کو نور تعلیم سے آشنا کیا ہے۔

خطابت:

حضرت قاضی صاحب کو تقریر وخطابت کا خاص ملکہ ہے، بے ساختہ، تصنع سے پاک دلوں میں اتر جانے اور کانوں میں رس گھولنے والی آواز، موقع محل اور مخاطب کے اعتبار سے الفاظ کا انتخاب، آورد کے بجائے آمد، قصہ کہانی سے بچتے ہوئے کتاب وسنت کے ٹھوس دلائل اور صحابہ کے واقعات، نیز اپنے عہد کے حالات پر ان کی تطبیق، یہ آپ کی تقریروں کے نمایاں پہلو ہیں، اگر اس عہد کے دو تین سب سے مؤثر خطباء کے نام لکھے جائیں تو شاید ان میں سرفہرست آپ ہی کا نام ہوگا۔

آپ کے خطاب کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں وہ حالات کی رعایت کے ساتھ، علماء ہوں تو علمی اور فنی گفتگو، جدید تعلیم یافتہ لوگ ہوں تو ان کے فہم کے مطابق موضوع بھی عوامی اور زبان بھی آسان تر، جوش کی جگہ جوش اور ہوش کی جگہ ہوش، کہیں شعلہ اور کہیں شبنم، لیکن ہر بات جذبہ دروں کی شمولیت کی وجہ سے ''از دل ریزد بر دل خیزد'' کا مصداق، اگر مجمع میں برہمی اور بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہوجائے تو اس کو سنبھالنے کی خاص

صلاحیت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے، مثلاً: مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس احمد آباد کی ایک نشست میں ایک صاحب نے کسی قدر غیر متوازن تقریر کردی اور احناف اور غیر مقلدین کے درمیان زیر بحث ایک اختلافی مسئلہ چھڑ گیا جس سے اچھا خاصا تکدر پیدا ہو گیا اور بڑی بد نظمی کی کیفیت ہوگئی، خود صدر اجلاس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مضطرب ہو گئے اوران کی ایماء پر قاضی صاحب نے اسٹیج سنبھالا اور صرف چند منٹ کے دردانگیز خطاب نے نہایت ہی اعتدال اور توازن کے ساتھ اس کیفیت کا ازالہ بھی فرمادیا اور ساتھ ہی ساتھ آپ نے بلا تاخیر دوسرے ایجنڈے کو چھیڑ دیا اور گفتگو کا رخ موڑ دیا، اس موقع سے حاضرین میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کی آنکھ نم نہ ہوئی ہو۔

کئی دہائیوں سے یہ صورت حال ہے کہ مسلمانان ہند کا جب بھی کوئی قومی، علمی اور مذہبی اجتماع ہو اور اس میں آپ شریک ہوں تو آپ کے خطبہ کی حیثیت اس اجتماع کے کلیدی خطاب کی ہوتی ہے، اس نسبت سے آپ امریکہ، برطانیہ، ساؤتھ افریقہ، خلیجی ممالک، برصغیر میں پاکستان و بنگلہ دیش وغیرہ تشریف لے جاچکے ہیں اور ہندوستان میں تو شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں اس حیثیت سے آپ کا قدم نہ پہنچا ہو، مسلمانوں کی فکر، ان کے درد میں گھلاؤ اور گاؤں گاؤں پہنچ کر ان سے گفتگو اور اس کے لئے اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر ان کے مسئلے کو سمجھا۔

علم و تحقیق:

آپ کا اصل میدان علم و تحقیق ہے اگر متبحر عالم کی تصریف ایسے شخص سے کی جائے جس سے گفتگو کرتے ہوئے انسان پر اپنا جہل واضح ہو جائے تو یقیناً آپ کی شخصیت کو اس کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے، جن حضرات نے آپ کو قریب سے دیکھا اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا ہے اور علمی مسائل میں اسے آپ سے تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے،

وہ یقیناً اس کا اعتراف کرے گا، مشکل مسائل کو سہل طریقہ پر بیان کرنے اور اس کی روح تک پہنچ کر مسئلہ کو سمجھانے کا خاص ملکہ اللہ نے آپ کو عنایت فرمایا ہے، گو ملی مشغولیات کی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں مل پایا اور تالیف برائے تالیف کے آپ قائل نہیں، اس کے باوجود جو کچھ علمی سرمایہ آپ کا لوح وقلم نے محفوظ کیا ہے، وہ ''کم'' کے اعتبار سے بھی اور اس سے زیادہ ''کیف'' کے اعتبار سے ایک گنج گراں مایہ ہے۔

اسلام کا عدالتی نظام فقہ اسلامی کا نہایت ہی اہم موضوع ہے اور عربی زبان میں اس درجنوں کتابیں مختلف عہد میں لکھی گئی ہیں، اردو زبان کا دامن قریب قریب اس سے بالکل ہی خالی تھا اور یہ کام ہے بھی نازک اور مشکل، ایک طرف قانون قضاء پر نگاہ ہو، دوسرے کار قضا انجام دینے کا علمی تجربہ ہو اور تیسرے ہندوستان کے مخصوص حالات اور محدود وسائل کے پس منظر میں ان فقہی آراء کی تطبیق کی صلاحیت ہو، جو اس موضوع پر عمیق نظر اور احوال زمانہ کی بابت دوررس فہم کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت آپ کی قسمت میں لکھی تھی، چنانچہ آپ نے اس موضوع پر ''اسلامی عدالت'' کے نام سے ایک نہایت ہی جامع کتاب مرتب کردی ہے، جس میں ادب قضاء کی تمام بحثیں دفعہ وار اور حوالہ جات کے اہتمام کے ساتھ جمع کردی گئی ہیں، کتاب کا مقدمہ فقہ کے اصولی مباحث اور قضاء کی تاریخ سے متعلق ہے جو اپنے علمی مواد کے اعتبار سے اہل علم کے لئے نہایت قیمتی چیز ہے، اس کتاب کا امتیازی پہلو قضاء سے متعلق نئے مسائل، نیز ان مسائل کی عقدہ کشائی ہے جن پر ہندوستان اور ان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کے مقرر کئے ہوئے قاضی کے لئے عمل کرنا دشوار ہے، آپ نے فقہاء کی عبارتوں میں غواصی کرکے اور شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی دوسری جلد ''دعویٰ اور شہادت'' سے متعلق ہوگی جس کا کام شروع ہو چکا ہے، خدا کرے کہ یہ کام جلد پایہ تکمیل کو پہنچے تو یقیناً اس سے ایک بہت بڑی ضرورت کی تکمیل ہوگی۔

نظام قضاء سے طویل وابستگی کے سبب اسلام کے عائلی قوانین آپ کی فکر ونظر کی خاص جولان نگاہ ہیں، یہ مجموعہ جو ابھی آپ کے سامنے ہے، اس میں بھی معاشرتی زندگی کے متعدد پیچیدہ مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت عائلی قوانین کا جو مجموعہ مدون ہوا ہے، اس میں آپ کا بھی نمایاں حصہ ہے، اس کے علاوہ قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی حیثیت سے آپ نے سیکڑوں فیصلے کئے ہیں، یوں تو یہ فیصلے زندگی کے مختلف شعبوں کے مقدمات سے متعلق ہیں، لیکن اکثر مقدمات معاشرتی مسائل ہی کے ہیں، ان سے اس راہ کے نو واردوں کو فصل خصومات کے طریقہ کار کے متعلق واضح اور عملی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، یہ فیصلے ابھی تک کتاب کی صورت میں طبع نہیں ہوئے ہیں لیکن ''بحث ونظر'' میں ان کی ایک اچھی خاصی تعداد طبع ہو چکی ہے اور اب ضرورت ہے کہ ''مجموعہ قضایا دارالقضاء امارت شرعیہ بہار واڑیسہ'' کی اشاعت عمل میں آئے۔

ہندوستان میں اگر تین چار مصروف ترین دارالافتاء کو شمار کیا جائے تو ان میں ایک دارالافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ بہار بھی ہوگا۔ یہاں کا دارالافتاء بھی قدیم زمانہ سے کام کر رہا ہے، بانی امارت شرعیہ حضرت ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحبؒ جن کو علامہ کشمیری جیسے جوہر شناس بزرگ نے ''فقیہ النفس'' کا لقب دیا ہے، خود بھی فتاوی دیا کرتے تھے، آپ نے ایک جلد میں ان فتاوی کو جمع کیا ہے اور اس کو اپنی بیش قیمت تعلیمات سے مزین کیا ہے، جن میں کہیں کہیں صاحب فتاویٰ پر استدراک بھی ہے جہاں یہ فتاویٰ مولانا سجاد صاحب کی گہری فقہی بصیرت کے شاہد ہیں وہیں مرتب کے عمیق نظر اور وسعت مطالعہ کی دلیل بھی۔

تقریباً چار سال کے عرصہ سے آپ علیل تھے، لیکن اس علالت میں ایک خیر کا پہلو یہ تھا کہ متعدد علمی کام جو یکسوئی اور کامل توجہ کا طالب تھا اور جس کا حاصل ہونا آپ کی ملی سرگرمیوں کی وجہ سے بہ ظاہر دشوار تھا اس کو اس بیماری کے زمانہ نے پورا کرایا، چنانچہ قضاء کے موضوع پر نہایت ہی اہم کتاب ''صنوان القضاء'' پر اسی زمانہ میں آپ نے تعلیق وتحقیق

مجموعہ القاسم: جلد ششم — تیری عظمتوں کو سلام

کا کام کیا ہے جو چار جلدوں میں کویت کی وزارت اوقاف سے طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے، یہ کتاب تو اپنی جگہ اہم ہے ہی، آپ مبسوط تعلیقات نے اس کی اہمیت مزید اضافہ کر دیا ہے، دوسرا اہم کام ''وزارۃ الاوقات'' کویت سے طبع ہونے والی ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' کے ترجمے کا ہے، جسے آپ کی نگرانی میں انجام دیا جا رہا تھا اور آپ بہ نفس نفیس اس پر آخری نظر ڈالتے ہیں، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے، اگر یہ عظیم فقہی ذخیرہ اردو کا جامہ پہن کر طبع ہو جائے تو اردو کے کتب خانہ میں ایک عظیم الشان اضافہ ہوگا، لبنان سے آپ کی دو اہم عربی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک ضخیم کتاب ''الوقف'' اور دوسری ''نظام القضائی الاسلامی'' ہے۔

آپ کی تصنیفی اور فقہی خدمات میں ایک اہم عنوان سہ ماہی ''بحث ونظر'' کا اجراء ہے، جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے، اس میں فقہ کی اصولی بحثیں، فقہی مسائل پر تحقیقی مقالات، اہم فتاویٰ ومقدمات کے فیصلے، اہم علمی شخصیتوں اور کتابوں کا تعارف اور نو طبع شدہ کتابوں پر تبصرہ کے علاوہ ملکی وملی مسائل پر تجزیاتی شجرات بھی اداریہ کی شکل میں موجود ہوتے ہیں، یہ رسالہ اہل علم اور اصحاب دانش کے لئے نہایت قیمتی اثاثہ ہے اور محض وقتی رسالہ نہیں، بلکہ مستقل دستاویز ہے، اس رسالے کے مدیر بھی آپ ہی تھے جس نے اہم موضوعات پر قلم اٹھانے والے تازہ دم فضلاء کی تربیت بھی کی ہے اور ان کو متعارف بھی کرایا ہے۔

مجتہد فیہ مسائل میں فکری اعتدال:

حضرت قاضی صاحب کی فکر کا امتیاز عدل اور اعتدال ہے، اعتقادات کے باب میں آپ کے یہاں اہل سنت والجماعت کے سلف صالحین کی رائے پر تصلب ہے، لیکن اختلاف رائے کے باوجود امت کی اجتماعیت کی طرف اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مشترک مسائل کے لئے زیادہ سے زیادہ اجتماعی قوت کی فراہمی کی فکر آپ کو بے چین رکھتی

ہے، فقہی مسائل میں آپ کا ذوق خالصۃ اعتدال پر مبنی ہے، آپ اس تجدد اور اباحیت کے سخت مخالف ہیں، جو اجتہاد کے نام پر شریعت کی نصوص تک کو خاطر میں نہیں لاتے اور اس لئے تقلید کو ایک ضرورت سمجھتے ہیں، لیکن دوسری طرف اس تقلید جامد کے بھی آپ قائل نہیں، جس میں حالات کی تبدیلی کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف فقہاء کی جزئیات پر جمود اختیار کیا جائے، یہاں تک کہ لوگ شریعت کو بوجھ اور ناقابل عمل سمجھنے لگیں، اجتہاد کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ کہنا درست نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے، کیونکہ فقہاء نے قضاء و افتاء کے لئے زیادہ مستحق اس شخص کو قرار دیا ہے جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو، تو اگر مطلق باب اجتہاد بند ہو تو پھر یہ بات بے معنی ہو کر رہ جائے گی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ واقعہ یہی ہے کہ عملاً فی زمانہ صلاحیت اجتہاد کی حامل شخصیتیں مفقود ہیں، نئے مسائل کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انفرادی اجتہاد کے بجائے ان مسائل پر اجتماعی غور و فکر کی راہ اختیار کی جائے اور اسی پس منظر میں آپ نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم فرمائی ہے۔

اہل علم فقہیات میں قاضی صاحب کے مزاج و مذاق اور فکر و نظر کے اعتدال کو سمجھنا چاہیں تو شرعی رخصتوں اور اس کے ذیل میں آنے والی تلفیق کی بحث کو ملاحظہ کریں کہ کس طرح افراط و تفریط سے بچتے ہوئے رائے قائم کی گئی ہے، چنانچہ منصوص مسائل میں آپ کا رویہ نہایت احتیاط کا ہے، سود کے بارے میں جو احتیاط آپ نے اختیار کی ہے اس سے بھی یہ حقیقت واضح ہے، جو مسائل اجتہادی ہیں اور ائمہ متبوعین اور سلف صالحین کے درمیان مختلف فیہ رہ چکے ہیں اور ان میں فقہ حنفی ہی پر قائم رہنے میں بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے تنگی یا اباحیت کا اندیشہ ہے، کے بارے میں آپ کا رجحان ہے کہ علماء اجتماعی غور و فکر کے ذریعہ بہ قدر ضرورت سلف کی رائے سے استفادہ کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ دین کے مقابلے بے دینی کو اختیار کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ اختلاف کو امت کے لئے رحمت بنانا ہے اور تمام ہی سلف

صالحین کے اجتہادات ہمارا اثاثہ اور سرمایہ ہیں، غرض کہ اگر آپ کے فقہی مزاج اور فکری مذاق کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو اس کی تعبیر فکر ولی اللہی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں افراط و تفریط کی راہ چلنا آسان ہے اور اعتدال کی راہ پر قائم رہنا دشوار، کیونکہ علمی افراط و تفریط جذباتیت، شدت پسندی اور بے اعتدالی کو جنم دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، اس لئے اگر کوئی شخص گروہی تنگ نظری اور جماعتی تعصب سے خالی ہو کر وہ بات کہتا ہو جو انصاف کی ہو اور جس کی ضرب افراط پسند اور تفریط پسند لوگوں پر پڑتی ہو تو ان کا رویہ جارحانہ ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے لے کر شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک کون ہے جو اس فکری جارحیت کا ہدف نہ بنا ہو؟ حضرت قاضی صاحب بھی اسی سنت کو پورا کر رہے ہیں، لیکن جن لوگوں کی تاریخ پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ بے ثبات گھٹائیں ہیں جو چھٹ جائیں گی اور جو فکر کتاب و سنت سے ہم آہنگ اور امت کے لئے نافع ہے وہ باقی رہے گی۔

☆☆

اتحاد ملت کا عظیم داعی قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

• مولانا اسرار الحق قاسمی

علم ودانش کے آفتاب اور عظیم مجاہد حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی علمی عظمت، فکری کاوش، ملی وسماجی اور وطنی خدمت اور ہر محاذ پر ان کے رہنمایانہ نقوش ہمیشہ ہمارے سامنے درخشاں رہیں گے۔ چار سال پہلے اپریل ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹروں کی طرف سے کینسر کی تشخیص کے بعد بغرض علاج ان کا دہلی میں مستقل قیام رہا۔ اس دوران ان کے کام اور جدوجہد میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ علمی وملی امور میں پہلے سے زیادہ تیزی آگئی تھی۔ تقریباً چار برسوں سے یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ طبیعت بگڑی اور حسب معمول اپولو اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ آخری بار انہیں ۱۱/مارچ کو اپولو اسپتال میں داخل کرایا گیا، لیکن جوں جوں دن گزرتے رہے، ان کی صحت میں زبردست اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴/اپریل ۲۰۰۲ء کی شام کو تقریباً ۷ بجے انہوں نے آخری سانس لی اور واصل بحق ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی صاحب علیہ الرحمہ اتحاد امت کے عظیم داعی اور پُر جوش علم بردار تھے۔ کانپور مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے شرکاء کی نگاہوں کے سامنے آج بھی اجلاس عام کا کبھی نہ فراموش کیا جانے والا منظر ضرور ہوگا، جس میں مجاہد کی آواز گونج رہی ہے۔ وہ اتحاد ملت کا ایک طاقتور پیغام پوری قوت سے سنا رہے ہیں اور لوگ گوش برآواز ہیں۔ پیغام یہ ہے ’’لوگو! امت اصل ہے، امت کی بقاء، امت کا تحفظ، امت کا استحکام، امت کی وحدت

اصل ہے، امت رہے گی تو تحریکیں برپا ہوتی رہیں گی۔ امت رہیں گی تو تنظیمیں اور جماعتیں وجود میں آتی رہیں گی۔ جماعتیں اصل نہیں ہیں امت اصل ہے۔ امت کبھی بانجھ نہیں رہی، امت باقی رہے گی تو اس میں سینکڑوں ابوالحسن اور سینکڑوں منت اللہ رحمانی پیدا ہوں گے۔ (ہوئے) لوگو! امت کا اتحاد، امت کی امت محمدیہ والی شان اور ابراہیمی مزاج، مطلوب ومقصود ہے۔‘‘ مجاہد کی اذان سن کر سامعین پر سناٹا چھا گیا تھا۔ مجاہد کی گھن گرج، مجاہد کا طرز تخاطب کچھ اور ہی تھا۔

پھر قاضی صاحب علیہ الرحمہ پر امت کے امتی ہونے کا رنگ مزید گہرایا۔ انہوں نے وحدت کا گیت گایا اور کہا کہ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر امت کا اتحاد ضروری ہے۔ وحدت کلمہ اور وحدت امت کا پیغام چپہ چپہ پر انہوں نے دیا۔ ان کے اس لے میں شدت آتی گئی۔ ان کے دل ودماغ پر جذبات کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا، ایک خواب تھا جو وہ دیکھ رہے تھے۔ اتحاد کا، ان کی تڑپ، ان کا سوز بڑھتا گیا۔ انہوں نے جوڑنے کی کوشش کی، تمام مسالک کے علماء کو، انہوں نے لکھنؤ کے شیعہ سنی جھگڑے کو حل کرنے اور اتحاد قائم کرنے کے لئے مولانا عبدالعلیم فاروقی اور مولانا سید کلب صادق سے دہلی میں گھنٹوں گفتگو کی وہ بے چین تھے اتحاد کے لئے، وہ مسلک کے نام پر، علاقہ کے نام پر، جماعتوں کے نام پر پائی جانے والی گروہ بندی، گروپ بندی، عصبیت، تنگ نظری کو ختم کرنے کے لئے امت واحدہ کا نعرہ بلند کیا۔ البتہ وہ علمی بنیاد پر معقول وموزوں وسنجیدہ اختلاف کو نظر انداز کردیتے تھے۔ حالیہ دنوں میں انہیں جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کی کسی ریاست میں سلفی حنفی اختلاف شدید ہوگیا ہے اور لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کو تیار نہیں ہیں تو انہوں نے بستر مرگ سے نہایت جامع فتویٰ جاری کیا اور لکھا کہ ایک مسلک والوں کی نماز دوسرے مسلک والوں کے پیچھے بالکل درست اور جائز ہے، امت فتنہ میں مبتلا نہ ہو۔

جن لوگوں نے ذات پات کے جھگڑوں کو ہوا دینے کی کوشش کی تو انہوں نے امت کو

اس جانب متوجہ کیا اور اسلام کے تصور مساوات، تصور عدل کی تشریح کرتے ہوئے وحدت امت کی جانب لوٹنے کا پیغام دیا۔ انہوں نے اختلافات فقہاء کی شرعی حیثیت کو موضوع بحث اس لئے بنایا تاکہ اتحاد امت کو نئی روح ملے۔

قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی یہ آواز مصر میں بلند کی، خراسان میں بلند کی، بخارا اور سمرقند میں بلند کی اور کہا کہ حضور اکرم ﷺ نے کلمہ واحدہ کی بنیاد پر وحدت پیدا فرمائی، لہٰذا امت کو کلمہ واحدہ کی بنیاد پر ایک بننا چاہئے، امت جسم واحد ہے اس کو تفریق کی قینچیوں سے نہیں کاٹا جا سکتا، حضور ﷺ امت کو ایک بنانے اور بکھرے لوگوں کو جوڑنے آئے، ٹوٹے دلوں کو ایک کرنے آئے اور آج ہم ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امت اگر علم سے دور رہی، قرآن سے دور رہی، فقہ فی الدین سے دور رہی تو امت کبھی امت نہیں بن سکے گی، امت کو اجتماعیت کے شیرازہ میں باندھنا ضروری ہے۔

انہوں نے زور دے کر کہا کہ امت کو جوڑنے والی چیزیں توحید و رسالت، وحدت انسانی، وحدت قانون اور وحدت اعمال ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں کو یہ فرمان رسالت ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ''تم ہمارے بعد کفر و گمراہی میں مبتلا مت ہو جانا کہ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو'' بات بات پر ایک دوسرے کو کافر، فاسق اور ضال اور مضل قرار دینا بھی دراصل معنوی اعتبار سے گردن مارنے اور قتل کر دینے کے ہی درجہ میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میری امت کی گردن پر غیروں کی تلوار مسلط نہ کرنا۔ اللہ نے فرمایا دعا قبول فرما مگر ایک شرط کے ساتھ، جب تک آپ کی امت خود ہی تلوار اپنے بھائی کی گردن پر نہیں اٹھائے گی تب تک آپ کی امت پر غیروں کی تلوار مسلط نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے اتحاد امت کے لئے ملک اور بیرون ملک میں مقالات پڑھے، تقریریں کیں، شخصیات کو مشورے دئے، مہمیں چلائیں اور یہ سلسلہ

آخر دم تک جاری رکھا۔ مرحوم اتحاد امت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات و مسائل، بین الاقوامی تبدیلیوں، سیاسی مد و جزر پر گہری نظر رکھتے تھے۔ قاہرہ میں سابق شیخ ازہر کے ساتھ دریائے نیل کے کنارے ہونے والی خصوصی ملاقات میں جس میں مختلف ممالک کے ۳۰ سے زائد بڑے علماء خاموشی کے ساتھ تعمیری جدوجہد کرنے کے سلسلہ میں بیٹھے، اس میں حضرت نے یہ بات رکھی کہ ٹکراؤ کے بجائے صبر و تحمل کا رویہ اختیار کریں اور امت کو بلند مقام پر لانے کے لئے شب و روز جدوجہد کریں۔ اس طویل میٹنگ کے بعد مختلف اسلامی ممالک کے حکمراں اور ملوک قاضی صاحب کی جانب اچانک متوجہ ہوئے اور مسلسل ان سے ملاقات کے متمنی رہے۔

قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے عالمی سطح پر بعض اسلامی ممالک میں سیاسی تربیت کے لئے سیاسی کیمپ منعقد کرنے کی مفصل تجاویز اور منصوبے بھی پیش کئے۔ انہیں قیادت کے لئے بہتر افراد کی فراہمی کے لئے تربیت یافتہ افراد تلاش کرنے کی بہت فکر رہا کرتی۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دشمن کی چالوں سے خوب واقف ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا دماغ عطا کیا تھا کہ وہ بیک وقت مختلف زاویوں اور پہلوؤں پر ایک ساتھ سوچا کرتے تھے۔ ذہن بہت بیدار اور اخاذ تھا۔ ہندوستان میں سیاسی میدان میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ مسلم سیاستدانوں کو ایشوز پر سوچنے اور واضح رائے دینے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ وہ ان کو مسلم مسائل پر اظہار خیال کے لئے بھی بلاتے اور ان سے تبادلہ خیال بھی کرتے۔ غیر مسلم صاحب رائے اور صاحب نظر سے استفادہ اور تبادلہ خیال کو وہ ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ انسانی بنیادوں پر وسیع فکر کے حامل تھے۔

سماجی خدمت، مخلوق خدا کی خدمت اور بے لوث خدمت کے وہ بڑے داعی تھے۔ چنانچہ کبھی امارت شرعیہ کی جانب سے اور کبھی ملی کونسل کی جانب سے میڈیکل کیمپ، آنکھوں کے آپریشن کا کیمپ، میڈیکل ریلیف کیمپ، موبائل میڈیکل ایڈ، وبائی امراض کے لئے

مخصوص میڈیکل کیمپ، بلالحاظ دین ومذہب وہ انجام دیتے اوراس کام کے لئے زبردست مہم چلاتے۔

ہاسپٹل، کلینک کے قیام سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ وہ علماء کواس کام کے لئے مسلسل آمادہ کرتے تھے۔ سماجی ضروریات، سماجی تقاضوں کا انہیں خوب علم تھا۔ وہ انسانی بنیاد پر مخلوق کی خدمت کے لئے خطوط بھیجتے، جلسے منعقد کرتے، پروگرام بناتے، سماجی کارکنوں سے رابطے قائم کرتے، وہ ''الخلق عیال اللہ'' کے وسیع تناظر میں ہندوستان میں عظیم سماجی خدمت انجام دیتے۔ قاضی صاحب علیہ الرحمہ کی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سیاسی حکمت عملی بالکل واضح تھی۔ وہ کسی بھی قسم کے ٹکراؤ جذباتی نعروں، مظاہروں، نعرہ بازیوں اور تصادم کے انداز اورسوچ کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مسلسل نوجوانوں کوتلقین کرتے تھے کہ وہ جذباتیت کا طریقہ ترک کریں، تعمیری کام زیادہ کریں، نفرت کی بجائے محبت تقسیم کریں، اپنے کاموں سے غلط فہمیوں کودور کریں۔

☆☆

قطعہ تاریخ وفات

● محمد واصف نفیس مظاہری

حق، حق گو، مجاہدؒ، اک فقیہ بے مثال
تھے جو ابنائے وطن کے خانہ دل میں مکیں
دار فانی سے گئے وہ کرکے ملت کو یتیم
عالم بے مثل تھے جو، حامل دین متیں
ہے دعا فرمائے ان کی مغفرت رب کریم
ہوں وہ ''بہرہ ور مجاہدؒ، داخل خلد بریں''

☆۲۰۰۲ء

تھیں جن سے زندہ، خدا جانے کتنی تنظیمیں
انہی کے زیر صدارت تھا، بورڈ کا بھی نظام
گئے وہ علم وہنر کے بکھیر کر موتی
کہاں سے لائیں ظفر وہ مجاہد الاسلام

☆☆

ایسا کہاں سے لائیں تجھ سا کہیں جسے

● مولانا محمد رضوان القاسمی

امارت شرعیہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور آل انڈیا ملی کونسل، ان چار اداروں سے قاضی صاحب کا ذمہ دارانہ اور قائدانہ تعلق رہا ہے اور تقسیم کی بنیاد پر وہ سارے نظام کو سنبھالے رہے۔ بلاشبہ ان کا اصلی ذوق علمی، تحقیقی اور فقہی تھا، خصوصیت کے ساتھ ان کو فقہ سے خصوصی تعلق تھا، اس کے مآخذ اور مراجع پر گہری نظر تھی، ہمیشہ وہ اس موضوع سے متعلق مطبوعہ اور مخطوطہ کتابوں کی تلاش میں رہے تھے اور حاصل ہوجانے میں لذت بے پایاں محسوس کرتے تھے، تاہم وہ ہمہ جہت صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کی طبیعت اور مزاج میں تنوع تھا۔ مذکورہ چاروں اداروں کے ذریعہ ان کی وسیع تر علمی، دینی، فقہی، ملی، سماجی، سیاسی اور معاشی خدمات کا جو عظیم الشان ریکارڈ قائم ہوا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے۔ اس کے ساتھ ان کی زندگی کا یہ نہایت روشن باب ہے کہ مسلسل اسفار اور ملی اور عوامی مصروفیات سے ان کے علمی، تحقیقی اور فقہی کام میں رخنہ نہیں پڑا۔ پہلو بہ پہلو یہ سارا کام بھی انجام پاتا رہا۔ بلاشبہ یہ ان کی علمی کرامت خدا کی خاص نصرت کا مظہر ہے۔

قاضی صاحب کی درجنوں تصنیف، تالیف اور ترتیب کردہ کتابیں ہیں۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی مجلّہ ''بحث ونظر'' بھی علمی، تحقیقی اور فقہی دنیا میں دستاویزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اہل علم وتحقیق اور اصحاب فکر ونظر کے لئے ان کی تمام تحریریں بصیرت افروز اور چشم کشا ہیں۔ قاضی صاحب کے اعتراف علمی ہی کا یہ پہلو ہے کہ عربی میں

ان کی بعض کتابیں کویت اور بیروت سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کے عربی مقالات کا ضخیم مجموعہ بھی دارالفکر، بیروت سے بہت جلد چھپ کر منظر عام پر آنے والا ہے۔ ایسی شخصیت کے بارے میں اب تو یہی کہا جاسکتا ہے۔ ع

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملی مسائل میں قاضی صاحب کا جرأت مندانہ بیان اور اقدام لائق تحسین رہا ہے۔ کوئی مرحلہ اور کوئی معرکہ ہو، ان کی نظر عارفانہ تھی اور قدم غازیانہ۔ ع

ہر گام حادثوں سے تعارف ہوا مگر
ہم مسکرا کے حسب روایت گزر گئے

قاضی صاحب مسلک ومشرب اور ادارہ وجماعت کی حد بندیوں سے بالاتر ہوکر کلمہ واحدہ کی بنیاد پر اتحاد ملت کا پیغام پوری زندگی دیتے رہے۔ زبان تھی، فن خطابت کا ملکہ تھا، ان کا آستانہ علمی بہت اونچا تھا، مگر کہیں سے ان کے اندر علمی نخوت کی بو نہیں آتی تھی۔ وہ حد درجہ متواضع تھے اور اسی طرح جھکے رہتے تھے جیسے پھل دار درخت جھکا رہتا ہے۔ علمی فضل وکمال کے باوجود زندگی سادہ اور تکلف سے عاری تھی۔ خدمت خلق اور علم دین کی حفاظت واشاعت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ وہ نہ ہی طرز کہن پر اڑتے تھے اور نہ ہی تعمیر نو سے ڈرتے تھے اور نہ ہی قصہ قدیم وجدید میں الجھتے تھے۔ تکنیکی تعلیم اور عصری علوم وفنون کا وہ فروغ چاہتے تھے۔ اس کے لئے ان کے پاس ہمیشہ متعدد پروجیکٹ تیار رہتے تھے۔ ان کی اس فکر اور عملی دلچسپیوں سے کئی جگہ اس قسم کے ادارے بھی قائم ہوئے۔ اس سلسلہ میں کوئی کامیابی ان کو بہت خوش کرتی تھی۔ ملک اور بیرون ملک میں درجنوں اداروں کے وہ سرپرست اور رکن تھے۔ عرب اور خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ، مغربی اور افریقی ممالک کا انہوں نے دورہ کیا اور بین الاقوامی سیمینار اور کانفرنس میں شرکت کرتے رہے۔ قضا اور

فیصلہ میں ان کی نگاہ تیز تھی۔ کسی بات کی تہہ تک پہنچنے اور معاملہ فہمی میں انہیں درک وکمال حاصل تھا۔ صلح صفائی کرانے اور نزاعی مسئلہ کو حل کرنے کی خوش تدبیری سے وہ خوب واقف تھے۔ موقع ومحل کے اعتبار سے تقریر اور گفتگو ان کا امتیاز تھا۔ قاضی صاحب کی مومنانہ فراست، فقہی بصیرت، تدبر اور زمانہ شناسی اور قوم وملت کے لئے دردمندی اور فکرمندی مثالی تھی۔ ملک وملت کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی اور انہیں پورے خلوص کے ساتھ حل کرنے کی سعی وکوشش کرتے رہتے تھے۔ عصر حاضر کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی اور زبان وبیان کی خوبی کے ساتھ ان مسائل کی تفہیم وتعبیر کی خداداد صلاحیت حاصل تھی۔ قدیم وجدید طبقات اور دینی وعصری تعلیم یافتہ حلقوں میں وہ یکساں مقبول تھے، وہ ان طبقات اور حلقوں میں میل جول کے لئے ایک پل کا درجہ رکھتے تھے۔ اسلامی شریعت سے گہری واقفیت اور بین الاقوامی قانون پر نظر کی وجہ سے ایک سے زیادہ بار جنوبی افریقہ بلائے گئے، تاکہ وہاں قاضی صاحب کے علمی تعاون سے ملک قوانین اور انسانی حقوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلم باشندوں کے لئے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں آئین وضابطہ تدوین پاسکے۔ اردو زبان تو خیر ان کی اپنی زبان تھی، تاہم عربی زبان میں بھی مہارت تھی اور حسب ضرورت انگریزی زبان میں بھی بات چیت کر لیتے تھے اور انگریزی اخبارات پڑھنے کا تو معمول ہی تھا۔ متعدد واقعات بتاتے ہیں کہ قانونی الفاظ اور شرعی وفقہی اصطلاحات پر ان کی گہری نظر تھی اور الفاظ کے صدف سے معانی کے گہر نکالنے کا انہیں فن آتا تھا۔ مختلف زبان میں استعمال کئے جانے والے الفاظ پر بھی ان کی گرفت ماہرانہ تھی، ان کی طبیعت میں نکتہ رسی اور نکتہ سنجی تھی۔ صلہ وستائش کی تمنا اور کچھ حاصل کرنے کی آرزو سے بے نیاز مرد مجاہد کو ان کے ملکی اور غیر ملکی نیاز مندوں اور قابل قدر اداروں نے مختلف ایوارڈ اور اعزازات بھی دئے جس میں ان کے لئے اعتراف کا پہلو ضرور سامنے آیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قاضی صاحب ہم سے ایسے وقت جدا ہوئے، جبکہ مولانا علی

میاں ندویؒ کے بعد ملت ہند کی ان پر نظر تھی۔ اس وقت ملت مختلف قسم کی دقتوں اور مشکلات میں گھری ہوئی ہے۔ ایسے وقت میں ان کی مدبرانہ سیاست اور حکمت عملی بہت کام آتی تھی، مگر وہ ہمارے درمیان سے بلالئے گئے، خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔ تاہم قانون قدرت یہی ہے کہ شب تاریک کے دامن سے سحر پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں ایسی ہی سحر کا انتظار ہے۔ آخر میں اس تذکرہ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ قاضی صاحب کی علالت نے شدت اختیار کر لی تھی اور اشارہ غیبی پاگئے تھے کہ کچھ دنوں میں مجھے اپنی زندگی کا آخری سفر کرنا ہے، ایسے وقت میں بھی میں نے ان کو دہلی کی قیام گاہ میں ۴؍فروری ۲۰۰۲ء کو دیکھا کہ ان کا علمی، تحقیقی، تصنیفی اور ملی کام جاری ہے۔ جسم اور چہرے سے ضعف اور نقاہت ظاہر ہے، لیکن ''ذوق پرواز'' پر شستگی اور خود سپردگی کا کوئی اثر نہیں۔ جوش عمل ان کا خموش نہیں ہوا ہے، نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کی مثال بنے ہوئے ہیں۔ البتہ ان کی زبان پر سودا کا یہ مصرعہ تکرار کے ساتھ آرہا ہے: ع

ساغر کو میرے ہاتھ سے لو کہ چلا میں

جانے والے نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے جس ساغر کو اپنے بعد رہنے والوں کے ہاتھ میں دیا ہے، (بشمول امارت شرعیہ، مسلم پرسنل لاء بورڈ، فقہ اکیڈمی، ملی کونسل) وہ ایک امانت ہے جس کی حفاظت دینی وملی فریضہ بھی ہے اور وقت کا اہم تقاضہ بھی۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم ''طلوع اسلام'' میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام جیسے ''مرد مجاہد'' اور دیدہ ور ہی کے لئے کہا تھا: ع

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆

مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں!

● حقانی القاسمی

میں قاضی صاحب سے کبھی ملا نہیں، دور سے دیکھا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک جلسے میں، جبکہ میں رسومیاتی جلسوں سے دور بھاگتا ہوں، پھر بھی جانے وہ دن، کیسی بات تھی کہ کچھ دیر کے لئے میرے پاؤں ٹھہر گئے تھے۔ شاید اس میں ذکر حبیب ﷺ کی تاثیر تھی اور حضور اکرم کی عقیدت کا جادو کہ میں کچھ ساعتوں کے لئے بت سا بنا خاموشی کے ساتھ تقریر سن رہا تھا اور وہ تقریر انتہائی دل پذیر عالمانہ اور عارفانہ تھی۔ تقریر جونہی ختم ہوئی مصافحیوں کا ایک ہجوم قاضی صاحب کی طرف لپکا اور انگشت بوسی کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا۔ میں ان سب چیزوں سے ایک طرح کی کراہیت محسوس کرتا ہوں، تھوڑی دیر تک اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر میں نے اپنی راہ پکڑی اور شمشاد مارکیٹ آگیا۔ اس دن میں نے دیکھا کہ روحانی مقناطیسیت کیا ہوتی ہے۔ میں نے ہمیشہ مقناطیسیت کسی اور ہی شے میں محسوس کی ہے۔ اس شئے لطیف میں جسے ہر حساس اور سینے میں دھڑکتا دل رکھنے والا انسان محسوس کرتا ہے۔ اس دن کے پورے سلسلہ عمل سے ایک خاص طبقے کی نفسیات اور سائیکی پر غور کرتے ہوئے میں قرون وسطیٰ کے اس دور میں پہنچ گیا جب رسومیات کا غلبہ تھا۔ جب ظاہری اشیاء پر توجہ تھی اور اپنے باطن کو لوگ فراموش کر چکے تھے۔ اجتماعی ضمیر زندگی سے عاری ہو چکا تھا۔ علی گڑھ کی اس ایک تقریر کے بعد میرے دل ودماغ میں بہت سارے سوالات جنم لینے لگے اور پھر میں دلی آگیا۔ دوسری تقریر مجھے کبھی نصیب نہیں

ہوئی۔ ہاں دیوبند کے زمانہ قیام میں سنا تھا کہ قاضی صاحب نے احاطہ دارالعلوم میں زبردست تقریر کی تھی اور غیر طیب دور میں جب جبروتی داڑھیوں کے بال بال میں اور بڑھتی ہوئی توندوں میں بہاریوں کے لئے نفرت ہی نفرت بھر گئی تھی تو انہوں نے للکار کر کہا تھا کہ اگر بہار والوں کے ساتھ تعصب برتا گیا تو بہار میں اس سے بڑا دارالعلوم قائم کریں گے۔ دلی کی راہوں میں بھٹکتا ہوا، مختلف پیچیدگیوں سے الجھتا ہوا میں ایک دن اپنے کسی خیال میں گم تھا کہ کسی نے میرے شانے تھپتھپائے اور کہا کہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب سے ملنے چلیں گے، میں نے بیک جنبش سر انکار کیا، کیونکہ میرے دل میں کبھی کسی بزرگ، کسی عظیم انسان، کسی ملی قائد یا کسی اور سے ملنے کا نہ کوئی تحریک پیدا ہوا اور نہ کوئی جذبہ۔ میرے دل میں ایسے لوگوں کے لئے بے پناہ عزت تو ہے لیکن وہ اشتیاق اور وفور شوق نہیں جو اکثر لوگوں میں ہوتا ہے۔ میں ایک پرانے بچھڑے ہوئے دوست سے ملنے میں جو خوشی محسوس کرتا ہوں وہ کسی بڑی شخصیت کے ملنے سے مجھے حاصل نہیں ہوتی۔ دراصل بڑی شخصیت اور میرے درمیان فاصلے اور خلیج بہت زیادہ ہوتے ہیں کہ پاٹنا مشکل ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ اپنی ہی سطح اور اپنی ہی سوچ کے لوگوں سے مل کر مسرتیں کشیدہ کرتا ہوں کہ مجھے بزرگوں کے ماحول کی اجنبیت، بیگانگی سے ہول سی آتی ہے۔ روحانی فضا مجھے کبھی راس نہیں آئی۔ اس لئے میں کسی ایسے ماحول میں جانا پسند نہیں کرتا۔

قاضی صاحب بڑے آدمی تھے، ان کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ ان کے ارد گرد زاہدوں، متقیوں، مولویوں اور مفتیوں کا جھمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اتنی بھیڑ میں بھلا مجھ جیسے گنہ گار کے لئے کونے کھدرے میں بھی کہاں سے جگہ نکل پاتی اور بلاوجہ میں ان کے ہاتھوں کو اپنے لمس سے کیوں کر مکروہ کرتا اور ان کی آنکھیں بلاوجہ کیوں میری گھناونی صورت سے آلودہ ہوتیں۔ سو، نہ کبھی میں ان سے ملا اور نہ کبھی ملنے کی خواہش ہی پیدا ہو سکی کہ میرے لئے اپنی چھوٹی سی دنیا اور چھوٹے سے لوگ ہی کافی تھے۔ پھر ایک دن پتہ چلا

کہ قاضی صاحب مجھ حقیر فقیر سراپا تقصیر سے بے پناہ نفرت کرتے ہیں تو اس دن مجھے ان کی شرافت اور عظمت پر یقین کامل ہوگیا اور ان کی شخصیت کی ارتقاعی جہت مجھ پر منکشف ہوگئی اور میں نے اپنے سینے کے دائیں حصے میں ان کی شرافت کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیا۔ کیونکہ میں خود اپنے باطن کی سیاحت میں مصروف رہا ہوں اور مجھے یہ پتہ ہے کہ مجھ سے نفرت کرنے والا دنیا کا کوئی شریف ترین انسان ہی ہوسکتا ہے۔ باقی میری طرح کے آوارگان شب تو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور مجھے عزت کے اس مینار پر کھڑا کردیتے ہیں جہاں نظر اٹھاتے ہوئے محتسبوں کی ٹوپیاں اور واعظوں کی پگڑیاں گر جاتی ہیں۔ قاضی صاحب کی اس شرافت کی ایک ایسی نشانی تھی جو میرے لئے آج بھی مینارہ نور بنی ہوئی ہے۔ قاضی صاحب کی اس نفرت میں میرے اور میری طرح کے لوگوں کے لئے بڑی عبرت پوشیدہ تھی کہ جو اپنے ثقافتی اور تہذیبی جڑوں سے کٹ جاتے ہیں اور شجرۂ طیب اور طوبیٰ سے جن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے ان کی حیثیت زمین پر پڑے ہوئے پتوں اور تنکوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

دراصل قاضی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو جہاں دیدگی کے باوجود انتہائی سادہ لوح تھے۔ وہ ہر کسی کی بات پر یقین کرلیتے تھے۔ ہر وہ چہرہ جس کے اوپر ہلکی سی نورانی داڑھی ہوتی تھی، اسے وہ انتہائی باوقار اور ثقہ راوی سمجھتے تھے، چاہے وہ چہرہ دنیا بھر کی عیاری اور مکاری کا معجون مرکب ہی کیوں نہ ہو۔ ان کا دل تو آئینے کی طرح صاف شفاف تھا۔ اپنے آئینہ جیسے قلب میں وہ ہمیشہ لوگوں کو دیکھا کرتے تھے۔ سو ان کے ذہن میں جو تصویر بٹھا دی گئی تھی، وہ محفوظ ہوگئی۔ قاضی صاحب مجھے انتہای درجہ کا غلیظ، غامض اور گمراہ سمجھتے تھے۔ یہی وہ رائے ہے جس سے مجھے کبھی اختلاف نہیں رہا۔ ملی مسائل کے تعلق سے ان کی بہت سی رائے کو میں مشکوک اور غیر معتبر سمجھتا ہوں، لیکن میری ذات سے متعلق ان کی جو رائے تھی، اس سے میں کبھی اختلاف نہیں کرسکا۔ یہ ایسی رائے ہے جس پر امت کا اجماع

بھی ہوسکتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت کچھ...... میں نے ہمیشہ اپنی ذات کو قاضی صاحب کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور مجھے واقعتاً ایسا لگا کہ میری شکستگی ذات میں بہت کچھ دخل اپنے تہذیبی اور ثقافتی محور و مدار سے خروج کا ہے۔ اگر میں وہاں سے خروج نہ کرتا تو شاید میری زندگی کچھ بہتر ہوتی۔ ان لوگوں کی طرح ہوتی جن کے لئے قاضی صاحب کے دل میں بے پناہ عزت، شفقت اور محبت تھی۔

پھر ایک دن عجب سانحہ ہوا کہ میرے بارے میں قاضی صاحب کی رائے بدل گئی۔ انہی دنوں ہفت روزہ نئی دنیا میں امارت شرعیہ سے شائع ہونے والی چند کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہوئے تھے۔ ان تبصروں میں میرے شبد نہیں، میرے دل کی دھڑکن تھی۔ میں نے رات کے جانے کس پہر میں لکھا تھا۔ میں نے اس میں وہ کچھ لکھ دیا تھا جو دراصل میرے باطن کی آواز تھی۔ انہوں نے اپنے کچھ مصاحبوں کو جو میرے تئیں بغض اور عناد کا رویہ رکھتے تھے ڈانٹ پلائی کہ تم لوگ کیوں کسی کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو۔ حقانی تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ رات میری بہت بے چینی میں کٹی کہ ایک انتہائی شریف انسان نے مجھ جیسے خفیف آدمی کے بارے میں اپنی رائے کیوں بدل دی۔ اپنے پہلے قول سے کیوں رجوع کرلیا۔ مجھے اس غیر متوقع رجوع پہ حد درجہ حیرت ہوئی۔ قاضی صاحب نے اس ضعیف راوی کو اچھی طرح پہچان لیا تھا جس کی مجہولیت اب مشتہر ہوگئی ہے۔ اس واقعے سے قاضی مجاہد الاسلام کے شخصی عرفان کا ادراک ہوا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ عین الیقین سب سے بڑی منزل ہوتی ہے اور وہ ساری آوازیں ساری سرگوشیاں بے معنی ہوجاتی ہیں جو بغیر دیکھے کی جاتی ہیں۔ یہ ساری باتیں ان دنوں کی ہیں جب میں قاضی صاحب کے ایک انتہائی معتمد اور ثقہ آدمی عبدالقادر شمس قاسمی کے ساتھ رہائش پذیر تھا اور وہ ہمیشہ قاضی صاحب کی مدح وثنا میں مصروف رہتے تھے۔ پھر میرا مقام بدلا، میرا قیام کہیں اور ہوگیا۔ قاضی صاحب کے تعلق سے باتوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔ بس کبھی کبھی ٹیلی فون پر ان کے

بارے میں پتہ چل جاتا ہے۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ان کی شدید علالت کی خبر مجھے ملی اور میرا پورا اعصابی اور ذہنی وجود لرز اٹھا۔ ایک صحت مند دماغ کی جسمانی بیماری نے مجھ پر لرزیدگی کی کیفیت طاری کردی اور میری کئی راتیں اسی سوچ میں گزر گئیں کہ اگر یہ صحت مند دماغ بیماری کی یلغار سے شکست کھا گیا تو پھر اس مریض ملت اسلامیہ کا کیا حال ہوگا؟ اس کے بعد سے میری نگاہ اخبار کے صفحے پر قاضی صاحب کی خبریں ہی تلاش کرنے لگی تھیں اور میں تمام خبروں سے بے نیاز سا ہوگیا تھا کہ میرے لئے ملت کے اس عظیم صحت مند قائد کی بیماری کی خبر ہی سب سے بڑی خبر تھی۔ کیونکہ اس خبر ہی میں ہمارے حال اور مستقبل کی تابانی اور تاریکی مضمر تھی۔ کیونکہ جب ایک صحت مند دماغ مرتا ہے تو پوری قوم بیمار ہوجاتی ہے اور ذہن مفلوج ہوجاتے ہیں۔

قاضی صاحب ملت کا ایک انتہائی بیدار اور متحرک ذہن تھے جنہوں نے پوری ملت کو بحران کے منجدھار اور مسائل کے گرداب سے باہر نکالا اور بیمار ہوتی ہوئی ملت میں زندگی کی روح پھونکی اور اپنی تصنیفات سے انہیں نسخۂ شفا عطا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب ہمارے دور میں ملت کے آخری مجتہد اور مسیحا تھے۔ اب ان کے بعد ہر طرف گھپ اندھیرا ہے۔ گھٹاٹوپ تاریکی ہے۔ ایسی تاریکی کہ چاند سورج بھی اسے دور نہیں کرسکتے، کیونکہ ان کی شخصیت چاند اور سورج کی ساری ضیابار کرنوں کو اپنے وجود میں سمیٹ کر مٹی میں روپوش ہوگئی ہے اور جب کوئی عالم روئے زمین سے اٹھتا ہے تو خدا علم سلب کرلیتا ہے:

وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے
مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں

(۲)

میری صبح اچانک سیاہ شب ہوگئی تھی۔ صبح کی سیاہ شبی پورے وجود میں تحلیل ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیروں کے سوا کچھ نہ تھا کہ رات کا چاند، صبح کا سورج...... دونوں

غروب ہوگئے تھے اور یہ اس خبر وحشت اثر سے ہوا تھا جو عابد انور نے مجھے علی الصبح آکر سنائی تھی اور میری صبح کا رشتہ رات سے جوڑ دیا تھا۔ یہ خبر تھی قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی وفات حسرت آیات کی۔ مجھ پر ایک عجیب سی اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور میں ایک لمحے میں اپنے آپ کو تاریکیوں کی زنجیروں میں اسیر محسوس کرنے لگا۔ ایسا لگا جیسے آسمان سے آنسوؤں کی بارش مسلسل اور متواتر ہورہی ہے اور زمین سے درد کے چشمے ابل پڑے ہیں۔ ایسا اس لئے لگا کہ قاضی صاحب کی تجسیم میری نظر میں آفتاب ومہتاب کی مانند تھی اور ان کی روپوشی سے جیسے ہمارا عہد تاریکی میں ڈوب گیا۔ ان کی شخصیت میں جو نورانی کرنیں تھیں جس سے ایک عالم، آفتاب عالم تاب تھا۔ وہ کرنیں ڈوب گئیں تو ایسا ہونا فطری تھا۔ اب عالم پہ گریہ طاری ہے اور ملت پہ یہ ساعت بہت بھاری ہے۔

قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے انتقال نے ذہن میں بہت سارے سوال، وسوسے اور اندیشے پیدا کردئے ہیں۔ سب سے بڑا سوال ملت کی فکری قیادت کا ہے، اُس ملت کی جو اِس وقت بہت سارے بحران سے دوچار ہے اور جس کی تقدیر میں بہت ساری پریشانیوں اور بہت سارے مسائل تحریر ہیں۔ جب تک ان کا وجود تھا ان کی آفتابی حرکی شخصیت نے ملت کو صحیح سمت دکھائی، ایسی سمت جس میں ملت کی فلاح وخیر بھی مضمر تھی، امن وامان اور تحفظ بھی۔ قاضی صاحب کے وجود سے ملت کا تحرک قائم تھا، ملت کی موجوں میں طغیانی تھی۔ وہ ایک ایسی بلند نگاہ شخصیت تھے جنہوں نے ملت کو درپیش مسائل اور بحران پر ہمیشہ اُسی انداز میں سوچا جس انداز میں کسی زمانے کا کوئی مجدد یا مجتہد سوچتا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے ایک ایسے زعیم وقائد تھے جن کی نیک نظروں نے وہ سارے مسائل محسوس کرلیے تھے جو ملت کو پیش آنے والے تھے۔ فقہی مباحث اور عائلی مسائل پر جس مجتہدانہ بصیرت اور فقہی فراست کا ثبوت انہوں نے دیا ہے شاید ایسی فراست ہمارے بہت کم عالموں کو نصیب ہوگی۔ تنِ تنہا وہ کارنامہ انجام دیا جو ملت کے کئی اجتماعی ادارے بھی مل کر نہ انجام دے سکتے۔

قاضی صاحب نے ملت کی قیادت اُس وقت سنبھالی جب ملت بے سمتی کی طرف گامزن تھی۔ بھٹکے ہوئے آہوؤں کو انہوں نے سوئے حرم لانے کے لئے پیہم کوشش کی اور اپنی کوششوں میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے اندر قیادت کی تمام تر صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ایک قائد کے لئے جس نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ملت کو بھنور میں دیکھا اور کشتیوں کو ڈوبتے ابھرتے محسوس کیا اور یہ اندازہ کیا کہ ملت کے اندر جو شگاف پیدا ہوگیا ہے، اُس کی وجہ سے ملت کی کشتی ڈوب سکتی ہے تو انہوں نے آل انڈیا ملی کونسل کی بنیاد ڈالی۔ اس کا لائحۂ عمل تیار کیا۔ اس کے تاسیسی مقاصد سے پورے ہندوستانی علماء اور دانشوروں کو آگاہ کیا اور تمام حلقۂ فکر کے علماء اور زعماء سے مل کر وحدتِ ملت کی بات کی اور سب کو ایک پلیٹ فارم پہ مجتمع کر دیا۔ یہ دراصل ان کی شخصیت کا سحر ہی تھا کہ تمام لوگ مسلکی امتیازات اور فروعی اختلافات سے ماوراء ہو کر آل انڈیا ملی کونسل سے منسلک ہو گئے اور ملت کے اُس پیغام کو عام کرنے لگے جس پیغام میں وحدت اور انسانیت کا درس تھا۔ قاضی صاحب کے اندر اتنی فکری اور ذہنی کشادگی تھی کہ کسی بھی فرقے یا مسلک سے وابستہ لوگوں کو اس میں گھٹن نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ان کی عزت ان کے مخالفین و معاندین بھی کرتے تھے اور ان کی فقہی بصیرت اور مجتہدانہ لیاقت کے معترف بھی تھے۔ قاضی صاحب کی وسعتِ نظری اور کشادہ روی نے ہی ملی کونسل کے دائرہ کار کو وسیع کیا اور جب مولانا ابوالحسن ندوی کی وفات کے بعد ملت کی قیادت کا گمبھیر مسئلہ سامنے آیا تو بیک وقت سب کی نظر ایک ہی شخصیت پر پڑی اور وہ شخصیت قاضی مجاہد الاسلام کی تھی۔ کسی نے ان کی قیادت پر نہ کوئی سوالیہ نشان قائم کیا اور نہ کسی نے اعتراض کیا، بلکہ باتفاق رائے سبھی نے انہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا صدر منتخب کر لیا۔ یہ ان کی کشادہ نظری کی کرامت تھی۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اس دور کے مجتہد تھے۔ انہوں نے عصرِ حاضر میں پیش آنے

والے بہت سے پیچیدہ مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا اور ایسے نتائج اخذ کئے جو عصرِ حاضر سے ہم آہنگ بھی ہوں اور قرآن و حدیث سے ہم رنگ بھی۔ عائلی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ طلاق اور فسخ نکاح کے پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل کا حل، جس خوش اسلوبی سے وہ پیش کرتے تھے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ روزانہ بدلتے ہوئے فکری منظرنامے اور نت نئے مسائل پر ان کی بہت باریک نظر تھی اور وہ ان مسائل پر تدبر اور تفکر فرماتے تھے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل کا استنباط اور تخریج کرتے تھے۔ کتنے ہی پیچیدہ مسائل کیوں نہ ہوں اس کا خوبصورت حل تلاش کر لینا، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ ان کی ژرف نگاہی، علمی وسعت اور فقہی بصیرت کی دلیل تھی۔ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں فقہا کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے۔ اُن میں ایسے ایسے ذہین فقہا تھے جو قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل کا استخراج کرتے تھے، مگر وہ آج کے زمانے میں ہوتے تو شاید ایسے فقہا کی جبینوں پر بھی شکنیں ابھر آتیں اور وہ نت نئے مسائل سے پریشان ہو اٹھتے، مگر قاضی صاحب کا کمال تھا کہ وہ گنجلک، مبہم، مغلق اور پیچیدہ مسائل پر بھی بہت ہی آسانی کے ساتھ غور و فکر کرتے تھے اور نئے تناظر میں اس کا حل ڈھونڈھ لیتے تھے۔ انہوں نے فقہ کو ایک نیا تناظر عطا کیا ہے اور جمود اور تجرد کو توڑا ہے۔

قاضی صاحب ایک انتہائی فعال اور متحرک شخصیت تھے۔ انہوں نے پوری زندگی ملت کے لئے وقف کر دی تھی۔ ملت کی فلاح و بہبود ہی ان کے پیش نگاہ تھی۔ ان کے سینے میں سارے جہاں کا درد تھا۔ وہ بہت ہی دردمندی کے ساتھ ملت کے بارے میں سوچتے تھے اور اسلامی بصیرت کی روشنی قریہ قریہ نگر نگر پھیلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ بہار اڑیسہ کی امارت شرعیہ سے وابستہ ہوئے تو دور دراز، پس ماندہ علاقوں میں رفاہی اور ملی ادارے قائم کئے، مکاتیب قائم کئے، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے، ہاسپٹل قائم کئے اور جب بھی مسلمانوں پر کوئی قیامت گزرتی تھی تو قاضی صاحب بلک اٹھتے تھے۔ ان کے سینۂ سوزاں

سے اس وقت ملت کے لئے بس ایک آہ اٹھتی تھی اور وہ آہ پورے ہندوستان میں گریہ زاری کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

قاضی صاحب بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کی فقہی بصیرت کا اعتراف صرف ہندوستانی علماء اور فقہا ہی نہیں، بلکہ عالم عرب کے ممتاز فقہا بھی کرتے ہیں۔ جدید معاشرتی، سماجی، تجارتی مسائل پر ان کی بہت اچھی نظر تھی۔ انہوں نے ایک اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کی جس کی تاسیس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک اسلامی فقہی قانون مرتب کیا جائے۔ اس مقصد میں انہیں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے فتاوے اور قضایا کی جتنی اہم کتابیں تھیں انہیں ایڈٹ کیا اور ملت کے سامنے وہ سارا سرمایہ رکھ دیا جس سے وہ اپنے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھ سکیں۔ چار جلدوں میں 'صنوان القضا' کی ترتیب وتدوین مجموعہ قوانین اسلامی اور مجلّہ بحث ونظر کے شمارے، ان کی فقہی اور اجتہادی بصیرت کے روشن ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ قضایا سجاد، حکومت الٰہی، مکاتیب سجاد اور قانونی مسودے کی ترتیب وتدوین ایسے کارنامے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ انہوں نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے آثار وباقیات کو جس اہتمام کے ساتھ پیش کیا، وہ ان کی علمی لگن، محنت اور اسلاف شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی بہت ہی بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ ان کے اندر سوز وساز رومی بھی تھی اور پیچ وتاب رازی بھی۔ وہ جب تقریر فرماتے تھے تو مجمع پر سکوت طاری ہو جاتا تھا۔ ایک سناٹے کا عالم ہوتا تھا۔ ہر شخص کی نگاہیں ان کے چہرے پر اور ان کی گل افشانی گفتار پر ہوتی تھیں۔ قاضی صاحب جب بولتے تھے تو ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ہونٹوں سے اوس کی بوندیں گر رہی ہوں۔ قاضی صاحب کی شیریں گفتاری کے قائل وہ لوگ بھی تھے جو ان کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کو نئے عصری تناظر میں دیکھتے تھے اور آج کے عہد میں

اس کی معنویت کو آشکار کرتے تھے اور اپنی فصاحت لسانی اور بلاغت بیانی سے ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ 'خطبات بنگلور' ان کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں ان کے پانچ خطبے شامل ہیں۔ ان خطبوں کو پڑھ لیجئے اندازہ ہو جائے گا کہ علم کا دریا موجیں مار رہا ہے اور ادارک وعرفان کی لہریں رواں ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں اس واقعے کے حوالے سے جس میں حضور کو مجنوں اور پاگل کہا گیا تھا، آج کے تناظر میں اس واقعے کا اطلاق کرتے ہوئے اس کی عصری معنویت کو یوں آشکار کرتے ہیں:

اے لوگو! یہ تھا ''ابولہبی میڈیا'' اور آج اسی میڈیا کی ترقی یافتہ صورت ہے جو امریکہ، انگلینڈ اور ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن دنیا نے دیکھا کہ ابولہب کا وہ میڈیا ناکام ہوا۔ نبی ﷺ کی لائی ہوئی سچائیوں اور حقیقتوں کے سامنے یہ میڈیا کارگر نہ ہوسکا۔ سچائی اپنا وجود رکھتی ہے۔ حقائق اپنا وجود رکھتے ہیں جن کے پاس حقیقت ہوگی ان کو میڈیا سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

ابولہب کی یہ نعرہ بازیاں، جھوٹی نشر واشاعت اور جھوٹی پبلیسٹی، جناب محمد ﷺ کی خاموش، مگر حقیقت پر مبنی دعوت کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکی۔ انتہائی درجہ معتدل، ردعمل سے بچے ہوئے، چوٹ سہتے اور حکمت عملی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہوئے، کبھی چچا سے جھگڑے نہیں، کبھی ابولہب کی بات کا جواب تک نہیں دیا۔ اپنا کام کرتے رہے، سچائیاں غالب ہو کر رہتی ہیں۔

قل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا. (الاسراء: ۸۱)

''حق آ گیا، باطل مٹ گیا اور بے شک باطل مٹنے کے لئے تو آیا ہی ہے۔''

''لوگو! کیا آنحضور ﷺ کا یہ عمل ہمارے اور تمہارے لئے سوچنے کے لئے نہیں ہے۔

آج علم و دانش کے نام پر، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے نام پر، بڑے بڑے دماغوں کی پلاننگ کی بنیاد پر، اسلام اور رسول کی تصویر کو بگاڑنے کی جو بھی سازش کرتے رہیں، ناکامی ہی ان کا مقدر ہے۔ سچائیاں اور حقائق غالب ہو کر رہتے ہیں۔ ہمیں ہمت ہارنے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر ابولہب کا چراغ بجھ سکتا ہے اور مصطفیٰ ﷺ کا چراغ چمک سکتا ہے اور ''سراج منیر'' بن کر پوری کائنات کو ضوفشاں کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج بھی وہی چراغ مصطفوی روشن نہ رہے اور کائنات کو اپنی کرنوں کا اسیر نہ بنالے۔''

قاضی مجاہد الاسلام نے اپنے ایک خطبے میں اسلام کی عالم گیریت اور قانون کی وحدت پر خطبہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پاس پوری کائنات کے لئے عالمی قانون ہے اور وہ عالمی قانون سب کے لئے قابل قبول بھی ہے۔ کیونکہ انسانی قانون سب کے لئے الگ ہو سکتا ہے لیکن قانونِ الٰہی سب کے لئے یکساں ہے۔ کیونکہ ''الخلق عیال اللہ'' ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ قانون کون بنائے؟ اس حوالے سے انہوں نے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

''لوگو! دنیا کو ایک ایسے موحد اور یکساں قانون کی ضرورت ہے کہ ساری انسانیت کے لئے تنہا ایک قانون اور یکساں قانون ہو، جو پوری کائنات کو ایک نظر سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اگر ہندوستان کی پارلیمنٹ کوئی قانون بناتی ہے تو امریکن کے مفادات کی شاید حفاظت نہ ہو سکے، امریکن کانگریس اگر کوئی قانون بناتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ ہندوستانی مفادات کی حفاظت کرے، اگر انگلینڈ میں ایک قانون بنتا ہے تو ضروری نہیں کہ ملکہ برطانیہ سعودی عرب کی بھلائی اور وہاں کے شہریوں کی بھلائی کو دیکھ سکے۔ اس لئے ہم تو ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھیں گے، ہندوستانی، امریکن قانون کو، امریکن، برٹش کے قانون کو برٹش شہری، سعودی کے قانون کو سعودین، عراقیوں کے قانون کو اور عراقی کویت کے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو، انسانوں کو اپنی ایسی بنائی ہوئی قانون ساز اسمبلیز اور

لجسلیٹو جب بھی کوئی قانون بنائیں گے تو اُن کے بارے میں یہ امکان رہے گا کہ وہ دوسرے کے حقوق کی حفاظت نہ کر پائیں گے، اس لئے ایک ایسے قانون ساز کے پاس چلو جس کے پاس آدمی آدمی کا، ملک ملک کا، نسل نسل کا کوئی فرق نہیں ہے اور وہ صرف اللہ ہی ہو سکتا ہے جو خالق و مالک ہے۔ اسی نے اپنے ہاتھوں سے امریکن کو بنایا، اسی نے عربوں کو بنایا، اسی نے عجم کے لوگوں کو بنایا، اسی نے ہندوستان کے لوگوں کو بنایا، اس کی نظر میں آدمی اور آدمی کے بیچ کوئی فرق نہیں ہے۔

اس لئے اسلام کی عالمگیریت اور قانون کی وحدت ساری انسانی کائنات کے لئے اس لئے قابل قبول ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں ساری مخلوق برابر ہے۔''

قاضی صاحب جہاں دیدہ تھے۔ عالمی تہذیبی روایات اور بدلتے ثقافتی منظر نامے سے وہ آشنا تھے۔ ان کے ذہن میں نہ کوئی دھند تھی اور نہ تشویش و تشکیک۔ وہ ہر ایک تہذیبی روایت پر ویسی ہی نظر ڈالتے تھے جو ایک بلند نظر کا تقاضہ ہوتی ہے۔ اسلامی اور مغربی تہذیب کے فاصلوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ پھر بھی وہ ایک جگہ خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ مغرب میں کوئی خوبی ہی نہیں ہے، اس کی بعض اخلاقی خوبیوں اور انسانی قدروں کا معترف ہوں۔ معذوروں کی خدمت کا جذبہ اور یہ بات کہ ان کے یہاں کوئی شخص بے کار نہیں رہ سکتا۔ کوئی بھوکوں نہیں مر سکتا۔ سوشل سیکورٹی ان کو ضرور کھلائے گی، میں نے ان میں بہت سی خوبیاں آنکھوں سے دیکھی ہیں، مجھے لگتا ہے کہ ان کے یہاں یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی برکتوں کا چھینٹا پہنچا ہے اور افسوس کہ یہ برکت ہمارے سماج سے اٹھتی جارہی ہے، ہمارا حال یہ ہے کہ پڑوسی بھوکا ہے، ہم عمدہ سے عمدہ غذا کھاتے ہیں، ہمارے بھائی کو کپڑا میسر نہیں، ہم اچھے سے اچھے کپڑے پہنتے ہیں، اپنے گھر میں اچھا سے اچھا فرنیچر رکھتے ہیں اور ہزاروں روپے کے قیمتی قالین اور پردے بچھاتے اور لگاتے ہیں اور

ہمارے پڑوس میں ایسے غریب و نادار بھائی بھی ہوتے ہیں جن کو سر چھپانے کے لئے ایک سائبان بھی میسر نہیں اور بیسیوں افراد ہیں جو ٹھنڈک میں ٹھٹھر کر اپنی جان دے دیتے ہیں، کیا یہی اسلام کی تعلیمات ہیں؟ اور یہی پیغمبر اسلام کے دئے ہوئے اخلاق ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کو اگر جوہر ایمان حاصل ہو جائے تو وہ انسانیت کا صحیح نمونہ بن جائے، لیکن افسوس کہ مادیت کے جنون نے ان کو بدمست کر رکھا ہے، ان کے یہاں انسانیت صرف پیٹ کا نام ہے۔''

'خطبات بنگلور' کی ایک ایک سطر میں علوم و معارف کا خزانہ اور حسن نظر کا نور چمک رہا ہے۔ اس کتاب نے سید سلیمان ندوی کے 'خطبات مدراس' کی یاد تازہ کر دی ہے۔ قاضی صاحب اسلاف کے سچے امین اور جانشین تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے بزرگوں کو فراموش نہیں کیا۔ اسی لئے انشاء اللہ نئی نسل بھی ان کو فراموش نہیں کرے گی۔ کیونکہ ان کی خدمات جلیلہ ناقابل فراموش ہیں اور ان کے کارنامے انتہائی عظیم ہیں۔

قاضی صاحب کی وفات نے یقیناً پورے عالم اسلام کو رنجیدہ کر دیا ہے۔ ملت ایک بڑے فقیہ، مجتہد اور عالم دین سے محروم ہوگئی ہے۔ اس خلاء کو پر کرنا بہت مشکل ہے۔ قاضی صاحب کی وفات کے بعد اب یہی ایک سوال بار بار پریشان کرتا ہے کہ اب ملت کی قیادت کون سنبھالے گا؟

☆☆

فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

● مولانا حکیم محمد اسلام انصاری

آپ سرزمین بہار کے زبردست عالم، وسیع النظر فقیہ، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے قاضی القضاۃ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے جنرل سکریٹری، آل انڈیا ملی کونسل کے بانی وسرپرست اور بحث و نظر سہ ماہی فقہی مجلّہ کے چیف ایڈیٹر اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے۔

ولادت:

آپ کی ولادت ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو جالہ، دربھنگہ بہار میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم کا نام حضرت مولانا عبدالاحد صاحب قاسمیؒ تھا، آپ کے والد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے خاص شاگرد میں سے تھے۔

تعلیم وتربیت:

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور حضرت مولانا محمد اسحاق خاں صاحبؒ سے حاصل کی۔ پھر مدرسہ محمود العلوم دملہ، مدھوبنی، مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے، دربھنگہ اور دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں متوسطات کی کتابیں پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں پانچ سال رہ کر مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں اور ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں فراغت حاصل کی۔

درس وتدریس:

فراغت کے بعد جامعہ رحمانی مونگیر میں سات سال تک مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں، آپ کا ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک جامعہ رحمانی مونگیر میں قیام رہا۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی مردم شناس نگاہ ان پر پڑی تو ان کو مدرسہ سے ہٹا کر امارت شرعیہ میں لے آئے اور وہاں قضاء کی خدمت سپرد کی۔ یہاں پہنچ کر ان کو اپنی فطری، صلاحیت اجاگر کرنے کا پورا موقع ملا اور جلد ہی وہاں کے قاضی القضاۃ بنادئے گئے اور تاحیات اسی عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ اسی دوران ۱۹۶۹ء میں جامعہ رحمانی مونگیر میں استاذ حدیث شریف کے اعلیٰ منصب پر بھی فائز ہوئے، آپ بہت سی ملی تنظیموں، تحقیقی اداروں کے رکن تھے اور آپ بلا کے ذہین تھے۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی فرمایا کرتے تھے، ان کے دماغ کی چاروں کھڑکیاں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔

آپ کے کارنامے:

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی تعمیر وترقی میں آپ کا زبردست ہاتھ ہے، اسلامی فقہ اکیڈمی کے ذریعہ نئے فارغین کے لئے انہوں نے شرعی مسائل میں غور وفکر کا جو راستہ دکھایا ہے وہ بجائے خود بہت بڑا کارنامہ ہے۔ قاضیوں کی تربیت کے لئے ''المعہد العالی'' کے نام سے جو ادارہ انہوں نے پٹنہ میں قائم کیا وہ ان کا منفرد کام ہے۔ آپ نے چوتھا سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اسلامی عدالت نام کی ایک کتاب تصنیف کی جس میں قضاء کیا ہے؟ قاضی کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور اسلامی عدالت کا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟ پر روشنی ڈالی گئی ہے، آپ کی یہ کتاب آپ کے پچیس سالہ تجربہ اور مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جو کام انجام دیا وہ بھی ناقابل فراموش ہے جس وقت وہ صدر منتخب کئے گئے بیمار چل رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی مسلم

پرسنل لا بورڈ کا جو خاکہ مولانا منت اللہ رحمانی نے معتبر علماء کی ایک جماعت کے ذریعہ تیار کرایا تھا، وہ تقریباً دس برس سے چھپ نہیں سکا تھا، قاضی صاحب کے دور صدارت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ''مجموعہ قوانین'' کے نام سے شائع کرایا۔

وفات: ۲۰ر محرم الحرام ۱۴۳۲ھ، ۴ر اپریل ۲۰۰۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ نماز جنازہ پہلی بار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی جامع مسجد کے وسیع وعریض صحن میں پڑھی گئی اور نماز جنازہ حکیم الملت حضرت مولانا عبداللہ مغیثی صاحب دامت برکاتہم (اجراڑا میرٹھ) نے پڑھائی، پھر دوسری نماز جنازہ دہلی ایئرپورٹ پر پڑھائی گئی، پھر میت دہلی سے پٹنہ لائی گئی اور وہاں امارت شرعیہ کے کیمپس میں نماز جنازہ ہوئی اور حضرت امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحب نے پڑھائی، پھر حضرت قاضی صاحب کے جسد خاکی کو وصیت کے مطابق دربھنگہ لے جایا گیا، اور چوتھی اور آخری نماز جنازہ وہاں پڑھی گئی جہاں دربھنگہ، مدھوبنی، سمستی پور اور دیگر شہر اور گاؤں کے لوگوں کا سیلاب اُمڈ پڑا، دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ اتنی بڑی نماز جنازہ بہار کی تاریخ میں شاید ہی کسی کی ہوئی ہوگی۔ ان کے آبائی وطن مہدولی ضلع دربھنگہ میں تدفین عمل میں آئی۔ بجا طور پر اس مرد مجاہد کے لئے کہا جاسکتا ہے:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمہیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

☆☆

قاضی صاحب کے عالمِ اسلام سے تعلقات

● امین عثمانی

گھٹے اگر تو مشت خاک ہے انساں
بڑھے اگر تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

قاضی صاحبؒ کی جلالت علمی، امت کے تئیں فکرمندی، وسعت فکری، بلند نظری، فراست وبصیرت نے انہیں بہت جلد عالم اسلام سے مربوط کردیا، بین الاقوامی سطح پر وہ اپنی علمی خصوصیات امت واحدہ کے اتحاد کے وسیع تصور، سوزِ دروں کی بدولت اسلامی دنیا میں جانے اور پہچانے گئے، مراکش ہو یا اردن، ایران ہو یا برونائی، پاکستان ہو یا بنگلہ دیش، کویت ہو یا سعودی عرب، قطر ہو یا بحرین، مصر ہو یا سوڈان ہر جگہ جہاں گئے، وہاں کے علماء نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، ہر جگہ وہ ایک ہی پیغام دیتے رہے، امت مسلمہ ایک ہے، امت بحیثیت امت ایک داعی امت ہے، امت آپس میں نہ ٹکرائے اور کسی بھی حال میں تفرقہ میں مبتلا نہ ہو۔

ہر جگہ علماء سے انہوں نے کہا کہ وہ اتحاد کا درس دیں، حکام وامراء اور بادشاہوں سے صاف صاف کہا کہ وہ امت مسلمہ کو لا الٰہ کی بنیاد پر استوار کریں اور امت کی ترقی وفلاح کے لئے ملک میں موجود وسائل وطاقت کا استعمال کریں، بڑے بڑے بین الاقوامی سیمینار اور اجلاس میں وہ اپنی بلندی فکر، وسعت نظر اور کشادہ دلی کی بنیاد پر چھا گئے۔

انہوں نے قاہرہ میں صدر مصر سے کہا کہ سماج سے دہشت پسندی کے خاتمہ کے لئے

حکام وامراء پر عدل وانصاف کرنا لازمی ہے، رعایا پر ظلم کا خاتمہ اور ان کی ترقی کے لئے جدوجہد حکام کی ذمہ داری ہے اگر عدل نہ ہوگا تو ردعمل پیدا ہونا فطری ہے۔

انہوں نے یہی پیغام صدر ایران کو بھی دیا اور اپنی طویل تقریر میں سماج میں برپا کشیدگی، تشدد کے رجحانات کے سدباب پر روشنی ڈالتے ہوئے عدل کو ہر سطح پر نافذ کرنے اور اسلامی عدل کے مطابق اقدامات کرنے کا مشورہ دیا، تاکہ اسلام کے عدل اجتماعی کی برکتیں ہر طبقہ تک پہنچ سکیں۔

یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ عالم اسلام کے حکمرانوں کے مشیران ان سے تبادلہ خیالات واستفادہ کے لئے برابر ملتے تھے اور وہ سب کو اپنی درویشی اور استغنائی کیفیت کے ساتھ حکیمانہ انداز سے اسلام کے روشن زریں عدل کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے اور اس کی حکمتیں بھی بتاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عالم اسلام کے سفراء ان کی علالت کے طویل عرصہ میں ازخود ان سے ملاقاتیں کرتے رہے اور درپیش مسائل پر تبادلہ خیالات کو گفتگو کا خاص مرکزی نقطہ بناتے رہے۔

قاضی صاحب امن کے فروغ واستحکام کے موضوع پر اپنے مخصوص زاویہ فکر سے روشنی ڈالتے تھے، وہ تصادم وٹکراؤ، مظاہراتی سیاست اور طریقہ کار کو، بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی بھی ایسی پالیسی یا اقدار کو وہ سخت نقصان دہ تصور کرتے تھے جس سے ملک میں عدم استحکام اور طبقاتی آلودگی وتکدر پیدا ہو، وہ اپنی تعمیر آپ کرنے کے اصول کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے، ان کے فکری امتیازات میں متعدد اصول قابل ذکر ہیں:

(الف) اتحاد امت، (ب) وحدت انسانیت، (ج) خدمت خلق، (د) امن وسکون کے لئے عملی جدوجہد، (ہ) غیر تعمیری اقدامات سے گریز میں قدیم صالح اور جدید نافع سے استفادہ۔

عالم اسلام کے فقہاء وعلماء سے مسلسل ربط واستفادہ قاضی صاحب کا معمول

رہا۔ عالم عرب کی جامعات میں فقہی موضوعات پر ہونے والی تحقیقات کا وہ برابر جائزہ لیتے رہے۔ اس سلسلہ میں وہ کلیات شرعیہ اور شعبہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ سے نہ صرف مربوط رہے، بلکہ ملاقاتیں بھی کرتے رہے۔ ازہر کے سابق شیخ الازہر شیخ جادالحق سے قاضی صاحب کے گہرے تعلقات تھے۔ قاضی صاحب نے علماء ازہر کو عربی میں برجستہ خطاب کرتے ہوئے قرآن وسنت کا علم بلند کرنے اور وحدت وعدل کے قیام کے لئے اسلامی اصولوں کے اختیار کرنے پر اہمیت کے ساتھ زور دیا، قاضی صاحب مصر متعدد بار تشریف لے گئے، ہر بار مصری علماء سے اجتماعی وانفرادی طور پر انہیں خطاب کا موقع ملا۔

قاضی صاحبؒ جدہ فقہ اکیڈمی کے اجلاسوں میں تیاری وپابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے اور مقالہ کے ساتھ بحث میں بھی حصہ لیتے تھے۔ خواتین کے حقوق واختیارات سے متعلق وہاں پیش ہونے والی تجویزوں پر انہوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں ایسی شاہکار تحریر پیش کی جو صرف اور صرف ایک متقی خداترس فقیہ ہی پیش کرسکتا ہے اور قاضی صاحب کی مدلل تحریر پر تجویز دوبارہ ترمیمات کے بعد ایک دوسرے اجلاس میں پیش کی گئی، وہ افراد جو قاضی صاحب پر اعتراضات گڑھتے ہیں ان کے لئے یہ بات بڑی حیرت واستعجاب کی ہوگی، لیکن اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ حق کے معاملہ میں انہوں نے کبھی مداہنت ومجاملت کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

تہران میں صدر ایران کے سامنے اپنی برجستہ عربی تقریر میں یہ بات ایرانیوں سے کہی کہ وہ پڑوس کی مسلم ریاستوں کے مسائل کے حل میں دل کھول کر مدد کریں اور آگے بڑھیں۔

انہوں نے ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اسلام کے تصور مساوات، حقوق انسانی، اخوت ورواداری، انصاف کے اصولوں کی وسیع پیمانہ پر تشہیر وتوضیح کریں، تاکہ

دعوت کی راہ ہموار ہو۔

عالم اسلام اور عالم عرب کی نمایاں ترین دینی وعلمی شخصیتوں سے قاضی صاحبؒ کی اہم موضوعات پر گفتگو ومراسلت آخر آخر وقت تک جاری رہی اور ہر بار وہ کسی دینی وفقہی مسئلہ پر ہی لکھتے یا بات کرتے تھے، ان کا جو میدان تھا اس وسیع میدان میں وہ فقہی اصولوں کی روشنی میں امت کے مسائل کے بارے میں شب وروز سوچا کرتے تھے۔

☆☆

قطعہ

وہ امام کارواں تھا دہر میں عالی مقام
فقہ کی تخریج میں ہے سب سے آگے جس کا نام
اتحاد باہمی کا دے گیا وہ درس عام
اے مجاہد خلق ڈھونڈے گی تجھے اب صبح وشام

☆☆

قطعہ

فقہ کا تھا پیشوا علم کا کوہ گراں
قوم وملت کا تھا مخلص وہ مسیحا بیگماں
تیری رحلت سے گئی ہے رونق بزم جہاں
پروانہ آئین فطرت تجھ کو نہ اب پائیں گے یاں

☆ محمد واصف نفیس مظاہری

☆☆

حضرت قاضی صاحبؒ ولادت سے وفات تک

● زبیر احمد ندوی

حضرت قاضی صاحبؒ کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور ہشت پہلو تھی، بیسویں صدی کے نصف آخر کی اسلامی تاریخ پر ان کے اثرات اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر ہر تاریخ ادھوری رہے گی، خواہ فقہ اسلامی کی تاریخ ہو یا علوم اسلامی کی یا تحریکات اسلامی کی، عالم اسلام کے ہر خطہ کو عموماً اور ہندو پاکستان کے ہر خطہ کو خصوصاً اور زندگی کے ہر میدان کو انہوں نے کم وبیش متاثر کیا۔

امارت شرعیہ میں آپ کا تقرر اور خدمات:

اس زمانہ میں جامعہ رحمانی مونگیر کی رونق حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ذات سے تھی جنہیں اللہ تعالیٰ نے جوہر شناسی کا خوب ملکہ عطا فرمایا تھا۔ جب ان کا انتخاب امیر شریعت رابع کی حیثیت سے ہوا اور حضرت قاضی صاحبؒ کی دینی وعلمی اور تحقیقی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں جن سے امیر شریعت رابع بہت زیادہ متاثر ہوئے تو انہوں نے اس جوہر قابل کو امارت شرعیہ میں افتاء وقضاء کے معاملات دیکھنے کے ساتھ ساتھ امارت شرعیہ کی تعمیر نو کے لئے پٹنہ بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے بڑی محنت اور جانکاہی کی زندگی شروع کی اور اپنے مخلص ترین رفقاء کے ساتھ امارت شرعیہ کی تعمیر وترقی میں لگ گئے اور پھر امارت شرعیہ ان کی زندگی اور امارت شرعیہ کی آبرو بن گئے۔ چنانچہ وفات کے وقت نائب امیر شریعت کے

منصب پر فائز ہوگئے۔ انہوں نے جتنے انقلابی اقدامات کئے ان سب میں امارت شرعیہ جاگزیں تھی، اس لئے ان کے قائم کئے ہوئے تمام ادارے امارت شرعیہ کی فکری توسیع کا سرچشمہ ہیں۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے امارت شرعیہ میں اپنی زندگی کے تقریباً ۴۰ سال بسر کئے۔ زندگی کے اس حصہ میں انہوں نے بہت سارے عظیم کارنامے انجام دئے، ان میں ایک بڑا کارنامہ دارالقضاء کا قیام ہے۔ انہوں نے ہزاروں معاملات کے فیصلے کئے اور نظام امارت کا جز بن کر اندرون صوبہ اور بیرون صوبہ ہزاروں تقریریں کیں، ملک کے دوسرے صوبوں میں امارت شرعیہ کے قیام کی جدوجہد کی۔ ان کی کوشش تھی کہ پورے ملک میں مسلمانوں کے دیوانی مقدمات کے فیصلوں کے لئے شرعی عدالتیں قائم کردی جائیں، تاکہ نہ انہیں زیر بار ہونا پڑے اور نہ ہی زیادہ پریشانیاں اٹھانی پڑے۔ لہٰذا انہوں نے صرف اسلامی قوانین کی تدوین کی، اس موضوع پر کتابیں لکھیں، بلکہ اس کا عملی تجربہ بھی کیا اور قاضی کا لقب ان کے نام کا کچھ ایسا حصہ بن گیا کہ وہ قاضی صاحب کی حیثیت سے ہی مشہور ہوگئے اور قاضی صاحب کے لفظ سے ہر خاص وعام کا ذہن مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی طرف ہی منتقل ہوتا تھا۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے امارت شرعیہ کو ایک نہایت معتبر اور باوقار ادارہ بنانے میں بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ امارت شرعیہ کا سجاد، ہاسپیٹل المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء اور متعدد ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بلاشبہ قاضی صاحبؒ کی کوشش کا کرشمہ ہیں۔

چاردہائیوں پر محیط اس عبقری شخصیت کی کارکردگی مختلف جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا سرسری احاطہ کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ''عام انسانوں کے دماغ کی ایک کھڑکی کھلی ہوتی ہے مگر مجاہد الاسلام کے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں'' حضرت قاضی صاحبؒ کی شخصیت میں ایسی نوع بنوع صلاحیتیں موجود تھیں کہ وہ ہر محاذ پر میر کارواں بن جاتے تھے۔ ایسا محسوس

ہوتا کہ الگ الگ تحریک وتنظیم کے مسند پر ایک ایک مجاہدالاسلام بیٹھا ہوا ہے اور ایک غیر مرئی قوت ان سب کو کنٹرول کررہی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ علم کے آفتاب ومہتاب تھے جس کی شعاعیں ہندوبیرون ہند میں پھیلی۔ ان کی فراست اوران کا علم کسی ایک گوشہ تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ صحیح معنی میں علم کے سمندر اور محیط العلم تھے، وہ عظیم مفکر اردو، عربی اور فارسی سمیت دیگر درجنوں زبانوں کے اسکالر، عظیم المرتب محدث، بے مثال فقیہ، متبحر عالم تھے، خاص طور سے اسلامی فقہ اور فقہی مسائل پر آپ کو عبور وتبحر حاصل تھا اور اس سلسلے میں ملک وبیرون ملک، کوئی شاید ہی ان کی ہمسری کا دعویٰ کرنے کا اہل ہوگا وہ بلاشبہ فقیہ العصر تھے، اسی لئے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ: مسلم پرسنل لا بورڈ کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے مجاہدالاسلام جیسا دور اندیش مدبر وفقیہ ملا ہے۔''

اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام اور اس کے کارنامے:

حضرت قاضی صاحبؒ کا سب سے پسندیدہ موضوع فقہ تھا۔ ان کی فقاہت کو دنیا نے تسلیم کیا، اس لحاظ سے وہ جس مقام ومرتبہ کے حامل تھے اس کا حق تھا کہ جدید شرعی اور فقہی مسائل میں امت کی رہبری ورہنمائی کے لئے وہ کوئی قدم اٹھاتے، چنانچہ ان کے اس ذوق ومزاج کے مطابق ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کا بنیادی خاکہ ۱۹۸۹ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجتماع کے موقع پر ان کی قیادت میں چند باحوصلہ نوجوان علماء نے حیدرآباد میں تیار کیا تھا، لیکن اس وقت مولانا بدرالحسن قاسمی صاحب نزیل کویت کی تجویز پر نام ''مرکز البحث العلمی'' رکھا گیا تھا اور جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے چند نئے پیدا شدہ مسائل سے متعلق سوالات کے جوابات، گویا اس کا پہلی تحقیقی کارنامہ تھا، لیکن دہلی میں ''انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز'' کے قیام کے بعد ہی یہ خواب پورے طور پر شرمندہ تعبیر ہوسکا اور

باقاعدہ طور پر ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام حضرت قاضی صاحبؒ کا ایک عظیم کارنامہ ہے جو ان کے بے مثال رہنمائی اور انتھک جدوجہد کی وجہ سے ایک تناور ہی نہیں گل افشاں اور بارآور درخت کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس پلیٹ فارم کی ندرت یہ ہے کہ جدید مسائل کا شرعی حل تلاش کرنے کے لئے علماء اور اصحاب افتاء کے شانہ بشانہ علوم عصریہ کے ماہرین بھی دکھائی دیتے ہیں۔ فقہ اکیڈمی نے علماء اور طلبا میں بحث وتحقیق کا مزاج پیدا کیا اور سیمیناروں میں ان مسائل پر جس طرح بحثیں ہوئیں اس نے مدارس میں تبدیلی پیدا کی، فقہ کی طرف ذہن راغب ہوا اور نئی نسل میں بھی یہ احساس جاگا کہ کسی طرح ہمارے قدیم علماء واصحاب افتاء کس قدر محنت اور اخلاص ولگن سے جدید مسائل کا حل تلاش کرتے تھے، فقہ اکیڈمی کی صدا نے اس سناٹے پر ضرب لگائی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کی شہرت ہندوستان میں ہی نہیں، ہندوستان سے باہر بھی ہے اور اس کے کارناموں کا عالم عرب کی نامور شخصیتوں نے بھی دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور اس کے کارہائے نمایاں اپنی کمیت وکیفیت دونوں لحاظ سے عرب اور اسلامی دنیا کے مشابہ اکیڈمیوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

عالم اسلام کے نامور فقیہ مولانا محمد تقی عثمانی، کویت میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے ذمہ دار اعلیٰ ڈاکٹر خالد المذکور، شام کے نامور فقیہ اور متعدد انسائیکلوپیڈیا کے مؤلف ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، اسلامی آرگنائزیشن کانفرنس کی نمائندہ فقہ اکیڈمی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر الحبیب ابن الخوجہ، شام کے مشہور فقیہ اور درجنوں انسائیکلوپیڈیا کے مصنف ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی، بغداد کے معروف محقق ڈاکٹر محروس المدرس اور قطر کے شیخ عبدالرحمٰن آل محمود نے نہ صرف اسلامی فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں شرکت کی ہے، بلکہ اس کے طریقۂ کار اور منہج کو سراہا بھی ہے اور دوسرے اداروں کو اس کا طرز اختیار کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔

اکیڈمی کی جانب سے ۲۰۰۱ء تک ملک کے مختلف صوبوں میں تیرہ فقہی سیمینار منعقد ہوئے جن میں ملک وبیرون ملک سے شریک نمائندہ علماء نے دوکانوں کی پگڑی، لائف انشورنس، بینک کی ملازمت، پراویڈنٹ فنڈ، پلاسٹک سرجری وغیرہ جیسے چالیس سے زائد جدید مسائل ومشکلات پر غور وخوض کرکے اجتماعی فیصلے کئے جو ایک عظیم فقہی سرمایہ ہے اور اجتماعی طور پر فقہی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی بہترین مثال ہے۔ نیز جدید اکیڈمی کی طرف سے طلبہ مدارس کے لئے متعدد تربیتی کیمپ، فقہی مذاکرات اور جدید موضوعات پر لکچرس کرائے گئے۔ مؤرخ جب علمی وفقہی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ فقہ اکیڈمی کی وقیع خدمات کو فراموش نہیں کرسکے گا۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے ان کارناموں کے علاوہ حضرت قاضی صاحبؒ کی عظمت وعبقریت اور اسلامی فقہ اکیڈمی کی کامیابی کی ایک بڑی دلیل نوجوان علماء کی وہ کھیپ ہے جو قاضی صاحب نے تیار کردی ہے، جس کی دلچسپی درسی کتابوں کے شروح وحواشی سے آگے نہ تھی، لیکن اب وہ قاضی صاحب کے فیض نظر سے نہ صرف مؤلف اور مقالہ نویس بن گئے ہیں، بلکہ وہ ہر فقہی مسئلہ پر خوب داد تحقیق بھی دے سکتے ہیں اور دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے علمی وفقہی سیمینار اور کانفرنس میں آسانی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ یقیناً حضرت قاضی صاحبؒ کی فقہی بیداری کی تحریک کا براہ راست یا بالواسطہ اثر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی صاحبؒ کی فکر اتحاد اور ملی کونسل کا قیام وکارنامہ:

حضرت قاضی صاحبؒ نے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی زندگی میں اپنی زندگی کی سیاسی اور قائدانہ انفرادیت کو حضرت امیر شریعت میں گم رکھا اور کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے لئے کوئی مستقل قائدانہ مقام بنائیں، لیکن حضرت امیر شریعت کے

انتقال کے بعد سے انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کے میدان میں پائے جانے والے خلا کو اپنی بے مثال شخصیت اور غیر معمولی صلاحیتوں سے بہت جلد پر کردیا۔

حضرت قاضی صاحبؒ اتحاد و اتفاق کے علمبردار تھے۔ وہ پوری امت مسلمہ کو جسد واحد تصور کرتے تھے اور اس کے لئے سعی پیہم کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے آل انڈیا پیمانہ پر مسلمانوں کے مسائل کو مؤثر طور پر پیش کرنے کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے پیش نظر اور وحدت کلمہ کی بنیاد پر ملت کی تمام سرکردہ تنظیموں اور افراد کو باہم مربوط کرنے کے لئے ۱۹۹۲ء میں ملی کونسل کی داغ بیل ڈالی، جس میں ملک گیر سطح پر مختلف صلاحیتوں کو جمع کیا اور مختلف میدان کار میں ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس پلیٹ فارم سے انہوں نے اتحاد ملت کے اپنے اسی درس کو پوری قوت کے ساتھ دوہرایا جس درس کو انہوں نے امارت شرعیہ سے اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی کتاب زندگی سے سیکھا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ بحیثیت خیر امت اس ملک میں مسلمانوں کو کلمہ کی بنیاد پر کھڑا کرنا ہے اور جوڑنا ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ ملت کا سب سے بڑا مسئلہ شعور ذات کا مسئلہ ہے۔ یہ امت اپنے کو پہچانے، اپنے منصب کو پہچانے اور اس کے مطابق اپنی ذمہ داریاں پوری کرے، جس وقت یہ امت اپنے کو پہچان لے گی اور دنیا کو یہ باور کرادے گی کہ اس کا سودا محال ہے، اس وقت امت کا مسئلہ قابو میں آجائے گا۔

آل انڈیا ملی کونسل کے قیام کے کچھ ہی عرصہ بعد، ہندو انتہاء پسندی میں اضافہ، ہندو تنظیموں کی طرف سے شدت پسندی، بابری مسجد کے انہدام اور اس کے بعد بڑے پیمانہ پر مسلم کش فسادات نے ثابت کردیا کہ قاضی صاحبؒ کا اقدام بروقت و برمحل اور انتہائی بصیرت پر مبنی تھا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آل انڈیا ملی کونسل ٹاڈا قانون کی تنسیخ، انتخابی سیاست میں مسلمانوں کا ووٹ متحد کرنے، نیز دینی و عصری تعلیم میں ان کو آگے بڑھانے اور کسی بھی سیاسی و مذہبی مسئلہ اور مسلم مخالف کارروائیوں پر حکومت کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں جتنا مؤثر قدم اٹھایا وہ کسی اور ملی تنظیم کی طرف سے نہیں اٹھایا جاسکا۔

آل انڈیا ملی کونسل کا سب سے خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس میں مذہبی عصبیت اور گروہی یا علاقائی تفرقہ اندازیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس وقت ہندو انتہا پسندی کے فروغ و ترقی سے جس قدر خطرناک اور طاقتور چیلنجز کا سامنا ہے، اس کے مقابلہ کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موزوں تجویز نہیں ہوسکتی کہ تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع اور متحد کیا جائے اپنے وجود و بقا کی جنگ مشترکہ طور پر لڑی جائے۔

آل انڈیا ملی کونسل کو دوسری تنظیموں کے مقابلہ میں ایک برتری یہ بھی حاصل ہے کہ اس کے اصولوں میں درپیش مسائل ومشکلات کے حل کے لئے صرف احتجاج اور پروٹسٹ کرنے یا منانے اور بند یا دھرنا دینے کے طریقہ پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایک طرف مسلمانوں میں حقیقی دینی و مذہبی بیداری پیدا کرنے اور ان کے تعلیمی و معاشی سطح کو بلند کرنے کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں، تو دوسری طرف قانونی و دستوری اور جمہوری جنگ پر زور دیا گیا ہے اور ہر گاؤں، علاقہ اور خطہ میں قانونی سیل قائم کرنے اور ظلم و استبداد کے شکار مسلمانوں تک بروقت قانونی مدد پہنچانے اور ان کے مسائل ومشکلات کو ایک قومی مسئلہ کی طرح اٹھانے پر زور دیا گیا ہے۔

دینی تعلیم کی طرف توجہ اور مدارس اسلامیہ کونسل اور وفاق المدارس کا قیام:

حضرت قاضی صاحبؒ دینی تعلیم کا معیار بہتر بنانے، اس کے نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح و ترقی، مدارس کے تحفظ اور انہیں حکومت کی یورش سے بچانے کے لئے برابر فکر مند رہتے تھے۔ بہار واڑیسہ کے متعدد مدارس کے وہ سرپرست بھی تھے۔ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی سربراہی میں غیر سرکاری مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کا

معیار بلند کرنے کے لئے آزاد دینی مدارس بورڈ قائم ہوا تو قاضی صاحبؒ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان ہی کی کوششوں سے مدارس اسلامیہ کونسل اور وفاق المدارس الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور آپ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

عصری تعلیم کا فروغ:

دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کی طرف بھی ان کی توجہ رہی۔ چنانچہ اپنے وطن جالہ میں ایجوکیشنل کیمپس قائم کیا جس میں پرائمری اسکول سے لے کر ڈگری کالج اور ٹیچرس ٹریننگ کالج تک ہر سطح کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت ایک اقامتی انگلش میڈیم ہائی اسکول وہاں چل رہا ہے۔ امارت شرعیہ کے زیر انتظام اس کے مرکز میں ''مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ'' اور بعض دوسرے اضلاع میں کئی ٹیکنیکل ادارے انہی کی کوششوں سے قائم ہوئے۔ جہاں سے ہزاروں طالب علموں نے عصری تعلیم حاصل کر کے روزگار حاصل کی اور اب بھی حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت قاضی صاحب ایسے ادارے قائم کرنے اور ان کے لئے وسائل وذرائع فراہم کرنے کی برابر تاکید فرماتے رہے اور تاحیات خود بھی اس کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ کی تحریک سے ہی ''امارت شرعیہ'' کے زیر نگرانی ''مولانا سجاد میموریل ہسپتال قائم ہوا جس سے غریب ونادار لوگوں کی طبی سہولتیں میسر آرہی ہیں اور لاعلاج امراض میں مبتلا ہزاروں افراد شفایاب ہو رہے ہیں۔

المعہد العالی کا قیام اور اس کے مقاصد:

حضرت قاضی صاحبؒ نے قضاء کا منصب سنبھالا تو ایک غیر مسلم اکثریت والے ملک میں ہوتے ہوئے بھی اس منصب کو بے پناہ وقار واعتبار عطا کیا اور اپنے فیصلوں سے ججوں کے فیصلوں کو بھی مات کر دیا۔ پھر تصنیفی طور پر اسلام میں قضاء کے مقام اور قاضی کے

منصب کی وضاحت کی اور ''اسلامی عدالت'' نامی کتاب لکھی اور جگہ جگہ دارالقضاء کے قیام کی تحریک چلائی۔ ''المعہد العالی'' کے قیام کا پس منظر اور مقاصد بیان کرتے ہوئے حضرت قاضی صاحبؒ رقم طراز ہیں۔

''غرض یہ کہ سلف کی وراثت خلف کی طرف منتقل کرنا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے، آج جو قحط الرجال نظر آتا ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ بزرگ گزرتے رہے اور نئی نسل میں ان کی وراثت منتقل نہیں ہوئی، نتیجہ یہ ہے کہ ہر میدان میں ایسا خلا پیدا ہوا کہ اس کا پُر ہونا مشکل ہے اور شاید علم اور فضل وکمال سینوں سے سلب نہیں کئے جاتے ہیں، بلکہ اہل علم اور اصحاب فضل وکمال کے اپنی وراثت منتقل کئے بغیر گزر جانے سے علم وفضل کا انحطاط ہوتا ہے۔ اس کی طرف خود جناب رسول اللہ ﷺ نے ''**ولکن یقبض العلم بقبض العلماء**'' میں اشارہ فرمایا ہے۔''

بہر حال اس دور کا اہم ترین کام یہ ہے کہ جدید نسل کے ہونہار نوجوانوں کو تربیت دے کر حال اور ماضی کے اصحاب فضل وکمال کا وارث بنایا جائے۔ یہ وہ فکر ہے جو اول یوم سے ہم لوگوں کے سامنے رہی ہے۔ اولاً غیر رسمی طور پر ملک کے مختلف مقامات پر تربیتی کیمپ کا انعقاد اور دوسرے دارالقضاء ودارالافتاء میں نوجوانوں باصلاحیت فضلاء کو رکھ کر انہیں علمی، نظری وفکری اور عملی تربیت دینے کا نظام عرصہ سے جاری ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہی تصور ''**المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء**'' کی تاسیس کا باعث بنا، اس کا مقصد فقہ کے بحر ناپیدا کنار کی شناوری، اصول استنباط، قواعد وضوابط فقہ، مقاصد شریعت، مناہج استنباط، اصول ترجیح اور جدید حالات میں احکام شرعیہ کی تطبیق، نیز جدید نظامہائے قانون اور اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ ہے، تاکہ ہمارے فضلاء اس عہد کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے اہل ہوں اور عہد حاضر کے سوالات حل کرنے کے لائق ہوسکیں۔

''المعهد العالی'' میں داخل ہونے والے فضلاء کی دوسالہ تعلیم کے دوران نہ صرف یہ کہ انہیں جدید مسائل کی تخریج اور پیش آمد مسائل کے حل اور فتویٰ نویسی کی تربیت دی جاتی ہے، بلکہ مختلف علمی فقہی موضوعات پر تحقیق بھی کرائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام کے عدالتی نظام کے عملی طریقوں سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ قضاء کے مختلف مسائل کی نظری تعلیم اور عملی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ امارت شرعیہ کا نظام قضاء انتہائی مربوط ومنظّم اور وسیع بنیادوں پر قائم ہے جہاں روزانہ نئے مقدمات کی سماعت اور فیصلے ہوتے ہیں اور اس کے پاس شرعی فیصلوں کا ۸۰ سالہ عظیم الشان فقہی ذخیرہ بھی محفوظ ہے جس سے یہ فضلاء فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆☆

آہ فقیہ زمانہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

● محمد ارشد فاروقی

قاضی صاحب کی زیارت وملاقات کا سب سے پہلے شرف مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند میں حاصل ہوا جب میری عمر چودہ سال کی تھی اور جدہ سے شائع ہونے والے ''المدینہ'' اخبار کے ایڈیٹر بھی تشریف فرما تھے اور فقہ حنفی کی خصوصیت وجامعیت اور وقت ضرورت دوسرے مسلک پر عمل کی حیثیت موضوع بحث تھا۔ طرز گفتگو اور مضبوط وقیع دلائل نے مصری عالم شیخ ابراہیم کو بہت متاثر کیا وہ بار بار قاضی صاحب کی پررونق پیشانی پر بوسہ ثبت کرتے اور تعریف وتوصیف کے کلمات فرماتے۔

جب جشن صدسالہ دارالعلوم کے موقع پر قاضی صاحب نے کچھ اہم عرب مقررین کی تقاریر کی سلیس وادیبانہ ترجمانی فرمائی تو اردو کے ادباء عش عش کرتے رہ گئے اور کہنے لگے ابھی تک ہم نے عربی زبان ہی میں رعب ودبدبہ اور گھن گرج سنی تھی آج اردو میں بھی دیکھ لیا۔

پھر تو قاضی صاحب سے استفادے کے مواقع دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے زمانہ قیام میں بارہا ملتے رہے، کیونکہ وہ وقفہ بہ وقفہ تشریف لائے۔

قاضی صاحب کی رفاقت میں لکھنؤ سے باندہ قاری صدیقؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ درمیان سفر راقم السطور نے فقہی سوالات شروع کردیا دوران استفسار درجنوں فقہی کتب کے حوالے جمع ہوگئے جیسے ہی ہم لوگ قاری صدیق صاحبؒ کے مدرسہ میں داخل ہوئے قاضی صاحب نے ناظم کتب خانہ سے وہ ساری کتابیں طلب فرمائیں اور مجھے چائے نوشی سے قبل

ہی مطلوبہ مقامات تلاش کرنے کا حکم دیا وہ خود بھی متوجہ رہے۔

ہم نے بزرگوں میں حضرت علامہ انور شاہؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے متعلق ضرور سنا ہے کہ وہ حد درجہ مطالعہ کے عادی تھے، لیکن دیکھا صرف قاضی صاحب کو جیسے وہ خود مطالعہ کے پابند تھے وہ دوسروں کو بھی مطالعہ کا عادی بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بعد حوادث ونوازل یا نت نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے سلسلہ میں اجتماعی مذاکرہ ومباحثہ (احوال زمانہ کے مطابق) کی بنیاد قاضی صاحب نے ڈالی اور ۱۲ علمی وفقہی عالمی سیمینار منعقد کرائے جن میں دنیا بھر کے مفتیان کرام علماء عظام نے شرکت فرمائی اور درجنوں مسائل کے حل تجویز کئے۔ ان سیمیناروں کی تجاویز کے حوالے عالم اسلام کی عدالتوں میں دئے گئے، وہ سیمیناروں کے انعقاد کے لئے بڑی کدوکاوش فرماتے، ہر فن کے ماہرین کو جمع کرتے، متعلقہ کتابوں کو دور دراز مقامات اور ملکوں سے منگاتے، عالم اسلام کے ممتاز علماء، فقہاء اور دانشوروں کو مدعو کرتے، نوجوان ہونہار فضلاء مدارس کو ہمت افزائی اور تربیت کی خاطر بلاتے ان کے مقالات پر حوصلہ افزائی فرماتے، ان کی کرم فرمائی کا ثمرہ تھا کہ پہلے دوسرے سیمینار میں بیس تیس مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے اور بارہویں کے لئے اسی سے متجاوز، عالم اسلام کے مشہور فقیہ شیخ وہبہ زحیلی قاضی صاحب کی دعوت پر سیمینار میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور قاضی صاحب کی فقاہت وسعت مطالعہ دقت نظر اور یقین محکم سعی پیہم اور علومیت اور جرأت سے بے حد متاثر ہوئے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کی دعوت پر جب کویت کا مؤقر وفد علماء پر مشتمل سیمینار میں شرکت کے لئے آیا تو قاضی صاحب کی خدمت میں ان کی فقہی خدمات کے اعتراف میں ”تمغہ امتیاز“ پیش کیا۔

قاضی صاحب مسائل کی تہ میں اتر کر حل نکالنے میں کامیاب ہو جاتے۔ جے پور میں فقہی سیمینار کے موقع پر مقامی مسئلہ سحر کا آخری وقت درپیش تھا۔ مدعو ممتاز علماء اور مقامی

فقہاء ٹونک اپنے موقف کے دلائل پیش کر رہے تھے۔ راقم سطور کتابوں کی اوراق گردانی کر کے حوالے دکھا رہا تھا، صورت مسئلہ یہ تھی کہ عام مساجد کے مؤذنین رائج کمپیوٹر نقشہ کے مطابق اعلان کرتے کہ وقت سحر ختم ہونے میں بیس منٹ باقی ہیں۔ دوسری مساجد سے اعلان ہوتا وقت ختم ہو گیا ہے یہی سلسلہ سالوں سے جاری تھا اس کے حل کے لئے قاضی صاحب فکر مند ہو گئے اور مباحثہ شروع ہو گیا مجھے حیرت واستعجاب اس وقت ہوا جب دوران بحث قاضی صاحب نے مقابل عالم کا ایک جملہ سے: ”اولی یہ ہے کہ ایک سدس وقت باقی رہے کھانا پینا ترک کردئے“، قاضی صاحب نے اسی جملہ پر فیصلہ فرمادیا جب صرف اولیت کی بات ہے تو جو چاہے اس پر عمل اور جواز کا دروازہ آخری وقت تک کھلا ہوا ہے۔ سالہا سال قدیم نزاعی مسئلہ لمحوں میں حل ہو گیا، یہ اور ان جیسے بیشتر مسائل قاضی صاحب کی دقت نظر کے بین ثبوت ہیں۔ قاضی صاحب دردمند دل کے ساتھ فکر ارجمند رکھتے تھے، جب انہوں نے غیر متناہی الجھے ہوئے قومی مسائل دیکھے اور مسلم جماعتوں کو ان کے سلجھانے میں ناکام نہیں تو ناکامی ضرور پایا اور خاص طور پر مسلم مجلس مشاورت کے تارو پود کو بکھرتا دیکھ کر بے چین ہو گئے، پھر کیا تھا بے چینوں کی تلاش وجستجو میں بھی بے چین رہنے لگے اور پورے ملک سے ایک قافلہ ڈھونڈ نکالا جس کی صدارت مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے فرمائی اور آل انڈیا ملی کونسل کے قیام کا اعلان ہوا۔ مولانا علی میاں نے فرمایا ان مقاصد کے حصول کے لئے مسلم مشاورت قائم ہوئی تھی، لیکن وہ ابتدائی کامیابیوں کے باوجود رفتہ رفتہ اپنی وقعت کھو بیٹھی اس لئے اب بجائے مردہ جسم میں روح پھونکنے کے ملت کے چیدہ افراد پر مشتمل کارواں کو از سر نو آگے بڑھایا جائے، وہ ملی کونسل کے بارہ شعبہ جات کے سربراہ وسکریٹری جنرل آخر دم تک رہے اور کامیاب اقدامات کرتے رہے، یہ الگ بات ہے کہ وسائل واسباب کی کمی وفقدان کے باعث مقررہ نشانے پورے نہ ہوسکے، ایسے اسباب کا مہیا کرنا بسا اوقات حکومتوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔

قاضی صاحب جری و بے باک بھی حد درجہ تھے اور ''کلمۃ حق عند سلطان جائر'' کے بھر پور مصداق، جب مسلم پرسنل لا بورڈ کا نمائندہ وفد بابری مسجد کی شہادت کے بعد وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ سے ملا تو قاضی صاحب نے جرأت مندانہ اسلوب میں برملا فرمایا ''راؤ جی دو بات میں سے ایک ضرور ہے یا تو آپ نے دانستہ طور پر کارسیوکوں کو مسجد مسمار کرنے کی چھوٹ دی ہے یا آپ نے کلیان حکومت سے دھوکہ کھایا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں آپ وزارت عظمیٰ کی اس کرسی کے لائق نہیں۔ آپ استعفیٰ دیں، لیکن وہ بھی حد درجہ عیار و مکار ان سخت و تلخ جملوں کو پی گیا۔

قاضی صاحب کی ادارت میں علمی، فقہی، تحقیقی اور دستاویزی سہ ماہی مجلّہ ''بحث و نظر'' جاری ہوا اور کچھ ہی دنوں میں برصغیر کے ممتاز ترین مجلوں میں شمار ہونے لگا کوئی اسے فرد فرید کہتا کوئی یکتا و یگانہ۔

قاضی صاحب سادگی میں ضرب المثل اور اسلاف کا نمونہ تھے، کھانے پینے اور لباس میں بھی سادہ، زندگی کے ہر شعبہ میں سادہ دکھائی دیتے وہ زاہدانہ انداز رکھتے تھے وہ بلندیوں کے آسمان پر ہوتے ہوئے بھی عبدیت کے اظہار سے نہ تھکتے، ایک مرتبہ موسم سرما میں فائیو اسٹار ہوٹل میں تشریف فرما تھے کچھ متمول احباب کی موجودگی میں فرمانے لگے آج ہم نے یہ قیمتی اولیٰ سوٹر پہن رکھا ہے ہمیں خوب یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں انتہائی معمولی سوئٹر بھی نصیب نہ ہوتا۔

ارباب مدارس کے لئے قابل تقلید اور باعث احتساب قاضی صاحب کی زندگی کا یہ واقعہ ہے کہ امارت شرعیہ کی عمارت کی تکمیل کے لئے فراہمی زر کی اپیل کلکتہ میں کی گئی ایک صاحب خیر پانچ لاکھ کی خطیر رقم لے کر آئے اور پیش کرتے ہوئے کہنے لگے یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ قاضی جی نے فوراً واپس کر دیا معطی نے باصرار تملیک وغیرہ کی صورتیں اختیار کرنے کا مشورہ دیا پر قاضی جی نے اپنا فیصلہ نہ بدلتے ہوئے رقم واپس فرما دیا۔ یہ مقام عبرت ہے

ذمہ داران مدارس کے لئے قاضی صاحب کے طالب علمی کی بھی مثال ملنی مشکل ہے۔ استاذ محترم مولانا ہاشم بخاریؒ فرماتے ہیں ''عزیزم مجاہد جیسے طالب علم بنو جواب قاضی القضاۃ کے بلند منصب پر فائز ہے، وہ اس قدر انہماک سے مطالعہ نودرہ میں کیا کرتے کہ بالائی منزل میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اور دیگر مشہور علماء کی تقریریں بھی ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر پاتیں اور کبھی کسی نے اگر شرکت کا مشورہ دیا تو صاف جواب دیتے کہ یہ پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا وقت ہے، تقریر پھر کبھی سن لیں گے۔

عالم اسلام کی مایہ ناز ہستی نامور شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ قاضی صاحب سے قریبی تعلق رکھتے اور دیار حبیب ﷺ کے سفر میں ملاقات میں پہل فرماتے، ہم خوردوں کو مشورہ دیتے کہ (اغتنموا الشیخ القاضی) قاضی صاحب کو غنیمت سمجھئے۔

قاضی جی نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب، مفکر اسلام ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ، حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ جیسے آفتاب و ماہتاب سے کسب فیض کیا اور حضرت قاری صدیق صاحبؒ جیسے صاحب نسبت بزرگ کی توجہ و محبت کا مرکز بنے رہے۔

بلاشبہ قاضی صاحب نے اپنے علمی صاف شفاف ذوق کے نتیجہ میں ہزاروں جواں سال علماء کو علمی و تحقیقی میدان میں لا کھڑا کر دیا۔ ان میں سب سے ممتاز و منفرد عالم و فاضل فقیہ و مصنف، محقق، مدقق محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں جو ان کے بھتیجے ہیں اور حضرت مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم اور حضرت مولانا محمد عبیداللہ اسعدی شیخ الحدیث جامعہ ہتھورا باندہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

قاضی جی کا مدارس سے بہت گہرا تعلق تھا ان کے معمولی کمروں کو معیاری ہوٹلوں پر ترجیح دے کر قیام فرماتے، جب کسی مدرسہ میں تشریف لے جاتے تو طلبا حیران و ششدر رہ جاتے، کیونکہ وہ ہر طالب علم سے اس کے درجہ کے مطابق سوالات کرنے لگتے اور اگر کوئی

ذہین طالب علم مل جاتا تو اس کی حوصلہ افزائی فرماتے، مفید مشورے سے نوازتے۔

وہ مشرقی یوپی کی مشہور درسگاہ مدرسہ بیت العلوم کے سالانہ جلسہ میں بھی تشریف لائے۔ حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ کی اصلاحی مساعی کے بہت قدرداں اور ان کی نسبت عالی سے بہت متاثر تھے۔

ادھر جب مفتی عبداللہ صاحب نائب ناظم کی طرف سے دعوت جاتی تو خوش ہوتے، دعائیں دیتے اور راقم سطور سے بارہا فرمایا کہ دل بہت چاہتا ہے کہ شرکت کروں، لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔

قاضی جی ہمہ جہت صفات کے جامع اور متنوع شخصیت کے حامل تھے وہ ممتاز بلند پایہ عالم دین، نامور فقیہ، ادیب وخطیب، ماہر تعلیم زاہد وصوفی منش انسان تھے ان کا وصف امتیازی ان کی جامعیت تھی، جب کسی مجلس میں ہوتے تو وہ صدر محفل اور شمع انجمن ہوتے اور لوگ پروانہ وار انہیں گھیر لیتے، ان سے رجوع کرتے اور میر مجلس بناتے: ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

خطرہ اس بات کا ہے کہ ان کی یہ جامعیت سوانح نگاروں اور مؤرخین کے لئے حجاب نہ بن جائے، مؤرخین کا قلم ہمیشہ سے اپنے ممدوح کو کسی ایک خانہ میں فٹ کرنے اور اہل کمال کی کسی ایک صف میں جگہ دینے کا عادی رہا ہے، لیکن جب ایک شخصیت مختلف خانوں میں جگہ پانے اور اہل کمال کی ہر صف کی زینت بننے کی اہلیت رکھتی ہے تو بعض اوقات وہ حیرت کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں اور اس کی صحیح جگہ اور مقام متعین کرنے سے قاصر رہتے ہیں، قاضی صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ جیسے طبقہ علماء میں محبوب تھے ویسے ہی جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی حد درجہ پسندیدہ تھے۔ ایک تقریر میں مولانا سعید الرحمٰن ندوی مہتمم ندوہ لکھنؤ نے فرمایا تھا: اگر قاضی صاحب کسی اسلامی ملک میں ہوتے تو یقیناً چیف جسٹس ہوتے۔

البتہ آزاد خیال طبقہ میں ان کی مقبولیت واحترام بعض متشددین کے لئے باعث پریشانی ومحرک تنقید ضرور بنا، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا عمل شیخ سعدی کی تعلیم:

درویشی صفت باش وکلاہ تتری دار

دیکھا گیا کہ زندگی کے آخری ایام میں ان کے دل ودماغ دونوں پر حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ کا گہرا اثر تھا اور فساد احمد آباد وتباہی گجرات سے بے چین ہیں، میڈیا کے ذریعہ دل دہلا دینے والے قتل وغارت گری انسان کے ہاتھوں انسان کو جلائے جانے والے واقعات سے دلبرداشتہ تھے۔

اب وہ اپنے قدیم دوستوں کے پاس پہنچ گئے اور وہ علمی اور دینی زندگی میں ایسا خلا چھوڑ گئے جس کا پُر ہونا قریبی مدت میں نظر نہیں آیا۔

☆☆

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

● مولانا کلیم اللہ

امت مسلمہ کے عظیم رہنما، وحدت امت کے جلیل القدر پیامبر، امت کی دکھتی ہوئی رگ کے نبض شناس حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی وفات حسرت آیات کو اگرچہ کئی ماہ گزر چکا ہے، لیکن اب بھی عوام وخواص پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور امت کا رنج وغم رکھنے والوں کی آنکھیں آج بھی قاضی صاحب کی یاد میں نم ہو جاتی ہیں۔ حضرت قاضی صاحب نے اپنی مستعار زندگی میں جس قدر ہمہ گیر ہمہ جہت کارنامے انجام دئے وہ چند افراد کے لئے کجا کسی انجمن یا ایک جماعت کے لئے بھی آسان نہ تھا آپ کی سوچ میں آفاقیت، علم میں اتھاہ گہرائی، فکر میں تنوع، عزائم میں پختگی، جہد ومحنت میں دوام وتسلسل تھا۔ آپ نے جہاں علمی حلقوں میں اپنے وسعت مطالعہ اور گہرائی وگیرائی کا لوہا منوایا وہیں آپ نے ملی اور قومی خدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے، آپ نے امت کے بکھرے شیرازے کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی، دوسری طرف سیاست میں آپ نے اپنے پیش رو کی عظمت رفتہ کو بحال کیا۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں جہاں آپ نے شاہکار اور قیمتی اثاثہ چھوڑا وہیں تقریر وخطابت کے ذریعہ بھی آپ نے ہزاروں دلوں پر حکمرانی کی جگہ جگہ مدارس ومکاتب قائم کرنے کے ساتھ ساتھ آپ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے میدان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا غرضیکہ آپ نے متنوع خدمات انجام دیں جو تادیر سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

حضرت قاضی صاحب یوں تو مختلف علوم میں دستگاہ رکھتے تھے، لیکن سب سے دلچسپی کا مرکز اور موضوع آپ نے فقہ کو بنایا تھا، چنانچہ آپ نے اس فن کی بے شمار کتابوں کا نظر عمیق سے مطالعہ کیا اور فقہ پر وہ تجدیدی کارانجام دئے کہ عقل انسانی حیران وششدر رہ جاتی ہے، آپ نے فقہ حنفی کی مشہور بیش بہا خزانہ کا مجموعہ ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' ایڈٹ کیا اس کے لئے کہاں سے کہاں مخطوطات فراہم کئے، بیماری کی حالت میں ہند وبیرون ہند کے متعدد اسفار کئے اور بڑی جاں فشانی کے بعد آپ نے اس مخطوطہ کو جس کے استفادے سے فقہاء ہنوز محروم تھے قابل استفادہ بنادیا۔

حضرت قاضی صاحب نے بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کی مشترک امارت شرعیہ کے دائرے کو بڑی باریک بینی اور دقیقہ سنجی سے وسیع فرمایا اور ہندوستان جیسے ملک میں عہدہ قضاء کی حیثیت کو بحال کیا، اس لئے بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ عہدہ قضاء نے حضرت کو جتنا جلا بخشا ہے اس سے کہیں زیادہ قاضی صاحب کی وجہ سے عہدہ قضا کو رونق ملی، آپ نے صوبہ اور دوسرے صوبوں میں بھی قضاء کی حیثیت بنانے کی کوشش کی۔ قضاء کی مہارت اور پیچیدہ ترین مسائل کو چٹکیوں میں حل کرنے کے ملکہ نے آپ کو قاضی القضاۃ بنادیا تھا اور بلا تردد کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہندوپاک وبنگلہ دیش میں اس منصب کے لئے آپ کے سوا کوئی حقدار بھی نہ تھا۔

جب آپ کے اسفار بیرون ملک ہونے لگے اور علمی اثر ورسوخ کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا تو افریقی ممالک کے بیدار مغز بڑے بڑے تجار کو انٹرنیشنل تجارتوں میں شرعی نگاہوں سے مشکلات پیش آئے، نیز وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے مسائل جن پر بڑے بڑے علماء لاعلمی ظاہر کرتے یا تشفی بخش جواب نہیں دے پارہے تھے۔ قاضی صاحب نے وہاں کے پیش آمدہ مسائل اور ان کا فوری اسلامی وفقہی حل تلاش کیا انہیں نت نئے مشکل ترین مسائل کے حل اور تلاش کے لئے موصوف فکرمند رہے۔ بالآخر خدانے دستگیری فرمائی

اور وقت کی اہم ترین ضرورت کے پیش نظر ۱۹۸۹ء میں فقہ اکیڈمی کی بنیاد ڈالی گئی اور خدا نے جس کے ذریعہ دین کی اعلیٰ ترین خدمت لی بہت سے مسائل حل ہوئے اور امت کے لئے حلال وحرام کی تمیز آسان ہوگئی۔اسی ادارے کی طرف سے ناقابل حل مسائل پر بحث وتحقیق کے لئے فقہی سیمینار منعقد کئے جانے لگے، جو آج تک تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی رہے گا۔

قاضی صاحب ملی وسماجی زندگی میں انقلاب لانے کی فکر کرتے رہے اور الحمدللہ کامیاب بھی ہوئے۔ملت کو برادران وطن سے موقع بموقع پر ملے مصائب کے وقت عوام و خواص کی نگاہ آپ پر اٹھتی اور آپ کے فیصلے یا مشورے کے منتظر رہتے۔آپ نے فساد اور سیلاب زدہ علاقوں میں مظلوم وبے کس کی دل کھول کر مدد کی۔مذہب کا فرق کئے بغیر ہر مظلوم کی فریادرسی کی۔آپ کو ناخواندگی اور جہالت سے بڑا رنج ہوتا، چنانچہ ملت کی ترقی اور بیداری کے لئے آپ نے جگہ جگہ کالجز کھولے، انسٹی ٹیوٹ قائم کئے ہسپتال بنوائے دیگر مخصوص قوم کے لئے بھی اسکول بنائے، سیاسی میدان میں الیکشن وغیرہ کے موقعوں پر بھی آپ نے جلسے وجلوس کے مہمل اور لغو مظاہرے اور ہنگامے اور گورکھ دھندوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے کاوش ومحنتیں کیں، چنانچہ آپ اپنے ٹھوس قدم میں خاموش مزاجی سے کامیاب ہوئے۔

آپ کے اوصاف وکمالات کا احاطہ کرنے کے لئے انجمن وکمیٹی چاہیے، یہاں تو صرف جھلک دکھائی جاسکتی ہے، آپ نے امت کو جوڑنے کی ساری زندگی کوشش کی، وحدت امت اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے، جزوی اور فروعی اختلافات کی بناپر الزام تراشی یا تلخ کلامی یا ایک دوسرے پر نشتر زنی کے بجائے آپ نے کلمہ واحد کی بنا پر قوموں کو متحد کرنا چاہا یہی وجہ ہے کہ آپ ہر طبقے کے یکساں مقبول راہنما تھے۔آپ طبعی طور پر اس کو ناپسند کرتے تھے کہ آپسی انتشار کی وجہ سے ملت کا اتحاد پامال

ہو اور پھر ہم اس ملک میں مزید پستی کے قعر عمیق میں جاگریں، اسی نظریے کے پس منظر میں آپ سیکولر طبقے اور ارباب مدارس کے لئے پل کی حیثیت رکھتے۔بارہا آپ نے ملی تشخص وملی اتحاد کی حفاظت کی۔

آپ حد سے زیادہ ملنسار، خوش طبع تھے، اخلاق کریمانہ کے حامل اور اوصاف حمیدہ کے پیکر تھے، بے شمار خوبیاں آپ میں بیک وقت جمع تھیں۔نہایت متواضع، منکسر المزاج تھے، اس قدر علمی بلند پرواز کے باوجود آپ بناوٹی ڈھونگ اور پوز سے دور رہتے۔زندگی نہایت سیدھی سادی تھی آپ سے جو کوئی ملتا ایسا محسوس کرتا شاید سب سے زیادہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ہر ملنے والا ان کا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہتا۔

آپ کی زندگی بھی نسل نو اور موجودہ وقت کے علماء کو کیا سبق دیتی ہے وہ سبق ہمیں یاد کرنا چاہیے۔ان کی زندگی بھی درس دیتی کہ انسان بیک گراؤنڈ کے بغیر بھی ذاتی محنت سے ظاہری اسباب ووسائل کے فقدان کے باوجود بہت کچھ کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ عزم جواں ہو تگ وتاز مسلسل اور جہد پیہم ہو، ہمت نہ ہارتا ہو، حالات موافق ہو یا ناموافق ہر حالت میں پائے استقامت میں لغزش نہ آئے۔دوسرے یہ کہ ملی اتحاد کو پارہ پارہ نہ ہونے دیا جائے، ذاتی منفعت کے لئے امت میں اختلاف وانتشار پیدا نہ کیا جائے، بلکہ فروعی وجزوی اور نظریاتی اختلاف کو آپسی دوری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔اہل علم کی قدردانی کی جائے ان کو قریب کیا جائے اور اپنی سوچ میں آفاقیت، تنوع، بلندی، علم میں گہرائی گیرائی پیدا کی جائے، امت کے درپیش مسائل حل کرنے اور خواندگی کا ماحول پیدا کیا جائے۔

☆☆

کارواں کا فقیہ اعظم چل بسا

● مولانا سلطان احمد القاسمی

اس دارفانی میں جو بھی آیا جانے کے لئے آیا، جو بھی آتا ہے ایک نہ ایک دن چلا جاتا ہے لاکھوں کروڑوں انسانوں نے جنم لیا بالآخر دوگز زمین کے ٹکڑے کو اپنا مسکن بنا کر ابدی نیند سو گئے، نہ وہ دنیا کو سمجھ اور برت سکے اور نہ دنیا اس کو سمجھ اور یاد رکھ سکی۔ حضرت قاضی صاحبؒ بھی وہاں چلے گئے جہاں ہر کس و ناکس کو جانا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ع

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی موت فرد کی نہیں پوری ملت کی موت ہوتی ہے، ان کا رحلت فرما جانا عالم کا مرجھا جانا ہے۔ قاضی صاحب کی موت بھی ایک فرد کی نہیں فرد فرید کی موت ہے، ان کی موت کے سلسلے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ''موت العالم موت العالم'' کہ ایک عالم کی موت در حقیقت عالم انسانیت کی موت ہے۔ قاضی صاحب کی موت سے عالم اسلام ایک رجل عظیم وفقیہ نبیل سے محروم ہو گیا، حضرت قاضی صاحبؒ کی شخصیت ایک سرسبز وشاداب لہلہاتا تناور درخت تھی جس سے ہر ذی روح مستفید ہوتی تھی، ایک چشمہ تھی جہاں پہنچ کر پیاسی انسانیت صرف سیراب ہی نہیں تسکین قلوب کے سامان سے بھی لذت آشنا ہوتی تھی۔

حضرت قاضی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایسی نعمت غیر مترقبہ سے سرفراز فرمایا تھا کہ جس

کے بارے میں صاحب لولاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: '' **لاحسد الا فی اثنین رجل أتاه الله مالا ء بی فسلطه علی هلکته فی الحق، ورجل أتاه الله الحکمة فهو یقضی بها ویعلمها**''۔ (رواه الشیخان) کہ (اگر شریعت مطہرہ میں حسد جیسے مہلک عمل کی گنجائش ہوتی تو صرف دو ہی فرد ایسے ہیں جن پر حسد کیا جا سکتا ہے ایک وہ شخص جسے مال وافر سے نوازا گیا ہو اور وہ اسے راہ خیر میں صرف کرتا پھرتا ہو دوسرا وہ شخص جسے حکمت ودانائی اور سرچشمہ علم دین سے اکتساب فیض کی توفیق عنایت کی گئی ہو اور وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے مسائل ومعاملات کو حل کرتا ہو اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتا ہو)، حضرت قاضی صاحبؒ کو حضرت امیر شریعتؒ جیسی شخصیت ساز ہستی کے سایہ تلے جگہ نصیب ہوئی اور ان کی عنایتیں وشفقتیں شامل حال رہیں۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی قدس سرہ العزیز کو باری تعالیٰ نے شخص سے شخصیت اور فرد سے فرید بنانے کا ملکہ راسخہ عطا فرمایا تھا، جیسا کہ حضرت امیر شریعتؒ کے حالات زندگی میں مسطور ہے کہ ''ماضی قریب کی وہ شخصیتیں جنہوں نے افراد سازی جیسے پتہ ماری اور جگر کاری کا کام کیا ان میں ایک نمایاں نام حضرت امیر شریعت کا بھی ہے''۔

حضرت قاضی صاحب کو یوں تو تمام علوم وفنون میں مہارت تامہ بلکہ امامت وسیادت کا مقام حاصل تھا، لیکن فقہ وفتاوی آپ کا خاص موضوع تھا، فقہ جدید کے آپ ماہر ہی نہیں مجدد تھے، آپؒ نے فقہ وفتاوی کی رو سے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ تاریخ ان کا تذکرہ کئے بغیر ناقص اور نامکمل رہے گی۔ تقریباً چالیس برس سے زائد طویل عرصہ تک مسند افتاء وقضاء کے خاردار اسٹیج پر جلوہ افروز ہو کر لوگوں کے مسائل ومعاملات کو سلجھانے، اہم سے اہم تر مسائل کو چٹکیوں میں سلجھا دینا آپ کے لئے بازیچۂ اطفال تھا۔ آپ خود بھی اس میدان کے مرد مجاہد وشہسوار تھے اور علماء، اصحاب افتاء وقضاء ودانشوران قوم وملت کو بھی مرد مجاہد بنانا چاہتے تھے جس کے لئے آپ نے اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ

علماء وطلباء میں تحقیق وریسرچ کی روح پھونکی اوران میں مسائل کے اخذ واستنباط کا شوق وجذبہ پیدا کیا۔تقریباً چالیس سے زائد مسائل فقہ پر بحث ومباحثہ اورانتہائی عرق ریزی کے بعد اجتماعی فیصلے فرمائے۔ جوارباب فقہ وفتاویٰ وماہرین علوم سے خراج تحسین بھی حاصل کرچکے ہیں۔

حضرت قاضی صاحبؒ کی خمیر میں فقہی بصیرت، علم وآگہی کے ساتھ اتحادیت واجتماعیت کا مادہ بھی شامل تھا۔ بنابریں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام ہی سے آپ اس کے رکن رکین رہے۔(مسلم پرسنل لاء بورڈ ملک کی وہ واحد تنظیم ہے جس نے ملک وملت کے علماء کرام ودانشوران عظام کو بلاکسی تفریق مسلک ومشرب کے اخوت اسلامی کے پیش نظر تحفظ اسلام کی خاطر شانہ بشانہ لاکھڑا کیا جس میں چمنستان دیوبندیت کے نرگس ونسترن عطرافشانی کررہے ہیں۔توبریلویت وشیعیت، اہل حدیث وجماعت اسلامی کے کاسہ نے بےنورانی سے سیراب ہونے والے بھی محوخرام ہیں) حضرت قاضی صاحبؒ اس کے نہ صرف رکن اورمتحرک فردکی حیثیت سے سرگرم عمل رہے، بلکہ مسند صدارت کوبھی اپنے وجود سے زینت بخشی۔اسی اجتماعیت میں مزید استحکام وپائیداری پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا ملی کونسل جیسے مضبوط اورمربوط اورفعال تنظیم کی بنیادرکھی جس کے ذریعہ ہرمسلک ومشرب کے لوگوں کوایک لڑی میں پرونے میں نہ صرف آپ کو مدد ملی، بلکہ آپ اس میں کامیاب وبامراد بھی رہے۔

موجودہ دورمیں حضرت شیخ الشیوخ مفکراسلام علامہ سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے بعد حضرت قاضی صاحبؒ کی ذات وہ واحد ومنفرد شخصیت تھی جنہیں ہرمسلک ومشرب کے افرادمعتقدانہ نظروں سے دیکھتے اور مانتے تھے اورآپ کوان سب کی حمایت ومحبت حاصل تھی اوربفرمان نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیم کہ ’’اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتا ہےتو حضرت جبرئیل علیہ السلام کوآواز دیتے ہیں کہ جبرئیل! میں فلاں بندے سے محبت کرتا

ہوں تو بھی محبت کرتو حضرت جبرئیل امین بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان پرآواز لگاتے ہیں کہ فرشتو! اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہےتم بھی محبت کروتو آسمان کے تمام فرشتے اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں اس کے بعد زمین والوں میں اس کی محبوبیت ومقبولیت رکھ دی جاتی ہے (جس کی وجہ سے ساری مخلوق اس سے محبت کرنے لگتی ہے) قاضی صاحبؒ کومحبت الٰہی ونصرت خداوندی حاصل تھی۔

حضرت قاضی صاحب کا نہتے مسلمانوں کے درمیان سے اٹھ کر چلا جانا، جبکہ مسلمان چہار جانب سے مصائب وآلام کے کٹہرے میں محبوس ہیں اورمسلمان عالم کی نگاہیں آپ پر مرکوزتھی ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے،لیکن موت کا وقت متعین ہے۔ ’’**اذاجاء أجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون**‘‘.

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆

عالم اسلام منبع وعرفاں سے محروم

● محمد ضیاء اللہ ضیاء رحمانی

حضرت امیر شریعت رابعؒ کا تربیت یافتہ دارالعلوم دیوبند کا وہ چراغ جس کی روشنی نے عالم انسانیت خصوصاً عالم اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کو منور کیا آج وہ روشنی ہمارے درمیان نہ رہی انسان اس دارفانی کو چھوڑ کر دارالبقا کی طرف سفر کرتا ہے، لیکن انسانیت زندہ جاوید اور نہ ختم ہونے والا سفر ہے، اسی رشتۂ انسانیت سے انسان مکمل انسان بنتا ہے اور ایسے انسان کی انسانیت کو فراموش کرنا خود کو فراموش کرنے کے مترادف ہے۔اس سلسلے کی ایک اہم اور مضبوط کرن سرزمین ہند نے جالہ کے گاؤں میں ایسے انسان کو جنم دیا جس کی شفقت ومحبت، خلوص وپیار، ایثار وقربانی، ہمدردی، حلم وبردباری، ملک وملت کی تحفظ وترقی، شریعت وطریقت کے علمبردار اور نفاذ شریعت کے مکمل داعی مدعو اللہ ہوگئے۔**انا للہ وانا الیہ راجعون.**

مصائبوں سے الجھ کر مصائب کے الجھے ہوئے گتھی سلجھا کر نکل جانا حالات کے تھپیڑوں سے نبرد آزما ہونا مشکل وقتوں میں مشکلوں کو سہل کرنا اور اپنے حریفوں سے بھی خندہ پیشانی سے شفیقانہ کلام کرنا یہی وہ سرمایہ تھا کہ آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی جیسے اہم اور حساس مسئلے میں مسلمانان ہند کی قائدانہ صلاحیت کے ساتھ رہنمائی کی، بابری مسجد رام جنم بھومی قضیے پر وزیراعظم سے تفصیلی گفتگو کی اور اس ملک وملت کو سیاست کے میدان میں آل انڈیا ملی کونسل جیسا مربوط مضبوط اور منظم تنظیم سے

مادر وطن کی خدمت کی جو ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔بہار کی سرزمین سے پھوٹنے والا یہ کرن پوری دنیا اور خصوصاً مادر وطن اور عالم اسلام کی وہ ضیاپاشی کی جس کی روشنی سے اپنی مختصر حیات میں ایک پاکیزہ علمی نفوس کو تیار کیا اور ملت کی علمی محاذ پر رہنمائی کے لئے ۱۹۸۹ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد رکھی اور ملک کے مختلف خطے اور گوشے میں فقہی سیمینار کے ساتھ ساتھ دارالقضاء قائم کرنے کی سعی وتدبیر کرتے رہے۔

حضرت قاضی صاحب کی ذات گرامی بھی کسی انجمن سے کم نہ تھی اگر آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں تو آل انڈیا ملی کونسل کے سکریٹری جنرل بھی ہیں ساتھ ہی اسلامک فقہ اکیڈمی مکۃ المکرّمہ کے رکن اور کبھی الخیریہ الاسلامیہ العالمیہ کویت کے رکن اعزازی۔گویا کہ اپنی ۶۵ سالہ زندگی میں ملک وبیرون ممالک میں حرف بحرف لفظ بلفظ دین اسلام کے نشر واشاعت، تصنیف وتالیف، تبلیغ وتشہیر میں کما حقہ کردار ادا کیا، کیا یہ سب اس مردم ساز شخصیت کا مرہون منت نہیں جس نے ذرہ کو آفتاب، مدرس کو فقیہ، قاضی القضاۃ کو مجدد بنایا جس میں غیر معمولی کردار ہندوستان کے مشہور ومعروف اور قد آور شخصیت حضرت امیر شریعت رابع نور اللہ مرقدہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کا ہے۔

حضرت قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا انتقال پرملال اس دور قحط الرجال میں ایک اجل عظیم سے محروم ہوجانا ہے۔اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم تمام کو صبر جمیل۔آمین ثم آمین۔

☆☆

فکری نقوش

عقل وفراست کا شاہکار

• امین عثمانی

ہرانسان اپنی پسند اور اپنے موضوع کے لحاظ سے گفتگو کرنا یا تجربہ لکھنا پسند کرتا ہے، بلکہ اسی کے اردگرد گھومتا رہتا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ اپنی سوچ اور نقطۂ نظر کو مسلط کرنے ہی کو اپنی خوبی وصلاحیت تصور کرتے ہیں، قاضی صاحب مخاطب کی نفسیات کے اعتبار سے لب ولہجہ اور الفاظ کا انتخاب کرتے تھے، اسی بنا پر وہ بچوں میں بچہ، طلباء میں طالب علم، مدرسین میں مدرس، قانون دانوں میں قانون داں، صوفیوں میں صوفی، دانشوروں میں دانشور، صحافیوں میں صحافی، فقہا میں فقیہ، قاضیوں میں قاضی، سیاستدانوں میں ماہر سیاست، علماء معاشیات میں فاضل اقتصادیات کی حیثیت سے گفتگو کرتے اور حاوی رہتے، ہر مجلس میں محسوس ہوتا کہ وہ اس مجلس کے استاذ ہیں، ان سے میں کبھی ناراض ہوتا حالانکہ یہ غصہ مالی مسائل پر نہیں، بلکہ پالیسی میں ہوا کرتا تھا، لیکن میرا غصہ ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر وہ میرے چہرہ کو پڑھ لیتے تھے ان کو چہرہ شناسی میں خاص ملکہ حاصل تھا یہ اندازہ کہ مخاطب کے دل میں کوئی بات ہے اس کو جلد از جلد نکلوانے کی کوشش کرتے تھے، طویل رام کہانی سے وہ اکتا جایا کرتے تھے اور اصل مدعا جلد سننا چاہتے تھے۔

وہ انسان کو انسان سمجھتے تھے اور نفسیاتی وانسانی امور کا لحاظ بھی کرتے تھے، ذہانت خوب تھی، ہنستے بھی تھے، ہنساتے بھی تھے، کھاتے بھی تھے اور کھلاتے بھی، رشتہ داروں کا

پاس ولحاظ بھی فرماتے تھے۔

منصوبہ بندی جب کرنے پر آتے تو موضوع سے متعلق اس قدر تفصیل جمع کراتے کہ لوگ پریشان ہوجاتے، مگر وہ خود نہ تھکتے، سائل کے سوال کا جواب وہ ضرور دیا کرتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے بارہا اصرار کیا کہ میں بیرون ہند سفر پر ان کے ساتھ جاؤں، لیکن ہر بار میں نے دوسروں کا نام پیش کردیا۔

وہ ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بے تاب رہتے تھے، خواہ وہ بات کمپنی کی ہو یا کارخانہ کی، پولیٹیکل سرکل کی ہو یا ڈپلومیٹک سرکل کی، انفرادی طور پر وہ کسی کے بارے میں خواہ کوئی رائے رکھتے ہوں، لیکن امت کے مسئلہ پر وہ بہت بے چین تھے، تصور امت کا وسیع نقشہ وہ ہر وقت ذہن میں رکھتے تھے، فقہی سیمینار کے لئے بھی ان کے ذہن میں اتحاد امت کا موضوع مسلسل رہا۔ انہوں نے امت کے موضوع پر وسیع تناظر میں کام کے لئے بین الاقوامی سطح پر مفکرین اور علماء سے رابطہ بھی قائم کیا اور مختلف جہتوں پر ان کی تفصیلی گفتگو مختلف بین الاقوامی علمی وفکری حلقوں سے ہوتی رہی، نیز اخوان کے حلقوں سے بھی رابطہ رہا، ۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد انہوں نے امت کے نام جو اعلامیہ جاری کیا وہ واقعی پڑھنے اور سوچنے کے لائق ہے اس کے بین السطور میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی منصوبہ بندی سے متعلق کئی پالیسیاں متعین کی گئی ہیں۔

شاید یہ بات کسی کے علم میں نہ ہو کہ انہوں نے عالمی سطح پر اسلامی مفکرین وعلماء، نیز تحریک اسلامی کے حلقوں سے نئی حکمت عملی اختیار کرنے اور حالات کا از سر نو تجزیہ کرنے کی درخواست بھی کی جسے اہمیت کے ساتھ قبول کیا گیا، وہ اپنے دشمن کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کرنا جانتے تھے اور شدید اختلاف کے باوجود راہ ورسم اور روایات وبرتاؤ کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ ہر گروپ میں ذہین افراد کون ہیں، پتہ نہیں کیوں وہ ذہین افراد کی بڑی قدر کرتے تھے اگر کسی مسئلہ ومعاملہ میں کوئی شخص رائے نہ دے پاتا تو وہ

بہت بے چین ہوتے۔

ان کا خاص طریقہ تھا کہ پیچیدہ مسائل میں از خود ملک کے ذہین مسلم دانشوروں اور قانون دانوں، نیز سیاستدانوں سے فوراً بات کرکے ان کی رائے اور دلیل دونوں معلوم کیا کرتے تھے، ان کی ایک خاص خوبی متعلقہ مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ متنوع تفصیل جمع کرنا اور مختلف ذرائع سے معلومات لینا تھا اس طرح وہ مسئلہ سے کافی باخبر ہوجاتے تھے، اس پیچیدہ ملکی وبین الاقوامی مسائل کے سلسلہ میں صحافیوں کی ایک ٹیم سے ان کا تعلق رہتا تھا جو ہر واقعہ پر فوراً حاضر ہوتی اوران کے ساتھ گفتگو ہوا کرتی، اس لئے قاضی صاحب مختلف ممالک بالخصوص پڑوسی ریاستوں کے سیاسی، اقتصادی، دینی، سفارتی مسائل سے اس قدر آگاہ رہتے تھے کہ بتایا نہیں جاسکتا، ان کا ذہن ہر وقت چلتا تھا اور حیرت انگیز طور پر مختلف متضاد سمتوں میں ایک ساتھ چلتا تھا، ذہن کے مختلف سمتوں اور جہتوں میں ایک ساتھ چلنے کی وجہ سے ان میں یہ ملکہ پیدا ہوگیا تھا کہ وہ بیک وقت دس الگ الگ ایشوز پر ایک ساتھ سوچتے اور رائے دیتے تھے۔

نئی نسل، نوجوانوں، بالخصوص یونیورسٹی کے طلباء سے وہ بہت محبت کرتے اوران کی اسلامی تربیت، اسلامی ذہن سازی کے لئے دل میں بڑا درد رکھتے اور بے شمار منصوبے بھی بناتے تھے۔

ان کے بارے میں متشدد روایت پسند علماء کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ دین کے معاملہ میں کچھ ڈھیلے ڈھالے ہیں، حالانکہ ایسا بالکل نہیں، وہ ایک داعی مصلح اور مربی کا روپ بھی رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے والے وہ نوجوان جو پینٹ شرٹ کثرت سے پہنتے ہیں اکثر تنہائی میں ان سے کہا کرتے کہ قاضی صاحب اچھا بتاؤ خاکروب میں اور تم میں اس لباس بد نظر کے اندر کیا فرق ہے، یہ لباس ساتر نہیں ہے، اصلاً اسلامی لباس ہی ساتر ہے، بورڈ کے ۱۰/مارچ کے اجلاس سے قبل ۷/مارچ کو جب امیر شریعت کے ساتھ میں اپولو پہنچا تو قاضی

صاحب نے امیر شریعت سے پوچھا کہ حضرت وہ حدیث کیا ہے، مونچھ بڑھاؤ، داڑھی گھٹاؤ، امیر شریعت نے کہا نہیں حدیث میں ہے ''**قصوا الشارب واعفو اللحی**'' اس کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کرلی دراصل وہ وہاں موجود بعض افراد کی اصلاح کرنا چاہ رہے تھے۔

وہ تنہائی میں افراد کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ بھی لیتے تھے اور پھر ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے انہیں کام سونپتے تھے، اس معاملہ میں وہ عجیب وغریب ذوق رکھتے تھے پورے ملک میں نظر دوڑاتے، فہرستیں بنواتے اور ہر موضوع اور ہر فن کے افراد کی لسٹ تیار کراتے، دورہ میں وہ کام کے افراد کی تلاش جاری رکھتے، عام طور پر اپنے محدود مقاصد واغراض کے لئے لوگ ایک دوسرے کو یاد رکھتے یا ملتے ہیں، لیکن وہ سبھوں سے مختلف تھے، اعلیٰ مقاصد اور امت کے کاز کے لئے، نیز ہند میں مسلم اقلیت کو مضبوط کرنے اور سیاسی استحکام ومعاشی ترقی اور تدریسی وتعلیمی خدمات اور متنوع مقاصد کے لئے، وہ افراد کا انتخاب کیا کرتے اور پھر ان کو کسی نہ کسی کام میں لگاتے اوران کی خبر بھی رکھتے، اس طرح وہ افراد کو تدریجاً آگے بڑھایا کرتے۔

بعض دفعہ لوگ قاضی صاحب کے حسن سلوک اور مشفقانہ تربیتی انداز سے اس قدر بے حال ہوجاتے کہ اس کی کوئی انتہا نہیں بعض افراد کو قاضی صاحب محض تربیت وٹریننگ کے لئے آگے بڑھاتے، مگر جب ان میں تکبر، انانیت، رعونت، شہرت کی ہوس اور نام ونمود کے لئے تڑپ اور بے قابو جذبات نظر آنے لگتے تو قاضی صاحب متبادل افراد تلاش کرکے ان کو کسی دوسرے کام میں لگادیتے، چنانچہ ایسا بارہا ہوا کچھ لوگ خود کو قاضی صاحب کا ہمسر وثانی سمجھ بیٹھے۔ قاضی صاحب کو اس کا احساس بھی ہوا، اسی طرح بعض افراد اس پیرایہ بیان میں مضامین لکھتے گویا وہ سب سے زیادہ باخبر ہیں، یا کچھ اس طرح کا تاثر پیش کرتے جیسے بقیہ لوگ بونے ہیں تو قاضی صاحب مسکرا کر مجھ سے کہتے ذرا دیکھئے ان کو، ان کے سادہ

رویہ سے بعض لوگ یہ دھوکہ میں رہتے کہ قاضی صاحب کی نظروں سے ان کی وہ دوڑ بھاگ مخفی ہے جو وہ سماجی یا سیاسی سطح پر اپنی ذاتی شناخت اور بلندی کے لئے کر رہے ہیں۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ مخالفین سے بھی رابطہ رکھتے تھے، لیکن بہت محدود ومتوازن سطح پر وہ بھی دفع مضرت کے لئے، ان کی سرشت میں اقدام کی قوت ودیعت تھی اس لئے وہ اقدامی انداز زیادہ کیا کرتے تھے، بعض جگہ وہ ایسی اسکیموں اور رایوں پر جس کی ملت کو ضرورت نہ ہو اپنی رائے اس طرح پیش کرتے کہ اس سے نہ مخالفت ہوتی نہ تغلیط، بلکہ نفس ضرورت پر وہ گفتگو کر کے یہ ثابت کرتے کہ اس منصوبہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ملی کونسل کی مختلف پالیسیوں پر بوقت ضرورت وہ اسی طرح رائے دیا کرتے، ان کا طرز استدلال بہت عجیب ہوتا، میرا ان سے باضابطہ رابطہ ۱۹۸۸ء سے شروع ہوا جو اتنا قوی اور مضبوط رہا کہ وہ میرے صاحب الرائے اور صابت الرائے نہ ہونے کے باوجود مختلف امور، پالیسی، طریقہ کار کے بارے میں مجھ سے ضرور پوچھا کرتے۔

ان کی خواہش تھی کہ ملک کی تمام طلباء تنظیموں کو آپس میں ملا کر ایک بڑی قوت بنایا جائے اس کا منصوبہ انہوں نے بنایا بھی، لیکن منصوبہ کو آخری شکل دیتے وقت ایک صاحب تشریف لائے اور خاموشی سے مباحثہ سن کر چلے گئے اور پھر وہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی، قاضی صاحب کو اس بات کا بھی بہت افسوس تھا کہ اب قیادت غیر سنجیدہ اور سطحی طرز بیان زیادہ اختیار کرتی جارہی ہے اور گہرائی کے ساتھ حالات کا تجزیہ نہیں کرتی اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قاضی صاحب نے قیادت کی تربیت کا دو سطح پر جامع منصوبہ اور ایک جامع نصاب برائے مطالعہ ترتیب دیا پہلا مرحلہ ملی کونسل کے مختلف کیڈر کو فکری وسیاسی شعور عطا کرنے کے لئے اور دوسرا مرحلہ مختلف تنظیموں کے اہم فعال افراد کے لئے ایک وسیع کیمپ کے انعقاد کے لئے۔

قاضی صاحب نے ملی کونسل کے مختلف اہم اجلاس میں قیادت کی صفات اور خوبیوں

کی جانب مناسب پیرایوں میں اشارہ کیا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ قاضی صاحب کسی کی صلاحیت نکھارنے کے لئے اسے آگے بڑھاتے، مثلاً نماز کی امامت، مجمع سے خطاب، مضمون کی اصلاح، حوالوں کی درستگی، مقالہ کی تیاری یا ترجمہ یا اہم وفود میں اظہار خیال کا موقع، مگر اس سے کمزور انسانوں کو خود پر قابو نہ رہتا اور وہ خود کو ان سے زیادہ صلاحیت والا صاحب فکر، بالغ نظر تصور کرنے لگتے۔

قاضی صاحب کی قوت برداشت، بہت زیادہ تھی، حالانکہ بیماری کے ساتھ ساتھ کچھ اپنوں اور کچھ غیروں کی ریشہ دوانیوں نے انہیں بہت کمزور اور شکستہ خاطر کر دیا تھا وہ اکثر کہتے تھے کہ مجھے بیمار وکمزور پا کر نفس پرستوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا ہے، ان کی قوت برداشت کا اندازہ آپ اس سے کریں کہ افغانستان کے واقعہ پر لوگوں نے ان سے جہاد کا فتویٰ جاری کرنے کے لئے فون پر سب وشتم کیا، مگر انہوں نے اف نہ کیا، انہیں دھمکیاں دی گئیں، مگر انہوں نے خاموشی اختیار کی، انہیں اسلحہ بھی دکھایا گیا، مگر وہ پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے، انہیں اپنوں نے اللہ سے نہ ڈرنے والا کہا، مگر اس غم کو بھی وہ پی گئے، چھوٹوں نے ان کے سامنے اپنا منہ پھیرے رکھا، لیکن انہوں نے صبر کیا، کون یہ کہتا ہے کہ ان کے اندر تحمل نہیں تھا۔

قاضی صاحب کے اندر تحمل کے ساتھ توسیع وکشادگی بھی خوب تھی، سینہ بہت کشادہ تھا، دل میں فراخی تھی، اس لئے سب کو سمیٹ لیتے تھے، مگر یہ سب اتحاد امت کی خاطر وہ کیا کرتے تھے، بیماری نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا، مگر اس کے باوجود ان کی ہمت جوان تھی، میں بعض واقعات سے غمزدہ ہوا کرتا تو وہ کہتے کہ زندہ رہنے کے لئے ہمت ضروری ہے، مگر آخری ایام کے چند واقعات نے ان کے مضبوط دل ودماغ پر گہرا اثر ڈالا۔

☆☆

قاضی مجاہد الاسلام کا فقہی منہج فکر

● غطریف شہباز ندوی

اعلان ہوا کہ جامعہ ملیہ کی مسجد میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا خطاب ہوگا۔ یہ اب سے تقریباً ۱۳؍برس پہلے کی بات ہے، راقم دہلی کی ایک درسگاہ واقع جوگا بائی ذاکر نگر میں سکنڈری درجات میں پڑھ رہا تھا اور اسے کتابوں کے مطالعہ کے موروثی ذوق کے ساتھ جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت اور بڑے علماء و مقررین کو سننے کا چسکا لگا ہوا تھا اور اس حوالہ سے اسے مختلف شخصیات، تحریکوں اور جماعتوں کے اکابر اور بڑے اداروں سے وابستہ بہتیری شخصیات و معروف علماء سے واقفیت ہوگئی تھی۔ مولانا مجاہد الاسلام کا نام کانوں میں پڑا تھا، نہ ان کو دیکھا تھا نہ سنا تھا، تقریر مغرب بعد تھی، بصد شوق راقم وہاں پہنچا۔ مولانا کا خطاب ہوا، یہ تو یاد نہیں کہ کیا موضوع تھا، لیکن اتنا ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے کہ حضرتِ انسان کی اس کائنات میں حیثیت اور اس ذات شریف کے لئے اشیاء کائنات کی تسخیر پر بات چل رہی تھی، مقرر بہت دیکھے اور سنے تھے۔ سامعین جامعہ کے تعلیم یافتہ حضرات علاقہ کے معززین پر مشتمل تھا اور ہمہ تن گوش تھا، ایک بے ریش، قدرے پست قامت اور سیدھی سادی وضع و قطع میں ایک عالم خطاب کر رہے تھے، آواز میں گھلاوٹ، ''اے لوگو'' تکیہ کلام، لہجہ میں غضب کی تاثیر، الفاظ ڈھلے ڈھلائے، تقریر میں روانی، برجستگی، موضوع پر زبردست قابو، اپنے اوپر اعتماد، مقرر تیز و تند بادلوں کی گھن گرج نہیں، بلکہ آبشار کی سی روانی سے بول رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ پہلا تاثر ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے، (First

Impression is the last Impression) خطاب کے بعد مولانا سے مصافحہ کا موقع بھی مل گیا تھا، یہ پہلی بار تھا جب انہیں دیکھا اور سنا۔

اسی وقت سے یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ مولانا ایک قابل عالم، ذہین انسان، اعلیٰ درجہ کے مقرر اور وسیع المطالعہ شخص ہیں اور بعد میں اس یقین میں اضافہ بھی ہوتا رہا، ان کے وسعت مطالعہ، دراکی اور دوسروں کے اعتراف کی ایک مثال اس وقت سامنے آئی جب ایک علمی اور اہم کتاب ''عالم اسلام کی اخلاقی صورت'' پڑھی۔ اس کتاب پر قاضی صاحب کا دو صفحہ کا مختصر سا مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے بڑی خوبی سے پوری کتاب کا عطر پیش کر دیا ہے اور مصنف کتاب کی محنت، وسعتِ مطالعہ اور قوت ادراک کا پورا پورا اعتراف بھی کیا ہے، اب یہ اور بات ہے کہ مصنف صاحب اپنی نئی تحقیقات کے نتیجہ میں اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اسلامی فقہ تو دشمنوں کی گڑھی ہوئی ہے اور اہلِ فقہ یہودیوں کے ایجنٹ ہیں، چنانچہ اب مذکورہ کتاب سے قاضی صاحب کا مقدمہ ہٹالیا گیا ہے۔

قاضی صاحب نے ایک طویل عرصہ تک درسی و تدریسی اور قضاء و افتاء کی ذمہ داریاں نبھائیں اور بہت ہی گوشہ نشینی کی سی زندگی گزاری، ملی و قومی سیاست کے افق پر وہ بہت بعد میں نمودار ہوئے، چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ایک طویل مدت تک ان کی تیاری ہوتی رہی، وہ پڑھتے رہے، پڑھاتے رہے، مطالعہ کرتے رہے، قضاء کا کام جاری رہا، مطالعہ نے ذہن کو نکھارا، مولانا ابوالمحاسن سجاد کی فکر نے فکری تربیت و رہنمائی کی، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی بافیض صحبتوں نے انتظامی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ قضا کا کام کچھ ہے ہی ایسا کہ اس میں آدمی کو معاشرہ کے متعدد اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان کی سننا اور اپنی سنانا پڑتی ہے اور اس عمل Process میں قوت ادراک اور افہام و تفہیم کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور طویل عرصہ کی ممارست سے موضوع پر رسوخ حاصل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ان کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کرن سے

آفتاب اور ذرہ سے خورشید بننے کے بیچ ایک طویل وقفہ ہے، جس میں وہ ان سب کاموں کے لئے گویا تیار ہوتے رہے جو وہ بعد میں انجام دے سکے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی ملی، قومی اور بین الاقوامی شہرت وعظمت کے عمر کے آخری عشرہ کی رہین منت ہے جس میں انہوں نے اپنی حرکت اور تازہ دم وتیز رفتاری سے منزلیں طے کیں، جبکہ آخری ۳ سالوں میں شدید علالت کا شکار بھی رہے، لیکن تیاری مکمل تھی، اس لئے تیز گامی سے رواں دواں رہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے جو کام کیا جن کا آغاز کیا اور وہ ناتمام رہ گئے جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے، اس کا جو نقشۂ کار اپنے ذہن میں رکھتے تھے، ان سب کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک عبقری (Genious) شخص تھے۔ اسی تناظر میں سوچتے اور اسی کے مطابق کام کی پلاننگ کرتے تھے، مختصر طور پر ان کے بعض امتیازات جو انہیں معاصرین علماء میں بہت نمایاں کردیتے اور اونچا اٹھادیتے ہیں یہ ہیں:

ا۔ وہ کثیر المطالعہ آدمی تھے، یہ دور اختصاص Specilization کا ہے، پھر بھی خال خال ایسی شخصیات مل جاتی ہیں جن کا مطالعہ متعدد الجہات ہو اور متعدد علوم کو محیط ہو، ماضی میں علماء اسلام کو معاشرہ کا سب سے زیادہ باخبر اور پڑھا لکھا طبقہ سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کچھ تو خارجی حالات کے جبر سے اور کچھ تعلیم کے دینی ودنیاوی خانوں میں بانٹ دئے جانے سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ماضی کی طرح اب مدارس اسلامیہ کا نظام تعلیم زندگی وحرکت سے لبریز نہیں رہ گیا ہے، عام علماء معاشرہ کا سب سے بے خبر طبقہ شمار کئے جاتے ہیں، اہل مدارس صدیوں سالہ پرانے نظام سے ایک سرے موانحراف برداشت نہیں کرتے، اس لئے جمود وتعطل، گردوپیش سے ناواقفیت ان کے طلبہ کا طرۂ امتیاز ہے، مفلوج اور قوت فکر وعمل سے محروم طلبہ کی اس بھیڑ بھاڑ میں سے بعض اوقات ایسے لوگ نکل آتے ہیں جن کی وجہ سے مدارس کا بھرم قائم ہے، انہیں علماء میں سے قاضی صاحب بھی تھے، وہ مطالعہ کن چیزوں کا کرتے تھے، کیسے کرتے تھے اس بارے میں ان کے بہت قریب اٹھنے بیٹھنے والا ہی بتا سکتا

ہے، البتہ ان کی تھوڑی بہت جو تحریریں ہیں، فقہی مجلّات کے پیش لفظ اور سیمیناروں کے سوال نامے اور ان کے خطبات وغیرہ کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قدیم علوم اسلامیہ کے ساتھ جدید فکر وفلسفہ، ایجادات، نئی تحقیقات، معاشیات سے متعلق جدید مباحث ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، موجودہ دور کے مسائل ومشکلات اور ان کے اسلامی حل کے سلسلہ میں غور کرتے وقت وہ اس سلسلہ میں دوسرے مسلم ملکوں کے فقہا نے کیا نئے مباحث لکھے ہیں اور فلاں فلاں مسئلہ میں ان کی کیا رائے ہے، یہ ضرور دیکھتے تھے، اسی طرح مختلف ممالک میں کیا کیا فتاوی دئے گئے ہیں ان پر بھی غور سے نظر ڈالتے تھے، ان کے قریبی مشاہدین اور واقف کاروں کا کہنا ہے کہ کسی بھی سیمینار میں جاتے تو وہاں کی لائبریری ضرور جاتے، مخطوطات کی فہرست اور نئی مطبوعات پر نظر ضرور ڈالتے، کسی موضوع سے متعلق کیا نئی تحقیق ہوئی ہے، اس کی جستجو بھی کرتے رہتے تھے، اس لحاظ سے طبقہ علماء میں وہ ایک منفرد شخص تھے۔

۲۔ قاضی صاحب نے جو فقہی کام کی ایک نئی طرح ڈالی وہ نہ تو کوئی بدعت ہے نہ اس کی اساس جدت پسندی، مغرب سے مرعوبیت یا زمانہ کے جبر سے مجبور ہو کر سہولیات کی تلاش ہے، جیسا کہ بعض معترضین کا خیال ہے، لوگوں نے مختلف مسائل کو لے کر کافی لے دے کی، بعض کو رہ ذوق اور بلید الذہن آج بھی کئے جا رہے ہیں، حالانکہ علمی دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ آدمی کی اپنی تحریریں ہی اس کی فکر اور سوچ کی اصل ترجمان ہوتی ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر ہی کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے، فقہ کا کام اصولی طور پر کیا ہے اس بارے میں وہ بہت وضاحت سے کہتے ہیں ’’قرآن کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بقا ودوام کلیات کو ہوتی ہے جزئیات کو نہیں، حالات ومقام کی تبدیلی سے جزئیات تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لیکن اصول وکلیات باقی رہتے ہیں، اللہ کی کتاب نے مجموعی طور پر سینکڑوں احکام بیان فرمائے ہیں اور نہ صرف احکام وجزئیات بیان کئے ہیں بلکہ اصول اور جزئی احکام کی علتوں کو بھی بیان کیا ہے، اللہ جزائے خیر دے ائمہ مجتہدین کو کہ انہوں نے قواعد وعلل کا استخراج

کیا اور تنقیح مناط کی، یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی زمانہ کے تغیرات کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔'' (مجلّہ فقہ اسلامی صفحہ ۷، سیمینار نمبر ایک)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں ''پس جو وارثان رسول ہیں ایک طرف تو ان کو اپنے عہد کو پڑھنا ہوگا، اپنے زمانہ کے تقاضا کو جاننا ہوگا، اصول شریعت کی روشنی میں انسانوں کے مسائل، ان کی دشواریاں، معاشرہ کی مشکلات حرج اور ضرر کو دور کرنے کے لئے محض اوہام کا شکار ہوکر امت کو دشواریوں میں نہیں ڈالنا ہوگا اور دوسری طرف محض لوگوں کی خواہشات پر چل کر شریعت کو ترک نہیں کرنا ہوگا، یہی ہے بیچ کا معتدل راستہ جو ہم کو ہمارے بزرگوں سے ملا ہے جو کتاب وسنت سے ملا ہے۔ (صفحہ ۱۵؍ مجلّہ فقہ اسلامی، سیمینار نمبر ۳)۔

قاضی صاحب یہ بھی مانتے ہیں کہ قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے ذخیرہ رکھتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ کسی دور اور زمانہ کے علماء اپنے دور کے تقاضوں کی تکمیل اور پیش آمدہ مسائل کے صحیح حل سے ہمت ہار جائیں۔ جمود کا شکار ہو جائیں، جب پچھلے اور آخر میں ایسا نہیں ہوا تو آج بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے اور آج کے علماء کا فرض ہے کہ وہ زمانہ کی ضروریات سے واقف ہوں۔ وہ متجددین کے اس الزام کو بھی رد کرتے ہیں کہ علماء نے مسائل کے حل کے سلسلہ میں کوششیں نہیں کیں اور ان کے دعوی کو لاعلمی، بےخبری اور جدت پسندی پر محمول کرتے ہیں، نیز ماضی قریب کے علماء میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ، مولانا تھانوی، مولانا ابوالمحاسن سجادؒ، مفتی کفایت اللہ اور مفتی محمد شفیع کی فقہی کاوشوں کی تعریف وتحسین کرتے اور لائق تقلید بتاتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''ان کے کام کو آگے بڑھانا اور پھر اس طرح کے کام کو باہم مربوط کرنا اور مسلک ومشرب اور تنظیم وادارہ کے اختلاف سے بالاتر ہوکر ''فریق'' کے بجائے ''رفیق'' کے احساس کے ساتھ اجتماعی شکل میں ان مسائل پر غور کرنا بلاشبہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔ (صفحہ ۱۴؍ مجلّہ فقہ اسلامی سیمینار ۲)۔

وحدت امت کی انہیں ہمیشہ فکر رہی اور تمام فقہی کاموں میں انہوں نے سبھی مکاتب

فکر کو جمع کیا، سبھی کو مدعو کیا ان دعوت میں اپنی رائے تھوپنے کی نہ تھی، بلکہ ان کے الفاظ میں ''میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہر شک وشبہ سے بالاتر ہوکر علم ومطالعہ اور تحقیق کے ساتھ آکر بیٹھئے، ایک دوسرے کے آراء اور خیالات کو سمجھئے اور کوئی بھی رائے کثرت رائے یا جبر یا میجارٹی کے ساتھ نہیں چلے گی۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجئے...... موقع اس بات کا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کے عہد کے مختلف علوم کو جاننے والے فضلاء ودانشور بھی یہاں موجود ہوں، یہ خلیج بہر حال پٹنی چاہئے اور امت کے درمیان مسلکوں میں فرق اور اس کے درمیان مختلف صلاحیتوں کا اپنے خول میں بند رہنا یہ اتنا عظیم فتنہ ہے کہ اگر ہم اس پر قابو نہیں پاسکتے تو ہم اس امت کو ترقی کی اس راہ پر نہیں لے جاسکتے جو اس کا حق ہے۔ (مجلّہ فقہ اسلامی صفحہ ۱۴ سیمینار ۳) آگے انہوں نے کہا ''ہم علماء ان دانشوروں سے براہ راست استفادہ کریں اور آپس میں مسالک کے فرق کو بھول کر شریعت کے عام اصولوں کو سامنے رکھ کر ایک ساتھ جمع ہوکر مسائل کو سوچنے کی کوشش کریں، گروہ بندی اور تفریق اسلام میں لعنت ہے۔ دوستو! یہ کبھی بھی موجب رحمت نہیں ہوسکتی، ہندوستان میں اگر اس امت کا تحفظ کرنا ہے تو ہر محاذ پر آپ کو کلمہ کی بنیاد پر اکٹھا ہونا پڑے گا۔ (مرجع مذکور)۔

بعض لوگوں نے کو ان کو جدت پسندی کی طرف راغب بتایا، بعض نے فقہ حنفی کا جنازہ نکالنے کا الزام دیا، جبکہ انہوں نے خود تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی کہ کس طرح کے فقیہ کی ضرورت ہے اور اس کی کیا صفات ہونی چاہئیں، مثلاً اجماعی احکام اور مختلف فیہ احکام سے واقف ہو، احکام کے مدارج سے واقف ہو، شریعت کی روح پر نگاہ رکھتا ہو، طریق استنباط پر نظر رکھتا ہو، شرع کے قواعد کو شاذ اور نادر رائے کی روشنی میں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو، جو شواذ ونوادر کی تلاش میں نہیں، بلکہ قواعد اور دین کے بنیادی اصول کے تحت دین کے تحفظ کا کام کرتا ہو۔ ورنہ کوئی باب ایسا نہیں جس میں کوئی نادر قول آپ کو نہ مل جائے، لیکن نوادر اور شواذ کبھی حجت نہیں رہے ہیں۔ حجت ہیں اصول اور قواعد۔ آگے وہ کہتے ہیں ''ہمیں اس پر

پورا اطمینان ہے، ورع وتقویٰ اور ہوی اور عقل سلیم کے درمیان فرق اور دورِ نبوت سے اور نورِ نبوت سے کسب کرنے کی استعداد۔ ایک طرف مسائل کو علم کی روشنی میں یقین کے ساتھ حل کرنے کا عزم اور دوسری طرف اپنے اوپر اتنا بڑا جرم لادنے کا خطرہ دونوں باتیں جب جب ساتھ ہوں گی تو کام بڑھے گا۔ (مجلّہ فقہ اسلامی صفحہ۱۴ اسیمینار۲)

قاضی صاحب تمام نئے مسائل کے بارے میں مستقل سوچتے رہتے تھے۔ بطورِ خاص جدید نظامِ معیشت، بینکنگ اور انشورنس کے بارے میں انہوں نے غور وخوض کیا اور رونمائی بھی کی۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ فی زمانہ نظامِ معیشت کی باگ ڈور یہودیوں کے ہاتھ میں ہے جس کے مزاج اور خمیر میں سود داخل ہے، اور اس پر نہ صرف قرآن وحدیث بلکہ بائبل بھی شاہد ہے، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور حرام کو حلال کرنے کے لئے حیلہ جوئی ان کی فطرت میں رہی ہے، اسی طرح یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سود اور معیشت پر اپنی گرفت قائم رکھنے کی کوشش ابتدائی دور سے آج تک اس قوم کی تمنا رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہوا اس میں سود اور قمار کی اس طرح آمیزش کی گئی کہ اس نے موجودہ معیشت کے ایک لازمی عنصر کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اسی طرح ان کی اس پر بھی نگاہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام نے جس اداروں مثلاً بینک اور انشورنس کمپنی وغیرہ کو وجود بخشا ہے، ضرورت اس بات کی ہے، طریق کار کی اصلاح کرکے اسے مسلمان بنایا جائے اس سلسلہ میں وہ یہ چاہتے تھے کہ علماء وماہرین کی مدد سے اسلامی بینک کاری کے ایسے نظام کی تشکیل کی جائے جو صرف فکری اور نظریاتی مباحث پر مبنی نہ ہو، بلکہ اس مقصد کے لئے ایک واضح اور عملی شکل کی رہنمائی کرے۔ اس بارے میں جو مشکل ہے اس پر انہوں نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے "بینک کے بنیادی مقاصد، سرمایہ جمع کرنے والوں کے لئے اعتماد اور بھروسہ قائم کرنا، رقم کی حفاظت کرنا اور بروقت ان کے لئے ان کی رقم کی واپسی کو ممکن بنانا منجمد پیسوں کو گردش میں لانا اور غرباء اور اہل حاجت کی ضرورت کے لئے قرض کی فراہمی

ہے۔ غور کیا جائے تو یہ تمام ہی مقاصد وہ ہیں جو اسلام میں مطلوب اور پسندیدہ ہیں، لیکن افسوس ہے کہ جدید بینکنگ کی بنیاد سود اور زر کے ذریعہ کسب زر پر ہے، جو زر کے فطری اور خلقی مقاصد کے خلاف ہے، زر تبادلہ کا ذریعہ ہے، زر قابل ادخار ہے، لیکن اپنی فطرت کے لحاظ سے کسب زر کا ذریعہ نہیں ہے۔ ان واسطوں کی وجہ سے مصنوعات کی لاگت بڑھ جاتی ہے اسی لئے اسلام تجارت کو جائز رکھتا ہے اور سود کو حرام "**احل اللہ البیع وحرم الربا**" بینک کا طریق کار اس کے عین برعکس ہے، وہ تجارت اور براہ راست سرمایہ کاری کو ممنوع قرار دیتا ہے اور سود کو اپنے نظام کا ایک لازمی جز بنالیتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے ہندوستانی بینکنگ قانون کے مطابق کسی بینک کا قیام اور اس کو اسلامی بینک کا نام بلا وضو نماز پڑھنے کے مترادف ہے" اس بارے میں عملاً قاضی صاحب جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ یہ تھا:

"اسلام کی رحمت عامہ کا تقاضا ہے کہ ہم اسلام کے نتیجہ خیز اور ثمر آور اصول معیشت کا قوم وملک کے سامنے تعارف کرائیں۔ صحیح اسلامی معیشت سے لوگوں کو روشناس کریں، احکام شریعت کا انطباق کریں اور کچھ نہ کچھ عملی نمونہ پیش کریں۔ ہمارا فرض ہے کہ قانون ملک کی روشنی میں ایسی صورت پیدا کی جائے کہ براہ راست سرمایہ کاری ہوسکے، نیز ایسا خاکہ تیار کیا جائے اور بروئے کار لایا جائے جو ممکن حد تک ان مقاصد کو پورا کرتا ہو جو شرعی نقطہ نظر سے سود سے پاک ہیں اس سلسلہ میں بنیادی طور پر علماء اور ماہرین معاشیات کے درمیان جس نقطہ نظر پر اتفاق ہے وہ یہ کہ ایک ایسے مالیاتی ادارہ کا خاکہ بنایا جائے جو بینک کے پسندیدہ مقاصد کو پورا کرے، وہ محض خیراتی اور رفاہی ادارہ نہ ہو، بلکہ منافع پیدا کرنے والا ادارہ ہو اور اس کی حسابی جواب دہی اتنی پختہ ہو کہ اس پر اعتماد کیا جاسکے۔" (مجلّہ فقہ اسلامی سیمینار نمبر۴ ص:۲۶)۔

۴۔ جن ملکوں میں مسلم اقلیتیں ہیں ان سے متعلق براہ راست اور واقعی مسائل کیا ہیں؟ ان کا حل کیا ہوگا اس کے لئے وہاں کے علماء سے رابطہ کرنے کے ساتھ ہی وہاں کے خصوصی حالات کے پیش نظر قرآن وحدیث اور فقہی نظائر کو سامنے رکھ کر انہوں نے ایک اصول اخذ کیا

تھا کہ انفرادی معذوری ہے تو اجتماعی معذوری بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ جبری شادی کے مسئلہ پر اور مخصوص جگہوں پر انشورنس کے سلسلہ میں اکیڈمی کی جوازی رائے اسی تناظر میں قائم کی گئی تھی اور اس بارے میں بھی ان کی کوئی رائے انفرادی نہیں، بلکہ ہندوستان کے دوسرے دارالافتاء کے فتوے ان کی تائید میں موجود ہیں جو لوگ انہیں فقہ الاقلیات کے نام پر مطعون کرتے ہیں ان کی نظر اس طرح کے فیصلوں کے پس منظر اور ان کے شرعی ماخذ پر نہیں جاتی۔

۵۔ قاضی صاحب کی ایک نمایاں خوبی حرکیاتی تربیت کا رجحان تھا، وہ فقہ اکیڈمی کے ذریعہ نئے باصلاحیت علماء کو علمی و تحقیقی رخ دینا چاہتے تھے کہ علم و تحقیق کا ماحول بن جائے اور مدارس عربیہ کے ذہین طلبہ کی تربیت اس نہج پر ہو کہ وہ عصر حاضر کے لئے معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کو براہ راست سمجھ کر کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کا حل تلاش کریں، جن مسائل کے بارے میں کتاب وسنت و ذخیرہ فقہ میں کوئی واضح اور متعین جواب نہ مل سکے، ان مسائل کو مقاصد شریعت قواعد فقہ اور فقہ اسلامی کے ثانوی مراجع استحسان وغیرہ کی روشنی میں حل کریں، اس تربیتی مقصد سے ہی عربی مدارس کے طلباء و فضلاء کے تربیتی کیمپ قائم کئے گئے، پہلا کیمپ ضلع غازی آباد کے قصبہ پسونڈہ میں ستمبر ۱۹۹۲ء میں ہوا، یہ کیمپ چار روزہ تھا، مختلف جدید علم کے ماہرین نے شرکاء کیمپ کو ان علوم سے روشناس کرایا اور ان کی بنیادی معلومات پیش کیں اور اصحاب تحقیق علماء نے فقہ اسلامی کے بعض اہم اور اصولی مباحث پر لیکچر دئے۔ اس کے علاوہ اور بھی کیمپ کئے گئے، اسی سلسلہ میں اکیڈمی نے مدارس کے ذہین طلبہ کے لئے تربیتی وظائف (اسکالرشپ) جاری کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ موضوعات تفسیر، حدیث اور فقہ رکھے گئے تھے اور یہ کورس دو سالہ تھا جو بعد میں **المعهد العالي للتدريب في الافتاء والقضاء** (پٹنہ) کی شکل اختیار کر گیا۔

۶۔ قاضی صاحب کی مجموعی اپروچ امتی تھی، وہ فرقہ مسلک اور تنظیم کے سوال سے اوپر اٹھ کر سوچتے تھے ان کا کام انداز یہ ہوتا تھا کہ امت کو کسی چیز کی ضرورت ہے، عقیدہ، فکر دینی دعوت

اور سیاسی قوت کے سلسلہ میں کیا ترجیح قائم کی جائے، اہداف متعین کئے جائیں اور کام کا آغاز کر دیا جائے، چنانچہ جب ملی کونسل بنی تو مقصد صرف ایک نئی روایتی سیاسی تنظیم کھڑی کرنا نہ تھا، بلکہ وہ اسے ایک سیاسی قوت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے جس کا اگر ملکی پیمانے پر محسوس کیا جائے اور ملت اسلامی کی سیاسی ضرورتوں کی تکمیل ہوسکے، اس کے لئے انہوں نے جیسا کہ ہمارے کرم فرما جناب مولانا امین احمد عثمانی، سکریٹری فقہ اکیڈمی انڈیا نے بتایا، تربیت کا ایک پورا منہج تشکیل دیا تھا، کونسل کے ارکان، ذمہ داران اور کارکنوں کی ہمہ جہتی تربیت کا یہ نصاب اخوان المسلمین کے تربیتی نظام سے ماخوذ تھا، جس کے بڑے حصہ کا انتخاب اور ترجمہ کیا جا رہا تھا، انفرادی واجتماعی تربیت سے متعلق انہوں نے اخوان کا پورا لٹریچر بھی منگایا تھا اور اس کا ترجمہ بھی ہوا تھا، المیہ رہا کہ خارجی حالات اور شدید علالت اور مصروفیات کے ہجوم میں وہ یہ اہم کام نہیں کر سکے۔

اب جبکہ قاضی صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوسکتا ہے کہ ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل کی جائے، فقہ اکیڈمی اور ملی کونسل میں انہوں نے جو سکنڈ لائن تیار کی ہے وہ بطور خاص ان کی علمی وفکری امانت کی حامل اور امین ہے، اسے انہیں خطوط پر اور اسی طرز پر ان دونوں اداروں کے مقاصد کی تکمیل کرنی ہوگی جو قاضی صاحب نے وضع کیا تھا، بطور خاص آج جبکہ مسلمان ہند پر آزادی کے بعد غالباً سب سے شدید ترین وقت آ کھڑا ہے اور ہندتو کا عفریت انہیں نگلنے کے لئے ہر آن آگے بڑھ رہا ہے، انہیں اپنے وجود و بقاء کی لڑائی لڑنے کے لئے قاضی صاحب کی سیاسی فکر وبصیرت سے کام لے کر مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، کہ یہی وقت کی پکار بھی ہے حالات کا تقاضا بھی۔

اٹھ کے اب خورشید سفر تازہ کریں
نفس سوختہ شام و سحر تازہ کریں

☆☆

قاضی جیؒ کا سفرآخرت

● نسیم اختر شاہ قیصر

حضرت مولانا مجاہدالاسلام قاسمی رحمہ اللہ کا اس دنیا سے رخصت ہونا نہ تو ایک عہد کا خاتمہ ہے اور نہ ہی ایک دور کا اختتام، البتہ ان کا گزر جانا ایک ایسے انسان کا گزرنا ہے جس کی ملت کو اس وقت شدید ضرورت تھی اور مسلمانانِ ہند جن مسائل سے دینی، سیاسی اور ملکی پلیٹ فارم پر دوچار ہیں ایسے میں ان جیسے دوراندیش، دوربیں، معاملہ فہم، معتدل مزاج، حلیم اور بردبار، ذکی وذہین شخص سے محرومی بلاشبہ بڑا سانحہ ہے اور اس عالم میں یہ سانحہ زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہوجاتا ہے جب جانے والے کا ہزار کوششوں اور جستجو کے بعد بھی متبادل نہیں مل پاتا اور محرومیوں کے اندھیروں میں روشنی کی کوئی کرن نہیں ابھرتی۔

حضرت مولانا مرحوم کی پوری زندگی سعی وکوشش، لگن ومحنت سے عبارت ہے قدم بہ قدم منزل بہ منزل انہوں نے زندگی کا سفر طے کیا اور ہر منزل ان کے عزم وارادے کی گواہ بن گئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور چند ہی سالوں میں اپنی سعید فطرت، نیک طبیعت اور صالح عادات واخلاق کی بناء پر بارگاہ اکابر میں مقبول قرار پائے۔ دارالعلوم سے نکلے تو بہار کو اپنی علمی، دینی اور تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور زندگی کا لمبا وقت اس مردم خیز ریاست میں خدمتِ دین اور خدمت خلق میں گزارا، جامعہ رحمانی مونگیر میں تدریسی خدمات انجام دیں اور امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

وجھارکھنڈ کے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) قرار پائے۔ لفظ قاضی ان کے نام کا جزو بن گیا علمی، دینی حلقوں میں جب بھی قاضی جی کا جانا ہوتا تو سننے والا فوراً سمجھ لیتا کہ اس سے مولانا مجاہدالاسلام قاسمی مراد ہیں، اکثر جگہوں اور مجلسوں میں ان کے نام کے بجائے لفظ قاضی کا چلن ہوگیا تھا۔

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا انہیں اعتبار بھی حاصل تھا اور قرب بھی حضرت امیر شریعتؒ ایک جری، بیباک، صاحب علم اور نہایت فعال انسان تھے، بروقت فیصلوں کی قوت، جرأت کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہنے کی صلاحیت، وقت اور حالات کو پہچاننے، مسائل کی سنگینی اور نزاکت کو سمجھنے کا انہیں ملکہ تھا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

قاضی جیؒ کو حضرت امیر شریعت کی خوب خوب صحبتیں حاصل رہیں، کام کرنے کے کافی مواقع حاصل ہوئے، ملک بھر میں آنے جانے اور مسلمانوں کے مسائل پر قریب سے واقف ہونے کا موقع ملا، سیاسی، سماجی اور دینی ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبوں کو قاضی جی نے قریب سے دیکھا۔ حضرت امیر شریعتؒ جیسی بھاری بھرکم شخصیت کی زندگی میں ہی وہ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قاضی صاحب جیسا صاحب علم وفضل انسان زمانۂ دراز تک ریاست بہار سے باہر نکل کر کچھ کرنے کا وقت نہ نکال سکا وہاں ان کی مصروفیات اس قدر تھیں جس کی بناء پر ان کے لئے وہاں سے نکلنا ایک مشکل کام تھا کبھی کبھی ان حدود سے باہر نکلتے بھی تھے تو مختصر وقت کے لئے، مگر اس مختصر سے وقت میں ہی وہ کافی کام کرجاتے ہر جگہ ان کے مداح ان کو گھیر لیتے اور علمی حلقوں میں ان کا پرتپاک استقبال ہوتا، علم ان کا وسیع، نگاہ عمیق، فکر مستقیم اور عمل کی قوتیں جوان تھیں، یہی وجہ ہے جب وقت نے انہیں تھوڑی فرصت دی تو انہوں نے اپنی فکری اور قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار اور استعمال کیا۔ ان کی تحریروں میں ایک صاحب نظر عالم اور ایک صاحب فکر

انسان بولتا اور گفتگو کرتا ہے، ملی درد اور ملی کرب کو وہ جانتے بھی تھے اور محسوس بھی کرتے تھے، خاص طور پر سیاسی پلیٹ فارم پر مسلمانوں کی محرومیوں اور مایوسیوں کا انہیں بھرپور ادراک تھا۔

آل انڈیا ملی کونسل کے قیام کو اگر تنہا ان کی کوششوں کا نتیجہ کہا جائے تو ایک پہلو سے یہ بات خلاف واقعہ نہ ہوگی۔ ملی کونسل کے وہ سکریٹری جنرل تھے اور سیاسی محاذ پر کونسل کی سرگرمیاں قابل انتفاع رہیں، چند سالوں میں ہی کونسل نے ایک مسلمان کا اعتماد حاصل کیا اور سیاست کے ایوانوں میں اس کی آواز صرف بازگشت بن کر نہ رہی۔ قاضی جیؒ ٹھوس عملی کاموں پر اعتماد کرتے تھے الفاظ کی بازیگری اور بیان بازی کے حربوں سے وہ دور ہی رہتے تھے ان کی نگاہیں مستقبل کے پردوں میں چھپی حقیقتوں کو تاڑ لیتیں اور پھر عمل کی راہوں پر ان کے قدم تیزی کے ساتھ اٹھتے۔

فقہ اکیڈمی کا قیام ان کی دینی بصیرت اور علمی ژرف نگاہی کا شاہکار ہے، اکیڈمی کو جس نہج اور بنیادوں پر وہ لے کر چلے اس سے ان کی سوجھ بوجھ، علمی عظمت اور فکری بلندیوں کا اظہار ہوتا ہے، ملک بھر کے صاحب علم، صاحب تحقیق افراد کو چن چن کر انہوں نے اس کام پر لگادیا۔ دور جدید کے پیدا کردہ مسائل پر ان سب حضرات نے خوب داد تحقیق دی، فقہی اصولوں، شرعی ضابطوں اور استنباط واستخراج کی حدود میں رہ کر امت کو ایک راستہ دکھایا، کھل کر ان مسائل پر بحث ہوئی، متقدمین ومتاخرین کی آراء مختلف مسالک کی توضیحات اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ہر ہر پہلو پر غور ہوتا پھر یہ تمام تر کاوشیں ان ہی اصحاب علم کی تحریروں کی صورت میں مرتب شکل میں سامنے لائی جاتیں۔ فقہ اکیڈمی کی ہر پیشکش موجودہ دور کے علماء اور خود قاضی جیؒ کی فقہی بصیرت، علمی پختگی کی علامت، بلکہ رسوخ فی الدین اور رسوخ فی العلم کی دستاویز ہے۔ اس سلسلہ میں وقت کے نامور عالم حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ سے چند مسائل پر ان کا اختلاف بھی ہوا اور مولانا مرحوم نے بھرپور طریقہ پر ان کی

مخالفت کی۔ یہ مخالفت ذاتی نہ تھی، بلکہ اس مخالفت کی بنیاد علم واخلاص پر قائم تھی اور ایک عام آدمی کی دلچسپی کا اس میں کوئی سامان نہ تھا، اس لئے یہ اختلاف اختلاف امتی رحمۃ کا مصداق بن کر رہا، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پہلے صدر حکیم الاسلام مولانا حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنی علمی شخصیت، علمی عظمت اور معروف علمی نسبتوں کی بنیاد پر عہدۂ صدارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور باوقار شخصیت قرار پائے اور حضرتؒ کے دور میں مسلمانانِ ہند کا یہ مشترکہ پلیٹ فارم پوری مستعدی کے ساتھ مصروف کار رہا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہ منصب دوسری جلیل القدر شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی طرف منتقل ہوگیا اور ۱۶/۱۷ سال تک بورڈ ان کی سربراہی میں بھرپور طریقہ پر اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتا رہا، جب مفکر اسلام نے بھی آخر کار رخصت سفر باندھ لیا تو بورڈ کی صدارت کے لئے جس شخص کا انتخاب ہوا وہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ہی تھے۔ قاضی جیؒ کا زمانہ صدارت نہ تو طویل ہے اور نہ پرجوش، ان کی طویل اور مسلسل بیماری نے ان کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کچھ کرسکیں، کوئی لائحہ عمل دے سکیں، دیکھتے دیکھتے ہی وہ صاحب فراش ہوگئے اور پھر دہلی میں ۴/اپریل ۲۰۰۲ء شب جمعہ کو انہوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کردی، اس طرح ایک دیدہ ور عالم، صاحب فکر انسان، تحریر وقلم کا شہسوار، کامیاب ترین مدرس، پاکیزہ عادات واخلاق کی حامل شخصیت ہمارے درمیان اٹھ گئی۔

راقم الحروف نے متعدد مجلسوں اور جلسوں میں ان کو دیکھا اور سنا گو کبھی ملاقات کی سعادت اور گفتگو کا موقع نصیب نہ ہوا، مگر جب بھی ان کو سنا تو محسوس ہوا کہ ہم جیسے عامیوں میں ان کی بلند علمی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے کی بھی صلاحیت موجود نہیں ہے، ان کی تقریر میں علمی رفعتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایک شگفتگی اور تازگی تھی، خشک اور سپاٹ موضوعات کو بھی وہ طرز ادا اور مخصوص لب ولہجہ سے دلچسپ بنادیتے تھے۔ آخری بار وہ

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی عربی لغت ''القاموس الوحید'' کے رسم اجراء کے موقع پر دیوبند تشریف لائے تو ہجوم امراض کے باوجود پروگرام میں شریک ہوئے اور اپنے معروف ومخصوص انداز میں مختصر تقریر بھی فرمائی اور ان کی یہی تقریر میرے لئے آخری تقریر ثابت ہوئی اس کے بعد پھر کوئی دوسرا ایسا موقع نہ آیا جہاں وہ بولتے اور بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔

☆☆

ایک روشن چراغ بجھ گیا

● شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی

حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، علوم دینیہ کے ایک ممتاز جید عالم ربانی تھا اور شرعی امور کے ایک متبحر فقیہ مجتہد تھے اور ملی معاملات کے اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے اور ملکی وعالمی ہمہ جہتی مسائل (تعلیمی، سماجی، سیاسی) سے پوری طرح باخبر اور حالات حاضرہ سے براہ راست مکمل واقف ایک بلند پایہ رہنما تھے۔ ان ظاہری ''علمی، فکری، قانونی، سیاسی'' خوبیوں کے ساتھ باطنی ''روحانیت، بصیرت، فراست'' کے اوصاف سے بی متصف تھے۔ بلاشبہ آپ گزری بیسویں صدی اور جاری اکیسویں صدی کے ایک جامع کمالات عبقری شخصیت اور بزرگ ہستی تھے۔ ملت اسلامیہ ''ہندو عالم'' کے لئے تو آپ سب کچھ تھے ہی، ملک اور عالم انسانی کے لئے بھی آپ بہت کچھ تھے آپ کے علمی، فکری اور عملی ملکہ وکاوش سے پوری امت محمدیہ (امت اجابت وامت دعوت) فیضیاب ومستفید ہوئی ہے۔ مسالک ومکاتب فکر کی تمیز اور مذاہب کی تفریق کے بغیر آپ سب کے خیر خواہ وہمدرد، سب کے لئے فکر مند ودعا گو تھے۔ طبقہ علماء سے ہونے کی وجہ سے اہل علم وادب سے اور ہندوستانی ہونے کی وجہ سے اہل ملک سے آپ کا خصوصی جذباتی تعلق تھا۔ ملک کی خوشحالی وترقی اور سارے عالم میں اس کی شہرت ونیک نامی کے آپ ہمیشہ خواہاں تھے اور اس کے لئے کوشاں رہے۔ ملک میں کہیں بھی کوئی حادثہ (قحط، سیلاب، زلزلہ) ہوتا یا کوئی فتنہ (بلوا، فساد) ہوتا تو آپ حد درجہ بے چین ہوجاتے اور متاثرین کی راحت رسانی کے لئے شب وروز مصروف کار رہتے۔

اللہ نے آپ کو ظاہری ومعنوی، علمی وروحانی استعداد سے خوب بہرہ ور اور مالا مال فرمایا تھا۔ آپ کی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں ملت اسلامیہ اور عالم انسانی، ملک اور عالم اسلام کے نام تاحیات معنون رہیں۔ آپ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے نائب امیر شریعت اور اس کے دار القضاء کے قاضی القضاۃ تھے۔ آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے اور آل انڈیا ملی کونسل کے اس کے زمانہ قیام ۱۹۹۲ء سے تاحیات سکریٹری جنرل تھے اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے، اس کے زمانہ قیام ۱۹۸۹ء سے تاحیات سکریٹری جنرل تھے۔ مگر یہ مناصب بظاہر تھے، ورنہ حقیقت یہ رفاعی فقیر جانتا ہے کہ نہ صرف ملک کے، بلکہ عالم اسلام اور دیگر ممالک کے تمام تنظیموں اور تحریکوں اور علمی فکری، ادبی، فلاحی، اصلاحی، دعوتی اداروں کو آپ اپنا سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے مسائل کو حل کرنے، ان کی ترقیات کے لئے کوشاں رہنے، ان کے پروگراموں میں شرکت کرنے اور ان کی امداد ومعاونت کے لئے جدوجہد کرنے کو اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔

اس سیہ پوش رفاعی فقیر کا یوں تو آپ سے تعلق ۱۹۷۵ء سے رہا، مگر ۱۹۹۰ء سے بہت قریب ہوا اور ۱۹۹۲ء سے تو قریب تر ہو گیا۔ گزشتہ دس سالوں میں سفر میں حضر میں آپ کو بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ ہر ہر موقع پر اس فقیر نے آپ کو ملی تمام اختلافی ونزاعی مسائل میں الجھنے سے مبرا اور ہر گروہ طبقہ کے حق میں خیر خواہ ودعا گو ہی پایا۔ ملک وعالم میں عوام وخواص دونوں طبقوں کے حالات ومسائل سے آپ بہت زیادہ واقف تھے۔ جدید تعلیم یافتہ اور مالدار طبقہ کی مادہ پرستی ونفس پروری سے اس کے اسراف اور بے جا اخراجات کی عادت سے اور اخلاقیات میں دن بدن اس کے بے توجہی سے آپ بہت متفکر رہتے تھے اور اسی طرح غریب طبقات کی طرف سے بھی بہت مغموم رہتے کہ تعلیمی ومعاشی اعتبار سے ان کی پسماندگی دن بدن بڑھتی جارہی ہے، ایک طرف نوے فیصد سے زائد وہ انسان ہیں جو بنیادی ضروریات وحاجات کے لئے محتاج سے محتاج تر ہوتے جارہے ہیں۔

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

آپ ایک خوشحال وترقی یافتہ انسانی سماج کے ہمیشہ خواہشمند رہے اور مختلف ذرائع سے اس کے لئے تاحیات کوشاں بھی رہے حضرت قاضی صاحب یوں تو انسانی تمام طبقات کے لئے ایک نمونہ تھے، لیکن طبقہ علماء کے لئے بطور خاص آپ کی زندگی ایک مکمل اسوہ تھی۔ ملک وملت اور عالم انسانی کی دارین میں صلاح وفلاح کے لئے آپ کا ذہن ہمہ وقت سوچ میں رہتا تھا اور آپ عملاً بھی اس کے لئے سرگرم عمل رہتے تھے۔ آپ رنگ ونسل، علاقہ وزبان، مسلک وطبقہ، پارٹی وجماعت وغیرہ ہر طرح کی وابستگیوں کے تعصب اور ہر طرح کے مفادات سے بالاتر رہے۔ بلاشبہ آپ ایک ولی اللہ تھے۔ پوری للّٰہیت سے اور بے لوثی سے آپ نے ملک وملت اور عالم انسانی کی ہر جہت سے شب وروز خدمت کو معمول حیات بنایا تھا۔

آپ اعلیٰ درجہ کے عالم، فقیہ، قاضی اور مجتہد تھے۔ آپ اعلیٰ درجہ کے مفکر، مدبر اور منتظم تھے، آپ اعلیٰ درجہ کے دینی رہبر، ملی رہنما، قومی پیشوا اور سیاسی قائد تھے۔ آپ صوفی، زاہد، ذاکر اور درویش تھے۔ آپ نہایت شفیق وخلیق اور وسیع القلب اشرف انسان تھے۔ ایسی جامع الامتیازات شخصیت ۴؍اپریل ۲۰۰۲ کو اس دنیا سے اللہ کو پیاری ہوئی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے صدمہ سے ہم سنبھلے بھی نہیں تھے کہ آپ کی رحلت کا عظیم سانحہ پیش آیا۔ آپ کے وصال سے پوری ملت اسلامیہ اور عالم انسانی رنجیدہ وغمزدہ ہے۔ اللہ نے آپ کو ایک چراغ بنایا تھا، تاحیات دوسروں تک حق کی روشنی آپ پہنچاتے رہے۔ اس چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن ہوتے رہے ہیں۔ اصل چراغ تو بجھ گیا، مگر علمی وفقہی، فکری وادبی تعلیمی وتہذیبی، معاشی ومعاشرتی اور ثقافتی وسیاسی ہر میدان عمل کے لئے اس چراغ سے روشن مردان کاران کی وراثت کے طور پر حیات ہیں، جن سے ملک وملت اور عالم انسانی مستفید ومستفیض ہوتی رہے گی اور ان چراغوں سے چراغ روشن ہوتے رہیں گے اور یہ تمام ہستیاں اور ان کی کاوشیں مرد مجاہد، مجاہد الاسلام کے لئے صدقہ جاریہ ہوں گی۔

☆☆

"

آج کے دور میں خاص کر جب کہ احکام شرع کا بوجھ سر سے اتار کر ہر شی کو جائز قرار دینے کا رجحان بڑھا ہوا ہے اور دوسری طرف احوال ناس کے تغیر اور عرف وعادات کی تبدیلی نے واقعتاً کچھ مشکلات پیدا کردی ہیں، فقہاء کا فرض بہت نازک ہوجاتا ہے کہ وہ مقاصد تشریع کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے ہوئے معاشرہ کی مشکلات کو بھی دور کریں اور دوسری طرف اباحیت کا راستہ بھی بند کریں جو مغربی تہذیب کا خاص تحفہ ہے۔

چونکہ انسان کمزور پیدا ہوا ہے اور بسا اوقات وہ مشقتوں کو برداشت نہیں کرپاتا اور اس کو ایسے اندیشے پیش آتے ہیں جو واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے پرہیز کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں، اسلام دین فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ طاقتور اور کمزور تندرست، بیمار، قادر اور معذور کو اچھی طرح جانتا ہے چنانچہ دین فطرت کا تقاضا ہے کہ ان مختلف حالات کی رعایت کی جائے اور ہر حال میں ایسا حکم صادر کیا جائے جو اس حال کے مناسب ہو۔

"

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور ۳۷ سالہ رفاقت

● مولانا سید نظام الدین

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ صاحب قاضی شریعت سے پہلی ملاقات ۱۹۵۸ء میں جامعہ رحمانی مونگیر میں ہوئی، وہاں وہ دو سال سے تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس وقت وہ دبلے پتلے، چھریرے بدن کے ایک نوجوان تھے اور دیکھنے میں ایک طالب علم معلوم ہوتے تھے، لیکن اس وقت بھی ان کا شمار جامعہ رحمانی کے ممتاز اساتذہ میں تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ان کو جامعہ میں لے آئے ان کے ساتھ کافی شفقت کا برتاؤ کرتے، اس زمانہ میں آزاد مدارس کا بورڈ قائم ہوا اور قاضی صاحب اس کے روح رواں بنائے گئے، اس کی ایک میٹنگ میں، میں مونگیر حاضر ہوا، اس کے جلسہ میں میری ایک تقریر مجمع کو پسند آئی، دوسری ملاقات ۱۹۶۰ء میں جبکہ جامعہ رحمانی مونگیر میں امارت شرعیہ کی طرف سے تربیت قضاء کا انعقاد ہوا تھا، اس کے دوسرے ہفتہ میں شریک ہوا، علماء میں قضا کے فن کو جاننے اور عملی طور پر اس کے اصولوں کو انجام دینے، توسیع دارالقضاء کے لئے قضاۃ تیار کرنے کے لئے یہ اجتماع بلالیا تھا، جو بڑی حد تک کامیاب رہا، اس کے بعد ہی صوبہ کے مختلف علاقوں میں امارت شرعیہ کی طرف سے دارالقضاء قائم ہوئے، اس عرصہ میں حضرت قاضی صاحب کی فقہی صلاحیت اور فن قضاء سے مناسبت بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور وہ بھی مجھ سے

بہت مانوس رہے، بالآخر ان کی تحریک پر امیر شریعت رابعؒ نے مجھ سے عہدۂ نظامت کو سنبھالنے کی فرائش کی، مگر میں اس وقت ''مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی چمپارن'' (بہار) میں صدر مدرس تھا اور بہت سارے اچھے لڑکے زیر تعلیم تھے، اس لئے فوری طور پر وعدہ نہ کرسکا۔ ۱۹۶۱ء میں مدرسہ کے بانی مولانا ریاض احمد صاحب کا وصال ہوگیا وہ مجھ پر بہت شفیق تھے اور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن اللہ کی طرف سے یہ انتظام ہوا کہ میرے بہت سے شاگرد دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر مدرسہ میں آگئے اور میں نے ان کو نظم ونسق اور تدریس کا کام سپرد کردیا ایک سال رہ کر ان کو تربیت دی اور ۱۹۶۲ء میں گھر چلا گیا، اس درمیان امارت شرعیہ کے قدیم ناظم مولانا قاضی احمد حسین صاحب (ممبر پارلیمنٹ) کا انتقال ہوگیا اور حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری عہدۂ قضاء سے الگ ہوگئے، اس فوری ضرورت کو دیکھتے ہوئے اور قاضی صاحب کی صلاحیت پر پورا اعتماد کرتے ہوئے ان سے امیر شریعت رابع نے پوچھا کہ آپ امارت جاسکتے ہیں، انہوں نے آمادگی ظاہر کردی اور ۱۹۶۲ء میں ناظم اور قاضی کے عہدہ سے امارت شرعیہ آئے اور میں نے مدرسہ رشید العلوم چترا میں صدر مدرس کی خدمت اختیار کرلی، دوسال کے بعد ۱۹۶۴ء کے آخر میں امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نائب امیر شریعت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ اور مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ کے اصرار پر امارت شرعیہ کے قافلہ میں شامل ہوگیا، پھر حضرت امیر شریعتؒ نے قضاء کے عہدہ پر قاضی صاحب کو باقی رکھا اور نظامت کا عہدہ میرے سپرد کردیا۔

اس وقت سے ہم دونوں نے ساتھ مل کر اپنے عہدوں کا فرق کئے بغیر امارت شرعیہ کے سارے کام کو انجام دینا شروع کیا، سب سے پہلے عوام میں اتحاد بحال کرنا تھا اس کے لئے تنظیمی علاقوں کا دورہ کرنا تھا اور تمام شعبوں کی ترقی کے لئے مالی استحکام کا نظم کرنا، ہم دونوں نے اس وقت کے کارکنانوں اور مبلغوں کو ساتھ لے کر پوری لگن کے ساتھ اس کام کو

انجام دیا اور اللہ کا شکر ہے کہ ہر مرحلہ میں کامیاب رہے۔ اس طرح ۱۹۶۴ء سے ۲۰۰۲ء یعنی ۳۷ سال تک ہر کام میں ساتھ رہے، یہ بات ضرور تھی کہ ہمارے منصوبوں کی کامیابی قاضی صاحب کی ذہانت ان کی اقدامی صلاحیت، ارادے کی پختگی، راستہ کی صعوبتوں کو جھیلنے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی پوری صلاحیت تھی اور اس سے ہمیں اپنے دوروں کو کامیاب بنانے میں مدد ملتی رہی، جس کام کو شروع کرتے پورے جوش ولگن کے ساتھ کرتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی لگاتے، اس طرح امارت شرعیہ کا اول دور ۵۷ء،۶،۱۹۶۵ء تک شدید مالی بحران کا دور تھا، افراد کی کمی تھی، معاونین ومخلصین انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، اکثر ہم لوگ دفتر کے مالی حالت کو دیکھ کر باہر نکل جاتے، بڑی مشقتوں کے بعد کچھ کام کرکے لاتے تو اس سے کام چلتا تھا، ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی پہلی جنگ ہوئی تو اس میں امارت شرعیہ نے جو معتدل موقف اختیار کیا اس میں امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی حکمت عملی کو بڑا دخل تھا۔ ۶؍جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر، اردن اور شام پر حملہ کرکے اس کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا، اس سے پوری دنیا میں اسرائیل کے خلاف غم وغصہ کی شدید لہر دوڑ گئی اور ان کی بے بسی پر امت مسلمہ میں ایک خاص ہمدردی پیدا ہوئی، اس موقع پر امارت شرعیہ کی طرف سے ان تینوں ممالک کو امداد پہنچانے کی اپیل کردی گئی، یہ اپیل ۲۵؍جون کو جاری ہوئی اور ۶؍اگست کو ایک فلسطین کے مسئلہ پر اجتماع کا اعلان کردیا گیا جو انجمن اسلامیہ پٹنہ میں منعقد ہوئی۔ اس کا بڑا زبردست اثر ہوا اور اس کا بھرپور مالی تعاون سے اس کو کامیاب بنایا، شام کے سفیر عمر ابوعیسیٰ، مصر کے نمائندہ سفیر منعام المصری شریک ہوئے۔ انجمن اسلامیہ میں جلسہ ہوا، عمر ابوعیسیٰ نے عربی میں پُرجوش تقریر کی، ہلکی بارش ہورہی تھی، مجمع بھیگ رہا تھا، لیکن بالکل پرسکون تھا، مولانا مجاہدالاسلام قاسمی کا جوہر اس وقت نمایاں ہوا جب عمر ابوعیسیٰ کی تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا کہ پورا میدان داد تحسین سے گونج اٹھا، جب تقریر ختم ہوئی تو ابوعیسیٰ نے کھڑے ہوکر قاضی صاحب سے معانقہ کیا اور

کہا کہ میری باتوں کو آپ نے مجھ سے بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ اجلاس حضرت امیر شریعت رابع کی صدارت میں منعقد ہوا اس اجلاس میں قاضی صاحب کی شہرۂ آفاق تقریر نے اچانک امارت شرعیہ کو پستی سے بلندی کے رخ پر ڈال دیا اور کہنا چاہیے کہ یہ اجلاس امارت شرعیہ کے لئے سنگ میل ثابت ہوا۔ اسی موقع پر جناب کلیم عاجز صاحب جو بہار کے ممتاز شاعر ہیں بڑا معرکۃ الآراء مضمون لکھا، جس کو نقیب اور دیگر اخبارات نے شائع کیا، اس اجلاس میں بہار کے مسلمانوں کی طرف سے تینوں ممالک کو ۵۷ ہزار روپے پیش کئے گئے اور پھر اس طرح سے ۲۱/ اگست کو دہلی میں سیمینار کر کے وہاں اردن کے سفیر کو بلایا گیا جو پٹنہ نہیں آسکے تھے اور ان کی خدمت میں ۲۵ ہزار پیش کئے گئے، اس طرح ایک لاکھ دیا گیا۔ اسرائیل کے ظالمانہ رویہ کی مذمت کی گئی، اسی ۱۹۶۷ء میں ۲۲/ اگست کو فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں مجھ کو جانا پڑا قاضی صاحب نے دفتر نظامت کو سنبھالا اور میں جتنی اطلاعات بھیجتا تھا اس سے وہ پورے ہندوستان کو باخبر کرتے تھے، اس طرح رانچی، سیتامڑھی، گرڈیہ وغیرہ کے فسادات میں امارت نے نمایاں خدمات انجام دی۔ اس میں قاضی صاحب کی حکمت عملی کو بڑا دخل تھا، واقعات سے ملک بھر کے لوگوں کو باخبر کرتے تھے، اس طرح رقم اور سامان آتا گیا اور ہمارے کارکن حضرت مولانا عبداللہ مرحوم اور اس کے بعض اہم شعبہ جات کو ترقی دینے کے لئے مالی ترقی پیدا ہوئی، نقیب میں شاہد رام نگری کو ایڈیٹر کے طور پر بلایا گیا اور وہ تقریباً ۱۶ سال تک نقیب سے منسلک رہے، ان کے اداریے اور سیاسی تبصرے بہت پسند کئے جاتے اور اخبارات میں شائع ہوتے۔ اس کے وفود کے دوروں کا ہر سال مسلسل پروگرام ہوتا رہا جس میں قاضی صاحب اور میں پیدل، بیل گاڑی سے سفر کرتے تھے اور گاؤں گاؤں جاتے تھے، اکثر دوروں میں امیر شریعت رابع بھی شریک ہوتے تھے، امارت شرعیہ میں سب سے پہلی رجسٹری دارالقضاء کے مکان کے لئے ہوئی، اسی سال پانی اور بجلی کا مناسب انتظام ہوا۔

فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر دوسرے ملی مسائل کے سلسلہ میں بہار کے ذمہ داروں سے ملنے کا سلسلہ رہا، اسی طرح حکومت نے بھی امارت شرعیہ کے اثر کو قبول کیا۔ اسی قدیم دفتر میں شوریٰ کا اجلاس بھی ہونے لگا، بعض ہنگامی اجلاس بھی ہوئے اور وزراء کی آمد کا سلسلہ بھی رہتا، اس میں ایک وزیر آئے اور انہوں نے امیر شریعت سے کہا کہ اتنا بڑا کام ہو رہا ہے اور یہاں تک پہنچنا مشکل ہے کسی اور جگہ کو خرید یئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے انگریزوں سے تو نہیں مانگا، پتہ نہیں آپ دیں گے یا نہیں، انہوں نے کہا سرکاری زمین ہوگی تو دیں گے، جناب سراج احمد دفتر بیت المال میں تھے جو کاغذات سمجھتے تھے ان کے حوالہ یہ کام کیا گیا اور آج جہاں یہ دفتر قائم اور P.W.D کی زمین ہے جس کے متعلق ۱۹۷۳ء میں جب کہ عبدالغفور صاحب وزیر اعلیٰ تھے پہلی درخواست دی گئی، آٹھ سال تک کارروائی چلتی رہی، بالآخر عبدالغفور صاحب نے استعفیٰ دے دیا اس زمانے میں جناب اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی گورنر ہو کر آئے، ہم لوگوں نے دفتر امارت شرعیہ آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے قبول کیا، ہمارے پاس جگہ نہیں تھی، شیش محل میں بلایا، انہوں نے دفتر کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا، بہت خوش ہوئے، جب ان سے کشادہ زمین کی ضرورت کی بات کہی اور کہا کہ درخواست دی ہوئی ہے تب انہوں نے کہا کہ آپ اپنی درخواست مجھے بھیج دیجئے، وہ درخواست ان تک پہنچی، وہ اپنی ایڈوائزری کمیٹی کو دے دیا، اس نے توجہ کی اور سفارش کی کہ ایک ایکڑ زمین امارت شرعیہ کو دی جائے، اسی درمیان جگن ناتھ مشرا کی سرکار آگئی یہ مسئلہ گورنمنٹ میں پیش ہوا، ۶/ دسمبر ۱۹۸۰ء کو لیز پر یہ زمین امارت شرعیہ کو دی گئی۔ ۲۰/ فروری ۱۹۸۱ء کو زمین کی رجسٹری ہوئی، مگر افسوس کہ اس زمین کے حصول کے لئے شب وروز جدوجہد کرنی پڑی۔ جناب سراج احمد صاحب کا ۲/ فروری کو انتقال ہوگیا سب سے زیادہ خوشی ان کو ہوتی اگر وہ زندہ ہوتے، بڑی مشکلوں سے ۲۰/ اپریل ۱۹۸۱ء کو زمین پر قبضہ ملا، مولانا احمد حسین صاحب نائب ناظم اس مسئلہ میں آگے آگے تھے، ان کی حکمت عملی اور

اقدام سے بہت سی منزلیں آسان ہوئیں، مگر قاضی صاحب کی دوراندیشی نے بہت اہم کام کیا۔ زمین کی دوبارہ پیمائش کرائی گئی اور اس کے لئے قاضی صاحب خود کھڑے رہے اور جو عجلت میں کم ناپ دی گئی تھی اس کو پورا کرایا اور پورے ایک ایکڑ پر نشان لگا دیا گیا، اس وقت پولیس افسر اور سب سے بڑھ کر ناپنے والے امین سے نمٹنا، نقشہ کو سمجھنا اور کاغذات پر پورا عبور رکھنا یہ قاضی صاحب کی اس خداد صلاحیت سے ہوا کہ اس فن میں بھی اللہ نے بڑی صلاحیت عطا کی تھی۔

زمین حاصل ہوجانے کے بعد میں نے جناب فہیم الدین مرحوم کے مشورے سے ۳۷۰ فٹ کی چہار دیواری ۷؍مئی سے ۲۰؍مئی تک کی مدت میں کھڑی کروادی جس میں ۸۰ ہزار اینٹ خرچ ہوئی، مگر پوری زمین محفوظ ہوگئی، اس کے بعد یہ زمین بالکل تالاب کی شکل میں تھی جس میں کہیں دس فٹ اور کہیں پندرہ فٹ پانی بھرا ہوا تھا، اس کے بھروانے میں کافی وقت لگا، لیکن کام مسلسل جاری رہا، بالآخر ۲۲؍مئی ۱۹۸۱ء میں سنگ بنیاد کے اجلاس کا اعلان ہوا جس میں جناب عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی بھی شریک ہوئے، وزیر اعلیٰ بہار جگن ناتھ مشرا اور شہر کے دوسرے مقررین پہنچے اور حضرت امیر شریعت نے بنیاد رکھی۔ اس اجلاس میں حاضرین سے قاضی صاحب نے اپنے خاص انداز میں خطاب کیا، اس کے بعد حضرت امیر شریعت نے لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ کمرے کی تعمیر کا بار اٹھا لیجئے تو دس منٹ میں ۵؍لاکھ ۴۰ ہزار کا اعلان آ گیا جس نے اسٹیج پر بیٹھے وزراء اور پٹنہ کے دانشوروں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس وقت لوگوں نے امارت کے اثر کو جانا، اس کے بعد اس رقم کی وصولی کے لئے وفود کی تشکیل اور دوروں کو کامیاب بنانے کیلئے حضرت قاضی صاحب کے کارناموں کو نمایاں حرفوں میں لکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے دسمبر سے مارچ تک وفود کے دوروں کا نقشہ بنایا اور پورے جنوب ومشرق کا دورہ کیا اس میں قاضی صاحب پر جوجوش کا غلبہ تھا اور دیہاتیوں کے سامنے جو تقریر کرتے تھے اور ٹیکنیکل کا نقشہ جس طرح دکھاتے تھے یہ انہیں کا

حصہ تھا، پوری بات لوگوں کو سمجھ میں آجاتی تھی، دیہات کا بچہ اور عورت تعمیر میں چندہ دینے سے گریز نہیں کرتا تھا اس طرح وہ رقم چند ماہ میں حاصل ہوگئی۔

پھر اس کے بعد مئی ۱۹۸۲ء سے کام شروع ہوا اور الحمدللہ دارالامارہ ۱۹۸۴ء میں مکمل ہوگیا اور قدیم مکان سے منتقل ہوا اور پھر نومبر میں بڑے عظیم الشان پیمانے پر اس جدید عمارت کا افتتاح ہوا اس میں قاضی صاحب نے معرکۃ الآراء تقریر جس جوش وخروش کے عالم میں کی اور امارت کے مستقبل کے خاکوں کو جس انداز میں پیش کیا، وہ انہیں کا حصہ تھا، اس کے بعد اسپتال کا حضرت امیر شریعت رابع کے مشورہ سے پہلی منزل کا کام شروع ہوا اور تعمیر مکمل ہونے کے بعد ۲۰؍نومبر ۱۹۸۸ء میں افتتاح ہوا اس اسپتال کی تعمیر میں بھی جناب حاجی واجد علی صاحب جو حضرت قاضی صاحب سے بے حد متاثر تھے ان کا گرانقدر عطیہ بھی ان کی کوششوں سے حاصل ہوا۔ اس کے بعد اسپتال کی دوسری منزل کی تعمیر حضرت امیر شریعت رابع کے وصال کے بعد وزیر اعلیٰ بہار لالو پرشاد یادو کے ہاتھوں ہوئی۔ میٹرنیٹی کا شعبہ قائم کیا گیا، پھر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد بھی رکھی گئی اور اس کی تعمیر بھی ہوئی، اس کا افتتاح بھی بڑے شاندار طریقہ پر ہوا، دارالامارہ کی دوسری منزل بھی قاضی صاحب کی کوششوں اور تحریک سے تکمیل تک پہنچی، امیر شریعت رابع کے زمانہ میں ہی اس کا بھی افتتاح ہوا۔ طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ قاضی صاحب کے مشورہ سے منصوبہ تیار ہوتا اور سب لوگ اس کی تکمیل میں لگ جاتے، اس طرح اسپتال کی تیسری منزل اور الٹرا ساؤنڈ وغیرہ کے لئے الگ سے کمروں کی تعمیر ہوگئی۔ پھر آہستہ آہستہ المعہد العالی کی عالی شان عمارت اور قاضی مسجد کی تعمیر بھی عمل میں آئی، قاضی صاحب کا ذہن تعمیری تھا اور برابر کوئی نہ کوئی تعمیری منصوبہ ان کے ذہن میں رہتا۔ پورنیہ اور دربھنگہ میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی زندگی میں امارت شرعیہ میں بڑے پیمانے پر جلسے ہوئے، سیمینار ہوئے، بہار کے دوسرے شہروں میں بھی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، ان میں وہ

برابر شریک رہتے۔

اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام ممبئی کنونشن اور پھر اس کے تمام جلسوں میں ان کا بہت اہم رول رہا۔ان جلسوں میں ان کی معرکۃ الآرا تقریر کا چرچا بہت دنوں تک جاری رہتا تھا۔ وہ مسئلہ امارت، مسلم پرسنل لا بورڈ اور حقوق انسانی کے بہترین وکیل تھے، اپنی بات مؤثر طور پر دلائل کے ساتھ کہتے اور مخاطب کو مطمئن کردینا ان کی خاص خوبی تھی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہونے سے پہلے تقریباً ۲۷ سال تک بغیر کسی عہدہ کے کام کیا، ہم لوگ ان کے ساتھ کام کرتے تھے۔

۵؍سال پہلے بیمار ہوئے جانچ کے بعد مہلک مرض ثابت ہوا، مگر پھر اللہ نے ایک حد تک شفایاب کیا اور ملک وبیرون ملک کا سفر بھی کرتے رہے۔ اسی درمیان حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جو بورڈ کے صدر تھے ان کا وصال ہوگیا تو آپ کو ۲۳؍اپریل ۲۰۰۲ء میں ارکان بورڈ نے اتفاق رائے سے بورڈ کا صدر منتخب کیا اور آپ نے بورڈ کے استحکام کے لئے ہر جہت سے جدوجہد کی، بنگلور کا سفر کیا، بنگلور میں بورڈ کا کامیاب اجلاس ہوا، اس کے بعد طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی، مگر ان کا علمی سفر جاری رہا، اسی درمیان مجموعہ قوانین اسلامی کو نظر ثانی کے بعد طبع کرایا۔ طبیعت دن بدن خراب ہونے لگی دواوعلاج جاری تھا اور وقت موعود آپہنچا اور وہ ۴؍اپریل ۲۰۰۲ کو اللہ کے پیارے ہوگئے۔ فرحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ افسوس کہ ہم ایک ۳۷ سالہ رفیق اور ملت اسلامیہ کے سالار سے محروم ہوگئے، اللہ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے (آمین)۔

☆☆

ایک یادگار سفر-نقوش وتاثرات

● مولانا محمد اسلام قاسمی

حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نوراللہ مرقدہ کے ساتھ ایک تاریخی اور یادگار سفر، ازبکستان کے شہر تاشقند، سمرقند اور بخارا کا ہے جو ۱۹۹۳ء کے اواخر میں ہوا، تقریب تھی ”امام بخاری کانفرنس“، جس کا انعقاد آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے زیر انتظام تھا اور اس میں دنیا بھر سے معروف علماء دین، محدثین عظام، علم وتحقیق سے وابستہ افراد، اہم ترین اسلامی شخصیات اور بعض مسلم ممالک کے وزراء وغیرہ پر مشتمل دوسو سے زائد کی نمائندگی ہوئی۔

یوں تو اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی حضرت قاضی صاحب کی شخصیت سے واقف تھا، جب دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے اور اس کے عظیم الشان تحتانی ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا، طلبہ واساتذہ سبھی موجود تھے، پہلی بار ان کی تقریر سنی، اللہ نے خطابت کا انہیں ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، انداز بیان سہل، اسلوب عمدہ، تفہیم کی قوت، مدلل طریقۂ خطابت، تسلسل وروانی اور وہ تمام خوبیاں جو خطاب کو درکار ہوتی ہیں حضرت قاضی صاحبؒ کی تقریر میں ہوتیں۔

اس کے بعد مختلف موقعوں پر حضرت قاضی صاحبؒ کی مجلس میں شرکت ہوئی، ان کو قریب سے دیکھا، ان کی علمی نوادرات اور تحقیق کی باتیں بھی سنیں، دیوبند، دہلی، پٹنہ اور دوسرے مقامات پر ہزاروں کے عوامی اجتماعات میں بھی اور علماء ومفکرین کی خصوصی مجلسوں میں بھی ہر ہر جگہ ان کی عبقری شخصیت نمایاں ہوتی اور ہر بات ان کی علمی، تحقیقی ہوتی اور جب

علماء ومفکرین اور دانشوروں کے سامنے مسلم پرسنل لا بورڈ کی ترجمانی کررہے ہوتے تو محسوس ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیچیدہ مسائل کے حل اور مؤثر انداز بیان کی وہ قوت عطا فرمائی ہے جو ان کو اکابر علماء اہل علم ودانش اور ارباب سیاست میں سب سے نمایاں کرتی ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ۱۹۷۲ء میں ہوا اور اس کے سب سے پہلے صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند منتخب ہوئے اور جنرل سکریٹری کے اہم ترین عہدہ پر امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ فائز ہوئے تو بورڈ کے تمام امور کی انجام دہی حضرت امیر شریعت کی نگرانی وترتیب میں انجام پاتی رہی اور اس کی ترجمانی درحقیقت حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کے سپرد رہی، اس طرح بورڈ کی ابتداء سے حضرت قاضی صاحب کی صدارت کے دور تک فقہی اور قانونی مسائل اور ان کی گتھیوں کے حل میں سب سے اہم کردار حضرت قاضی صاحب کا ہی رہا۔

اتنی عظیم شخصیت کے ساتھ دس روزہ سفر کی سعادت میرے لئے ایک یادگار رہے اور جیسا کہ تجربہ ہے سفر میں انسان کے اوصاف وکمالات بھی ظاہر ہوتے ہیں اور کمزوریاں بھی اجاگر ہوتی ہیں، چنانچہ اس سفر میں حضرت قاضی صاحب کی وہ خوبیاں بھی ظاہر ہوئیں جو موجودہ زمانے کے بڑے علماء میں بھی عام طور پر مفقود ہوتی ہیں، تواضع اور انکساری تو حضرت کا امتیازی پہلو ہے ہمدردی، غم گساری، حوصلہ افزائی اور خورد نوازی بھی ان میں بیحد تھی۔

اس سفر میں ہندوستان کے مؤقر علماء اور اہم افراد مدعو تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ ندویؒ بھی ایک وفد کے ہمراہ تھے۔ یہ کانفرنس ان کی ہی صدارت میں تھی، دیوبند سے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دار العلوم وقف دیوبند اور ان کے رفیق سفر مولانا محمد سفیان قاسمی تھے۔ راقم الحروف ان کے ساتھ دہلی ایئرپورٹ پر پہنچا تو وہاں حضرت قاضی صاحب سے ملاقات ہوئی، بے حد خوشی کا اظہار فرمایا، میرا یہ پہلا غیر ملکی سفر تھا اور میں پان کھانے کا عادی تھا، حضرت قاضی صاحب سے دریافت کیا کہ ازبکستان میں

پان بھی دستیاب ہوگا یا نہیں، اس لئے کہ میرے پاس اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ انہوں نے بڑے ہمدردانہ انداز میں مجھے غور سے دیکھا ایسا لگا کہ وہ میری بے بسی پر مسکرائے بھی، مگر کوئی جواب نہیں دیا، جب بورڈنگ کا وقت قریب ہوا تو میں نے ان کا سامان اٹھایا، ایک بیگ تھا جس میں کاغذات وغیرہ اور کچھ دواؤں کے ڈبے تھے اور دوسرا سامان ایک عام سا سفری تھیلا تھا، فرمایا کہ اس تھیلے کو اپنی حفاظت میں رکھنا اس میں تمہارے درد کی دوا ہے اور غم کا علاج بھی، دیکھا تو کچھ اردو وعربی کے رسالے اور چند کتابیں نظر آئیں۔

تاشقند ایئرپورٹ پر اترے تو جہاز کے دروازے کے قریب ہی منتظمین کانفرنس اور استقبالیہ کے اراکین موجود تھے وہاں سے ہمیں ''ازبکستان ہوٹل'' پہنچا دیا گیا، یہ عظیم الشان ہوٹل ہے جہاں عارضی طور پر مہمانوں کے قیام کے لئے انتظام کیا گیا تھا، قاضی صاحب کے کمرے کے برابر ہی میرا کمرہ تھا، سامان پہنچ گیا تو میں نے سب سے پہلے قاضی صاحب کا سامان رکھوایا، ان کی اٹیچی کھلی تو اس میں ''چند تصویر بتاں...... زیادہ تر کتابوں کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ فرمایا کہ اب تھیلے میں سے سامان نکالو، رسائل اور کتابیں میز پر رکھیں تو اندر ایک پوٹلی سی دکھائی دی اسے کھولا تو بے اختیار مسکرا پڑا قاضی صاحب کو دیکھا تو وہ مجھے خوش دیکھ کر مسکرا رہے تھے، اس میں پان کے پتے اور اس کے لوازمات تھے، مجھ سے کہا کہ اتنا ذخیرہ ہے کہ کانفرنس کے اختتام تک ہمارے کام آسکتا ہے، میں نے ان سے دریافت کیا کہ اتنی تعداد میں لانے کی کیا ضرورت تھی ممکن ہے یہاں دستیاب ہو تو فرمایا عزیزم! یہ تجربہ کی بنیاد پر ہے جب میں پہلی بار ساؤتھ افریقہ کے سفر پر گیا تو وہاں شدت سے کمی کا احساس ہوا تھا اور پریشانی بھی ہوئی تھی، اس لئے حسب ضرورت پان اور لوازمات ساتھ رکھتا ہوں (پھر جب قاضی صاحب بیمار ہوئے تو ڈاکٹروں نے انہیں پان کھانے سے منع کردیا تھا) پھر میں نے پوچھا: قاضی صاحب! اتنی ساری کتابیں لانے کی کیا ضرورت تھی فرمایا یہ بھی میری ضرورت اور عادت ہے۔

سفر کے دوران اس بات کا اندازہ ہوا کہ انہیں مطالعہ سے کتنا شغف ہے، جب ہوٹل کے باہر ہوں تو وہاں کی قدیم عمارتوں، تاریخی اشیاء اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیتے، کمرے میں ہوتے تو زیادہ تر وقت کتاب کے مطالعہ میں محو، ان سب سے ہٹ کر وہ ایسی کتابیں خاص طور سے لے گئے تھے جن میں ان مراکز علوم اسلامیہ کی تاریخ اور وہاں کے محدثین، فقہاء واصولیین وغیرہ کے حالات زندگی کا مطالعہ کر کے اس کی تطبیق کرتے یا ان اہم مقامات کی جستجو جہاں یہ ارباب علم بستے تھے اور جہاں جہاں ان کی علمی خدمات کا فیضان جاری تھا خاص طور پر فقہاء احناف (جو ماوراء النہر کے فقہا کے نام سے موسوم ہیں) کے حالات، ان کے مراکز اور مقامات پر کتابی مطالعہ اور پھر ظاہری تلاش وجستجو اور کوشش یہ تھی کہ ان مقامات پر حاضری بھی دیں۔

ابھی ہم تاشقند میں تھے اور ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے کہ معلوم ہوا سعودی عرب سے مشہور عالم دین، محقق ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ تشریف لے آئے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد وہ اسی جگہ آگئے، سبھوں سے معانقہ اور مصافحہ کے بعد تعارف ہوا، شیخ ابوغدہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور حضرت قاضی صاحب سے بخوبی واقف تھے، اس کے بعد تو ایسا ہونے لگا کہ جہاں کہیں سفر ہوتا حضرت شیخ ابوغدہ کی قیادت میں ہی ہم آٹھ دس افراد ساتھ ساتھ ہوتے، خواہ وہ امام بخاری کا مزار اور ان کی مسجد ہو یا فقیہ ابواللیث سمرقندی، صاحب اصول الشاشی یا دوسرے محدثین وفقہاء کے مراکز اور مزارات یا تاریخی مقامات ہوں۔

دوسرے روز ہم سب مہمان تاشقند سے سمرقند پہنچے جہاں یہ کانفرنس منعقد ہونی تھی وہاں قیام سمرقند ہوٹل میں تھا جو بہت ہی سرسبز وشاداب علاقے میں واقع تھا ویسے بھی وہاں کے سبھی علاقے بڑے سرسبز وشاداب ہیں، خوبصورت بڑے بڑے درخت، رنگ برنگے پھول پتیاں، ہرے بھرے پھولوں اور پھلوں کے باغات، مزید یہ کہ حکومت کی جانب سے صفائی کا نہایت درجہ اہتمام، یاقوت الحموی نے ”**معجم البلدان**“ میں اس خطہ کی جو تعریف کئی سو سال پہلے کی تھی آج بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔

کانفرنس منعقد ہونے سے پہلے ہی تمام مہمانوں کے لئے حضرت امام المحدثین محمد بن اسماعیل البخاری کے مزار اور مسجد کی زیارت کا پروگرام منتظمین اور مقامی حکومتی انتظامیہ کی جانب سے طے تھا، چنانچہ ایک لگژری بس میں ہم پچیس تیس افراد حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی قیادت میں اور حضرت قاضی صاحب کی معیت میں اس گاؤں میں پہنچے جو پہلے خرتنگ کے نام سے مشہور تھا اور اب ناحیہ خواجہ اسماعیل البخاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہاں امام بخاری کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد مسجد میں شیخ ابوغدہؒ کا مختصر خطاب اور حضرت قاضی کا معلوماتی بیان ہوا۔ اس طرح سبھی مہمان آتے رہے اور واپس قیام گاہ پر پہنچتے رہے۔

کانفرنس کی کارروائی ایک بڑے حال میں شروع ہوئی، اسٹیج پر معزز نمایاں علماء کرام جس میں ہندوستانی علماء نمایاں تھے، اجلاس حضرت علی میاں ندویؒ کی صدارت میں ہوا، پھر ایک جلسہ کی صدارت حضرت قاضی صاحب کے حصے میں آئی۔ اس ذیلی اجلاس میں کویت کا وفد بھی شامل تھا، خاص طور پر نائب وزیر حج اوقاف ڈاکٹر عادل الفلاح شروع سے اخیر تک موجود رہے، یہ خود بھی زبردست عالم اور محقق ہیں، مگر حضرت قاضی صاحب کے سامنے مؤدب بیٹھے رہے۔ اخیر میں انہوں نے قاضی صاحب کے سامنے عقیدت اور ان کی علمی شخصیت کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کیا اور ہر ملاقات اور اجتماع میں عقیدت مندانہ حیثیت سے پیش آتے رہے۔

کانفرنس تو تین دن میں ختم ہوگئی، مگر حضرت قاضی صاحب کی ان مقامات اور یہاں کے فقہاء ومحدثین اور علماء کرام کے مراکز سے دلچسپی ختم نہیں ہوئی، معروف ومشہور محدثین کے علاوہ بھی جب کسی کتاب کے مطالعہ سے غیر معروف اہل علم اور ان کی خدمات کا پتہ چلتا تو فوراً ان کے مقامات کی تلاش شروع کر دیتے، اس دوران ایک صحابی حضرت قثم بن عباسؓ کے مزار کی رہنمائی ہوئی تو وہاں چل پڑے، مگر بہت اونچی جگہ پر واقع تھا خود کمزور مگر حوصلہ اتنا توانا کہ میں خود بھی وہاں پیدل جاؤں گا، چنانچہ راستے میں کئی جگہ رکتے رکتے وہاں پہنچے

ہر جگہ عقیدت نچھاور کرتے رہے۔

صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی کے گاؤں مرغینان (مرغیلان) صوبہ فرغانہ کے لئے تڑپ پیدا ہوئی چونکہ خود بھی فقیہ تھے اور فقہ سے لگاؤ ان کی فطرت کا حصہ بن چکا تھا، اس لئے مرغینان جانے پر مصر ہوئے جس کے لئے وہاں کا ویزا درکار تھا، وہ بھی حاصل کیا اور کار سے ایک لمبا سفر طے کر کے پہنچے، تھکن کے باوجود ان کی آنکھوں سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

اس طرح تقریباً دس روز تک میں حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے ساتھ اس سفر میں رہا وہ اپنے علم و تحقیق سے فیضیاب کرتے رہے اور بڑی سادگی اور بے تکلفی سے ہر جگہ ہم تمام لوگوں کے ساتھ پیش آتے رہے۔ پورے سفر میں اپنی خوبیوں اور کمالات کے تاثرات پیش کرتے رہے۔ ہوٹل کا کمرہ ہو، کھانے کی میز ہو یا بازار، ہر جگہ ان کی عنایتیں جاری رہیں۔

اخیر میں عرض کیا کہ یہاں سردی کے کپڑے ملتے ہیں، مل جائے تو ایک اور کوٹ خرید لوں، فرمایا کہ چلو میں بھی چلتا ہوں مجھے بھی امین عثمانی (معتمد خصوصی دفتر اسلامک فقہ اکیڈمی کے انچارج، خاموش طبع، بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک) کے لئے کوئی تحفہ خریدنا ہے، چنانچہ ہم چاروں آدمی جو عام طور پر ایک ساتھ رہتے تھے (قاضی صاحب، مولانا سالم قاسمی صاحب، مولوی سفیان اور راقم الحروف) بازار بھی گئے۔ یہ اس ''گم'' اور ''سم'' بازار کی سعادت تھی کہ اتنی بڑی شخصیت وہاں جلوہ افروز ہوئی۔

سفر سے ایک ساتھ واپسی ہوئی دل میں حضرت قاضی صاحب کا احترام اور عقیدت مزید فزوں ہوا جب وہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں بہت یاد آتے ہیں کہ خوردوں کو بھی اس قدر عزیز رکھتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے آمین۔

☆☆

میرے میر کارواں

● مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رفتہ رفتہ اٹھ رہی ہیں ہستیاں بے نظیر
دل کا شاد بڑھتا جارہا ہے پیہم اضطراب

مفکر ملت قاضی القضاۃ حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ملت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم حادثہ فاجعہ ہے۔ موت تو برحق ہے ہر کسی کو ایک نہ ایک دن اس دنیا کو الوداع کہنا ہے، لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی موت ایک ایسا خلا پیدا کرتی ہے جس کا پر ہونا ممکن نہیں ہوتا بہت کم ایسی ذات ہوتی ہیں جن کے اندر تمام کمالات یکجا، تمام خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری اور مشکل حالات میں امت مسلمہ کی رہنمائی کرنے کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہو، ایسے ہی تمام صفات کی حامل حضرت قاضی صاحب کی ذات گرامی تھی۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد صوبہ بہار کی مشہور دینی درسگاہ خانقاہ جامعہ رحمانی مونگیر بہار سے درس و تدریس اور اپنی عملی زندگی شروع کی تھی۔ آپ اپنی علمی کاوش، خداداد صلاحیت، ذوق سلیم اور قابل رشک تحریر و تقریر کی صلاحیت کی وجہ سے بہت جلد امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے چہیتے بن گئے۔ حضرت امیر شریعت کی دور رس نگاہوں نے یہ جان لیا تھا کہ یہ نوجوان ایک دن ملت کی رہنمائی اور بکھری ملت کو متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔ اسی لئے امیر شریعت نے قاضی صاحب کو امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ قاضی صاحب نے ذمہ داری

سنبھالتے ہی اس کی کایا پلٹ دی اور امارت شرعیہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اس کا دائرہ قصبہ قصبہ، قریہ قریہ تک وسیع ہوا۔ آج مسلمان اپنے عائلی مسائل اسی نظام قضاء کے تحت حل کرتے ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام سے ہی اس کے رکن رکین رہے اور اخیر میں عہدہ صدارت پر فائز ہوئے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے جو بھی مسئلہ آیا اس کو حل کرنے میں فعال اور قائدانہ کردار ادا کیا ۹۰-۱۹۸۹ء میں جب مرکز میں وی پی سنگھ اور بابری مسجد کا مسئلہ درپیش تھا، تو کئی رہنماؤں مثلاً یونس سلیم (گورنر بہار)، سید شہاب الدین، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ کے ساتھ اس کو حل کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی تھی لیکن مسلم رہنماؤں کے صفوں میں انتشار، اس سے الگ ہو کر ایک گروپ کا وی ایچ پی کے ساتھ مذاکرات کرنا، وی ایچ پی کا اپنے قول سے انحراف وغیرہ نے بابری مسجد کو انہدام تک پہنچایا۔ اس سے پہلے قاضی صاحب نے شاہ بانو کیس میں ملت اسلامیہ کو بیدار اور متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ملت کو بیدار اور یکجا کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستان بھر کا طوفانی دورہ کیا اور جلسے جلوس منعقد کئے جس کی وجہ سے راجیو گاندھی کی حکومت ایک نیا بل پارلیمنٹ میں پیش کرنے پر مجبور ہوئی اور قانون پاس بھی ہو گیا۔

قاضی صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ شہرت سے دور رہ کر ملت کے درپیش مسائل حل کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے اور اس کے لئے وہ شعبہ ہائے زندگی کے مختلف مکتب فکر کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرتے تھے اور وہ کامیاب بھی ہوتے تھے۔ اسی جذبہ کے تحت قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کی کرسی سنبھالی تو جمعیۃ علماء سمیت دیگر تنظیموں کے سربراہان سے ملاقات کی، جو مسلم پرسنل لا بورڈ سے دوری بنائے ہوئے تھے اور ان سے تعاون چاہا۔

جب سیاہ قانون ٹاڈا ملک پر مسلط کیا گیا اور اس کا شکار بے قصور مسلمان ہوئے تو قاضی صاحب نے اس سلسلے میں زبردست جدوجہد کی اور آل انڈیا ملی کونسل کے بینر تلے کئی

کامیاب کنونشن کر کے ٹاڈا کے خلاف عوامی بیداری کی مہم شروع کی اور سیاسی لیڈروں کو حقیقی صورت حال سے آگاہ کیا جس کی وجہ سے حکومت اس کی میعاد میں اضافہ کرنے سے باز رہی۔ حضرت قاضی صاحب کی یہ خوبی تھی کہ وہ کسی بھی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتے تھے، امارت شرعیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد ان کا سب سے بڑا کارنامہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا قیام ہے جس کے تحت ملت کے درجنوں حل کے متقاضی مسائل حل ہوئے اور اس ادارے نے مختصر مدت میں علم و تحقیق اور فقہ و فتاوے کی دنیا میں ہلچل مچا دی۔

راقم الحروف کو بارہا حضرت قاضی صاحب سے ملاقات کرنے اور شفقت کا شرف حاصل ہوا، دوران تعلیم بھی جب قاضی صاحب سجاد لائبریری جو بہار، اڑیسہ، نیپال کے طلبہ کی مرکزی انجمن ہے، کے پروگراموں میں آتے تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد بھی جب جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کے لئے حضرت قاضی صاحب کے پاس جایا کرتا تھا۔ قاضی صاحب مفید مشوروں سے نوازتے تھے اور سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ آخری ملاقات آپ سے اپولو اسپتال نئی دہلی میں ہوئی۔ قاضی صاحب بستر علالت پر ہونے کے باوجود اور نقاہت کے عالم میں فرمایا تھا کیا حال ہے جامعۃ القاسم کا۔ کیونکہ قاضی صاحب نوجوان لوگوں میں کام کرنے والوں میں بندہ فقیر اور جامعۃ القاسم سے بے حد متاثر تھے، جبکہ مہلک و موذی مرض نے گھیر رکھا تھا، لیکن قاضی صاحب کے عزم اور قوت ارادی میں ذرہ برابر اضمحلال پیدا نہیں ہوا تھا، کاش حضرت قاضی صاحب کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو ملت کے بہت سے حل طلب مسائل حل ہو چکے ہوتے، اللہ تعالیٰ حضرت کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے دینی و ملی کارناموں کو قبول فرمائے (آمین)۔

بدل جائے نظام ہر دو عالم آن واحد میں
گر کوئی ضد پر آجائے دیوانہ محمدؐ کا

☆☆

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

● مولانا محمد الیاس المظاہری

حضرت قاضی القضاۃ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی پوری زندگی فکروں کی تھی۔آپ کی حیات کا ہر گوشہ اور ہر لمحہ گویا امت کی خدمات اور اس کی دینی اور دنیوی ترقیات کے لئے وقف تھا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بصیرت وحکمت عطا فرمائی تھی۔دور بینی معاملہ فہمی اور اس کے لئے لائحہ عمل طے کرنا اور اس میں کامیابی حاصل کرنا یہ آپ کا طرہ امتیاز تھا۔حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ اکابر واسلاف کے امین اور جانشین تھے۔ان کے سینے میں امت کی فلاح وکامیابی اور ترقیات کے ہر میدان میں امت کو نمایاں دیکھنے کا ایک دھڑکتا ہوا دل تھا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے علوم میں مہارت عطا فرمائی تھی۔جہاں آپ ایک طرف عظیم مفکر، دانشور اور انقلابی سماجی مصلح تھے۔دوسری طرف آپ عظیم المرتب محدث اور مفسر بھی تھے۔علوم ومعارف کے گویا اتھاہ سمندر تھے۔فقہ تو آپ کا امتیازی میدان ہے۔فقہ کے میدان میں آپ کا کارنامہ تجدیدی ہے۔آپ یہ چاہتے تھے کہ امت کسی بھی میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے،اسی لئے آپ نے اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں مختلف نوع کی محنتیں فرمائیں۔آپ نے جہاں علوم اسلامیہ اور سنت نبویہ کی ترویج واشاعت کی فکر فرمائی وہیں فرزندان ملت کے لئے دنیوی علوم میں مہارت وکمال کے حصول کی بھی کوششیں فرمائیں۔اس کے لئے ملک اور بیرون ملک کے مختلف خطوں، علاقوں اور شہروں کا سفر بھی فرمایا اور کثیر تعداد میں اس طرح کے ادارے بھی قائم فرمائے۔

اسی علمی فکری سفر کا ایک چھوٹا سا واقعہ اس ناکارہ کو یاد آیا جو بھلایا نہیں جاسکتا۔یہ ناکارہ اس وقت ''جامعہ رشیدیہ نگینہ ضلع بجنور یوپی'' میں مدرس تھا۔اس شہر میں احقر کا یہ تدریسی سلسلہ تقریباً گیارہ سال رہا۔اسی درمیان حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی علمی ترقیاتی منصوبہ کے پروگرام کے تحت نگینہ تشریف لائے۔محلّہ قاضی سرائے جو نگینہ کے روساء اور دانشوروں کا محلّہ ہے ایک جلسہ سے مدلل اور مبسوط خطاب فرمایا اور اپنے مزاج کے مطابق نوجوانوں اور طلباء کرام کو علوم وترقی کے میدان میں امتیازی شان حاصل کرنے کی اور جرأت ودلیری کے ساتھ آگے بڑھنے کی تلقین فرمائی اور اس ضرورت کا احساس دلایا اور فرمایا: ''گوہر مقصود خود ملتا ہے ہمت شرط ہے۔مضطرب رہتا ہے ہر موتی ابھرنے کے لئے'' بیان اور ظہرانہ سے فراغت کے بعد جب ہم حضرت کی خدمت میں پہنچے اور خدمت کررہے تھے تو حضرت نے فرمایا جو لکھتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ بھائی تم بیس پچیس دن کے لئے پٹنہ آجاؤ میں آپ کو اپنے پٹنہ رہنے کی تاریخیں لکھ کر دے دیتا ہوں میں اس مدت میں آپ کو کچھ سکھادوں گا،لیکن ملازمت تدریس کی مشغول زندگی کو کیا کہیے کہ اجازت وموقع نہیں ملا اور آج حسرت وافسوس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوسکتا، جبکہ علوم ومعارف حکمت وتدبیر کا یہ خزانہ ہمیشہ کے لئے ہم سے بہار کی سرزمین میں روپوش ہوگیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طبیعت را
اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

☆☆

متنوع کمالات کے جامع تھے حضرت قاضی صاحبؒ

● مفتی عبداللہ مظاہری

"کل نفس ذائقة الموت" (موت ایک اٹل حقیقت اور فیصلہ خداوندی ہے)۔ دنیا میں جو بھی آیا جانے کے لئے آیا باقی رہنے والا وہ صرف رب ذوالجلال ہے جو موت وحیات کا خالق اور قادر ومختار ہے، لیکن کچھ جانے والے اپنے کارنامے، اولوالعزمیوں اور یادوں کے ایسے نقوش ثبت کر جاتے ہیں کہ وہ مرکر بھی زندہ رہتے ہیں اور ان کی تعلیمات وارشادات اور تفردات اور تحقیقات لوگوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ ان ہی مردانِ باصفا میں حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب بھی تھے جنہیں اب مرحوم ومغفور لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ قاضی صاحب ایک شخص ہی نہیں، بلکہ مستقل ایک تحریک تھے۔ آپ نے فقہ وفتاویٰ کے حوالے سے جو عظیم تجدیدی کارنامے انجام دئے اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذریعہ علماء عظام بالخصوص نوجوان مفتیان کرام میں بصیرت وتفقہ کی جو روح پھونکی ہے اور علم وتحقیق کی جو نئی راہ دکھلائی ہے وہ آپ کی عظمت کے لئے کافی ہے۔ علم ودرایت اور خداداد فقہی بصیرت جو آپ کو عطا ہوئی تھی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ہمارا اپنا احساس ہے کہ اگر قاضی صاحب چند صدیوں قبل پیدا ہوئے ہوتے تو جن محقق علماء اور مجتہدانہ شان رکھنے والے فقہاء کے اقوال آج ہم عظمت وعقیدت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ان میں ایک نمایاں نام قاضی صاحب کا بھی ہوتا۔ قاضی صاحب جیسی شخصیتیں صدیوں

میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنے لازوال کارنامے بے پناہ بصیرت اور عظیم قائدانہ صلاحیت کی بنا پر ایسے نقوش ثبت کر جاتی ہیں جو انہیں زندہ جاوید بنا دیتی ہیں سچ ہے۔

ہرگز میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

قاضی صاحب کا نام اور ان کے علم وفضل کا شہرہ تو ایک مدت سے سنتا آرہا تھا اور زیارت کا شرف بھی حاصل کر چکا تھا، تاہم دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ میں منعقد ساتویں فقہی سیمینار کے موقع پر آپ کو قریب سے دیکھنے اور آپ کے علوم سے براہ راست استفادہ کے مواقع نصیب ہوئے۔ سیمینار سے فارغ ہو کر احقر کی دعوت پر آپ اپنے رفقاء کی ٹیم کے ساتھ جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ تشریف لائے اور یہاں کے تعلیمی وتربیتی نظام کو دیکھ کر کافی مسرور ہوئے اور خوب دعائیں دیں۔ حوصلہ افزائی کے طور پر فرمانے لگے "آپ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے" بلکہ آپ نے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے تاثراتی تقریر میں یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ اگر ٹھوس تعلیم کے تعلق سے ملک میں جامعہ مظہر سعادت جیسے پانچ چھ ادارے بھی قائم ہو جائیں تو تعلیم کے گرتے اور گھٹتے معیار کو اونچا اٹھانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ پھر آپ نے احقر کو باصرار تمام اسلامک فقہ اکیڈمی کی علمی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب قاضی صاحب کی نوازشیں اور عنایتیں تھیں، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

جامعہ کے کتب خانہ اور اس کے انتظام وانصرام کو قاضی صاحب نے کافی سراہا اور الحمد للہ کتب خانہ کے پرانے رجسٹروں میں قاضی صاحب کے نام پر نکلی ہوئی کتابوں کا اندراج آج بھی موجود ہے۔

دسواں فقہی سیمینار بمبئی کے حج ہاؤس میں منعقد ہوا تھا جس میں بیرون ملک بالخصوص بلاد عرب سے تشریف لانے والے علماء اور فقہاء کی مہمان نوازی جامعہ کی خواہش اور قاضی صاحب کے ایماء پر جامعہ کے حصے میں آئی۔ اس طرح جامعہ کا حضرت قاضی صاحب سے

تعلق مستحکم ہوتا گیا۔

خردنوازی، چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور خوبیوں کا اعتراف قاضی صاحب کی خاص صفت تھی۔ مردم سازی کا جو جوہر خاص آپ کو عطا ہوا تھا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ جس سادگی اور تواضع کے ساتھ دورانِ طالب علمی اساتذہ کرام کی خدمت کرتے تھے آپ کی وہی سادگی اور تواضع اس وقت بھی باقی رہی جب آپ ملت کے مخدوم بن گئے۔ بڑے بڑے باوقار عہدے اور مناصب بھی آپ کو اپنے اسلاف واکابر کی روش سے ہٹا نہ سکے۔

قاضی صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ نے منفی پہلو اپنانے کے بجائے ہمیشہ مثبت پہلو اختیار کیا جس کے بہت دوررس فوائد سامنے آئے۔ آپ ملک کے بگڑتے حالات کے تناظر میں کلمہ واحد کی بنیاد پر اتحاد امت کے نہ صرف قائل، بلکہ اس کے زبردست داعی ونقیب بھی تھے۔

قاضی صاحب قدیم صالح اور جدید نافع کے عظیم سنگم تھے، ملت کی فلاح وبہبود کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اور اس کی زبوں حالی وخستہ حالی پر بے بسی کے آنسو بہانے کے بجائے آپ نے ہمہ جہتی علمی اقدامات کئے۔ قاضی صاحب کئی اداروں، تحریکوں، مراکز، جامعات اور تنظیموں کے روح رواں، ملت کی امیدوں کے مرکز، ہر نازک موڑ پر امت کے مسیحا مرجع، حق وصداقت کی علامت اور ایک عظیم انسان، بلکہ ان تمام خوبیوں کے جامع تھے جن سے متصف ہونا ایک میر کارواں کے لئے ضروری ہے

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

خدا کے مقرب بندے اور عظیم انقلابی مصلحین کی طرف قاضی صاحب بھی محسود الاقران رہے، بلکہ اباحیت وفقہ قدیم کی جدید کاری کے سنگین الزامات بھی عائد کئے گئے، لیکن قاضی صاحب نے ہمیشہ معترضین کے اعتراضات پر چراغ پا ہونے اور ان کے خلاف محاذ آرائی کے

بجائے سکوت اور بصیرت وتدبر سے کام لیا۔ اس لئے لوگوں کی تنقیدیں اور مخالفین کے پروپیگنڈے آپ کے پائے استقامت کو کبھی متزلزل نہ کرسکے۔ آپ کی وسعت ظرفی اور وسیع القلبی مثالی تھی۔ آپ نے کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ دوسروں کی آراء کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے پوری بصیرت کے ساتھ اپنے موقف پر جم جاتے اور دلائل کے انبار لگادیتے۔ بسا اوقات آپ کے دو جملے حاضرین کے شکوک وشبہات دور کرنے میں صیقل کا کام کرجاتے اور علم وفکر کی نئی راہیں کھل جاتیں۔ غرضیکہ قاضی صاحب جامع الکمالات مجمع الصفات شخص تھے جنہوں نے بحث وتحقیق کے میخانے میں ہلچل مچادی اور علم ودرایت کی شمع روشن کی۔ ع

بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

ملت اسلامیہ یوں بھی داخلی وخارجی سطح پر لاتعداد مسائل سے دوچار ہے ان نازک حالات میں قاضی صاحب کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آرہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قاضی صاحب کی تحریک کو نہ صرف زندہ رکھا جائے، بلکہ اسے آگے بڑھایا جائے اور وہ علمی وتحقیقی کام جو ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں انہیں مکمل کیا جائے۔ حقیقت میں یہی قاضی صاحب کے لئے ہماری طرف سے بہترین تحفہ اور خراج عقیدت ہے۔

اللہ پاک قاضی صاحب کے درجات کو بلند کرے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ کروٹ کروٹ سکون نصیب ہو اور قبر پر انوار کی بارش ہو

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆

قاضی شریعت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

ایک پیکر عزیمت وبطل جلیل کی رحلت

● مولانا مشتاق احمد حامد الحسینی

قاضی صاحبؒ برصغیر ہندو پاک کے مسلمہ مسلم اسکالر فقہ اسلامی کے ماہر دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل، جامعہ رحمانی مونگیر کے قابل قدر محبوب استاذ حدیث، اس زمانہ تدریس میں حضرت امیر شریعت مولانا شاہ منت اللہ رحمانیؒ کی جوہر شناس نگاہ نے قاضی صاحب کی خداداد استعداد وصلاحیت کو بھانپ لیا اور اپنی تربیت سے نوازنے لگے۔ علوم اسلامی اور امور سیاسی میں کمال ادراک تک پہنچے۔

حضرت قاضی صاحب ملک میں امن وسلامتی کیسے قائم ہو اور ترقی وخوشحالی ملک میں کیسے آئے اس کے لئے ہمیشہ مذہبی، سیاسی رہنما سے گفتگو کرتے اور اپنا گرانقدر مشورہ بھی پیش کرتے، یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت قاضی صاحبؒ ہر جہت کی صلاحیتوں اور گوناگوں محاسن سے متصف تھے۔ ملت اسلامیہ کی رہنمائی وقیادت کا بے مثال کارہائے نمایاں انجام دیا اور ملک وملت میں خیر سگالی، ایثار وقربانی، انسانی ہمدردی، بھائی چارگی احسان واخلاق کے ساتھ خدمات انجام دینے کے لئے احباب کی اچھی خاصی جماعتیں تیار کیں اور فکر انگیز نظریات کے پیغام حیات آفریں کو عام کیا۔

ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے عالم اسلام میں ایک متاع گراں مایہ تھے جو ایک علمی

وعملی اعتبار سے ایک متبحر عالم دین بہت بڑے مدبر ومحقق بلند وپاکیزہ افکار وانظار سے عالم اسلام کو روشنی پہنچاتے رہے۔ قاضی صاحب کے رشحات قلم سے مرتبہ تصنیفات وتالیفات کی تعداد تقریباً ۳۶ ہیں جو ہزاروں صفحات پر مشتمل عربی، انگریزی، اردو زبان میں شائع شدہ ہیں۔

قاضی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی مثالی روایتوں کی قدر ومنزلت آنے والوں کے راہ عمل میں حائل دشواریوں میں چراغ منزل کی حیثیت سے رہنمائی کریں گی، عمائے دین، دانشوران، ملک وملت کے لئے ضرب المثل اقدامات کی قندیلیں کتابوں کی صورت میں موصوف کی خدمات جلیلہ کے بہترین خزینے ہیں جو ساری دنیا میں ابھرنے والے مسلمانوں کے عائلی قوانین اور دیگر مسائل میں آپ نے بڑا ہی اہم کردار ادا کیا اور ہر سطح پر مسائل کو حل فرمایا ہے۔ حضرت قاضی صاحبؒ کی ذات گرامی ۲۱ ویں صدی کی بے مثل نادر الوجود شخصیات میں تھی۔ حق سبحانہ وعزاسمہ نے آپ کو مجتہدانہ ذہن ودماغ، بے پناہ خوبیوں، صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ انتہائی متواضع، متحمل مزاج، بلند اخلاق آپ کو تمام مسالک ومکاتب فکر کے حلقوں میں مقبولیت حاصل تھی۔

☆☆

ہند میں فقہ وقضا کا قافلہ سالار
قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

● مولانا نور عالم خلیل امینی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کو اللہ تعالیٰ نے چند ایسی صفات سے نوازا تھا جو انہیں اپنے معاصر اور اقران سے بالکل ممتاز کرتی تھیں۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں تحصیل علم میں کما حقہ محنت کی، خداداد فطانت اور حوصلہ مندی نے ان کا ساتھ دیا، توفیق الٰہی ہم رکاب رہی، اخاذ اور بیدار ذہن نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے دینی، دعوتی، فکری وثقافتی وجود کی سب سے بڑی علامت کی حیثیت رکھنے والے ادارے دارالعلوم دیوبند پہنچے، یہاں انہیں دیگر یگانہ روزگار اساتذہ کے ساتھ ساتھ، بطلِ حریت اور حقیقی معنی میں عالم باعمل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء کے سامنے زانوے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ دارالعلوم اس زمانے تک حضرت مولانا مدنیؒ قدس سرہ العزیز کے انفاس کی گرمی کے طفیل، اپنے دیرینہ وبابرکت طرز کہن پر گامزن تھا۔ دارالعلوم کے اکثر اساتذہ شب بیدار تھے، دربان او رملازمین میں بھی عبادت وریاضت کی سرمستی پائی جاتی تھی، خیر وبرکت در بام سے ابلتی تھی۔ چپے چپے پر ذکر الٰہی کا نقش نمایاں تھا، علوم شریعت کی جامع تلقین کے ساتھ ساتھ دل کی دنیا کی آبادی، بلکہ تابناکی اور عقل وخرد کی پاکیزگی اور دعوت الی اللہ کے ذوق وشوق کی دلوں میں آبیاری اور امت کے مسائل اور دکھ درد کے مدوزجر پر ہمہ وقت، ہمہ گیر اور

گہری نظر رکھنے کی صلاحیت سازی کا اہتمام پایا جاتا تھا۔ مولانا مجاہد الاسلام حضرت مدنی کے فیض تعلیم وتربیت اور دارالعلوم کے اس روح پرور ومردم ساز ماحول کے طفیل خدا کی توفیق سے اعلیٰ پائے کے عالم بن کر نکلے۔ ان کے علم وفضل میں خیر وبرکت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنے دیگر عالی مرتبت اساتذہ کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلامؒ اور اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے لاثانی اور لافانی عقیدت ومحبت تھی۔ انہیں ان دونوں انتساب ہائے گرامی پر حد درجہ افتخار تھا، وہ جب بھی ان دونوں کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا تذکرہ کرتے، تو بے طرح مچلتے اور جھومتے اور ایسے وقت میں ان کے لہجے میں اس قدر شیرینی اور عشق کرشمہ سازی کی وارفتگی پائی جاتی کہ سننے والا بھی وجد کرنے لگتا، وہ دارالعلوم سے عشق اور شیخ الاسلام سے تلمذ کو مقدس ترین سرمایہ زندگی سمجھتے تھے۔ وہ دارالعلوم آتے تو ان کے ہر رویے سے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے مچھلی خشکی کی اذیت سے پانی کی راحت میں آگئی ہے اور زندگی کی لذتوں سے دوبارہ ہم کنار ہوگئی ہے۔ ان کے تمام حرکات وسکنات سے ایسا لگتا کہ ایک عاشقِ محروم کو حقیقی وصال کی لذت اندوزیوں کا موقع مل گیا ہے۔ دارالحدیث فوقانی میں ان کی عرصہ ۱۷-۱۸ سال پہلے کی تقریر کے یہ جملے میرے کانوں کو لگتا ہے کہ اب بھی محفوظ کر رہے ہیں:

”دوستو! میں یہاں بیٹھ کر آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں، کیونکہ میرے کانوں میں شیخ الاسلامؒ کی آواز اس کونے سے اب بھی آرہی ہے، صاف وشفاف آواز، عشق رسولؐ کے آبِ زلال سے دھلی ہوئی زبان کی پرسوز آواز: حدیث رسولؐ کی تلاوت کی آواز، ان کا عربی لہجہ، ان کا مدنی طرز ادا، ان کی عالمانہ شان، ان کی مجاہدانہ آن بان، ان کا منور وپاکیزہ چہرہ، یقین پرور اندازِ کلام، دلوں میں گھر کر جانے والا خلوص...... میں کہاں سے الفاظ لاؤں اور کس طرح میں الفاظ کو معانی وحقائق کی صحیح صحیح تجسیم کی طاقت بخشوں کہ وہ ان احساسات وجذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرسکیں جو دارالعلوم میں آنے کے

بعد، میرے قلب کی پہنائیوں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موجزن ہوجاتے ہیں۔ میں جذبات کے طوفان کو زبان سے کانوں تک منتقل کرنے سے قاصر ہوں۔ یہاں کے چپے چپے پر مہر و وفا کی جلوہ گری ہے، عشق بے خطر کی دولت بے بہا کا جو دریا یہاں رواں ہے۔ مکتب کی جو واقعی کرامت اور فیضان نظر کا جو کرشمہ یہاں ہر آن نظر آتا ہے۔ علم وفضل کی بے پناہی کے پہلو بہ پہلو آدم سازی اور قلب کی صیقل گری کا جو کارخانہ یہاں مصروف کار ہے، دین وسط اور توازن واعتدال کے ساتھ ساتھ تعمیر نو کا جو درس یہاں دیا جاتا ہے، میں...... سچی بات یہ ہے کہ......اس کی تصویر کشی سے عاجز ہوں۔ یہاں آکر طالب علمانہ کھلا پن، طفلانہ معصومیت، حوصلہ مندانہ نوعمری، لاپرواہ کم سنی، خودرائی شعار نوجوانی، یادوں کی بارات، ماضی کے خوبصورت نقوش، اساتذہ کی شفقتیں، ان کی فیاضانہ ساقی گری، سبھی باتیں حافظے کے کینوس (Canvas) پر ابھر آتی ہیں۔''

کہا جاسکتا ہے کہ علم کی صنعت پر مولانا مجاہد کو جو عبور تھا، وہ صرف ان کی محنت وخوئے جستجو یا ذوقِ طلب وشوق سفر ہی کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ مذکورہ عشق وعقیدت کا بھرپور فیضان تھا۔ شجر سے وابستہ رہنے کی عادت حسنہ، بہار اوران گنت نئے نئے برگ وبار کی ضامن ہوتی ہے۔ وابستگی کے تقدس پر ایمان، انسان کو اس انسان اور اس ادارے کا مثالی نمونہ بننے پر آمادہ کرتی رہتی ہے، جس سے وہ وابستہ ہوتا ہے۔ وابستگی کا منکر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتا ہے جس کی کوئی منزل ہوتی ہے، نہ راہ، نہ کارواں، مولانا مجاہد کے علمی وفکری فتوحات کی بوقلمونیوں اور گل کاریوں میں مذکورہ فیضان ہر سطح پر نمایاں نظر آتا تھا۔

ان کا دوسرا امتیاز وصف یہ تھا کہ وہ غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ ان کی ذہانت محض کتابی اور مطالعہ ومعلومات کی اسیر نہ تھی۔ وہ حالات، زمانہ، انسان، زندگی اور معاشرے کے بھی نبض شناس تھے اور ہر نازک اور پیچیدہ مرحلے میں ''صحیح ترجیح'' یا ''پسند'' کو اختیار کرنے کے حوالے سے انہیں دیر نہیں لگتی تھی۔ ذہانت ہی کے طفیل سے وہ جوہر شناسی میں بھی طاق

تھے۔ نیز ہر انسان سے اس کے پسندیدہ رویے کے مطابق پیش آنے اور اس کو اپنا بنا لینے اور اپنا بنائے رکھنے اور صلاحیت کے مطابق فائدہ اٹھانے کا گر جانتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنے گرد باصلاحیت افراد کو اکٹھا کرلیا تھا۔ یہ اکٹھا ہوجانے والے متنوع الاستعداد افراد نہ کبھی ان کے کارواں سے ٹوٹے نہ کبھی خود ان سے روٹھے، نہ ان کے علم وعمل کے حرم سے بدگماں ہوئے۔ یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ علم وعمل کی ان کی راہ مستقیم تھی، ورنہ زندگی کا تجربہ بتاتا ہے کہ کج مج کردار کے حامل انسان سے، لوگ بدگماں ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور محض علم کا گھنیرا پن اس پیارے اور راحت بخش سایے کو وجود میں نہیں دے پاتا، جس میں آنے کا شوق لوگوں کو کھینچتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی آرزو مختلف الاقسام لوگوں کو کھینچتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی آرزو مختلف الاقسام انسانوں کو اس سے مربوط رکھتی ہے۔ مولانا مجاہد سے اگر کوئی کبھی بدگماں ہوا تو یقیناً ان کی ذات یا صفات کی وجہ سے نہیں، بلکہ اردگرد کے بعض افراد اور مشیرانِ کار کے غلط سمجھاؤ کو بھی اس میں دخل ہوسکتا ہے۔ نیز یہ کہ مولانا مجاہد بہر کیف ایک انسان تھے اور اپنے ماحول اور عصر ہی کی پیداوار تھے۔ انسان بہر کیف غلطی کرسکتا ہے، اس لئے کسی انسان کو اس کے مجموعی صورت حال کی روشنی میں دیکھنا چاہئے، اس لئے کہ صرف مولانا کی قد کے مجاہد اور ان کے لوگ یا ان سے کم تر لوگ انسان نہیں تھے، بلکہ ہم سبھی لوگ بھی انسان ہی ہیں اور ہم سبھوں کے اعمال وکردار بھی صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔

ذہانت ہی کی وجہ سے انہوں نے اپنے کتابی علم کو نکھارا، اپنے مطالعے اور معلومات کو صیقل کیا اور آگہی کا دائرہ اتنا وسیع کرلیا تھا کہ معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ اور جدید وقدیم دونوں حلقوں کے افراد، حتیٰ کہ مسلمان وغیر مسلم حضرات ان سے مل کر ان کے افکار وخیالات سن کر یکساں طور پر نہ صرف مطمئن ہوتے تھے، بلکہ محظوظ ہوتے تھے۔

ان کو دوسروں سے یہ چیز بھی ممتاز کرتی تھی کہ ان کا ملنے اور آنے جانے والوں کا

استقبال کرنے کا انداز البیلا تھا۔ وہ اس طرح مسکراتے ہوئے پیار سے ملتے اور ان کے مصافحے اور معانقے میں ایسی گرم جوشی اور اپنائیت ہوتی کہ بعض دفعہ آدمی ایک ہی ملاقات میں، ان ہی کا ہو کے رہ جاتا۔ ان کی شیریں گفتگو، عالمانہ تواضع، قدرتی انکسار، سادہ انداز، تصنع کی آمیزش سے مکمل طور پر منزہ اچھے، سچے اور کھرے انسان کی ادا، ہر ملنے والے کا دل موہ لیتی، چند منٹ کے لئے جایئے، لیکن اجازت لینے پر بھی بسا اوقات آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھ کر کھینچ لیتے اور کہتے بھائی اور بیٹھو، ابھی جی نہیں بھرا، کیا جلدی ہے؟ کتنے دن بعد آئے ہو، جلدی جلدی ملا کرو، تم سے ملنے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ علمائے مشاہیر میں، ان کی طرح دل میں سما جانے والا، اسیر کر لینے والا، اپنوں سے زیادہ اپنا بن جانے والا اور اپنا بنا لینے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کی خوش اخلاقی اور دل آویزی کے ساتھ ساتھ، ملنے والے کو ان کی ذہانت، علمی بے پناہ فراست کا امتیاز اور امت کی مجبوری و رنجوری کی عالم گیر کیفیت کے ازالے کے لیے کارگر تدبیر رسائی کی ان کی کوشش پیہم کا استحضار، ان کی محبت کے لئے اسیر کیے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے دل کی وسعت کے سامنے دنیا کے ہر صحرا کی وسعت ہیچ ہے۔ ملنے والے کا دل گواہی دیتا تھا کہ گویا وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ ان کے دل میں جگہ پا سکتا اور دیگر ملاقاتیوں کے لئے بھی اس کی وسعتیں کم نہ ہوں گی۔

اس سلسلے میں ایک دو واقعات کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ اوائل ربیع الاول ۱۴۰۰ھ/ اواخر جنوری ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں میری تدریس کے زمانے میں اچانک وارد ہوئے، اپنے اسی محبت بھرے لہجے میں دعا و سلام کے بعد فرمایا کہ میں ایک ضرورت سے یہاں لکھنؤ آیا تھا، پھر ندوہ آنا ناگزیر تھا۔ یہ خیال بھی یہاں لے آیا کہ میری عرصے سے ایک تمنا ہے کہ میں تم سے درخواست کروں کہ امارت شرعیہ کا اچھا سا تعارف، تم اپنی خوبصورت عربی میں لکھ دو۔ میں کچھ عذر کرنا چاہتا تھا، لیکن انہوں نے کوئی

جملہ ادا کرنے نہ دیا اور فرمایا: میں سمجھتا ہوں، تم مدرس ہو، پڑھانے کے علاوہ بہت سے لکھنے پڑھنے کے مشاغل ہیں، مولانا علی میاں صاحبؒ (متوفی جمعہ ۲۲/رمضان ۱۴۲۰ھ ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء) کے تحریری کاموں میں بھی حصہ لینا رہتا ہے، لیکن تم کو اس کے لئے بہر صورت وقت نکالنا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! فلاں میرے دوست فلاں جگہ رہتے ہیں، جہاں آپ یقیناً زیادہ آتے جاتے ہیں، ان سے ربط کرنا بھی میری بہ نسبت زیادہ آسان ہوگا۔ آپ انہیں حکم فرما دیں، شاید کام اچھا ہو اور زیادہ جلدی۔ فرمایا: پھر تم نے بکواس شروع کر دی۔ بھائی میں تم سے ہی کام لینا چاہتا ہوں۔ ان کی محبت و شفقت کے سامنے میں بے بس ہو گیا اور کوئی عذر نہ کر سکا کہ ان کے پیار اور اپنائیت کے انداز کے سامنے اظہار عذر، گناہ سا معلوم ہوا، یکم ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۸/فروری ۱۹۸۰ء بہ روز یک شنبہ کو میں مظفر پور سے پٹنہ آمد و رفت کے قدیم راستے، یعنی ''پہلیجا گھاٹ'' سے اسٹیمر کے ذریعے، ان سے کیے ہوئے مذکورہ وعدے کو وفا کرنے کے لئے، زندگی میں پہلی بار پٹنہ اور وہاں سے بذریعہ تانگا، پھلواری شریف پہنچا۔ میں وہاں تین دن رکا۔ امارت کا دفتر پھلواری شریف قصبے کے بالکل اندر تنگ گلی کے ایک گھر میں واقع تھا۔ مولانا مجاہدؒ نے اتنی محبت دی، اپنائیت، خوش اخلاقی، مہمان داری اور خرد نوازی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ میرے الفاظ اس کی تصویر کشی سے قاصر ہیں، اکثر اوقات ساتھ ساتھ رہتے، دل لگاتے، چھوٹی سی مسجد میں پنج گانہ نماز میں ساتھ ہوتے، اکثر ساتھ ہی ناشتہ کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے۔ ایک روز میرے ایک ندوی شاگرد، یعنی مولانا شاہ عوان احمد صاحب قادری خانقاہ مجیبیہ والے کے بڑے صاحبزادے جن کا نام غالباً نصر احمد تھا، دعوت دینے آئے کہ والد صاحب نے آج دوپہر کھانے پر مدعو کیا ہے اور رات کا قیام خانقاہ مجیبیہ ہی میں تجویز کیا ہے۔ مولانا مجاہدؒ بڑی مشکل سے رضامند ہوئے۔ عشا بعد خانقاہ کے لئے اپنی متبسمانہ ادا کے ساتھ ہاتھ کو ہاتھ میں لے کے، اس طرح رخصت کیا کہ جی چاہا کہ اپنے عزیز شاگر سے معذرت کر دوں کی

بھائی پھر کبھی دعوت کر لینا، اب کی بار تو صحبت سے محروم نہ کرو، لیکن مولانا مجاہد نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کر دی کہ جاتے ہو تو جاؤ لیکن فجر کے بعد فوراً آ جانا، ناشتہ میرے ساتھ کرنا ہے۔

شنبہ ۲۳؍رجب ۱۴۰۰ھ ۳؍جون ۱۹۸۰ء کو میں امارت شرعیہ کے تعارف والے عربی کتابچے کا مسودہ مکمل شکل میں لے کر، صرف ایک روز کے لئے اسی ''پہلیجا گھاٹ'' کے اسٹیمر والے راستے سے ''مہندرو گھاٹ'' پٹنہ اور وہاں سے بذریعہ ٹیمپو پھلواری شریف پہنچا۔ مولانا مجاہدؒ اسی محبت اور گرمجوشی سے ملے، بلکہ عربی میں امارت کے تعارف والے کتابچے کو ''مال غنیمت'' سمجھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر تین دنوں بعد ہی واپسی کی اجازت دی۔ بہت سی کتابوں اور منصوبوں کو عربی شکل دینے کے لئے رائے مشورہ کیا اور امارت کے قضا کے کاموں کی تفصیلات بتائیں۔ ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو دل بھر آتا ہے۔

سہ شنبہ ۱۷؍شعبان ۱۴۰۰ھ یکم جولائی ۱۹۸۰ء کو میں اپنے وطن مظفر پور سے لکھنؤ سے روانہ ہوا۔ اس زمانے میں مظفر پور سے ''سونپور'' تک تو بڑی لائن بن چکی تھی، لیکن اس سے آگے لکھنؤ تک چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں تبدیل کرنے کا کام جاری تھا، اس لئے لکھنؤ جانے والے مسافر اکثر بس یا جیپ وغیرہ کے ذریعہ سونپور پہنچ کر وہاں سے بذریعہ ٹرین سفر شروع کرتے تھے۔ میں مظفر پور سرکاری بس اڈے کے باہر ایک جیپ والے سے سونپور کے لئے بات ہی کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کرتے کو کھینچتے ہوئے کہا نور عالم! میں جو مڑ کے دیکھا تو مولانا مجاہد کو اچانک پا کر اتنی خوشی ہوئی جیسے اس شخص کو ہوتی ہوگی جسے عین مشکل کے وقت کوئی مخلص غمگسار مل جائے۔ فرمایا چلو ساتھ چلتے ہیں، سونپور تک ساتھ رہے گا۔ میں اسی جیپ سے ''پہلیجا'' چلا جاؤں گا تم سونپور میں اتر جانا۔ جیپ پر سوار ہونے کے بعد میں نے خیر خیریت دریافت کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ابھی چند روز قبل گرامی نامہ ملا۔ انہوں نے حکم فرمایا کہ ۲۴؍۲۶؍جون ۱۹۸۰ء کی کسی تاریخ

کو میں پٹنہ یا مونگیر حاضر ہو کر نیاز حاصل کروں، لیکن خط تاخیر سے ملا، اس لئے میں اس سعادت سے محروم رہا۔ انہوں نے اپنے مکتوب میں یہ تحریر فرمایا کہ امارت شرعیہ پر تمہارا مقالہ ''خدمة دينية عظيمة''، مستقل کتابچے کی شکل میں چھپا ہوا عزیزی ولی سلمہ (مولانا سید شاہ ولی رحمانی) نے دیا۔ تحریر بہت بلند ہے، لیکن طباعت ناقص ہے۔ یہ سنتے ہی مولانا مجاہدؒ نے اپنے بیگ سے کتابچے کا ایک نسخہ نکال کر مجھے عنایت کیا۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! آپ پھلواری شریف سے کب تشریف لائے؟ فرمایا میں ۱۸؍جون کو ''جالہ'' آیا تھا اور اس وقت وہیں سے پھلواری شریف جا رہا ہوں۔ مولانا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ دسیوں سال سے ہم آپ سفر کر رہے ہیں، مگر کسی سفر میں ساتھ نہیں ہوا، حسنِ اتفاق کہ آج ساتھ ہو گیا۔ میں کتابچے کے مطالعے میں لگ گیا اور مولاناؒ انگریزی اور اردو اخبارات پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔

مظفر پور سات کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ جیپ والے نے یہ منحوس خبر سنائی کہ اس کی گاڑی کا انجن بیٹھ گیا ہے، اس لئے ہم لوگ کوئی دوسری سواری کی سوچیں۔ ہم لوگ بہت متفکر ہوئے کہ کیا کریں۔ اتنے میں ایک بڑا ٹرک آیا، جیپ کے دیگر مسافر اس پر چڑھ گئے۔ مولانا میں ان کے رفیق سفر وہیں پڑے رہے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چائے کی دکان میں جیسے ہی پہنچے کہ چند سوٹ بوٹ والے نوجوان نمودار ہوئے، مولاناؒ کو دیکھتے ہی اچنبھا ہوئے، واقعہ کا علم ہوا، تو وہ معقول سواری کی تلاش میں لگ گئے، اتنے میں ایک پرائیویٹ بس آئی اور ان لوگوں نے احترام کے جذبات کے ساتھ ہمیں اس پر سوار کرا دیا اور ہمارے سارے سامان بھی ہاتھوں ہاتھ اس پر ڈال دئے۔ بس چل پڑی تو میں نے مولاناؒ سے عرض کیا کہ یہ کون لوگ تھے؟ مولاناؒ نے فرمایا: بھئی! میں بھی نہیں جانتا، لیکن میں نے ان سے یہ پوچھا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ مروت کے خلاف سمجھا، وہ اپنے دل میں سوچتے کہ یہ کیسے مولانا ہیں کہ میں انہیں پہچانتا ہوں اور یہ مجھے نہیں پہچانتے؟ اندازہ یہ ہے

کہ یہ لوگ ٹریننگ اسکول کے طلبہ ہیں، کیونکہ اس گاؤں کا نام ''ترکی'' ہے اور یہاں کا یہ اسکول بہت مشہور ہے۔

اس واقعے سے مولانا کی خوش خلقی، شرافت اور خوئے انسانیت عیاں ہے۔ اسی ہتھیار سے انہوں نے ہزاروں دلوں کو فتح کیا اور ہزاروں آنکھوں کو اپنے بعد اشک چھوڑ گئے۔ غیر معمولی علم وفراست اور فطانت وذہانت کے ساتھ ملنساری، خوش اخلاقی اور خندہ روئی کی اتنی بڑی دولت، کم لوگوں کو ہاتھ آتی ہے، لیکن جن لوگوں کو ہاتھ آتی ہے، خلق خدا کی بڑی تعداد، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے کے بعد، پھر اپنا ہاتھ کبھی نہیں کھینچتی، کہ دلوں کا فاتح، فاتح زمانہ ہوا کرتا ہے۔

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند آمد کے بعد مجھے متعدد مرتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اب امارت کے سارے دفاتر پھلواری شریف پٹنہ شاہراہ عام پر کشادہ اور شاندار عمارتوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ مولاناؒ سے ہر مرتبہ مل کر نہ صرف جی خوش ہوتا، بلکہ ان کی اپنائیت اور شفقت میں اضافہ محسوس ہوتا رہا۔ ایک آدھ مرتبہ بلا وقت بھی ان کی خدمت میں جا دھمکا۔ ایک مرتبہ مجھے اپنے بعض مسائل کے حل کے لئے بعض آزمودہ کار حضرات کے مشورے سے مرحوم سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں انہیں ذاتی اور ناگریز کام کے لئے زحمت دینے آیا تھا۔ وہ سابقہ تمام ملاقاتوں سے زیادہ خندہ پیشانی سے ملے۔ اسی وقت پٹنہ کے سرکاری دفاتر کے بعض شناسا اور متعلقہ افسران کو انگریزی میں خطوط لکھے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کے ساتھ، مجھے اسی دل داری کے ساتھ رخصت کیا اور فرمایا کہ بہ صورت دیگر مجھ سے دوبارہ رابطہ کرنا۔

دیوبند کے میرے اب تک کے ۲۰ سالہ دورانیۂ عمل کے دوران وہ کئی بار دیوبند تشریف لائے۔ وہ جب تشریف لاتے، فوراً کسی کے ذریعے جن لوگوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کا اہتمام فرماتے، ان میں راقم الحروف بھی ہوتا۔ ایک بار مجھے دارالعلوم کے مہمان

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

خانے میں تشریف آوری کے فوراً بعد حاضر ہونے کا حکم فرمایا۔ میں جیسے ہی حاضر ہوا علیک سلیک کے بعد مہمان خانے سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے اترے۔ میں نے سمجھا کہ شاید میری قیام گاہ افریقی منزل تشریف لے جانا چاہتے ہیں، لیکن وہ دارالعلوم کی مسجد قدیم والے چوراہے کی طرف مڑے اور اس کو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے عبور کر گئے اور فوراً حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی (صاحب زادۂ گرامی حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کے مکان میں داخل ہو گئے۔ میں نے انہیں جب دیکھا کہ یہ حضرت میرے ساتھ ''ریڈ لائن'' (Red Line) پار کر رہے ہیں...... کیونکہ دونوں دارالعلوموں میں جو دوری ہے، اس کی وجہ سے ایک دارالعلوم کے اساتذہ کا دوسرے دارالعلوم کے اساتذہ سے ملنا عملاً تقریباً بند ہی ہے۔ تو میں نے اپنا ہاتھ جھٹکنا چاہا۔ مولانا جھٹ فرمایا۔

چوں در دوستی مخلصم یافتی
عنانم صحبت چرا تافتی؟

اور فرمایا آؤ تو سہی مجھے تم سے ضروری کام ہے۔ حضرت مولانا سالم صاحب کی بیٹھک میں جیسے ہی ہم لوگ داخل ہوئے، وہاں اخبار نویسوں کو دیکھا کہ وہ مولانا مجاہد صاحب سے انٹرویو کے لئے بیٹھے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد واپس تشریف لائے اور سیدھے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے ملاقات کے بعد مہمان خانے واپس آئے۔ فرمایا کہ عزیزم! میں نے کویت کی وزارتِ امور مذہبی واوقاف کی طرف سے شائع کردہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا اردو ترجمہ کروانے کا پروگرام تشکیل دیا ہے۔ اس سلسلے میں تم سے زیادہ امیدیں وابستہ ہیں، دیگر فضلا کا بھی انتخاب کرلیا ہے، لیکن تمہیں سب سے زیادہ زحمت دینی ہے یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک جلد کا آدھا حصہ میرے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ اتنے کا ترجمہ تو جلد ہی

کردو، میں دیوبند آمد کے دوایک سال کے بعد سے مجموعۂ امراض سا ہوگیا ہوں، کارہائے مفوضہ کی انجام دہی کے بعد دیگر کوئی کام مشکل سے کر پاتا ہوں، لیکن محبت افشانی اور پیار پاشی کے ان کے انداز کو نظر انداز کی جرأت نہ کرسکا، مگر دوڈھائی سو صفحات کا ترجمہ بہ مشکل تمام ایک سال میں مکمل ہوسکا، جس کو فقہ اکیڈمی کے محسن عثمانی صاحب ندوی کے سپرد کرکے میں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ ان سے معذرت کرلی۔

وہ کئی مرتبہ ازخود اور بعض دفعہ میری درخواست پر میری قیام گاہ افریقی منزل قدیم تشریف لائے۔ ایک بار تو خاص میری عیادت کو آئے، فرمایا سنا ہے کہ تمہیں تلوے میں اکثر زخم رہا کرتا ہے، دیکھیں کہاں ہے؟ میں نے زخم کھول کر دکھایا، تو پوچھنے لگے کہ تم کہاں علاج کراتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اکثر دیوبند ہی میں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں کہ یہ آسان ہے، جب زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو دہلی میں ''آشرم'' کے علاقے میں واقع 'جیون نرسنگ ہوم' کا قصد کرتا ہوں کہ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ متوفی ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۵ء...... جو ان دنوں الحمدللہ حیات تھے۔ اکثر اپنا علاج بھی وہیں کراتے ہیں۔ فرمایا: دیکھو یہ کوئی ادب اور زبان کا مسئلہ نہیں ہے کہ تم مولانا وحید الزماں کیرانوی کی اس سلسلے میں بھی تقلید کرتے ہو۔ تم ایک آدھ بار یا تو پٹنہ آؤ، ورنہ دہلی میری موجودگی میں کبھی آؤ، تمہارا علاج میں کسی اچھی جگہ کرانا چاہتا ہوں۔ میں آج کل کرتا اور سوچتا ہی رہا کہ مولاناؒ کے حکم کے مطابق دہلی میں ان کے توسط سے کوئی کارگر علاج کسی موقع سے ضرور کراؤں گا کہ اتنے میں مولانا خود انتہائی بیمار اور لاچار، بلکہ رہینِ فراش اور آخرش بستر مرگ پر دراز ہوگئے۔ وقت، موقع اور حالات کس کا انتظار کرتا ہے کہ میرا یا مولانا مجاہدؒ کا کرتے؟

یوں تو وہ عرصے سے شوگر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور اس کے عوارض روزافزوں تھے، لیکن اپریل ۱۹۹۸ء (ذی الحجہ) میں اس تشخیص کے بعد کہ انہیں کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہوگیا ہے، علاج کے لئے، ان کا مستقل قیام دہلی ہی میں رہا۔ پہلے وہ حضرت نظام

الدین ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک مخلص کے مکان میں کئی ماہ رہے۔ پھر (۱۶۶) ذاکر باغ اوکھلا میں سکونت اختیار کی۔ وہ بار بار اپولو اسپتال میں داخل ہوتے رہے یا اسی اسپتال کے ڈاکٹروں کے مشورے اور نگرانی میں پیہم علاج ہوتا رہا۔

دہلی کے اس طویل قیام کے دوران، متعدد مرتبہ عیادت اور ملاقات کے لئے حاضر ہوا، بیماری کے ساتھ ساتھ تصنیفی و تحقیقی مشاغل اور ملت کے ہمہ جہت مسائل کے حوالے سے ہمہ وقت متفکر رہنے کی وجہ سے ان کا وقت انتہائی مصروف رہا کرتا تھا، مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے بعد ان کی ذمہ داریاں دوچند ہوگئی تھیں، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی رفیق کار یا خادم نے ان سے یہ کہا ہو کہ دیوبند سے نور عالم آیا ہے اور انہوں نے اسی وقت اندر نہ بلالیا ہو۔ جب بھی ملتا سراپا محبت و شفقت نظر آتے، مصافحہ کرتے وقت دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رہتے اور فرماتے تم ایسے چند مخلصوں سے مل کر زندگی پر اعتماد بحال ہوجاتا ہے۔ کبھی فرماتے اتنے دنوں بعد کیوں آئے ہو؟ ادھر چند ہفتوں سے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے، لیکن خوش اخلاقی اور خندہ روئی کا خزانہ حسب سابق لٹاتے رہے۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام کو ان کے معاصرین واقران علماء سے یہ بات بھی ممتاز کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قدرت گویائی سے نوازا تھا۔ گویائی کے دعوے دار ہماری صف میں بہت لوگ نکل آئیں گے، جو بے ہنگم طریقے سے شور مچانے اور بے تکان گھنٹوں سمع خراشی اور گلے کی مشق کی بلا کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن میری مراد یہ نہیں۔ مولانا مجاہد بھرے مجمع میں تقریر کرتے، یا کسی مجلس میں کوئی گفتگو کرتے تو متعلقہ موضوع کو ترتیب کے ساتھ، خوش اسلوبی کے ساتھ اور اس کے تمام ممکنہ اعتمادی اور ڈھنگ سے پیش کرتے کہ مخاطب نہ صرف متاثر ہوتا، بلکہ مرعوب ہوجاتا تھا۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بڑے ماہر تھے، تعبیر کی خوبیوں اور خرابیوں اور طرز ادا کے محاسن و معائب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ موضوع خواہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا ہو، یا تازہ ترین حالات پر تبادلۂ خیال ہو، یا

ہندی مسلمانوں کو درپیش چیلنج زیر غور ہو، یا اخبار نویسوں کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مطمئن کرنا ہو، مولانا مجاہدؒ کی شگفتہ، شستہ، برجستہ، نپی تلی، بلیغ، موقع ومحل کے لئے موزوں، موتیوں کی طرح پروئی ہوئی، حشو وزوائد سے پاک اور حجت وبرہان سے مستحکم گفتگو، مخاطب کو زبان حال اور بعض دفعہ حال اور قال دونوں سے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ قانونی پہلو والی پیچیدہ اور طویل گفتگو کو حیرتناک طور پر، آسان زبان میں مختصر طور پر پیش کرنے میں طاق تھے۔ یعنی بہ وقت ضرورت کسی بھی موضوع کا خلاصہ یا اس کا جوہر نکال کر مخاطب کے سامنے رکھ دینے کی عجیب سی قدرت رکھتے تھے اور اگر کسی موضوع کو شرح وبسط کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے، تو قطرے کو سمندر اور ذرے کو بیاباں بھی بنا دیتے۔ یعنی مقام اور موضوع کا جیسا تقاضا ہو، ویسا کرتے۔

پھر عجیب سی بات یہ تھی کہ مخاطبین خواہ علماء ہوں، خواہ مفتیان کرام ہوں، مفکرین اسلام ہوں، دانش وران قوم ہوں، زعمائے وطن ہوں، اخبار نویس ہوں، وکلاء ہوں، ڈاکٹر ہوں، انجینئر ہوں، انگریزی تعلیم یافتہ اور نئے طبقے کے لوگ ہوں، یا قدیم طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، یا سیاست داں ہوں، پھر یہ کہ صرف مسلمان کا مجمع ہو، یا صرف غیر مسلموں کا، یا دونوں فرقوں کا، مولانا مجاہد سبھوں سے اپنی چشم کشا اور بصیرت افروز گفتگو سے، اپنے خیالات کی سچائی اور نقطۂ نظر کی صحت کو منوا لینے میں منفرد تھے۔

اس سلسلے میں ان کی ذہانت، علمی جامعیت، شیریں سخنی موضوع پر قابو، مطالعے کی وسعت، حالات حاضرہ سے آگاہی اور اردو عربی کے علاوہ انگریزی زبان پر دسترس بھی ان کا ساتھ دیتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے بعد (جو دراصل حضرت مولانا منت اللہؒ رحمانی کی تحریک وفکر، مولانا مجاہد کی منصوبہ بندی اور ہندی

مسلمانوں کے گوہر شب چراغ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیادت وسرپرستی میں معرض وجود آیا) حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا مجاہد کی ملی خدمات کا قافلہ، جب بہار سے پورے ملک کے لئے سرگرم سفر ہوا اور محبان دین کو دونوں غازیان کردار وگفتار کے خلوص اور قائدانہ صلاحیت سے واقفیت ہوئی تو اکثر لوگوں کو کہتے سنا کہ مولانا منت اللہ رحمانی اگر ملت کی گاڑی کا مضبوط انجن ہیں، تو مولانا مجاہد اس انجن کا پٹرول ہیں۔ یعنی اول الذکر کا دماغ ایک نقشہ بناتا ہے اور ثانی الذکر کا علم وفکر اس میں رنگ بھرتا ہے اور اپنے علم کی تازہ کاری اور فکر کی بالیدگی اور زبان وبیان کی شیرینی سے ملی خدمات کے لئے نئے نئے علاقوں کو فتح کرتا ہے۔

مولانا مجاہدؒ کی قادر الکلامی اور ذہانت وفطانت کی پروردہ بلاغت کے حوالے سے ایک واقعے کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لکھنؤ میں چار باغ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک مسافر خانہ نیا نیا بنا تھا اواخر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ اوائل مئی ۱۹۷۸ء میں اسی میں مولانا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کی اہم میٹنگیں منعقد ہوئیں، جن میں بورڈ کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اس وقت کے قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ، اس وقت امارت شرعیہ کے ناظم اور اس وقت امیر شریعت وسکریٹری جنرل بورڈ مولانا نظام الدین، ندوۃ المصنّفین دہلی کے بانی وسرپرست اور ممتاز اسلامی قائد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، متوفی ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء مفتی ضیاء الحق دہلوی، امیر جماعت اسلامی مولانا یوسفؒ، سابق امیر جماعت مولانا ابو اللیث ندویؒ، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ابراہیم سلیمان سیٹھ اور اس کے اہم لیڈر غلام محمود بنات والا، نیز مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندویؒ اور عالم خلیل حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ متوفی ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء لکھنؤ کے فرنگی محلی عالم مولانا ہاشم میاںؒ، ندوہ کے شیخ التفسیر مولانا برہان الدین سنبھلی لکھنؤ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وغیرہ نے شرکت کی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ (جنہیں اعتراف حق کی غیر

معمولی توفیق سے خدائے بخشندہ نے نوازا تھا اور جو خود بے نظیر اور عالم میں انتخاب عالم ومفکر وادیب وخطیب تھے) جب بھی مذکورہ میٹنگ کی کسی نشست میں شرکت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں تشریف لاتے، جہاں ان کا لکھنؤ آمد کے وقت قیام ہوا کرتا تھا، تو وہ اس میں ہونے والی گفتگو اور مسائل پر ہونے والے تبادلۂ خیال سے زیادہ والہانہ انداز میں اور بار بار مولانا مجاہدؒ کے حسن بیان، قانونی نزاکتوں اور فقہی نقطوں کی دیدہ درانہ تشریح کا، منہ بھر بھر کے اور مزے لے لے کر تذکرہ کرتے اور فرماتے کہ مولانا مجاہدؒ ہندی مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ ہیں، اللہ نے عجیب سی قدرت گفتار سے نوازا ہے، جس بات کو دیگر علما گھنٹوں میں بیان نہیں کر سکتے، مولانا مجاہد نے منٹوں میں اس طرح بیان کر دیا کہ لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ ضرورت ہے کہ انہیں آگے بڑھایا جائے اور ملک وملت کے مسائل کے حل کے لئے ان کے تازہ دم وبھر پور علم، قادر الکلامی اور حیرتناک ذہانت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

برصغیر کے علماء میں وہ اس بات میں بھی ممتاز تھے کہ ان کا ذہن، علم فقہ اور قضاء وافتا کے لئے خدائے علیم نے خاص طور پر ڈھالا تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ عصر حاضر میں اس صنعت کے خاص عالم کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کو اس باب میں جو مہارت وبصیرت تھی، اس میں پاکستان کے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کے بجا طور پر استثنا کے ساتھ، ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس دعوے کو شاید ہی کوئی انصاف پسند اور حق گو عالم چیلنج کر سکے۔ ان کی شہرت جب اندرونِ ملک سے بیرون ملک پہنچی اور عالم عرب وعالم اسلامی کے علماء ہی نہیں وہاں کے قانون دانوں کو ان کی ہمہ گیر فقہی بصیرت کا علم ہوا تو سبھوں نے ان کا لوہا مانا، چنانچہ عالم عرب کے علاوہ دیگر مغربی اور افریقی ممالک میں انہیں فقہی، شرعی اور علمی سیمیناروں میں دعوت دی گئی، وہاں ان کے متعدد فقہی وعلمی اداروں کے ممبر اور سرپرست منتخب ہوئے، ہر جگہ ان کی پذیرائی ہوئی، بلکہ فقہ وقضا واجتہاد میں ان کی انفرادیت کا ماہرین فن اور مفکرین نے کھل کر اعتراف کیا۔ کویت، سعودی عرب اور مصر کے علماء وارباب علم

ودانش نے تو بہ طور خاص انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جامعہ ازہر کے موجودہ شیخ سید طنطاوی ان سے بہت متاثر تھے۔ علوم شریعت میں ان کی گہرائی کو خراج عقیدت ہی کی بات تھی کہ انہیں اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ، اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، علمی اکیڈمی شام، ہیئۃ خیریہ اسلامیہ کویت وغیرہ کا رکن منتخب کیا گیا اور اندرون ملک تو وہ اسلامی فقہ وقضا کا عنوان، بلکہ اس کی آبرو تھے۔ عالم اسلام کے علماء وفقہاء ان کی ایک ملاقات کے بعد ہی ان کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ سعودی عرب کے محکمہ العدل ریاض میں تشریف لے گئے، قاضیوں سے ملاقات ہوئی، فیصلوں کے طریقوں پر تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا مجاہدؒ نے جب وہاں کے قاضیوں کو اس راہ کے اپنے طویل تجربوں اور امارت شرعیہ میں اپنے فیصلوں کے انداز پر عربی میں فاضلانہ گفتگو کی تو وہ لوگ ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس وقت ان قاضیوں نے طے کیا کہ وہ وقتاً فوقتاً مولانا مجاہدؒ کو مدعو کر کے ان کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ بعد میں اس پر عمل ہوا کہ نہیں۔

مدینہ منورہ میں شیخ عطیہ سالم مالکیؒ سے ایک مرتبہ تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ مولانا کے علم وتفقہ سے حد درجہ متاثر نظر آئے اور فرمایا کہ اگر میں اس وقت قضا کے منصب پر ہوتا، تو آپ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی، مجھے آپ جیسے عمیق العلم اور ذہین علماء کی جستجو رہتی ہے۔

مولانا مجاہدؒ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ ان میں فکر ونظر کی بھرپور وسعت پائی جاتی تھی، لیکن ساتھ ہی ان میں مومن کا توازن اور علوم شریعت میں گہرائی رکھنے والے عالم کی شانِ اعتدال اور ثوابت پر جمنے کی خوبی پائی جاتی تھی۔ وسعت نظری کی وجہ سے ان میں وسیع النظری تھی اور وسیع النظری اور کشادہ قلبی کی وجہ سے ان کے اندر دوسروں کو برداشت کرنے اور کلمۂ توحید کی بنیاد پر امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اتحاد ملت کی دعوت کو زور وشور سے ہر موقع سے، ہر بزم میں اور اجلاس عام وجمع وخاص میں پیش کرنے کا نہ صرف داعیہ پیدا ہوا، بلکہ انہوں نے اس دعوت کو عملی طور پر برپا کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں اور امکانات

کا لیاقت کے ساتھ استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے قول وعمل سے ہر جگہ یہ ثابت کر دکھایا کہ امت اور ملت کی وحدت اصل ہے اور باقی تمام سرگرمیاں، تحریکیں، تنظیمیں، ادارے، انجمنیں اس کی فرع ہیں، مسلک اور نقطہ نظر کا اختلاف امت کے اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہئے، ورنہ ملت کا وجود ہی معرضِ خطر میں آجائے گا، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں جو دستور کے اعتبار سے خواہ سیکولر ہو، لیکن اکثریت کی بڑھتی ہوئی جارحیت اور ہندو مذہب کی جارحانہ تعبیر وعمل کی وجہ سے، تمام سرکاری اداروں اور مشینریوں کی سمتِ سفر میں تیزی سے جو خطرناک تبدیلی رونما ہورہی ہے، اور ننگی تلوار بن کر ملت کے وجود کے سر پر لٹک رہی ہیں، اس لئے اب اگر تحزب، تعصب، تنگ نظری اور مسلکی نظری اختلافات کو دین بنالینے کی کوشش کی گئی، تو یہ بڑے جرم کی بات ہوگی اور ایسا کرنے والوں کو تاریخ کبھی معاف نہ کرے گی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (جس کے وہ شدید علالت کے زمانے میں، مفکر اسلام مولانا علی میاں کی رحلت کے بعد صدر بھی ہوگئے تھے) تو شروع ہی سے ہندی مسلمانوں کا سب سے زیادہ مضبوط اور وسیع البنیاد پلیٹ فارم رہا، جس کو مولانا مجاہد نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی سرپرستی میں اول دن سے ملت کے اتحاد واتفاق کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے استعمال کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لئے پرسنل لا بورڈ نے جو کوشش کیں، ملت کی ملی وشرعی زندگی کی موت وزیست سے متعلق مسائل کے سلسلے میں جو اجتماعی فیصلے کئے، اس کی نظیر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کسی اور تنظیم کے حوالے سے ہرگز نہیں پیش کی جاسکتی۔

اتحاد ملت ہی کے جذبے سے انہوں نے کئی سال قبل آل انڈیا ملی کونسل کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی، تاکہ ہندی مسلمانوں کے مسائل کو متحدہ پلیٹ فارم کے ذریعہ مؤثر طور پر پیش کیا جاسکے۔ مولانا کے اس اقدام سے نہ صرف مسلمانوں کی صفوں کے سیاسی طالع آزماؤں کو قلبی اذیت ہوئی، بلکہ علماء کی صف میں ان کے بہت سے مخلصوں کو بھی ان

کے اس فیصلے سے آخر وقت تک اختلاف رہا۔ ثانی الذکر لوگوں کا اختلاف سچی نیت پر مبنی تھا، کیونکہ ان کو بجا طور پر اندیشہ تھا، جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آیا، کہ مولانا مجاہدؒ جیسے عالمِ جلیل اور فقیہ وقت کو پرسنل لا بورڈ اور امارت شرعیہ، نیز فقہ اکیڈمی کے بعد کسی اور پلیٹ فارم کی ضرورت نہ تھی کہ کسی درجے میں بھی سیاسی شناخت رکھنے والی تنظیم سے ان کے انتساب کی وجہ سے، سیاسی قسمت آزما لوگ ان کو اپنا حریف بنالیں گے اور بلاضرورت ان جیسا بلند نگاہ، مخلص اور علوم فقہ وقضا کا بے بدل عالم، سیاسی اختلافات اور حریفانہ کش مکشوں کا نشانہ بن جائے گا اور ملت کی فقہی راہ نمائی، شرعی گرہ کشائی اور نئے نئے مسائل کے لئے دینی حل کی راہ پر جس قافلے کو انہوں نے سرگرم سفر کیا ہے، اس کی رفتار سست پڑ جائے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہ قافلہ اپنا سفر ہی روک دے۔

اہل علم وفکر کے بہت سے اقدامات سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا، اس لئے مولانا مجاہد کے اس فیصلے یا دیگر اقدامات سے اختلاف کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے، لیکن ان کے خلوص اور نیک نیتی سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ ملی کونسل نے ملی خدمات کے میدانوں میں اپنی نوعمری، مولانا مجاہد کی ہمہ قسم کی علالت، مخلص اور متعدد بہ تعداد میں لائق افراد کار کی کمی اور بعض دیگر رکاوٹوں کے باوجود، متعدد ایسے کام انجام دئے جیسے کسی اور تنظیم اور جماعت نے انجام نہیں دئے۔ مثلاً مسلمانوں کی حقیقی بیداری کے بہت سارے خاکوں میں رنگ بھرا گیا، انہیں تعلیمی اور عصری ثقافت کی سطح پر خصوصاً ٹیکنیکل اور طبی تعلیم کے میدان میں معقول بلند سطح تک پہنچانے کی جو کوشش کی گئی، اس طرح کے جو تعلیمی ادارے قائم کئے گئے، نیز سرکاری مشینری کے ظلم کے شکار مسلمانوں کے لئے ہر علاقے میں قانونی چارہ جوئی کا جو مؤثر نظام برپا کیا گیا اور ٹاڈا جیسے ظالمانہ اور فسطائی قانون کے خلاف جو فعال قدم اٹھایا گیا، اسی طرح مسلم سیاست دانوں کو باقاعدہ طور پر جوڑنے کی جو کارروائی کی گئی، ملک کے دانشوروں اور چوٹی کے زعما وقائدین سے بلاتفریق مذہب وملت، جس طرح رابطہ استوار

کر کے، ٹھوس بنیادوں پر مسلمانوں کے مسائل ومشکلات سے انہیں آگاہ کر کے، انسانی بنیادوں پر حکومتی، سیاسی بنیادوں پر حکومتی، سیاسی، ابلاغی اور عوامی سطح پر پیش کرنے کی انہیں جس طرح دعوت دی گئی، یہ سب کارنامے ملی کونسل کو دیگر مسلم جماعتوں سے امتیاز کی سند عطا کرنے کے لئے کافی ہیں اور ملی کونسل کے حوالے سے یہ سارے کارنامے مولانا مجاہدؒ کے اور ثانیاً ان کے خلوص کیش رفقا کے نامہ اعمال میں انشاء اللہ درج ہوں گے۔

مولانا مجاہدؒ کا یہ کارنامہ بھی ممتاز اور ناقابل فراموش ہے کہ انہوں نے فقہ اکیڈمی کی تاسیس، اس کے سیمیناروں اور فقہی اجتماعات کے ذریعے، نہ صرف ان گنت نئے نئے مسائل کے شرعی حل پیش کئے اور امام ابوحنیفہؒ کے طرز عمل پر عمل کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے نقطۂ نظر کو عملی جامہ پہنایا، عام کیا، علما کو اس کا عادی بنایا، بلکہ اس پلیٹ فارم کے ذریعہ انہوں نے نوجوان علماء وفضلا کو نئے حالات ومسائل پر سوچنے، لکھنے، غور کرنے اور بولنے کے لئے حوصلہ دیا اور نوجوان علما کی ایک جماعت کو صحیح وقت پر، صحیح سمت میں سرگرمِ سفر کر دیا اور بہت سے لوگ فقہ واجتہاد کے متنوع موضوعات پر لکھ کر مصنف ومؤلف بن گئے اور بنتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان کا احسان نہ بھی مانیں تو اللہ کے یہاں تو مولانا مجاہدؒ کے سارے احسانات ریکارڈ ہیں۔ فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں جو مقالات پڑھے گئے وہ بجائے خود عظیم فقہی سرمایہ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سارے مقالات وتحقیقات مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، کاش ان کے سچے خلف انہیں عربی زبان میں منتقل کروا سکتے۔

اس کے علاوہ فقہ اکیڈمی ہی کی طرف سے انہوں نے ’’بحث ونظر‘‘ کے نام سے جو وقیع علمی وفقہی رسالہ جاری کیا اور آخر تک جاری رہا، وہ مستقل کارنامہ ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے علمی، فقہی، تحقیقی مقالات اہل علم وارباب فقہ وفتوی کے لئے چشم کشا ثابت ہوئے اور بہت سے لوگوں کے لئے فکر وعمل کی تحریک کا ذریعہ بنے۔

قائدانہ، مفکرانہ اور سیاسی وسماجی وملی سطح پر بے پناہ مشاغل اور ادھر سالہا سال سے

شدید قسم کی علالت کے باوجود مولانا مجاہد نے جو علمی وتالیفی نقوش چھوڑے ہیں، وہ بھی معیار ومقدار دونوں اعتبار سے غیر معمولی ہیں اور مرنے کے بعد بھی ان کے لئے نہ صرف باعث زندگی، بلکہ صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گے۔

ان کی مشہور کتاب تو ’’اسلامی عدالت‘‘ ہے جو واقعی ایک عالم کی علمی بصیرت اور قاضی کی فراست وپختہ ذہنی کی آئینہ دار ہے۔ وہ عرصہ پہلے چھپ کر عام ہو چکی ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ ’’نظام القضاء فی الاسلام‘‘ کے عنوان سے بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح قضایا فقہیۃ معاصرۃ، فقہ المشکلات، الذبائح، دراسات علمیۃ، بحوث فقہیہ اور الوقف کے عنوان سے کئی عدد کتابیں اردو سے عربی میں ترجمہ ہو کر، عالم عربی میں طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ جلسہ ہائے عام میں کی ہوئی ان کی بعض تقریریں بھی چھپ چکی ہیں، انہیں پڑھنے والے کو بھی زبان کی لذت، فکر کی ندرت، گفتار کی گل افشانی اور جہاں دیدہ مفکر کا سوز وساز ایک خوبصورت آمیختہ شکل میں نظر آتا ہے۔

عین بیماری کے زمانہ میں جب کہ کہنا چاہیے کہ وہ بستر مرگ پر تھے ’’صنوان القضاء‘‘ نام کی عظیم فقہی کتاب کو چار جلدوں میں ایڈٹ کیا۔ وہ کویت کی وزارت اوقاف وامور مذہبی کی طرف سے شائع ہو کر وفات سے قبل ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سرور کا باعث بن چکی ہے۔ مولانا مجاہدؒ نے نہ صرف زمانہ صحت میں، بلکہ علالت کے عرصے میں جب کہ کئی سال پہلے تیماردار اور ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، نہ تو ملی مسائل سے صرف نظر کیا اور نہ دادِ تحقیق وتالیف دینے سے باز رہے۔ ان کا یہ وصف انہیں عظیم علمائے سلف کی صف میں کھڑا کرتا ہے، جنہوں نے آخری لمحے تک قرطاس وقلم کا ساتھ چھوڑا، نہ اس پر فکر ونظر کی پشت سے نزول کیا اور المحبرۃ الی المقبرۃ (یعنی دوات کا تو قبر تک ساتھ رہے گا) کی زندہ جاوید، درس انگیز اور حوصلہ افزا مثل چھوڑ گئے۔

جمعرات ۴/اپریل ۲۰۰۲ء (۲۰ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ) کو عرصے کے بعد میں ایک مختصر

اورنا گزیر سفر پر رائیپور اور مرزاپور، ضلع سہارنپور گیا ہوا تھا۔ مغرب کی نماز کے ذرا دیر بعد ہی جیسے گھر میں قدم رکھا کہ ایک صاحب نے فون پر بتایا کہ دہلی سے ابھی فون آیا ہے کہ مولانا مجاہدؒ سات بج کر پانچ منٹ پر اللہ کو پیارے ہوگئے، تو ایسا لگا جیسے کوئی مجنوں ہماری اس دنیا کے جنگل کو اداس کر گیا۔ فکر و نظر کے میدان کا مجنوں، ملی خدمتوں کے صحرا کا مجنوں، دین و شریعت کے جنگل کا مجنوں اور امت کی ہمہ گیر ترقی کے لئے تڑپنے، نقش بنانے اور اتحاد و اتفاق کی لیلیٰ پر جان چھڑکنے والا مجنوں......اور اب: ع

مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی اب دنیا میں نہیں رہے، ان کا چھوڑا بہت سا کام ابھی باقی ہے، لیکن ان کے ایسے عاشق سوختہ جاں اور عاشقی کی تمام اداؤں کا رازداں، بلکہ کاروبار عشق کا ماہر، ہر روز اور آسانی سے پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی روح گویا ان کے علماء وقائدین سے بجا طور پر مخاطب ہے:

ہے جنوں، اہل جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا، میرے بعد

اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ملت کو اپنی قدرت کاملہ سے ان کا نعم البدل عطا کرے۔ **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔**

☆☆

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لے کر

● رضوان احمد قاسمی

علم و دانش کا آفتاب، حلم و بردباری کا پیکر، فقہ و تفقہ کا امام، مجاہد باسل، مفکر ملت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی علمی، دینی، سماجی اور رفاہی خدمات کو امت اسلامیہ ہندیہ بالخصوص اور عالم اسلام بالعموم نہیں بھلا سکیں گے، پچھلے چند سالوں سے مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے اپولو اسپتال دہلی میں علاج کے لئے آنا جانا ہوتا رہا، ۱۱/مارچ کے بعد مرض میں برابر اضافہ ہوتا گیا اور مسلسل وہیں زیر علاج رہے۔ یہاں تک کہ ۴/اپریل ۲۰۰۲ء بروز جمعرات سات بجے شام مالک حقیقی سے جا ملے۔ **فانا للہ وانا الیہ راجعون۔**

حضرت قاضی صاحب کے وصال کی خبر چند ہی گھنٹوں میں پورے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی جس نے بھی سنا، آہ و بکا کی اور بلا اختیار زبان پر یہ جاری ہوا کہ حضرت امت کو بیچ بھنور میں چھوڑ کر رخصت ہوگئے اور ایک ایسی حالت میں جبکہ امت کو ان جیسے بے باک قائد اور مجاہد اور فقیہ کی ضرورت تھی، ملک و بیرون ملک میں تعزیتی جلسے اور مجلسیں منعقد ہوئیں۔ سبھوں نے رنج و غم کا اظہار کیا۔

۱۹۵۵ء کے اواخر میں دارالعلوم کے سالانہ امتحان میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی، دوران طالب علمی طلبا کے درمیان مقبول اور اساتذہ کرام کے ممنون نظر رہے۔ دارالعلوم میں موصوف کے دور طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا سید انظر شاہ

مسعودی کشمیری زیدمجدہ اپنی ایک تحریر میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

''میں دارالعلوم میں مدرس ہو چکا تھا کہ قاضی صاحب دارالعلوم میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے، ان کی طالب علمی از اول تا آخر میری نظروں میں گھومتی ہے فلاکت کے شکار، ناداری کے آہنی پنجے میں، پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل ایک لنگی اور معروف طالب علمانہ دراز کرتا، موسم سرما آتا تو دیوبند کی قہر برپاتی سردی ایک معمولی بھاگلپوری چادر، جوان کے نصف اعلیٰ کے لئے بھی ناکافی ہوتی، مگر واقعی طالب علم تھے، پڑھنے میں ممتاز، صلاحیتوں میں طاق، بے حد خوش خط، ہر سال امتیازی نمبرات سے کامیاب دورہ حدیث میں نمبر اول رہے۔''

بہر حال موصوف نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی ایماء پر پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور فاضل عربی آنرز کا امتحان فرسٹ کلاس سے پاس کیا، اسی دوران جامعہ ازہر مصر میں داخلہ کے لئے ان کا انتخاب ہو گیا، مگر اپنے طبعی رجحان کے باوجود امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی خواہش اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایماء پر ''جامعہ ازہر'' نہ جا کر ''جامعہ رحمانی مونگیر'' میں استاذ عربی کی حیثیت سے قیام پذیر ہو گئے، وہاں ابتدا تا دورہ حدیث ہر فن کی مختلف کتابیں پڑھائیں، طلبہ میں بے حد مقبول رہے، درس کا انداز نرالا اور انوکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ طلبہ کا جم غفیر ان سے استفادہ کے لئے ہر وقت مشتاق رہتا، درس کے علاوہ علیحدہ طور پر بہت سے طلبہ نے اپنی علمی تشنگی دور کی، اس طرح وہ مختصر مدت میں ایک کامیاب مدرس اور استاذ بن کر ابھرے اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا، اسی تدریسی دور میں حضرت امیر شریعتؒ نے اپنی دوربیں نگاہوں سے قاضی صاحب کی صلاحیت واصابت رائے کو تاڑ لیا تھا۔ انہوں نے امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے آپ کو ۱۹۶۰ میں بحیثیت قاضی القضاۃ منتخب فرمایا، اس وقت امارت شرعیہ کا دائرہ کار محدود سے محدود تر اور آمدنی کے ذرائع نہایت قلیل تھے، ''امارت'' کی اس کسمپرسی کے عالم میں موصوف نے امارت کے

کئی اہم عہدوں: مسند قضاء، نظامت اور بیت المال کی ذمہ داری بیک وقت سنبھالتے ہوئے بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کا خلوص، طریقہ کار اور مسئلہ امارت پر ان کے مضبوط و مستحکم طرز فکر کو سامنے رکھا اور امیر شریعت کی نگرانی میں نہ صرف مسئلہ امارت کا پورے ملک کے علماء اور ارباب فکر و دانش کے سامنے خلاصہ کیا، بلکہ اس کی توسیع واشاعت اور اس کو پروان چڑھانے میں تن من کی بازی لگا دی، بہار واڑیسہ کے مسلمانوں کی دینی وملی قیادت فرمائی اور ہر موڑ اور ہر میدان میں عوام کے مفاد کا بھرپور خیال رکھا، کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا، یہی وجہ ہے کہ وہ تاحیات مسلمانان بہار واڑیسہ کے درمیان نہایت مقبول رہے، ان کی ہر آواز اور ہر دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ان سے روبرو ہو جاتے۔

حضرت امیر شریعت کی نگرانی میں امارت شرعیہ نے دین وشریعت کے تحفظ اور سماجی وملی، معاشی وسیاسی میدانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان میں حضرت قاضی صاحب کی بے پناہ صلاحیت، اخلاص وللّٰہیت، خود اعتمادی اور امت اسلامیہ کے لئے کچھ کرنے اور انہیں کچھ دینے کے جذبہ کا بڑا دخل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر شریعت فرمایا کرتے تھے کہ ''عام انسانوں'' کے دماغ کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے، مگر مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔''

حضرت امیر شریعت کے رحلت فرما جانے کے بعد امارت شرعیہ نے بہار واڑیسہ کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، ہاسپٹلز، سینکڑوں مدارس ومکاتب اور عصری درسگاہوں کا قیام، وفاق المدارس کی تشکیل، دارالقضاء اور خدمت خلق کے میدان میں قابل رشک پیش رفت کی ہے، وہ حضرت قاضی صاحب کی مرہون منت ہیں۔

حضرت مرحوم کی پوری زندگی دینی وتعلیمی، ملی وسماجی، رفاہی وعوامی خدمات سے لبریز ہے، تحقیق وتدقیق اور تصنیف وتالیف مرحوم کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے، علم وتحقیق خصوصاً فقہ وفتاویٰ اور جدید مسائل کی تنقیح کے میدان میں اتھارٹی اور مرجع خاص وعام کی

حیثیت رکھتے تھے، اسی سلسلہ کو مزید بڑھانے اور عالمی سطح پر علماء کے آراء معلوم کرنے کے لئے ۱۹۸۹ء میں ایک ادارہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کے نام سے قائم فرمایا، جس کے تاحیات جنرل سکریٹری رہے اور آپ کی قیادت وسیادت میں اکیڈمی نے جدید مسائل کے شرعی حل کی دریافت، مختلف مسالک کے حامل علماء کرام کے درمیان اتحاد، طلباء مدارس کی تربیت اور جدید فقہی لٹریچر کی تیاری کے میدان میں عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، جس کی گونج ملک سے باہر نکل کر بیرون ملک بھی سنائی دی۔

اکیڈمی کی جانب سے اس کے قیام سے لے کر ۲۰۰۱ء تک ملک کے مختلف صوبوں میں تقریباً ۱۳؍سیمینار منعقد ہوئے جس میں ملک بھر سے شریک علماء کرام ومفتیان عظام نے چالیس سے زائد جدید مسائل ومشکلات پر غور وخوض کر کے اجتماعی فیصلے کئے، دینی مدارس کے لئے تربیتی کیمپس اور فقہی مذاکرے، نیز جدید موضوعات پر لکچرس بھی کرائے، آپ نے جدید فقہی مسائل پر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی شائع کیا اور اب اخیر میں ۴۰ جلدوں پر مشتمل فقہی انسائیکلو پیڈیا کا اردو ترجمہ بھی مکمل کرایا جس کی بعض جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور بعض اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

موصوف نے آل انڈیا ملی کونسل قائم فرمائی، جس کی ملک کے مختلف صوبوں میں اور ضلعوں میں متعدد شاخیں قائم اور برسرکار ہیں، ملکی طور پر اس کی شناخت ہوئی اور ہر خاص وعام نے سراہا، ملی کونسل نے بلاتفریق وبلالحاظ مسلک وفرقہ صرف کلمہ واحد کی بنیاد پر ملک کے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کی جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی، مذہبی، سیاسی وسماجی تمام میدانوں میں مسلم معاشرہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا اور ہر طبقہ کو سربلندی کا مقام عطا کرنا ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ جو مختلف المسالک کے ہندی مسلمانوں کا متفقہ ومشترکہ پلیٹ فارم ہے جس کو ۱۹۷۲ء میں حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان میں شریعت اسلامیہ کی بقا وتحفظ کے لئے باتفاق رائے علماء وقت ودانشورانِ

ملت نے قائم فرمایا تھا، موصوف اس کے ابتداء سے ہی نہایت فعال رکن رہے اور بورڈ کے دوسرے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد ۱۵۱ رکن بورڈ نے باتفاق رائے آپ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا، صدر منتخب ہونے سے قبل ہی سے مختلف امراض کے شکار تھے، گویا امراض نے آپ کو گھیر لیا تھا، مسلسل بیمار رہے، بستر مرگ پر رہتے ہوئے بھی ہمیشہ مشوروں سے نوازتے رہے اور بورڈ کی ترقی کے لئے سعی پیہم کرتے رہے اور امت کو اتحاد واتفاق کا پیغام دیتے رہے، نہ کچھ کر کے بھی سب کر دیا، بقول حضرت علامہ شاہ صاحب کشمیری ''بلاشبہ قاضی جی ممتاز دانشور، مفکر ومدبر، فہم وذکا کی قندیل، ذہانت ورزانت کا پیکر تھے، نہ ملت فروش تھے، نہ ضمیر فروش، انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کا وقار بڑھایا، اس اہم اور مضبوط اسٹیج کو نہ اقتدار کی چشم ابرو پر اپنے موقف سے ہٹنے دیا اور نہ شخصی مفادات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا۔''

حضرت قاضی صاحب نے امت مسلمہ کی خدمت کے لئے پوری زندگی وقف کر دی تھی، ہر وقت ہر آن ہر گھڑی اس فکر میں کھوئے ہوئے رہتے تھے کہ یہ امت کس طرح دوسری قوموں سے ممتاز ہو سکتی ہے، امت میں اتحاد واتفاق قائم کرنے کے لئے ہر وقت لگے رہتے تھے اور بفضلہ تعالیٰ وہ اپنی اس فکر اور سعی میں بہت حد تک کامیاب ہوئے جس کے لئے انہوں نے ملک بیرون ملک کے حتی الوسع اسفار بھی کئے، میٹنگیں بھی بلائیں، مقالات بھی پڑھے، تقریریں بھی کیں اور مقتدر شخصیات کو مشورے بھی دئے اور یہ سلسلہ آخر دم تک باقی رکھا، اتحاد امت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات ومسائل پر گہری نظر رکھتے تھے، قاہرہ میں سابق شیخ ازہر مصر کے ساتھ دریائے نیل کے ساحل پر ہونے والی خصوصی ملاقات میں جس میں مختلف ممالک کے ۳۰ سے زائد بڑے علماء تھے، نہایت ہی درد وسوز کے ساتھ فرمایا تھا کہ ''علماء خاموشی کے ساتھ تعمیری جدوجہد کریں، ٹکراؤ کے بجائے صبر وتحمل کا رویہ اختیار کریں اور امت کو بلند مقام پر لانے کے لئے شب وروز جدوجہد کریں'' اس طویل میٹنگ کے بعد حکمراں اور مختلف ممالک کے عہدہ قضا پر فائز قضاۃ اچانک متوجہ ہوئے اور ان سے برابر ملاقات کے متمنی رہے۔ ☆☆

ملت اسلامیہ پر رب کائنات کا فضل مبیں

● مولانا بدرالحسن قاسمی

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ صرف اپنی نوعیت کے ایک منفرد عالم دین ہی نہ تھے بلکہ امت مسلمہ پر رب کائنات کے ''فضل مبیں'' بھی تھے۔ انہیں اللہ نے غیر معمولی ذہانت اور انتہائی زرخیز دماغ عطا فرمایا تھا۔ پھر انہیں دینی علوم میں مہارت اور ایسی فقہی بصیرت عنایت فرمائی تھی جو شاذ و نادر ہی کسی کو ملا کرتی ہے۔

وہ بیک وقت ایک مایۂ ناز فقیہ، ایک کامیاب مدرس، ایک بابصیرت قاضی، ایک شعلہ بیان خطیب و مقرر اور ایک بہترین مفکر و دانشور سبھی کچھ تھے۔

مولانا دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی اور اپنی جماعت میں سب سے زیادہ نمبرات حاصل کر کے نیا ریکارڈ قائم کیا۔ فراغت کے بعد مولانا نے تدریسی زندگی شروع کی اور جلد ہی انہیں جامعہ رحمانی مونگیر میں فقہ و حدیث کی اونچی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا اور وہاں ان کی تدریسی قابلیت کے جوہر کھلے اور اپنے وقت کے مقبول ترین اساتذہ و مدرسین میں ان کا شمار ہونے لگا۔

اس زمانہ میں جامعہ رحمانی اور خانقاہ مونگیر کی رونق حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم کی ذات سے تھی جنہیں اللہ نے جوہر شناسی کا خوب ملکہ عطا فرمایا تھا۔ جب ان کا انتخاب امیر شریعت رابع کی حیثیت سے ہوا تو انہوں نے اس جوہر قابل کو ''امارت شرعیہ'' میں افتاء و قضاء کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ 'امارت کی تعمیر نو' کے لئے پٹنہ بھیج

دیا۔ جہاں انہوں نے بڑی محنت اور جانکاہی کی زندگی شروع کی اور اپنے مخلص ترین رفقاء کے ساتھ امارت شرعیہ کی تعمیر و ترقی میں لگ گئے اور پھر تو 'امارت شرعیہ' ان کی زندگی اور وہ 'امارت شرعیہ' کی آبرو بن گئے۔ چنانچہ وفات کے وقت نائب امیر شریعت کے منصب پر فائز ہو گئے۔

مولانا قاضی مجاہدالاسلام نے امارت شرعیہ میں اپنی زندگی کے تقریباً ۳۵ سال بسر کیے اور ہزاروں معاملات کے فیصلے کیے اور نظام امارت کا جز بن کر اندرون صوبہ اور بیرون صوبہ ہزاروں تقریریں کیں۔ دوسرے صوبوں میں امارت شرعیہ کے قیام کی جدوجہد کی اور ملک کے مختلف علاقوں میں دارالقضاء قائم کرائے اور 'قاضی' کا لب ان کے نام کا جز اس طرح بن گیا کہ 'قاضی صاحب' کے لفظ سے لوگوں کا ذہن مولانا مجاہدالاسلام قاسمی کی طرف ہی منتقل ہوتا تھا۔ قاضی مجاہدالاسلام صاحب نے 'امارت شرعیہ' کو ایک نہایت معتبر اور باوقار ادارہ بنانے میں بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ امارت شرعیہ کا سجاد ہاسپٹل، المعہد العالی للقضاء والافتاء اور متعدد ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بلاشبہ مولانا مجاہدالاسلام صاحبؒ کی کوششوں کا کرشمہ ہیں۔

مولانا مجاہدالاسلام صاحبؒ نے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی زندگی میں اپنی شخصیت کی انفرادیت کو حضرت امیر کی شخصیت میں گم رکھا اور کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے لئے کوئی مستقل مقام بنائیں، لیکن حضرت امیر شریعت کے انتقال کے بعد سے انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کے میدان میں پائے جانے والے خلا کو اپنی بے مثال شخصیت اور غیر معمولی صلاحیتوں سے بہت جلد پر کر دیا۔

آل انڈیا پیمانہ پر مسلمانوں کے مسائل کو مؤثر طور پر پیش کرنے کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت کے پیش نظر مولانا نے آل انڈیا ملی کونسل کی بنیاد رکھی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد ہندو انتہا پسندی میں اضافہ، ہندو تنظیموں کی طرف سے شدت پسندی، بابری مسجد

کے انہدام اور اس کے بعد بڑے پیمانہ پر مسلم کش فسادات نے ثابت کردیا کہ مولانا کا اقدام بروقت اور انتہائی بصیرت پر مبنی تھا اور اس میں شک نہیں کہ آل انڈیا ملی کونسل نے ٹاڈا کے قانون اور بعض دیگر مسلم مخالف کارروائیوں کے خلاف جتنا مؤثر قدم اٹھایا وہ کسی اور ملی تنظیم کی طرف سے نہیں اٹھایا جاسکا۔

آل انڈیا ملی کونسل کا سب سے زیادہ خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس میں مذہبی عصبیت اور گروہی یا علاقائی تفرقہ اندازیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس وقت ہندو انتہا پسندی کے فروغ کے بعد سے جس قدر خطرناک چیلنج کا سامنا ہے، اس کے مقابلہ کے لئے اس سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہوسکتی کہ تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور اپنے وجود وبقا کی جنگ مشترکہ طور پر لڑی جائے۔

آل انڈیا ملی کونسل کو دوسری تنظیموں کے مقابلہ میں ایک برتری یہ بھی حاصل ہے کہ اس کے اصولوں میں درپیش مسائل ومشکلات کے حل کے لئے صرف احتجاج اور پروٹسٹ کرنے اور منانے، بند یا دھرنا دینے کے طریقہ پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایک طرف مسلمانوں میں حقیقی بیداری پیدا کرنے، ان کی تعلیمی ومعاشی سطح کو بلند کرنے کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں، تو دوسری طرف قانونی ودستوری جنگ پر زور دیا گیا ہے اور ہر گاؤں اور علاقہ میں قانونی سیل قائم کرنے اور مظلومیت کے شکار مسلمانوں تک قانونی مدد پہنچانے اور ان کے مسائل کو ایک قومی مسئلہ کی طرح اٹھانے پر زور دیا گیا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ ان پہلوؤں کی افادیت مکمل طور پر اس وقت سامنے آسکتی ہے جبکہ ان تصورات کو عملی جامہ پہنایا جائے اور ان کو خاکوں میں رنگ بھرا جائے، اس کی ضرورت مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے بعد اور زیادہ ضرورت بڑھ گئی ہے اور گجرات میں جاری منظّم نسل کشی نے مولانا کے جانشینوں کی ذمہ داریاں اور بڑھا دی ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مولانا کی زندگی کے آخری ایام میں اس میدان میں جو اضمحلال آ گیا تھا

اسے دور کیا جائے اور ملی کارواں کے مقاصد کو از سرِ نو روبہ عمل لایا جائے۔

مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی ملی سرگرمیوں کا ایک اہم اور مضبوط پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی قیادت بھی تھی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی آواز، وقت کی ضرورت اور ملت کی اجتماعی جدوجہد کا سب سے مضبوط قلعہ اور ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس پر بہ آسانی پوری ملت کو اکٹھا کیا جاسکتا ہے اور اپنے حقوق کے لئے قانونی ودستوری جنگ لڑی جاسکتی ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل اور اس کی آبیاری میں سب سے زیادہ خون دل اگر صرف ہوا تھا تو وہ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کا اور ان کے دست راست ہونے کی حیثیت سے سب سے زیادہ دماغی توانائی اگر کسی نے صرف کی ہے تو وہ مولانا مجاہداسلام قاسمی مرحوم نے، جس کا اقرار واعتراف بورڈ کے تمام ذمہ داروں اور ارکان کو ہمیشہ رہا ہے۔ بورڈ کے پہلے صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب منتخب کئے گئے تھے جو ملت اسلامیہ کی عظمت کا نشان تھے، پھر ان کے وصال کے بعد پرسنل لا بورڈ کی صدارت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی الندویؒ کے حصہ میں آئی جن کی دینی ودعوتی خدمات کا سکہ عرب وعجم میں رائج تھا، لیکن خود حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے بقول آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی فعالیت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی بے پناہ محنت اور عالی دماغی کی رہین منت تھی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کا منصب مولانا مجاہدالاسلام قاسمی کو ایسے وقت میں ملا جب کہ ان کی صحت انتہائی طور پر خراب ہوگئی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ پرسنل لا کے مسائل پر مولانا کو جتنا عبور تھا اور ان کو جس طرح خوش اسلوبی اور مضبوط دلائل کے ساتھ وہ پیش کرسکتے تھے کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ اس معاملہ میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں تھا۔ مولانا مجاہداسلام قاسمیؒ ان عبقری شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے بیک وقت متعدد اہم کارنامے انجام دئے ہیں اور ان کا ہر کارنامہ اس قابل ہے کہ اس کو ان کی خدمات جلیلہ کا

شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

انہوں نے قضاء کا منصب سنبھالا تو ایک غیر مسلم اکثریت والے ملک میں ہوتے ہوئے بھی اس منصب کو بے پناہ وقار واعتبار عطا کیا اور اپنے فیصلوں سے بڑے بڑے ججوں کو بھی مات دی، پھر تصنیفی طور پر اسلام میں قضا کے مقام اور قاضی کے منصب کی وضاحت کی اور ''اسلامی عدالت'' نامی کتاب لکھی اور جگہ جگہ دارالقضاء کے قیام کی تحریک چلائی۔

عربی میں 'صنوان القضاء' جیسی لازوال کتاب کو ایڈٹ کیا اور اسے کویت کی وزارۃ الاوقاف وشؤون الاسلامیہ جیسے اہم ومستند ادارے سے شائع کرایا اور ابتدائے عمر سے تصنیف وتالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ ہونے کے باوجود عین بیماری کے عالم میں اس اہم کام کوانجام دیا۔

'مسلم پرسنل لا' کے کاموں میں الجھے تو اس کی بہت سی گتھیاں سلجھائیں اور پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے منصب پر پہنچنے سے پہلے ہی نظریاتی سطح پر اس کی اتنی خدمت انجام دی جو اوروں کی خدمات پر یقیناً بھاری ہے۔ چنانچہ پرسنل لا بورڈ کی ہر مجلس میں فقہی وقانونی مباحث کے لئے مولانا کی ذات ہی ہمیشہ مرجع بنی رہی۔ صدر بننے کے بعد 'مجموعہ قوانین اسلامی' کو بڑی مشکلوں سے شائع کرایا اور یہ اہم کام برسوں سے جس طرح غیر ضروری تعویق میں پڑا رہا اور حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اپنی پوری مدت صدارت میں اس کی اشاعت کے لئے کوشاں رہے، لیکن کامیابی نہ ہوسکی تھی، مولانا نے بڑی حکمت سے مسودہ کو شکنجہ سے نکالا اور اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں اسے پورے آب وتاب سے شائع کرایا اور بڑے پیمانہ پر اس کی افتتاحی تقریب بھی منعقد کی گئی۔ اس سب کارناموں کے علاوہ ان کے اپنے ذوق ومزاج کے لحاظ سے 'اسلامی فقہ اکیڈمی' کو ان کی خدمات کا شاہکار کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح کی اکیڈمی کا بنیادی خاکہ تو برسوں پہلے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک

اجتماع کے موقع پر مولانا کی قیادت میں چند باحوصلہ نوجوان علماء نے حیدرآباد میں تیار کیا تھا، لیکن اس وقت میری تجویز پر نام 'مرکز البحث العلمی' رکھا گیا تھا اور جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے چند نئے پیدا شدہ مسائل سے متعلق سوالات کے جوابات گویا اس کا پہلا تحقیقی کارنامہ تھا، لیکن دہلی میں آبجیکٹیو اسٹڈیز کے قیام کے بعد ہی یہ خواب پورے طور پر شرمندہ تعبیر ہوسکا اور باقاعدہ طور پر اسلامی فقہ اکیڈمی کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔ آج مولانا کی بے مثال رہنمائی اور انتھک جدوجہد کی وجہ سے ایک تناور ہی نہیں گل افشاں اور بارآور درخت کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

اس کی شہرت ہندوستان میں ہی نہیں ہندوستان سے باہر بھی ہے اور اس کے کارناموں کا عالم عرب کی نامور شخصیتوں نے بھی دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور ان کے کارہائے نمایاں اپنی کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے عرب اور اسلامی دنیا کی مشابہ اکیڈمیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

عالم اسلام کے نامور اور مستند فقیہ مولانا محمد تقی عثمانی کویت میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے ذمہ دار اعلیٰ ڈاکٹر خالد المذکور، شام کے نامور فقیہ اور متعدد انسائیکلوپیڈیائی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، اسلامی آرگنائزیشن کانفرنس کی نمائندہ فقہ اکیڈمی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر الحبیب ابن الخوجہ، شام کے مشہور فقیہ اور درجنوں فقہی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف ڈاکٹر محمد رواس قلعجی، قطر کے شیخ عبدالرحمٰن آل محمود نے نہ صرف اسلامی فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں شرکت کی ہے، بلکہ اس کے طریقہ کار اور منہج کو سراہا بھی ہے اور دوسرے اداروں کو اس کا طرز اختیار کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔ اکیڈمی کے ۱۳،۱۴ سیمیناروں میں پیش کردہ ابحاث ایک عظیم فقہی سرمایہ ہیں اور اجتماعی طور پر جدید فقہی مسائل کو حل کرنے کی کوششوں کی بہترین مثال ہے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کے ان کارناموں کے علاوہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ صاحب کی

عظمت وعبقریت اور اسلامی فقہ اکیڈمی کی کامیابی کی ایک بڑی دلیل نوجوان علماء کی وہ کھیپ جو مولانا نے تیار کردی ہے جس کی دلچسپی درسی کتابوں کے شروح وحواشی سے آگے نہ تھی، لیکن اب وہ مولانا مجاہدالاسلام کے فیض نظر سے نہ صرف مصنف اور مقالہ نویس بن گئے ہیں، بلکہ وہ ہر نئے فقہی مسئلہ پر خوب داد تحقیق بھی دے سکتے ہیں اور دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے علمی وفقہی سیمینار اور کانفرنس میں آسانی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ یقیناً مولانا مجاہدالاسلام قاسمی کی 'فقہی بیداری' کی تحریک کا براہ راست یا بالواسطہ اثر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

'فقہ اکیڈمی' تو ایک عنوان ہے، دراصل زندگی کے آخری سالوں میں اور خاص طور پر بیماری کے بعد سے بجائے اضمحلال اور مایوسی کے مولانا کی زندگی میں غیر معمولی حوصلہ مندی پیدا ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے منصوبوں کے لئے ان کا دماغ تو شروع ہی سے کافی زرخیز واقع ہوا تھا، لیکن خاص طور پر بیماری کے بعد سے تو وہ سراپا منصوبہ ہی بن گئے تھے، شاید ہی کوئی ہفتہ گزرتا ہو جس میں ان کا ٹیلی فون نہ آئے کبھی کبھی تو ایک دن میں کئی کئی بار ٹیلی فون کرتے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی نیا خاکہ اور نیا منصوبہ سامنے رکھتے۔ ان کا اللہ نے جن بڑے کارناموں کے انجام دینے کی توفیق دی ہے ان میں کویت سے چالیس سے زائد ضخیم جلدوں میں شائع ہونے والی عظیم فقہی انسائیکلو پیڈیا کا اردو ترجمہ بھی ہے۔ خالص فقہی اصطلاحوں سے مرصع اتنی بڑی کتاب جس کی تیاری گزشتہ ۳۵ سالوں سے مختلف فقہی مذاہب کے علماء کی ایک بڑی ٹیم انجام دے رہی ہے، اس کے ترجمہ کے بارے میں سوچنا اور پھر اسے عملی جامہ پہنانا یہ مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ جیسے باعظمت انسانوں کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اس کے لئے نوجوان علماء کی ایک ایسی منتخب ٹیم تشکیل دی کہ حیرت انگیز طور پر نہایت ہی کم عرصہ میں اس کام کا بڑا حصہ تیار ہوگیا۔

این سعادت بزور بازو نیست

افسوس ہے کہ ان کی تمنا کے مطابق ان کی عربی کتاب 'صنوان القضا' تو وفات سے پہلے ان کو مطبوعہ شکل میں دکھلانے میں کامیاب ہوگیا، لیکن وفات سے صرف ۳ دن پہلے ٹیلی فون پر ان کی بار بار کی یہ آرزو سن کر کہ اردو موسوعہ کی کم از کم پہلی جلد چھپی ہوئی شکل میں مجھے دکھلا دو میں پوری نہ کرسکا، جس کی وجہ بعض انتظامی دشواریاں تھیں۔ یقیناً اس موسوعہ کی اردو میں مکمل طور پر طباعت ان کی روح کے لئے تسکین کا باعث ہوگی۔ یہ محض مولانا کی زندگی کے چند گوشوں کی طرف ایک سرسری اشارہ ہے۔ ان کے تمام اوصاف وکمالات اور ان کی زندگی کے سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے تو فرصت درکار ہوگی۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

☆☆

ملت اسلامیہ کے دھڑکتے دلوں کا ترجمان

● عبدالوہاب خلجی

آل انڈیا ملی کونسل کے بانی وسکریٹری جنرل، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نشین، تحریک تحفظ شریعت کے روح رواں حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء کی شام ایک ایسے وقت میں جب کہ ملت کو ان جیسے کئی مجاہدوں کی ضرورت تھی، ملک وملت کے انتہائی پرآشوب حالات میں دارفانی سے دار بقا کی طرف رخصت ہوگئے اور اپنے پیچھے عزم وہمت، بلند حوصلگی اور عزیمت کی ایسی داستانیں چھوڑ گئے جو طویل عرصہ تک ان کی کمی کا احساس دلاتی رہیں گی اور دردمند دل آنسو بہاتے رہیں گے۔

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی جو قضاء سے اپنی طویل ممارست کے باعث اپنے دیگر متعدد اوصاف وامتیازات کے باوصف قاضی صاحب کے لقب سے مشہور ومعروف ہوئے، ہندوستان کے ان ممتاز علماء دین میں سے ایک تھے جو اپنے گہرے علم، وسیع مطالعہ وعمیق فکر، ژرف نگاہی، فکر اصلاح، حق گوئی، ملی شعور، صبر وتحمل، نظم وضبط، میانہ روی، حلم، خرد نوازی، تواضع وانکساری کے ساتھ ساتھ عزم وحوصلہ اور عزیمت کا ایک قابل تعریف نمونہ تھے۔ خاص طور پر ان کی بے خوفی وجرأت نے خاکسار کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور میں ان کی بے باکی کا نہ صرف قائل ہوگیا، بلکہ مداح بھی رہا۔

کتب وجرائد کے حوالہ سے تو میں عرصہ سے موصوف سے واقف تھا، لیکن اصل ملاقات آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس دہلی کے موقع پر ہوئی جب میں اس کی مجلس

استقبالیہ کا نائب صدر تھا اور وہ انتظامات کے سلسلہ میں دہلی تشریف لائے ہوئے تھے، یہ ملاقات بعد میں ایک گہرے اور خصوصی تعلق میں تبدیل ہوگئی۔ یہ تعلقات کیسے اور کس طرح پروان چڑھے اور کن بلندیوں تک پہنچے یہ الگ موضوع ہے، جس کا ذکر دیگر مضامین ومقالات میں اصلاً یا ضمناً حسب موقع ہوتا رہے گا، ان سطور میں ان کی بے باکی سے متعلق چند باتیں درج کرنے کی کوشش کروں گا جس کے سبب مجھے بلا تامل یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ وہ ملت کے بے باک سپاہی اور رہنما تھے۔

علماء کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ کٹھن سے کٹھن مراحل ومواقع اور حالات میں بھی صبر وتحمل کا دامن چھوٹنے نہیں دیتے۔ معاشرہ کے اڑیل مزاج لوگ ہوں یا اقتدار اور اکثریت کے نشے میں نام نہاد ظالم حکمراں وہ کلمۂ حق اور سچی وسیدھی بات کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اسی لئے کلام نبوت نے ان کی باتوں کو افضل الجہاد، ” **کلمة الحق امام السلطان الجائر** “ سے تعبیر کیا ہے۔ قاضی مجاہدالاسلام قاسمی اپنے اندر ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ ملک وملت پر کسی افتاد یا مصیبت پر اس کی رفتار، تیز ہوجاتی اور وہ پہلو بدلنے لگتے کہ اس مشکل وقت میں وہ کس طرح اپنا کردار کریں، کیوں نہ اجتماعی مشکل ان کی اپنی ذاتی مشکل بن جائے۔

۶؍دسمبر کو بابری مسجد کے انہدام کے بعد ایک وفد اس وقت کے وزیر اعظم ہند نرسمہا راؤ سے ملا تو قاضی صاحب نے بے باکی کے ساتھ فرمایا: نرسمہا راؤ آپ نے ملک کا سر جھکا دیا، آپ نے ہمارے اعتماد کو ختم کردیا، آپ اس بات کے اہل نہیں کہ اس ذمہ داری کو سنبھال سکیں، ہمارا آپ کی حکومت پر کوئی اعتماد نہیں رہا، کیا اسی دن کے لئے ہم نے جنگ آزادی لڑی تھی، کیا یہی ہماری قربانیوں کا صلہ ہے، وقت کا حکمراں سر جھکائے ساری باتیں سنتا رہا، لیکن اس کو جرأت نہ ہوئی کہ اس وفد کے جرأتمندوں کے سوالات کا جواب دے سکے جن میں ایک جرأتمند مجاہدالاسلام قاسمی بھی تھا۔

۶/دسمبر کے حادثہ کے بعد ملک بھر میں مسلم خون کی ارزانی تھی، حکمراں تماشائی بنے ہوئے تھے۔ مسلمان مایوسی کا شکار ہورہے تھے، انہیں کوئی تسلی دینے والا نظر نہ آرہا تھا، قاضی صاحب قائد بنے۔ آل انڈیا ملی کونسل کے معاون جنرل سکریٹری مولانا محمد اسرار الحق قاسمی اور خاکسار کو ہم سفر بنایا اور ارض بنگال کی جانب قصد کیا۔ کلکتہ پہنچ کر یہ سہ نفری قافلہ سیل رواں بن گیا۔ چھوٹے بڑے، عوام وخواص، علماء، ائمہ ومقتدی، استاد وشاگرد، امیر وغریب جمع ہوئے۔ دن بھر کلکتہ اور اس کے قرب وجوار میں جلی بستیوں، اجڑے مکانوں، ویران محلوں، روتے بلکتے یتیم ونادار بچوں، بیوہ بہنوں اور سسکتی ماؤں کو دیکھا، انہیں اپنائیت کا احساس دلایا، دلوں سے خوف وہراس نکالنے کی کوشش کی۔ تین آدمیوں کا مختصر قافلہ شام تک تین سو متجاوز ہوکر نماز عشاء کے بعد کلکتہ کی مشہور تاریخی جامع مسجد ناخدا کے سامنے جمع تھا۔

مقامی حضرات کے بعد مولانا اسرار الحق قاسمی نے بے لچک انداز میں گفتگو کی، خاکسار نے بھی غزوات نبوی، شجاعت محمدی، ہمت صحابہ استقلال ائمہ اور امت کی جرأت وبردباری کے حوالے سے رنجیدہ دلوں کو حوصلہ دیا۔ انابت ورجوع الی اللہ کی چند باتیں کیں۔

پھر قاضی صاحب نے اسلام کے مجاہد کا روپ اپنایا، کمیونزم کو نمونہ بنانے والے اور یکسانیت کا دم بھرنے والوں کی حکومت کے زیر سایہ جب انسانی درندگی کے مناظر دکھائے گئے تو ان کو للکارا کہ کیا یہی انصاف ہے، کیا یہی مساوات ہے، کیا یہی سیکولرزم ہے، کہا کہ یاد رکھو! فرعون کے لئے موسیٰ نمودار ہوتا ہے، الحاد ودہریت کے خاتمے سے سرزمین دہریت سے نومسلم ریاستیں جنم لیتی ہیں۔ وہ یہ بستی ہے جہاں ہمارے اسلاف کے خون سے معطر ہوائیں ہماری جرأتمندانہ تاریخ کو یاد دلارہی ہیں۔ قاضی صاحب کے صاف صاف دوٹوک باتوں نے زخمی دلوں پر مرہم کا کام کیا، اپنائیت کی آواز نے آنسو خشک کئے

اور لوگوں نے محسوس کیا کہ تحریک استقلال کے جیالوں عبداللہ الکافی اور عبداللہ الباقی کے دیش میں ابھی غیرت مند ختم نہیں ہوئے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ سے میری پندرہ سالہ وابستگی کے دوران میں بہت کم اس کی میٹنگوں میں غائب رہا ہوں۔ محترم قاضی صاحب شاید مجھ سے بھی کم غائب رہے ہوں گے۔ یوں تو بورڈ کے سبھی ارکان اپنے علم وفضل، تفقہ، جرأت وبے باکی میں اپنی مثال آپ ہیں، مگر قاضی صاحب جب اپنی بات رکھتے تو ہر آدمی ان کی پراثر گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ مفکر ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود اپنی بات کے آغاز کے بعد گفتگو کا رخ قاضی صاحب کی طرف پھیر دیتے۔

بورڈ کے اجلاس کے بعد پریس کانفرنس سے جو لوگ مخاطب فرماتے ان میں عموماً جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید نظام الدین، سکریٹری بورڈ جناب محمد عبدالرحیم قریشی ایڈووکیٹ، جناب امین الحسن رضویؒ شریک ہوتے، لیکن قاضی صاحب کی موجودگی میں ان کی کمان ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتی، اہل صحافت بال کی کھال نکالنے میں مشہور ہیں، لیکن ملت کا یہ بے باک سپاہی جب ان کو مسکت جواب دیتا تو انہیں بھی یہ محسوس ہوجاتا کہ یہ بورڈ ہی نہیں بلکہ ملت کا ترجمان ہے۔

بابری مسجد کا مسئلہ ملت اسلامیہ ہند کا رستا ہوا ایک ایسا زخم ہے جس کی ٹیس ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان خواہ عمل سے کورا اور کردار کا کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو برابر محسوس کرتا ہے۔ اس کے ذکر سے ہر انصاف پسند ہندوستانی تڑپ اٹھتا ہے۔ نرسمہا راؤ کے تاریک دور میں یہ مسئلہ زیادہ ہی ابھرا اس تعلق سے مسلمانوں کے نمائندہ وفود کو کئی بار ہندوستانی وزیراعظم کی حیثیت سے ان سے ملنا پڑا۔ بار بار کی ملاقاتوں کے بعد بھی سخت جاں ضدی وزیراعظم کے سر پر جوں نہ رینگی اور اس نے امت مسلمہ کی قیادت کی متعدد عرضداشتوں کے جواب میں دس پیسے کے پوسٹ کارڈ پر ان کو رسید وصولیابی سے بھی مطلع نہ کیا، تو بورڈ نے فیصلہ لیا کہ

ایک تنبیہی ملاقات کے بعد یہ سلسلہ ختم کردیا جائے۔محترم مولانا سید علی میاں ندویؒ کی قیادت میں مسلمانوں کے مختلف طبقات سے متعلق چیدہ افراد وشخصیات پر مشتمل ایک قد آور وفد نے کانگریسی وزیراعظم نرسمہا راؤ سے ملاقات کی۔ قائد وفد نے ابتدائی چند جملوں کے بعد قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی طرف اشارہ کیا۔انہوں نے ببانگ دہل کہا کہ ہم آپ کے پاس ہاتھ پھیلائے، جھولا لٹکائے بھیک مانگنے نہیں آئے، بلکہ ہم اپنے حق کے حصول کے لئے آئے ہیں۔ ہم حق لینا بھی جانتے ہیں اور حق چھیننا بھی۔آپ نے ہمارے مسائل سے مجرمانہ طور پر منہ موڑا ہے، دس پیسے کے پوسٹ کارڈ پر رپلائی دینا بھی گوارہ نہیں کیا آپ نے بابری مسجد کی جگہ دوبارہ مسجد بنانے کے وعدہ سے انحراف کرکے ہماری دل شکنی کی ہے۔اس لئے اب ہمیں آپ پر نہ کوئی اعتماد ہے اور نہ کسی مسئلہ کے حل کی امید؟ اگر کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوئی تو آج اس مسئلہ میں ہماری آپ سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔

جنوری ۱۹۹۳ء میں بمبئی کے مسلم کش فرقہ وارانہ فسادات بھی اس ملک کی سیکولر تاریخ پر بدنما داغ ہیں۔اس کی سنگینی کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۹؍جنوری کو جب نئی دہلی کے بستی حضرت نظام الدین کے ''نیو ہورائزن اسکول'' میں بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس جاری تھا تو دوران اجلاس بذریعہ فون خبر ملی کہ بمبئی کے سات راستہ مسجد کے علاقے میں مسلمان خواتین وحضرات کو پی اے سی کے جوانوں نے اپنی گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہ خبر شرکاء اجلاس کے لئے ایک صاعقہ سے کم نہ تھی۔ طے پایا کہ فوراً اجلاس ملتوی کرکے حالات کو قابو میں لانے اور بمبئی کو فوج کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کرنے کے لئے نرسمہا راؤ سے ملا جائے۔فوراً ہی ایک اعلیٰ وفد نے وزیراعظم سے ملاقات کی۔دوران ملاقات پوری سنجیدگی، متانت، غیر متزلزل لب ولہجہ اور بے باکی کے ساتھ قاضی صاحب نے فرمایا:

''آخر مسلمانوں کو کب تک رسوا کیا جاتا رہے گا، کب تک ان کے خون کی ہولی کھیلی

جاتی رہے گی۔ان صبر آزما حالات میں اگر آپ مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں تو 'ہزار سو مسلمانوں کا' کوٹہ مقرر کردیں ہم آپ کی خدمت میں مقررہ تعداد پیش کردیا کریں گے، لیکن اس طرح کا یہ قتل عام بند کریں۔''

ملک کا وزیراعظم درویشوں کے ایک قافلہ کے ایک درویش کے سامنے تھا۔جنہیں کلمۂ حق کی ادائیگی کے لئے اصحاب اقتدار کا خوف کسی طرح متاثر نہیں کرسکا۔

کانگریسی دور اقتدار میں جناب سی کے جعفر شریف محکمہ دہلی کے وزیر کبیر تھے۔ملت اسلامیہ کے لئے اسی طرح کا کٹھن مرحلہ درپیش تھا۔باہمی صلاح ومشورہ کے بعد چند دینی، ملی، سیاسی مسلم قیادت کے نمائندے وزیر موصوف کے گھر جمع ہوگئے مسئلے کی سنگینی کے پیش نظر اس پر زور دیا گیا کہ اسی وقت ملک کے منتظم اعلیٰ سے ملاقات کا بندوبست کیا جائے، ورنہ حالات کے مزید دھماکہ خیز ہونے کا خطرہ ہے۔اسی دوران جناب احمد پٹیل، محترمہ نجمہ ہبۃ اللہ، جناب غلامی نبی آزاد وغیرہم بھی شریک مجلس ہوگئے۔ باتفاق رائے طے پایا کہ بات کا آغاز قاضی صاحب کریں گے، مولانا سید کلب صادق، محترم ابراہیم سلیمان سیٹھ، سید شہاب الدین بھی شریک گفتگو ہوں گے، پہلی صف میں قاضی صاحب کے داہنی طرف بیٹھنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا، نشست کی کیفیت کچھ اس طرح بنی۔ قاضی صاحب نرسمہا راؤ جی بالکل روبرو تھے ان کے ہمراہ آنجہانی راجیش پائلٹ اور دیگر مشیران وکارپردازان ریاست بھی موجود تھے۔

دوران گفتگو ہو کا عالم تھا۔ انکسار وتواضع کا پیکر اسلام کا یہ مجاہد جس سادگی، مگر عزیمت کے ساتھ بلا توقف بولتا جارہا تھا۔ میں جہاں اس کے ملت کی ترجمانی کرنے والے کلام سے محظوظ ہورہا تھا۔وہیں یہ سوچ رہا تھا کہ جب اخلاف امت کی جرأت کا یہ عالم ہے تو خلیفہ عباسی کی محفل میں آبروئے امت امام احمد بن حنبل کی گفتگو اور اکبر کے استبدادی دربار میں مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی کی تمکنت وجرأت کیا ہوگی؟ نہ

جانے کیوں نرسمہاراؤ سے قاضی صاحب کی مخاطبت کے دوران بہار کے ایک رکن پارلیمنٹ سابق صوبائی ومرکزی وزیر نے شاید حکومت سے اپنی وفاداری کے اظہار کے لئے قاضی صاحب کو لقمہ دینا چاہا تو قاضی صاحب نے کسی کی پرواہ کئے بغیر ان سے یہ کہتے ہوئے ''بات ایسی نہیں آپ خاموش رہئے'' بلاتوقف اپنی بات کہتے رہے۔ وزیر اعظم اور ان کے ہم نشیں رفقاء وزراء بھی دنگ رہ گئے اور کنکھیوں سے اپنے آدمی کو گھورنے لگے۔ اس اندازِ رندانہ سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ میری یہ رائے تھی کہ ملت کی ترجمانی کے لئے اس گئے گزرے دور میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مناسب ترین شخص ہیں۔ بلاشبہ وہ ملت کے نڈر، جری اور بے باک سپاہی تھے۔

☆☆

قاضی صاحبؒ اور احیاءِ اسلام

● عابد انور قاسمی

مسلمان واسلام کو مٹانے کے لئے دشمنان اسلام کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے، لیکن مذہب اسلام اپنی پہلی چمک دمک کے ساتھ آج بھی پرکشش بنا ہوا ہے، کیونکہ یہ دین ابدی ہے اور قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ البتہ مسلمانوں کی دین کے تئیں بے رخی، مذہب سے غفلت وعدم واقفیت اور مسلمانوں کا مذہب کے بارے میں جمود کا شکار ہوجانا ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی شان اور اس کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کے لئے ہر دور میں برگزیدہ شخصیتوں کو پیدا فرماتے رہے ہیں، تاکہ دین کی شان وشوکت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اس کے لئے جہاں حجۃ الاسلام امام قاسم نانوتویؒ نے مسلمانوں کو آریہ سماج اور عیسائیوں سے متاثر ہونے سے بچانے کے لئے آگے آئے وہیں چمنستان قاسمی کا ایک تناور درخت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بدعات وخرافات سے لوہا لیا۔ غرضیکہ ہر دور کے علماء کرام تحریک اسلام اور احیاءِ دین کا کام کرتے رہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ احیاء دین کے سلسلے میں کافی سرگرم تھے، ہندوستانی مسلمانوں پر دین اسلام کا مکمل نفاذ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کے لئے مختلف جہت اور مختلف طور طریقوں سے کام کرنے کے عادی تھے اس میں تعاون دینے کے لئے تمام طبقہ سے، چاہے وہ ماہر قانون ہوں، یا پروفیسر ہوں، ڈاکٹر ہوں یا انجینئر ہوں بزرگ علماء کے

ساتھ ساتھ نوجوان علماء سے بھی اس موضوع پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔اس کے لئے ان علماء کے دلوں میں جذبہ دینی حمیت پیدا کرتے تھے وہ دعوت اسلام کے طور وطریقہ پر بھی تبادلہ خیال کرتے تھے اور قاضی صاحب کا خیال تھا کہ اس سائنسی اور تکنالوجی کے دور میں دعوت اسلام بھی غیر مسلموں کو انہی کی زبان وبیان میں دینا چاہئے۔اس کے لئے قاضی صاحب ملک کے مدارس کے ذہین فضلاء کی ایک کھیپ تیار کرنا چاہتے تھے جس کے لئے انہوں نے ایک منصوبہ بھی بنایا تھا اور اس پر کچھ حد تک عمل بھی ہوا۔اس منصوبہ کے تحت وہ مدارس اسلامیہ کے ذہین وفطین اور باصلاحیت طلباء کے لئے تربیتی کیمپ کا انعقاد کرتے تھے۔اسی طرح کا کیمپ ضلع غازی آباد میں لگایا گیا تھا جس میں مدارس اسلامیہ کے ذہین اور با استعداد طلباء نے حصہ لیا تھا۔راقم السطور نے کئی مرتبہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں ذہین طلباء کا سروے کیا تھا۔اس کا جو خاکہ تیار کیا گیا تھا وہ بہت عمدہ اور امید افزا تھا اگر یہ سلسلہ اپنے منصوبہ کے مطابق جاری رہتا تو ہندوستان میں دعوت اسلام ودین اسلام کی تصویر کا رخ کچھ اور ہوتا۔

ہندوستان میں شیخ سرہندیؒ کے بعد احیاء اسلام کی تحریک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے شروع ہوتی ہے اس سے بہت سے حضرات جڑتے چلے گئے جس میں سید احمد شہیدؒ اور سید اسماعیل شہیدت کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ان حضرات نے احیاء اسلام کی کوشش کر کے ہندوستان میں اسلام کو مخدوش ہونے اور صفحۂ ہستی سے مٹانے سے روکنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے، اسی سلسلے کی کڑی مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور حضرت قاضی صاحبؒ تھے دونوں حضرات کا احیاء اسلام کے سلسلے تصور یکساں تھا۔

سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ میں احیاء اسلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ایک نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں

ہوسکتا۔اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے جو حکومت پر موقوف ہے، حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے، خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن ہے، مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی ودیوانی وفوجداری معطل ہوجاتا ہے، اس لئے قرآن غلبہ وعزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی اور اس کو اکابر صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین پر مقدم رکھا جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لئے حضرت حسینؓ نے اپنی قربانی پیش کی، تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نااہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔'' (سیرت سید احمد شہیدؒ صفحہ ۵۷-۵۸، مصنف مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)۔

مولاناؒ کی یہ تحریر ۱۹۳۸ء کی ہے، جب انگریزی حکومت تھی اور اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے حالات اس قدر سنگین نہیں تھے جو اس وقت ہیں۔ظاہر سی بات ہے کہ جب تک اسلامی حکومت نہ ہو اس وقت تک احکام اسلام کا مکمل نفاذ نہیں ہوسکتا ہے اور نہ قرآن وحدیث کے ایک ایک جملہ پر عمل ہوسکتا ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ نے مباحث فقہیہ میں لکھا ہے کہ:

''ہمارے لئے بس قرآن وسنت دستور العمل ہے، ہم ایک جماعت ہیں، بھیڑ نہیں اور جب تک امیر حق پر قائم رہے اس کی اطاعت میں اللہ اور رسول کی اطاعت ہے، ہمارے نزاعات کو اللہ ورسول کی عدالت میں پیش ہونا چاہئے اور اس عدالت کا فیصلہ ہمیں دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا چاہئے۔''

موجودہ حالات میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں نہیں آسکتا، اس لئے قاضی صاحب چاہتے تھے کہ حالات حاضرہ کے مطابق جس قدر ممکن ہو مسلمان اپنے اوپر احکام اسلام نافذ کریں۔

مباحث فقہیہ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”اس لئے اگر شریعت محمدیہ مٹ رہی ہو، حضور ﷺ کی سنت مردہ ہوچکی ہو ایسے وقت میں شریعت محمدیہ کے قیام اور طریقہ کار رسالت مآب کی احیاء کی جدوجہد جہاد میں داخل ہے اور مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ جس کے پاس جتنی بھی صلاحیت ہو اسے بہر حال استعمال کرے، ورنہ سنت کو مردہ ہوتے ہوئے دیکھنا، شریعت کو مٹتے ہوئے دیکھنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا، غیر اسلام پر راضی اور قانع ہو جانا اور پھر ایمان کا دعویٰ کرنا دونوں میں کوئی ربط نہیں۔ (مباحث فقہیہ صفحہ ۲۹۱)۔

قاضی صاحبؒ احیاء اسلام کے لئے اتحاد امت کو ضروری قرار دیتے تھے، اسی لئے قاضی صاحب مختلف المسلک اور مختلف الفکر افراد کو ساتھ لے کر چلتے تھے تاکہ اتحاد امت میں دراڑ پیدا نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ کے ساتھ مختلف مکتب فکر اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد آپ سے وابستہ تھے۔ قاضی صاحب ان حضرات سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لیا کرتے تھے۔ اسی تعلق سے قاضی صاحب مباحث فقہیہ کے صفحہ ۲۹۱ پر لکھتے ہیں کہ:

”خدا نے اور خدا کے رسول نے مسلمانوں کی زندگی کو اجتماعیت کے مضبوط دھاگوں سے باندھ دیا ہے، اسلام انتشار، انارکی اور لامرکزیت کو کسی حال میں پسند نہیں کرتا، وہ مذہب کو انسان کا پرائیویٹ مسئلہ قرار نہیں دیتا، بلکہ قرآن کی روشنی میں اسلام انسانوں کی پیدائش سے لے کر موت تک اور خالص نجی زندگی سے لے کر اجتماعی اور تمدنی مسائل تک میں یہ چاہتا ہے کہ بندے بس خدا کی مرضی پر چلیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ چند وقتوں کی نماز پڑھ کر اپنے کو فارغ کرلیں، دین کو مسجد کی چہار دیواریوں میں محدود کردیں، گھروں، بازاروں، کاروبار میں، شادی بیاہ میں، مرنے جینے، نیز دوسرے سیاسی اور تمدنی مسائل میں اسلام کی رہنمائی سے الگ ہوکر زندگی گزاریں ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔“

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے نظام قضا کو وسعت دے کر بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے

دور دراز علاقوں تک پہنچا دیا، تاکہ مسلمان اپنے مسائل اسلامی احکام کے مطابق حل کریں۔ اسلامی عدالت نامی کتاب تصنیف فرما کر مسلم علماء پر احکام اسلام اور عائلی قوانین اپنے اوپر نافذ کرنے اور عمل کرنے کے لئے راہ کھول دی، وہ ایسے معاشرہ کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جہاں کوئی بھوکا نہ سوئے اور مسلمان اپنے دیگر مسلمان بھائیوں کے حقوق وفرائض کے تئیں بیدار رہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دیں، جب تک ایسا نہیں کرتے احیاء دین نہیں ہوسکتا۔ قاضی صاحبؒ نے ان باتوں کو لازمی قرار دیتے ہوئے مباحث فقہیہ میں لکھا ہے:

اسلام اس انفرادیت کو پسند نہیں کرتا جس میں فرد اپنے ذاتی مفادات کے لئے زندہ رہتا ہے، بلکہ اسلام ایسی اجتماعی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد پر دوسرے افراد کے تئیں فرائض اور حقوق عائد ہوتے ہوں، معاشرہ کا کوئی فرد بے سہارا لاوارث نہ رہے، بلکہ ہر ضرورت مند اور معاشرہ کا ہر وہ شخص جو خود اپنی کفالت کا اہل نہیں اور نہ اپنی روزی خود کما سکتا ہے اس کی ذمہ داری سماج کے کسی دوسرے فرد پر عائد کی گئی ہے۔ (صفحہ ۲۰۰)

آج مسلمانوں میں جتنی خرابیاں اور خرافات نظر آرہی ہیں اس کے لئے اسلام ذمہ دار نہیں ہے اسلام کی شکل نہیں بدلی ہے، بلکہ مسلمان بدل گئے ہیں۔ اس لئے ساری خرابیاں مسلم معاشرہ میں در آئی ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں میں لاتعداد غیر اسلامی نشانات اور رسومات نظر آرہے ہیں، اسی لئے قاضی صاحبؒ اصلاح معاشرہ پر بہت زور دیتے تھے۔

آج یہ بات عام ہوگئی ہے کہ اپنے ذاتی مفاد اور ذاتی نزاع کے سلسلے میں قرآن کی غلط تشریح کے ذریعہ اپنے کو حق پر ثابت کرنے کے لئے سہارا لیا جارہا ہے اور ہر مسلمان اپنے مفاد اور حساب سے دین کی تشریح کرنے پر آمادہ ہے، تاکہ ان کے ذاتی مفاد کی تکمیل ہو۔ اس طرح کی چیزیں قاضی صاحبؒ کو سخت ناپسند تھیں۔

وہ اس بات کے سخت خلاف تھے کہ ہر آدمی اجتہاد واستنباط کا فریضہ ادا کرے۔ اس

سلسلے میں انہوں نے مباحث فقہیہ میں لکھا ہے کہ:

اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے اگر ہر کس و ناکس کو اجتہاد کی اجازت دے دی جائے تو دین ایک کھیل بن کر رہ جائے گا، خواہشات نفس کی پیروی کی جائے گی، ''مصالح شرعیہ'' اور ''مقاصد تشریع'' کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور شریعت کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، کار اجتہاد نازک ذمہ داری ہے اگر نااہل افراد یا ایسے لوگوں کے حوالہ کر دی جائے جو خوف خدا سے خالی اور خشکی وتری میں بے محابا چکنے کا مزاج رکھتے ہیں تو یقین ہے کہ یہ اصول اجتہاد ناواقف اور اہلیت اجتہاد سے محروم لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے بھی گمراہ ہوں گے اور اللہ کی مخلوق کو بھی گمراہ کریں گے۔

آج کے عہد کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ لوگ جو مکان کی تعمیر سے لے کر معاشی مسائل تک اور پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی تدریس تک، یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں مہارت، تربیت، تجربہ، تخصص (Specialisation) کو ضروری تصور کرتے ہیں وہ دین کے معاملہ میں ناکارہ سے ناکارہ شخص کو رائے دینے اور اجتہاد کرنے کا اہل سمجھتے ہیں اور دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ آج جو لوگ اجتہاد کا نعرہ با آواز بلند لگا رہے ہیں ان میں اکثر وہی لوگ ہیں جو اس دور کے منکرات وفواحش اور اللہ کے دین کی حرمتوں کو اجتہاد کے مقدس نام پر محض اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے حلال کرنا چاہتے ہیں۔ (صفحہ ۸۹)

غرضیکہ قاضی صاحبؒ نے زندگی کا کوئی شعبہ نہیں چھوڑا جہاں مسلمانوں کی رہنمائی نہ کی ہو، چاہے وہ مذہبی معاملات ہوں، یا تجارتی ومعاشی معاملات، بینکنگ ہو یا انشورنس عائلی معاملات ہوں یا ازدواجی زندگی کس طرح بہتر اور اسلامی طریقے سے گزارے جائیں رہنمائی کی ہے۔

قاضی صاحب شریعت کے معاملے میں نہ شدت کے قائل تھے اور نہ اباحیت پسندی کے اس سلسلے میں قاضی صاحب نے ساتواں فقہی سیمینار منعقدہ ۳۰ر دسمبر تا ۲ر جنوری

۱۹۹۵ء جس میں راقم بھی شریک تھا علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ان نازک حالات میں ہمیں مسلمانوں کی اجتماعی مصلحتوں کا خیال کرنا ہے، تاکہ مسلمانوں کو ناقابل برداشت تنگی پیش نہ آئے۔ دوسری طرف اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ اس آزاد طرز فکر کو سہارا نہ ملے جو اجتہاد کے نام پر دین کی ایک ایک چولیں ہلانے کی فکر میں ہے، ورنہ بقول اقبال مرحوم: ع

لیکن مجھے ڈر ہے کہ آواز تجدید
مشرق میں تقلید فرنگی کا بہانہ

قاضی صاحبؒ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کے اقوال، تصانیف اور تحریکیں مسلمانوں کے لئے مہمیز کا کام دیں گی اور ملت اسلامیہ جو عظیم صدمے سے دوچار ہے قاضی صاحب کے بتائے راستے، طریقے اور انداز کو اپنا کر سنگین سے سنگین حالات کا سامنا کرتے ہوئے دین کے ساتھ مستقبل کو سنواریں گے۔

☆☆

ویراں ہے مے کدہ خم وساغر اداس ہے

● شاہد عادل قاسمی

زمانے کا قاصد ہر دن نئے نئے پیغام لے کر پیدا ہوتا ہے جو کبھی قرطاس دل وجگر پر رنج والم کے واقعات چھوڑ جاتا ہے تو کبھی سرور وانبساط کی داستانیں، ان واقعات میں سے تو بعض دل ودماغ کے دریچے کو معطر کر دیتے ہیں اور بعض ماتم کناں بنا کر نوحہ خوانی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء کی شام بھی ایک جان لیوا خبر حادثہ فاجعہ کی شکل میں لے کر رونما ہوئی۔ جو ہندوستان کی علمی، دینی، اصلاحی، سیاسی اور فلاحی تاریخ میں ایک المناک سانحہ اور جان گزار حادثہ کی حیثیت سے یاد رہے گا، کیونکہ علم وفضل کا سمندر، شجاعت وصداقت کا پیکر، توحید وسنت کا پاسبان، گلشن دین کا باغباں، فقہ وقوانین کا درخشاں ستارہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ہم سے اس وقت ناطہ توڑ لیا جب ہماری کشتی حیات موجوں کی روانی میں غوطہ کھا رہی تھی۔ ہمارے حقوق کی پامالی، مذہب کی بیخ کنی، مساجد ومدارس پر طرح طرح کے بے بنیاد الزامات کا سلسلہ تیز ہوتا جارہا ہے، گویا آپ کے جانے سے اندھیرا سا چھا گیا، عدل ومساوات کا جنازہ نکلتا جارہا ہے، آئین ودستور کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں اور ہمیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ:

تم کیا گئے دل میں اندھیرا سا چھا گیا
شمع حیات ہوگئی مدھم ترے بغیر

چنانچہ آپ نہایت خلیق ملنسار اور ہر دلعزیز انسان تھے، نہایت ہی بے باک وبے

خوف طبیعت کے مالک تھے، مودت ومروت، خلق واطوار، تہذیب وثقافت، علم وعمل، حلم ومتانت، آپ کے رگ وپے میں بھری ہوئی تھی، سیدھا سادا، تصنع وملمع سازی سے بے نیاز، میانہ قد، سر پر جالی دار ٹوپی اور موٹے فریم کی عینک کے پیچھے دو چمک دار آنکھیں اور نورانی چہرہ جسے اغیار بھی دیکھ لیں تو بغیر متاثر ہوئے نہ رہیں آپ کی شخصیت کافی امور وخدمات سے وابستہ تھیں تمام کا احاطہ اس مضمون میں ممکن نہیں ہے، تاہم بربنائے عقیدت ومحبت کچھ پہلوؤں پر بقدر صلاحیت روشنی ڈالی جارہی ہے۔

ولادت:

۹؍اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بہار کے مشہور مردم خیز 'دربھنگہ' شہر کے ایک گاؤں 'جالے' میں ہوئی۔

حسب ونسب:

والد ماجد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب قاسمیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے ''دارالعلوم دیوبند'' سے امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کر کے ''بہار'' ہی کی سرزمین میں مدتوں درس حدیث سے منسلک رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے آپ کا اصلاحی تعلق رہا، آپ ایک شریف اور مہذب خاندان کے پروردہ تھے اور آپ کا رشتہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (تاریخ دارالعلوم از محبوب رضوی۔ وہ کوہ کن کی بات صفحہ ۲۰۶ (طباعت سوم) از نور عالم خلیل الامینی) سے تھا اور قرابت دار بھی تھی، آپ کی والدہ (قاضی صاحبؒ) مولوی محمد جمیل صاحبؒ (جالے) کی صاحبزادی تھیں، ان کی والدہ بی بی نجوم فاطمہ عبدالفتاح صاحبؒ کی صاحبزادی تھی، جو اپنے وقت کے معروف ومشہور بزرگ تھے۔

تعلیم:

ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے گھر پر ہی ہوئی متوسطات کی تعلیم مدرسہ محمود العلوم دملہ (مدھوبنی) مدرسہ امدادیہ (دربھنگہ) اور دارالعلوم مئوناتھ بھنجن (یوپی) میں حاصل کی۔ مزید

علمی تشنگی بجھانے کے لئے ۱۹۵۱ء میں آپ نے ازہر ہند (دارالعلوم دیوبند) کے لئے رخت سفر باندھا جہاں آپ نے ۱۹۵۵ء تک کسب فیض کیا اور یہیں سے فراغت حاصل ہوئی۔

تعلیمی دور:

تعلیمی زمانہ آپ کا نہایت ہی تابناک اور قابل فخر رہا ہے تمام کتابوں کی عبارتیں پڑھتے تھے۔ ذہانت وذکاوت کی یہ دولت جلد اسباق کا احاطہ کر لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ زملائے درس میں ہمیشہ سبھوں سے آگے رہے باوجود کے غربت وافلاس آپ کی چوکھٹ پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند کی زبانی، ''میں دارالعلوم دیوبند'' میں مدرس ہو چکا تھا، قاضی صاحب دارالعلوم میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے، ان کی طالب علمی از اول تا آخر میری نظروں میں گھومتی ہے، پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل، ایک لنگی اور معروف طالب علمانہ دراز کرتا، موسم سرما آتا اور ''دیوبند'' کی قہر برپانی سردی ایک معمولی ''بھاگلپوری'' چادر، جوان کے نصف اعلیٰ کے لئے بھی ناکافی ہوتی، مگر واقعی طالب علم تھے۔ (نئی دنیا ۱۱ تا ۲۵ر اپریل ۲۰۰۲ء)۔

اساتذہ:

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا فخرالحسن مرادآبادیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، حضرت مولانا حسین احمد بہاریؒ اور حضرت مولانا علامہ ابراہیم بلیاویؒ جیسے نابغۂ روزگار شخصیتوں کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ طے کر کے کسب فیض کیا ہے۔

رفقائے درس:

ادیب زماں حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، پروفیسر بدرالدین الحافظ، حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی، حضرت مولانا عبدالرحیم بستوی، حضرت مولانا قمرالدین گورکھپور اور حضرت مولانا شفیق عالم پورنوی دامت برکاتہم جیسے علماء آپ کے ساتھیوں میں سے ہیں

جن میں سے ہر ایک آپ کی مدح سرائی پر مجبور ہیں۔

درس وتدریس:

۱۹۵۵ء میں فراغت کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایماء پر ''جامعہ رحمانی مونگیر'' تشریف لے گئے اور نہایت ہی انہماک والتفات کے ساتھ چھوٹی بڑی کتابوں کو ۱۹۶۲ء تک پڑھاتے رہے۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت رابع کی خواہش پر ایک سال دوبارہ ۱۹۶۹ء میں کتب حدیث وغیرہ پڑھائی اور ''ابوداؤد'' آپ سے منسلک رہی۔

علم وتحقیق:

یوں تو آپ ہر فن مولا تھے، تبحر علمی، فکر کی گہرائی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اودق اور اہم مسائل کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے اور پیاسے سیراب ہو کر خوش وخرم لوٹتے، مولانا اسعد مدنی صدر جمعیۃ علمائے ہند لکھتے ہیں کہ: ''آپ کا اصل میدان فقہ اسلامی تھا اس معاملے میں وہ اپنے انداز کے منفرد آدمی تھے۔'' (نقیب ہفتہ وار ۱۵ر اپریل ۲۰۰۲ء)۔

خطابت ونقابت:

طرز تکلم، انداز بیان، بہت شوخ اور نبض شناس مقرر تھے، آپ کی دماغی توانائی یہ باور کر لیتی تھی کہ مجلس کس قسم اور کس طرف مائل ہے؟ مخاطبین کس کوالٹی اور کس ذہنیت ومزاج کے مالک ہیں؟ اسی مناسبت سے آپ گفتگو فرمایا کرتے تھے اگر جدید تعلیم یافتہ سائنس داں، ایڈووکیٹ، وکلاء، جج اور انجینئر زلوگوں کی مجلس ہے تو آپ ان کے اصطلاحات میں انہیں سے دستور وآئین اور زبان ولسان میں کلام کرتے اور اگر علماء، فقہا اور دینی پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہوتا تو وہاں مدلل، محقق، وزن دار خطاب فرماتے اور اگر مجمع جہلا کا ہوتا تو ایسی زود اثر اور آسان بیان فرماتے کہ لوگ 'دانتوں تلے انگلیاں' دبانے پر مجبور ہو جاتے کہیں شبنم برساتے، کہیں شعلے بھڑکاتے، ہوش کی جگہ ہوش اور جوش کی جوش سے کام لیتے۔

غرضیکہ آپ کو وعظ وخطابت کے نشیب وفراز سے کما حقہ واقفیت تھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس ''احمد آباد'' میں ''احناف'' اور ''غیر مقلدین'' کے مسئلے کے تحت ایک صاحب نے غیر متوازن تقریر چھیڑ دی جس سے فضا مکدر ہونے لگی، برہمی اور انتشار کی کیفیت ہوگئی اور ایک اختلافی مسئلہ زیر بحث ہوگیا اور بدنظمی کے باعث صدر جلسہ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے آپ کو اسٹیج سنبھالنے کے لئے کہا، آپ نے چند منٹ کی دردانگیز خطابت اور ''شعلہ گفتار'' وعظ سے اعتدال وتوازن پیدا کر دیا اور اس تکدر کا ازالہ فرما کر گفتگو کا رخ دوسری جانب موڑ دیا جس سے ماحول سازگار ہوگیا۔

مجتہد، معتدل:

آپ کی زندگی فیض مسلسل اور دائمی عطا کا نام ہے، اختلاف وانتشار سے مبرارہ کر آپ نے کافی خدمات انجام دی ہیں، اجتہاد واعتدال کے بربنا آپ نے کافی مسائل کے مشکلات کو حل کئے ہیں، کیونکہ ''فقہ'' میں آپ کو مکمل دسترس اور کما حقہ مہارت تھی، مسئلے کا استنباط بہت فہم وذکا اور بصارت وبصیرت، غور وخوض اور جدوجہد سے کرتے تھے، مسئلہ ''طلاق سکران'' کے متعلق آپ کی جو رائے ظاہر ہوئی لوگوں نے بالخصوص طبقۂ مفتیان کرام نے اس کو سراہا اور اس کی تائید کی، لیکن بعض حضرات نے اس کو ہدف ملامت بنا کر چہ می گوئیاں بھی کیں، لیکن آپ اعتدالی کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے مذکورہ مسئلے کی صواب دید پر قائم رہے۔

مصنف ومؤلف:

آپ تین درجنوں سے زائد کتابوں کے مؤلف ہیں، علمی تحقیقات، متدلات اور تدقیقات سے آپ کی تمام تصانیف پُر ہیں، لیکن چند تصانیف اپنے اندر الگ ہی قسم کی خوبیاں رکھتی ہیں جنہیں ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوسکتا ہے۔

مجموعہ القاسم: جلد ششم   تیری عظمتوں کو سلام

اسلامی عدالت:

اسلام کا عدالتی نظام فقہ اسلامی کا معیاری اور عظیم الشان موضوع ہے۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی کافی اہم ہے، کیونکہ راقم کو اگر ایک طرف قانون قضاء پر مبسوط اور مکمل دھیان رکھنا ہوتا ہے تو دوسری طرف ''کار قضاء'' انجام دینے پر علمی تجربہ، فنی مہارت، فقہی صلاحیت اور شرعی وفقہی آراء کے مطابق کی استعداد بھی ضروری ہے۔ یہ سعادت خوش بختی رب کریم نے آپ کی جھولی میں ڈال دی اور ''اسلامی عدالت'' نام کی کتاب لکھ کر اردو دنیا میں ایک نیا انقلاب اور مفتیان کرام وقاضیان عظام کے لئے ایک گراں قدر تحفہ پیش کر دیا ہے جس میں آپ نے قضا کی تمام بحثیں دفعہ وار اور حوالہ جات کے اہتمام کے ساتھ جمع کر دیں اور مقدمہ کتاب لکھ کر مباحث وقضا کی تاریخ سے واقفیت کرادی۔

مجموعہ قوانین:

مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ اسلامی قوانین وضوابط کیا ہیں؟ عقد، نکاح، طلاق، خلع، فسخ، مہر، میراث، بیع، ترکہ، موروث وغیرہم کے کیا قوانین ومسائل ہیں؟ ان سب سے کما حقہ واقفیت ہم جیسے لوگوں کو نہیں ہوسکتی ہے، چہ جائے کہ جدید تعلیم یافتہ ایڈووکیٹ، جج صاحبان، منصف وغیرہم کو ہو، یہ تمام فکر رات دن آپ کو ستاتی رہتی تھی، غلط فیصلے کے صدور کی خبریں آپ پر بجلی بن کر گرتی تھی، ہدایہ کا انگلش ترجمہ (جو نہایت ہی غلط اور بے بنیاد ترجمہ ہے) کی اشاعت وعمل سے آپ ہراساں تھے، آپ کا میلان طبیعت اسلامی قوانین کو احاطہ کرنے کا تھا اردو انگریزی ٹرانسلیشن کرا کے عدالتوں، منصف خانوں میں بھجوانا تھا، تا کہ منصف وجج حضرات اس کی روشنی میں فیصلہ دیا کریں، خدا نے آپ کو یہ سعادت عظمیٰ بھی بخشا اور علی میاں ندویؒ کے خواب کی تعبیر آپ کے ذریعہ سامنے آئی، آپ نے اس کتاب کی رسائی ہر جگہ ہر طبقے کے لوگوں تک کرائی تا کہ مطالعے سے استفادہ کریں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

امارت شرعیہ:

۱۹۲۱ء سے ہی مذکورہ تنظیم دینی اور اسلامی ادارہ ہے، مگر حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ایماء پر ۱۹۶۱ء سے آپ نے جو توانائی بخشی ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ۴۱ برس تک آپ نے خون پسینے سے اس ادارے کو سینچ کر آج بار آور شجر اور تناور درخت بنا دیا ہے اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی جوہر شناس نگاہ نے آپ سے جو امید وابستہ رکھی تھیں وہ بر آئیں، آپ کی آمد کے وقت امارت شرعیہ میں بیٹھنے کے لئے بوریہ تک نہیں تھی۔ دارالقضاء کا کوئی نظام دوسری جگہ نہیں تھا، لیکن آپ نے ۱۳۸۱ھ سے اب تک اتنی خدمات انجام دی ہیں کہ آج بہار اڑیسہ، جھارکھنڈ کے ہر معروف ومشہور گاؤں میں ذیلی دفاتر، دارالقضاء اور متعدد ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور ہاسپٹل موجود ہیں، جو اپنے مشن میں لگے ہوئے ہیں، آفات وبلیات کے وقت امداد رسانی اور مرض وبیماری کے وقت مفت علاج اور جا بجا کیمپس لگا کر خدمات انجام دئے جا رہے ہیں اور ''دارالقضاء'' کے انعقاد سے ہزاروں مسائل حل ہو رہے ہیں جو آپ ہی کی رہین منت ہے۔

مسلم مجلس مشاورت:

روزمرہ حالات کے پیش نظر چند ارباب کی معیت میں ۱۹۶۵ء میں اس تنظیم کا انعقاد عمل میں آیا، مگر بحرانی کیفیات، دستوری خامیاں، مخلص اور فعال ومتحرک قائد کے فقدان، منتشر ذہنیت اور اختلاف آراء کی بربنا یہ تنظیم کامیاب نہیں ہوسکی۔ بنابریں چند سال بعد ''مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام وجود میں آیا۔

آل انڈیا ملی کونسل:

۱۹۹۲ء میں علی میاں ندویؒ کی قیادت میں اس تنظیم کا آغاز ہوا جو بحمد اللہ آج تک موجودہ تمام تنظیموں سے زیادہ خدمات انجام دے رہی ہے، ''بابری مسجد'' کی شہادت کے

موقع سے اڑیسہ تباہی کے موقع پر گجرات (زلزلہ) کے حادثۂ عظیم کے موقع سے پھر اس وقت جو ملی خدمات یہ تنظیم انجام دے رہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ خود قاضی صاحب مرحوم نے حکومت وامارات کے سربراہان سے ملی، سماجی اور سیاسی فلاحی وبہبود کے لئے کئی مرتبہ گفتگو کی ہے۔ ''مقامات''، ''ٹاڈا''، ''پوٹا''، ''میسا'' اور اس کے علاوہ V.H.P., R.S.S شیوسینا اور بجرنگ دل سے ان کے موقف واغراض پر آپ نے کھل کر بحث کی ہے۔ ابھی مرگ وفات سے پہلے کا واقعہ ہے کہ آپ بستر مرض پر دراز ہیں، مگر فکر امت دامن گیر ہے کہ ''وشو ہندو پریشد'' کے کارکنان اور کارسیوکوں نے ''مندر نرمان'' کا پلان بنا کر ہندوستان کی جمہوریت کو کس طرح للکارا، اس کے متعلق آپ نے موجودہ وزیر اعظم کو تحریری شکل میں یہ چیتاونی دیا کہ پہلے آپ گہرائی سے سارے قانونی لفظوں کا جائزہ لیں اس کے بعد وی ایچ پی کے ناجائز مانگ پر توجہ دیں۔ (بشکریہ ملی اتحاد فروری ۲۰۰۲ء)۔

مناصب اور عہدے:

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، قاضی القضاۃ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، بانی وجنرل سکریٹری آل انڈیا فقہ اکیڈمی، سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل، اکسپرٹ ممبر اسلامک فقہ اکیڈمی (جدہ) ممبر اسلامک فقہ اکیڈمی مکۃ المکرّمہ) ممبر المجمع العلمی العالی (دمشق) رکن اعزازی الہیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ العالمیۃ (کویت) سکریٹری سجاد میموریل ہاسپٹل (پٹنہ) صدر المعہد العالی للتدریب فی الافتاء والقضاء (پٹنہ) صدر مولانا منت اللہ رحمانی انسٹی ٹیوٹ (پٹنہ) چیف ایڈیٹر سہ ماہی ''بحث ونظر'' سرپرست ماہنامہ ''ملی اتحاد'' اس کے علاوہ سینکڑوں مدارس ومکاتب اور عظیم اداروں کے بانی اور سرپرست رہے ہیں۔

اعزازات:

آپ کی تمام زندگی فلاحی خدمات میں گزری ہیں کافی کالجز اور اسکولوں کے بانی

وسرپرست رہے ہیں، خود اپنے گاؤں ''جالے'' میں ''ڈگری کالج'' کے بانی اور سرپرست رہے ہیں اور اغیار کے لئے اسکول کھولے ہیں جو آپ کی جمہوری شخصیت کا عکس جمیل ہے۔ شاہ ولی اللہ ایوارڈ ۲۰۰۱ء کے علاوہ بہت سے اعزازات وایوارڈس سے نوازے گئے ہیں۔

وفات:

پانچ سال سے علالت کی زندگی گزار رہے تھے، ڈاکٹروں نے مہلک مرض ''بلڈ کینسر'' کی تشخیص کیا تھا، ''اپولو'' ہاسپٹل میں داخل کئے گئے اور موت وزیست کے درمیان ہچکولے کھاتے ہوئے ۴/اپریل ۲۰۰۲ء جمعرات کی شام ۷ بج کر ۵ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے، بعدہ قطار سا بندھ گیا زائرین ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے۔ دیوبند ۷ بج کر ۴۵ منٹ پر خبر پہنچی ایک کہرام بپا ہوا، عقیدت مندوں نے آخری زیارت کی تمنا لیے ۳۵-۲ بج کررات میں ایک بس ریزرو کیا۔ ڈرائیور کی ناگہانی اور ناانجانی کے بربنا کافی تاخیر ہوئی۔ ۷ بج کر ۵۵ منٹ پر بس جامعہ ملیہ اسلامیہ پہنچی، مگر مرحوم کا جسد خاکی ایئرپورٹ جا چکا تھا، کف افسوس ملتا ہوا ادھر ادھر جھانکا اور ایک مشورہ طے پایا کہ ''ایئرپورٹ'' چلا جائے، عقیدت مندوں کا پھول نچھاور کرتا ہوا ہم نشینوں کی معیت میں ایئرپورٹ پہنچا۔ خوش قسمتی کہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب عمت فیوضکم سے ملاقات ہوئی، موصوف کی امامت میں ''صلوٰۃ جنازہ'' پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، مگر زیارت سے محروم لاچار ہم وطن انسان یہیں سے دیوبند لوٹ آیا اور سہارا ایئرلائنز کے ذریعہ جسد خاکی پٹنہ لے جایا گیا۔ جہاں سہ بارہ نماز جنازہ کی ادائیگی امیر شریعت کی امامت میں ہوئی پھر پٹنہ سے آبائی وطن لے جایا گیا جہاں ہزاروں سوگوار نے نم ناک آنکھوں سے مرحوم کو الوداع کہا اور ہم عزیز اشخاص وطن مالوف سے دور یہ کہتے رہے کہ

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

☆☆

آٹھ سو سال پرانا ایک نادر علمی تحفہ

مخطوطہ: صنوان القضاء وعنوان الافتاء

تحقیق حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

● مفتی محمد فہیم اختر ندوی

دیار ہند کا رشتہ سرزمین عرب سے خاصا پرانا رہا ہے۔ دور جاہلیت کی خانہ بدوش زندگی میں ہندوستانی تلوار نے نہ صرف ان کی رزم رستخیزی میں خاراشگافی کی داستان رقم کی، بلکہ ان کی بزم شعر ونشاط میں بھی اپنی تشبیہات واستعارات کے گل کھلائے، اگر ہند کے مسالوں نے ان کے دسترخوان کی لذت میں اضافہ کیا تو فاران کی بلندیوں سے پھوٹنے والے ابدی مقدس نغموں نے ہر گوشہ ربع کو نغمہ ریز کرتے ہوئے ہند کی فضاؤں کو بھی ترنم ریز بنایا۔

آب رود گنگا کے کنارے اترنے والے قافلہ اسلام نے جو امانت اہالیان ہند کو سونپی تھی، اسلامیان ہند نے اسے سینوں میں محفوظ رکھا اور اس کی حفاظت وخدمت میں سینہ سپر اور پیش پیش رہے۔ انہوں نے یہاں حدیث کی مسندیں بچھائیں، تفسیر کے درس جاری کئے، ان کے شوق رہ نوردی نے فقہ وتحقیق کی وادی سنگلاخ کو بھی خوب خوب طے کیا۔ علماء ہند کی علمی خدمات علوم اسلامیہ کے ہر میدان میں بیش بہا وعظیم الشان ہیں، لغت ورجال، تفسیر وحدیث اور فقہ ودیگر شعبہ ہائے علم میں ان کی قیمتی تصنیفات نے اسلامی لائبریری میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

فقہ اسلامی کا ایک اہم شعبہ علم قضاء اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، حیات انسانی

میں نظم وضبط اور خوگواری اسی کی رہین منت ہے، اسی لئے وحی الٰہی نے اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات دیں اور ترغیبی وتربیتی وسائل کے ذریعہ اس کی تاکید کی، ان ہدایات کو ''علم ادب قضاء'' کے عنوان سے مستقل کتابوں میں جمع کرنے کا سلسلہ دوسری صدی ہجری سے ہی شروع ہوگیا اور اسلامی تاریخ کے پہلے چیف جسٹس امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) نے ''ادب القاضی'' پر پہلی کتاب دنیائے اسلام کو پیش فرمائی، کشف الظنون میں ہے: ''حنفی قاضی ومجتہد امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم (متوفی ۱۸۲ھ) کی کتاب ''ادب القاضی'' امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر ہے، یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر املاء کی صورت میں تصنیف کی۔ ان سے بشر بن ولید مریسی اور محمد بن سماعہ حنفی (متوفی ۲۳۳ھ) نے روایت کیا ہے (ہدیۃ العارفین ۲/۴۷)۔

پھر اس موضوع پر فقہ حنفی میں امام محمد بن حسن شیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) حسن بن زیاد لولوی (متوفی ۲۰۴ھ)، محمد بن سماعۃ (متوفی ۲۳۳ھ) امام خصاف (متوفی ۲۶۱ھ)، قاضی ابوحازم (متوفی ۲۹۲ھ)، ابوجعفر اسحاق انباری (متوفی ۳۱۷ھ)، امام طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ)، امام قدوری (متوفی ۴۲۸ھ)، امام سمنانی (متوفی ۴۹۹ھ)، امام سروجی (متوفی ۷۱۰ھ) وغیرہ متعدد فقہاء نے بیسوں کتابیں تصنیف فرمائیں، فقہ مالکی میں امام اصبغ بن فرج (متوفی ۲۲۵ھ)، امام محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم (متوفی ۲۸۲ھ)، امام ابن شبطون لخمی (متوفی ۳۱۲ھ)، امام خلف بن مسلم (متوفی ۴۴۰ھ)، امام قرافی (متوفی ۶۸۴ھ)، امام ابن فرحون (متوفی ۷۹۹ھ)، امام ابن سلمون، امام قاضی الجماعہ (متوفی ۸۲۹ھ)، اور فقہ شافعی میں امام اصطخری (متوفی ۳۲۸ھ)، امام ابن القصاص (متوفی ۳۳۵ھ)، امام ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) امام ابن ابی الدم (متوفی ۶۴۲ھ)، امام غزی (متوفی ۷۹۹ھ)، امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، امام سیوطی وغیرہ فقہاء نے بیس سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں، اسی طرح فقہ حنبلی میں امام ابن القیم (متوفی ۷۵۱ھ) اور فقہ

ظاہری میں امام داؤد بن علی (متوفی ۲۷۰ھ) وغیرہ نے بھی ادب القاضی کے موضوع پر قیمتی کتابیں لکھیں۔

ہندوستان میں ادب القاضی:

ساتویں صدی ہجری عالم اسلام کے لئے ایک سخت ترین وسنگین ترین دور تھا، فتنہ تار تار کی حشر سامیانیوں سے عالم اسلام کا بڑا حصہ زیروزبر ہورہا تھا، اقصائے چین سے لے کر ماوراء النہر، کابل اور خراسان وحدود شام وروم تک کا علاقہ تاتاری بربریت سے لہولہان ہورہا تھا، ۶۱۶ھ میں بخارا کو تاراج کیا گیا، ۶۱۷ھ میں سمرقند، مرو اور نیشاپور کو چنگیز خاں نے تباہ وبرباد کیا اور ۶۵۶ھ میں تاتاری عفریت نے اسلامی سلطنت کے پایہ تخت اور علم وتہذیب کے معدن بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل کا یہی وہ دور تھا جب وسط ایشیا میں اسلامی سلطنت کا چراغ گل ہورہا تھا اور برصغیر میں ایک نیا چراغ روشن ہورہا تھا۔ ۵۸۹ھ میں شہاب الدین محمد غوری اپنے غلام قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب بنا کر غزنہ واپس ہوا تو ایبک نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور غوری کی وفات کے بعد ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں قطب الدین نے لاہور میں بیٹھ کر ہندوستان پر حکمرانی شروع کی، چار سال بعد ۶۰۷ھ میں قطب الدین کی وفات ہوئی اور اس کا لائق غلام شمس الدین التمش دہلی میں تخت نشین ہوا، التمش نے بڑی دوراندیشی کے ساتھ طویل حکومت کی، ۶۳۳ھ میں مستحکم اور پرامن حکومت چھوڑ کر وہ اس دنیا سے رخصت ہوا، اس کے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو صرف چھ ماہ کی حکومت کے بعد قتل کردیا گیا اور التمش کی بیٹی رضیہ سلطنت پر متمکن ہوئی، تین سال بعد ۶۳۷ھ میں اس کا بھائی معز الدین بہرام شاہ حاکم ہوا، لیکن ۶۳۹ھ میں امراء سلطنت نے اس کی جگہ علاء الدین مسعود شاہ بن فیروز شاہ بن التمش کو حاکم بنایا، جس نے چار سال حکومت کی، پھر ۶۴۴ھ میں اس کے چچا ناصر الدین

محمود شاہ بن التمش کو تخت حکومت پر بٹھایا گیا، اس دور میں غیاث الدین بلبن کی محنت سے ملک میں پھر استقرار وامان قائم ہوا اور بیس سال تک یہ حکومت باقی رہی اور اس کی وفات کے بعد بلبن نے باگ ڈور سنبھالی۔

عہد غلاماں میں التمش کا دور حکومت اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ عالم اسلام میں اس وقت دہلی سب سے زیادہ پر امن اور اسلامی حکومت کا مرکز تھا اور اسی لئے عالم اسلام سے علماء واہل علم اپنے وطن کی بربادی کے بعد کھینچ کھینچ کر دہلی آگئے، اغلب ہے کہ خراسان جو ۶۱۷ھ کے بعد تاتاریوں کے ظلم وبربریت کا شکار ہوا وہاں کے جلیل القدر علماء وفقہا نے بھی عہد التمش میں ہی دہلی کا رخ کیا ہوگا۔

خراسان سے دہلی آنے والوں میں ایک جلیل القدر فقیہ وعالم قاضی عماد الدین محمد بن محمد بن اسماعیل بن محمد الخطیب الاشفورقانی ہیں، علاء الدین مسعود شاہ کے دور میں ۴/ذی الحجہ ۶۳۹ھ مطابق ۵/جون ۱۲۳۲ء کو آپ دہلی میں قاضی القضاۃ بنائے گئے اور سات سال پانچ دن اس منصب پر رہ کر ۹/ذی الحجہ ۶۴۶ھ مطابق ۲۵/مارچ ۱۲۳۹ء کو ناصر الدین محمود شاہ بن التمش کے دور میں اپنے عہدہ سے علاحدہ ہوئے۔

قاضی عماد الدین محمد اشفورقانی غالباً ہندوستان میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''ادب القضاء'' کے موضوع پر ایک مفصل وو قیع تاب تصنیف فرمائی، ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' کے نام سے انہوں نے ۶۴۲ھ میں کتاب کی تصنیف کا آغاز فرمایا اور قضاء وقاضی کے نظام وآداب سے متعلق جزوی مسائل پر جامع ترین کتاب تیار کی، جس نے نہ صرف اس عہد کی ضرورت کو پورا کیا، بلکہ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد شیخ علامہ عالم بن العلاء انصاری اندریتی (متوفی ۷۸۶ھ) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''فتاوی تاتارخانیہ'' تصنیف فرمائی اور ساڑھے چار سو سال بعد اورنگ زیب عالم گیر (متوفی ۱۱۱۸ھ) نے ''فتاویٰ عالمگیری'' مرتب کرائی تو ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' ان کے پیش نظر رہی، چنانچہ فقہ

وفتاوی کی ان دو مایہ ناز کتابوں میں نہ صرف طویل طویل عبارات بلکہ پورا پورا صفحہ ''صنوان القضاء'' سے حرف بحرف منقول ملتے ہیں، فتاوی عالمگیری (مطبوعہ دار الفکر ۱۹۹۱ء) کی جلد سوم میں صفحہ ۴۷۲ پر ایک جگہ ''کذا فی صنوان القضاء'' تحریر بھی ہے، اسے حالات کی ستم ظریفی کہیے کہ ایسی مؤقر، وقیع اور جامع کتاب اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکی تھی، لیکن کیا یہ خوش کن پہلو نہیں ہے کہ زمانہ کے انقلابات اور وقت کے نشیب وفراز میں بھی یہ قیمتی علمی ورثہ دست برد کا شکار نہیں ہوا اور آج ہم اس سے مستفید ہونے کا موقع پا رہے ہیں۔

قاضی عماد الدین محمد اشفورقانی:

یہ امر حیرت ناک ہے کہ عہد غلاماں میں ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں سات سال کے طویل عرصہ تک قاضی القضاۃ کے عظیم منصب پر فائز رہنے والی اس شخصیت کی زندگی کے گوشوں پر خفا کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ مصنف نے ''صنوان القضاء'' کے مقدمہ میں اشارۃً جو کچھ لکھا ہے اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خراسان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور اسی وجہ سے شہر اور مدارس علماء سے خالی ہوگئے، علم وفقہ کا علم زمین بوس ہوگیا اور وطن سے جدا ہوکر ہندوستان میں مقیم ہونا پڑا۔ صاحب ''نزہۃ الخواطر'' علامہ حکیم عبدالحئی صاحبؒ نے جلد اول میں مصنف کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''قاضی عماد الدین محمد اشفورقانی ہندستان کے ایک مشہور فقیہ ہیں، دہلی میں ۴/ذی الحجہ ۶۳۹ھ کو مسعود شاہ کے دور میں قضاء الممالک کے منصب پر فائز ہوئے اور ایک زمانہ تک رہے، پھر ان کو کسی معاملہ میں متہم کیا گیا اور جمعہ ۹/ذی الحجہ ۶۴۶ھ کو عہدہ قضاء سے معزول کیا گیا اور سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں بدایوں کی طرف روانہ کیا گیا اور عماد الدین ریحان صاحب کے حکم سے دوشنبہ ۱۲/ذی الحجہ ۶۴۶ھ کو قتل کر دیا گیا، جیسا کہ طبقات ناصری میں ہے۔'' حکیم صاحب

نے جو کچھ لکھا ہے وہ طبقات ناصری کے حوالہ سے ہے، حیرت ہے کہ طبقات ناصری کے مصنف شیخ منہاج الدین بن سراج الدین جو نہ صرف مصنف کے ہم عصر مؤرخ ہیں، بلکہ خود بھی اسی منصب پر فائز رہے ہیں اور ان کے استعفیٰ دینے کے بعد ہی مصنف کو قاضی القضاۃ بنایا گیا ہے، لیکن انہوں نے بھی کوئی تفصیل فراہم نہیں کی، چند مختلف مقامات پر صرف ڈیڑھ دوسطروں میں مصنف کے تعلق سے جتنا کچھ لکھا ہے ان سب سے مصنف کی زندگی کا انتہائی مختصر ترین وہ خاکہ تیار ہوتا ہے جو صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے اوپر ذکر کیا ہے۔ مصنف کا ذکر مذکورہ دونوں کتابوں کے علاوہ تاریخ فرشتہ میں بھی ہے۔ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی مشترکہ انگریزی کتاب (Comprehensive History of India) نیز جناب حبیب اللہ صاحب نے انگریزی کتاب کے اردو ترجمہ بنام ''ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس'' میں بھی مصنف کا ذکر کیا ہے، لیکن شاید ان سب کا ماخذ طبقات ناصری ہے، کیونکہ ان سے کسی مزید معلومات کا اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

صنوان القضاء کے مختلف مخطوطوں کے سرورق پر مصنف کا نام القاب کے ساتھ اس طرح لکھا ملتا ہے۔ ''الصدر الامام ملک القضاۃ والحکام صدر صدور الاسلام عماد الحق والدین ابوالملوک والسلاطین اعظم صدور الدھر اکرم علماء ماوراء النہر ابوالمحامد محمد بن محمد بن اسماعیل بن الخطیب الاشفورقانی۔''

حاصل یہ ہے کہ مصنف کا نام ونسب محمد بن محمد بن اسماعیل بن الخطیب ہے، خراسان کے علاقہ ''اشفورقان'' کے رہنے والے ہیں، فتنۂ تاتار کی وجہ سے آپ نے وطن سے ہجرت کی اور دہلی تشریف لائے، سلطان علاء الدین مسعود شاہ کے عہد میں آپ کو ۶۳۹ھ میں قاضی الممالک کا اعلیٰ عہدہ سونپا گیا، مسعود شاہ کے پورے پانچ سالہ دور حکومت میں آپ اس عہدہ پر فائز رہے، یہ دور سیاسی اتھل پتھل کا تھا، شاہ وقت کی تبدیلی کا اثر اس کے

متعلقین اور اونچے عہدیداران پر بھی پڑتا تھا، جب مسعود شاہ کو ہٹا کر ۶۴۴ھ میں سلطان ناصر الدین محمود شاہ کو حاکم بنایا گیا تو آپ اس کے بعد بھی دو سال تک اپنے عہدہ پر برقرار رہے، ۶۴۶ھ میں آپ کو عہدہ سے ہٹایا گیا، اس طرح سات سال پانچ دن آپ قاضی الممالک رہے، اسی سال آپ کو کسی وجہ سے بدایوں منتقل کیا گیا اور وہاں شہید کر دیا گیا۔

''صنوان القضاء'' کے مقدمہ سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب سے پہلے کئی دیگر کتابیں بھی تصنیف فرمائی تھیں، لیکن ان کی بابت کوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی ہے، قاضی اشفورقانی کی تعلیم وتربیت، اساتذہ وشیوخ اور ان کے تلامذہ کا بھی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔

صنوان القضاء وعنوان الافتاء:

یہ کتاب دراصل آداب قضاء کے موضوع پر ہے، اس میں مصنف نے ایسے جزوی مسائل کا زیادہ احاطہ کیا ہے جن کی ضرورت قضاۃ اور مفتیان کو روزمرہ پیش آتی ہے، چنانچہ مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ''یہ کتاب مفتی کے لئے اسی طرح مفید ہے جس طرح قاضی کے لئے مفید ہے، اس سے دیوان قضاء کے محررین کو محاضر اور سجلات کی تیاری میں، وکلاء کو دعویٰ اور مقدمات میں اور گواہان کو اداء شہادات میں بڑی مدد ملے گی، متوسط لوگوں کو بھی مصالحت کے وقت، تحقیق حال کرنے والے کو تزکیہ کے وقت اور حکم کو نزاع فیصل کرتے وقت اس کی ضرورت پیش آئے گی۔''

پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کے تحت فصول اور فصل کے تحت انواع کی تقسیم وترتیب ہے، کتاب کا پہلا باب ''فاتحۃ الکتاب'' ہے جس میں پانچ فصول قائم کر کے مصنف نے قضاء کے فضائل، شرائط، اہلیت قضاء اور سلطان عادل وجابر کا ذکر کیا ہے، دوسرا باب آداب قضاء (System of Judicary) پر ہے جس میں پانچ

فصول کے تحت مصنف نے قاضی کی صفات، عہدہ قضاء میں مانع بننے والے اوصاف، قاضی کی سیرت، اس کی مجلس قضاء کے آداب اور اس کی ضروریات درپیش مسائل میں دوسرے علماء سے مشورہ اور اختلاف آراء کی صورت میں طریقہ کار، قاضی کی معلومات کے ذرائع اور ان کی حیثیت، نیز قضاء کے رجسٹر وفیصلوں پر روشنی ڈالی ہے، تیسرے باب میں بھی پانچ فصول قائم کئے گئے ہیں اور ان میں فریقین کو طلب کرنے، جیل بھیجنے، ضمانت طلب کرنے، گواہان، ان کی تحقیق اور بیت المال سے وظائف کے مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، چوتھا باب اس امر سے متعلق ہے کہ قاضی کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں اور آخری پانچواں باب دعویٰ اور ثبوت کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

کتاب کی امتیازی خصوصیات:

''صنوان القضاء'' کی تصنیف ساتویں صدی ہجری کے وسط میں انجام پائی ہے، اس قدامت کی وجہ سے یہ کتاب کافی اہم قرار پاتی ہے، ادب القاضی پر موجودہ کئی اہم متداول کتابوں سے یہ کافی قدیم ہے۔

اس کی دوسری اہم خصوصیات یہ ہے کہ قاضی اشفورقانی نے اس کی تصنیف کے وقت فقہ حنفی کے اوّلین اہم ترین مراجع کو پیش نظر رکھا ہے اور ان سے اقتباسات نقل کئے ہیں، اس طرح خود ان مراجع کا خاصا حصہ اس کتاب کے اقتباسات کی صورت میں محفوظ ہو گیا ہے، قاضی اشفورقانی نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے حفظ پر اعتماد کرنے کے بجائے مراجع کو سامنے رکھا ہے اور اقتباسات درج کئے ہیں، ان کے الفاظ ہیں: ''**ولم اعتمد فی نقلی علی حفظی ولا فی شئی منی احلت الی درایتی وانما لی روایتی وحکایتی.**''

قاضی اشفورقانی کے پیش نظر مندرجہ ذیل مصادر فقہ حنفی رہے ہیں جن کا انہوں نے خود

تذکرہ فرمایا ہے: المبسوط، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، الزیادات، السیر الکبیر، الذخیرۃ الامامیۃ البرہانیۃ، الاقضیۃ الظہیریۃ، شرح ادب القاضی الصدری الشہیدی الحسامی، فوائد ائمۃ الامصار، نیز کتب ظاہر الروایہ کے علاوہ الہارونیات، الکیسانیات اور الرقیات وغیرہ سے بھی اقتباسات درج کئے گئے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی اشفورقانی کے پاس یہ تمام کتب موجود تھیں، یہی نہیں، بلکہ اس دور میں جبکہ طباعت کی موجودہ آسانیاں نہیں تھیں، علمی کتابوں سے استفادہ کا اہتمام دیکھئے کہ قاضی اشفورقانی نے پچاس، سوسال پہلے تصنیف پانے والی کتاب الہدایۃ للمرغینانی (متوفی ۵۹۵ھ) سے بھی اپنی اس کتاب میں استفادہ کیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ سیاسی حالات کی ابتری بھی شوق وجستجوئے علم پر کوئی اثر نہیں ڈال سکی۔

''صنوان القضاء'' کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آداب قضاء سے متعلق جزوی مسائل کا بڑا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ قاضی اشفورقانی ہندوستان جیسے طویل وعریض ملک میں قاضی القضاۃ کے منصب جلیل پر ایک طویل عرصہ تک فائز رہے، اس دوران انہوں نے عملی طور پر مشکلات اور مسائل کا سامنا کیا اور اپنے تجربات کا عطر بھی اپنی تصنیف میں کشید کرنے کی کوشش فرمائی، چنانچہ ''صنوان القضاء'' کے فاضل محقق نے کتاب کے آخر میں اپنا یہ احساس درج کیا ہے کہ ''میں نے (ادب القضاء پر متداول تقریباً تمام) کتابوں اور فقہی کتابوں میں ادب القضاء کے مباحث کا مطالعہ کیا ہے، اس کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے قضاء کے مسائل اور مشکلات ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' سے زیادہ جامع اور جزئیات پر محیط کوئی دوسری کتاب نہیں پائی۔''

صنوان القضاء کی تحقیق ایک وقیع کارنامہ:

سچ ہے کہ ذات حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، کبھی تخریب کے پردہ سے بھی تعمیر کے ساماں مہیا ہوتے ہیں اور مقصد حیات کی ڈگر پر عزم محکم کا سفر جاری رہتا ہے تو

رکاوٹوں کے طوفان بھی پلٹ جاتے ہیں، ''صنوان القضاء'' کی اہمیت اور اس کی تحقیق کی ضرورت کا احساس تو ایک عرصہ سے فاضل محقق کو تھا، گاہے بہ گاہے آغاز کی کوشش بھی ہوتی رہی، لیکن جب علالت اور شدید علالت کی شدت اپنے عروج پر پہنچی تو رکاوٹیں دور ہوگئیں اور تحقیق وایڈیٹنگ کا جاں گسل عمل ایک سال کے اندر مکمل ہوگیا اور چار ضخیم جلدوں میں یہ نایاب ونادر وقیع کتاب تحقیق کے پیرہن سے آراستہ ہوکر طباعت کے لئے تیار ہوگئی اور اس طرح یہ حسن اتفاق پورا ہوا کہ ادب القاضی پر عہد غلامان کے دہلی میں وقت کے قاضی القضاۃ کے قلم سے لکھی جانے والی برصغیر کی غالباً پہلی کتاب کو آزاد ہندوستان کے شہر دہلی میں امارت شرعیہ کے قاضی القضاۃ کے قلم نے پہلی بار زیور تحقیق سے آراستہ کرکے اسلامیان ہند کے پاس محفوظ امانت عالم اسلام کے کتب خانہ کو پیش کردی۔

قضاء کے موضوع پر عملی تجربات کی روشنی میں تصنیف شدہ اس عظیم کتاب کی تحقیق ایک طویل عرصہ تک قضاء کا عملی تجربہ رکھنے اور خود بھی ''اسلامی عدالت'' (آداب قضاء) کے موضوع پر بیش بہا تصنیف تیار کرنے والی شخصیت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب مدظلہ العالی نے انجام دی ہے، جو بذات خود تحقیق کے مقام وحیثیت کو واشگاف کرتا ہے۔

قاضی صاحب نے ''صنوان القضاء'' کے چار مخطوطے دریافت کئے، دو نسخے خدابخش لائبریری پٹنہ سے اور ایک نسخہ مکتبہ آصفیہ حیدرآباد سے حاصل کئے، چوتھا نسخہ دارالعلوم دیوبند کے مخطوطات میں دریافت ہوا۔

حضرت قاضی صاحب مدظلہ العالی نے خدابخش لائبریری کے ایک نسخہ کو بنیاد بناکر دیگر تینوں نسخوں کی مدد سے متن کتاب کا مقابلہ اور تصحیح عبارت اس طور پر کی جن مقامات پر الفاظ وکلمات میں نسخوں کے درمیان فرق تھا ان میں جو لفظ زیادہ صحیح محسوس ہوا اسے متن میں اختیار کرلیا اور دیگر نسخوں کے فرق کو حاشیہ میں ذکر کردیا۔

کچھ ایسے بھی مقامات آئے جہاں تمام نسخوں میں موجود لفظ واضح طور پر غلط محسوس کیا گیا، ایسے مقامات پر متعلقہ بحث کو فقہ کی دیگر کتابوں بالخصوص فتاوی تاتارخانیہ، فتاوی ہندیہ، جامع احکام الصغار للاستروشنی اور فتاوی النوازل للسمرقندی سے مراجعت کرکے الفاظ کی تصحیح کی گئی۔

مصنف کے نقل کردہ اقتباسات کو محولہ کتابوں سے ملایا گیا اور عبارات کی توثیق کی گئی، نیز مصنف کے ذکر کردہ مسائل کا دیگر فقہی کتابوں کے مسائل سے موازنہ کیا گیا اور حواشی میں ان مسائل کی توثیق اور مطبوعہ کتابوں کے حوالے درج کئے گئے۔

محقق نے ہر جزئی مسئلہ کے لئے باضابطہ عنوان قائم کیا اور ہر بحث کے لئے علاحدہ فقرہ نمبرات دئے، اس سے قارئین کو مطالعہ اور مراجعت دونوں میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے، محقق نے کتاب میں ذکر آنے والی شخصیات اور کتب کا تعارف حواشی میں کرایا ہے، آیات قرآنی کے حوالے اور احادیث وآثار کی تخریج کی ہے اور آخر میں آیات واحادیث، شخصیات، کتب، اماکن وغیرہ کی بابت تفصیلی فہرستیں اور اشارے درج کئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں محقق کے قلم سے ایک طویل مقدمہ ہے جس میں اس تعارف میں آنے والے تمام مباحث کو بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔

پاکستان کے چیف جسٹس حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے کتاب کی جلد اول پر مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے اور عالم اسلام کے نامور مفکر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اس کی چوتھی جلد پر اپنا وقیع مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

محقق کا اب حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب مدظلہ کے اس وقیع علمی کارنامہ کو کویت کی وزارت اوقاف نے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، محقق موصوف نے اس کی چاروں جلدیں ادارہ کو سپرد کردی ہیں، دعاء ہے کہ یہ جلد سے جلد زیور طبع سے آراستہ ہوکر شوق کے ہاتھوں تک پہنچے اور تشنہ کامان علم اس سے سیراب ہوں، اللہ رب العزت

کتاب کے مصنف اور محقق کو بھر پور جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کوشش کو قبولیت سے نوازے۔

نــوٹ: یہ مضمون حضرت قاضی صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی میں لکھا گیا تھا، اس کی اہمیت اور حضرت قاضی صاحبؒ کی ذات اور ان کے کارنامے کی نسبت کے مدنظر کتاب میں شامل ہے، اور مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ حضرت قاضی صاحب کے اس علمی کارنامہ سے ہندستانی علماء کا وقار پوری علمی دنیا میں بلند ہوا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے لئے اس کو ذخیرہ آخرت بنائے اور حضرت کے ان رفقاء کار اور بالخصوص فقہ اکیڈمی کے کارکنان جنھوں نے اس اہم علمی کام میں حضرت کا تعاون کیا، سب کے علمی تعاون کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا کرے (آمین)۔

☆☆

مجاہد ملت جاتا رہا

● مولانا رضوان احمد ندوی

۱۴؍اپریل ۲۰۰۲ء کی شام کو ایک ایسا مرد مجاہد دنیا سے رخصت ہو گیا جس نے اپنی تمام عمر میں کبھی ٹھہرنے اور رستانے کا نام نہیں لیا تھا۔ اس کا دماغ مشین کے پرزوں کی طرح ہمیشہ حرکت وگردش میں لگا رہتا، وہ ملت اسلامیہ ہند کے غم میں نڈھال ہو چکا تھا، واحسرتاہ کہ اب وہ اس مقام پر چلا گیا جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ یہ گوہر درخشاں، نابغہ روزگار شخصیت، ملک کی سب سے باوقار مؤقر تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے نائب امیر شریعت وقاضی القضاۃ، اسلامک فقہ اکیڈمی اور آل انڈیا ملی کونسل کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کی تھی، جو اپنی طویل علالت کے بعد دہلی کے اپولو اسپتال میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، بس یوں سمجھئے کہ قوم کی ایک مشترک دولت لٹ گئی۔

چاندنی افسردہ، گل بے رنگ وبو، نغمے اداس
اک تیرے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہو گیا

حقیقت یہ ہے کہ بعض آفاقی شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو چرخ کے ہزاروں گردشوں کے بعد جنم لیتی ہیں اور چشم فلک جن کا صدیوں اور سالوں انتظار کرتی ہیں، وقت قدم قدم پر رک کر اور سنبھل کر ایسے افراد کو بناتا ہے، سنوارتا ہے اور تراشتا ہے، تب کہیں جا کر ایک گوہر نایاب اور مرد کامل جنم لیتا ہے، بلاشبہ حضرت قاضی صاحب ایسی ہی عالمی شخصیات میں سے

تھے، وہ بیک وقت فقیہ بھی تھے اور متکلم بھی، بے مثال خطیب بھی تھے اور شیریں گفتار عالم دین بھی، بلکہ یوں کہیے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب جید عالم دین، صاحب نسبت بزرگ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی کے خصوصی شاگرد اور تربیت یافتہ لوگوں میں تھے۔ آپ کی اس علمی وتہذیبی گھرانے میں پرورش پرداخت ہوئی۔ جب ۲۵/مارچ ۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی بہار واڑیسہ کے چوتھے امیر شریعت منتخب ہوئے تو امارت شرعیہ کے شعبوں کو متحرک وفعال بنانے تنظیم امارت کے دائرہ کار کو وسعت دینے اور نظام قضا کو پھیلانے کے لئے نہایت ہی دور اندیش، زمانہ شناس اور حد درجہ ذہین وفطین شخص کی ضرورت محسوس کی اور نظر انتخاب حضرت قاضی صاحب پر ہی پڑی۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں آپ کو امارت شرعیہ کا ناظم اور دارالقضاء کا قاضی مقرر فرمایا، جو چند سالوں کے بعد نظامت کا عہدہ تو مولانا سید نظام الدین صاحب (موجودہ امیر شریعت) کو سپرد کیا، مگر تقریباً ۴۲۔۴۳ سال تک قاضی کے عہدہ پر تاحیات فائز رہے اور ایک قابل تقلید، مثالی قاضی کی حیثیت سے ملک وبیرون ملک متعارف ہوئے آپ کے فیصلوں کو فریقین اس طرح تسلیم کرتے تھے گویا کہ فیصلے دونوں کے حق میں برابر ہوئے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج آپ کے فیصلوں کو بطور ریفرنس پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت قاضی صاحب نے جہاں نظام قضاء کو وسعت دی وہیں "**المعہد العالی للتدریب الافتاء والقضاء**" کا شعبہ قائم کیا جس کے تحت تربیت یافتہ قاضیوں کی ایک ٹیم تیار کی جو اس وقت بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے علاوہ ملک کے مختلف ریاستوں میں قضاء کے فرائض انجام دے رہے ہیں (جو اَب مستقل ادارہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے)۔ انہوں نے قاضیوں کی عملی رہنمائی کے لئے اسلامی عدالت کے نام سے اردو عربی میں ایک جامع علمی کتاب بھی مرتب کی جس میں

فقہ اسلامی کی تدوین کی تاریخ اور متقدمین قضا کے نظام قضاء کے طریقوں پر بہت ہی مفصل مدلل بحث کیا۔

حضرت قاضی صاحب ملت کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے اور ان کے درمیان نظم واتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے اور اس سلسلہ میں امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے سینکڑوں دیہی وشہری علاقوں کا دورہ کیا۔ مسلمانوں کے ذہن ودماغ کی فکری آبیاری کی اور انہیں ذات وبرادری کی لعنت اور اونچ نیچ کی تفریق وامتیاز سے اوپر اٹھ کر کلمہ واحدہ کی بنیاد پر ایک امت اور ایک جماعت بن کر زندگی گزارنے کی کامیاب کوششیں کیں، قدرت نے آپ کی زبان میں بلا کی تاثیر وقوت گویائی عطا کی تھی، جس سے خاص وعام کو استفادہ کا موقع ملا، اس پس منظر میں جب ۱۹۶۵ء میں آل انڈیا مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی تو آپ کو اس سرگرم وفعال ممبر بنایا گیا۔ آپ نے اس پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں قوت عطا کی، مگر جب مجلس مشاورت کے مخلص وفعال رجال علم دین آہستہ آہستہ اٹھنے لگے اور مشاورت اپنی افادیت کھونے لگیں تو یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ ایسا نہ ہو مسلمان موتی کے دانوں کی طرح منتشر ہو جائیں اور ان کی اجتماعی قوت بکھر جائیں۔ چنانچہ ان کی شیرازہ بندی کے لئے ۱۹۹۲ء میں آل انڈیا ملی کونسل کی تشکیل فرمائی، جس میں ملک گیر سطح پر ہر مکتب وفکر کے ممتاز علماء ودانشور کو ایک دھاگے میں پرویا۔ پھر اس تنظیم کے ذریعہ ملک میں بڑے نازک مرحلوں میں ملت کی صحیح رہنمائی کرتے رہے۔ اس سے قبل جب حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے ۱۹۷۲ء میں مسلمانوں کے ایک متفقہ ادارہ اور تحفظ شریعت کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے قیام کا خاکہ تیار کیا تو اس خاکے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حضرت قاضی صاحب کو ہی اپنا رفیق کار اور مشیر کار بنایا اور اس میدان میں آپ ان کے خاص معین ومددگار بنے رہے پھر اس کے بعد آپ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کی شرعی اور قانونی حیثیت کی

جس طرح وضاحت کی اور ملک کے سامنے اس کا تعارف کرایا مجھے یہ کہنے میں کوئی باک وتامل نہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے معاصر علماء ودانشور اور اصحاب فکر ونظر پر بھی فوقیت لے گئے، جب آپ ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد کی مکہ مسجد میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا تعارف کرانا شروع کیا تو حضرت قاری محمد طیبؒ نے فرمایا کہ قاضی صاحب کی اس فکر انگیز تقریر کے بعد تقریر کرنا گویا قاضی صاحب کی تقریر کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی شخصیت نے تقریر نہیں کی۔ بورڈ کے سامنے چاہے متبنی بل کا معاملہ ہو، جبری نسبندی کا، مسلم مطلقہ کے نفقہ کا مسئلہ ہو، یا یکساں سول کوٹ کے نفاذ کا، ہر محاذ پر آپ نے بورڈ کی ایسی ترجمانی کی جس سے مسلمانوں کا بھی وقار بلند ہوا اور سچ یہ ہے کہ آپ کی انہیں جلالت علمی، دینی بصیرت اور مدبرانہ فراست وعزیمت کی بنا پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارکان نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات کے بعد ۲۳؍اپریل ۲۰۰۰ء کو اتفاق رائے سے بورڈ کا صدر منتخب کیا، گرچہ آپ کا عہد صدارت بہت مختصر رہا۔ پھر بھی آپ نے اپنے دوسالہ عہد صدارت میں بورڈ کے اندر ایسی حرارت وتیزی لائی اور شریعت محمدی اور تشخص اسلامی کے تحفظ کے لئے جو عملی منصوبہ اور پروگرام بنائے اور برت کر دکھایا وہ آپ کی عظیم دینی خدمات کا نمایاں پہلو ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ فیصلہ اور کام کی راہ میں تکلف ومروت اور مراعات کو قطعاً حائل نہ ہونے دیتے تھے، جو شخص جس صلاحیت کا مالک ہوتا اس سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کام لے لیا کرتے تھے، اگر موت مہلت دیتی تو یقین تھا کہ وہ بورڈ کے درپیش بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل کر دیتے، لیکن ہر کمال کو زوال ہے، لازوال صرف خدا کی ذات ہے۔

ان تمام خصوصیات وامتیازات کے ساتھ حضرت قاضی صاحب کا اصل عملی میدان فقہ اسلامی کو بدلتے ہوئے حالات وزمانے پر منطبق کرنا درپیش آمدہ مسائل کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور فقہاء مجتہدین کے اجتہادات کی روشنی میں حل پیش کرنا تھا۔ اس کے لئے ۱۹۸۹ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد ڈالی اور جدید مسائل پر بحث وتمحیص کے لئے ملک

وبیرون ملک کے بلند پایہ فقہا، نامور علماء ومجتہدین اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب فکر ونظر اور نوجوانوں کو ایک جگہ جمع کر کے متعدد سیمینار کیئے۔ مقالات ومباحث اور مختلف آرا پر کھل کر بحث کی دعوت دی۔ آخر میں کسی ایک مسئلہ پر اتفاق کر کے ملت کو بہت سی دشواریوں سے بچایا، آپ نے اکیڈمی کے دائرہ کار کو وسعت دے کر بہت ہی عظیم علمی وفقہی کارنامے انجام دئے، ان میں سب سے اہم کام قدیم مخطوطہ ”**صنوان القضاء و عنوان الافتاء**“ کو ایڈٹ کرنا اور ”**الموسوعۃ الفقھیہ**“ کویت کا اردو ترجمہ کروانا علماء وفقہا کو استفادہ کا موقعہ فراہم کرنا ہے، اس کے علاوہ آپ نے کئی وقیع علمی وفقہی اور معاشرتی کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ خاص کر ایام علالت میں تو آپ کی رہائش گاہ ذاکر باغ، نئی دہلی علم وتحقیق کا مرکز بنا ہوا تھا۔ علماء وفضلاء مدارس قلم وکاغذ سنبھالے ہیں اور حضرت ہیں کہ وہ اپنے علم وکمال کا دریا بہا کر انہیں سیراب کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی علمی کارنامے انجام دئے یقین ہے کہ عنداللہ ان کے حق میں حجت ودلیل ثابت ہوں گے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت قاضی صاحب کی ہمہ جہت علمی شخصیت اور ان کے نام وکارناموں سے بہت پہلے سے متعارف تھا، مگر شناسائی وملاقات ۱۹۸۰ء میں اپنے آبائی وطن جمال پور دربھنگہ میں ہوئی۔

کہاں سے چھیڑوں میں اپنا قصہ یہ درد فرقت کی داستاں ہے
سناؤں بھی میں یہ قصہ غم اگر تو آخر کہاں سے پہلے

میں انہیں ٹکٹکی باندھے بہت دیر تک دیکھتا رہا، یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی ہیں جن کی میں اس قدر شہرت سن چکا ہوں، میانہ قد، سادہ کرتا وپائجامہ، بارعب چہرہ، عینک سے جھانکتی روشن اور ذہین آنکھیں، شہد سے زیادہ شیریں زبان، گفتگو اس قدر پرکشش کی ہر لفظ ناپ تول کر استعمال کر رہے ہیں جملوں کی بندایسی

کہ ان میں نہ کسی لفظ کے اضافے کی گنجائش اور نہ تخفیف کی ضرورت، بس وہ تقریر فرما رہے ہیں اور میں بے ساختہ ان کی طرف کھینچا چلا جا رہا ہوں، آج بھی ان کا وہ فکر انگیز خطاب میرے ذہن ودماغ پر نقش ہے انہوں نے فرمایا تھا کہ کوئی ملت اتحاد اور اجتماعیت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر جب ۱۹۹۲ء میں امارت شرعیہ سے وابستہ ہوا تو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا، متعدد اسفار میں رفیق سفر بھی بنا، آخری ملاقات ۱۰؍مارچ کو دہلی میں ہوئی، جس میں انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کو فعال بنانے کے سلسلے میں کئی مفید مشورے دئے، آخر کار وقت موعود آپہنچا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

آہ کتنی مشکل زندگی ہے؟
کس قدر آساں ہے موت

☆☆

فقیہ ملت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

● محمد وقار الدین لطیفی

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلامی قاسمیؒ آج ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کے روشن وتابناک کارنام تاریخ میں سنہرے حروف سے مرقوم رہیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت قاضی صاحبؒ اسم بامسمیٰ تھے۔ انہوں نے موقع اور وقت کی نزاکت کے لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کی بقاء وتحفظ کے لئے کبھی قلم کے ذریعہ تو کبھی زبان کے ذریعہ حتیٰ کہ ضرورت پڑی تو جسم وجان کے ذریعہ پوری زندگی جہاد ہی کرتے رہے اور ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے آپ کو اسی کام کے واسطے منتخب فرمایا تھا جبھی تو آپ ہمیشہ اپنے چھوٹوں سے فرمایا کرتے تھے کہ قوت مدافعت پیدا کرو اور یہ حوصلہ پیدا کرو کہ ''کرتے کرتے مرنا ہے اور مرتے مرتے کرنا ہے'' یہ اس مرد مجاہد کا جملہ ہے جو واقعتاً اسلام کا سچا مجاہد تھا اور یہ صرف ان کا قول ہی نہ تھا، بلکہ پوری زندگی انہوں نے اس کو کر کے بھی دکھایا۔

۱۹۹۸ء سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے، جبکہ ایک اچھا بھلا انسان کینسر کے نام ہی سے ظاہری طور پر مرجاتا ہے، لیکن یہ اسلام کا سچا اور پکا مجاہد ہمیشہ اپنے کاموں میں مصروف رہا، دیکھنے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ مہلک مرض کے شکار ہیں، جبکہ اسلام کے اس مرد مجاہد کے سامنے ہمہ وقت علماء وفقہاء کی جماعت کسب فیض میں مصروف رہتی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی کو خطوط کے جوابات لکھواتے تو کسی سے تصنیف وتالیف کا کام کرواتے تو کسی سے مصادر ومراجع تلاش کرواتے تو کسی مضمون کی اصلاح

فرماتے تو کسی قضیہ کا فیصلہ فرماتے اور ملکی وعالمی حالات پر تجزیہ وتبصرہ اور قوم وملت کی فلاح وبہبود کے مختلف پہلوؤں پر غور وخوض، غرض کہ بیک وقت متعدد کام انجام دیتے۔ شاید لوگ اس کو مبالغہ سمجھیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاضی صاحب کی زندگی کے معمولات کا جن لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قاضی صاحب کے سینہ میں ملت کی خاطر اللہ نے ایک دھڑکتا دل دیا تھا جو رات کی تنہائیوں میں امت کے لئے تڑپتا رہتا تھا اور اس کی کسک کو محسوس کرتا تھا، جس کی بنا پر ہمہ وقت وہ اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ اس قدر بیماری واعذاری کے باوجود ملک وملت کے کاموں کے سامنے کبھی تکان محسوس نہ کی اور تقریباً نصف سال سے برابر فرماتے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے کب بلاوا آجائے کوئی ٹھیک نہیں، اس لئے میری دیرینہ خواہش ہے کہ جلد سے جلد اپنی زندگی ہی میں ان کاموں کو ختم کردوں، لیکن قاضی صاحبؒ جیسی ہمہ جہت شخصیت کے پاس کام کہاں ختم ہونے والا تھا، ایک کام مکمل نہ ہوتا کہ بے شمار کام سامنے آجاتے، لیکن قاضی صاحبؒ کی دور اندیشی اور جرأت مندی تھی کہ کبھی کاموں سے خوف نہ کھاتے اور کوئی کام صبح آتا تو پہلی کوشش ہوتی کہ شام ہونے سے پہلے پہلے یہ کام مکمل ہوجائے، غرض کہ پورا وقت امت کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔

قاضی صاحبؒ بذات خود ایک انجمن تھے، ان کے نزدیک علماء وفضلاء کی مجلس جمی رہتی اور نت نئے مسائل کے استنباط واستخراج اور دیگر علمی مباحث پر گفتگو چلتی رہتی تھی۔ شرکائے مجلس پر حضرت قاضی صاحب کا ایک عجیب وغریب قسم کا علمی رعب طاری رہتا، حالانکہ قاضی صاحبؒ کی خصوصیت تھی کہ وہ کسی بھی مسئلہ میں ہر شخص کو اپنی رائے پیش کرنے کی پوری آزادی دیتے اور فرماتے کہ گھبراؤ نہیں بے خوف وخطر اپنی پوری بات پیش کرو۔

قاضی صاحب کی نمایاں خصوصیات میں ان کی جامعیت، مومنانہ فراست، ادارہ سازی، افراد سازی، اختلاف رائے قبول کرنے کی صلاحیت، انسانی خدمت کا جذبہ سیاسی

بصیرت، اتحاد امت کی فکر اور اس کے لئے تن من دھن کے ساتھ عملی اقدامات اور نظام قضاء کے نفاذ وقیام وغیرہ جیسے اہم امور کی خاطر آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ خواہ وہ امارت شرعیہ پٹنہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ یا ملی کونسل اور اسلامک فقہ اکیڈمی وغیرہ کے پلیٹ فارم سے ہوں وہ سب رہتی دنیا تک تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں موجود رہیں گے۔ انشاء اللہ

الغرض! حضرت قاضی صاحب ایک کامیاب مدرس، قاضی القضاۃ، قائد، مربی وسرپرست اور شفیقوں کے شفیق تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت قاضی صاحب کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے آمین ثم آمین۔

☆☆

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ایک فرد فرید تھے

● مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی
● مولانا سید سلمان الحسینی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کے سانحہ وفات پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقدہ تعزیتی جلسہ میں مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی نے اپنے واردات قلبی کو طلباء کے سامنے نہایت ہی دردوسوز کے ساتھ پیش کیا اور اپنا دل نکال کر رکھ دیا جس میں پیغام ہی پیغام تھا، انہوں نے کہا کہ آپ میں سے ہر ایک کے اندر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی چھپا ہوا ہے، شرط یہ ہے کہ وقت کی قدر جانتے ہوئے اپنے کو بنانے کی کوشش کیجئے وہ بھی آپ ہی کی طرح ایک طالب علم تھے جب وہ مئو کے مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کی نگاہ جوہر شناس نے اس طالب علم میں چھپے جوہر کو بھانپ لیا اور اپنی نگرانی اور تربیت میں امارت شرعیہ کے عہدہ قضا پر فائز کر کے اسے خوب صیقل کیا اور مہمیز لگایا، میں آپ سے بلاتردد کہہ سکتا ہوں اور مجھے ایک جلسہ میں یہ کہنے کا موقع بھی ملا کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں اگر اسلامی نظام قائم ہوتا تو بلا تامل قاضی صاحب ہی کو قاضی القضاۃ کا منصب عطا کیا جاتا، واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی طالب علمی کی زندگی سے لے کر تادم اخیر ویسے ہی خود کو گھلایا اور پگھلایا اور ملت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، مہتمم صاحب کا یہ جملہ کہ ”آپ کے اندر بھی قاضی مجاہد الاسلام چھپا ہوا ہے، آپ کے اندر بھی یہ جوہر موجود ہے“ حاصل مجلس تھا اور

ان کے دل میں طلباء کے تئیں پنہاں دردوسوز کی عکاسی کر رہا تھا۔

اس کے بعد مولانا سید سلمان الحسینی نے خطاب کیا، مولانا کی تقریر کیا تھی، اس میں عقیدت ومحبت کے پھول بھی تھے اور حقیقت پسندی کے شعلوں کی آنچ بھی، بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ حضرت مہتمم صاحب کے متن کی مولانا نے ایسی تشریح کی جس کی مدد سے قاضی صاحب کی ہشت پہلو زندگی پر ایک وقیع مقالہ سپرد قلم کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”**اذکروا محاسن موتاکم**“ اسلاف جب اپنے اسلاف کا تذکرہ کرتے ہیں تو کڑی سے کڑی جڑی رہتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے اور تسلسل باقی نہیں رہ پاتا، انہوں نے فرمایا کہ قاضی صاحب نے اپنی زندگی میں کئی ایک کارہائے نمایاں انجام دئے جنہیں دنیا فراموش نہیں کر سکے گی خصوصیت کے ساتھ۔

۱- امارت شرعیہ کی مسند قضا کی بیس سالہ خدمات اور اس کی وسعت وشہرت میں ان کا نمایاں کردار، امارت شرعیہ میں قاضی کے منصب پر بیٹھ کر قاضی صاحب نے زندگی کے تلخ حقائق وواقعات کو سنا اور ان کے مسائل کو حل کیا۔ اس چیز نے ان کے اندر جلا پیدا کر دی، قاضی کا یہ منصب اور اس کی ذمہ داری نبھانا کوئی آسان کام نہیں تھا، احمد امین نے قاضی کے منصب کو تج کر درس وتدریس کو پسند کیا تھا اور کہا تھا کہ ایک قاضی کو مسائل ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ مدرس کو ایسے غنچوں سے واسطہ پڑتا ہے جو چٹکنے اور پھول بننے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ قضا کا یہ عمل اتنا حساس ہے کہ اس کے متعلق کسی صاحب نظر نے یوں کہا ہے ”**من ولی الیہ قضاء فقد ذبح بغیر سکین**“ کو جسے قضاء کی ذمہ داری سونپی جائے گویا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔

۲- امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی خاطر اور باہم مل کر ایک صدا لگانے کی خاطر آل انڈیا ملی کونسل کا قیام جس میں قاضی صاحب نے اپنی توانائیاں صرف کر دیں اس کے لئے گھلتے اور کڑھتے رہے، شہر شہر اور قریہ قریہ دورے کئے۔

۳- مسلم پرسنل لا بورڈ جوملت اسلامیہ ہند کا واحد نمائندہ پلیٹ فارم ہے جس میں تمام مکاتب فکر اور ہر مسلک ومشرب کے افراد کی نمائندگی ہے، روز اول سے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبت سے لے کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دور تک اس تحریک کے سب سے کامیاب ترجمان حضرت قاضی صاحب تھے، آپ کو علوم اسلامیہ میں کامل درک حاصل تھا، مسائل فقہیہ میں دسترس، اردو عربی پر عبور کے ساتھ انگریزی سے بھی انہیں واقفیت تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ ذہن رسا عطا فرمایا تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نشستوں میں ابتداء مسئلہ کی تشریح اس طور پر کیا کرتے تھے کہ مسئلہ بالکل واضح اور مبرہن ہوکر سامنے آجاتا تھا، سامعین کے دلوگوں کو موہ لیتے تھے عوام تو عوام خواص کو میں نے سر دھنتے دیکھا۔

۴- چوتھی خدمت تھی میدان فقہ کی خدمت، فقہ جو آپ کا اصل میدان تھا اور جس کے آپ مرد میدان واقع ہوئے تھے، جس کے نتیجہ میں اسلامی فقہ اکیڈمی کا قیام آپ کے ہاتھوں عمل میں آیا، جو ہندوستان میں ایک نادر شئی ہے، جس کے تحت متعدد سیمینار منعقد ہوئے۔ بیرون ممالک امریکہ، یورپ، افریقہ اور انڈونیشیا کی فقہ اکیڈمیوں نے آپ کو اپنا رکن منتخب کیا اور آپ کی رائے ایک حیثیت اور وزن رکھتی تھی۔

آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے نہ صرف فقہی مسائل پر عبور حاصل کیا بلکہ دفعات ہند کا بھی بغور مطالعہ کیا، تا کہ اس کی جزئیات سے واقف ہوسکیں، بڑے بڑے وکلاء آپ کے ساتھ شاگرد کی طرح پیش آتے تھے، کورٹ میں بھی آپ کی رائے تسلیم کی جاتی تھی۔

بیس سال تک ٹاٹ اور چٹائی پر بیٹھ کر آپ نے جس طرح فقہ اسلامی کو کھنگالا اور چھاپا اور بہار جیسے صوبہ کے پیچیدہ مقدمات کو جس حسن وخوبی اور چشم بصیرت سے حل کیا، اسی محنت کا نتیجہ تھا کہ جس نے بعد میں ملت کو ایک عظیم اور ذہین وفطین قاضی عطا کیا، وقت

پڑنے پر جب قاضی صاحب اپنے اس جھونپڑے سے باہر آئے تو اس طرح آئے جیسے شیر کچھار سے باہر نکلتا ہے۔

یوں تو قاضی صاحب قاسمی تھے، لیکن حقیقت میں ندوی الفکر اور ندوی تھے، آپ ندوی فضلاء کو بے انتہا عزیز رکھتے تھے اور حضرت مولاناؒ سے طالب علمی ہی کے زمانہ سے آپ کا گہرا ربط رہا۔ آپ ہی کی دعوت پر حضرت مولانا نے طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں کے موضوع پر اپنا بیش قیمت خطبہ دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مجاہد الاسلام ایک فرد فرید تھے، جن کا کوئی ثانی نہیں دکھائی دیتا، لیکن آپ ہی میں سے بہت سے ایسے وجدانی ملکات کے حامل طلباء ہیں جن میں سے انشاء اللہ پیدا ہوں گے، آج امت کو قیادت کی ضرورت ہے، ملت کی فکر اصل ہے، تاریخ ساز بننے کی کوشش کیجئے، بس اس کی فکر کیجئے کہ جھنڈا اسلام کا سربلند رہے اور گرنے نہ پائے، مولانا مجاہد الاسلام صاحب کی زندگی کا پیغام یہی ہے۔

☆☆

نتیجۂ فکر

● محمد صبغت اللہ القاسمی

کونسل ملی سے پوچھا قاضی صاحب کیسے ہیں
رونے کی آواز آئی میں نے سمجھا کیسے ہیں

بیس دن سے کومہ میں تھے کچھ نہیں تھے بولتے
سانس باقی تھی بظاہر کچھ نہیں تھے بولتے

خیریت معلوم کرنے فون کرتا روز روز
تھا کہا جاتا طبیعت گر رہی ہے روز روز

اب دوا سے فائدہ کچھ ہے نظر آتا نہیں
کیجئے رب سے دعا اب کچھ نظر آتا نہیں

پانچ برسوں سے برابر مبتلائے مرض تھے
لاکھوں کے نورِ نظر تھے مبتلائے مرض تھے

جب پڑے بیمار تھے سب لوگ کہتے آج کل
مرض ہے یہ سخت جائیں گے چلے بس آج کل

مرض سے لڑتے رہے سب کام یہ کرتے رہے
ہے تعجب خیر سب عہدہ بھی یہ پاتے رہے

پہلے تھے قاضی شریعت پھر بنے نائب امیر
ہند کے مسلم پرسنل لا کے تھے یہ خود امیر

مرض کے ایام میں کرتے رہے تالیف بھی
موقع کو یہ دیکھ کر کرلیتے تھے تصنیف بھی

فقہ اسلامی میں ان کی جانکاری خوب تھی
شاہ ولی اللہ دہلی ان سے نسبت خوب تھی

عالم اسلام کے اندر تھا ان کا ایک مقام
کویت ہو یا ہو سعودی ان کا ہونا تھا قیام

علم ان کا جس قدر تھا عقل ان کی سو گنا
تھی ذہانت ان کی ایسی دوسروں سے سو گنا

وہ میرے استاد تھے میں ان کا ایک شاگرد ہوں
ان کو پایا سب سے اعلیٰ ان کا میں شاگرد ہوں

جامعہ میں پڑھ رہا تھا وہ پڑھانے آئے تھے
بات سن پچیس کی ہے جب وہ پڑھانے آئے تھے

جب پڑھانے آئے تھے کچھ لوگوں کو دھوکہ ہوا
کچھ یہ سمجھے آئے ہیں پڑھنے انہیں دھوکہ ہوا

کچھ دنوں کے اندر ان کی دھوم تھی ایسی مچی
لوگ حیرت میں پڑے تھے دھوم تھی ایسی مچی

مرے حضرت مرشدی (۱) ان پر بہت تھے مہرباں
مانتے تھے خوب اور بیحد تھے ان پر مہربان

مرشدی جب بن گئے شرعیہ امارت کے امیر
ان کو قاضی تھا بنایا حضرت ہوتے تھے امیر
تب سے یہ قاضی شریعت تھے کہے جاتے تمام
یہ ہوئے مشہور ایسے نام چلتا صبح وشام
ہائے بدبختی میری استاد میرے چل بسے
اب تو ہے سب آس ٹوٹا اب جہاں سے جا چکے
میرے مولیٰ تو ہی تو ہے ان کو دے ایسا مقام
ان کو اعلیٰ درجہ دے جنت بنے ان کا قیام
جمعہ کی شب کو گئے اپریل کی تاریخ چار
دو ہزاری دو تھا سن مجھ پر کریں لوگ اعتبار
راہی ہے اب رو رہا اللہ سے یہ کہہ رہا
صبر پائیں سارے اپنے ہوں میں ایسا کہہ رہا

☆☆

حضرت قاضی مجاہدؒ وقت کا ابن ہمام

● احمد میرٹھی قاسمی

تھے وحید دہر ویکتا اور فقیہوں کے امام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام
ان کے اٹھنے سے فقیہ العصر اک جاتا رہا
اک مربی اک محقق راہبر جاتا رہا
مستند جاتا رہا اک معتبر جاتا رہا
تاقیامت اپنی یادیں چھوڑ کر جاتا رہا
چھوڑ کر دنیا گیا ہے آج اک ماہ تمام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام
اک مجاہد اک خطیب خوش بیاں جاتا رہا
کرکے کتنے کارہائے جاوداں جاتا رہا
کر دیا آخر اجل نے آج قصہ ہی تمام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام
آپ کے جانے سے ساری رونقیں ہی اٹھ گئیں
سینکڑوں کی زندگی کی حسرتیں ہی اٹھ گئیں

قوم وملت کے لئے سب کوششیں ہی اٹھ گئیں
آپ سے مخصوص ساری حکمتیں ہی اٹھ گئیں
موت عالم موت عالم ہے یقیناً لا کلام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام

کیا عزائم کیا جوانمردی تھی کیسا ذوق تھا
واسطہ ملت کے کاموں سے مطالعہ شوق تھا
ہر گھڑی بس قوم کا غم مشغلہ تھا شوق تھا
حامی حق تھا وہ باطل کے گلے کا طوق تھا
صاحب فکر و نظر تھا واعظ شیریں کلام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام

ان کا کہنا ان کا سننا ان کا سب کچھ بولنا
ان کا کھانا ان کا پینا ان کا سونا جاگنا
ان کا چلنا ان کا پھرنا ان کا ہر دم سوچنا
ان کا آنا ان کا جانا ان کا اٹھنا بیٹھنا
قوم کی خاطر تھا ان کا ہر سفر ہر ہر قیام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام

مجتہد تھے منتسب تھے لائق تقلید تھے
بوالحسن کے بعد باطل کے لئے تہدید تھے
ظالموں کے روبرو مظلوم کی تائید تھے
تھی معظم شخصیت وہ قابل تمجید تھے

ذات پر تھے آپ ہی کی متفق سب خاص وعام
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام

علم میں ممتاز عزم و حوصلہ کا تاجدار
اک مفکر اک مدبر اک ادیب پائیدار
وادیاں سر کر گیا وہ کیسی کیسی خاردار
مرضی مولیٰ سے واقف تھا وہ رب کا راز دار
آہ احمد چل بسی وہ ہستی ذولا
حضرت قاضی مجاہد وقت کا ابن ہمام

☆☆

بوحنیفہ تیمیہؒ کا ترجمان جاتا رہا

● محمد واصف نفیس مظاہری

باغ افتاء اور قضاء کا باغباں جاتا رہا
بزم فقہ اکادمی کا روح رواں جاتا رہا

حضرت مدنیؒ کی شاگردی پہ جس کو ناز تھا
فکر منتؒ کا تھا جو سیل رواں جاتا رہا

علم وفن کا جو لٹاتا تھا گہر خاموش ہے
وافر سازی جس کی فطرت بیگماں جاتا رہا

آسماں معرفت، افتاء وقضاء گہنا گیا
بوحنفیہؒ وتیمیہؒ کا ترجماں جاتا رہا

محرم اسرار احق اور کاشف اسرار دیں
رہنمائے قوم وملت کا نشاں جاتا رہا

میں نے واصف راز یہ سب کو ہے بتلا دیا
رب کو وہ محبوب تھا سوئے جناں جاتا رہا

☆☆

شخصی تعارف

نام : (قاضی) مجاہد الاسلام قاسمی
والد کا نام : مولانا عبدالاحدؒ قاسمی (شاگرد رشید شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ)
تاریخ پیدائش : ۹/اکتوبر ۱۹۳۶ء
تعلیمی لیاقت : فاضل دارالعلوم دیوبند ۱۹۵۵ء
: ایم اے پنجاب یونیورسٹی

عہدے اور ذمہ داریاں:

۱- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
۲- بانی وسکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)
۳- چیف قاضی امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ
۴- سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل
۵- اکسپرٹ ممبر انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی، جدہ
۶- ممبر اسلامک فقہ اکیڈمی مکۃ المکرّمہ
۷- نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، جھارکھنڈ
۸- چیئرمین وفاق المدارس الاسلامیہ، بہار
۹- رکن اساسی شریعہ بورڈ آف الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن
۱۰- ممبر المجمع العلمی العالی دمشق، شام

۱۱- رکن اعزازی الہیۃ الخیریۃ الاسلامیہ العالمیۃ، کویت

۱۲- سکریٹری مولانا سجاد ہاسپٹل، امارت شرعیہ پھلوار شریف، پٹنہ

۱۳- ممبر گورننگ باڈی انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی

۱۴- بانی وصدر المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، پھلواری شریف، پٹنہ

۱۵- صدر مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ، پھلواری شریف

۱۶- چیف ایڈیٹر، سہ ماہی بحث ونظر، نئی دہلی

۱۷- سرپرست ماہنامہ ملی اتحاد، نئی دہلی

تصنیفات وتالیفات:

۱- الوقف	بیروت، لبنان سے شائع شدہ	(عربی)
۲- نظام القضاء فی الاسلام	بیروت سے شائع شدہ	(عربی)
۳- قضایا فقہیہ معاشرہ		(عربی)
۴- فقہ المشکلات		(عربی)
۵- الذبائع		(عربی)
۶- صنوان القضاء وعنوان الافتاء	چار ضخیم جلدیں کویت سے شائع شدہ	(عربی)
۷- دراسۃ فقہیہ		(عربی)
۸- دراسۃ علمیہ		(عربی)
۹- بحوث فقہیہ		(انگریزی)
۱۰- میڈیکل ایشوز		(انگریزی)
۱۱- اسلامی عدالت	پاکستان وہندوستان سے شائع	(اردو)
۱۲- مجلّہ فقہ اسلامی	جلد اول	(اردو)
۱۳- مجلّہ فقہ اسلامی	جلد دوم	(اردو)

۱۴- مجلّہ فقہ اسلامی	جلد سوم	(اردو)
۱۵- مجلّہ فقہ اسلامی	جلد چہارم	(اردو)
۱۶- مجلّہ فقہ اسلامی	جلد پنجم، دو حصے	(اردو)
۱۷- مجلّہ فقہ اسلامی	جلد ششم، دو حصے	(اردو)
۱۸- ضرورت وحاجت		(اردو)
۱۹- اشتراط فی النکاح		(اردو)
۲۰- طبی اخلاقیات		(اردو)
۲۱- خطبات بنگلور		(اردو)
۲۲- فتاویٰ امارت شرعیہ	جلد اول	(اردو)
۲۳- فتاویٰ امارت شرعیہ	جلد دوم	(اردو)
۲۴- کتاب العشر والزکوٰۃ		(اردو)
۲۵- کتاب الفسخ والتفریق		(اردو)
۲۶- اوقاف		(اردو)
۲۷- حج وعمرہ		(اردو)
۲۸- جدید تجارتی شکلیں		(اردو)
۲۹- ولایت نکاح		(اردو)
۳۰- بیع التقسیط		(اردو)
۳۱- شیئرز اور کمپنی		(اردو)
۳۲- مباحث فقہیہ		(اردو)
۳۳- آداب قضاء	زیر طباعت	(اردو)
۳۴- چیف ایڈیٹر ''بحث ونظر''		(اردو)

☆☆

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تاریخ
اور کارکردگی کے چند نمایاں پہلو

۱۹۵۶ء میں جب ہندو پرسنل لا میں تبدیلی کی گئی تو اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے اس بات کا اشارہ دیا تھا کہ ہندو قوانین میں جو اصلاح کی گئی ہے بہ تدریج اسی کو پورے ملک پر نافذ کیا جائے گا۔ یہ خطرہ کا الارم تھا جس نے اہل دانش کے کان کھڑے کر دئے، پھر جب یہ بات محسوس کی گئی کہ مسلمان قانون شریعت میں کسی تبدیلی کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو حکمت عملی بدل دی گئی اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ بالواسطہ قانون سازی (Indirect Legislation) اور متوازی قانون سازی (Parilal Leg) کے ذریعہ قانون شریعت کو اپنے دائرۂ عمل میں بے اثر کر دیا جائے۔ قانون شریعت کی تنسیخ کا یہ وہ راستہ ہے جو مشہور مستشرق مسٹر انڈرسن نے دکھایا تھا جن کو یورپ میں قانون شریعت محمدی کا بڑا ایکسپرڈ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کی کڑی ''متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء'' تھا، جسے ہندو قانون تبنیت ۱۹۵۱ء کی جگہ ملک کے تمام شہریوں کے لئے قابل نفاذ بنانے کی غرض سے پیش کیا گیا تھا اور اس وقت کے وزیر قانون مسٹر ایچ آر گوکھلے نے صاف کہا تھا کہ یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا مضبوط قدم ہے۔ پس ان حالات میں جب پورے ہندوستان میں شریعت محمدیہ کے وجود پر حملوں کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے وار مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کرنے کی گہری سازشیں رچی جا رہی تھیں، چنانچہ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' منعقد ہوا، اسی کنونشن نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بوڈ کی تشکیل کا فیصلہ

کیا اور اس طرح ۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔

اس سے کوئی بھی حقیقت پسند انکار نہیں کر سکتا کہ شریعت اسلامی کے خلاف جن شرمناک سازشوں کے تانے بانے بنے جا رہے تھے بورڈ نے علماء اور دانشوروں سے لے کر عام سے عام دیہات اور قریہ جات میں رہنے والے مسلمانوں تک کو اس سازش اور اس کی سنگینی سے باخبر کیا۔ اکثر مسلمان جو مسلم پرسنل لا کے نام سے بھی واقف نہیں تھے، نہ مسلم پرسنل لا کی شرعی اور تہذیبی اہمیت کو سمجھتے تھے ان کو اس مسئلہ کی حقیقت اور اہمیت سمجھائی۔ جو جدید تعلیم یافتہ مسلمان قانون شریعت کی معقولیت اور فطرت انسانی سے اس کی ہم آہنگی کے بارے میں آگاہ کیا گیا، جس سے احساس کمتری دور ہوا۔ قانون شریعت کے بارے میں مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور جو لوگ مخالفین کے اعتراض پر منہ چھپاتے تھے وہ ان مسائل کے سلسلے میں ایک راسخ العقیدہ وکیل اور ترجمان بن گئے۔ مسلمانوں کی رائے عامہ بیدار ہوئی، حقیقت پسند برادران وطن نے بھی اسلام کے عائلی قوانین کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس سے توازن واعتدال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی جماعتیں اور سیاسی قائدین جو یکساں سول کوڈ کی بات کہنا ایک فیشن سمجھتے تھے اور اپنے نام نہاد سیکولرزم کے اظہار کے لئے مسلم پرسنل لا میں تغیر کی باتیں کیا کرتے تھے، ان کا بھی انداز بیان بدلا اور وہ بھی اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ کی دہائی دینے لگے۔ بورڈ نے جو قانون شریعت کے بارے میں شعور کی بیداری اور فکر ونظر کی تبدیلی کا یہ کام کیا ہے، یہ بجائے خود ایک انقلابی کام ہے اور دراصل یہی چیز ہے جس نے مخالفتوں کے طوفان کو تھاما ہے اور عناد وعداوت کے سیل رواں پر بند باندھا ہے۔

متبنیٰ بل:

رائے عامہ کی ہمواری کے علاوہ بورڈ نے قانونی لڑائی کے محاذ پر بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور یہ کامیابی محض ہمارے اتحاد ویکجہتی کا مثر ہے۔ سب سے پہلے ہمیں متبنیٰ بل کے

سلسلے میں فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی۔ ہندو قانون میں ۱۹۵۶ء ہی سے متبنیٰ کا تصور موجود ہے۔ ۱۹۷۲ء میں متبنیٰ سے متعلق ایک نیا بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا جس کا مقصد ملک کے تمام شہریوں بشمول مسلمانوں پر اس قانون کا اطلاق تھا۔ گویا اصل میں اس بل کا نشانہ مسلمان ہی تھے۔ بظاہر یہی بل مسلم پرسنل لا کنونشن اور پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا باعث بنا کہ "**عسى ان تكرهو اشياء وهو خيرلكم**" بورڈ کی مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں حکومت مجبور ہوئی کہ پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی قائم کرے، آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کسی پارلیمانی کمیٹی میں اس کثرت سے علماء، قانون دانوں اور دانشوروں نے شہادتیں پیش نہیں کیں جو اس کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں۔ یہ بورڈ کی مساعی اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۷۸ء میں یہ بل واپس لے لیا۔ ۱۹۸۰ء میں دوبارہ کانگریس نے یہ بل پیش کیا، لیکن بورڈ کی کوششوں سے واضح الفاظ میں مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

نسبندی کا مسئلہ:

ابھی بورڈ کے قیام کو چند ہی سال کا عرصہ ہوا تھا کہ جون ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی اور ابتلاء وآزمائش کی ایک نازک گھڑی آ گئی۔ پورا ملک مہر بہ لب تھا، صحافت اور تحریر وتقریر کی آزادی مسلوب تھی۔ جبر و دباؤ کی اسی فضا میں جبری نسبندی کی کوشش ایوان حکومت سے شروع ہوئی، کوئی زبان نہ تھی جو اس جبر وظلم کے خلاف کھل سکے اور کوئی قلم نہ تھا جو اس غیر جمہوری اقدام کے خلاف جنبش کر سکے، بورڈ نے ان حالات میں نہایت جرأت مندی کے ساتھ لازمی نس بندی کے خلاف آواز اٹھائی، خوف وہراس کے ماحول میں بورڈ کی عاملہ کی میٹنگ ہوئی اور اس نے بے خوف وخطر شرعی موقف کا اعلان کیا۔ جب پریس ان تجاویز کو شائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا تو بورڈ نے اپنے طور پر اس فیصلہ کو شائع کیا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اسے پہنچایا۔ ۱۹۷۸ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے

مساجد ومقابر کو ایکوائر کرنے کے سلسلے میں ایک ایسا فیصلہ دیا جو نہایت سنگین نتائج کا حامل تھا، اس فیصلہ کے مطابق مساجد اور مقابر کی زمینوں کی ملکیت حکومت سلب کر سکتی تھی، بورڈ نے اس کے خلاف پورے ملک میں تحریک چلائی، ذمہ داران حکومت کے نام ٹیلی گرام بھجوائے، حکومت اور اپوزیشن کے لیڈروں سے نمائندگی اور اس کے نتیجہ میں یوپی اور راجستھان کی حکومتوں نے مساجد کو ایکوائر کرنے کے احکام واپس لے لئے۔

اوقاف پر انکم ٹیکس لگانے کا مسئلہ:

اوقاف کی آمدنی کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کرانے اور یا وقف ایکٹ بنوانے میں بھی بورڈ نے کامیاب کوششیں کی ہیں، جو نیا وقف قانون آیا ہے، گو غالباً اب بھی اس میں اسلامی نقطہ نظر اور وقف کے مفادات کے لحاظ سے بہت کچھ خامیاں موجود ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو قانون وقف پہلے سے موجود تھا اس کی بہت سی خامیاں دور ہوئی ہیں۔ اب ہمیں کوشش کرنی ہے کہ قانون وقف مکمل طور پر قانون شریعت سے ہم آہنگ ہو اور وقف کی حفاظت وصیانت کا معقول نظم اس میں ملحوظ رکھا گیا ہو۔ ملک کی کئی ریاستوں میں لازمی نکاح کا رجسٹریشن ایکٹ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بورڈ نے اس کی مخالفت کی اور رجسٹریشن کے لزوم کے شرعاً واجب نہ ہونے کی وضاحت کی اور یہ کوششیں بارآور ہوئیں۔

شاہ بانو کیس کا معاملہ:

اس موقع سے شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں بورڈ کی جرأت مندانہ اور حکیمانہ مہم ہندوستان میں تحفظ شریعت کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے، اس مہم نے ہندوستان کے کونے کونے میں ایک ایسی بیداری، جوش وخروش اور تحفظ شریعت کا عزم وحوصلہ پیدا کیا کہ ماضی قریب کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔ بالآخر پارلیمنٹ میں ایک غیر معمولی اجلاس میں جو رات کے آخری حصہ تک چلتا رہا'' قانون تحفظ

حقوق مسلم مطلقہ خواتین‘‘ منظور کیا اور محض امت اسلامیہ ہند کی وحدت اور عزم مصمم نے ان کو اس کامیابی سے ہمکنار کیا۔

بابری مسجد:

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کی تاریخ مسلمان کبھی بھلا نہ سکے گا۔ یہ قلب وجگر کا ایسا ناسور اور ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کا ایسا امتحان ہے کہ جب تک مسجد دوبارہ اپنی جگہ پر تعمیر نہ ہوجائے یہ زخم نہ مندمل ہوسکتا ہے اور نہ ہمارے ملک کو اس امتحان میں سند کامیابی حاصل ہوسکتی ہے، بابری مسجد کی شہادت کے اس حادثہ سے پہلے ہی بعض مفاد پرست عناصر اس تگ ودو میں لگے ہوئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی نام نہاد نمائندگی کرتے ہوئے مسجد سے دستبردار ہوجائیں حالانکہ بابری مسجد کے سلسلہ میں علاحدہ کمیٹیوں کی موجودگی کی وجہ سے بورڈ نے براہ راست اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا، لیکن صورت حال کو دیکھتے ہوئے ضروری محسوس کیا گیا کہ مسجد کی شرعی حیثیت کی وضاحت کردی جائے تاکہ لوگ اس مسئلہ کا استحصال کرنے نہ پائیں۔ چنانچہ ۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو بورڈ کی مجلس عاملہ نے دوٹوک انداز پر اپنا نقطہ نظر واضح کردیا کہ بابری مسجد قیامت کے لئے مسجد ہی ہے، نہ اس کو اپنی جگہ سے منتقل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے، بورڈ کے اس فیصلہ نے بابری مسجد سے متعلق کمیٹیوں کو ایک نیا حوصلہ دیا، تذبذب کی کیفیت دور ہوئی اور جو لوگ مسجد کا سودا کرنا چاہتے تھے، ان کی یہ مذموم سازش بھی ناکام ہوئی۔

مفید لٹریچر کی تیاری:

بورڈ نے اس عرصہ میں کئی مثبت کام بھی کئے ہیں۔ مستقبل میں ان کے دوررس نتائج سامنے آئیں گے، اس نے ’’مسلم پرسنل لا‘‘ سے متعلق نہیں مفید اور جامع رسائل مرتب کرائے، لاکھوں کی تعداد میں مختلف زبانوں میں ان کو شائع کیا اور مسلمانوں کے ہر طبقہ

تک بلکہ غیر مسلم دانشوروں تک بھی ان کو پہنچایا۔ خصوصیت سے امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے رسائل جو مسلم پرسنل لا اور خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ سے متعلق ہیں، اس موضوع پر مختصر ہونے کے باوجود نہایت بصیرت افروز رسائل ہیں۔

تدوین قانون اسلامی:

نہایت اہم اور قیمتی کام وہ ہے جو حضرت امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اپنی خاص نگرانی میں تدوین قانون اسلامی کا کرایا تھا، اس کام پر ممتاز اہل علم اور ارباب افتاء نے طویل عرصہ تک بڑی کاوشیں کی ہیں، پورے ملک میں اہل علم سے ان مسودات پر رائیں حاصل کی گئیں، بار بار خواندگی عمل میں آئی، ایک ایک لفظ پر غور کیا گیا، ہر مسئلہ پر مناقشے اور مباحثے ہوئے، پھر جاکر اس مسودہ کو آخری شکل دی گئی، یہ بورڈ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ جلد سے جلد اس کی اشاعت عمل میں آئے اور مختلف زبانوں میں اہل علم ودانش تک یہ علمی تحفہ پہنچایا جائے۔ انشاء اللہ اس کی اشاعت نہ صرف اسلامی قانون کو سمجھنے میں ممد ومعاون ہوگی بلکہ بہت سی غلط فہمیاں جو شریعت کی بابت پیدا ہیں ان کا بھی ازالہ ہوسکے گا۔

نظام قضا کا قیام:

نظام قضا کا قیام مسلمانوں کا ایک اہم ترین شرعی فریضہ ہے۔ قانون شریعت کی تنفیذ اور اس کے تحفظ کی عملی تدبیر اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتی کہ مسلمان اپنا نظام قضاء قائم کریں۔ اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے شروع ہی سے نظام قضاء کے قیام اور اس کے استحکام کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ اس کے لئے بہت فکر مند تھے۔ ان کی ایماء پر دار القضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے تربیت قضاء کا کیمپ لگایا۔ صوبہ بہار واڑیسہ کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے علماء

وارباب افتاء نے اس پروگرام میں شرکت کی اوراس کے نتیجہ میں بحمد للہ مختلف علاقوں میں نئے دارالقضاء قائم ہوئے ، پھر امارت شرعیہ کرناٹک کے تحت حضرت مولانا ابوالسعود صاحب امیر شریعت کرناٹک کے زیرنگرانی دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور میں قضاء کا دوسرا تربیتی کیمپ قائم ہوااور خاکسارکوان دونوں کیمپوں میں تربیت کی ذمہ داری انجام دینے کا شرف حاصل ہوا۔ بورڈ کے گیارہویں اجلاس جے پور میں نظام دارالقضاء کے قیام کی باضابطہ تجویز پاس ہوئی، جس پر ہمارا انگریزی صحافت نے بہت واویلا بھی کیا اور اسے ایک متوازی عدلیہ اورمتوازی حکومت سے تعبیر کیا اس فیصلہ نے بھی مفید اثرات ڈالے اور برہان پور(مدھیہ پردیش)،آسنسول، پرولیا(مغربی بنگال)لکھنؤ اور سیتاپور(یوپی) تھانہ، ممبئی، اکولہ اور دھولیہ وغیرہ میں دارالقضاء قائم ہوئے اور ارباب حل وعقد کے نمائندہ پلیٹ فارم کی حیثیت سے بورڈ نے ان مقامات پر نصب قاضی کا فریضہ انجام دیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ قضاء کے نظام کو پورے ملک میں جاری کیا جائے اور بورڈ کے تحت مختلف صوبوں اور علاقوں میں قضاء کے تربیتی کیمپ قائم کئے جائیں۔اس سے افرادسازی کا کام بھی ہوگا اورلوگ اس نظام کی ضرورت اوراہمیت کو بھی محسوس کرسکیں گے۔

اصلاح معاشرہ:4111

قانون شریعت کا تحفظ صرف اس بات سے نہیں ہوسکتا کہ ہم حکومت کومسلم پرسنل لا میں تغیر وتبدیلی سے روکنے کی کوشش کریں اوراس کی آئینی اور سیاسی لڑائی جاری رکھیں بلکہ شریعت کا تحفظ اس وقت ہوگا جب ہم اپنے آپ پر قانون شریعت کو نافذ کریں، ہماری زندگی احکام شریعت کے تابع ہو، ہماری تقریبات میں اللہ کی رضا وخوشنودی ہماری اور ہمارے بگڑے ہوئے سماج کی خواہشات پر غالب رکھی جائے اور ہمارا معاشرہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ ہوجس میں اسلام کو چلتی پھرتی صورتوں میں دیکھا جائے، جس میں تقویٰ

ہو، اللہ کی خشیت ہو، معروف اور حسنات کا غلبہ ہو، لوگوں کی عزت وآبرو محفوظ ہو، جس میں نکاح کے معنی نوجوانوں کی خرید وفروخت اوران کے وجود کی قیمت کے نہ ہوں، جہاں شرافت اورعفت وحیاء تلک وجہیز کی عفریت پر بھینٹ نہ چڑھائی پڑتی ہو، اگر ہم نے اپنے آپ پر قانون شریعت کو نافذ نہیں کیا اور اپنے معاشرہ کومسلمان نہیں بنایا تو ساری کوششیں خدانخواستہ اکارت ہوجائیں گی، محض احتجاج اورمزاحمت کے ذریعہ ہم شریعت کی حفاظت نہیں کرسکتے اورنہ اللہ کی نصرت اور مدد ہمارے حصہ میں آسکتی ہے۔

اسی مقصد کے تحت بورڈ نے اصلاح معاشرہ کی تحریک چلائی، پورے ملک میں اس عنوان سے جلسے کئے گئے، کانفرنسیں منعقد ہوئیں اس موضوع پر پمفلٹ شائع کئے گئے، بورڈ کی اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری مختلف جماعتوں اورتحریکوں نے اس مسئلہ کی اہمیت کومحسوس کیا اور بکثرت اصلاح معاشرہ کے ہفتے اورعشرے منائے، یہ سب بلاوجہ یابالواسطہ بورڈ کی تحریک اور مساعی کا حصہ ہے۔

۱۹۶۹ء میں نفاذ شریعت کا یہ کارواں مرتب ہوا تھا اور گزشتہ ۲۷ سال سے یہ اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہے، اس راہ میں آبلہ پائی کے مواقع بھی آئے ہیں اور وہاں بھی آپ نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس راہ میں ہماری بہت سی کوتاہیوں کے باوجود بہت سی کامیابیاں عطا کی ہیں، لیکن ابھی بہت سے کام ہیں جو ناتمام ہیں اور جن کے لئے ہمیں نسبتاً زیادہ سعی وکاوش کی ضرورت ہے۔ بہت سے قوانین ہیں جو بالواسطہ طور پر مسلم پرسنل لاکو متاثر کرتے ہیں، ان کا اصلاح کی کوشش کرنی ہے، بہت سے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں جن میں ہروقت اور مؤثر پیروی بہت ضروری ہے ورنہ سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مسلم پرسنل لا سے متعلق بہت سے جدید مسائل ہیں جن پر بدلتے ہوئے عرف اورسماجی اقدار کے پس منظر میں غور کرنا ہے اوران پر بحث وتحقیق کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں بورڈ کی ایک پرانی تجویز موجود ہے جواب تک تشنۂ عمل ہے۔ مسلم پرسنل لا سے متعلق انگریزی، ہندی

اور مقامی زبانوں میں ایسے لٹریچر کی شدید ضرورت ہے، جو عقلی نقطہ نظر سے اسلام کے معاشرتی احکام کی اہمیت، افادیت اور فطرت انسانی سے اس کی ہم آہنگی اور مطابقت کو واضح کرتی ہو، تا کہ سنجیدہ اور حقیقت پسند برادران وطن حقیقی صورت حال کو سمجھ سکیں اور پروپیگنڈوں سے دھوکہ نہ کھائیں۔ مغربی تہذیب کی یلغار نے ہمارے معاشرہ کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں، مغرب میں تو خاندانی نظام بکھر ہی چکا ہے، مغربی ثقافت کی آمد مشرقی معاشرہ میں بھی تیزی سے خاندانی نظام کے استحکام کو کمزور کر رہی ہے۔ خود ہمارے ملک میں فرقہ پرست عناصر اس بات کے لئے سرگرم ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کو اکثریتی معاشرہ میں جذب کر لیا اور آہستہ آہستہ ان کا تہذیبی تشخص ختم ہو کر رہ جائے۔ ان حالات میں اصلاح معاشرہ کی تحریک کو اور طاقت پہنچانے اور اس کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔

جو کچھ کامیابی آپ نے حاصل کی ہے اللہ کی مدد کے علاوہ اس کا ظاہری سبب ہمارا اتحاد واتفاق ہے۔ اتحاد اس بات کا نام نہیں کہ مختلف جماعتیں باقی نہیں رہیں، فکر ونظر کا اختلاف ختم ہو جائے، ہم سب کے طریقہ کار میں مکمل یکسانیت پیدا ہو جائے، تنظیمیں اپنے وجود کو ایک تنظیم میں ضم کر لے نہ ایسا اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ یہ اتحاد مطلوب ہے۔ ایک ایسی امت جس میں اجتہاد اور فکر ونظر کا راستہ کھلا رکھا گیا ہو اور ایک ایسا دین جو زندہ و پائندہ دین ہو اور تمام انقلابات اور تغیرات کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، ایسے اتحاد کا مطالبہ ہی نہیں کر سکتا ہے۔ اتحاد سے مراد یہ ہے کہ فکر ونظر کے اختلاف کے باوجود ہم مشترکہ کاز کے لئے ایک ہو جائیں اور ''بنیان مرصوص'' بن جائیں۔ ہمارے عمل سے دنیا کو یہ پیغام ملے کہ ہم بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف رائے کے باوجود متحد ہیں، ہمارے درمیان نقاط اتفاق بہ مقابلہ نقاط اختلاف کے بہت زیادہ ہیں، ہم دانائی اور سمجھداری کا ثبوت دیں تا کہ کوئی ہماری صفوں میں شگاف پیدا کرنے کا تصور بھی نہ کر سکے۔

☆☆

عائلی قوانین کا مجموعہ

تعارف اور پس منظر

● مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہ اسلامی وہ بہترین نظام قانون ہے، جس پر ڈیڑھ ہزار سال کی بہترین ذہانتیں خرچ ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کے اعتدال وتوازن، انسانی مسائل حل کرنے کی صلاحیت اور اس کے ساتھ ساتھ فقہاء کی دقت نظر، زمانہ آگہی اور کتاب وسنت سے احکام اخذ کرنے کا ملکہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کا مشرق ومغرب میں اعتراف کیا جاتا ہے، یہ قانون صرف فکر وفلسفہ نہیں، بلکہ ایک آزمودہ اور ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک زندگی کے تمام شعبوں میں عملاً جاری وساری رہنے والا قانون ہے۔ قرآن وحدیث اس کا اصل سرچشمہ ہے اور کتاب وسنت کے مقرر کئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ہر دور کی ضرورت اور ہر عہد کے تقاضوں کو اس میں سمو لیا گیا ہے، نہ وہ اتنا جامد ہے کہ زمانہ کی ضرورتوں سے آنکھیں بند رکھے اور نہ اتنا بے ثبات ہے کہ موم کی ناک کی طرح جیسے چاہیں ویسے موڑ لیں۔ جن احکام کی بابت اللہ اور اس کے رسول کی صراحت موجود ہے، ان میں نہ غور وفکر کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت، کیونکہ خدا سے بڑھ کر اپنی مخلوق کی ضروریات سے کون زیادہ آگاہ ہو سکتا ہے؟ لیکن بہت سے احکام وہ ہیں جن میں خود قرآن وحدیث نے لچک رکھی ہے تا کہ اللہ کی شریعت کبھی ناقابل برداشت بوجھ نہ بن جائے اور انسان اسے بارگراں تصور نہ کرنے لگے، اسی لئے رسول اللہؐ نے اس امت میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا۔ جو اس

امت کے لئے بہت بڑی اور نعمت رسولؐ پر ختم نبوت اور اس امت کے آخری امت ہونے کی دلیل ہے۔

فقہاء کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب وسنت کی ہدایت کو ایک مرتب اور منظّم نظام کی صورت میں امت کے سامنے پیش کیا اور اس طرح وہ عام لوگوں کے لئے قابل استفادہ اور سہل الوصول ہوگیا۔ ان میں بہت سی فقہی کتابیں وہ ہیں جو خاص طور پر عدالتوں کی سہولت کے لئے مرتب کی گئی ہیں اور حکومتوں کے ایماء پر ان کی ترتیب عمل میں آئی ہے، ہندوستان کو اس باب میں بڑا امتیاز حاصل رہا ہے، فتاویٰ ابراہیم شاہی، فتاوی فیروز شاہی، فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ عالمگیری اس نوعیت کی عظیم الشان اور نہایت ہی اہم اور جامع کتابیں ہیں اور یہ سب اس عہد کے حکمرانوں سے موسوم اور منسوب ہیں۔ فتاویٰ تاتارخانیہ کو علامہ عالم بن علاء دہلوی نے مرتب کرکے امیر تاتارخاں کی طرف منسوب کیا ہے اور محیط برہانی کو اصل بنا کر جزئیات کا جس قدر احاطہ اس کتاب میں ہے متداول اور دستیاب کتب میں شاید ہی ک وئی کتاب اس وصف میں اس کی ہمسر ہو، اب تک چھ ضخیم جلدیں اس کتاب کی آچکی ہیں اور سنا ہے کہ ۹ر جلدوں تک تحقیق کا کام بھی ہوچکا ہے اور ابھی بہت سارا حصہ باقی ہے، خدا کرے کہ یہ کتاب مکمل طبع ہوجائے اور اہل نظر کی آنکھوں کا سرمہ بنے۔

فتاویٰ عالمگیری (جس کو فتاویٰ ہندیہ بھی کہتے ہیں) کی ترتیب تو اکیڈمک طرز پر ہوئی ہے اور پورے ہندوستان سے علماء کی ایک بڑی جماعت نے اس کی ترتیب وتہذیب کا فریضہ انجام دیا ہے۔ خدا ترس بادشاہ اور ''سلطانی درویشی'' کے مصداق اورنگ زیب عالمگیر'' جو خود بھی باعث رشک تھا، نے اپنی خاص نگرانی میں اس کی ترتیب کا کام کرایا ہے۔ آج یہ فقہ حنفی کے نہایت اہم اور جامع مراجع میں سے ایک ہے۔

نیا دور سہولت وآسانی کا دور ہے۔ ان قدیم مراجع سے استفادہ میں نفع تو بہت

ہوتا ہے، تمام پہلوؤں پر نظر ہوجاتی ہے۔ مختلف اہل علم کے اقوال سامنے آجاتے ہیں اور ایک سے زیادہ مراجع سے رجوع کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن اس میں زیادہ محنت وذہانت اور قوت فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اب تن آسانی اور سہل نگاری کے اس دور میں یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ دفعہ وار قانون مرتب کردیا جاتا ہے۔ اصطلاحات اور حدود وقیود کو بھی تشریحی فقروں کے ذریعہ پورا کردیا جاتا ہے اور ایک ہی قول فیصل لکھا جاتا ہے تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو سہولت ہو۔ اسی پس منظر میں خلافت عثمانیہ ترکی نے ''مجلۃ الاحکام'' کے نام سے فقہ حنفی کے مطابق قوانین اسلامی کا ایک جامع مجموعہ مرتب کیا۔ چنانچہ آج کل اکثر مسلم ممالک میں تھوڑی ترمیم وتغیر کے ساتھ اسی مجلّہ سے شخصی احکام کے قوانین لئے گئے ہیں۔ اس کی کئی شرحیں ترکی اور عربی زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور مسلمانوں کے علاوہ بعض عیسائی قانون دانوں نے بھی اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

ہندوستان میں مسلم قوانین اور خاص کر مسلم پرسنل لا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مسلم عہد حکومت سے پہلے ہندو عہد میں بھی یہاں مسلمانوں پر ان ہی کے قوانین نافذ تھے اور ان قوانین کی تنفیذ کے لئے حکومت کی جانب سے ایک مسلمان قاضی ووالی مقرر ہوا کرتا تھا، جسے ''ہنرمند'' یا ''ہنرمن'' کہا کرتے تھے۔ ابن شہریار اور بعض دوسرے مسلمان سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں ہر قوم کا پرسنل لا محفوظ رہا اور مسلمانوں پر ان کی شریعت کا قانون نافذ کیا گیا، جب انگریز نے اس ملک پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی جاری رکھی۔ چنانچہ ۱۷۷۳ء میں وارن، ہسٹنگر نے اعلان کیا کہ تمام دیوانی معاملات میں مسلمانوں پر قرآن اور شریعت اسلامی نافذ رہے گی، اس اعلان کے مطابق مسلمان علماء کو قاضی مقرر کیا جاتا اور انہیں تنفیذی اختیارات دئے جاتے۔

لیکن یہ حکومت برطانیہ کے دل کی آواز نہیں تھی، بلکہ ایک سیاسی حکمت عملی تھی۔ اسی

حکمت عملی کے تحت انہوں نے فقہ اسلامی کو انگریزی زبان کا جامہ پہنانا شروع کیا۔ ہملٹن نے ہدایہ کا ترجمہ کیا جو ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ہدایہ کے ایک غیر معروف فارسی ترجمہ کا انگریزی ترجمہ ہے۔ سر ولیم جونز نے ۱۷۹۲ء میں سراجی کو انگریزی میں منتقل کیا اور شریفیہ کی مدد سے اس کی شرح لکھی۔ ۱۸۰۹ء میں مشکوٰۃ کا ترجمہ میتھیوز نے کیا، فتاویٰ عالمگیری کی تلخیص بیلی نے کی جو پہلی بار ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں میں مسلمان علماء جو فتاویٰ دیا کرتے تھے ''اصول ونظائر محمدی'' Principles and Precedents of Mohammaden law کے نام سے میکناٹن نے ۱۸۲۵ء میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس وقت قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کے لئے سیل اور پامر کے محرف ترجمے اور ریورینڈ وبیری کی معاندانہ تفسیر انگریز اہل علم کے لئے کل اثاثہ تھا۔

ان بالواسطہ ماٰخذ کی تیاری کے بعد ۱۸۳۳ء اور ۱۸۵۵ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے دو کمیشن مقرر ہوئے اور دونوں ہی نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان قاضیوں کے ذریعہ فیصلہ کے طریقے کو موقوف کر دیا جانا چاہئے یہ گویا مسلمانوں کے ذہن کو تیار کرنے کی ایک مرحلہ وار کوشش تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں ہائی کورٹ ایکٹ کے ذریعہ پرانی عدالتیں منسوخ ہوگئیں اور قاضی کا عہدہ ختم ہوگیا، یہ قانون شریعت پر سب سے بڑا حملہ اور اس کو غیر مؤثر اور غیر مفید بننے کی بالواسطہ کوشش تھی۔ مسلمان قاضی کا عہدہ ختم ہوجانے کی وجہ سے مسلم پرسنل لا کی حیثیت کو جو نقصان پہنچا وہ تو ظاہر ہے، کیونکہ بہت سے معاملات میں مسلمان قاضی کا فیصلہ ضروری ہے۔ غیر مسلم ججوں کا فیصلہ معتبر نہیں، لیکن علاوہ اس کے خود مسلم پرسنل لا کی ایسی تشریحات وتوضیحات کی گئیں اور خود ساختہ معانی پہنائے گئے کہ الامان والحفیظ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ جن حضرات نے قانون اسلامی کے ماخذ کو انگریزی میں منتقل کیا۔ وہ عربی زبان سے ناواقف، قانون اسلامی کے اصل سرچشموں سے نابلد اور شریعت کے مزاج

سے ناآشنا ہونے کے علاوہ اسلام کے بارے میں معاندانہ ذہن بھی رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں سے نہ غلطی کا ہونا باعث تعجب ہے اور نہ غلطی کا کرنا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ موجودہ عدالتی نظام میں اعلیٰ عدالت کا فیصلہ ماتحت کے عدالت کے لئے نظیر بن جاتا ہے۔ اب نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کسی عدالت نے کسی مسئلہ کو سمجھنے میں غلطی کی تو اب یہ غلطی خود قانون بن گئی۔ ان وجوہ سے مسلم پرسنل لا کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اسی پس منظر میں ایک کوشش پاکستان کے ایک ماہر قانون اور صاحب علم ڈاکٹر تنزیل الرحمان نے ''مجموعہ قوانین اسلام'' کے عنوان سے کی ہے۔ جو پانچ یا چھ جلدوں میں طبع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ مصنف کی گہری علمی بصیرت اور ظرف نگاہی کی آئینہ دار ہے، لیکن یہ ایک انفرادی کوشش ہے اور فقہی اختلافات پر گفتگو اور محاکمہ کرتے ہوئے ترجیحات قائم کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح کی تحریریں مسلمان ممالک میں تو موزوں ہوسکتی ہیں، لیکن غیر مسلم ممالک میں ایسے ماٰخذ سے اندیشہ ہے کہ مزید خلفشار پیدا ہوجائے اور عدالتوں کو شریعت اسلامی کے علم وشعور کے بغیر اختلافی مسائل میں خودرائی کی راہ نکل آئے۔ جو ظاہر ہے کہ نہایت ہی نامناسب بات ہوگی اور اسلامی قانون کی من چاہی تشریحات کا دروازہ کھل جائے گا۔

ہندوستان میں شاہ بانو کیس کے موقع سے شدت سے اہل علم کو اس کا احساس ہوا اور حضرت سید مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (صدر) اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس طرف خصوصی توجہ فرمائی کہ مسلم پرسنل لا کا ایک مستند مجموعہ علماء کے ذریعے تیار ہوجائے۔ اس کام کے لئے ابتداء ملک کے ممتاز اہل علم حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی قاضی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتی دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور حضرت مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کو امیر شریعت حضرت مولانا رحمانی نے جمع فرمایا اور اپنی خاص نگرانی میں اس کام کو کرایا۔ قانون کا جو حصہ

مرتب ہوتا گیا اسے پورے ملک کے مشہور اہل علما و اصحاب افتاء کے پاس نظر ثانی کے لئے بھیجا گیا اور وقتاً فوقتاً مختلف اہل علم اس کام میں شریک رہے اور زبان و بیان کو حسب ضرورت درست کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی۔ اس طرح ممتاز اہل علم کی مشترکہ مساعی، ملک بھر کے اصحاب علم و افتاء کے مشوروں اور متعدد بار نظر مکرر کے بعد اب یہ مجموعہ آخری شکل میں مرتب ہو چکا ہے اور کتابت وطباعت کے آخری مرحلہ میں ہے۔

یہ مجموعہ ''نکاح، طلاق، وخلع، فسخ وتفریق، ایلاء، ظہار، مبارأت، لعان، نفقہ، مضمانت، ولایت، میراث، وصیت، ہبہ اور وقف'' کے قوانین پر مشتمل ہے اور ہر دفعہ کے ساتھ اس دفعہ سے متعلق فقہی حوالے حاشیہ میں بالتفصیل درج کردئے گئے ہیں، اس طرح آزاد ہندوستان میں یہ کام نہیں بلکہ کارنامہ ہے اور قانون شریعت کی وضاحت اور حفاظت دونوں پہلوؤں سے ایک ایسا بے نظیر کام ہے، جسے انشاء اللہ ہماری تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، جن بزرگوں نے اس اہم کام کو انجام دیا ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بھرپور اجر عطا فرمائے اور اس کو ہندوستان میں قانون شریعت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ایک مفید اور مؤثر ذریعہ بنائے۔

☆☆

حضرت قاضی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر تاثرات

● ظفر جنکپوری قاسمی

اے مجاہد، عالم بے مثل، مردِ باکمال
تجھ کو بخشا تھا مشیت نے شعورِ لازوال

تیری ہستی تھی یقیناً، لائق صد افتخار
علم دین کا تھا منارا، حق نگر، روشن خیال

تو نے سلجھائے تھے گیسو، قوم کی تقدیر کے
تجھ کو بخشا تھا، مشیت نے عجب حسن کمال

دار فانی میں، تجھے اب ڈھونڈنے جائیں کہاں
اے مفکر، اے مدبر اے فقیہ بے مثال

تیرا غم، اہل زمیں پر ہی نہیں کچھ منحصر
اہل گردوں کو بھی ہے، تیرا بہت حزن وملال

ہجر میں تیرے ہیں ابنائے وطن سب اشکبار
اے مجاہدؒ، مرد بیباک وجری، روشن خیال

تیرے غم میں رو رہی ہے، ملک کی ہر رہ گزر
بھول جانا تجھ کو ہمدم ہے یہ اک امرِ محال

رو رہے ہیں، آج بیرون ممالک بھی تجھے
وہ کہاں پائیں گے اب تجھ سا خطیب بے مثال

تیری فرقت میں، عرب کی اور عجم کی سرزمیں
ہوگئی ہیں، اشک برساتی ہوئی، بے حد نڈھال

تیری تصنیفات سے، سب ہورہے ہیں فیضیاب
دے جزائے خیر اس کی، تجھ کو رب ذوالجلال

ہے ہمیں یہ فکر لاحق، تیرے اٹھ جانے کے بعد
ہو نہ جائے گلستاں بورڈ، تجھ بن پائمال

رحمت حق بڑھ کے لے، عقبٰی میں خود تیرے قدم
تیرا مسکن جنت الفردوس ہو بے قیل وقال

ہم نفس عقبٰی میں تجھ کو، وہ ظفر مندی ملے
دیکھ کر تجھ کو کہیں واں، خوش نصیب وخوش خصال

☆☆

مسلم پرسنل لاء بورڈ تاریخ کے آئینے میں

☆ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کے سلسلے میں پہلی میٹنگ مارچ ۱۹۷۲ء بمقام دارالعلوم دیوبند

☆ مسلم پرسنل لاء کنونشن ۲۷/۲۹؍ دسمبر ۱۹۷۲ء بمقام ممبئی۔

☆ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے دوسرے اجلاس میں بورڈ کی باضابطہ تشکیل ۷/۸؍ اپریل ۱۹۷۳ء کو بمقام حیدرآباد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بحیثیت صدر اور مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری منتخب۔

☆ مسلم مطلقہ کے لئے تاحیات یا تا نکاح ثانی سابق شوہر سے نفقہ سے متعلق نیا ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء سے متعلق بورڈ کے وفد نے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملاقات کی جس سے اس قانون میں کچھ ترمیم کی گئی۔

☆ جون ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کا نفاذ اور حکومت کی جانب سے جبری نسبندی کی مہم۔

☆ ۱۷/۱۸؍ اپریل ۱۹۷۶ء کو نسبندی کے خلاف دہلی میں بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس۔

☆ ۱۵/۱۶؍ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو تیسرے اجلاس رانچی میں حضرت مولانا قاری طیب صاحب دوبارہ بورڈ کے صدر منتخب۔

☆ ۲۳؍ مئی ۱۹۷۲ء کو راجیہ سبھا میں متبنیٰ بل پیش۔

☆ دسمبر ۱۹۷۲ء تا جولائی ۱۹۷۸ء مسلم پرسنل لا بورڈ کا متبنیٰ بل کے خلاف ملک گیر ایجی ٹیشن۔

☆ ۱۹؍ جولائی ۱۹۷۸ء کو جنتا پارٹی حکومت کے ذریعہ بل کی واپسی۔

☆ ۱۷؍ جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے پہلے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا انتقال۔

☆ ۲۸/دسمبر ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے سالانہ اجلاس مدراس میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کا بحیثیت صدر انتخاب۔

☆ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے مساجد ومقابر کو حکومت کے ذریعہ ایکوائر کرنے کا فیصلہ دیا۔

☆ بورڈ کے جنرل سکریٹری نے اس فیصلہ کے خلاف گشتی مراسلہ کے ذریعہ مسلمانوں کو اس فیصلہ سے آگاہ کیا اور اس کے خلاف حکومت کو ٹیلیگرام بھیجنے کی اپیل کی اور متعدد بار وزیراعظم سے ملاقاتیں کیں۔

☆ اس احتجاج کے نتیجے میں مسٹر رام نریش یادو اور مسٹر بھیرو سنگھ شیخاوت راجستھان نے لکھا کہ اس نوٹس کی اصلاح کی جارہی ہے اور سرکار کا مسجد کو ایکوائر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

☆ ۱۹۸۰ء میں کانگریس حکومت کی جانب سے متبنیٰ بل کو دوبارہ پارلیمنٹ میں لانے کی تجویز۔

☆ متبنی بل کے خلاف بورڈ کے ایک وفد کی مسز اندرا گاندھی سے ملاقات

☆ ۱۶/دسمبر ۱۹۰۸ء کو وزیرقانون مسٹر پی شیوشنکر کے ذریعہ متبنیٰ بل دوبارہ پارلیمنٹ میں پیش

☆ بورڈ کی زبردست جدوجہد کی وجہ سے بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

☆ اپریل ۱۹۸۰ء میں اوقاف کی آمدنی پر ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی گئی۔

☆ جنرل سکریٹری بورڈ مولانا منت اللہ رحمانی اور جناب یوسف نجم الدین صاحب نے وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ اندرا گاندھی نے اسی وقت وزیر مالیات مسٹر وینکٹ رمن کو فون کیا اور یہ مسئلہ حل ہوا۔

☆ ۱۹۸۴ء میں مرکزی حکومت نے راجیہ سبھا میں ایک بل پیش کیا تھا جس کی رو سے وقف بورڈ کی جمہوری حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔

☆ فوری طور پر بورڈ کے وفد نے وزیرقانون جگن ناتھ کوشل سے ملاقات کی۔ انہوں نے وفد کو یقین دہانی کرائی باوجود اس کے تین دن کے بعد وہ بل منظور کرالیا گیا۔

مجموعہ القاسم: جلد ششم — تیری عظمتوں کو سلام

☆ اس بل کے خلاف بورڈ نے صدر جمہوریہ اور وزیراعظم کو اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور بورڈ کی اپیل پر ہزاروں ٹیلیگرام بھجوائے گئے۔

☆ صدر جمہوریہ نے بھی اس بل پر دستخط کردیا۔

☆ بورڈ نے اس سلسلے میں ترمیمی بل پیش کیا۔

☆ ۲۳/جولائی ۱۹۸۵ء کو شاہ بانو کیس کا فیصلہ سپریم کورٹ نے دیا جو شریعت کے خلاف تھا۔

☆ ۳۰/جولائی ۱۹۸۵ء کو بورڈ کا ایک وفد وزیراعظم سے ملا۔

☆ ۲/فروری ۱۹۸۶ء کو صدر بورڈ مولانا علی میاں ندوی نے وزیراعظم سے ملاقات کی۔

☆ ۱۷/فروری ۱۹۸۶ء کو صدر بورڈ مولانا علی میاں ندوی اور جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی وزیراعظم سے ملے۔

☆ ۱۹/اور ۲۳/اپریل ۱۹۸۶ء کو پھر دونوں ذمہ داروں نے وزیراعظم سے ملاقات کی اور شرعی قانون اور اپنا موقف واضح کیا۔

☆ ۶/مئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ نے ''قانون حقوق مسلم مطلقہ'' ۱۹۸۶ء پاس کیا جو بورڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

☆ ۱۹۹۱ء کو جنرل سکریٹری بورڈ مولانا منت اللہ کا انتقال۔

☆ ان کے بعد مولانا سید نظام الدین جنرل سکریٹری منتخب۔

☆ دسمبر ۱۹۹۹ء کو صدر بورڈ مولانا علی میاں ندوی کا انتقال۔

☆ ۲۳/اپریل کو بحیثیت صدر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کا انتخاب۔

☆ ۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو قاضی صاحب کی رحلت۔

☆ ۲۳/جون کو مولانا رابع حسنی الندوی بورڈ کے صدر منتخب۔

☆☆

تھا وہ اپنی ذات میں یک انجمن

● محمد واصف نفیس مظاہری

تھا وہ اپنی ذات میں یک انجمن
فن میں یکتا اور اعلیٰ جیسے ہو در عدن
فقہ تفسیر و حدیث یا کوئی تحریر ہو
پیش کرسکتا نہیں ہے آپ کا ثانی وطن
آپ کا جانا مجاہد سب کے لئے سوہان روح
غمزدہ ماحول ہے اور سونا سونا ہے چمن
ملت بیضا کی رونق بالیقین معدوم ہے
”ملی کونسل“ اور ”امارت“ سے اٹھا اک اہل فن
فقہ کی ترویج کا اسلوب نو اس نے دیا
اس کی شمع دیکھ لو چاروں طرف ضوفگن
بانی فقہ اکیڈمی اور نازش اہل جہاں
حضرت منتؒ، نظام الدین کے دل بانکپن
وہ مفکر و مدبر ساغر عرفاں تھا
حامل قرآن وہ محبوب ذوالمنن
آپ یہ کہتے تھے واصف قرض تیرا رہ گیا
حوصلہ بے حد بڑھاتے تھے ہمارا بے سخن

☆☆

حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمہ اللہ
حیات و خدمات

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ

کامیاب مربی، مشہور فقیہ اور عظیم مصنف

● مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی

گزشتہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے کی بالکل ابتدا میں، میں ''مدرسہ مفتاح العلوم جامع مسجد شاہی مئو'' میں ابتدائی مکتب میں داخل ہوا تھا، اس وقت میرے اساتذہ میں پرائمری درجات کے ذمہ دار جناب منشی گدا حسین صاحب فاروقی اور ناظرۂ قرآن کریم کے استاذ قاری عبدالمنان صاحب تھے، بہت جلد چند سالوں میں یہ مرحلہ پورا ہوگیا، پھر عربی درجات میں تعلیم حاصل کرنے کی سعادت اس خاکسار کو حاصل ہوئی اور درجہ اوّل سے لے کر غالباً سال ششم جلالین ومشکوٰۃ اور ہدایہ کے درجہ تک کی ساری کتابیں ۱۹۴۸ء مطابق ۱۳۶۸ھ تک اپنے سبھی جلیل القدر اساتذہ سے پڑھ لیا تھا، ان میں عربی ادب کی کتابیں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نوراللہ مرقدہ اور درسیات کی جملہ کتابیں اپنے والد مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب اعظمی رحمہ اللہ، حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی رحمہ اللہ، حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی رحمہ اللہ، حضرت مولانا شمس الدین صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی عبدالباری صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ اور بعض دیگر اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ **فجزاھم اللہ خیراً کثیراً۔**

مفتی صاحب میرے استاذ میرے مربی:

غالباً سال دوم میں علامہ جرجانی کی کتاب ''شرح مائۃ عامل'' کے اسباق حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی رحمہ اللہ سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ غالباً ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا، بالکل اسی زمانہ میں مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاح العلوم سے سند فراغ لے چکے تھے اور محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا معاون مدرس کی حیثیت سے مفتاح العلوم میں تقرر فرمالیا تھا، الحمدللہ ان کے طریقہ تدریس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور ترکیب نحوی کی مشق کرنے اور اعراب کی صحت کا ادراک حاصل ہوا، مولانا مفتاحی نے بہت خوبی اور وضاحت کے ساتھ یہ کتاب ہم کو پڑھائی۔ **فجزاہ اللہ خیرًا کثیرا۔**

متعدد مدارس میں تعلیمی وتدریسی سرگرمیاں:

مولانا مفتاحی نے اپنا بیشتر تعلیمی سفر مفتاح العلوم میں پورا کیا، محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے جوہر کو اچھی طرح پہچان لیا تھا؛ اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص طور سے متوجہ رہے اور حضرت مولانا سے مفتی صاحب کا علمی اور تربیتی تعلق بہت مضبوط ہوا، اور اس شجر سایہ دار؛ بلکہ شجر طوبیٰ کے سایہ میں اپنی علمی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ہمہ تن مشغول ہوگئے، اور اہل علم کی صفوں میں ان کا شمار ہونے لگا، اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے استاذ ومربی علامہ اعظمی سے اجازت لے کر دو تین سال تک مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنوء میں تدریسی خدمت انجام دیں، ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر میں مدرس ہوئے اور عرصہ دراز تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، ایک سال ڈابھیل ضلع سورت کی جامعہ اسلامیہ میں تعلیمی خدمت انجام دی، لیکن وہاں کی آب وہوا اس نہ آنے کی وجہ سے پھر دارالعلوم سانحہ واپس تشریف لے گئے۔

مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مشورہ سے انھوں نے ۱۹۴۴ء ہی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، اور تقریباً چھ ماہ بحیثیت طالب علم، یہاں قیام کرسکے، اس دوران وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، مولانا محمد اسحاق ندوی اور مولانا حمید الدین جیسے اساتذہ سے استفادہ کیا اور حضرت مولانا اویس ندوی نگرامیؒ کے مشورہ سے ان کے قصبہ نگرام کے ''مدرسہ معدن العلوم'' میں مدرس ہوگئے، اور ایک اچھا تعلیمی اور تربیتی وقت گذارنے کا وہاں موقع ملا۔

دارالعلوم دیوبند میں علمی مشغولیت:

۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تصنیف وتالیف سے منسلک ہوکر کئی کتابیں تصنیف کیں، ان میں اسلام کا نظام مساجد، نظام عفت وعصمت خاص طور سے قابل ذکر ہے، ۷ سال تک اس شعبہ سے متعلق رہنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے مرتب مقرر ہوئے اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب نو کا بیڑہ اٹھایا۔ ۲۱ جلدوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی کے فتاویٰ کی تدوین کی اور یہ فتاویٰ شائع ہوئے، مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے مختلف علمی اور تدریبی شعبوں کی سرپرستی کی اور اس کے ذریعہ سے بہت سے ذہین اور ہونہار طلباء کے اندر علمی اور تفسیری مطالعہ کا شوق پیدا کیا، اور انھوں نے ان کی بہترین رہنمائی میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا، دارالعلوم کے بہت سے شعبوں کو اپنی صلاحیتوں سے مالامال کیا، دارالافتاء میں مفتی کا منصب آپ کو عطا کیا گیا، رسالہ ''دارالعلوم'' میں اداریہ لکھنے کے فرائض بھی آپ نے انجام دیے، اور ۱۴۲۹ھ میں دارالعلوم کے ساتھ سبکدوشی کی درخواست کی، اور اپنے وطن عزیز میں قیام فرمایا۔

مفتی صاحب مرحوم نے ہر اعتبار سے ایک کامیاب استاذ، انشاء پرداز اور افتاء میں مہارت کے ساتھ ساتھ جملہ دینی اور اخلاقی صفات کے ساتھ زندگی گذاری، وہ تعلیم و

تربیت کے فن سے نہ صرف واقف تھے؛ بلکہ وہ اس فن سے پوری طرح مسلح تھے اور حدیث وفقہ کی کتابوں کو درجات علیا میں پڑھانے کی استعداد کامل رکھتے تھے۔

مفتی صاحب کے قابل صد افتخار اساتذہ:

مفتی صاحب کے اساتذۂ کرام میں سرفہرست محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ علیہ، جن کے زیر تربیت رہ کر مفتی حاصل نے عالمانہ زندگی کا درس حاصل کیا، مطالعہ کی گہرائی، مسائل میں باریک بینی، ائمہ اسلام کی حیات وخدمات کا مطالعہ، علم دین کی اہمیت کے ساتھ حسنات دنیا سے پوری واقفیت، یہ ساری چیزیں حضرت محدث جلیل کی تربیت میں رہ کر ان کو سیکھنے کا خوب موقع ملا، ان کے دیگر اساتذہ کرام میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ جیسی نادرۂ روزگار ہستیاں شمار کی جاتی ہیں۔

برادر مکرم حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب سے بے تکلفانہ مراسم:

دوران قیام دارالعلوم دیوبند مفتی صاحب مرحوم کا محبانہ تعلق ہمارے برادر اکبر حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمیؒ سے بہت بے تکلفانہ تھا، اکثر یہ حضرات مجلسوں کی زینت بنتے تھے اور اپنے علم وآگہی سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، اور صدق دلی کے ساتھ یہ دونوں حضرات اخیر تک ایک دوسرے سے برادرانہ اور محبانہ تعلق میں مشہور رہے، حکیم صاحب مرحوم اپنی چائے کی مجلسوں میں اکثر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دیتے اور شرکت کرنے کی درخواست کرتے تھے، مفتی صاحب انتہائی خوشی اور انبساط کے ساتھ تشریف لاتے، اور جب تک وقت ساتھ دیتا علمی،

دینی اور ادبی معلومات میں تبادلہ خیال کرتے اور زندہ دلی اور فوائد علمیہ کی ایک بہتر فضا قائم کر کے ایک دوسرے سے جدا ہوا کرتے تھے، مختلف مواقع پر حکیم صاحب مرحوم مفتی صاحب کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے اور وہیں ایک لطیف اور مفید مجلس منعقد ہو جایا کرتی تھی، بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے کا احترام واعتماد مجلس کی زینت میں اضافہ کا باعث بنتا تھا اور جملہ اہل تعلق اس سے مستفید ہوتے تھے۔

مفتی صاحب نے تاحیات اپنے بنیادی ادارے مفتاح العلوم مئو سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا، حضرت محدث جلیل کے مشورہ سے وہاں کی تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے، جب بھی کوئی اہم موقع ہوتا، مفتی صاحب وہاں بلائے جاتے تھے، مفتاح العلوم کے ایک عظیم جلسہ تقسیم اسناد میں جو غالباً ۱۹۵۳ء میں جامع مسجد کے وسیع میدان میں ہوا، مفتی صاحب نے جلسہ کے تنظیمی امور میں خاطر خواہ حصہ لیا اور اپنے استاذ ومربی حضرت محدث اعظمی کی ہدایات کے مطابق وہاں کی سرگرمیوں میں مشغول رہے، مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد جہاں کہیں بھی تعلیمی اور تربیتی اعتبار سے قیام کیا، برابر محدث اعظمی سے رابطہ رکھا، اور ان کی ہدایات کے مطابق کام کیا، ان کی وفاداری کا حال یہ تھا کہ جب بھی وہ اپنے وطن جاتے یا وہاں سے واپس ہوتے مربی جلیل اور اساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے مئو میں بریک جرنی (Journey Breake) کرتے، یا مزید کچھ وقت گذارنے کے بعد اپنے وطن واپس جاتے، محدث اعظمی سے اپنے خاص الخاص تعلق کی بنا پر ان سے تعلق رکھنے والے ہر فرد سے اور ان کے خاندان کے جملہ افراد سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کی صدارت:

دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران وہاں کے دارالافتاء میں مفتی دارالعلوم کے منصب پر فائز ہوئے تو اسلامی فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ذمہ داروں نے ان سے درخواست

کی کہ اس اکیڈمی کے رئیس کا منصب قبول فرما کر اپنی ہدایات اور مشوروں سے اس کے لیے ترقی کی راہ عمل تجویز فرمائیں، اور اپنی تجاویز سے ارکان اکیڈمی کو مستفید فرمائیں، الحمدللہ انھوں نے اس پیش کش کو قبول فرما لیا اور تاحیات اکیڈمی کے منصب صدارت پر فائز رہے، اکیڈمی کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں اور سیمینار کے انعقاد کے سکریٹری حضرت مولانا عبیداللہ الاسعدی ہیں، جب تک صحت نے ساتھ دیا، مفتی صاحب نے سیمیناروں میں شرکت فرمائی اور اپنی نگارشات اور تقریروں سے فقہ اسلامی کی روشنی میں مسائل جدیدہ کا حل تلاش کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اہم ترین ارکان میں تھے، اور فقیہانہ بلندی سے مسائل اور بورڈ کے سیمیناروں اور اجلاس کے ایجنڈے پر غور کر کے اپنی رائے دیا کرتے تھے اور بورڈ کے سبھی جلسوں میں شرکت فرماتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی تیاری میں مفتی صاحب کی سرگرمی:

مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندویؒ نے ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن منعقد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور مجلس انتظامی نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تو ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود مخطوطات کا تعارف لکھنے کے لیے حضرت مولانا کی نظر انتخاب مفتی صاحب مرحوم پر پڑی، اور دارالعلوم کے ذمہ داروں سے خط و کتابت کرنے کے بعد ان کو کم از کم دو مہینے تک ندوہ میں قیام کرنے کے لیے بلا لیا، اس موقع پر مفتی صاحب سے جب میں ملا تو انھوں نے بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ سعید الرحمٰن! میں اب تمہارا مہمان ہوں، میں نے عرض کیا: میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے؛ چنانچہ ندوہ کے دوران قیام اور پچاسی سالہ اجلاس کی تیاریوں کی مشغولیت کی بنا پر بہت زیادہ خدمت کا موقع نہ مل سکا، مختلف مواقع سے دارالعلوم سے باہر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلنے کی درخواست کیا کرتا

تھا؛ تا کہ وہاں دوپہر کا کھانا نوش فرمائیں اور کھانے کے بعد عصر تک آرام فرمائیں، الحمدللہ اس طرح کے مواقع اُن اوقات میں بھی پیش آتے، جب وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ یا اجلاس کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء، دیگر ارکان اور علماء کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے، کئی اہم حضرات سے وہ اپنی خاص شفقت کے ساتھ میرا تعارف کراتے اور انتہائی شفقت کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ سعید الرحمٰن میرے شاگرد ہیں، مجھے بہت خوشی ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ میں مفتی صاحب کے قدموں میں رہ کر زندگی گذاروں۔

احقر پر مفتی صاحب کی شفقت:

اجلاس ندوۃ العلماء کے دوران قیام، مفتی صاحب کو یہاں کی آب و ہوا اور کھانا موافق نہیں آتا تھا، ہم نے گذارش کی کہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے گھر کا پکا ہوا روکھا سوکھا کھانا آپ کی خدمت میں لایا کروں، لیکن انھوں نے مجھے اس کی مستقل اجازت نہیں دی؛ اس لیے مواقع کے انتظار میں رہا کرتا تھا؛ تا کہ مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع ملے، انھوں نے مجھے ہر موقع پر بہت دعائیں دیں اور ان کی دعاؤں سے مجھے فائدہ پہنچا، مجھے یاد ہے کہ کئی بار مفتی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ طلباء کے داخلہ کے سلسلے میں مجھے خط لکھا اور میں نے اس کی تعمیل کرنے کی پوری کوشش کی، ندوہ کے تمام ذمہ دار حضرات اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مفتی صاحب کا بہت احترام اور خاص خیال فرماتے تھے۔ کسی موقع سے جب یہاں تشریف لاتے تو ان کے قیام وطعام کا خاص اہتمام فرمانے کا حکم فرماتے اور اکثر مجھ سے فرماتے کہ دیکھو! مفتی صاحب کا خیال رکھنا۔

مفتی صاحب کے صاحبزادگان:

مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب احمد سجاد قاسمی صاحب اپنے وطن کے قرب وجوار میں کسی ہائی اسکول میں استاذ ہیں، دوسرے صاحبزادے جناب حماد میاں

صاحب جامعہ رحمانی مونگیر سے فارغ ہوئے اور تیسرے صاحبزادے جناب عباد میاں صاحب مفتی صاحب کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں حفظ کیا۔

مفتی صاحب کے خط کا ایک حصہ جو انھوں نے ۱۳۹۲ھ یعنی آج سے چالیس سال پہلے برادر مکرم حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی کی خدمت میں بھیجا تھا، اس کا ایک حصہ نقل کرنا یہاں مفید ہوگا؛ اس لیے ان کی کتاب ''پس مرگ زندہ'' سے مفتی صاحب کے خط کا یہ ٹکڑا نقل کیا جارہا ہے۔

''عزیزم احمد سجاد سلّمہٗ فراغت کے بعد گھر گئے تھے، ابھی شوال میں ان کو ''سانحہ'' بھیج کر آیا ہوں، وہاں وہ میٹرک کی تیاری میں ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب فرمائے اور میاں حماد سلّمہٗ کو جامعہ رحمانی مونگیر بھجوادیا ہے؛ اس لیے کہ سانحہ سے قریب ہے، میاں احمد سجاد اس کی نگرانی بھی کریں گے؛ البتہ عباد سلّمہٗ کو اپنے ساتھ لایا، وہ یہاں حفظ کررہے ہیں۔

مولانا علی میاں مدظلہ، مولانا سعید الرحمٰن سلّمہٗ اور مولانا شمس تبریز سے سلام مسنون عرض ہے، اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں، میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے، اس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالب علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ناظم صاحب اور مولانا اسحاق صاحب دامت برکاتہم، یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گو ندوہ والے یہ نہیں جانتے''

طالب دعا

محمد ظفیر الدین، دارالعلوم دیوبند

شب ۶ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ''

سانحہ وفات:

۲۵/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۳۱/مارچ ۲۰۱۱ء ۸۵ سال اور ۲۵ دن اس دار فانی میں اپنے علم وتقویٰ اور تواضع، وسعت نظر اور بلندی فکر کی ایک مثال قائم کرکے راہیِ

دار آخرت ہوئے اور علمی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا کرگئے جو مشکل سے پر ہوتا ہے، اور علم وعمل کی دنیا میں اس کو ایک بڑے نقصان سے تعبیر کیا جاتا ہے:

مت سہل ہمیں سمجھو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے درجات بہت بلند فرمائیں، انھوں نے علم وعمل کی جامعیت کے ساتھ اللہ کے دین اور اس کی شریعت اور کتاب وسنت کے علم کو پھیلانے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی جو سعی بلیغ کی ہے، اللہ اس کو قبول فرمائیں اور دار آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور جنت الفردوس کی بہاروں سے پوری طرح سرفراز فرمائیں۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا شاید مناسب ہو کہ مفتی صاحب کے مفتاح العلوم مئو کے زمانہ تعلیم میں حضرت محدث جلیل شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے، اور حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی علوم اسلامیہ کے درجات علیا میں استاذ ومربی تھے، اور میرے والد ماجد حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی مفتاح العلوم کے ناظم اور علوم دینیہ وعقلیہ کے استاذ تھے اور دیگر بڑے اساتذۂ کرام کا ذکر اس مقالہ میں واضح طریقہ سے آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرماکر جنت الفردوس کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں، آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وآصحابہ آجمعین۔

☆☆

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ

چراغ باد صبا نے بجھائے ہیں کیا کیا

● نسیم اختر شاہ قیصر

اب کہاں واصفؔ ملیں گی وہ گذشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سربسر خوابِ پریشاں ہوگئیں

میری خوش قسمتی یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں کچھ ایسے لوگوں اور افراد کو دیکھنے کا موقع ملا جو اپنی نظیر آپ تھے۔ اور یہ صرف ایک فرد کی بات نہیں بلکہ جماعت کی جماعت ایسی تھی جسے اللہ نے خصوصی کمالات اور امتیازات سے نوازا تھا ہر زاویہ سے ان کی زندگی قابل رشک تھی علم وفضل، کردار وعمل، حسن اخلاق، حسن سلوک، رواداری ومروّت جن کے خمیر میں پڑی ہوئی تھی اور یہ لوگ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن کے یہاں دوسروں کے کام آنا، معاون بننا اور دکھ درد میں شریک ہونا اوّلین فریضہ کی حیثیت رکھتا تھا تصنع وبناوٹ سے یہ لوگ کوسوں دور تھے اور کسی کو نقصان پہنچانے کا کوئی جذبہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ شرافت، انسانیت اور آدمیت نے ان کے گرد اس طرح بسیرا کیا تھا کہ ان کا نفس انھیں کسی ایسی بات اور عمل پر نہیں ابھارتا تھا جو کسی کی تکلیف یا معمولی اذیت کا سبب بنے، سب اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کرتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی ان کی یہی خواہش رہتی تھی۔ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنی ذات پر دوسروں کو فوقیت دیتے تھے اور خاموشی ویکسوئی کے ساتھ کاموں

میں مشغول رہتے تھے۔ میری عمر اس وقت تقریباً چار پانچ سال رہی ہوگی جب مفتی صاحب دارالعلوم میں آئے ہوں گے یا شاید اس سے بھی چند سال پہلے۔ اور اسی وقت سے انہیں دیکھنے، سننے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملنے لگا۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں ملازم ہوکر آئے تو ان کی ملازمت کے سلسلے میں والد مرحوم مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی دلچسپی اور کوشش شامل تھی۔ دارالعلوم دیوبند کو اس وقت ترتیب کتب خانہ کے لیے کسی عالم اور مستعد آدمی کی ضرورت تھی جس کی جانب حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو والد مرحوم نے توجہ دلائی اور حکیم الاسلامؒ نے مفتی صاحب مرحوم کی صلاحیت، قابلیت اور کمال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو دارالعلوم دیوبند میں آنے کے لیے کہا اور وہ باقاعدہ دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔

ان کے دیوبند پہنچنے سے پہلے ہی رسالہ دارالعلوم دیوبند میں ان کے مضامین ومقالات شائع ہوتے رہتے تھے اور یہی والد مرحوم سے ان کے تعلق کی بنیاد تھی، پہلے اور پھر بعد کے ملازمت کے عرصے میں ان کے لاتعداد مضامین اور مقالات اور کتابوں وغیرہ پر تبصرے خوب شائع ہوئے اور ایک زمانہ وہ آیا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کا اداریہ بھی لکھنے پر مامور ہوئے اور سترہ سال تک وہ والد مرحوم کی ادارت کے زمانہ میں اداریے سپردِ قلم کرتے رہے۔ اس طرح ان کا والد مرحوم اور میرے خاندان سے ابتدا سے ہی ایک مضبوط اور گہرا تعلق قائم ہوگیا وہ پابندی کے ساتھ رسالہ دارالعلوم کے دفتر میں آتے اور کافی وقت وہاں گزارتے پھر یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے ان کی آمد گھر تک ہوگئی اور گھر بھی وہ عصر کے بعد آتے اور اکثر مغرب اور عشاء کی نمازیں وہیں ادا فرماتے۔ ان کے ساتھ تشریف لانے والے لوگوں میں حضرت الاستاذ مولانا محمد حسین بہاریؒ مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمیؒ مولانا سید محبوب رضویؒ مولانا مفتی شکیل قاسمی سیتاپوریؒ وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ حضرات مغرب کی نماز پڑھ کر رخصت ہوجاتے کچھ عشاء کی نماز ادا کر کے چلے جاتے تنہا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ تھے جو بعد نماز عشاء کئی گھنٹے ٹھہرتے اور ان کی گفتگو جاری رہتی مفتی

صاحبؒ کواللہ نے بڑی صلاحیت کا مالک بنایا تھااوران کا مطالعہ نہایت وسیع تھامشکل سے مشکل موضوعات پر وہ لکھنے کے عادی تھےاور جو کچھ لکھتے پوری تحقیق کے بعد لکھتے۔موضوع کے اعتبار سے مضامین کافی طویل اور پھیلے ہوئے ہوتے جو بسا اوقات کئی کئی قسطوں میں شائع ہوتے اسی زمانے میں مختلف موضوعات اور شخصیات پر منعقد ہونے والے سمیناروں میں بحیثیت مقالہ نگاران کی شرکت لازمی تھی گو وہ زمانہ زیادہ سمیناروں کا نہیں تھا،مگرامیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ مختلف عنوانات کے تحت مفتی صاحب مرحوم سے کام لیتے اوران کے کام پر اطمینان کا اظہار فرماتے۔امارتِ شرعیہ بہاراور مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ان سے انتہائی نازک اورحساس مسائل پر بہت سی چیزیں لکھوائیں اورمفتی صاحبؒ نے انھیں شرح وبسط کے ساتھ لکھا۔

مفتی صاحبؒ کا اپنا ایک اسلوب تھا جو سادگی سے عبارت تھا،مگران کی تحریریں رواں ہوتی تھیں۔کہیں الجھاؤاور پیچیدگی نہیں۔اپنی بات نہایت خوبی اور سلیقے کے ساتھ ادا کرتے تھے۔زمانہ طالب علمی میں ہی ندوۃ المصنّفین دہلی سے شائع ہونے والی سیرت پران کی ایک کتاب پڑھنے کا موقع ملا جس میں مفتی صاحبؒ کا رنگ ہی دیگر ہے۔نہایت شگفتہ اور شاداب تحریر خالص ادبی رنگ لیے ہوئے،مگر ساتھ ساتھ صحت واقعات کا بھرپور اہتمام۔کتاب پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ مفتی صاحبؒ کے قلم کا شاہکار ہے۔ہر جملے سے ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت،محبت،تعلق،دلی وروحانی وابستگی کا ایسا نقش ابھرتا ہے کہ مفتی صاحبؒ اپنے تمام تحریروں کے مقابلے میں اس مقام پر الگ کھڑے دکھائی دیتے ہیں یہ کتاب انھوں نے پورے جذبے کے ساتھ لکھی کافی کتابیں ان کی بازار میں آئیں اوراہل علم کے یہاں انھیں قدر کی نظر سے دیکھا گیا۔ذاتی اعتبار سے مفتی صاحبؒ سادہ اورشریف انسان تھےاور یہ سادگی ان کی گفتگو،ان کے لباس ان کے رہن سہن،ان کے معاملات سب سے عیاں تھی۔ان کو دور سے دیکھنے والا یہ اندازہ ہی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ شخص

اتنے کمالات کا مالک ہے۔بڑے خاموش اور گوشہ گیر انسان تھےاوراپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ان کا نصب العین تھا۔ضیاع وقت کو کامیاب زندگی کے لیے یا کسی بھی انسان کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھےاوراپنے شب وروز کوانھوں نے اس طرح سے تقسیم کیا ہوا تھا کہ کاموں کا ہجوم بھی نہ ہوتا اور وہ آسانی اورسہولت کے ساتھ اپنے تمام کام پورا کرلیتے۔

85 سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے اپنی زندگی میں انھوں نے بےشمار بڑے انسانوں کو دیکھا اور ہر شخص سے کچھ نہ کچھ حصہ پایا،یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ایک عالم کی زندگی تھی۔ایک ایسا عالم کہ جس کے یہاں علمی دینی اور تحقیقی کاموں کے علاوہ اور کسی کام کی گنجائش نہ تھی۔ان کے تین صاحبزادے دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے مولانا احمد سجاد قاسمی،مولانا حماد قاسمی،ہم سے عمر میں بڑے بھی تھےاور تعلیمی اعتبار سے سینئر بھی۔تیسرے صاحبزادے ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی پڑھ رہے تھے مگر وہ مجھ سے کافی چھوٹے تھے دونوں بڑے صاحبزادے بہار ہی میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں اورڈاکٹر ابوبکر عباد دہلی میں مقیم ہیں اوران کے مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔میرا تعلق عمر کے فرق کے باوجود مولانا حماد قاسمی سے رہا۔میں ان کے اور وہ میرے گھر کے فرد کی حیثیت سے لگ بھگ دس سال ساتھ رہے۔مفتی صاحبؒ اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ اللہ نے انھیں سنجیدہ،صالح اورفرماں بردار اولاد عطا فرمائی تھی اس میں ان کی تربیت اور محنت کا بھی بڑا دخل رہا اور آج تینوں ہی لڑکے مضبوط روزگار اور معاش کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

مفتی صاحبؒ کی ذات سے وابستہ کتنی یادیں ہیں کہ جن پر اگر نظر ڈالیں تو دفتر کے دفتر تیار ہوجائیں۔ان کی رہائش دارالعلوم دیوبند کے ایک کمرے میں تھی اور ہمارا اکثر ان کے کمرے پر جانا ہوتا۔وہ اگر موجود ہوتے تو کچھ لکھتے ہوئے دکھائی دیتے یا پھر کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوتے۔کبھی میں نے انھیں ان دو حال سے خالی نہیں پایا الا یہ کہ وہ کچھ ساعتوں کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے ہوں۔انھیں کے کمرے کے قریب

حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ اور مولانا بدرالحسن قاسمی مقیم حال کویت کی بھی رہائش گاہ تھی اور تینوں کا تعلق بڑا قریبی تھا۔اس طرح مفتی صاحبؒ کے یہاں حاضری ہوتی تو ان دونوں حضرات سے ملنے اور ان کے قریب بیٹھنے کے مواقع ملتے رہتے۔مضمون نگاری کے ابتدائی دور میں مفتی صاحبؒ سے اصلاحِ مضامین کا تعلق بھی قائم ہوا۔مگر مفتی صاحبؒ کی یکسوئی اور تنہائی پسندی و مصروفیت کی بناء پر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور ذہنی تربیت کا مفتی صاحب کو خاصہ ملکہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل ایک کارآمد اور کامیاب زندگی گزارے۔خود چوں کہ ان کا مزاج یہی تھا،اس لیے ہر شخص کے لیے ان کی سوچ یہی تھی۔ان کا اصل تعلق تو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا اور ان کے وصال کے بعد انھوں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے یہ رشتہ استوار کرلیا تھا،مگر چونکہ طبیعت میں انتہائی سادگی اور خود کو چھپانے کی عادت تھی اسی وجہ سے بیعت وخلافت کی راہ اختیار نہیں کی۔حالانکہ حکیم الاسلام کی جانب سے انھیں اجازت حاصل تھی۔انھوں نے بہت اچھی اور کامیاب زندگی گزاری اور کوئی موقع اپنی گفتگو، رکھ رکھاؤ سے ایسا نہیں آنے دیا کہ کوئی ان سے کبیدہ خاطر ہوا ہو۔وہ طوفان جو 1980 کے بعد دارالعلوم دیوبند میں آیا اور جس میں بڑے بڑے بہہ گئے مفتی صاحبؒ اپنی جگہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہے اور ان کی زبان وقلم سے کوئی جملہ اور لفظ ایسا ادا نہیں ہوا جس سے کسی کی تحقیر اور تضحیک ہو۔دونوں جانب ان کا تعلق برابر رہا اور ان تعلقات کو انھوں نے ملازمت سے کبھی متاثر نہیں ہونے دیا۔یہ ان کی صالح طبیعت اور اعتدالِ فکر کا نتیجہ ہے جس سے ان کے مزاج اور طبیعت تک آسانی کے ساتھ رسائی حاصل ہوتی ہے۔

کتب خانہ کی ترتیب کے بعد فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب ان کے ذمہ کی گئی۔یہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے فتاویٰ ہیں،جو مفتی صاحبؒ کی محنت،لگن،صلاحیت اور کاوش کا نتیجہ ہیں 12 ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ فتاویٰ

دارالعلوم دیوبند سے چھپ چکے ہیں اور اس کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔اپنی ملازمت کے آخر زمانہ میں وہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے مفتی کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں رہے اور یہاں رہ کر بھی ان کی صلاحیتوں کی روشنی بکھری رہی۔مفتی صاحبؒ جیسے لوگ دیر سے وجود میں آتے ہیں اور جب دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں تو ان کی کمی کا احساس بہت دنوں تک باقی رہتا ہے اور یہ احساس دن گزرنے کے ساتھ اس لیے دوچند ہوجاتا ہے کہ جو جگہ وہ چھوڑ کر گئے ہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جگہ ہمیشہ ہی خالی رہے گی۔ان کا بدل مشکل سے سامنے آئے گا اور اگر آئے گا بھی تو ان روایتوں اور اداؤں سے خالی ہوگا جو مفتی صاحبؒ کے ساتھ خاص تھیں اور جنھیں وہ اپنے ساتھ لے کر رخصت ہوگئے۔پرانے لوگ تیزی کے ساتھ بساطِ حیات سمیٹ رہے ہیں اور ہر دن کسی بڑے کی دنیا سے روانگی کا سانحہ اس کچھ طرح پیش آتا ہے جیسے رات کے اندھیروں کو اپنی روشنی دینے والے چراغ صبح دم بجھ جاتے ہیں مگر انھیں چراغوں سے ہزاروں چراغ جلتے ہیں جو اندھیروں کے مقابل اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔

وہ جن کی لو سے ہزاروں چراغ جلتے تھے
چراغ بادِ صبا نے بجھائے ہیں کیا کیا

☆☆

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی کے سانحۂ ارتحال پر
مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کا اظہار تعزیت

موت برحق ہے، اس کے خونخوار پنجے سے آج تک نہ کوئی بچا ہے اور نہ کوئی بچ سکتا ہے، مگر کچھ شخصیات کی موت پر ان کے عظیم کارناموں اور بے نظیر خدمات کے باعث زمانہ آنسو بہانے پر مجبور ہوتا ہے۔ انہی عبقری شخصیات میں ایک نام حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی مرتب فتاویٰ دارالعلوم ومفتی دارالعلوم دیوبند کا ہے جو گزشتہ دنوں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ حضرت مفتی صاحب کے سانحہ ارتحال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے ’جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار‘ کے بانی ومہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے کہا کہ مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کی موت، ’’**موت العالم موت العالم**‘‘ کی حقیقی مصداق ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں نصف صدی سے زائد عرصہ تک ایک باوقار عہدہ پر فائز رہنے کے باوجود ان کی زندگی میں جو سادگی اور نفاست تھی وہ معاصرین علماء میں ان کو ممتاز وممیّز کرتی ہے۔ مفتی عثمانی نے کہا کہ حضرت مفتی صاحب کی علمی، دینی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے، خاص طور سے فقہ اسلامی اور اصلاح معاشرہ کے تعلق ان کی کاوشوں کی ایک طویل فہرست ہے، اپنے ان نیک کارناموں کے سبب آپ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ حضرت مفتی صاحب کی ایک درجن سے زائد علمی تصانیف ہیں، مگر فتاویٰ دارالعلوم اور کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب آپ کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح ’مجموعہ قوانین اسلامی‘ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ترتیب انتھک کوششوں اور جہد مسلسل کا ثمرہ ہی نہیں، بلکہ ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اللہ رب کریم ان کارناموں کو مغفرت اور جنت الفردوس میں داخلہ ذریعہ بنائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ
جہد مسلسل سے عبارت رہی زندگی

● فضیل احمد ناصری القاسمی

مارچ کی 31ویں تاریخ تھی، دارالعلوم وقف دیوبند کے احاطے میں غلہ اسکیم کا جلسہ منعقد تھا، اسی جلسے میں شرکت کے لیے وہاں موجود تھا، بالکل خالی الذہن، جلسہ حسب روایت چل رہا تھا، اسی دوران کہ اب ’’حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثالی شخصیت‘‘ کی رسم اجراء ہوگی، اس کتاب کے مصنف مولانا احمد سجاد قاسمی ہیں، یہ کتاب صد سالہ اجلاس کے موقع پر لکھی گئی تھی اور اس وقت چھپی بھی تھی، لیکن اب نایاب تھی، مصنف کتاب آفتابِ فقہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب ’’رحمۃ اللہ علیہ‘‘ کے صاحب زادے ہیں، میں چونکا کہ اناؤنسر صاحب کیا بول رہے ہیں، وہ ہوش میں بھی ہیں یا نہیں، دو تین ثانیے کے بعد وہ خود ہی بولے کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج ہی وہ مرحوم ہوگئے ہیں، پہلے صرف چونکا ہی تھا، اب بھونچکا رہ گیا، بجلی کی چکاچوندھ اور اجلاس کی رنگینیاں کوئی کام نہ آسکیں، آنکھوں کے سامنے جو اندھیرا چھایا تھا اس کی سنگینی کچھ ایسی ہی تھی، غم واندوہ کے ساتھ رات بسر ہوئی، صبح ہوئی تو مرحوم کی یادیں تھیں اور صدمات کے سائے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کے نام وکام سے آشنا پہلے سے تھا اور اس وقت سے جب کہ زلف نے پریشانی کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا، استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد ابوبکر قاسمی

مفتی واستاذ مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواره (دربھنگہ) کے کمرے میں ایک کتاب دیکھی، جس کا نام تھا ''حیاتِ مولانا گیلانی'' نئی کتابوں کو الٹنے پلٹنے کا شوق بچپن سے رہا ہے، وہ کتاب پڑھی تو معلوم ہوا کہ اپنے عہد کے ایک صاحب طرز ادیب اور اردو زبان وادب میں علمائے دیوبند کے نمائندہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی سوانح ہے، جو مفتی ظفیر الدین مفتاحی نامی کسی عالم کے قلم سے ہے، شعور کی نمود ہی کا دور تھا، ابھی اس کی پختگی کا کوئی سوال نہ تھا، لیکن محسوس ہوا کہ صاحب کتاب نے صاحب سوانح کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، وہ بڑا جاذب اور گہرا رنگ ہے، اس میں سہل نگاری کے ساتھ سحر طرازی بھی ہے، عقیدت و محبت کی چمن آرائی بھی ہے، معلومات کی فراوانی بھی ہے، شیریں زبانی کے دلکش نمونے بھی ہیں، کتاب کی عمارت جن بنیادوں پر کھڑی ہے وہ درحقیقت مولانا گیلانی کے تحریری رشحات ہیں، ان رشحات کے ساتھ مصنف کی پیوندکاری اتنی دل کش معلوم ہوئی کہ میں نہ صرف مصنف کی قلمی بانکپن کا معتقد ہوا بلکہ نادیدہ طور پر ان کی اہم شخصیت کا علمی مرید بھی ہوگیا۔

ان کی اس کاوش کے بعد ذہن نے ان کی شخصیت کا جو خاکہ تراشا اس میں ہر طرح کا رنگ تھا علم وفہم بھی، رعب وداب بھی، جلال وجمال بھی، صدق وصفا بھی، لیکن 1996 میں بصیغہ طالب علمی جب دارالعلوم پہنچا اور ان کی پہلی بار زیارت ہوئی، تو یقین ہی نہیں آیا کہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی نامی عبقری روح جسم کے جس قفص عنصری میں بسیرا کرتی ہے وہ اس شان اور اتنی سادگی کا پیکر ہوسکتا ہے، ایسا لگتا تھا کہ جس خاکی تن پر مفتی مذکور کا اطلاق ہوتا ہے اس کا حقیقت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے جو کچھ ہے سب مجاز ہے۔

ترا رعبِ علم و کمال تھا جو ہمیشہ صیغۂ راز میں
کوئی کم نظر نہ سمجھ سکا کہ ہے کیا لباسِ مجاز میں

(عنبر ناصری)

مفتی صاحبؒ کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت رہی، 7مارچ 1926

مطابق 21 شعبان 1344ھ میں صوبہ بہار میں واقع ضلع دربھنگہ کے ایک قصبہ پورہ نوڈیہہ میں انہوں نے آنکھیں کھولیں، تین چار سال کی عمر ہوئی کہ مکتب کی آمدورفت انھوں نے شروع فرمادی، پانچ سال کے ہوئے تو گاؤں سے دور بہت دور اپنے چچازاد بھائی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس بہار واڑیسہ کی معیت میں مدرسہ محمودیہ راج پور ترائی نیپال کے لیے رخت سفر باندھا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب اس مدرسے کے صدرالمدرسین تھے، غور کیجیے، اتنی کم سنی میں اقامتی ادارہ میں رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے، ایک کم سن بچہ اس وقت خود کو غریب الدیار سمجھتا ہے، لیکن انھوں نے دل جمعی کے ساتھ پڑھا اور اس وقت تک منہمک رہے جب تک انھوں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ ختم نہیں کرلیا، اپنی خود نوشت سوانح ''زندگی کا علمی سفر'' میں انھوں نے لکھا ہے کہ فراغت کے بعد خیال آیا کہ اب آرام کرنے کا موقع ملے گا، لیکن زندگی کے دوسرے جھمیلے کسی کو کب چھوڑتے ہیں، پھر انھوں نے اپنی جدوجہد بھری زندگی کی جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی سنگریزے کو ہیرا بننے میں صرف سال دو سال کافی نہیں ایک عرصۂ دراز درکار ہوتا ہے، ہر طرح کی ٹھوکریں کھانے اور چیلنج قبول کرنے کے بعد ہی کامیابی کی منزل ہاتھ آتی ہے۔

تعلیم و تربیت: اولاد کی تربیت میں والدین کی تمنا اور ان کی کوشش بڑی زوداثر ہوتی ہے، مفتی صاحب کے والد محترم منشی شمس الدین صاحب کوئی دینی تعلیم یافتہ نہ تھے، ان کے پاس جو تعلیم تھی وہ عصری تھی، اس لیے وہ ریلوے کے ملازم تھے، البتہ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کا بچہ عالم دین بنے، اس مقصد کے تحت انھوں نے اپنے بچے کو گاؤں کے مکتب میں بٹھایا جہاں میاں جی محمد یوسف صاحب پڑھاتے تھے، میاں جی نے مفتی صاحب کو ہندی، پہاڑے، قواعد بغدادی پھر پارۂ عم پڑھایا، پانچ سال کی عمر ہوئی تو مدرسہ محمودیہ راج پور ترائی نیپال حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے، یہاں پارۂ عم سے شروعات کی، ناظرہ قرآن حافظ میاں جان صاحب سیتامڑھی اوران کے بعد حافظ محمد جان

صاحب مظفر پوری سے پڑھا، ناظرہ خوانی مکمل ہوئی تو درجہ حفظ میں بٹھا دیا گیا، ڈیڑھ پارہ تک پہنچے ہی تھے کہ ان کے استاذ نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو بتایا کہ بچہ بہت چھوٹا ہے، درجہ حفظ اس کے لیے مناسب نہیں، چناں چہ بھائی صاحب نے انھیں درجہ اردو میں داخل کیا، اس درجے میں اردو کی مختلف کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، یہ درجہ مولانا (عبدالرحمٰن) کے ذمہ تھا، اس لیے مفتی صاحب نے اردو کا قاعدہ اور اردو کی پہلی انھیں سے پڑھی، اردو آ گئی تو تعلیم الاسلام پھر دروس التاریخ (للخیاط) قواعد اردو اور اخیر سال میں مسدس حالؔی بھی پڑھی، مؤخر الذکر تینوں کتابیں تقریباً انھیں از بر یاد تھیں، ہر شب جمعہ کو مکالمے ہوتے جن میں طلبہ کی یادداشت اور اسباق سے ان کی دلچسپیوں کا جائزہ لیا جاتا۔

مفتی صاحب بڑے ذہین وطباع واقع ہوئے تھے، انہوں نے کبھی استاذ کی مار نہیں کھائی، حافظہ قوی تھا، جو بھی کتابیں پڑھتے انھیں زبانی یاد کر لیتے، جو بھی ان سے سوال کرتا فرفر جواب دے دیتے، حجاب وشرم اور ڈر وخوف جو اکثر بچوں میں پایا جاتا ہے بالکل نہ تھا، اپنے عہد طفولیت کا ایک واقعہ انھوں نے اس طرح لکھا ہے کہ:

''سالانہ امتحان مولانا عبدالرزاق نامی ایک غیر استاذ نے لیا جو ایک دوسرے مدرسے میں مدرّس اوّل تھے وہ ہماری یادداشت اور حاضر جوابی سے حیرت زدہ رہ گئے، ان اسباق میں ہم صرف تین ساتھی تھے، مظفر حسین، واعظ الحق مرحوم اور خاکسار ظفیر الدین، عمر میں یہ دونوں مجھ سے بڑے تھے، ذکاوت و تیزی میں مجھے لوگ ترجیح دیا کرتے تھے، سمجھ ان دونوں کی اونچی تھی اور یادداشت میری۔'' (زندگی کا علمی سفر، ص:23)۔

مدرسہ وارث العلوم چھپرا میں:

نیپال میں ڈھائی سال رہ کر 15 جنوری 1933 کو گھر چلے آئے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی معیت میں مدرسہ وارث العلوم چھپرا (بہار) منتقل ہو گئے، یہ 1933 کا ابتدائی

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

ماہ تھا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب یہاں بھی بحیثیت صدر المدرّسین ہی آئے، یہاں آمد نامہ، عزیز القواعد اور ضوابط فارسی شروع ہوئیں، ضوابط فارسی مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے اور آمد نامہ سید محمد قادری سے پڑھیں، ڈیڑھ سال تک فارسی کتابوں میں لگے رہے، 1934 آیا تو عربی چہارم میں داخلہ لیا، اس درجہ میں کتاب الصرف، نحو میر، علم الصیغہ اور مرقاۃ (منطق) پڑھی، مرقاۃ کے استاذ مولانا شاہ محمد حبیب تھے، 35ء میں پنجم، 36ء میں ششم عربی پڑھی، 37ء میں عربی ہفتم پڑھا، جس میں قدوری، کافیہ، اوضح المسالک، قلیوبی، اخوان الصفا اور مستطرف جیسی کتابیں تھیں، اسی سال اس مدرسے میں مفتی صاحب نے جمعیۃ الطلبہ کی بنیاد رکھی جس میں طلبہ تقریری مشقیں کیا کرتے تھے، اسی سال مفتی صاحب نے 3 ستمبر کو یوم فلسطین کا جلوس نکالا، جو جامع مسجد چھپرہ سے شروع ہوا اور پورے شہر میں گشت کیا، اپریل 38ء میں فوقانیہ کا امتحان دیا، جس میں تمام مدارس کا سینٹر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ تھا، اپنی قلمی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کے لیے اسی سال ماہ نامہ ''القاسم'' نکالا اور اس کے مدیر قرار پائے، مدرسہ وارث العلوم حکومت سے فوقانیہ تک ہی منظور تھا اس لیے اس مدرسے کی باضابطہ طالب علمی اسی سال مکمل ہوگئی، البتہ فوقانیہ امتحان میں کامیابی کے بعد اپنے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے مشورے سے مزید تعلیم کے لیے دو سال اور ٹھہر گئے، اس مدت میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر اگلی کتابیں پڑھیں، یہ سلسلہ دو سال تک چلا، اس دوران مفتی صاحب کا اس مدرسے میں مدرّس عربی پنجم کی جگہ تقرر بھی ہوا جہاں انھوں نے پڑھنے کے ساتھ پڑھایا بھی، 1940 میں جب مولوی کا امتحان ہوا تو مفتی صاحب نے ٹسٹ اور فائنل سارے امتحان میں شرکت کی، حالانکہ انھوں نے مولوی کی کتابیں باضابطہ نہیں پڑھی تھیں، تیاری بھی نہیں کی تھی، لیکن یہ ان کی ذہانت اور اخاذ فطرت ہی تھی کہ سکنڈ ڈویژن سے پاس ہوئے، اس طرح 33ء سے 40ء تک کا تعلیمی زمانہ مدرسہ وارث العلوم چھپرا میں گزارا۔

نومبر میں اپنے استاذ مولانا نظیر احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی اظہار الحق کے ساتھ مدرسہ مفتاح العلوم مئو کے لیے روانہ ہوگئے، پہلی ملاقات مولانا قاری ریاست علی سے ہوئی جو اپنے وقت کے خدارسیدہ، صوفی منش اور جید الاستعداد عالم دین تھے، میرے والد حضرت مولانا جمیل احمد ناصری صاحب مدظلہ نے بھی دارالعلوم مئو میں ان سے پڑھا ہے، قاری صاحب کے ایماء پر مفتی صاحب نے مدرسہ مفتاح العلوم کی راہ لی، جہاں انھوں نے اعلیٰ تعلیم میں داخلے کے لیے امتحان کی درخواست دی، اس وقت ناظم مدرسہ مولانا محمد ایوب صاحب تھے، انھوں نے خود امتحان لیا، اور بے حد خوش ہوئے، مفتی صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے مجھے اختیار دے دیا کہ جس جماعت میں چاہو داخلہ لے لو، اس لیے میں نے شرح وقایہ کی جماعت میں داخلہ لے لیا، اس پر ناظم مولانا ایوب صاحب نے ٹوکا کہ یہ کتابیں تم تو پڑھ چکے ہو، پھر دوبارہ پڑھنے کا کیا فائدہ؟ ہدایہ میں داخلہ لے لو، چناں چہ میں نے ہدایہ میں داخلہ لے لیا، تعلیم تو مدرسے میں پاتے رہے، لیکن مولانا ایوب کی ایماء پر چھتر پورہ کی مسجد کے ایک کمرے میں قیام کیا، وہاں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، اسی کمرے میں انجمن لمعات البیان کی بنیاد رکھی اور قلمی پرچہ ’’لمعات‘‘ کا آغاز کیا، اگلے سال جماعت جلالین میں داخلہ لیا، یہ 42ء تھا، اسی سال اگست میں فرنگیوں کے خلاف ’’ہندوستان چھوڑو تحریک‘‘ شروع ہوگئی اس لیے تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا، یہ پورا سال وطن میں ہی گزرا، اس دوران موقع غنیمت سمجھ کر عالم کے امتحان میں شرکت کی، چونکہ وارنٹ گرفتاری کا ان کے خلاف بھی تھا، اس لیے انھوں نے روپوشی اختیار کرلی، 43ء میں جب حالات معمول پر آئے تو محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی اطلاع پر دوبارہ مفتاح العلوم پہنچے اور وہیں سے دورۂ حدیث شریف پڑھ کر 1944 میں فراغت حاصل کی، بخاری اور ترمذی مولانا اعظمی سے پڑھی، جبکہ مسلم اور ابوداؤد مولانا عبداللطیف نعمانی سے، مولانا محمد یحییٰ اور مولانا شمس الدین مئوی بھی دورۂ حدیث میں ان کے استاذ تھے، فراغت کا یہ سن ہجری اعتبار سے ۱۰/ شعبان 1263ھ تھا۔

فراغت کے بعد:

مدرسہ مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب مزید تعلیم چاہتے تھے، انھوں نے محقق دوراں، مؤرخِ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی لکھی ہوئی کتاب حیاتِ شبلی دیکھ رکھی تھی، اس نے سید صاحب سے عقیدت پیدا کردی، دارالمصنفین اعظم گڑھ اس وقت ہندوستان بھر میں اپنی تحقیق و تدقیق، علم و فن کی نئی نئی دریافت اور نوادرات کی اشاعت میں اپنی دھاک جما چکا تھا، اس لیے مفتی صاحب کی خواہش ہوئی کہ سید صاحب کی خدمت میں رہ کر مزید علم حاصل کرلیں، اس سلسلے میں مولانا اعظمی اور مولانا ندوی کے درمیان گفتگو بھی ہوئی تھی، مولانا ندوی کو کسی نئے فاضل کی تلاش تھی جو فقہ میں تخصص کرنے کا خواہش مند ہو، مولانا اعظمی نے مفتی صاحب کا نام بڑے وقیع اور مضبوط پیرائے میں پیش کیا، مفتی صاحب اعظم گڑھ ان سے ملاقات کے لیے پہونچ گئے، سید صاحب جون پور تشریف لے گئے تھے، دو دن کے بعد واپس آئے تو ملاقات ہوئی، آنے کی غرض بتائی، سید صاحب نے آزمانے کے لیے بڑی ردّ و قدح کی، فرمانے لگے کہ میرے ساتھ رہ کر تم زیادہ سے زیادہ دو چار کتابوں کے مصنف بن جاؤ گے، اس سے کیا ہوگا، یہاں نہ تمھیں دین ملے گا، نہ دنیا، تمہارے پاس جو علم ہے آخرت سنوارنے کے لیے وہی کافی ہے، یہ تقریر کرنے کے بعد فرمایا ’’ظہر بعد ملئے‘‘، ظہر کے بعد ملاقات کے لیے گئے تو پھر آزمائش کے طور پر وہی تقریر دہرائی، اس پر مفتی صاحب نے جو مسکت جواب دیا اس سے مفتی صاحب کی ثاقب ذہنی خوب آشکارا ہوتی ہے، فرمایا:

حضرت اقدس! واقعہ یہ ہے کہ اس وقت نہ مجھے دولت اور شہرت کی خواہش ہے، اور نہ ولی کامل بننے کا ارادہ، میں تو یہ تمنا لے کر حاضر ہوا ہوں کہ عمر کا ایک حصہ میں نے پڑھنے میں صرف کیا ہے، مگر جسے علمی رسوخ کہتے ہیں مجھے حاصل نہیں ہوا ہے اور نہ اپنے علم پر پورا

اعتماد ہے، چاہتا ہوں کہ رسوخ فی العلم کا کوئی گوشہ میرے اندر بھی پیدا ہو جائے۔

(زندگی کا علمی سفر،ص:38)۔

مفتی صاحب کا ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ:

اس گفت وشنید کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ جب ایسا ہے تو تمہیں ندوہ میں پڑھنا پڑے گا، اس لیے درخواست لکھ دو، کہا، منظور ہے۔ درخواست لکھ کر سید صاحب کو دے دی تو فرمایا کہ ندوہ چلے جانا، مفتی صاحب ندوہ کے ارادے سے پہلے وطن پہنچے، لیکن ہوا یہ کہ انہیں اچانک حدتِ خون (ٹی بی) کا مہلک مرض لاحق ہوا اور کئی ماہ اس میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ محرم آ گیا، محدث کبیر سے خط وکتابت چل رہی تھی، انھوں نے فرمایا کہ تم یہیں (مفتاح العلوم) آ جاؤ، تمہارے لیے تربیت افتاء کا شعبہ اپنے طور پر قائم کیا جائے گا، چناں چہ 14 محرم 1364ھ کو مئو پہنچے، یہاں آئے تو ایک بڑے حادثے کا علم ہوا، ایسا حادثہ جس نے اہل شہر کی ہوا اکھاڑ دی، وہ یہ کہ محدث کبیر مفتاح العلوم سے اب دارالعلوم دیوبند جا رہے ہیں، جہاں وہ صدر مفتی کے فرائض انجام دیں گے، دارالعلوم کے ارکانِ شوریٰ نے باضابطہ انہیں طلب کیا ہے، مفتی صاحب کا خواب چکنا چور ہو گیا، مفتاح العلوم سے کئی اساتذہ کے چلے جانے اور پھر محدث کبیر کے مستعفی ہو جانے سے اساتذہ کی اسامیاں خالی رہ گئیں تھیں، اس لیے اربابِ مفتاح نے انہیں اپنا مدرّس چن لیا، وہاں چند ماہ ہی رہنا ہوا تھا کہ ایک سازش کے تحت انہیں مدرسے سے برطرف کر دیا گیا، ان کی بحالی کی محدث کبیر سمیت بڑے اساتذہ نے کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ملی، مفتی صاحب کا دل اچاٹ ہو گیا اور گھر چلے گئے، 1945ء ندوہ پہنچے، جہاں مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ، مولانا ناظم ندویؒ اور مولانا اسحاق سندیلویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، جس جماعت میں داخلہ ملا اس میں ساری کتابیں پڑھی پڑھائی تھیں، چند ایام کے بعد ہی ان کی طبیعت اکتا گئی، مولانا اویس ندوی نگرامی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ چھٹی گزار کر ندوہ واپس

آئے تو انہوں نے بھی مفتی صاحب سے کہا کہ پڑھی کتابیں پڑھنے سے کیا فائدہ؟ تم میرے گاؤں چلے جاؤ، وہیں مدرسہ معدن العلوم نگرام (لکھنؤ) میں بطور صدر مدرّس کام کرنا، ندوہ سے دل اچاٹ تو تھا ہی، مولانا اویس ندوی کی ترغیب نے انہیں ترکِ تعلیم اور ندوہ چھوڑنے پر مزید آمادہ کر دیا، اور وہ نگرام چلے آئے، جہاں انہوں نے شروع نومبر 45ء سے دسمبر 1947ء تک تین سال تدریسی خدمات انجام دی۔

قیامِ ندوہ کے دوران ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا، ہوتا یہ تھا کہ ''الاصلاح'' نامی انجمن میں جب طلبہ ابتداءً جمع ہوتے تو تعارفی تقریر ہوتی، جب مفتی صاحب کو تقریر کی دعوت دی گئی تو بڑے پُر جوش انداز میں کھڑے ہوئے اور بڑی بے باکی کے ساتھ اپنی گفتگو شروع کی، حیاتِ شبلی کے مطالعہ سے ندوہ کا جو نقشہ ان کے ذہن میں بیٹھا تھا وہ یہاں ندارد تھا، پھر یہ کہ پڑھی کتابیں ملنے سے طبیعت مکدر ہو چکی تھی، اس لیے نہایت تیز وتند تقریر کی، آگے کی بات مفتی صاحب سے ہی سنئے: ''میں نے ندوہ کے علمی ماحول کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ دراصل مجھے ندوہ حیاتِ شبلی کھینچ لائی ہے، اب سے چند سال پہلے جب وہ چھپی تھی تو میں نے بڑے غور وفکر اور اہتمام سے اس کا مطالعہ کیا تھا اور کافی متأثر ہوا تھا، مجھے سوانح پڑھنے کا بڑا ذوق ہے، آپ حضرات کو حیرت ہوگی میں نے دوبار شروع سے اخیر تک پڑھی، اس کے بعد کہا حضرات! ایک بات عرض کر دوں، جو ندوہ حیاتِ شبلی میں ہے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اب وہ ندوہ باقی نہیں رہا، اس وقت جو حالات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی تبدیلی آئی ہے، بس صدر جلسہ نے حکم دے کر مجھے آگے بولنے سے روک دیا اور کہا بیٹھ جائیں۔''

(زندگی کا علمی سفر،ص:52)۔

مفتی صاحبؒ کا تقریری مذاق:

حضرت مفتی صاحب کو تقریر وخطابت کا بڑا ستھرا ذوق تھا، وہ بڑی مؤثر اور دل پذیر تقریریں کیا کرتے تھے، راقم الحروف نے قیام دارالعلوم کے دوران ''انجمن تہذیب

الافکار“ کے جلسوں میں بارہا ان کی تقریریں سنی ہیں، وہ پانچ منٹ بولیں، یا پچاس منٹ، پوری تقریر طوفان بردوش اور گرما گرم ہوا کرتی، دیکھنے میں نحیف ولاغر اور انتہائی کمزور معلوم ہوتے، لیکن جب بولنے پر آتے تو لگتا کہ ان کا عہد شباب عود کر آیا ہے، بجلی کی سی کوند، الفاظ کی موسلا دھار بارش اور زورِ خطابت سب کچھ ہی ہوتا، تقریر کی مشق انہوں نے مدرسہ وارث العلوم چھپرا میں ہی کی تھی اور اسی عرصے میں وہ مؤثر تقریریں کرلیا کرتے تھے، ان کی اس صلاحیت کا اعتراف وہ لوگ بھی کرتے تھے جو مدرسہ وارث العلوم کی مخالفت صرف اس لیے کرتے تھے کہ یہ ادارہ جمعیۃ علماء سے وابستہ تھا، مسلم لیگ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، لیگی حضرات جمعیتوں کو جہنمی اور کافر گردانتے، مفتی صاحب لکھتے ہیں: ”1939 میں مسلم لیگ کی طرف سے فلسطین ڈے منایا گیا، ایک بڑا جلوس نکلا جس میں تمام مسلمان شریک ہوئے، بعد مغرب میونسپل ہال میں جلسہ ہوا اس میں ساتھیوں نے میری تقریر لکھوادی، نوجوانی میں، میں نے بڑی پُر جوش تقریر کی اس کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ کل تک جہنمی سمجھ کر ہم کو تھوکتے تھے اور لاحول پڑھتے تھے وہ جہاں سے میں گذرتا اب دکانوں سے نکل کر سلام کرنے لگے اور بڑی محبت وشفقت کا اظہار ہونے لگا۔ تعالیٰ اللہ شانہٗ“ (علمی سفر ص 26)

تحریک آزادی میں مفتی صاحبؒ کی شرکت:

تقریر کی یہ استعداد اور جوانی کا یہ جوش ہی تھا کہ اگست 1942 میں انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں نے جب ”ہندوستان چھوڑو“ تحریک شروع کی، تو مفتی صاحب بھی اس کا حصہ ہوگئے، مفتاح العلوم میں ابھی ان کی طالب علمی چل ہی رہی تھی، انہیں طلبہ نے اپنا لیڈر منتخب کرلیا، جلسہ ہوا تو مفتی صاحب نے اتنی زناٹے دار اور شعلہ بار تقریر کی کہ حالات دگرگوں ہوگئے، برطانوی فوج مئو میں بھی گشت کرنے لگی، دس دن کے بعد اس نے دار وگیر بھی شروع کردی، مسلمانوں کو بے دریغ پسِ زنداں کیا جانے لگا، وارنٹ جن لوگوں

کے نام جاری ہوا ان میں مفتی صاحب کا نام بھی شامل تھا، انہیں کی زبانی سنئے:

”گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا، مجبوراً مجھے چھپ جانا پڑا، کئی دن فاقے کے گذرے، پھر نثار مرحوم کی مدد سے کھانے کا انتظام ہوا، ٹرینیں بند ہوچکی تھیں، ڈاک خانے کا نظام بھی ٹوٹ چکا تھا، اس لیے منی آرڈر (روپے) گھر سے نہیں آرہے تھے، بے سروسامانی کا عجیب عالم تھا، کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو، کا مصداق بنا ہوا تھا، اس وقت میری لیڈری کچھ کام نہ آئی، بلکہ اپنے لیے مصیبت بن گئی، سر چھپانا مشکل ہو رہا تھا، دوستوں اور ساتھیوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا، کوئی دوست قرض دینے کے لیے بھی تیار نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے سوا سب کٹ گئے تھے، چھتر پورہ محلّہ کی مسجد کے کمرے میں مقیم تھا، اور مسجد کا امام بھی تھا، گیارہ روز ایسے ہی گزرے، جب یہ راز محلّہ والوں پر کھلا کہ مجھ پر وارنٹ ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ محلّہ چھوڑ دیں، آپ کی وجہ سے محلّہ پر بھی آنچ آسکتی ہے، مجبوراً گیارہ دنوں کی روپوشی کے بعد سفر کا ارادہ کرنا پڑا۔ (علمی سفر ص 33)۔

لوح وقلم کے بادشاہ:

مفتی صاحب جہاں میدانِ خطابت کے شہ سوار تھے وہیں انشاء پردازی کے قافلہ سالار بھی تھے، وارنٹ گرفتاری منسوخ ہونے کے بعد سیاست سے ان کا تعلق یوں بھی ختم ہوگیا تھا، تقریروں کا سلسلہ ضرور جاری رہا، مگر اب ان کا رجحان زمامِ قلم کی طرف ہوگیا، چنانچہ تدریس سے بچے ہوئے اپنے سارے اوقات انشاء پردازی کے لیے وقف کردیئے، اپنی 85 سالہ زندگی میں انہوں نے تحریر وانشاء کی راہ سے وہ خدمات انجام دیں جن کی ہمت عام طور پر بڑے بڑے اہل علم بھی جٹا نہیں پاتے، مدرسہ معدن العلوم میں قیام کے دوران انہوں نے ”اسلام کا نظام مساجد“ کے عنوان سے کتاب نویسی کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ”زندگی کا علمی سفر“ پر آکر رکا۔ موضوع دقیق ہو یا سہل، خشک ہو یا رس دار، لکھا اور خوب

دادِ مہارت دی، بعض کتابیں تو اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کے عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے، اسلام کا نظام عفت وعصمت، نظام تعلیم وتربیت، اسلامی حکومت کے نقش ونگار، ان کی وہ کتابیں ہیں جنہیں ہر باذوق اپنے لئے سرمایہ گردانتا ہے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب تو ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ایک باخبر مفتی اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا، بارہ ضخیم جلدوں میں یہ کتاب ہر اہل علم کے لیے ایک سوغات ہے، ترتیب کا لفظ سن کر عصر حاضر کے فضلاء یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو کوئی کوہ کنی نہ ہوئی، دارالعلوم کے مفتی اوّل مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ کے فتاویٰ کو جمع کرنا اور ترتیب دینا کون سا مشکل کام تھا، لیکن جنھوں نے مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کی تحریروں کو دیکھا ہے ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ کس جاں فشانی سے یہ کام انجام پایا ہوگا، شکستہ تحریریں، بوسیدہ اوراق، منتشر مضامین، اور پھر طویل استفتاءات کی دو دو تین تین سطروں میں تلخیص کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھی، مگر مفتی صاحب نے پوری تن دہی، کمالِ توجہ اور مکمل استغراق کے ساتھ اپنی پختہ کاری اور دقت نظری کا ثبوت دیا، جس دور میں یہ کتابیں ترتیب دی گئیں وہ مفتی صاحب کے کتب خانہ کی ادارت کا زمانہ تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے وقت کی صحیح قدر وقیمت جان کر اسے اچھی طرح وصول کیا اور اس طرح ارکانِ مجلس شوریٰ کی خواہش کو بروئے کار لانے میں کامیاب رہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ رسالہ دارالعلوم کی لگاتار سترہ سال اداریہ نویسی ہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ رسالہ دارالعلوم پابندی سے نکلتا تو ضرور تھا، مگر اس میں اداریہ نہ ہوتا تھا، کوئی بھی رسالہ بغیر اداریہ کے سر بریدہ ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے، ایک معتبر اور بین الاقوامی درس گاہ کے رسالے میں یہ عیب یقیناً بڑا عیب تھا، ارکانِ شوریٰ نے اسے محسوس کیا اور ماہ صفر 1385ھ میں انہیں باقاعدہ رکن ادارت بنادیا، مفتی صاحب نے نہ صرف ادارتی ذمہ داری کو نبھایا، بلکہ رسالہ اور اس کی رفتار کو ایک نئی جہت دے دی، اس کے اداریے ایسے ہوتے کہ بہت

سے قارئین صرف اداریے کے لیے رسالہ کے منتظر رہتے، عربی واردو کے شہرۂ آفاق ادیب حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہٗ نے بالکل درست لکھا ہے کہ ''مفتی صاحب میں تالیف وانشاء کا فطری ذوق ہے، زبان سادہ اور رواں لکھتے ہیں، ان کی تحریر ہر طرح کے تکلف سے پاک ہوتی ہے، انہوں نے بہت سی کتابیں اور سیکڑوں مقالات لکھے، جو ملک (وبیرون ملک) کے طول وعرض میں مختلف رسائل میں چھپے، انہیں جمع کردیا جائے تو دسیوں کتابیں تیار ہوجائیں گی۔ (پسِ مرگ زندہ، ص:931)

مفتی صاحب کے اسلوبِ تحریر کا سب نے لوہا مانا، علم وتحقیق، فکر ونظر، حسن ادا، برجستگی اور سلاست ان کے قلم کی خصوصیت ہوا کرتی تھی، کسی کی علمی گرفت یا تنقید بھی کرتے تو اتنے شستہ اور دل چسپ پیرائے میں کہ فریق مخالف کو برا نہ لگتا، اعتدال وتوازن ان کی تحریر کا جوہر تھا، جماعت اسلامی کی رد میں انہوں نے کئی رسالے اور مضامین لکھے ہیں، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مفتی صاحب ہذیان گوئی یا ناشائستگی پر اتر آئے ہوں، اسے دیکھنا ہو تو جماعت اسلامی کے دینی رجحانات اور مطالعۂ مودودیت ملاحظہ فرمائیں۔ ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد 24 تک پہنچتی ہے، مضامین ومقالات ان سے علیحدہ ہیں، غیر مطبوعہ تصنیفات کی بھی یقیناً ایک بڑی تعداد ہوتی، خود ان کے فتاویٰ کا ذخیرہ اس قدر ہے کہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔

تدریسی خدمات:

مفتی صاحبؒ کی تدریسی خدمات کا سلسلہ 1938 سے چلا تو وفات سے دو سال قبل تک وہ برابر چلتا رہا، درمیان میں چند سال ضرور تدریس سے علیحدہ گزرے، لیکن ان کی عمومی زندگی تدریس کے لیے ہی وقف رہی، جیسا کہ گزر چکا ہے کہ فراغت کے بعد ایک سال مفتاح العلوم میں مدرّس رہے، اس کے بعد ستمبر 1945 سے دسمبر 47ء تک مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنؤ میں تین سال تدریسی خدمات انجام دی، جنوری 1948 میں

دارالعلوم معینیہ موضع سانحہ ضلع مونگیر (حال بیگوسرائے) میں مدرّس ہوئے، یہاں 1956 تک درس وتدریس میں مشغول رہے، درمیان میں ایک سال محرم 1368ھ تا اواخر 1368ھ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل وسملک سابق ضلع سورت حال ضلع نوساری میں تدریسی خدمتیں انجام دیں، وہاں بیمار ہوگئے، اس لیے واپس دارالعلوم معینیہ سانحہ آگئے۔ دارالعلوم دیوبند آئے تو یہاں بھی 1993 سے درجۂ افتاء میں تدریس سپرد ہوئی، جب تک یہاں قیام رہا افتاء کی کتابیں پڑھاتے رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آمد:

9 ستمبر 1956، 1376ھ میں دارالعلوم دیوبند آئے، اپنے دارالعلوم آمد کا واقعہ مفتی صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کی لائبریری کا افتتاح ہونا تھا، اس موقع پر ایک بڑا اجلاس ہوا جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حکیم الاسلام حضرت قاری طیب صاحبؒ تشریف لائے تھے، اس اجلاس میں امیر شریعت حضرت مولانا محمد منت اللہ رحمانیؒ کی اجازت سے کتب خانے کی اہمیت وعظمت پر ایک مقالہ پیش کیا تھا، یہ طویل مقالہ اپنی جامعیت وعلمیت کی بنا پر دونشستوں میں پڑھا گیا، اس مقالے پر مفتی صاحب کو خوب داد ملی، یہی تحریر دارالعلوم آنے کا سبب بن گئی، قاری صاحبؒ نے 1375ھ انہیں طویل خط لکھا، مفتی صاحبؒ نے اسے سعادت سمجھ کر قبول کرلیا اور دارالعلوم تشریف لے آئے۔ یہاں آئے تو انہیں شعبۂ تبلیغ میں رکھ دیا گیا جس میں فرقِ ضالہ کے ابطال میں مضامین ورسائل کی ذمہ داری سپرد کی گئی، سات سال تک اس شعبہ سے منسلک رہے، 1383ھ میں انہیں کتب خانہ منتقل کردیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ مفتی صاحب کی آمد سے قبل غیر مرتب تھا، کتابوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، مطلوبہ کتابیں تلاشنے کے باوجود بڑی مشکل سے اور کئی کئی دنوں کے بعد ملتی

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

تھیں، اہل علم کو اس سے بڑی شکایتیں تھیں، ارکانِ شوریٰ نے اس مسئلے کے حل کے لیے مفتی صاحب کو منتخب کیا، گو مفتی صاحب اس ذمہ داری سے خوش نہ تھے، اور بہت مکدر بھی ہوئے، لیکن دارالعلوم کے مفاد میں اسے قبول کرلیا، اس کی صحیح ترتیب کے لیے مختلف لائبریریوں کی خاک چھانی، پٹنہ، رامپور، علی گڑھ اور نہ جانے کہاں کہاں کا دورہ کیا، اور اسے کئی سالوں میں ایک باوقار لائبریری بنادیا، کتب خانہ میں موجود مخطوطات کا تعارف بھی دو جلدوں میں لکھا، دارالعلوم کے کتب خانہ کی موجودہ ترتیب ان کا ایک شان دار کارنامہ ہے، اسے قابل ذکر نہ سمجھنا حقائق سے آنکھیں چرانا ہے۔

مفتی صاحب جہاں اور کمالات سے مالامال تھے وہیں مردم گری اور رجال سازی میں بھی انہیں یدطولیٰ حاصل تھا، ان کے دامنِ علم سے جو بھی طالب علم وابستہ رہا، کھرا سونا بن کر نکلا، ''سانحہ'' کا مدرسہ معینیہ؛ مکتب سے دارالعلوم ان کی اسی صفت کے طفیل میں بنا، ان کے طرزِ تدریس سے طلبہ کھنچ کھنچ کر ان سے استفادہ کے لیے آتے، دارالعلوم دیوبند میں 1384ھ میں ''مطالعۂ علومِ قرآنی'' کے نام سے جب نیا شعبہ قائم کیا گیا تو اس کی نگرانی اور سرپرستی کے لیے ارکانِ شوریٰ نے انہیں کو منتخب کیا، یہ شعبہ دارالعلوم کے ذہین طلبہ اور باصلاحیت فضلاء کے لیے اپنی علمی اور تحریری لیاقت کو پختہ کرنے کا بہترین ذریعہ تھا، حضرت مولانا محمد ولی رحمانی، مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم اور مولانا سمیع اللہ گونڈوی وغیرہم نے اسی شعبہ میں رہ کر مفتی صاحب سے فیض حاصل کیا ہے، یہ شعبہ چار سال تک باقی رہا۔ 1388ھ میں اسے بند کردیا گیا، اس کے بند ہونے پر مفتی صاحب بہت ناراض بھی ہوئے، لیکن تقدیر کے آگے کس کی چلی ہے؟۔

سادگی کے پیکر:

مفتی صاحب اپنی تمام تر علمی برتری کے باوجود خود کو چھوٹا ہی محسوس کرتے، اور اخفاء حال کی پوری کوشش کرتے، 1385ھ میں جب ادارہ یہ لکھنے کی فرمائش کی گئی اور انہیں مدیر

بنایا گیا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اداریہ تو میں ضرور لکھوں گا، مگر بحیثیت مدیر ٹائٹل پر میرا نام نہیں ہونا چاہئے، 1402ھ تک انہوں نے رسالہ کا کام کاج سنبھالا، مگر اکثر لوگ یہ نہ سمجھ پائے کہ اس رسالہ کے مدیر مولانا ازہر شاہ قیصر ہیں یا مفتی صاحب۔ اپنی سادگی کی بنا پر وہ سہل الحصول تھے، جو جب چاہتا انہیں بلا لیتا، باحیثیت، بے حیثیت، خورد و کلاں سب کی آواز پر وہ لبیک کہہ دیتے اور جہاں بٹھایا جاتا بیٹھ جاتے، جو کھلایا جاتا کھا لیتے، بیل گاڑی اور ہوائی جہاز، فرش خاکی اور تخت شاہی کے درمیان ان کے یہاں کوئی فرق نہ تھا، حالانکہ وہ بڑے تھے، بہت سے اکابر علماء کے استاذ تھے، نہ جانے کتنے ہی مفتیانِ کرام ان کے خوانِ علم کے زلہ ربا ہیں، لیکن جس سے ملتے، جھک کر ملتے، نہ چیں بہ جبیں، نہ عتاب وغصہ، بلکہ طلبہ سے تفریح بھی کر لیا کرتے، ایک دن راقم الحروف ان کے ساتھ بازار گیا، انہیں بڑے رومال کی ضرورت تھی، راقم نے ایک عربی رومال کی طرف اشارہ کیا جس کی زمین سفید تھی اور نقش و نگار سرخ تھا، فرمانے لگے ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' اور اس طرح آگے بڑھ گئے، کسر نفسی اور فنائیت ان کی زندگی کی عبا تھی، سادہ لباس زیب تن کرتے، موٹا جھوٹا کپڑا ان کی شناخت تھا، اتنے بڑے عالم سے اس قدر خاکساری بہت بڑی کرامت ہے، جب تک انہوں نے خود کو کام کے لائق سمجھا، کام کرتے رہے، اور جب انہیں لگا کہ ان سے مزید خدمت نہیں ہو سکتی، تو انہوں نے سبکدوشی کر لی، 20 شعبان 1429ھ مطابق 22 اگست 2008 بروز جمعہ انہوں نے دارالعلوم کو خیر باد کہا اور دو ہزار پنشن پر وطن تشریف لے گئے۔ اس طرح انہوں نے جہاں کی مٹی سے سر نکالا تھا اسی مٹی میں سو گئے۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

☆☆

یادیں جو اُن کی آتی ہیں

مولانا مفتی ظفیر الدینؒ (1926-2011)

● ڈاکٹر شمیم اختر قاسمی

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین کو میں نے پہلی بار 1992 کی ایک صبح دارالعلوم دیوبند کے دار جدید روم نمبر 21 میں دیکھا تھا۔ چار پانچ طالب علم ان کے گرد بیٹھے ہوئے اپنی اپنی ضرورتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ اسی سال میں بھی یہاں داخلہ کی غرض سے آیا تھا۔ جب میں ان سے ملنے کے لئے کمرہ سے نکلا تو راستہ بھر ان کے متعلق ذہن میں جو خیالی نقشہ کھینچا تھا، انہیں اس کے برعکس پایا۔ سلام ومصافحہ کے بعد انہیں اپنا اور اپنی بستی کا نام بتایا تو وہ دادا جان حکیم محمد سلیمان صاحب کے حوالے سے پہچان گئے اور خیریت معلوم کی۔ میری دل جوئی/ ضیافت میں انہوں نے ایک روپے کی سوجی اور ایک روپے کا دودھ منگوایا اور ٹوٹی ہوئی روٹیوں کو سوجی میں ملا کر حلوا بنوایا اور چائے تیار کروائی جسے سب لوگوں نے مل کر کھایا پیا۔ اس پہلی ملاقات میں ان کی سادگی اور انکساری کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کے بعد ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ اسی دوران ایک بار ان سے ملنے گیا تو انہوں نے فرمایا: آپ کے دادا کا خط آیا تھا، آپ کے داخلہ کے سلسلے میں وہ بہت فکر مند تھے، میں نے خط کا جواب لکھ دیا ہے۔ اس میں انہوں نے دادا جان کو اطمینان دلایا تھا کہ جس طرح آپ کا نواسا یہاں سے کامیاب ہو کر نکلا ہے، پوتا بھی کامیاب ہو کر نکلے گا۔

ان ابتدائی دنوں میں میں نے ایک خاص بات دیکھی، جو مجھے حیرت میں بھی ڈالے ہوئی تھی کہ مفتی صاحب کی خدمت میں جو کوئی آجاتا اور ان سے اپنی ضرورت بیان کرتا اور انہیں محسوس ہوتا کہ واقعی یہ ضرورت مند ہے اور کسی سے کچھ کہنے سننے سے اس کی ضرورت کی تکمیل ہوجائے گی تو وہ اس میں کوتاہی نہ کرتے، بلکہ ایسا کرنے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں جب داخلہ امتحان کا زمانہ آتا تو ہر علاقے سے تعلق رکھنے والے طلبا کو مفتی صاحب کے کمرہ میں بہ کثرت دیکھا۔ مقصد یہ ہوتا کہ وہ کسی کو سفارشی خط لکھ دیں گے تو داخلہ مل جائے گا یا کھانا کھل جائے گا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا: حضرت آپ اتنی زیادہ سفارش کرتے ہیں، کیا سب قبول ہوجاتی ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، مگر ان بچوں کا دل توڑا بھی تو نہیں جاتا۔ بڑی امید لگا کر میرے پاس آتے ہیں۔ اگر میرے لکھنے سے ایک دو کا بھی بھلا ہوجائے تو کتنی اچھی بات ہے، یہ دعائیں دیں گے۔ ان کی بات سن کر میں خاموش ہوگیا۔

دورۂ حدیث کے سال تک مفتی صاحب سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی، مگر جب میرا داخلہ شعبہ افتا میں ہوگیا تو ان سے ملاقات میں اضافہ ہوگیا۔ جب بھی کوئی فقہی مسئلہ سمجھنے میں دقت ہوتی، ان کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ وہ بڑے ہی آسان طریقہ سے اس کی تفہیم کرادیتے۔ اگر کسی وجہ سے ان سے ملنے میں تاخیر ہوجاتی تو وہ کبھی کبھی فضل الرحمٰن صاحب (بھائی فضلو) استاد شعبہ خوش خطی دارالعلوم یا کسی اور طالب علم کے ساتھ میرے کمرہ پر تشریف لاتے اور مغرب تک وہیں رہتے۔ جیسے ہی مغرب کی اذان کا وقت ہوتا وہ وہاں سے چل دیتے۔ میں ان سے کہتا کہ حضرت آپ نے آنے کی زحمت کیوں کی، میں آج نہ کل آپ سے مل ہی لیتا۔ اس پر وہ فرماتے: بھائی مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں تم بیمار تو نہیں پڑ گئے، اس لئے عیادت کے لئے آگیا۔ اب تمہیں اچھا دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پھر اپنے پیسے سے چائے کا سامان منگواتے، چائے بنتی اور ہم سب پیتے۔

رفیق سفر کی حیثیت سے مفتی صاحب کے ساتھ میرا پہلا سفر دیوبند سے علی گڑھ تک اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آٹھویں سیمینار میں شرکت کی غرض سے اکتوبر 1996 میں ہوا۔ اس پورے سفر میں ان کی جو نوازشیں میرے ساتھ ہوئیں میں اس کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں ملک کے بڑے بڑے علما اور دانش وروں کو پہلی بار دیکھنے اور ان سے ملاقات کا شرف انہیں کے طفیل حاصل ہوا۔ خردوں کی کیسے دل جوئی کی جاتی ہے اور ان کے حوصلوں کو بڑھایا جاتا ہے، کوئی ان سے سیکھے۔ اس سہ روزہ فقہی سیمینار کا ایک موضوع ''عقد نکاح میں شرائط کی فقہی حیثیت'' بھی تھا۔ اس تعلق سے علما اور دانش وروں کی بہت سی کارآمد باتیں سامنے آئیں اور مباحثہ ومناقشہ کا بازار گرم رہا۔ صدارت مفتی صاحب ہی فرمارہے تھے۔ مغرب کی اذان سے پانچ سات منٹ پہلے انہیں صدارتی کلمات کہنے کا موقع دیا گیا۔ مختصر سے وقت میں انہوں نے ظاہر کردیا، دیکھنا تقریر کی لذت۔ سارے لوگ ان کے خطاب کو سن کر عش عش کرنے لگے۔

مفتی صاحب کے ساتھ میرا دوسرا سفر 1997 میں جولائی یا اگست کی کسی تاریخ میں علی گڑھ کے لئے ہوا۔ میں نے یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات میں ایم.اے کے لئے فارم بھر دیا تھا، داخلہ کے لئے میرا نام منتخب کرلیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فلاں تاریخ کو داخلہ کی کارروائی مکمل ہونی ہے۔ اس کی اطلاع ان کو دی۔ وہ فرمانے لگے میں بھی تمہارے ساتھ علی گڑھ جاؤں گا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا: اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے، ہامی بھر لی۔ اس سفر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ان کی ایمان داری، بردباری، کسر نفسی اور انسانی ہمدردی وغیرہ کے بہت سے درس ملے۔ واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ریل میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ہم لوگ دیوبند سے میرٹھ اسٹیشن پر اس وقت پہنچے کہ سنگم اکسپریس کے کھلنے کا سگنل ہوگیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: دیکھو جنرل ڈبہ کدھر ہے۔ میں نے کہا: ہم جنرل کے بجائے سلیپر ڈبہ میں بیٹھیں گے۔ انہوں نے فرمایا: یہ تو غلط

ہوجائے گا، ہمارے پاس ٹکٹ جنرل کا ہے۔ میں نے کہا: آپ اس کی فکر نہ کریں، میں ٹی ٹی سے بات کرلوں گا۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ جنرل ڈبہ میں بیٹھوں گا، لیکن مشکل یہ تھی کہ میں دوڑ کر جنرل ڈبہ تک چلا جاتا مگر وہ ضعیف، بھاری جسم والے اور دارالعلوم کے استاذ تھے، یہ ان کی شان کے خلاف ہوتا۔ اسی دوران ایک ٹی ٹی سامنے آگیا۔ میں نے چلتے چلتے اس سے کہا: یہ میرے گرو (استاذ) ہیں اور ہمارے پاس جنرل ٹکٹ ہے اور جنرل ڈبہ میں کافی بھیڑ ہوگی اور کوئی ٹھیک نہیں کہ وہاں پہنچنے سے پہلے ریل چل پڑے۔ اگر اجازت دیں تو ہم سلیپر ڈبہ میں بیٹھ جائیں، علی گرھ تک جانا ہے۔ اس نے کہا: جائیے فلاں بوگی میں فلاں سیٹ پر بیٹھ جائیے۔ بڑی مشکل سے ان کو اس بوگی میں سفر کرنے کے لئے آمادہ کیا۔

ہم متعینہ بوگی میں ٹی ٹی کی بتائی ہوئی سیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک جوان لڑکی کھڑکی سے ٹیک لگائے سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے، دوسری طرف سامنے والی سیٹ پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سامان کو سیٹ کے نیچے رکھا اور مفتی صاحب سے کہا: آپ یہاں بیٹھ جائیے۔ جیسے ہی وہ بیٹھنے لگے، لڑکی نے بڑے ہی حقارت بھرے لہجے میں کہا: بڑے میاں آپ ہٹ کر وہاں بیٹھئے۔ وہ ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ کھڑے ہونے لگے۔ میں نے ان کا شانہ دباتے ہوئے کہا: آپ یہیں بیٹھیں گے۔ پھر میں نے اس لڑکی سے کہا: کیا آپ اپنے والد کو بھی اسی طرح مخاطب کرتی ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ چراغ پا ہوگئی اور کہنے لگی کہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اتنا تو سمجھ گیا ہوں کہ آپ بہت بدتمیز ہیں، بڑے چھوٹے کا آپ کے اندر شعور نہیں ہے۔ مفتی صاحب بار بار مجھ سے کہتے رہے کہ خاموش ہوجاؤ، کیا ہوا ہم زمین پر ہی بیٹھ کر چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ میں نے چپ سادھ لی۔ مگر وہ خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس پر سامنے والی سیٹ کے لوگوں نے اس کو ڈانٹا کہ تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا، غلطی تمہاری ہے، تمہیں تو ان سے معافی مانگنی چاہیے۔ اس کے بعد اس کا بڑبڑانا ختم ہوا۔

کچھ دیر کے بعد بلند شہر سے ایک دو اسٹیشن قبل گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی، وہ لڑکی بدستور کھڑکی سے ٹیک لگائے رہی۔ کسی لٹیرے نے اسے تاڑ لیا، کیونکہ وہ سونے کے زیورات پہنے ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں جیسے ہی گاڑی چلی، باہر سے اس نے اس کے کان پر حملہ کردیا اور سونے کی آئرن کو لے کر چلتا بنا، جس سے اس کا کان بری طرح زخمی ہوگیا۔ لڑکی نے چیخ لگائی تو سارے لوگ حیرت واستعجاب میں پڑ گئے کہ آخر اس کو کیا ہوا۔ مزید کچھ کہنے کے بجائے وہ کان پکڑ کر بیٹھ گئی اور آہ وبکا کرنے لگی۔ دیکھا کہ خون اس کے کان سے تیزی سے بہہ رہا ہے۔ مفتی صاحب نے جھٹ سے اپنا رومال نکال کر اس کو دیا کہ بیٹی اس سے زخم کو دبالو۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا: میرا بیگ کھولو، اس میں فلاں دوا ہے اسے نکال کر اس بچی کو کھلاؤ تاکہ اس کی تکلیف کی شدت کم ہو۔ یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے خود سے ہی اپنے تھرمس سے پانی نکال کر اسے دیا اور کہا لو بیٹی یہ دوا کھالو شاید جلدی تم کو آرام مل جائے۔ تھوڑی دیر میں بلند شہر اسٹیشن آگیا، جہاں اسے اترنا تھا، البتہ اب اس کی ساری اکڑن ختم ہوگئی تھی اور وہ معافی مانگتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئی۔

لڑکی کے جانے کے بعد مفتی صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ سفر میں آدمی کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ چلنا چاہیے۔ اگر اس نے مجھے ایسا ویسا کہہ دیا تو کیا ہوا میرا قد گھٹ تو نہیں گیا، ہم جیسے ہزاروں مفتی روزانہ سفر کرتے ہیں، کون جانتا ہے کہ کون مفتی ہے اور کون دارالعلوم کا استاذ۔ لڑکی کی اس بے ہودگی کا ان پر ذرہ برابر اثر نہ تھا، اور وہ اسے اس کی نادانی پر محمول کر رہے تھے۔ گویا کہ وہ مجھے یہ نصیحت کر رہے تھے:

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

مفتی صاحب علی گڑھ آتے تو پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی یا پھر اپنے بیٹے ڈاکٹر ابوبکر عباد کے یہاں قیام کرتے۔ (عباد صاحب اس وقت شعبہ اردو میں ریسرچ اسکالر تھے اور فیملی

کے ساتھ فردوس نگر میں رہتے تھے، اب دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں) عام طور سے وہ ابوبکر صاحب کو اور مجھے ساتھ لیتے اور خاص طور سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر اعظم قاسمی، حکیم مودود اشرف، پروفیسر مسعود اشرف، قاضی افضال حسین اور مولانا ہنادا احمد قاسمی وغیرہ سے ملنے ان کے دولت خانہ پر تشریف لے جاتے۔ یہ حضرات ان سے بڑی محبت اور عقیدت سے ملتے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ علی گڑھ آئے ہوں اور اپنے جاننے والوں سے ملے بغیر چلے گئے ہوں۔ ان کا جب بھی میرے پاس خط آتا تو نام بنام لکھتے کہ فلاں فلاں لوگوں کو میرا سلام عرض کردو گے۔

جب میں مسلم یونیورسٹی کے آفتاب ہال کے میکڈانل ہوسٹل بالترتیب روم نمبر 39 اور 21 میں رہنے لگا تو مفتی صاحب نے کئی مرتبہ خواہش ظاہر کی کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوسٹل میں ہی رہوں گا، مگر میں بعض وجوہ کی بنا پر ٹال دیتا اور کہتا کہ آپ اپنے بیٹے کے یہاں ٹھہریں تو زیادہ بہتر ہوگا، وہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ مگر جب میں آفتاب ہوسٹل کے روم نمبر 60 میں رہنے لگا تو ایک مرتبہ انہوں نے ایک رات کے لئے میرے کمرہ پر قیام کیا۔ چونکہ یہ سنگل سیٹ روم تھا، اس لئے مجھے ان کو یہاں ٹھہرانے میں کسی طرح کی قباحت محسوس نہیں ہوئی، بلکہ خوشی ہوئی۔ وہ میرے باضابطہ استاذ تو نہ تھے، مگر اس سے کم بھی نہ تھے اور وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اور میں ان کی کفش برداری کو اپنے لئے فخر اور سرمایہ زندگی سمجھتا تھا:

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اور یہاں کے لوگوں سے مفتی صاحب کو بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے چھوٹے لڑکے ابوبکر اور پوتے محمد رضوان یہاں پڑھتے تھے، یا چند جاننے والے یہاں درس وتدریس پر مامور تھے۔ بلکہ یونیورسٹی سے ان کا

لگاؤ فطری تھا۔ میں نے تو انہیں 1995 کے بعد سے علی گڑھ آتے ہوئے دیکھا، جبکہ وہ بہت پہلے سے علی گڑھ آتے جاتے تھے۔ جب کبھی انہیں یونیورسٹی کے ناخوش گوار واقعات کی خبر ملتی تو وہ بے چین ہو جاتے اور متعدد ذرائع سے یہاں کے حالات کی خبر لینے کی کوشش کرتے۔ ہم لوگوں سے بارہا انہوں نے فرمایا: آخر مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے، وہ اپنے ہی گھر کو اجاڑنے اور بدنام کرنے میں کیوں لگے ہوئے ہیں، کب انہیں ہوش آئے گا، لے دے کر ایک ہی مسلم سرکاری ادارہ ہے، اس کو بھی لوگوں نے سیاست کی آماج گاہ بنا دیا ہے۔

مفتی صاحب کو میں نے اکثر یا تو اپنے کمرہ میں لڑکوں سے بات چیت کرتے ہوئے دیکھا یا دارالافتا میں استفتا کا جواب لکھتے ہوئے پایا۔ انہیں منصوبہ بند طریقے سے اور معمولات کے مطابق کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر ان کا یہ بھی خاص وصف تھا کہ وہ سبق کا مطالعہ کئے بغیر نہ پڑھاتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھ لیا: حضرت آپ پڑھتے لکھتے کب ہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ کمرہ دیکھتے ہو، میں رات کے ۲ ربجے بیدار ہو جاتا ہوں اور وضو کر کے پہلے تہجد کی نماز ادا کرتا ہوں اس کے بعد گھڑی دیکھ کر دو گھنٹہ پڑھتا لکھتا ہوں، پھر سو جاتا ہوں اور فجر کی نماز کے لئے اٹھتا ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے عظیم علمی کام کیا ہے۔ اب تک جو کچھ شائع ہو چکا ہے، وہ تو بڑی حد تک لوگوں کے سامنے ہے، مگر اس سے زیادہ بڑا اور قیمتی سرمایہ ان کی ان گٹھریوں میں بند ہے جن کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے فرمایا تھا: ان سب میں قیمتی مسودہ موجود ہے، جبکہ ایک بڑا علمی سرمایہ دارالعلوم کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا۔ بڑا ہی اچھا کام کیا ہے مولانا احمد سجاد قاسمی نے کہ وہ اپنے والد محترم کے علمی اثاثہ کو آخر وقت میں دیوبند سے منتقل کر کے اپنے گھر لے آئے اور زندگی بھر کی جمع کی ہوئی کتابوں کو انہیں کے ہاتھوں قائم کئے ہوئے گاؤں کے مدرسہ 'شمس العلوم' کو دے دیا اور ان کے نام پر لائبریری قائم کردی۔ بقیہ علمی نوادر جو ان کی گٹھریوں میں بند ہیں انہیں وہ جلد ہی

کھولیں گے۔ دیکھئے اس میں سے کیا کیا نکلتا ہے۔

مفتی صاحب نے چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں تحریر کیں اور سیکڑوں مضامین ومقالات سپرد قلم کئے اور نہ معلوم کتنی بڑی تعداد میں تقریظ، پیش لفظ اور مقدمہ لکھا، کم وبیش ۱۷ رسال تک دارالعلوم کے ماہانہ ترجمان ’دارالعلوم‘ کا اداریہ لکھتے رہے۔ اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام عصمت وعفت، اسلام کا نظام امن، امارت شرعیہ: دینی جدوجہد کا روشن باب، سوانح مولانا مناظر احسن گیلانی، مخطوطات دارالعلوم وغیرہ بڑی مقبول ہوئیں۔ یہ وہ محققانہ کتابیں ہیں جو اپنے موضوع پر لاجواب سمجھی جاتی ہیں۔ انہوں نے فقہ کی مشہور کتاب ’درمختار‘ کی بھی اردو شرح ’کشف الانوار‘ کے نام سے لکھی، جو چھپ چکی ہے۔ ’زندگی کا علمی سفر‘ اور ’علمی مراسلے‘ ان کی دو اہم کتابیں ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نابغہ روزگار معاصر علماء اور دانش وروں سے ان کے مراسم کتنے گہرے تھے اور ان لوگوں کی نظر میں ان کا کیا مقام ومرتبہ تھا۔ خاص طور پر مولانا عبدالرحمٰنؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ ان کے نزدیک آئیڈیل لوگوں میں تھے، جن کا ذکر خیر ہمیشہ کرتے رہتے تھے۔ وہ مسلم پرسنل لابورڈ، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فعال رکن وممبر رہے۔ قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کے انتقال کے بعد اکیڈمی کے صدر بنائے گئے۔ مختلف مکاتب ومدارس اور سماجی وملی تنظیموں کے سرپرست ونگران بھی رہے۔

مفتی صاحب دارالافتا میں ہوتے تو طلبا کو پڑھانے کے بعد استفتا کا جواب لکھنے میں مشغول ہوجاتے۔ ان کی میز پر صرف چند کتابیں ہوتیں، مگر جواب لکھنے کے لئے ان کتابوں سے مراجعت کرنے کی بہت کم نوبت آتی۔ لفافہ کھولتے، سوال پڑھتے اور جواب لکھنا شروع کردیتے۔ بغیر حوالہ اور فقہی جزئیات نقل کئے وہ جواب نہ لکھتے اور بڑی بڑی عبارتیں کتاب دیکھے بغیر نقل کردیتے تھے۔ روزانہ صبح وشام جو ڈاک ان کے حصے میں آتی

اس کا جواب اسی وقت لکھ کر منشی یا محرر کے حوالے کردیتے تھے۔ وہ آج کا کام کل پر ٹالنے کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ متوسلین ومتعلقین کے خطوط واستفسارات کے جوابات کسی اور وقت لکھتے تھے۔

مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل نہ تھے اور نہ انہوں نے یہاں کبھی پڑھا تھا۔ وہ مدرسہ مفتاح العلوم مئو، اعظم گڑھ کے تعلیم یافتہ اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ محدث کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے استاذ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف 1942 کی ’ہندوستان چھوڑو تحریک‘ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی پوری تفصیل مفتی صاحب کے کتابچہ ’جنگ آزادی کا یادگار سفر‘ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ 1943 میں وہاں سے فراغت کے بعد وہ ملازمت کے سلسلے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ گئے، لیکن علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مشورہ سے ندوۃ العلما لکھنو میں پڑھنے لگے، وہاں دل نہیں لگا، درمیان سال میں تعلیم ترک کرکے وطن آگئے اور موضع ’سانھا‘ (بیگوسرائے، بہار) کے ایک چھوٹے سے مدرسہ ’معینیہ‘ میں مدرس ہوگئے، کچھ دن کے بعد وہاں سے ڈابھیل (گجرات) چلے گئے، مگر وہاں وہ بیمار رہنے لگے تو وطن لوٹ آئے۔ صحت بحال ہوئی تو دوبارہ وہاں جانے کا قصد کیا، مگر غالباً والدین یا چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب سابق امیر شریعت بہار واڑیسہ (جن کی سرپرستی ونگرانی میں انہوں نے پہلے ’راج پور‘ نیپال کے مدرسہ محمودیہ میں پھر مدرسہ حمیدیہ ’گودنا‘ چھپرا، بہار میں تعلیم حاصل کی تھی) کے حکم سے دوبارہ ’سانھا‘ کے اسی مدرسہ میں آگئے۔ انہوں نے انتھک محنت سے چھوٹے سے مدرسہ کو بڑا مدرسہ بنادیا اور اس کے لئے لوگوں سے بیس بیگہ زمین بھی وقف کروائی۔ انہیں دنوں مدرسہ رحمانیہ خانقاہ مونگیر میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے یہاں کے کتب خانہ کے افتتاح کے موقع سے ایک بڑا جلسہ کیا، اس میں خاص طور سے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے۔ مفتی صاحب نے اس جلسہ میں لائبریری اور اس کی اہمیت وافادیت پر نہایت معلوماتی اور پرمغز مقالہ

پڑھا۔اسے سن کر قاری صاحب نے فیصلہ کیا کہ اس صالح اور نوجوان محقق کو دارالعلوم لے جانا چاہیے۔انہوں نے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے فرمایا کہ جس طرح سے بھی ہوسکے آپ انہیں دارالعلوم میں خدمات پیش کرنے کے لئے آمادہ کریں۔بعد میں خود قاری صاحب کا خط مفتی صاحب کے پاس آیا کہ آپ جیسے باصلاحیت آدمی کی دارالعلوم کو ضرورت ہے۔اس طرح وہ 1957 میں بڑے ہی آؤ چاؤ سے دارالعلوم پہنچے۔وہاں غالبا ابتدا میں ان کے ذمہ دارالعلوم کے کتب خانہ کی دیکھ بھال اور اس کی فہرست سازی کا کام سپرد کیا گیا جسے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔

جب ''فتاویٰ دارالعلوم'' کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری ان کو دی گئی تو انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد فتاویٰ کی پہلی جلد کا مسودہ تیار کرلیا اور اسے قاری صاحب کے حکم سے کتابت کے لئے خطاط کے سپرد کردیا۔انہیں دنوں قاری صاحب پاکستان چلے گئے۔انہیں وہاں کافی دنوں تک ٹھہرنا پڑ گیا۔اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ٹائٹل پر مرتب کا نام ہو یا نہ ہو۔کچھ لوگ چاہتے تھے کہ ان کا نام اس پر لکھا ہی نہ جائے۔کسی طرح ان کو اس کی خبر لگ گئی۔انہوں نے پیش کار کی مدد سے قاری صاحب سے رابطہ کیا اور صورت حال سے آگاہ کروایا۔بالآخر لمبی خط وکتابت کے بعد قاری صاحب کا حکم آیا کہ فتاویٰ پر مرتب کا نام ضرور شائع ہونا چاہیے۔دارالعلوم کے حق میں ان کا یہ دوسرا بڑا کارنامہ ہے جو انہوں نے 12 جلدوں میں ایک خاص عہد تک کے تمام فتاویٰ کو جمع کرکے انجام دیا ہے۔جب تک یہ مجموعہ فتاویٰ دنیا میں باقی رہے گا ان کا نام زندہ رہے گا۔مفتی صاحب کی ہمہ گیر شخصیت اور فقیہانہ بصیرت اس بات کی مستحق تھی کہ وہ دارالعلوم کے مفتی اعظم کی مسند پر رونق افروز ہوتے۔لیکن بعض لوگوں کی وجہ سے وہ اس اعزاز سے محروم رہے۔

ایک دن عصر کے بعد مفتی صاحب سے ملنے ان کے کمرہ پر گیا۔دیکھا کہ کچھ اساتذہ اور طلبا وہاں بیٹھے ان سے گفت وشنید کررہے ہیں۔مجھے نہیں معلوم میرے پہنچنے سے قبل تک

وہاں کیا باتیں ہورہی تھیں،مگر وہ کچھ اس طرح کی باتیں کہہ رہے تھے کہ کیوں مولانا اسعد مدنی صاحب مجھے اپنی مجلس میں حاضری کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔میں دارالعلوم کا ملازم ہوں نہ کہ ان کا۔اس پر کسی صاحب نے مزاحیہ انداز میں کہہ دیا:اگر وہاں حاضری نہیں دیں گے تو دارالعلوم سے نکالے جائیں گے۔انہوں نے فرمایا:مجھے کوئی غم نہیں،میں کوئی درخواست دے کر یہاں آیا ہوں،مجھے تو لایا گیا ہے۔دارالعلوم والے لکھ کر دے دیں گے تو میں بخوشی یہاں سے چلا جاؤں گا۔پھر کہنے لگے کہ ایسے کیسے نکال دیں گے،کوئی وجہ تو ہونی چاہیے، میں اپنی ڈیوٹی بحسن وخوبی انجام دیتا ہوں۔ایک صاحب نے کہا:آپ کی ضعیفی کو وجہ بنالیں گے۔اس پر انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا:تب تو مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو مجھ سے پہلے مہتمم کے عہدہ سے ہٹانا ہوگا،کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ضعیف ہوچکے ہیں،میں تو ان سے ہٹا کٹا ہوں۔

مارچ 1996 میں مفتی صاحب کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا تو گویا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مرجھا سے گئے اور پہلے جیسا حوصلہ وولولہ ان کے اندر نہ رہا۔تاہم پوری ذمہ داری کے ساتھ دارالعلوم میں خدمات انجام دیتے رہے۔ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے فرمایا:احمد سجاد کی والدہ کے انتقال کے بعد میرے جینے کا مقصد ہی فوت ہوگیا،اب اچھا نہیں لگتا۔میں نے عرض کیا:حضرت آپ کی عمر زیادہ ہوگئی ہے،صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی،بہتر ہوتا کہ ملازمت ترک کرکے وطن چلے جاتے،بچوں کے ساتھ رہیں گے تو غم نہ ستائے گا۔انہوں نے فرمایا:یہ تو میں بھی سوچتا ہوں،مگر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بچے اور بوڑھوں کا دماغ یکساں ہوجاتا ہے۔وہ تو ہیں نہیں،وہاں کون خیال رکھے گا،سجاد اپنی ڈیوٹی پر چلے جائیں گے،بہو کہاں تک دھیان دے گی۔میرے لئے بہتر تو یہی ہے کہ دیوبند ہی میں رہوں، یہاں پڑھنے لکھنے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں وقت کٹ جاتا ہے۔گھر جانے کے بعد تنہائی کی وجہ سے غم سے نڈھال اور کمزور ہوجاؤں گا۔اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اسی طرح

دارالعلوم کی خدمت کرتے کرتے دنیا سے اٹھا لے اور مزار قاسمی میں پاک طینت لوگوں کے قدموں میں جگہ مل جائے۔مگر قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب سے میری آخری ملاقات اپریل 2008 میں دارالعلوم شیخ علی متقی، برہان پور میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے سالانہ سمینار میں ہوئی۔جب میں ان کی خدمت میں پہنچا، وہ لیٹے ہوئے تھے۔میرے سلام کی آواز سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔خیریت معلوم کی، پھر وہ اپنے خاص لہجے میں کہنے لگے کہ اب تم آ گئے ہو میرا سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔پریشانی کچھ بھی نہیں تھی، دل اچاٹ ہوگیا تھا، وطن جانا چاہتے تھے اور مراد یہ تھی تم ہی مجھے یہیں سے چند دنوں کے لئے وطن پہنچادو۔کافی دیر کے بعد میں نے ان سے کہا:فکر نہ کریں آپ گھر ضرور جائیں گے۔

سمینار کے آخری دن یعنی ۷/تاریخ کو میں نے مفتی امتیاز صاحب کو بلایا اور مفتی صاحب کے سامنے ان سے پوچھا:آپ لوگ حضرت کو گھر کس طرح اور کیسے پہنچائیں گے؟ انہوں نے پروگرام بتادیا۔میں نے کہا:آپ ان کو دہلی سے دیوبند نہ پہنچایئے، بلکہ گھر پہنچا دیجئے یا کسی قابل اعتماد آدمی کے ساتھ بھجوا دیجئے۔اگر کسی وجہ سے آپ لوگ معذور ہوں تو مجھے اس کی اطلاع کردیجیے گا، میں کوئی انتظام کرلوں گا۔اس پر وہ راضی ہوگئے۔مفتی صاحب خوش ہوئے اور کہنے لگے دیکھا نہ شمیم آگیا، میرا سارا مسئلہ حل ہوگیا۔طے شدہ پروگرام کے مطابق وطن گئے اور کچھ دن رہ کر پھر دیوبند آگئے۔اس کے بعد ان کی صحت مستقل خراب رہنے لگی، اس لئے ملازمت ترک کرکے اگست 2008 میں ہمیشہ کے لئے وطن آگئے۔

مفتی صاحب گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔میں نے ان کو نہ کبھی کسی سے ناراض ہوتے ہوئے دیکھا اور نہ ان کو کبھی مغموم پایا، کوئی بھی بات ہوتی دل میں دبائے رہتے اور ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے۔میں نے انہیں نہ کبھی کسی کی غیبت اور شکایت کرتے ہوئے

دیکھا۔وہ نہ فضول خرچ تھے نہ بخیل، سادہ مزاج تھے اور سادگی کو پسند کرتے تھے۔ملن سار ایسے کہ چھوٹوں سے ملنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے اور اگر کسی سے ملے ہوئے زیادہ دن ہوجاتے تو چاہے وہ استاذ ہو یا طالب علم یا اور لوگ، خود ہی ان سے ملنے چلے جاتے۔نمود و نمائش اور شہرت کو وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔کسی کو کچھ دیتے تو اس کی خبر کسی دوسرے کو نہ ہوتی اور خود بھی بھول جاتے تھے۔مہمان نواز ایسے کہ چھوٹے بڑے کا قطعاً خیال نہ کرتے اور اپنی بساط کے مطابق بڑی فیاضی سے ضیافت کرتے۔جو کام کرتے محنت اور خوش اسلوبی سے کرتے۔کوئی بات بولتے تو نپی تلی کہ کبھی شرم سار نہ ہونا پڑے۔سب کو جانا ہے اور سب جانے کے لئے ہی آئے ہیں، مگر ان میں کچھ لوگوں کے جانے کا غم بہت ہوتا اور دیر تک رلاتا اور ستاتا ہے۔مفتی صاحب کے انتقال (31 مارچ 2011) سے جو علمی خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔علم وعمل کا یہ چراغ 85 سال کی عمر پا کر ایک دن ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔وہ ۷/مارچ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔تقریباً ۶/ہزار لوگوں نے انہیں اپنے قائم کئے ہوئے چھوٹے سے مدرسہ کے ایک کنارے اگلی صبح یکم اپریل کو پونے دس بجے "مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى" کہتے ہوئے دفن کردیا

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

☆☆

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدینؒ

وہ صاحب جلال نہ جانے کدھر گئے

● ادارہ

انسان روزانہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں جن کا وقت موعود آچکا ہوتا ہے، دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں، کچھ دنوں تک عزیزوں و اقارب کو اس کی موت کا ملال رہتا ہے، اور پھر وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، لوگ بھول جاتے ہیں، مگر اس دنیا میں انسانوں کے بیچ سے کچھ ایسے انسان کو بھی اللہ تعالیٰ منتخب کرتا ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں، قرآن کریم نے خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

”ولاتقولو المن یقتل فی سبیل اللہ امواتا، بل احیاؤ ولکن لا تشعرون“

(جو لوگ اللہ کی راہ میں دنیا سے چلے گئے اور شہید ہوگئے ان کو مرا ہوا مت کہو، وہ تو زندہ ہیں، مگر تم اس کو محسوس نہیں کر سکتے اس کا تم کو شعور نہیں ہے)۔

حدیث میں جناب نبی کریم خاتم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **”من قتل دون مال، فھو شھید، ومن قتل دون نفسہ فھو شھید، ومن قتل دون عرضہ فھو شھید“**۔ (بخاری ومسلم)

(جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا، اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی حفاظت کرتا ہوا، منکر

کے خلاف لڑتا ہوا، دنیا سے جائے وہ تو شہید ہیں، اس کا نام بھی رہتی دنیا تک زندہ رہے گا اور کام بھی)۔

حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس زمین پر پیدا ہونے والے ان خوش نصیبوں میں ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں، اور اپنے کارناموں اور علم و دین کی خدمت کے جو انہوں نے نقوش چھوڑے ہیں ان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے کوئی فراموش کر کے بھی ان کو بھول نہیں سکتا، وہ اللہ کے ولی تھے، ان کو مٹی بھی کھانے سے شرمائے گی۔

آج جب میں یہ تحریر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے بارے میں لکھ رہا ہوں اس ملک کی چند وہ شخصیات جن کو میں نے دیکھا یا ان سے کسب فیض اور استفادہ کا موقعہ اس حقیر کو میسر ہوا ان میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، حضرت مولانا قاری محمد صدیق احمد صاحب باندوی، حضرت مولانا قاری محمد عبیداللہ صاحب استاذ حدیث افضل المعارف الہ آباد، حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی، حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری، حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی، حضرت مولانا اجتباء حسن صاحب ندوی، حضرت مولانا احرارالحق صاحب استاذ (دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئی، حضرت مولانا محمد نصیر احمد خاں صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، استاذ محترم حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب، حضرت مولانا مجیب الغفار صاحب بنارس، حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی، حضرت محمد حسین صاحب (ملقب بہ ملا بہاری) حضرت مولانا زبیر احمد صاحب سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، (استاذ گرامی حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی، حضرت مولانا محمد انظر شاہ مسعودی، حضرت مولانا محمد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم سہارنپور، حضرت

مولانا فضیل احمد قاسمی جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا باقر حسین صاحب بانی و مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ بستی، حضرت مولانا محمد مجیب اللہ ندوی صاحب، حضرت مولانا مصطفیٰ مفتاحی صاحب، حافظ مجیب الرحمٰن صاحب اور ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب (یہ دونوں ہمارے ابتدائی اساتذہ میں ہیں جو ہمارے گاؤں کے مدرسہ فلاح المسلمین اجرہٹہ دربھنگہ میں مدرس تھے اور اجرہٹہ کے ہی باشندہ اور گاؤں کے رئیس گھرانے سے ان دونوں کا تعلق تھا، اور ہمارے ممدوح محترم جناب حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مذکورہ تمام بزرگوں کو ان کی دینی اور ملی وقومی خدمات کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔

مذکورہ تمام بزرگوں سے ہم اس مختصر سی مدت میں فیضیاب ہوئے، اور ہمیشہ یہ ہمارے بزرگان یاد آتے رہتے ہیں، میں اس تحریر میں ان تمام اکابر علماء ربانیین کو خراج عقیدت پیش کرنا مناسب سمجھ رہا ہوں، آج جو کچھ بھی ہوں اللہ رب العالمین کی عنایت، اپنے مخلص والدین کی شفقت اور اپنے انھیں بزرگوں کی نظر توجہ اور دعاؤں کے صدقہ ہوں۔

حضرت مولانا مفتی صاحب ملاقات:

حضرت مفتی صاحبؒ سے میری پہلی ملاقات، خود ان کے کمرہ احاطہ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت ہوئی جب بیت المعارف الہ آباد سے سال سوم کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سال چہارم میں داخلہ کیلئے ام المدارس دارالعلوم دیوبند گیا، داخلہ کا امتحان چونکہ شوال میں ہوتا ہے، میں امتحان کی تاریخ سے کافی پہلے ہی دیوبند چلا گیا، تاکہ تیاری کرسکوں، مفتی صاحب کے بارے میں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حضرت دیوبند میں ہیں چنانچہ اس لئے حاضر ہوا کہ حضرت سے دعاء کی درخواست بھی کروں گا اور اپنا تعارف بھی، عصر کی نماز کے بعد کمرے پر حاضر ہوا، سلام ومصافحہ کے بعد کنارے بیٹھ گیا، اپنا نام بتایا، گاؤں کا نام بتایا،

تھوڑی دیر وہاں رہا چلنے لگا تو مصافحہ کیا اور حضرت سے دعاء کی درخواست کی اس کے بعد امتحان داخلہ تک حضرت کے پاس نہیں گیا۔

دارالعلوم کا امتحان دیا اور وہاں سے یہ سوچ کر مظاہر علوم سہارنپور چلا گیا کہ کہیں دارالعلوم میں داخلہ مقدر نہ ہوا تو سال خراب نہ ہو، وہاں جاکر امتحان دیا بحمداللہ کامیاب ہوگیا، داخلہ بھی ہوگیا، مظاہر علوم میں امتحان کا مستحق ہونے کے لئے دو پارے ۲۹، اور ۳۰، یاد ہونے ضروری ہیں چنانچہ حسب حکم ناظم مظاہر علوم حضرت مولانا محمد اللہ صاحب وہاں کے درجہ حفظ کے کسی استاذ کے پاس قرآن سنانے گیا، انھوں نے دو تین مقامات سے زبانی پڑھنے کو کہا، میں نے سنا دیا، اس کے بعد باضابطہ میں مظاہر علوم کا طالب علم ہوگیا، ابھی تعلیم کا آغاز ہونا باقی تھا، بخاری شریف کے درس کا آغاز ہو چکا تھا، تبرکاً شیخ محمد یونس صاحب کے درس بخاری میں شریک ہوا۔

اور پھر اس کے دو تین دنوں بعد ہی دارالعلوم کے داخلہ کا امتحان کا نتیجہ آیا، فون کر کے ہمارے دوست مولانا محمد حسین قاسمی صاحب جو ان دنوں دہلی میں شاستری پارک میں ایک مدرسے کے بانی اور مہتمم ہیں انھوں نے بتایا کہ آپ کا نام کامیاب طلبہ کی فہرست میں آ گیا ہے، آپ فوراً دیوبند آجائیں، اتنا سنتے ہی میری خوشی کی انتہا نہ رہی، سچائی یہ ہے کہ جتنی خوشی مجھے اس دن دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کی خبر سے ہوئی اور مسرت کی لذت جو اس دن محسوس ہوئی تھی، آج تک مجھے ایسی مسرت نصیب نہیں ہوئی، اور آج تک خوشی کی لذت کو محسوس کرتا رہتا ہوں، دیوبند پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے داخلہ کی فہرست دیکھی، اس کے بعد سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی صاحب سے ملاقات کی اور ان کو خوشخبری سنائی، حسب عادت وہ بہت خوش ہوئے دعائیں دیں۔

☆☆

ابا جان کی وفات پر

وہ فقہ وفتاویٰ علمِ نبی کا نیّر تاباں ڈوب گیا

● مولانا احمد سجاد قاسمی

ہر سمت اداسی چھائی ہے مغموم یہاں ہر پیر و جواں
ہر دل میں غموں کا طوفاں ہے ہر چہرے سے ہے کرب عیاں
نمناک بنی ہیں ہر آنکھیں ماحول میں ہر سو آہ وفغاں
پژمردہ ہیں سب گلہائے چمن اور دیدۂ نرگس اشک فشاں
اے حلم ومروت کے خوگر اے مہر ومحبت کے پیکر
اے رہروِ راہِ خلد بریں پھر ڈال دے شفقت سے تو نظر

وہ خواب سلیماںؒ ندوی کے وہ عاشقِ حضرت گیلانیؒ
محبوبِ حبیبِ رحماں تھے شاگردِ رشیدِ نعمانیؒ
وہ دیدۂ طیبِ مدنیؒ کے دلدادۂ منتِ رحمانی
اسلاف کے تھے وہ عکس حسیں اور ان سے تھا رشتہ روحانی
وہ فقہ وفتاویٰ علم نبی کا نیّر تاباں ڈوب گیا
سرتاپا جو درس قرآں تھا وہ مہرِ درخشاں ڈوب گیا

وہ نرم مزاج وشیریں زباں وہ جود وسخا کا نقشِ حسیں
تھی ذوقِ عبادت سے ہر دم مہتاب سی روشن ان کی جبیں
تھے آپ تصنّع سے عاری اور ان میں تکلف کچھ بھی نہیں
وہ سہل نگار وسہل بیاں، وہ سہل پسندی کے تھے امیں
اخلاقِ جلیلہ کا حامل تربت میں ابھی خوابیدہ ہے
تھا لمبا سفر، اب منزل پر آسودہ ہے آرامیدہ ہے

”ترتیب فتاویٰ“ علم فقہ کی دنیا میں شہکار بنی
تو ”اسوۂ حسنہ“ عشقِ نبی کے جذبے کا اظہار بنی
پھر ”عفت وعصمت“ کی شہرت سے دنیا لالہ زار بنی
اور ایک ”نظام امن“ تری لوگوں کے گلے کا ہار بنی
”تاریخ مساجد“ بھی لکھی اور اس کے نظامِ اعلا کو
اور ”درسِ قرآں“ کی خوشبو سرشار کرے گی دنیا کو

تخریج مسائل میں یکتا تحقیق کے فن میں تو اعلیٰ
تحریر تمہاری اہل قلم کے واسطے روشن مینارا
سب تجھ سے محبت کرتے ہیں تو سب کی آنکھوں کا تارا
جو کام ادارے کرتے ہیں وہ تنہا تونے کرڈالا
اب قادرِ مطلق کی جانب سے جنت میں اکرام ملے
ہر حرف کے بدلے میں تجھ کو اعزاز ملے، انعام ملے

سب آپ کے مرشد اور بڑے ہیں آج یقیناً خلد نشیں
استاذ جو دل کی دھڑکن تھے وہ سب کے سب ہیں زیر زمیں
غمخوار میاںؒ صاحب تیرے ہمدرد عتیقؒ مفتیؒ دیں
احباب میں ازہرؒ شاہ ہوں یا علامہ بہاریؒ کوئی نہیں

یوں دنیا میں جو آئے ہیں سب جانے کو ہی آئے ہیں
پھر ہوک سی دل میں کیوں اٹھی کیوں ہر سو غم کے سائے ہیں

جب دارالافتا کی مجلس میں چائے کی پیالی آئے گی
کچھ چشم حزیں اس محفل میں کچھ اور ہی شے چھلکائے گی
اور ہنستے کھلتے چہروں پر یکلخت اداسی چھائے گی
اک ا?ہ بھی نکلے گی دل سے اور عرش تلک وہ جائے گی

سب لوگ عبیدِ رحماںؔ سے تب دل کا حال سنائیں گے
اور غم کو ہلکا کر کر کے با دیدۂ نم اٹھ جائیں گے

☆☆

نیک دل عالم، سہل نگار اہلِ قلم اور بہت اچھے انسان
مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ

● مولانا نور عالم خلیل امینی، دیوبند

ادیب العصر حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب دامت برکاتہم (استاذ ادب دارالعلوم دیوبند و ایڈیٹر عربی مجلّہ الداعی) کا یہ اہم مضمون ان کی تصنیف ''پس مرگ زندہ'' میں حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کی زندگی میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا موصوف کا جو مخصوص انداز بیاں ہے اس نے کئی پرانی باتوں کو بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی پر ابھی تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان میں کہیں نہ کہیں اس مضمون کے حوالے اور مضمون نگار کے دلکش اسلوب کی خوشبو ضرور نظر آتی ہے۔..................(مرتب)

مری مَشّاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بہ خود کرتی ہے لالے کی حِنا بندی

ان سطروں کے لکھنے کی تقریب:

بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ اور نیپال کی متحدہ عظیم انجمن معروف بہ ''سجاد لائبریری'' کے ذمے دار طلبہ عرصہ دو ماہ پہلے مجھ سے ملے اور بتایا کہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب

مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند، کی دارالعلوم کی خدمت سے وابستگی پر عرصہ پچاس سال مکمل ہونے کے موقع سے، ہم ذمے دارانِ انجمن خصوصاً اور طلبۂ صوبہ جات مذکورہ عموماً اور طلبۂ دارالعلوم دیوبند بالاعمّ، حضرت مفتی صاحب مدّ ظلہ کے تعارف اور تعریف وتوصیف اور ان کی خدمات وتالیفات اور مقام ومرتبے کے تذکرے پر مشتمل ایک یادگاری مجلّہ شائع کرنا چاہتے ہیں، تاکہ نسل نو کو اس کے مطالعے سے پڑھنے لکھنے اور حصولِ کمال وامتیاز میں، جی جان سے لگنے کا حوصلہ اور مفتی صاحب کے لیے ہمارے جذبۂ عقیدت واحترام کو تسکین ملے۔

یہ طلبہ میرے سر ہوئے کہ آپ بھی...... اپنے مشاغل واَعذار سے وقت نکال کر، ہم لوگوں پر شفقت فرماتے ہوئے...... اس مجلّے کے لیے کوئی تحریر عنایت فرمادیں، تو ہمارے لیے بڑے فائدے کی چیز ہوگی۔ میں اُن طلبہ کے خلوص اور مفتی صاحب کے حوالے سے ان کی قدر دانی پر مبنی محبت کی وجہ سے، ان کی درخواست کو رد نہ کرسکا، لیکن اپنے پاس سے ان کے چلے جانے کے بعد، میں یہ سوچنے لگا کہ میں کب اور کیا لکھ سکوں گا؟ کب کا تعلق وقت کی تنگی سے ہے کہ اس کے گراں قدر سرمایے کو بیماری اور اُس کے متنوع عوارض نے تتر بتر کر کے رکھ دیا ہے اور جن لمحات کو ان کی دست برد سے میں بچا لینے میں کامیاب رہتا ہوں، وہ تحریری اور تدریسی فرائض کی ادائیگی اور ان کے لیے نہ ختم ہونے والی فکر کی نذر ہوجاتے ہیں، لہٰذا ''مستحبّات ونوافل'' کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس پر مُستزاد یہ کہ زود نویس نہیں، بلکہ انتہائی ''ست نویس'' واقع ہوا ہوں، شکر کی بیماری اور اُس کے نتائج بد کی وجہ سے عقل کی شادابی، فکر ونظر کی زرخیزی اور فطری ملکے کا بانک پن یا تخلیقی صلاحیت، بری طرح مجروح ہوگئی ہے اور عائد کردہ کسی مضمون کا لکھنا تو میرے لیے اور بھی دشوار ہوتا ہے، لہٰذا وقت جانے کب اس موضوع پر لکھنے کا موقع دے گا یا نہ دے گا؟

اہل قلم کے زندوں پر لکھنے سے احتراز کی عمومی وجہ:

کیا لکھ سکوں گا کا تعلق اس بات سے ہے کہ مفتی صاحب مدّ ظلہ بلاشبہ انتہائی بافیض

عالمِ دین ہیں، لیکن کسی زندہ پر لکھنا ہم جیسوں کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے، حالانکہ زندہ باکمالوں کی قدر وقیمت سے انسانوں کو متعارف کرانا، زیادہ مفید ہے، اس لیے کہ ان سے استفادے اور فیض یاب ہونے کی راہ کھلی ہوئی ہوتی ہے، جب کہ مردہ اصحابِ کمال سے استفادے کا اس کے سوا کوئی اِمکان نہیں رہتا کہ ان کی سیرت وسوانح - بہ شرطے کہ لکھ دی گئی ہو - کا مطالعہ کر کے ان کے باکمال ہونے کے منہاج کو اپنا کر، باکمال بننے کی کوشش کی جائے اور دین ودنیا کے ان اکتسابات سے اپنا دامن بھرنے کی سعی کی جائے، جن کی وجہ سے کسی کو باکمال کہا جاتا اور لائق رشک سمجھا جاتا ہے، لیکن زندہ شخصیتیں ایسا لگتا ہے کہ قلم اور زبان کی راہ روک کے کھڑی ہوجاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ عظیم کی عظمت، باکمال کا کمال اور باصلاحیت کی صلاحیت کا حتمی نتیجہ یعنی غیرت، خودداری اور شرافت، اہل زبان اور اہلِ قلم کو ملامت اور عتاب کے لہجے میں کہتی ہیں کہ تمھیں کیسے یہ ہمّت ہوئی کہ تم میرے حامل کے جیتے جی...... اور بعض دفعہ اس کے منہ پر ...... اس کی ثناخوانی کرسکو؟ اس کی قدر دانی اور توقیر واحترام کے اور بھی طریقے اور دن ہوسکتے ہیں؟!۔

غالبًا اسی وجہ سے زندہ اہلِ علم وفضل کو تحریر وتقریر کا موضوع بنانے کا عام رواج نہیں، بلکہ صرف مردوں کے کارناموں کو زندہ کرنے کی روِش عام ہے اور معمول بہ۔ اس کی وجہ غالبًا یہ بھی ہے کہ مردوں کے حوالے سے لکھنے بولنے والا بے تکلف جتنا اور جیسا چاہتا ہے لکھتا اور بولتا ہے، کیوں کہ کسی روکنے ٹوکنے والے کی روک ٹوک کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا، اس لیے بے تکلفی، بے ساختگی، آمد اور خلوص کے عناصر کی بھرپور مدد، اس کو حاصل رہتی ہے، جبکہ زندوں کی ''حضوری'' کا حجاب طرح طرح کے مسائل کے ساتھ، لکھنے بولنے والے کے سامنے حائل ہوجاتا ہے اور ''احتیاط''، مصلحت بینی اور پسند وناپسند کے جذبات کو پیشِ نظر رکھنے کی وجہ سے ''آزادیِ رائے'' سے کماحقّہ کام نہیں لے پاتا۔

زندوں پر لکھنا، بعض وجوہ سے زیادہ مفید:

لیکن میری رائے میں زندوں کو، ان کی زندگی میں اچھی طرح جاننے اور سمجھنے، خراجِ تحسین پیش کرنے اور ان کے کارناموں کو انعاموں اور تمغوں کے ذریعے اُجاگر کر کے، ان کا مزید حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ، نسلِ حاضر کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی جو طرح یورپ میں قائم ہے اور جس کو اب دیارِ مشرق میں بھی برتا جانے لگا ہے، وہ بہت خوب اور لائق صد تقلید ہے کہ زندوں کے زندہ رہتے ہوئے، ان کے کمال اور ہنر کی صحیح معرفت کے بعد، ان سے بلا واسطہ اور بروقت فائدہ اٹھا کر ان کی نکالی ہوئی راہ، انجام دیئے ہوئے کارناموں اور روشن کی ہوئی شمع سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا اور دین اور دنیا کی ترقی کی منزلیں زیادہ آسانی اور تیزی سے طے کی جاسکتی ہیں، کیوں کہ زندوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ''نظریہ'' اور ''نمونۂ عمل'' دونوں موجود ہوتے ہیں، جبکہ مردوں کے حوالے سے سچ یہ ہے کہ ان کی سیرت و کردار کا ریکارڈ صرف ''نظریہ'' تو دیتا ہے، لیکن متحرک ''نمونۂ عمل'' نہیں دیتا، اس لئے ان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کنندہ، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سیرت و کردار کو کس طرح برپا کیا جائے؟ یہ ہمیں کون بتائے گا؟ مشین (Machine) کے ساتھ رہنما کتاب (Guidebook) اور ''کتابِ مبین'' کے ساتھ ''نورِ عظیم'' ایسا قانون فطرت ہے، جس کو خود خدائے ذوالجلال نے وضع کیا اور اس کی راہ دکھائی اور خلق کو اس پر چلایا ہے اور اس کے بندوں نے طبعی طور پر قبول کر کے اس پر عمل کیا ہے۔

سجاد لائبریری کے طلبہ کا شکریہ:

میں ''سجاد لائبریری'' کے باتوفیق طلبہ کو، مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدّ ظلہ کو تحریری طور پر خراجِ تحسین پیش کرنے اور طلبۂ عزیز کے لئے ان کی علمی و عملی کارناموں سے، ان کی زندگی ہی میں متعارف ہونے اور پھر ان

سے فائدہ اٹھانے اور ان کی شخصیت کو غنیمت جان کر، ان سے بہ راہِ راست اکتسابِ علم اور ہنر کرنے کی ہمارے دارالعلوم میں طرح ڈالنے کی کوشش کی۔ اللہ ان کی کوشش کو بار آور کرے اور انہیں اس کا بہترین صلہ اور حضرت مفتی صاحب کو صحت و عافیت کے ساتھ توفیق مزید سے بھرپور عمر عطا کرے، تاکہ وہ اور زیادہ سے زیادہ نیکیوں اور کام رانیوں کا ذخیرہ اکٹھا کر کے دونوں جہان میں خوب خوب سرخ رو ہوں۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے زیادہ گھل مل جانے کی وجہ:

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب سے بہاری ہونے کے حوالے سے ہم وطن اور ''مئو ناتھ بھنجن'' میں تعلیم پانے اور وہیں کے ایک مدرسہ ''مفتاح العلوم'' میں کسبِ علم و کمال کرنے کے حوالے سے، تعلیمی ہم وطنی کے باوجود کیوں کہ اس ناچیز نے بھی وہیں کے دوسرے مدرسے ''دارالعلوم'' میں متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی- راقم الحروف کو دارالعلوم دیوبند ہی میں داخلہ لینے کے بعد متعارف ہونے کا موقع ملا، نہ صرف متعارف ہونے؛ بلکہ دیگر محنتی اور ذوقِ تعلّم و مطالعہ سے سرشار اپنے کئی معاصر دوستوں اور ہم درس ساتھیوں کے ہم راہ بہت زیادہ گھلنے ملنے اور بے شمار علمی فائدہ اٹھانے کی سعادت حاصل رہی۔

مفتی صاحب سے جس چیز نے ہم لوگوں کو، اس وقت اور بہت سارے طلبہ کو ہمیشہ، بہت زیادہ قریب ہوجانے اور بہت بہت فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، وہ ان کی مثالی سادگی، مومنانہ انسیّت، پدرانہ اپنائیت، بزرگانہ شفقت، اسلامیانہ ہمدردی، ہر ایک کے لیے خلوص اور ظاہر و باطن کی یکسانیت تھی اور ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، ان سے کوئی مشورہ کر کے، کسی طرح کی طالبِ علمانہ گفتگو، یا کسی موضوع پر استفادے کے لیے تبادلۂ خیال کر کے کبھی بھی بے مزہ نہ ہوا، نہ یہ خدشہ ہوا کہ فلاں لفظ یا جملہ ان کی علمی شان، بزرگانہ مقام اور راہِ علم و آگہی پر ان کے طویل تجربہ کارانہ سفر کے حوالے سے ان کی عظمت کے خلاف تھا، اس لیے

خدانخواستہ، اب وہ دوسری ملاقات میں مجھے منہ نہ لگائیں گے۔

ان کی اس افتاد کی وجہ سے جس پر خالق نے مصلحت اور حکمت ہی کے تحت ان کو پیدا کیا ہے ان کی طرف ہر ملنے والے کا دل کھنچتا ہے اور وہ بار بار ملنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ وصف میرے نزدیک، ان کے سارے علمی وعملی اوصاف پر بھاری ہے، کیوں کہ یہ نبوی وصف ہے۔ حضور ﷺ فداہ ابی وامی کے پیارے ساتھی بھی اسی وصف کے حامل تھے، اسلام میں علم وعمل کے قافلے نے اسی ہتھیار سے جہاں گیری وجہاں داری وجہاں بانی کی ہے۔ خود اسلام نے دلوں کو نرم خوئی ودل جوئی، اخلاقِ کریمانہ اور خلوصِ دل برانہ کے ذریعے ہی فتح کیا ہے۔ اسلام کے سارے اکتسابات کا سہرا ''فاتحِ عالم'' محبت وخلوص اور مسخرِ عقل وقلب ہم دردی وغم گساری کے سر جاتا ہے۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے بہت زیادہ گھلنے ملنے کی اصل وجہ یہی تھی۔ کسی وقت، کسی بھی حال میں ان کے پاس چلے جائیے، وہ آپ کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہیں گے اور اس طرح خوش ہوں گے جیسے وہ آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ اگر لکھنے پڑھنے میں لگے ہوں، تب بھی وہ آپ کے آدھمکنے سے ذرا بھی کبیدہ نہ ہوں گے؛ بل کہ وہ انتہائی ضروری مشغلے کو، جس کو وہ چھیڑے بیٹھے ہوں گے، ایک طرف کو ڈال، اب صرف آپ کے لیے خالی ہو جائیں گے۔ ان کے رہن سہن، رفتار وگفتار، زندگی کے سارے جھمیلوں اور شب وروز کے سارے کاموں میں یہی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی نظر آئے گی۔ نستعلیقیت، تہذیب، متانت، نفاست، رکھ رکھاؤ اور ترتیب وتنظیم، ہے تو اپنی جگہ اچھی چیز اور جو لوگ ان اوصاف کو سلیقے سے برتنا جانتے ہیں، وہ واقعی قابلِ تعریف ہیں؛ لیکن بہرکیف ان کے برتنے میں ذرا سی ''بدسلیقگی'' اور ''بے ڈھنگے پن'' کے در آنے سے دوسروں کے ساتھ ساتھ، برتنے والے کو بھی اذیت ہوتی ہے، خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ مفتی صاحب کو آپ اپنی ذات کی طرح برت سکتے ہیں، فطرت کی عام بخششوں کی

طرح استعمال کر سکتے ہیں، جہاں چاہئے بیٹھا دیجئے، جو چاہئے کھلا دیجئے، جس سواری پر چاہئے سفر کرا دیجئے، اچھے بُرے جس انداز میں پیش آیئے، وہ اپنی بے نفسی اور پیدائشی سادگی کی وجہ سے ذرا بھی برا نہ مانیں گے۔

شخصیت کی طرح تحریر وتقریر میں سادگی:

ان کی یہی سادگی، بے ساختگی، نرمی اور گدازی، ان کی تحریر وتقریر میں بھی نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے عام فہم مفردات ومرکبات سے ان کی تحریر وتقریر کے جملے اس طرح ڈھلے ہوتے ہیں کہ آپ کو، ان کے جیسے کسی بھی کثیر التصانیف عالم اور اہلِ قلم کی تحریر میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ وہ نہ لفظیات کی شوخی سے قاری کے لیے باعثِ تکان ہوتے ہیں، نہ اُسلوب کی شوکت کے باعثِ مرعوبیت، نہ ساختیات کے بناؤ سنگار سے باعثِ الجھن، نہ فصاحت وبلاغت کی بے جا زور آوری سے باعث اذیت، نہ جملوں کی درازی اور پُر پیچ ہونے کی وجہ سے ہمت شکن۔ آپ پڑھتے اور سنتے جائیے، آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کو، آپ ہی کی بات، آپ ہی کی زبان میں، کہی جا رہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے طالبِ علمی کے زمانے میں ہم لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ میں نے لکھنے کے لیے کسی تکلف کو راہ نما نہیں بنایا۔ بس بلا ارادہ اور بے تکلف، اپنی بات کو اپنی زبان میں، کسی آورد اور گہری سوچ کے بغیر، لکھنے کا میں نے اپنے آپ کو عادی بنایا۔ لفظوں اور ترکیبوں کی تحسین وتزئین کی کبھی نہیں سوچی، نہ اس پر توجہ دی، نہ اس کو مسئلہ بنایا۔ غالبًا اچھا اور سچا اور کھرا لکھنے کے لیے، یہ بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والا کسی بھی مرحلے میں اپنے کو تھکاتا ہے، نہ قاری کو۔ اس کے سوا جتنے طریقے ہیں، بے شمار خوبیوں کے باوجود، بے شمار خرابیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کا اصول طبعی ہے، بے ساختہ ہے، سہل العمل ہے، سہل التقلید ہے۔ نو آموز اور نو واردِ بساطِ تحریر کو، آپ اس سے زیادہ

سیدھی،فطری سچّی اور حقیقت سے سوفی صد ہم آہنگ راہ کی راہ نمائی کر بھی نہیں سکتے،اسی لیے مفتی صاحب کی تحریر میں،طوالت ہے نہ تکرار،الفاظ کا الجھاؤ ہے نہ جملوں کا،ترادف کی بھرمار ہے نہ الفاظ وتعبیرات کا اِسرافِ بے جا۔

مفتی صاحب کا تحریری امتیاز:

ان کی طبعی نرمی وگدازی،سادگی وخوش اخلاقی ہی کا اثر،ان کی طرزِ تحریر پر بھی ہے:وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور خوب صورت حروف میں اپنی بات لکھتے ہیں۔سطریں بالکل سیدھی جیسے اسکیل سے لکیر ڈال کر لکھی گئی ہوں،ہر لفظ بل کہ ہر حرف سے جیسے ندا آرہی ہو کہ یہ سادہ مزاج اور تکلف نا آشنا عالم کی تحریر ہے۔مفتی صاحب بہت سے علما اور ''تعلیم یافتہ'' کہنے جانے والے بدسلیقہ لوگوں کی طرح اپنی تحریر کے بھدّے پن،شکستگی،سطروں کی کجی،حروف کی نامانوس صورت گری،یا ان کے بھاری بھرکم پن اور بڑے ''ڈیل ڈول'' کے ذریعے یا بہت باریک اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قراءت ہونے کی بنا پر، آپ کے لیے باعث اذیّت نہ ہوں گے۔وہ کوئی خط لکھیں،درخواست لکھیں،مضمون تحریر کریں،کسی کتاب کی تالیف کریں،ہمیشہ ان کی تحریر قلم برداشتہ،کاٹ چھانٹ سے پاک اور تبییض کی ضرورت سے بے نیازی ہوتی ہے۔میں نے جن معاصر اہل علم وکمال اور صاحبِ تالیف کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت سے فیض پایا ہے،ان میں تحریر کی صفائی؛ بل کہ خوش خطی کے حوالے سے علامّہ،مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کے صاحب زادے،ادیب وشاعر وعالم وفقیہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ (متوفی ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) کے بعد حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدّ ظلہ ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔اوّل الذکر تو اپنے علمی کمالات کے ساتھ ساتھ باقاعدہ خطاط اور خوش خطی کے ماہرین میں تھے،لیکن مفتی صاحب نے خوش خطی کے فن پر شاید کبھی بھی توجہ نہ دی ہوگی،

مگر طبعی طور پر ان کی تحریریں،ان تمام خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں،جن کی کسی باذوق قاری کو نہ صرف تلاش ہوتی ہے؛ بلکہ جن سے،ہر قاری کا جی خوش ہوتا ہے،کیونکہ اس کے قلب وذہن کو پڑھتے وقت راحت محسوس ہوتی ہے اور دعا دیتا ہے کہ اللہ صاحبِ تحریر کو جزائے خیر دے کہ اس نے راحت بخش طرز تحریر سے بھی فائدہ پہنچایا۔

مفتی صاحب کے تحریری وتالیفی کارنامے:

مفتی صاحب نے متنوع موضوعات پر لکھا اور کام کیا،مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) کے فتاویٰ کی تدوین وترتیب کا اہم کام انجام دیا،جو ۱۲ جلدوں میں ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے ہمیشہ شائع ہوتا رہتا ہے۔اس کے علاوہ تعارفِ مخطوطات دارالعلوم دیوبند حصّہ اول ودوم جیسا مشقت طلب کام بھی کیا۔انھوں نے نظامِ عفّت وعصمت،نظام مساجد،نظامِ تربیت،نظامِ تعمیر سیرت،اسوۂ حسنہ،تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری،تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ،مشاہیر علمائے دیوبند،حکیم الاسلام اور ان کی مجالس،حیات مولانا گیلانی،جرم وسزا کتاب وسنت کی روشنی میں،اسلامی حکومت کے نقش ونگار،دارالعلوم کا قیام اور اس کا پس منظر،وغیرہ بہت سی کارآمد کتابوں سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا ہے۔

مفتی صاحب نے اچھا کیا کہ اپنی سوانح بھی،اپنی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ سے ''زندگی کا علمی سفر'' کے نام سے لکھ کر علما،طلبہ،اہلِ قلم اور تاریخ کے شائقین کو علمی تحفے سے نوازکر،ان پر بڑا احسان کیا۔آدمی اپنے حوالے سے جتنی سچی بات خود کہہ سکتا ہے،دوسرا آدمی نہیں کہہ سکتا ہے۔بنیادی اور اصل معلومات بھی جن کے بغیر کسی تاریخ،سوانح اور سیرت کی اَساس قائم نہیں ہوسکتی،آدمی اپنے حوالے سے خود ہی فراہم کرسکتا ہے۔دوسروں کی فراہم کردہ معلومات اتنی لائقِ اعتماد نہیں ہوسکتیں،جتنی خود کی فراہم کردہ،نیز دوسروں

کے لیے کسی کے متعلق اساسی معلومات تک پہنچنا مشکل بھی ہوتا ہے، اسی لیے آج کل ''بایوڈاٹا'' (ذاتی بنیادی معلومات) کا جو سلسلہ چلا ہوا ہے، بہت مفید ہے۔

مفتی صاحب کے یگانۂ روزگار اساتذہ:

مفتی صاحب نے ہندوستان کے عصرِ حاضر کے سب سے بڑے مُحدث اور اَسماء الرجال کے فاضل یگانہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی متوفی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء جیسے استاذ کے سامنے زانوے تلمیذ تہ کیا، مولانا علاّ مہ سید سلیمان ندویؒ متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء، امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ متوفی ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء، مولانا عبدالرحمٰن امیر شریعت بہار واڑیسہ متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ متوفی ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، مولانا شاہ فضل اللہؒ متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، کی صحبت سے نہ صرف فیض پایا، بلکہ ان سے خوب خوب روحانی، علمی اور فکری پیاس بجھائی، اسی لیے نہ صرف یہ کہ ان کا علم شریعت ٹھوس ہے، بلکہ ان کے ہاں فکری استقامت، تجربے کی پختگی اور زبان وقلم کی راست روی کا جو امتیاز نظر آتا ہے، وہ انھی اساطین علم وکمال وطریقت کا فیضان ہے، جو مفتی صاحب نے خدا کی توفیق سے اچھی طرح جذب کیا تھا۔

مفتی صاحب کے پاس چند منٹ بیٹھیے، آپ ان کی گفتگو سنیے، چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں میں آپ کو زندگی کی ایسی ایسی حقیقتوں سے روشناس کرادیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آپ عَش عَش کرتے رہ جائیں گے اور حیرت ہوگی کہ دیکھنے میں ایسا سیدھا سادہ بوڑھا زندگی، انسان اور کائنات کا اتنا کچھ تجربہ کیوں کر رکھتا ہے۔ اس کے بعد اپنی زندگی میں جتنا کچھ تجربہ کریں گے آپ کے نزدیک مفتی صاحب کی کہی ہوئی بات کی سچائی کی تہیں ایک ایک کرکے کھلتی چلی جائیں گی اور یقین ہوجائے گا کہ جس حوالے

سے، انھوں نے جو بات کہی تھی، وہ حرفِ آخر یا پتھر کی لکیر تھی، اب اس سے آگے یا اس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

ظاہر وباطن کی یکسانیت:

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مفتی صاحب، صرف ظاہر کے سادہ اور نرم خو ہی نہیں، وہ دل کے بھی بہت صاف اور اُس کی بیماریوں سے میرے تجربے کے مطابق خاصے پاک ہیں، کینہ، بغض، دشمنی کے جذبات کی پرورش اور انسانوں سے نفرت کا ان کے ہاں کوئی گزر نہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اگر کسی سے کوئی تکلیف پہنچتی ہوگی، تو میرا دل کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے بھی ان کے دل میں پیدا ہونے والا تاثر، آنے اور گزر جانے والے خیال کی طرح آتا اور گزر جاتا ہوگا۔ انسان کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے، مفتی صاحب کے چہرے کو پڑھنے والا ہر آدمی میری بات کی تصدیق کرسکتا ہے۔

یہ وہ صفت ہے جو تھوڑے علم، علمی تحقیقات اور علمی افادے اور فکری نفع رسانی سے تہی دامنی، بلکہ بالکل جہل کے ساتھ بھی انتہائی محبوب ہوتی ہے، لیکن اگر یہ مفتی صاحب جیسے علمی، فکری، تالیفی اور تدریسی خدمات کے بڑے سرمایے کے حامل میں پائی جائے، تو اور بھی لائق محبت اور قدر دانی ہے، کیونکہ عموماً ان سے بہت چھوٹے قد کے، بہت سے لوگ علمی پندار کی وجہ سے دل کے میلے، ظاہر کے برّاق اور باطن کے انتہائی تاریک ہوتے ہیں۔ آپ یقین جانئے کہ اکثر ''اہلِ علم'' اور ''باکمال'' سے مل کر جی خوش نہ ہوا۔ انھیں بَرَت کر، انھیں سمجھ کر، دل نے کہا کہ واقعی دور کا ڈھول سہانا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے گفتگو کرکے، ان سے فائدہ اٹھا کر، کبھی بھی کوئی کدورت نہ ہوئی۔

مخلص وتجربہ کار مشیر:

مفتی صاحب کا ایک اور وصف بھی بہت قدر کے لائق ہے کہ آپ ان سے کسی مسئلے میں

مشورہ کیجیے، تو بہت صحیح اور ٹھوس مشورہ دیں گے۔ مشورے کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ مشورہ مخلص، صالح اور سن رسیدہ وتجربے کار سے کرنا چاہئے۔ مفتی صاحب میں یہ سارے اوصاف بہ تمام وکمال پائے جاتے ہیں۔ ان سے جب بھی کوئی مشورہ کیا اور مشورے کے بعد اٹھا، تو دل میں انشراح محسوس ہوا اور بعد میں اس پر عمل کیا، تو خیر ہی خیر نظر آیا اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ اپنے اس بندے کو بہت نوازے کہ اس نے مجھے میرے مطلب اور مفاد کی صحیح راہ دکھائی۔

خُردوں کی کام یابی کو اپنی کام یابی تصور کرنے والے:

مفتی صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خردوں کی کامیابی اور ترقی سے بہت خوش ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کی کامیابی کو وہ اپنی ہی کامیابی تصور کرتے ہیں، یہ بھی ان کے مخلص ہونے کی دلیلوں میں سے ایک ہے اور صحیح انسان، سچا مسلمان اور حقیقی معنی میں مربّی ہونے کی ٹھوس شہادت بھی۔ جب کہ بہت سے ''بڑے'' چھوٹوں کی ترقی کو اپنی تنزلی سمجھ کر بے حد رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ بہت سے خرد اور واقعتاً ناچیز قسم کے لوگ بھی نہ صرف اپنے ہم عمروں اور ہم سفروں کے آگے بڑھنے سے مَلول ہوتے ہیں؛ بلکہ اپنے بڑوں کے اکتسابات سے بھی بہت افسردہ ہوتے ہیں، جیسے ان بڑوں نے ان کا کوئی حق مار لیا ہو، یا ان کی راہ روک کے بیٹھ گئے ہوں۔

دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کی طالب علمی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تدریس کے دوران، حضرت مفتی صاحب سے میں اور میرے بہت سے ساتھی اس طرح جُڑے رہے، جیسے ایک بیٹا شفیق باپ سے اور ایک سچی طلب رکھنے والا مُریدا پنے حلیم وکریم وتجربے کار وخلوص شعار شیخ سے۔ ان سے غیوبت کے دوران خط وکتابت بھی رہی اور انہوں نے خطوط کے ذریعے بھی ہمیشہ ایسے خلوص ومحبت کا ثبوت دیا، جس کا اب کسی سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ تھے، جو زمانے کی

خُرد برد سے محفوظ نہ رہ سکے، اب چند خطوط رہ گئے ہیں، طوالت کے خوف سے صرف ایک دو خطوط پر اکتفا کیا جاتا ہے، زندگی نے وفا کیا اور خدائے کریم کی توفیق نے ساتھ دیا، تو ان شاء اللہ اپنی خودنوشت میں ان کے باقی ماندہ خطوط بھی درج کیے جائیں گے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریس کے اوّلین دنوں میں انہوں نے اپنے ایک شفقت نامے کے ذریعے ناچیز کا حوصلہ بڑھایا اور اپنے تعلق خاطر کا اس طرح اظہار فرمایا:

عزیز مکرم! أیّدکم اللہ تعالیٰ بروح منه

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ محبت نامہ ملا، دلی مسرت ہوئی، آپ نے فراموش نہیں کیا، یاد رکھا۔ یہ آپ کے انتہائی خلوص ومحبت کا نتیجہ ہے۔ آپ کے پہلے خط کا جواب لکھا تھا، حیرت ہے نہیں ملا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ آپ کا خط آتا اور اس کے باوجود میں خاموش رہ جاتا۔ یقیناً آپ کو اس سے تکلیف پہنچی ہوگی۔ مگر اس میں میری کیا کوتاہی ہے؟ میں تو ہر تذکرے کے بعد، خود ہی سوچتا ہوں کہ کب آپ کا خط آئے گا۔ اس صورت میں ناراضی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ بہرحال اس کا احساس ہے کہ آپ کے قلب میں اس خاک سار کی محبت ہے۔ آپ کے خط سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ آپ پڑھانے بھی لگے ہیں، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور اسے ترقی کا زینہ بنائے۔ ان شاء اللہ آپ کی طلب ومحنت رائیگاں نہ جائے گی، ثمرہ مل کر رہے گا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ میں ہیں تو ابھی میں ۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ سے گزرتا ہوا دیوبند آیا ہوں ضرور لکھنؤ اتر کر ملتا، میں نے سمجھا کہ جب آپ رمضان میں دہلی اور دیوبند نہیں آئے، تو گھر گئے ہوں گے۔ آپ یقین کریں جس قدر خواہش آپ کو ملنے کی ہے، اس سے زیادہ قلبی طلب اِدھر بھی ہے اور اسی کا غالباً نتیجہ ہے کہ جواب نہ پہنچنے کے بعد بھی آپ نے پھر یاد کیا۔

عزیزم سجاد احمد سلمہ (۱) فراغت کے بعد گھر گئے تھے، ابھی شوال میں ان کو ''سانحہ'' بھیج کر آیا ہوں، وہاں وہ میٹرک کی تیاری میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کام یاب فرمائے اور میاں حماد سلمہ (۲) کو جامعہ رحمانی مونگیر بھجوا دیا ہے، اس لیے کہ ''سانحہ'' سے قریب ہے۔

میاں احمد سجاد اس کی نگرانی بھی کریں گے۔ البتہ عبّاد سلمہ (۳) کو اپنے ساتھ یہاں لایا۔ وہ یہاں حفظ کررہے ہیں۔

مولانا علی میاں مدّظلہ (۴) مولانا سعید الرحمٰن سلمہ (۵) اور مولانا شمس تبریز (۶) سے سلام مسنون عرض ہے۔ اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں۔ میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے، اس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالب علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ اور مولانا محمد ناظم صاحبؒ اور مولانا اسحاق صاحب دامت برکاتہم (۷) یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گو ندوہ والے یہ نہیں جانتے۔

محمد ظفیر الدین، دارالعلوم دیوبند

شبِ ۶ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ

۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی پر، ان کے انتقال کے چند ماہ بعد راقم نے ان پر تاثراتی کتاب لکھی، تو مفتی صاحب نے اپنا برجستہ تاثر اس پر ذیل کے الفاظ میں، بہ صورتِ مکتوب میرے پاس ایک طالب علم کے ہاتھ کتاب بھیجنے کے دوسرے دن ارسال فرمایا، جو راقم کے لئے ایک وقیع سند کا درجہ رکھتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرِ عزیز (مولانا امینی) سلمہ اللہ تعالیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کی تازہ تصنیف لطیف ''وہ کوہ کن کی بات'' ابھی ایک صاحب سے ملی، سرسری طور پر دیکھ گیا، پسند آئی، خاک سار پر جو حاشیہ لکھا ہے، وہ بھی پڑھا، بلکہ پڑھ کر اپنے عزیز طلبہ کو سنایا۔ سبھوں نے پسند کیا اور مجھ پر تو آپ کا شکریہ واجب ہوگیا کہ آپ نے ایک بے مایہ کی عزت افزائی اور قدر دانی کا ثبوت دیا، یہ آپ کی محبت کا زندہ وتابندہ ثبوت رہے گا۔ حماک اللّٰہِ عن شر النوائب، جزاک اللّٰہ فی الدارین خیراً۔

آپ کی کتاب کا لب ولہجہ اور بے ساختگی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اگر میرا کوئی ایسا

شاگرد ہوتا، تو مرجانے میں فائدہ تھا- جو بھی آپ کی کتاب پڑھے گا اور اہلِ دل ہوگا، تو وہ ایسے تلمیذ رشید کی سعادت مندی پر لازماً فخر کرے گا اور کہے گا کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے بھی مل جاتا اور میں مرجاتا- اللہ تعالیٰ آپ کی یہ خدمت قبول فرمائے اور اس کے ثمرے میں کوئی ویسا ہی شاگرد آپ کو بھی عطا کردے۔ آمین۔

ہمارے طلبہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک نسخہ (کتاب کا) آپ تک بھیج کر بخل کیا، معلوم ہوتا ہے، یہی حال ان کی کتاب کا تو نہیں ہے کہ تحریر ہی تحریر ہے دل میں نقش نہیں، میں کہتا ہوں ایسی بات نہیں۔ اس کتاب کا ایک ایک جملہ بولتا ہے کہ دل میں ان کے استاذِ محترم کا جو نقش ہے، وہ اس سے بہت زیادہ گہرا ہے، میں استاذ نہیں، لیکن میں ان کو غیر مخلص نہیں جانتا، میرے تو صرف عزیز ہیں۔ والسلام

محمد ظفیر الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۲/ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

یہ سطریں کل کے مؤرخ اور سوانح نگار کے لیے قیمتی سرمایہ:

ان سطروں میں مفتی صاحب کی خوبیوں کا احاطہ ممکن ہے نہ مقصود، یہ چند باتیں برجستہ قلم کی زبان پر آگئیں، تو میں نے دستورِ زباں بندی پر عمل نہ کرکے، قلم کو اپنی باتیں بہ عجلت اس لیے کہنے دی ہیں، تاکہ ہمارے طلبہ اور تحصیل علم کے راہ رو، اپنے ذوق شوق کو مہمیز کرسکیں اور مفتی صاحب کی قدر کرنے کی، انہیں مزید توفیق ہو، تاکہ ان کی شیخوخت سے لبریز زندگی کو غنیمت جان کر، ان سے زیادہ سے زیادہ استفادے کے لیے کوشاں ہوں۔ واللہ وحدہ الموفق لکل خیر۔

نیز کل کے سوانح نویس اور تاریخ نگار کے لیے بھی، یہ باتیں ریکارڈ ہوجائیں، تاکہ انہیں اپنے کام میں سہولت ہو اور مفتی صاحب کے ساتھ ساتھ اس گنہگار کو بھی دعا دے کر اپنے رب سے اپنا بدلہ پاسکیں۔

وہ کوہ کن کی بات میں، ص۱۲۰-۱۲۱ پر حاشیے پر، اس راقم نے مفتی صاحب کے متعلق کئی سال قبل جو بات کہی تھی، جی چاہتا ہے کہ اس مضمون کو اسی پر ختم کیا جائے اس لیے ذیل میں وہ ہدیۂ ناظرین ہے:

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی: مفتی دارالعلوم دیوبند: جہاں دیدہ، نرم وگرم چشیدہ، صائب الرائے، بے تکلف، رحم دل، بات میں سادہ، معانی میں دقیق، اردو کے بے ساختہ اہلِ قلم، بیسیوں کتابوں کے مصنف، خط ایسا پاکیزہ، جیسے موتیوں کی لڑی۔ تاریخِ ولادت ۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء ہے، ان کا وطن ''پورہ نوڈیہا، ضلع دربھنگہ (بہار) ہے۔ ۱۹۴۴ء میں مفتاح العلوم مؤ سے فارغ ہوئے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی (محدث جلیل) متوفی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) کے اَخصّ تلامذہ میں ہیں۔ دینی، تاریخی اور سیرت وسوانح کے موضوعات پر بیس سے زائد گراں قدر کتابوں کے مصنف ہیں، تحقیقی مقالات ومضامین ان کے علاوہ ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ جن چند لوگوں کا میرے اوپر جو گراں قدر احسان ہے، ان میں سے ایک ہیں۔ راقم الحروف کے اردو کے مذاق کی تخلیق میں، عجیب نہیں کہ کچھ حصہ ان کا بھی ہو۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کی وساطت سے پاکستان سے آمدہ اردو کے ادبی رسالے، اپنے کمرے لے جاتا اور ان سے بہت فائدے اٹھاتا۔ ہم محبانِ ادب طلبہ، روزانہ دن رات میں ایک مرتبہ، ان کے پاس ضرور بیٹھتے اور شوقِ زبان اردو کو بالیدہ کرنے کے ساتھ ساتھ، عقل وخرد کو بھی پختہ کرتے۔

دارالعلوم سے جانے کے بعد، مراسلت کے ذریعے ہمیشہ راہ نمائی کرتے رہے اور مادی ومعنوی ہر طرح کی دست گیری سے زندگی کے کسی بھی مرحلے میں دریغ نہیں فرمایا۔ رسمی طور پر میرے استاذ نہ ہونے کے باوجود، استاذ سے زیادہ کچھ جزاء اللہ خیر الجزاء۔

☆☆

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو...

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ (مفتی دارالعلوم دیوبند) اپنے معاصر علماء میں اس وجہ کر سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل تھے کہ وہ ایک طرف جہاں علم ومعرفت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، وہیں سادگی، انکساری، راستی، تحمل، استقامت، ایثار اور خدمت خلق میں بھی بے نظیر تھے۔ اس پایہ کے اہل علم، علماء یا کسی بھی شعبہ حیات سے وابستہ شخصیات میں احترام انسانیت اور آدمیت کی اس درجہ قدر نہیں ہوتی، جتنی مفتی صاحبؒ کے یہاں تھی۔ یہ ان کی ایک ایسی خصوصیت تھی جس کے سبھی معترف اور قائل ہیں۔ ان کا ذکر ہو تو سب سے پہلے ذہن ودماغ میں وہی سادگی سے مزین سراپا نقش ہو جاتا ہے جس سے ان کی پوری زیست منور تھی۔

ملک کے عظیم علمی ادارہ میں باوقار عہدہ پر ایک مدت تک فائز رہتے ہوئے جس سادگی وجذبہ صدقیت سے انہوں نے اپنی زندگی بسر کی وہ ہر بنی نوع انسان کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

یہ راز ان کے گل ناز ہی بتائیں گے
گلوں میں اتنی لطافت کہاں سے آئی ہے

معارف قاسم جدید کو یہ فخر حاصل ہے کہ فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کے سانحہ ارتحال پر سب سے پہلے ان کی

حیات وکارناموں پر مشتمل معارف قاسم کا خصوصی شمارہ ''قاضی مجاہد الاسلام نمبر'' ۲۰۰۲ میں شائع ہوا تھا۔ جس کی بروقت اشاعت پر مدیراعلیٰ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی مدظلہ العالی کی علمی و دینی حلقوں میں خوب ستائش ہوئی تھی۔

ایک بار پھر معارف قاسم جدید نے حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کی وفات کے محض چند ایام بعد ان کی حیات وخدمات پر خصوصی گوشہ شائع کر کے اسلاف واکابر کے نقوش کی حفاظت وبازیابی اور قدردانی کا سہرا اپنے سر لے لیا ہے۔

اس خصوصی گوشہ میں شامل مضامین ومقالات کے صاحب قلم نے مفتی صاحبؒ کے علم وفن اور ان کی زندگی کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر انتہائی ایمانداری اور خلوص جذبہ سے روشنی ڈالی ہے، ان کی یہ گراں قدر تحریریں ان اساتذہ اور طلبہ کیلئے بے شک نایاب ثابت ہوں گی جو مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ پر کچھ یا بہت کچھ تحقیقی کام کرنا چاہیں گے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ مفتی ظفیر الدینؒ کا بیعت وارشاد کا تعلق پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے تھا، مگر ان کو خلافت قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (بانی ندوۃ علماء لکھنؤ) کے پوتے حضرت مولانا سید فضل اللہ الجیلانیؒ (سابق صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ورکن شوری دارالعلوم دیوبند) نے دی تھی۔ یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب پی ایچ ڈی مقالہ کے تعلق سے راقم الحروف نے حضرت مفتی صاحبؒ سے رابطہ کیا اور ملاقات کیلئے وقت مانگا، تو آپ نے اس کے جواب میں ایک مختصر تحریر ارسال کی۔

''عزیز مکرم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، خوشی ہوئی کہ آپ حضرت مولانا پر مقالہ لکھ رہے ہیں، مولانا یحییٰ ندوی سلمہ سے کافی حالات معلوم ہوئے ہوں گے، حضرت مولانا فضل اللہ صاحبؒ بڑے لوگوں

میں تھے۔ مولانا کے بہت سے خطوط میرے نام تھے، تلاش کروں گا۔ انہوں نے اس خاکسار کو خلافت بھی عطا کی تھی۔ امید یہی ہے کہ اخیر شعبان میں دیوبند میں ہی رہوں گا، ضرور تشریف لائیں''

بقیہ سب خیریت ہے۔

طالب دعا

محمد ظفیر الدین غفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند

حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کو نمونہ اسلاف، عالم باعمل مولانا سید فضل اللہ الجیلانیؒ سے بیعت وارشاد کی اجازت حاصل تھی۔ چنانچہ ایک جگہ مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

''مگر انعامات الٰہی کا نزول ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاری رہا۔ میں سخت گنہگار آدمی ہوں، مگر یہ عجیب معاملہ پیش آیا کہ صفر ۱۳۹۵ کی شوریٰ میں قطب عالم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے پوتے حضرت مولانا فضل اللہ صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ۴؍صفر ۱۳۹۵ کو بعد نماز ظہر انہوں نے مجھے مسجد دارالعلوم دیوبند میں روک لیا، میں بیٹھ گیا۔ اس دفعہ آپ کے ساتھ مولانا رضوان امام 'مسجد عامرہ' حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ ان کو بلوایا اور ان سے فرمایا میرے کپڑوں میں 'شیخ سنوسی' والا جبہ ہے لے کر آؤ، وہ لے آئے، اب حضرت مولانا فضل اللہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں تم کو بیعت وارشاد کی اجازت دیتا ہوں اور 'یہ جبہ' میری طرف سے قبول کرو، اس کے اہل تم زیادہ ہو۔ میں نے عرض کیا حضرت میں بڑا گنہگار ہوں، تیز نظروں سے دیکھا پھر فرمایا قبول کرلو، میں بصد ادب اسے اپنے سر پر رکھ لیا، بات ختم ہوگئی، آنکھوں میں آنسو آگئے۔ معلوم ہوا میرے غائبانہ میں کسی نے عرض کیا کہ حضرت! مفتی صاحب میں آپ نے کیا خوبی دیکھی کہ سب کو نظر انداز کر کے

ان کو جبۂ عطا کیا اور اجازت ارشاد و بیعت بخشی؟ فرمایا تم ان باتوں کو نہیں جانتے،: یہ صحیح ہے کہ میں موتی اور لعل و جواہر کو نہیں پہچانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے اور آپ کے حسن ظن کے مطابق خاکسار کو کسی لائق بنادے۔

حضرت مولانا فضل اللہؒ کو اجازت اپنے دادا حضرت مونگیریؒ سے تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس وقت موجودہ مرشد حضرت حکیم الاسلام کو اس کی خبر دینی چاہئے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس وقت پیر و مرشد وہی تھے اور خلافت عطا کردی ہے حضرت مولانا فضل اللہؒ نے بغیر میری خواہش بلکہ میرے وہم وگمان کے، سوچتے سوچتے ذہن میں آیا کہ اطلاع کر دینی چاہئے، سال ڈیڑھ سال بعد حضرت کو کسی طرح اس کی خبر دی۔ حضرت کو اس اطلاع سے مسرت ہوئی۔ رمضان المبارک ۱۳۹۶ میں آپ کا قیام بمبئی میں تھا، وہاں سے ۴؍رمضان ۱۳۹۶ کو خاکسار کے نام ایک گرامی نامہ موصول ہوا، اس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا:

''حضرت مولانا فضل اللہ دام مجدہ اپنے طریقہ کے شیخ اور بے نفس بزرگ ہیں، ان کی توجہ اور اجازت دہی بلا شبہ فضل خداوندی ہے اس پیش کش کو آپ نے قبول فرمایا، انشاء اللہ یہ خیر و برکت کا باعث ہوگی۔ (مکتوب گرامی، ۶۹/۱۴)

بقول حضرت مفتی ظفیر الدینؒ کوئی شبہ نہیں بزرگوں کا یہ اعتماد میرے لئے باعث سعادت اور لائق صد خیر و برکت ہے۔ اللہ تعالی ان اکابر کو توجہات عالیہ کے لائق بنائے رکھے اور حسن خاتمہ نصیب ہو اور دین و دنیا کے معاملات میں اپنی مرضیات پر اللہ تعالیٰ چلنے و مضبوطی سے قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دونوں بزرگ اللہ والے تھے۔ انشاء اللہ ان کا اعتماد خالی نہ جائے گا اور رب العالمین اپنے دامن عفو میں اس گنہ گار کو جگہ عطا فرمائے گا۔

ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی دینی، تعلیمی، تدریسی، تصنیفی، سماجی اور انسانی خدمات کے سامنے یہ 'گوشہ' سورج کو چراغ دیکھانے کے

مترادف ہے تاہم ان کی زندگی پر جو مضامین شامل کئے گئے ہیں اس کے مطالعہ کے بعد قاری بہ آسانی یہ محسوس کرسکتا ہے کہ ہم نے اس تعلق سے ایک مضبوط 'نیو' رکھ دی ہے، جس پر بڑی سے بڑی عمارت قائم کی جاسکتی ہے۔

چاند بھی حیراں ہے دریا بھی پریشانی میں ہے
عکس کس کا ہے کہ اتنی روشنی پانی میں ہے

قابل استعجاب بات یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی زندگی عزیز کا بیشتر حصہ صرف کردیا۔ تصنیف وتالیف کے علاوہ انہوں نے جو دو عظیم کارنامے انجام دئے ہیں اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پہلا تو دارالعلوم دیوبند کا 'کتب خانہ' جو بے ترتیب اور غیر مرتب تھا اسے انتہائی ماہرانہ انداز میں مرتب فرمایا۔ آج کتب خانہ دارالعلوم جس ترتیب سے مزین ہے وہ دراصل حضرت مفتی صاحبؒ کا مرہون منت ہے۔ اسی طرح ان کا دوسرا قابل رشک علمی کارنامہ ۲۱؍جلدوں میں 'فتاویٰ دارالعلوم دیوبند' کی ترتیب ہے۔ یہ فتاویٰ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے تھے جنہیں ترتیب دینے کا کارنامہ بھی حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ نے انجام دیا۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۱؍برسوں تک انتہائی خاموشی اور نیک نیتی کے ساتھ ''اندر و باہر'' کی سیاست سے اپنے دامن کو آلودہ کئے بغیر مختلف جہتوں سے مادر علمی کی خدمت انجام دی، مگر اس کا صلہ انہیں کیا ملا، دارالعلوم انتظامیہ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی اس دینی وفاداری کا جو بدلہ دیا اس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ محض ۲؍ہزار روپے ماہانہ پینشن پر ۲۰؍شعبان المعظم ۱۴۲۹ر/مطابق ۲۲؍اگست ۲۰۰۸ کو انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو نم آنکھوں سے خیر باد کہا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اسی دارالعلوم سے کئی اساتذہ سبکدوش ہوکر ۱۰؍ہزار سے زائد پینشن پا رہے ہیں، مگر مفتی صاحب کے ساتھ انتظامیہ کا یہ متعصّبانہ رویہ کئی سوالات کو جنم دیتا ہے۔

معارف قاسم جدید کے اس خصوصی شمارہ 'رمضان المبارک نمبر' میں رمضان کریم کی مناسبت سے متنوع عنوانات کے تحت اس کے فیوض و برکات اور مسائل پر اہم ومعلوماتی مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اصلاح معاشرہ سے متعلق گراں قدر مضامین کے ساتھ ساتھ آخری حصہ میں حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ پر ایک گوشہ شائع کیا جارہا ہے۔ معارف کی یہ کوشش کتنی کامیاب ہے، کیا کمی رہ گئی جس کی بھرپائی ممکن تھی مگر ہماری توجہ نہیں گئی، قارئین اپنے خطوط اور رائے سے ضرور نوازیں، ہمیں آپ کے مفید مشوروں کا ہمیشہ کی طرح انتظار رہے گا۔

☆☆

حضرت مولانا سید نظام الدین رحمہ اللہ
حیات و خدمات

سوانحی خاکہ

امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ

● محمد عارف اقبال

نام .... سید نظام الدین

تخلص .... فرحتؔ گیاوی

ولادت .... 31/مارچ 1927ء مطابق 1345ھ

بمقام .... محلہ پرانی جیل، گیا (بہار)

والد محترم .... قاضی سید حسینؒ (تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ)

والدہ کی وفات 1930ء

ابتدائی تعلیم (رسم بسم اللہ) 1931ء

مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخلہ 1941ء

والد کی وفات 1942ء

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ 1942ء

دورۂ حدیث سے فراغت 1946ء

تخصص فی الادب 1947ء

مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی میں بحیثیت صدر مدرس 1948-962ء

قاضی شرف الدین (دادا) کا انتقال 1949ء

رشتہ ازدواج سے منسلک 31/مارچ 1950ء

امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے پہلی ملاقات............1958ء

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے پہلی ملاقات..............................1958ء

مفسر قرآن حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کا انتقال..... 1961ء

مدرسہ رشید العلوم چترا میں صدر مدرس 1963-1964ء

قاضی صاحبؒ کی طرف سے امارت آنے کیلئے مسلسل اصرار 1964ء

امارت سے وابستگی اور ناظم امارت شرعیہ 1965ء

پہلا سفر حج 1969ء

امارت کی نئی عمارت کی سنگ بنیاد 15/نومبر 1981ء

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام 8/اپریل 1973ء

دوسرا سفر حج 1988ء

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا قیام .... اپریل 1989ء

امیر شریعت رابعؒ کی وفات 19/مارچ 1991ء

بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے آپ کا انتخاب .... مئی 1991ء

رکن سنٹرل وقف کونسل .... 1972ء تا 1997ء

نائب امیر شریعت کے عہدہ پر 12/مئی 1991ء

بابری مسجد کی شہادت کے احتجاج میں صدر تھانہ دہلی میں گرفتاری......9/جنوری 1993ء

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا انتقال......2/ستمبر 1998ء

امیر شریعت کے منصب پر 1/نومبر 1998ء

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا انتقال 4/اپریل 2002ء

رکن، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ 1996ء

رکن، دارالعلوم دیوبند 1997ء

وفات.......................۳/محرم الحرام ۱۴۳۷ھ مطابق 17/اکتوبر 2015ء

ایک چراغ اور بجھا

مولانا سید نظام الدینؒ

● مولانا عبدالمتین منیری

17/اکتوبر 2015 کی شام کو خبر آئی کی حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انتقال کے وقت مولانا ملت اسلامیہ ہندیہ سے وابستہ اہم اور باوقار ذمہ داریوں اور امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے کئی ایک معزز عہدوں پر فائز تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر 88 سال تھی۔ آپ کی ولادت مورخہ 31 مارچ 1927ء محلّہ پرانی جیل، گیا بہار میں ہوئی تھی۔ مولانا کی رحلت کے ساتھ امت مسلمہ ایک سلجھے ہوئے، پرہیزگار، بردبار اور امانت دار قائد سے اس وقت محروم ہوگئی جب کہ آپ جیسی قیادت کی ملت کو پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔

مولانا کے والد ماجد قاضی سید حسین صاحب ایک جید عالم دین، اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں میں تھے۔ آپ کی والدہ کی وفات 1930ء میں اس وقت ہوئی جب آپ نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا، ابھی آپ کی عمر دودھ پینے کی تھی، چار سال کی عمر ہوئی تو 1931ء میں بسم اللہ خوانی سے آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا، اور گھریلو تعلیم ختم کرنے کے بعد 1941ء میں بہار کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں آپ کا داخلہ ہوا۔ ابھی عمر پندرہویں سال میں تھی کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جس کے ایک سال بعد 1942ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد

مدنی رحمہ اللہ علیہ، مولانا اصغرحسین، وغیرہ اساطین علم سے کسب فیض کیا، جون 1942ء میں آپ کوحکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ علیہ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ 1946ء میں آپ کی فراغت ہوئی اور آپ نے شیخ الادب مولانا اعزازعلی کے زیرسایہ 1946ء میں تخصص فی الادب کی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد آپ ریاض العلوم ساٹھی چمپارن میں تدریس سے وابستہ ہوگئے، جہاں آپ نے 1948 سے 1962ء تک بحیثیت صدر مدرس خدمات انجام دیں۔ 31 مارچ 1950ء کوآپ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے تیسرے امیر مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کے انتقال کے بعد جب امارت جمود اورانتشار سے دوچار ہوگئی تھی تو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور دیگر اکابر کے اصرار پر مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے امیر شریعت کا منصب قبول کیا، جس کے بعد آپ نے 1957ء میں مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب کو قاضی شریعت کے جلیل القدرعہدے پر فائز کیا، قاضی صاحب اس وقت نئے نئے دیوبند سے فارغ ہوکر آئے تھے اور عمر کے پچیسویں سال میں ابھی داخل نہیں ہوئے تھے۔ 1958ء میں مولانا سیدنظام الدین صاحب کی امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کے قائم کردہ ادارے میں آمد ہوئی اور یہیں پہلی مرتبہ حضرت امیر شریعت اور مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب سے آپکی ملاقات ہوئی۔ 1960ء میں جامعہ رحمانیہ میں آپ کی دوبارہ آمد ہوئی اور 1963ء۔ 1964ء میں آپ نے مدرسہ رشیدالعلوم چترا میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دوران قاضی صاحب سے آپ کا ربط وضبط بڑھا۔ جو 4/اپریل 2002ء میں قاضی صاحب کی رحلت تک اس طرح قائم رہا جیسے دو جان ایک قالب ہوں، اللہ تعالی نے ان دونوں کی رفاقت میں امت اسلامیہ ہندیہ کے بڑے بڑے کام لئے۔

1965ء میں قاضی صاحب کے مسلسل اصرار پر آپ نے ناظم امارت شرعیہ کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں، 19 مارچ 1991ء کوامیر شریعت مولانا رحمانی کی رحلت کے بعد جب مولانا عبدالرحمٰن صاحب امیر شریعت بنے تو آپ کا بحیثیت نائب امیر شریعت انتخاب عمل میں آیا۔ جن کی رحلت کے بعد آپ کوامیر شریعت بہار واڑیسہ منتخب کیا گیا۔

قاضی اور ناظم کی جوڑی نے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کی زیر سرپرستی امارت شرعیہ کواعتبار بخشنے اوراسے اوپر اٹھانے کی انتھک کوششیں کیں، ان حضرات کی قربانیوں سے یہ ادارہ ایک کمرہ سے اٹھ کر ملک کا معتبر ترین ادارہ بن گیا، اس کی عالیشان عمارت کھڑی ہوئی اور اس کے ماتحت کئی ایک ادارے قائم ہوئے جس نے مسلمانان بہار کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

مولانا سیدنظام الدین صاحب مرنجان مرنج بزرگ تھے، انہیں سب کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنرآتا تھا، ساتھ ہی ساتھ نہایت ہی امانت دار اور دیانت دار تھے۔ آخری سانس تک امارت کی مالیات کا نظام اپنے ہاتھ میں رکھا، جس کی وجہ سے چالیس سال پر محیط طویل عرصہ میں مالیات کے کسی تنازعہ نے امارت شرعیہ کو میلا ہونے نہیں دیا۔ قاضی وناظم میں افہام و تفہیم کی روح کارفرما تھی، لہٰذاان کے تعلقات میں انا کی خلیج کبھی آڑے نہیں آئی، انہوں نے ملت کے مفاد کو ہمیشہ ہر مفاد سے بلند رکھا، اور جس ادارے کی بارآوری کے لئے انہوں نے اپنا خون خشک کیا تھا، اس پر آنچ نہ آنے دی، ایسی رفاقت کی مثال شاذونادر ہی ملے گی۔

اس کی کا اندازہ اس بات سے آپ لگا سکتے ہیں کہ مولانا سیدنظام الدین صاحب کو امارت شرعیہ میں لانے والے قاضی صاحب تھے، آپ بھی معاملہ فہمی اور ماہرانہ صلاحیت میں اپنی مثال آپ تھے، جب تک زندہ رہے فقہی گتھیاں سلجھانے میں کم ہی لوگ ان کی برابری کرسکے۔ ایک بڑا حلقہ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کی رحلت کے بعد آپ کوامیر شریعت کے منصب کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتا تھا، لیکن کسی تنازعہ سے بچتے ہوئے آپ

نے مولانا سید نظام الدین صاحب کو نائب امیر شریعت منتخب کیا آیا، اس انتخاب سے ان حضرات کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا، امارت شرعیہ کے امور بھی حسب سابق چلتے رہے، کیونکہ عملاً انہی دو حضرات کے ہاتھوں میں امارت شرعیہ کی باگ ڈور تھی، پھر یکم نومبر 1998ء کو امیر شریعت پنجم کی رحلت کے بعد آپ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا اور قاضی صاحب آپ کے نائب بن گئے۔

28/دسمبر 1972ء کو ممبئی میں کل ہند مسلم پرسنل لا کنونشن بھٹکل کے جناب عبدالقادر کی کنوینر شپ میں منعقد ہوا، کنونشن کی تحریک پر 8/اپریل 1973ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ علیہ اس کے اولین صدر منتخب ہوئے اور امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ علیہ اس کے جنرل سکریٹری، بورڈ کے روز اول سے آپ نے قاضی صاحب کے ساتھ امیر شریعت کا سایہ بن کر خدمات انجام دیں، اور بورڈ کے مقاصد کے حصول اور اسے کامیاب کرنے کے لئے امکان بھر اپنی بھرپور صلاحیتیں صرف کیں۔ لہٰذا امیر شریعت مولانا رحمانی کے انتقال کے بعد آپ کا مئی 1991ء میں بورڈ کا جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔ ان چوبیس سالوں کے دوران جو بحران اٹھے، جن مسائل ومشکلات سے امت اسلامیہ ہندیہ دوچار ہوئی، بورڈ کو توڑنے اور کمزور کرنے کی جتنی سازشیں ہوئیں، مولانا نے کمال حکمت اور دانائی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بورڈ کی لڑی کو پروئے رکھنے کی کامیاب کوششیں کیں۔

مولانا نے کبھی عہدوں کا پیچھا نہیں کیا، عہدے ان کے پیچھے بھاگتے رہے، 31 دسمبر 2000ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی رحلت کے بعد جب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ علیہ بورڈ کے صدر منتخب ہوئے تو ایک موقعہ ایسا آیا جب کہ بورڈ کے صدر اور جنرل سکریٹری دونوں کلیدی عہدوں پر امارت شرعیہ کے عہدیدار، امیر شریعت اور نائب امیر منتخب ہوئے، چونکہ بورڈ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی

نمائندگی کرتا ہے، لہٰذا آپ کو احساس ہوا کہ ایک ہی حلقے سے کلیدی عہدیداران کا انتخاب بورڈ کی روح کے منافی ہے، لیکن قاضی صاحب کے اصرار اور ممبران کی خواہش پر مولانا اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ 4/اپریل 2002ء میں قاضی صاحب کی رحلت تک چند سال صورت حال یہ رہی کہ امارت شرعیہ میں مولانا امیر شریعت تھے تو قاضی صاحب نائب امیر، اور پرسنل لا بورڈ میں قاضی صاحب صدر تھے تو مولانا جنرل سکریٹری، اس طرح معاملات میں شخصیت کے ساتھ منصب کا احترام دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔

مولانا نے قاضی صاحب کے رفاقت میں جن اداروں کے قیام میں حصہ لیا، ان میں نومبر 1988ء میں سجاد اسپتال کا قیام، اور اپریل 1989ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی کا قیام، مئی 1996ء میں وفاق المدارس کا قیام، 1998ء میں المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء کی تاسیس بھی بہت اہم ہے۔ آپ 1996ء سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو، اور 1997ء سے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوری رہے۔ مولانا نے جن شخصیات کے ساتھ کام کیا انہیں اپنا گرویدہ بنایا۔ بورڈ کے موجودہ صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ بھی آپ کی خوب جمی، ان دونوں کے رجحانات اور فکری انداز اور تحمل اور براشت کی قوت نے امت کو بہت سہارا دیا، یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا کا داغ مفارقت مولانا سید محمد رابع صاحب کے لئے کتنا بڑا ذاتی نقصان ہے۔

مولانا نے عمر طبعی پائی، باوجود اس کے آپ کا جدا ہونا ملت اسلامیہ ہندیہ کیلئے ایک عظیم خسارہ ہے، جس کی تلافی مشکل ہی سے ہو سکے گی۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی میں اپنے اخلاق، مروت، صلاحیت، للّٰہیت اور قربانی کے جو چراغ جلائے تھے، ان کی لو کبھی نہ بجھے، چراغ سے چراغ جلتے رہیں، اسی میں امت کی بھلائی ہے، یہی ان کے درجات بلند سے بلند کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ **اللھم اغفرلہ وارحمہ۔**

☆☆

حضرت امیر شریعت مولانا سید نظام الدینؒ
حیات و خدمات

● محمد عارف اقبال

مذہب اسلام میں امارت گویا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خلافت و نیابت کا جو فریضہ امت مسلمہ پر لازم کیا گیا وہ اپنی تمام تر قوتوں اور بنیادی وجاہتوں کے ساتھ ساتھ قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں اسلامی امارت ظالم و جابر حکمرانوں کے استبداد سے مغلوب ہونے لگی تو زعمائے ملت اور مفکرین قوم وملت نے ایک مشترکہ میٹنگ طلب کی اور یہ لائحہ عمل اور قرارداد؛ بلکہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا گیا کہ اسلامی شان وسطوت کی بقا اور فقہ وفتاوی نیز اسلامی عائلی قوانین کی پاسداری اور نفاذ کیلئے ایک ادارہ کا قیام ناگریز ہے؛ لہذا ان ہی خطوط و نکات کے تئیں امارت شرعیہ کا قیام 1921 میں عمل میں آیا اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمہ نے جو طرح اور بنیاد ایک اسلامی امارت کیلئے ضروری سمجھا تھا، امارت شرعیہ کیلئے لازم تصور کیا، افراد آتے گئے اور جو نظریہ زعمائے ملت اور مفکرین قوم وملت نے امارت کیلئے پیش کیا تھا، اسے حرزِ جان بنا کر فروغ و احیاء میں مصروفِ کار رہے۔ اس ذیل میں بڑے بڑے اسماء قابلِ ذکر ہیں، بالخصوص امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کی خدمات کسی بھی فرد سے مخفی نہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی دوسرے اکابر ہیں جنھوں نے امارت کے تمام بنیادی اصولوں کے تئیں اپنی جاں سپاری کے ساتھ فرائض کی انجام دہی کو لازمی سمجھا اور اس کے نتائج بھی ثمر آور ثابت

ہوئے۔ اسی کڑی میں امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی ذات گرامی ہے، جنھوں نے ہر ممکن امارت شرعیہ کی ترقی و استحکام کیلئے کوششیں کی اور امارت شرعیہ کو ہمہ جہت ترقیات سے ہم کنار کیا۔

میر کارواں حضرت امیر شریعت مولانا نظام الدین صاحبؒ کی امارت شرعیہ سے وابستگی میں بہت حد تک حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی دیرینہ خواہش اور اصرار کا خاص دخل ہے۔ حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ امارت شرعیہ سے وابستہ ہوئے تو امارت کے کاز کو آگے بڑھانے اور مزید فعال بنانے کے لئے ان کی نظر انتخاب امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدینؒ پر پڑی۔ حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی طرف سے شدید اصرار ہوتا کہ امارت شرعیہ تشریف لائیں اور اپنے اکابر کی اس امانت کو سنبھالیں۔ بالآخر 1965 کے اوائل میں مولانا سید نظام الدینؒ امارت شرعیہ تشریف لائے۔ خداداد صلاحیت، بیدار مغزی اور فعالیت کے باعث ان کو امارت کی نظامت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ تقریبا 34 سال تک اس ذمہ داری کو نبھائی اور امارت شرعیہ کے تمام شعبہ جات کی ترقی استحکام نیز اس کی توسیع میں جانفشانی سے کام لیا، یہاں تک کہ امارت کی ترقی خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی خوب عیاں ہونے لگی۔

امیر شریعت مولانا سید نظام الدینؒ کی پیدائش 31 مارچ 1927 کو بہار کے گیا شہر کے محلّہ پرانی جیل خانہ واقع شاہ شریف صاحب شملہ والے کے یہاں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں رسم بسم اللہ ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ پنچیتی اکھاڑہ کی مسجد سے شروع ہوا۔ دارالعلوم دیوبند میں مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا عبدالسمیع صاحب، مولانا ادریس کاندھلوی صاحب، قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہم الرحمہ جیسے اساطین علم وفن اور منبع علوم ومعرفت سے شرف تلمذ حاصل کیا اور یوں وہ علم وکمال کے اوج ثریا تک پہنچے، ان کی فراغت دارالعلوم سے 1947 میں ہوئی اور یہیں فقہ وتفسیر میں تخصص بھی کیا، فراغت کے

بعد مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی چمپارن میں بحیثیت صدر مدرس درس وتدریس کا آغاز کیا۔ یہاں تقریباً 11 سال تک اپنے فرائض منصبی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اس دوران سینکڑوں کی تعداد میں علماء اور محافظین دین وملت کی فوج تیار کی۔ مولانا ریاض احمد صاحب کے انتقال کے بعد بعض وجوہ کے باعث مدرسہ ریاض العلوم سے مستعفی ہوگئے اور اپنے گھر واپس لوٹ آئے۔ 1963 میں مولانا رحمت اللہ چتراوی کی دعوت پر مدرسہ رشید العلوم چترا ہزاری باغ تشریف لے گئے اور دوسال تک صدر مدرس کی حیثیت سے درس وتدریس کے ساتھ مدرسہ کے انتظام وانصرام سے وابستہ رہے، اس طرح حضرت امیر شریعت بحیثیت مجموعی /16 سالوں تک درس وتدریس سے وابستہ رہ کر تشنگان علوم نبوت کی تشنہ لبی کو سیراب کرتے رہے۔ حضرت امیر شریعت کا طرز درس اپنی مثال آپ تھا؛ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ وہ ایک طرزِ نو کے موجد تھے، افہام وتفہیم کا خداداد ملکہ حاصل تھا، صرف ونحو کی باریکیوں کو یوں واضح کرتے کہ گویا اس کی تصویر کشی کررہے ہوں، غبی سے غبی طالب علم کو اسباق یوں ذہن نشیں ہوجاتے کہ نقش کالحجر ہوں۔ جیسا کہ ماقبل میں بھی گذرا کہ مولانا سید نظام الدینؒ امارت شرعیہ میں قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ کے شدید اصرار کے بموجب 1965 میں تشریف لائے۔ انتظامی صلاحیت، بیدار مغزی، دیانتداری اور بردباری کی وجہ سے امارت شرعیہ کے ناظم مقرر کیے گئے۔ قرعہ فال بنام ''من دیوانہ زدندیہ'' کے مصداق پر پورا اترتا ہوا نظر آیا جب مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کی وفات حسرت آیات پیش آئی اور ایک خلا بھی محسوس ہوا کہ اب امارت شرعیہ کی قیادت کون کرے گا اور کون ہے جو قومی وملی مفاد کیلئے غور وخوض کر کے مثبت راہ ہموار کرے گا۔ اس موقع پر حضرت قاضی مجاہدالاسلامؒ کے اس قول کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ہمارے حلقہ میں وہی سب سے زیادہ قابل اتفاق شخصیت ہیں؛ اس لیے میری نگاہ میں ان کے ہاتھوں امارت شرعیہ کا مستقبل محفوظ ہے۔ مجلس شوری کے فیصلے اور مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب کی تجویز کے باعث حضرت

مولانا کا یکم نومبر 1998 میں بحیثیت امیر شریعت انتخاب عمل میں آیا۔

آپ کے زرّیں کارنامے:

امارت شرعیہ سے وابستگی کے بعد امارت ہی اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ آپ اور آپ کے رفیق کار قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ قاسمی دونوں نے مل کر پورے صوبہ بہار کا دورہ کر کے امارت شرعیہ کو متعارف کرایا، اس کے مطالبات سے لوگوں کو روشناس کرایا اور اس کی اہمیت وافادیت کا احساس دلایا نیز امارت شرعیہ کے دائرہ کار اور اس کے ارتباط کو لوگوں میں وسیع کیا، آپ نے ملک کے تمام مسائل کو اٹھایا اور جو مسائل خواہ وہ ملی ہوں یا ملکی بھرپور طریقہ سے اس کے تدارک کے تئیں کوشش کی، امارت شرعیہ کے ناظم کے عہد سے امیر شریعت کی مدت کار میں بے شمار ملی وفلاحی کام میں پیش پیش رہے، امارت شرعیہ کے تمام شعبہ جات کی ترقی واستحکام اور توسیع میں اہم رول ادا کیا، آپ کی عظیم خدمات کا دائرہ وسیع ہے جسے زمانہ فراموش نہیں کرسکتا۔ جن میں سے کچھ یہاں پیش خدمت ہے۔

☆ ابتداء میں دفتر امارت شرعیہ تنگ جگہ میں تھا، جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی بھی مشکل سے ہو پاتی تھی آپ نے خانقاہ سلیمانیہ کے مکان کا ایک حصہ جو خلوت کے نام سے موسوم تھا، دس سال کیلئے کرایہ پر لیا یہ مکان ءتک امارت کے تصرف میں رہا۔

☆ داروغہ نظیر کے مکان میں امارت شرعیہ کا دارالقضاء قائم تھا جو کہ کرایہ پر تھا آپ کی کوشش سے اس مکان کو خرید کر امارت شرعیہ میں شامل کرلیا گیا۔

☆ دارالامارت کیلئے زمین کے حصول کی کوشش شروع کی اور پھر حاصل ہوجانے کے بعد رقم کی ادائیگی کیلئے آپ اور قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ نے ملک کا دورہ کیا اور پھر اپنی نگرانی میں اس کی احاطہ بندی کرائی جو کہ ایک مشکل کام تھا۔

☆ مولانا سجاد میموریل اسپتال کی تعمیر اور پھر آپ ہی کی نگرانی میں اس کی پہلی منزل تعمیر ہوئی نیز آپ کے حکم وایماء پر کئی دیگر شعبہ جات بھی قائم ہوئے۔

☆ آپ ہی کے عہد میں مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ہوا اور پھراس کی کئی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم ہوئیں۔

☆امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا۔

الغرض ان خدمات کے علاوہ اور بھی سینکڑوں خدمات ہیں جو حضرت امیر شریعت کے ہی عزم محکم، خلوص وایثار اور عمل پیہم کے باعث انجام پذیر ہوئے۔

مسلم پرسنل لا اور حضرت امیر شریعت:

آپ امارت شرعیہ کے ساتھ ساتھ ملک کے مسلمانوں کی سب سے بڑی اور متحدہ جماعت مسلم پرسنل لا بورڈ کے ابتدائے قیام سے ہی رکن رہے اور پھر جب پرسنل لا بورڈ کے پہلے جنرل سکریٹری حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی وفات ہوئی تو اکابر ملت کی نظر انتخاب آپ پر ہی پڑی اور متفقہ طور پر آپ کو اس عہدہ جلیلہ کے لئے منتخب کرلیا گیا۔اس طرح آپ پرسنل لا بورڈ کے دوسرے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے منتخب ہوئے اور آخری سانس تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہ کر ملت اسلامیہ ہندیہ کے مسائل کو حل کرنے میں انتہائی دیانت داری اور فعالیت کے ساتھ پیش پیش رہے۔

قضاء اور کچھ اہم فیصلے:

حضرت امیر شریعت مولانا نظام الدین صاحب یوں تو امارت شرعیہ کے ناظم تھے اور قضا کی ذمہ داری حضرت قاضی مجاہدالاسلام (قاضی القضاۃ) اور ان کے نائبین نبھار رہے تھے، امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ آپ کی ذہانت اور تفقہ کے قدرداں تھے اور خوب اعتماد بھی کرتے تھے؛ اس لیے کبھی کبھی قاضی صاحب دفتر میں موجود نہ رہتے تھے تو دارالقضاء سے متعلق تمام فیصلے آپ کے ہی حوالے کرتے، چونکہ امارت شرعیہ کے دارالقضاء کے فیصلہ میں تاخیر نہیں کی جاتی ہے؛ اس لیے حضرت قاضی صاحب کی عدم موجودگی میں آپ

ہی قاضی کی حیثیت سے فیصلہ کرتے اور دستخط فرماتے۔اس طرح حضرت امیر شریعت مولانا نظام الدین صاحبؒ کے قلم سے سینکڑوں فیصلہ صادر ہوئے جو امارت شرعیہ کے رجسٹر میں محفوظ ہیں۔ یہاں بطور استشہاد کے ایک فیصلہ نذر قارئین ہے۔

(مقدمہ:۱) اس مقدمہ میں مدعیہ نے مختلف اسباب کے تحت فسخ نکاح کا مطالبہ کیا ہے۔حضرت امیر شریعت نے فسخ نکاح کیلئے سبب کو ثابت پایا اور فسخ نکاح کا فیصلہ کیا۔قابل ذکر یہ ہے کہ مدعی علیہ نے جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا، کچھ دوسرے علماء سے مشورہ کر کے حضرت امیر شریعت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی اور اس فیصلہ کو غلط ثابت کرنے کی پوری کوشش کی۔اپیل کی سماعت کے بعد قاضی مجاہدالاسلامؒ نے تفصیلی بحث کی اور اس فیصلہ کے حق ہونے کو پوری طرح ثابت پایا اور حضرت امیر شریعت کے اس فیصلے کو بعینہ برقرار رکھا۔

(مقدمہ:۲) اس مقدمہ میں مدعیہ کا دعوی ہے کہ بیس سال پہلے مدعی علیہ سے نکاح ہوا پھر مدعی علیہ نے اس کو طلاق مغلظ دے دی ہے اس نے عدت گذار ر دوسری شادی بھی کر لی، ابھی تک اس کو مہر واپس نہیں ملا ہے، دلوایا جائے۔اسی طرح اس نے کچھ زیورات کے بارے میں دعویٰ کیا کہ وہ مدعی علیہ کے پاس ہیں اسے بھی دلوائے جائیں۔

مدعی علیہ نے طلاق دینے کا انکار کیا ہے، مگر گواہوں کے بیانات سے مدعی علیہ کی طرف سے مدعیہ کو تین طلاق دینے کا اقرار کرنا بھی ثابت ہے؛ اس لیے حضرت امیر شریعت نے وقوع طلاق کا فیصلہ کیا ہے اور مہر ادا کرنے کا بھی حکم دیا ہے، مگر مدعیہ کے زیورات کا مدعی علیہ کے یہاں ہونا ثابت نہیں ہوا اس لیے یہ دعوی خارج کیا گیا۔

(مقدمہ:۳) اس مقدمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ فریقین کے درمیان سرکاری عدالت میں بھی مقدمہ دائر ہوا تھا وہاں آپس میں صلح ہوگئی تھی پھر دارالقضاء امارت شرعیہ میں مقدمہ دائر ہوا اس مقدمہ میں مدعیہ نے زیورات کا مطالبہ کیا ہے نیز حق حضانت کا بھی دعویٰ ہے۔

عموماً یہ بات ذہن میں رہتی ہے کہ ایک خاص مدت تک ماں کو حضانت کا حق ہوتا ہے

اس کے بعد باپ کو یہ حق منتقل ہوجاتا ہے اور یہ دونوں کا حق ہے اور یہ بات ذہن سے اوجھل ہوجاتی ہے کہ ماں باپ کے حق حضانت کے ساتھ بچہ کا بھی حق ہوتا ہے

حالانکہ بچہ یا بچی کا حق ماں باپ کے حق پر مقدم ہے اسی لئے بچہ بچی کے نفع وضرر کو مقدم رکھا جاتا ہے اگر ماں کے پاس رکھنے میں بچہ کو ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہو تو اس مدت میں بھی جس میں ماں کو حق حضانت ہوتا ہے بچہ ماں کے حوالہ نہیں کیا جائے گا۔

اس مقدمہ میں بھی صورت حال کچھ یہی ہے ایک بچہ کی عمر ڈھائی تین سال تھی اور اس وجہ سے مدعیہ نے اپنا حق سمجھ کر اس کا مطالبہ بھی کیا تھا لیکن حالات ایسے ثابت ہوئے کہ اس عمر کے باوجود اگر بچہ ماں کو دیا جاتا تو اس کو ضرر پہونچنے کا اندیشہ تھا اس لیے حضرت امیر شریعت نے مدعیہ کا دعویٰ خارج کرتے ہوئے بچہ کو باپ کے پاس رہنے کا حکم دیا تا کہ بچہ کو ضرر سے بچایا جاسکے۔ زیورات کے بارے میں بھی مدعیہ کا دعویٰ ثابت نہ ہوسکا؛ اس لیے مدعی علیہ کو اس کے مطالبہ سے بری الذمہ قرار دیا گیا ہے۔

اعزاز اور ایوارڈ:

حضرت امیر شریعت نے ملی ودینی خدمات کے جو نقوش چھوڑے اس کے اعتراف میں انہیں یہ حق حاصل ہے کہ انہیں دنیاوی اعزاز واکرام سے نوازا جائے، تاہم آپ کے مزاج میں ایوارڈ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے چنانچہ ذیل میں اتفاقاً ملک کے مختلف علمی، سیاسی، سماجی اور دعوتی تنظیموں نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں جن اعزاز واکرام سے نوازا ہے اس پر مختصراً ایک نظر ڈالی جائے۔

(۱) نشان ملت ایوارڈ: یہ ایوارڈ ملک کے تاریخی شہر ممبئی کے حج ہاوس میں پیش کیا گیا 'حج میگزین' کے سب ایڈیٹر مولانا شاہد ناصری صاحب نے ممبئی میں عالمی پیمانے پر منعقدہ مقابلہ قرات کے اجلاس میں آپ کو صدارت کیلئے مدعو کیا اور آپ کی خدمات کے اعتراف

میں نشان ملت ایوارڈ پیش کیا۔

(۲) لائف ٹائم اچیومنٹ: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز دہلی ء میں آپ کے ذریعہ امارت شرعیہ کو دینی وملی خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومنٹ پیش کیا گیا یہ ایوارڈ اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر، بہار رام ولاس پاسوان، ڈاکٹر شکیل احمد، محمد علی اشرف فاطمی اور آئی او ایس کے قائم مقام چیئر مین ڈاکٹر منظور عالم کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔

(۳) دہرہ دون میں سیرت النبی کمیٹی کی جانب سے پروفٹ محمدؐ میسیج فار ہیومنیٹی کے عنوان پر پروگرام منعقد کیا گیا جس میں آپ بھی بحیثیت خطیب مدعو تھے۔ آپ نے اس موقع پر سامعین کے سامنے نبی کریمؐ کے پیغام کو اتنے آسان انداز میں رکھا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ کمیٹی کے ارکان کی جانب سے آپ کی تقریر سے متاثر ہوکر ڈاکٹر فاروق صاحب (ہمالیہ ڈرگس) کے ہاتھوں بہترین مقرر کا خطاب عطا کیا گیا۔

ان اعزاز واکرام کے علاوہ اور بھی ایوارڈ۔ دیگر ملی وسماجی تنظیموں کی جانب سے آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے جو اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ حضرت امیر شریعت کی خدمات کی سمت ہمہ جہت ہے۔

حضرت امیر شریعت کی ہمہ جہت خدمات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے جس کے احاطہ کے لئے یہ مضمون ناکافی ہے۔ حضرت امیر شریعت کی جہد مسلسل اور بے لوث دینی وملی خدمات سے عوام وخواص کو روشناس کرانے کے لئے راقم الحروف نے 'باتیں میر کارواں' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ خوشی ومسرت کا مقام ہے کہ بہت کم وقت میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مقبولیت میں حضرت کی ذات کا مکمل دخل ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت امیر شریعت کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)۔

☆☆

امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدینؒ

لانا پڑا تمہیں کو تمہاری مثال میں

● خورشید عالم داؤد قاسمی

یہ حقیقت ہے کہ کل تک جو شخص ہمارے سامنے ہوتا تھا، ہمیں بہت ہی عزیز و محترم تھا، ہم ان کے ساتھ رہتے سہتے اور زندگی گزارتے تھے، ہم ان کے کردار و گفتار سے استفادہ کرتے تھے، وہ ہماری خوشی و غم میں شریک ہوتا ہے اور ہم اس کی خوشی و غم میں ساتھ ہوتے تھے، آج وہ شخص اپنے مالک حقیقی سے جاملتا ہے اور پھر ہم اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر، قبر کی گود میں اتار کر مٹی و پتھر سے اسے بند کر دیتے ہیں۔ یہ ہے انسانی زندگی کی حقیقت۔ اللہ تعالی نے ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے۔ ہمیں اپنے مال و متاع اور اسباب دنیوی پر بھروسہ کر کے اللہ تعالی سے غافل نہیں ہونا چاہیے؛ بل کہ ہمیشہ اللہ تعالی کو یاد رکھنا چاہیے۔ اس دنیا میں رہ کر جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے، اللہ سے ڈرتا ہے، اچھے اعمال کرتا ہے، اللہ کی مخلوق کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ بنتا ہے اور ان کے لیے نافع ثابت ہوتا؛ تو ایسا شخص موت سے نہیں ڈرتا؛ بل کہ ایسے شخص کے لیے موت ایک عظیم تحفہ ہے اور اپنے پاک پروردگار سے ملنے کا ذریعہ ہے۔

بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے مسلمانوں کے چھٹے امیر شریعت (امیر شریعت سادس)، ہندوستانی مسلمانوں کا متحدہ پلیٹ فارم "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے جنرل سکریٹری اور ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہیں: دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے ممبر اور دارالعلوم ندوۃ

العلماء، لکھنؤ کی مجلس نظامت کے رکن: حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اس دنیا سے ہمیشہ ہمیش کے لیے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

امیر شریعت سادس عصر حاضر میں ہندوستانی مسلمانوں کے چند گنے چنے رہنماؤں اور چند معروف و مشہور عام دین میں سے تھے۔ آپ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سے تھے اور کا روحانی تعلق بھی شیخ الاسلام سے ہی تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد، اس وقت کی مشہور دینی درس گاہ "مدرسہ امدادیہ، دربھنگہ" میں داخلہ لیا اور متوسطات کی کتابیں پڑھی۔ پھر اعلی تعلیم کے لیے، سن 1942 میں ایشیاء کی عظیم دینی و اسلامی درس گاہ اور تحریک آزادی ہند کا مرکز: دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔ آپ نے دارالعلوم، دیوبند میں داخلہ لے کر، وقت کے ماہرین علوم وفنون سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ پھر سن 1946 میں دارالعلوم، دیوبند سے آپ نے دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی۔ بعد ازاں، مزید ایک سال دارالعلوم، دیوبند میں رہ کر "تخصص فی الادب" کیا۔ اس طرح سن 1947 میں آپ نے دارالعلوم، دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کے بعد، تدریسی لائن سے منسلک ہوگئے۔ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد، آپ "مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی میں بحیثیت صدر مدرس 1948 سے 1962 تک انتظامی اور تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر آپ نے مدرسہ رشید العلوم، چترا، جھارکھنڈ (سابق بہار) میں تدریسی خدمات شروع کی۔ اس ادارہ میں 1964-1963 تک آپ صدر المدرسین کی حیثیت سے رہے۔

جب آپ "مدرسہ ریاض العلوم، ساٹھی" میں بحیثیت صدر المدرسین تدریسی و انتظامی ذمے داری نبھا رہے تھے، تب سے ہی امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی (رحمہ اللہ) سے آپ کا تعارف تھا۔ جب مولانا رحمانی امیر شریعت رابع منتخب ہوئے؛ تو ان کی دور رس نگاہ نے قابل اور باصلاحیت علماء کا ایک ایسا گروپ امارت شرعیہ میں جمع کیا، جو آپ کی وفات کے بعد، اسلاف و اکابر کے مشن کو پوری تندہی اور جدوجہد کے ساتھ آگے بڑھانے

میں اہم کردار ادا کیا۔ دارالعلوم کے وہ چند فضلاء جن کو "رجال ساز یا افراد ساز" کے طور پر زمانہ یاد کرے گا، ان میں ایک شخصیت مولانا سید منت اللہ رحمانی (رحمہ اللہ) کی بھی تھی۔ جن لوگوں نے بھی مولانا رحمانی کی زیر نگرانی کام کیا اور کسی طرح کی ذمے داری سنبھالی، وہ کے سب چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بن کر پوری دنیا میں چمکے۔ ان ہی چند لوگوں میں امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحب (رحمہ اللہ) بھی تھے۔

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی ''امارت شرعیہ'' کے امیر منتخب ہونے کے بعد، جہاں امارت میں ''قضاء'' کا عہدہ جامعہ رحمانی کے موقر استاذ فقہ وحدیث: قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (رحمہ اللہ) کو تفویض کیا، وہیں سن 1965 میں، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کو، قاضی صاحب کے اصرار پر، ایک مضافاتی مدرسہ سے امارت شرعیہ لاکر، امارت کی نظامت کا عہدہ پیش کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ امارت کے پاس اپنا دفتر تک نہیں تھا؛ ''خانقاہ مجیبیہ'' میں اس کی آفس تھی۔ مگر اللہ کے ان مخلص بندوں نے مولانا رحمانی کی زیر نگرانی، دن رات ایک کرکے محنت کی اور امارت کے مشن کو بہار واڑیسہ کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پہنچایا۔ جوں جوں امارت کا کام بڑھتا گیا، اللہ نے امارت کے لیے راہ ہموار کی اور پھر ''پھلواری شریف، پٹنہ'' میں امارت کی اپنی آفس وغیرہ کی تعمیر کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

19/ مارچ 1991 کو امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی کی وفات کے بعد، مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کو ''امیر شریعت خامس'' اور مولانا سید نظام الدین صاحب کو نائب امیر منتخب کیا گیا۔ 2/ ستمبر 1998 کو امیر شریعت خامس اپنے رب سے جاملے۔ پھر یکم نومبر 1998 کو اراکین شوری امارت شرعیہ نے آپ کو ''امیر سادس'' اور قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کو نائب امیر منتخب کیا۔ امارت شرعیہ کے حوالے سے چاہے آپ کی

نظامت کا طویل دور ہو یا پھر ''امارت'' کا لمبا زمانہ، آپ نے اپنی ذمے داری بحسن وخوبی نبھاتے ہوئے ادارہ کی ترقی اور اس کے مشن کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

جب حضرت مولانا نظام الدین صاحب ''امارت'' سے منسلک ہوگئے؛ تو پورے طور پر امیر شریعت رابع کے ہوکر رہ گئے۔ اب چاہے پورے ہندوستانی مسلمانوں کی الجھی گتھی سلجھانی ہو یا امارت کے مشن کو گاؤں گاؤں پہنچانا، ہر جگہ اخلاص وللٰہیت کے ساتھ اپنی ذمے داری نبھاتے رہے۔ جب امیر شریعت رابع نے دسمبر 1972 میں تحریک ''مسلم پرسنل لاء'' کا آغاز کیا؛ تو اس وقت بھی مولانا سید نظام الدین صاحب اس تحریک میں اپنے رفقاء کے ساتھ آگے آگے رہے اور امیر شریعت کے معین ومددگار ثابت ہوئے۔ بورڈ کے قیام کے بعد، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب (رحمہ اللہ) کو بورڈ کا باوقار عہدہ صدارت پیش کیا گیا؛ جب کہ مولانا رحمانی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ مولانا سید نظام الدین صاحب کو بھی بورڈ کا معزز رکن بنایا گیا۔ قاری محمد طیب صاحب (رحمہ اللہ) کی وفات کے بعد، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (رحمہ اللہ) کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔ پھر 19/ مارچ 1991 کو بورڈ کے جنرل سکریٹری کی وفات کے بعد، باتفاق رائے مئی 1991 میں مولانا سید نظام الدین صاحب کو بورڈ کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ اس وقت سے اپنی آخری سانس تک آپ بورڈ کے موقر جنرل سکریٹری رہے۔ بورڈ میں چوں کہ مختلف فرقوں اور مختلف جماعتوں کے نمائندے ہوتے ہیں، اس لیے اختلاف رائے کا ہونا یقینی اور ظاہر ہے، مگر اس کے باوجود بھی تقریبا اپنے 25/ سالہ جنرل سکریٹری رہنے کے دور میں، کسی طرح کا کوئی بڑا انتشار رونما نہ ہونے دیا؛ بل کہ اپنی خداداد صلاحیت اور حسن اخلاق سے بورڈ کے شیرازہ کو متحد رکھا۔

فروغ مہر بھی دیکھا، جمال گلشن بھی
تمھارے سامنے کس کا چراغ جلتا ہے

آپ کا دائرہ کار صرف ''امارت شرعیہ'' اور ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' تک ہی محدود نہیں تھا؛ بلکہ آپ دارالعلوم، دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ جیسی اسلامی اور علمی درس گاہوں اور تحریکوں کی مجلس شوری اور مجلس نظامت کے رکن بھی رہے۔ آپ کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا رکن سن 1996 میں؛ جب دارالعلوم، دیوبند کی مجلس شوری کا رکن سن 1997 میں منتخب کیا گیا۔ آپ ان دونوں اداروں کی شورائی میٹنگوں میں پابندی سے پہنچتے تھے اور اپنی رائے صواب سے نوازتے تھے۔ آپ ان اداروں کو اکابر کی امانت سمجھتے تھے اور ان اداروں کے خلاف کسی طرح کی بات سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ میں دارالعلوم، دیوبند میں ''تکمیل ادب عربی'' کا طالب علم تھا۔ اس وقت میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ رمضان بعد ایک دن امیر شریعت سے ملنے گئے تھے۔ دارالعلوم، دیوبند کا ایک طالب علم حضرت سے ''تکمیل افتاء میں داخلہ کی سفارش'' کے لیے پہنچا۔ اس طالب علم نے امیر شریعت کی شفارش حاصل کرنے کے لیے اپنی بات شروع کی اور کہا: میں آپ کے یہاں تکمیل افتاء میں داخلہ کی شفارش کے لیے آیا ہوں؛ کیوں کہ دارالعلوم میں بہار کے طلبہ کا آسانی سے تکمیل افتاء میں داخلہ نہیں ہوتا؛ جبکہ دوسری جگہ کے طلبہ کا آسانی داخلہ ہوجاتا ہے۔'' امیر شریعت نے جوں ہی اس طالب کا یہ جملہ سنا، بہت ہی خفا ہوئے اور کہا کہ ''آپ نے اس جملے سے دارالعلوم، دیوبند کی انتظامیہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں مجلس شوری کا رکن ہوں اور بخوبی جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے تکمیل افتاء میں داخلہ کے بہت سے طلبہ متمنی ہوتے ہیں اور وہ امتحان میں اچھے نمبرات حاصل کرنے کی وجہ سے اس کے مستحق بھی ہوتے ہیں، مگر تکمیل افتاء میں محدود سیٹیں ہونے کی وجہ سے اتنے طلبہ کی گنجائش نہیں ہوتی؛ اس لیے تقابل کے بعد ہر صوبہ سے قابل طلبہ کو منتخب کیا جاتا۔ اس میں بہار کے طلبہ بھی ہوتے ہیں۔ مگر آپ

نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ آئندہ اس طرح کی دروغ گوئی سے پرہیز کریں۔''

ملک کی معروف ملی تنظیموں اور مشہور اداروں کے علاوہ آپ دسیوں مکاتب و مدارس کے نگراں اور سرپرست تھے۔ آپ اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا جیسی عظیم علمی اکیڈمی کے سرپرستوں میں بھی تھے۔ آپ بڑے اخلاص سے ان اداروں کی رہنمائی کرتے رہے۔ وہ جس عہدہ پر بھی فائز رہے، اللہ کی مدد ان کے شامل حال رہی اور اسلاف و اکابر کی نمائندگی اور قائم مقامی بڑی حسن وخوبی اور سلیقے کے ساتھ انجام دیتے رہے اور کبھی کسی کو کچھ بولنے کا موقع نہ دیا۔

دونوں جہاں آئینہ دکھلا کے رہ گئے
لانا پڑا تمھیں کو تمھاری مثال میں

امیر شریعت سادس کی پیدائش بہار کے مشہور ضلع: گیا میں 31/ مارچ 1927 کو ہوئی۔ آپ کا تعلق ایک علمی خانوادہ سے تھا۔ آپ کے والد ماجد قاضی سید حسین صاحب، حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری (رحمہ اللہ) کے شاگرد تھے۔ آپ کئی مہینوں سے صاحب فراش تھے۔ انتقال سے چند دنوں قبل رانچی میں زیر علاج تھے۔ ڈاکٹروں نے یہ کہہ کہ واپس کردیا تھا کہ اب حضرت کسی بھی وقت اس دار فانی سے کوچ کرجائیں گے۔ اس کے بعد آپ کو ''پھلواری شریف، پٹنہ'' میں لاکر رکھا گیا۔ 17/ اکتوبر 2015 کی شام کو، چھ بج کر پندرہ منٹ پر، 88 سال کی عمر میں، حضرت والا اپنے پروردگار کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہزاروں لوگوں کو یتیم کرکے رحلت فرماگئے۔ نائب امیر شریعت مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب، کارگزار جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور پٹنہ کے ''حاجی حرمین قبرستان'' میں لاکھوں لوگوں نے غمناکی کی حالت میں آپ کو سپرد خاک کردیا۔

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوب روزگار مجھے

(مضمون نگار مون اسکول زامبیا میں استاذ ہیں)

☆☆

مفکر، مدبر اور عظیم قائد مولانا سید نظام الدین کی رحلت

...اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

● نور اللہ جاوید

ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر قدم معرکۂ کرب وبلا پیش ہے امت فکری وعلمی انتشار میں مبتلا ہے، فرقہ پرستی ومسلکی عصبیت نے امت کے شیرازے کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور ملی قیادت کے منصب پر فائز قائدین خودنمائی، خودپرستی میں مبتلا ہیں اور مسلم ادارے آپسی گروہ بندی، اور اختلافات کی وجہ سے شکست و ریخت کے شکار ہیں۔ ان حالات میں مسلکی عصبیت اور خودنمائی وخودپرستی سے اوپر اٹھ کر ملت کی شیرازہ بندی، سرخروئی، اتحاد اور عظمت رفتہ کی بحالی کیلئے خود کو وقف کردینے والا عظیم قائد، مفکر اور مدبر حضرت امیر شریعت مولانا سید نظام الدینؒ کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا کسی قومی سانحہ سے کم نہیں ہے، ان کے جانے کی کسک اور کمی صرف چند ادارے جس کے وہ سربراہ یا قائد تھے محسوس نہیں کریں گے، بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو ان کی کمی کھلے گی اور ان کی بھرپائی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بقول شاعر

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

حضرت امیر شریعت کی موت کوئی ناگہانی نہیں ہے، ان کی علالت اور طبیعت میں

بہتری نہیں ہونے کی وجہ سے یہ خدشہ تھا، عمر کے جس حصے اور جن بیماریوں میں وہ مبتلا تھے وہاں سے واپسی کا امکان بہت ہی کم ہوتا ہے۔ ایسے بھی موت زندگی کی ایک حقیقت ہے، انسان کی ہستی مثل شمع ہے جو کبھی روشن ہوتی ہے اور کبھی بجھ جاتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

حیات انساں ہے شمع کی صورت ، ابھی ہے روشن ابھی فسردہ
نہ جانے کتنے چراغ یوں ہی جلا کریں گے ، بجھا کریں گے

حضرت امیر شریعت بھی اسی دنیا کے باشی تھے انہیں بھی ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا تھا۔ ہاں ان کی فعال، متحرک اور سرگرم شخصیت کی وجہ سے دلی تمنا تھی کہ ایسے مخلص قائدین کی ملت کو ابھی ضرورت باقی ہے، ان کی موجودگی ملت کی بقاء کی علامت تھی۔ وہ محو سفر تھے، نرم دم گفتگو گرم دم جستجو تھے، مگر کیا کیا جائے موت کا وقت متعین ہے ہماری تمنائیں، خواہشیں کسی کی موت کو نہیں ٹال سکتی ہیں۔ اگر خواہش اور ضرورت کی بنیاد پر کسی کی موت ٹل سکتی تھی وہ آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی، کیوں کہ اس دنیا کو تا ابد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔

اس حقیقت کے باوجود سماجی ویب سائٹوں کے ذریعہ جب امیر شریعت کے انتقال کی خبر ملی تو دل دھک سے رہ گیا، وفور غم سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ پوری ملت کا سرمایہ حیات لوٹ لیا گیا ہے، کیوں کہ وہ پہاڑوں کے مانند بلند اور اٹل تھے، اعلیٰ اخلاق، تہذیبی وضعداری کے پرکشش مجسمہ تھے۔ نرم دم گفتگو گرم دم جستجو، جہد مسلسل کے ذریعہ پژمردہ دلوں میں روح پھونک دیے والے تھے۔ بے لوثی، بے غرضی، الوالعزمی و بردباری کے روشن مینار تھے۔ ان کی شخصیت پیش قیمت سرمائے کی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ وہ ملت اسلامیہ ہندیہ کیلئے اتحاد امت کے بلند ستون تھے، بلکہ حضرت امیر شریعت کی دلنواز شخصیت یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا حسین مجموعہ تھی۔

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

میرے فکر وشعور کی عمر کوئی بہت زیادہ نہیں ہے، ابھی تین دہائی بھی مکمل نہیں ہوئی ہے ،مگر صحافت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے کئی نامور شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے نظریات وفکر کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔امیر شریعتؒ کی شخصیت بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھی۔اگر میں یہ کہوں تو زیادہ صحیح ہے کہ صحافت کے حوالہ سے جن شخصیتوں سے تعارف اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان میں امیر شریعت مولانا سید نظام الدین کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر میں صحافت سے وابستہ نہیں ہوتا تو مجھے امیر شریعت کو اتنے قریب سے جاننے کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بہترین مقرر و بہترین منتظم کار ہوتا ہے، وہ میڈیا کے تیکھے سوالوں کے سامنے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوجاتا ہے اور اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے جس کا فائدہ میڈیا کو مل جاتا ہے اور وہ بین السطور پڑھ کر خبر کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیتا ہے اور صحیح موقف پس پشت چلا جاتا ہے۔گزشتہ 12 سالوں کے دوران کئی حساس موضوع پر پریس کانفرنس یا پھر نجی ملاقاتوں میں امیر شریعت سے سوال پوچھنے اور اعتراض کرنے کا موقع ملا ،حضرت امیر شریعت ذاتی واہ واہی یا پھر محض اخبارات کے سرورق کی زینت بننے سے بے نیاز ہر سوالوں کا جواب سنجیدگی ومتانت ،خوداعتمادی اور واضح موقف کے ساتھ اس طرح دیتے تھے کہ سامنے والا نہ صرف مطمئن ہوجاتا تھا، بلکہ اس کے ہر شکوک وشبہات رفع ودفع ہوجاتے تھے۔کسی بھی سوال کے جواب میں میڈیا اہلکاروں کیلئے شرانگیزی کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔کیوں کہ میڈیا اہلکار اکثر بین السطور کا حوالہ دے کر بیانات کو توڑ مروڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے مقصد فوت ہوجاتا ہے اور ایک نیا تنازع سامنے آجاتا ہے۔

مثل خورشید سحر، فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

امیر شریعت رابع مولانا سید محمد منت اللہ رحمانیؒ جو نہ صرف ایک جلیل القدر عالم دین

تھے، بلکہ وہ ایسے قائد تھے جنہیں اللہ نے رجال سازی کا ملکہ عطا کیا تھا وہ رجال ساز ورجال شناس تھے۔مولانا سید محمد نظام الدین بھی مولانا رحمانیؒ کے حسن انتخاب ہیں۔انھوں نے مولانا نظام الدین کو امارت شرعیہ کے نظامت کیلئے منتخب کیا۔گزشتہ پانچ دہائیوں میں امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کی ہمہ جہت ترقی، دائرہ کار میں توسع ملک بھر میں دارالقضاء کا قیام، قدرتی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر متاثرین ومظلوموں کی دادرسی کیلئے پہل اور بڑے پیمانہ پر ریلیف کی تقسیم، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے خاتمہ کیلئے مکاتب اور عصری وتکنیکی اداروں کا قیام اور سب سے اہم نکتہ کہ امارت شرعیہ پھلواری شریف کو ہندی مسلمانوں کے باوقار اور ممتاز ادارہ کا درجہ دلانے میں حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے رفقاء کار بالخصوص قاضی القضاۃ مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے مخلصانہ اشتراک وعمل اور تعاون کا بہت اہم رول رہا ہے۔امارت شرعیہ پھلواری شریف صرف فتاویٰ وقضاء کے حوالہ سے ہی نہیں معتبر ہے، بلکہ مصیبت کے ہر لمحوں میں مسلمانان ہند بالخصوص بہار کے مسلمانوں کے زخم کا مداوا بن کر سامنے آتا ہے جب کوئی مصیبت اور آفت آتی ہے تو نگاہیں امارت شرعیہ پھلواری شریف کی طرف اٹھتی ہیں اور اس کی ہدایتوں اور لائحہ عمل کا انتظار کرتی ہیں۔

ملی وقومی زندگی میں ہر لمحے بے وحساب وبے رحم ناہمواریاں، حالات کی سنگدلیاں، وقت کی بے التفاتیاں اور اپنوں کی دغابازیاں، بلکہ مہم کو کمزور کرنے کی کوششیں کوئی نئی بات نہیں ہے، قیادت کے فرائض کو انجام دینے والی شخصیتوں کو ان لمحوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے، ان حالات کا مقابلہ کیے بغیر کوئی عظیم قائد نہیں بنتا ہے۔بلکہ ایسے لمحوں میں قائد کی ذہنی فراست، بصیرت اور علم وآگہی کا سب سے زیادہ امتحان ہوتا ہے کہ قائد حالات کا پامردی سے مقابلہ کرتا ہے یا پھر مخالفتوں کے ہجوم میں گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔تاریخ کے صفحات ان شخصیتوں کے تذکروں سے خالی ہیں جو حالات سے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتے

ہیں اوراپنے دامن میں داغ نہ لگے اس خوف سے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ تاریخ ان عظیم شخصیتوں کے کارناموں سے مزین ہے جنہوں نے حالات کا پامردی سے مقابلہ اور مخالفتوں کے ہجوم میں چل کر وقت کی دھارا اور ہوا کے رخ کو بدل کر حالات کو موافق بنالیا۔حضرت امیر شریعت مولانا سید نظام الدینؒ کی نصف صدی پر محیط ملی وقومی زندگی اس بات کی گواہ ہے جب جب حالات کی سنگدلیاں اور بے حساب و بے رحم ناہمواریاں ان کے صبر وعزیمت سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے تو وہ پاش پاش ہوگئی۔حوصلہ شکن حالات کا بیدار مغزی، خودارادی وخوداعتمادی کے ذریعہ جس طرح انہوں نے مقابلہ کیا، امارت شرعیہ پھلواری شریف اور مسلم پرسنل لا بورڈ کو اپنے مقاصد وعزائم کی تکمیل کی راہ پر گامزن رکھا وہ تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، مستقبل کا مورخ جب بھی ان اداروں کی شاندار روایات اوراس کے کارہائے نمایاں کوقلم بند کرے گا تو وہ امیر شریعت کی، غیر معمولی فعالیت ، ذہانت، قائدانہ لیاقت، یقین محکم، عمل پیہم اور جہد مسلسل کو نظرانداز نہیں کر سکے گا۔کیوں کہ امیر شریعت مولانا سید محمد نظام الدین نے گزشتہ پچاس سالوں سے جس احتیاط، حاضر دماغی اور مومنانہ بصیرت سے امارت شرعیہ پھلواری شریف کے گیسو برہم کو سنوارا ہے وہ اپنے آپ میں مستقل ایک تاریخ ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ امارت شرعیہ پھلواری شریف ان کے نام کا عنوان اوران کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا جو جسد خاکی سے روح نکل جانے کے بعد ہی ختم ہوا۔ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے ایک شخص کی پوری زندگی اور اس کے سوچ وفکر کا دائرہ صرف ایک نکتہ پر جا کر مرکوز ہوجائے۔امارت شرعیہ پھلواری شریف کے بانیوں کے اخلاص کا ہی نتیجہ ہے کہ اسے مولانا سید محمد نظام الدین صاحب جیسا عالی دماغ و بابصیرت اور مومنانہ خصوصیات کا حامل قائد ملا۔جس کی زندگی کی ہر سانسیں امارت کی فلاح و بہبود اور ترقی کی تڑپ اور امارت کے وقار وعظمت کی بحالی اور ملت اسلامیہ کیلئے فکرمندی کے ساتھ چلتی رہیں۔ان کے بغیر امارت شرعیہ کا تصور کرنے سے بھی

دل گھبراتا ہے۔امارت کے درو بام اور چہل پہل یونہی باقی رہیں گی مگر وہ روحانی وعرفانی کرنیں جس سے گوشہ گوشہ منور تھا، جس کی موجودگی ہی عظمت ورفعت کی علامت تھی وہ شاید دوبارہ محسوس نہ ہو۔

تیرے بغیر رونق دیوار و در کہاں
شام و سحر کا نام ہے ، شام و سحر کہاں
عرصہ ہوا کہ رسم محبت بدل گئی
دامن سے اب معاملہ چشم تر کہاں

مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسٹیج سے حضرت امیر شریعت کی خدمات ایک مستقبل باب ہے، امارت شرعیہ کی طرح مسلم پرسنل لا بورڈ میں جنرل سکریٹری کا عہدہ انہیں اپنے مربی و مشفق قائد مولانا سید منت اللہ رحمانی کی وراثت میں ملا۔مارچ 1991 میں حضرت مونگیریؒ کے انتقال کے بعد بورڈ کے جنرل سکریٹری کے عہدہ کیلئے اس وقت کے بورڈ کے صدر عالم ربانی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی نگاہ انتخاب مولانا سید محمد نظام الدین پر جا کر ٹھہر گئی۔کیوں کہ مولانا علی میاں ندویؒ کو یقین تھا کہ مولانا نظام الدین سے بڑھ کر مولانا رحمانی کی وراثت کو آگے بڑھانے اور بورڈ کی ذمہ داری کو پوری فعالیت ساتھ کوئی اور شخص کما حقہ ادا نہیں کرسکتا ہے جتنا مولانا سید محمد نظام الدین کرسکتے ہیں۔مسلم پرسنل لا بورڈ میں جنرل سکریٹری کا عہدہ سب سے اہم ہے، گرچہ عہدہ کے اعتبار سے صدر کواولیت اور فوقیت حاصل ہے، مگر جنرل سکریٹری ہی بورڈ کو فعال اوراپنے مقاصد کیلئے گامزن کرنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔سکریٹریوں کے ساتھ تال میل، مختلف شعبوں کی نگرانی، بورڈ کی مالی استحکام اور عدالتی فیصلوں کا تجزیہ یہ سب جنرل سکریٹری کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ان تمام مرحلوں میں حضرت امیر شریعت فکر وعمل کے پیکر بن کر کامران وکامیاب ثابت ہوئے، اگر بورڈ آج ملت اسلامیہ کا سب سے معتبر اور باوقار

ادارہ ہے تو اس میں حضرت امیر شریعت کی مخلصانہ اور مومنانہ قیادت کا اہم رول ہے ۔ غلطیاں کس سے نہیں ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ کمزوری اور عمر کی وجہ سے بورڈ کی سرگرمیاں کچھ متاثر ہوگئی ہوں مگر یہ بات اللہ کو گواہ بنا کر کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی بورڈ کے مفادات سے سودا نہیں کیا اور نہ ہی بورڈ کی عظمت کو داغ دار ہونے دیا، بلکہ ان کا دامن بہنے والے دریاؤں کی طرح شفاف اور طوفان آشنا تھا اور انھوں نے اپنی اجلی شخصیت کا لازوال نقش جریدہ عالم پر چھوڑا ہے۔

2008 میں کلکتہ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کے اجلاس کی پوری کارروائیوں کو میں نے صرف ایک صحافی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک کارکن کی حیثیت سے دیکھا اور شامل رہا۔ اجلاس کی تیاریوں سے لے کر انعقاد تک کئی مرحلوں میں مخالفین اور فتنہ سازوں نے اجلاس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، مسلکی گروہ بندی کے نام پر بورڈ کی عظمت و رفعت پر سوالیہ نشان لگا کر مسلم پرسنل لا بورڈ کی حیثیت کو مشکوک اور مختلف فیہ بنانے کی کوشش کی مگر ہر موڑ پر حضرت امیر شریعت نے سامنے کرآ کر فتنوں کی اس انداز سے سرکوبی کی کہ مخالفین بھی گرویدہ ہوگئے اور ان کے کارواں میں شامل ہوگئے ۔ حد اس وقت پار ہوگئی جب ممبران کی میٹنگ میں ایک گروپ نے ہنگامہ آرائی شروع کی، بورڈ کی قیادت کو بوڑھی اور فرسودہ قرار دے کر تبدیلی کا نعرہ بلند ہونے لگا مگر اس لمحہ بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوئی اور پورے صبر و استقامت کے ساتھ مخالفین کے ہر سوال کا جواب دیا اور بورڈ کو فتنوں سے بچانے کے ساتھ ساتھ کلکتہ اجلاس کے پیغام اور روح کو مجروح نہیں ہونے دیا گیا۔ بقول جگر مرادآبادی:

زندگی میں آ گیا جب ،کوئی وقت امتحاں
اس نے دیکھا ہے جگر، بے اختیارانہ مجھے

بلاشبہ کسی کے آنے اور جانے سے کارخانہ حیات کو فرق نہیں پڑتا ، ایک لمحہ کیلئے

کائنات کی سرگرمیوں میں فرق نہیں پڑتا مگر کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے جانے کے اثرات کافی دنوں تک محسوس کیے جاتے ہیں اور اس کا تدارک اور اس کی وراثت کو سنبھالنا ایک بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضرت امیر شریعت کے اس دنیا فانی سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی مسلم پرسنل لا بورڈ اور امارت شرعیہ ملت اسلامیہ ہند کے دل کی آواز اور تمناؤں کا مرکز بنا رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے امیر شریعت نے جس دیانت داری، لگن اور انہماک و بےلوثی کے ساتھ اکابرین کی امانت کو آگے بڑھایا ہے، اس کو باقی رکھا جائے۔ ان کے خالی کردہ عہدے کیلئے شخصیتوں کا انتخاب ایک بڑی امانت و ذمہ داری ہے۔ لمحہ کی غلطیوں کی سزا مدتوں بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ فکری ونظری اختلافات سے گریز ممکن نہیں مگر جب شخصیت آڑے آجائے تو ادارے اجڑ جاتے ہیں اور اس کی عظمت و رفعت کم ہوجاتی ہے۔

☆☆

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

● شمس تبریز قاسمی

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم دین حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت بہار، اڑیسہ جھارکھنڈ 17 اکتوبر 2015 کو طویل علالت کے بعد شام 6:15 منٹ پر دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا کافی دنوں سے بستر علالت پر تھے اور رانچی کے ایک ہسپتال نے ایک ہفتہ قبل ہی ان کو ریفر کردیا تھا۔ گذشتہ ایک ہفتہ سے امارت شرعیہ میں ہی ان کا علاج ہورہا تھا جہاں ہفتہ 7/ اکتوبر کی شام سوا چھ بجے دار فانی کی جانب کوچ کر گئے۔

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب ملت اسلامیہ کے عظیم پاسبان اور مسلمانان ہند کے مخلص قائد تھے ان کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ آپ کا تعلق ہندوستان کے تین اہم ادارے سے تھا اور آپ نے تینوں کو بحسن وخوبی نبھایا۔ آپ طویل عرصہ سے امارت شرعیہ بہار اڑیسہ جھارکھنڈ سے وابستہ تھے۔ امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد امارت شریعہ کے مشن کو آگے بڑھانے، قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی کے قائم کردہ خطوط کو برقرار رکھنے اور بانی امارت مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی فکر کو فروغ دینے میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دی۔ مسلمانان ہند کی سب سے متحرک وفعال تنظیم امارت شرعیہ پٹنہ کے آپ چھٹے امیر شریعت تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی متحدہ تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل

لاء بورڈ کے آپ 1991 سے ہی سے جنرل سکریٹری تھے جس کے بقاء اور تحفظ سے آپ کی پوری زندگی عبارت ہے۔ ایشیاء کی عظیم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے بھی رکن تھے اور ہمیشہ مشکل وقت میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کی صحیح رہنمائی کی۔ اراکین شوریٰ کا کہنا ہے آپ کی تعلیمی رہنمائی میں دارالعلوم نے بے مثال ترقی کی، اس کے علاوہ دسیوں مدارس اور تنظیمیں آپ کی سرپرستی میں تعلیمی، ملی اور رفاہی کام انجام دے رہی تھیں۔ آپ کا انتقال پرملال ملت اسلامیہ کے لئے سوہان روح ہے۔ آپ سلف کی یادگار تھے اور امارت ومسلم پرسنل لا بورڈ کی آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ حضرت امیر شریعت جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے جن پر پوری ملت کو ناز ہوتا ہے۔ آپ نے امارت اور بورڈ کی جس انداز سے قیادت کی ہے تاریخ میں وہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے ملت اسلامیہ ہند کی تابناک اور طویل روشن تاریخ کے ایک باب کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ آپ ان گنے چنے اشخاص میں سے تھے جن کی لائق قیادت کو ہر طبقے میں پذیرائی حاصل تھی۔ آپ نوجوانی سے لیکر تادمِ آخر سرمایۂ ملت کے نگہبان کی حیثیت سے ملتِ اسلامیہ ہند کے مذہبی مسائل کے حل اور تعلیمی انقلاب کے لئے جد وجہد کرتے رہے۔ آپ کے عقیدت مندوں میں ہر طبقے کے افراد تھے، حتیٰ کے غیر مسلم برادران وطن بھی آپ سے رہنمائی حاصل کرنے اور دعاء لینے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہ آپ مرجع خلائق اور اپنے متوسلین کے لئے شجر سایہ دار کی طرح تھے، جس کے سایہ میں بیٹھ کر ہر ایک اپنے آپ کو آسودہ خاطر پاتا تھا۔

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی ولادت باسعادت 13 مارچ 1927ء کو محلّہ پرانی جیل، گیا (بہار) میں ہوئی۔ آپ کے والد قاضی سید حسینؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ ابتدائی تعلیم دربھنگہ میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے 1942ء میں

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں سے 1946ء میں دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی اور 1947ء میں تخصص فی الادب کیا۔ 13 مارچ 1950ء کو رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ حضرت امیر شریعت ریاض العلوم، ساٹھی میں 1948 تا 1962ء صدر مدرس بھی رہے۔ کچھ سالوں تک آپ مدرسہ رشید العلوم چترا میں صدر مدرس کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی۔ مئی 1991 میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ 2 ستمبر 1998ء کو امیر شریعت خامس کے انتقال کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ یکم نومبر 1998ء میں امیر شریعت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔ مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کے آپ خصوصی معتمد تھے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے خصوصی شاگردوں اور حضرت سے ہی بیعت تھے۔

آپ طالب علمی کے زمانہ سے ہی دینی وملی تحریکوں میں سرگرم رہے ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند میں طلبہ بہار کی مرکزی انجمن 'بزم سجاد' کے ذمہ دار اور اس کے تحت نکلنے والے ہفتہ وار جریدہ البیان کے ایڈیٹر تھے۔ ایک مرتبہ ملاقات کے دوران آپ نے فرمایا میں انجمنوں میں صدر سکریٹری کے بجائے لکھنے پڑھنے والی ذمہ داریاں زیادہ لیتا تھا۔ میں نے حضرت سے کہا کہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں بھی اسی نظریہ پر عمل کرتا ہوں اور مجھے بھی ''البیان'' کے ایڈیٹر رہنے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت نے یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا اور اپنی دعاؤں سے نواز۔

حضرت امیر شریعت ملت اسلامیہ کے اہم اثاثہ تھے، آپ کا انتقال ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ آپ جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے جنہیں ملت کا مفاد سب سے عزیز ہوتا ہے۔ جو اپنی پوری زندگی قوم وملت کے مفاد کے لئے وقف کردیتے ہیں۔ اپنی ذاتی ضروریات پر کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں آپ کو جان کر یہ حیرت ہوگی حضرت نے اپنی پوری

زندگی گذار دی، لیکن رہائش کے لئے ایک مکان تک نہیں خریدا۔ پھلواری شریف میں ایک رشتے دار کے مکان میں قیام پذیر تھے۔ ہندوستان کے تین اہم ترین ادارے سے وابستہ ہونے کے باوجود آپ نے ہمیشہ خود کو نام ونمود وشہرت سے دور رکھا۔ گویا۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

اللہ تعالیٰ حضرت امیر شریعت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ

بحیثیت جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمات کا مختصر جائزہ

● محمد وقار الدین لطیفی ندوی

● امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں، آپ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، آپ کی ولادت ۳۱/مارچ ۱۹۲۷ء کو اپنے وطن میں ہوئی۔ آپ کے والد مولانا سید حسین صاحب مرحوم تھے، آپ کا وطن گھوری گھاٹ ضلع گیا جو اب جھارکھنڈ کی علیحدگی کے بعد ضلع چترا کے تحت آتا ہے، آپ کا بچپن وطن میں ہی گزرا۔ تعلیم کی ابتدا آپ نے اپنے والد بزرگوار سے ہی کی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں بعمر چودہ ساڑھے چودہ سال میں آپ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے پورے ایک سال تعلیم حاصل کی، پھر ۱۹۴۲ء میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، جہاں سے آپ نے ۱۹۴۷ء میں دورۂ حدیث مکمل کیا۔ دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے تدریس کی لائن اختیار کی اور سب سے پہلے بحیثیت صدر مدرس مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی چمپارن بہار میں ۱۹۴۹ء تا ۱۹۶۲ء چودہ سالوں تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر آپ مدرسہ رشید العلوم چترا آگئے اور یہاں ۶۴-۱۹۶۳ء یعنی دو سال تک رہے، امیر شریعت رابع

حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہٗ کی دوربین نگاہ نے آپ کے اندر چھپے جوہر کو پہچان لیا اور پھر کیا تھا آپ کو امارت کے لئے منتخب کر لیا، چنانچہ ۱۹۶۵ء میں آپ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ امیر شریعت رابعؒ کے حکم کی تعمیل میں بحیثیت ناظم مقرر ہوئے، اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی صاحبؒ کے وصال کے بعد اتفاق رائے سے مسلم پرسنل لا بورڈ کا آپ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا، اس عہدہ جلیلہ پر تادم حیات فائز رہے، اور حضرت امیر شریعت رابعؒ کی وفات کے بعد آپ نائب امیر بھی منتخب ہوئے پھر حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس کی وفات کے بعد ۱۹۹۸ء میں آپ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے امیر شریعت منتخب ہوئے۔ آپ ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے، اور خالص ادبی و علمی شاعری آپ نے کی، لیکن کبھی آپ نے اس کو پیشہ نہ بنایا، جامعہ رحمانی مونگیر کا ترانہ آپ کی شاعری کا آئینہ ہے۔ آپ کے اندر بلا کی انتظامی صلاحیت اور مختلف مسالک و مشارب کے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ قوت برداشت اللہ نے بڑی غضب کی عطا فرمائی تھی۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ آپ اپنے اساتذہ اور مربیوں کے گذر جانے کے بعد ان کے پورے خاندان کے اکرام و تعظیم میں کوئی کسر نہ چھوڑتے اور انتہائی مسرت کے ساتھ فرماتے کہ یہ میرے فلاں استاد/مربی اور مرشد کے خانوادے سے ہیں اس لئے میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ میں اس رشتہ کا لحاظ رکھوں، آپ کا یہ معمول اپنے آپ میں بے حد گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے اور ہم سب کے لئے کھلا سبق بھی ہے اور انشاء اللہ یہ عمل بھی حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی اخروی زندگی کا زاد راہ بنے گا۔

آپ اپنے محبوب ترین استاد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے اور حضرت مدنیؒ آپ کے مرشد بھی تھے، آپ بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے امیر شریعت، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ

کے رکن، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سرپرست کے ساتھ ساتھ کئی اداروں کے ذمہ دار وسرپرست تھے۔

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ ان کا حسن انتظام تھا، پیرانہ سالی، بیماری واعذاری کے باوجود انتظامی معاملات میں کہیں بھی ضعف و اضمحلال کا احساس نہیں ہونے دیتے، مئی ۲۰۰۱ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ کے حکم پر جب یہ خاکسار مسلم پرسنل لا بورڈ کے مرکزی دفتر میں بحیثیت آفس سکریٹری مقرر ہوا تو حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم سے دفتری معاملات پر گفتگو، ملاقات اور رابطہ کا سلسلہ تا حیات جاری رہا اور الحمد للہ ان کو بہت قریب سے ایک طویل عرصہ تک دیکھنے اور سیکھنے کے ساتھ ساتھ محض اللہ کی توفیق سے ان کی سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میرے ابتدائی دور کی ایک بات تقریباً پندرہ سالوں کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود آج بھی اچھی طرح یاد ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ تنظیمی اداروں میں کام کرنے کے لئے تین بنیادی چیزیں ہیں اور اس پر سختی سے عمل کرنے والا شخص ضرور کامیاب ہوتا ہے۔

(۱) تشاور (۲) تعاون (۳) توافق

پھر آپ نے ان تینوں کی تفصیل سے وضاحت فرمائی کہ جب کوئی معاملہ یا امور پیش آئے اولاً مشورہ کرو، دوم ایک دوسرے کا تعاون کرو، اور کوئی کام کسی کو دیا جائے تو اس کا انتظار مت کرو کہ وہی کرے گا اگر آپ کو معلوم ہے کہ آپ بہتر طور پر کرسکتے ہیں تو آگے بڑھ کر اس کام کو آپ کریں۔ ان تینوں باتوں پر عمل کرنے سے بڑا فائدہ سب سے پہلے یہ ہوگا کہ کسی کام میں نقصان کا امکان نہیں رہے گا، دوم یہ کہ کارکنان کے مابین محبت بڑھے گی، سوم یہ کہ ایک دوسرے پر اعتماد ہوگا، دوریاں ختم ہوں گی اور نااتفاقی جو شیطان موقع کی تلاش میں رہتا ہے وہ نہیں ہوں گی، اور کام میں برکت ہوگی اور تجربہ میں اضافہ ہوگا۔

● شخصیت سازی اور خاص کر ملی و جماعتی کام کرنے والوں کے لئے بظاہر یہ تین چھوٹے چھوٹے الفاظ ہیں مگر اس کی گہرائی میں جب آپ جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف تین باتیں ہی نہیں بلکہ اس میدان میں کام کرنے والوں کے لئے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے پندرہ سالہ دور میں آج تک مجھے ان کی سرپرستی میں کام کرنے میں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی، میں نے بعض معاملات میں دیکھا کہ ان کے افراد خاندان کا معاملہ تھا اور اصول وضابطے کے خلاف تھا تو انہوں نے انتظامی اصول کو برقرار رکھا، اور دفتری عملہ کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، یہ کہہ کر کہ تم لوگوں نے اصول کے مطابق کام کیا، حقیقت یہ ہے کہ ان کی سرپرستی میں کبھی کسی قسم کا دباؤ یا جھکاؤ محسوس نہ ہوا، کاموں کی انجام دہی میں کبھی کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دی یہ آپ کی سب سے بڑی خوبی تھی، عارضہ قلب کے بعد پیرانہ سالی اور ضعف کی وجہ سے جو اس عمر کا حصہ ہوا کرتا ہے، ایک بات کا بار بار ذکر کرنا اور اس کو ذہن پر بیٹھا لینا، نسیان کا غالب آجانا یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بھی جب ہم دوسروں سے موازنہ کرتے ہیں تو حضرت امیر شریعت سادس بہتر نظر آتے ہیں۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی ایک ایک خوبی یاد آرہی ہے اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے، اور ملت اسلامیہ ہندیہ کو اس کا بدل عطا فرمائے۔ آمین۔

● ہندوستان کی تاریخ میں اسلام اور تحفظ شریعت کے سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ اس کا ایک روشن اور تابناک باب ہے جسے مستقبل کا مؤرخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکے گا، ملت کے اس ادارہ نے انتہائی پرخطر اور حوصلہ شکن ماحول میں شریعت اسلامی کی پاسبانی کی ایک جرأت مندانہ اور حساس کوششیں کی ہیں اور یہ بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کے غیر معمولی بیدار مغزی اور شعور کا شاہکار رہا ہے، اسی تحفظ شریعت کے قافلہ میں جن لوگوں کو شروع سے شریک رہنے اور اس کا حصہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی ان

میں ایک اہم نام حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کا بھی ہے، آپ اس قافلہ میں اپنے بزرگوں کے ساتھ شامل رہے، ۱۹۹۱ء میں آپ کے مربی و مشفق بانی مسلم پرسنل لا بورڈ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ کے وصال کے بعد آپ ۸/مئی ۱۹۹۱ء کی مجلس عاملہ لکھنؤ میں جز وقتی بورڈ کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، پھر بورڈ کے انتخابی اجلاس دہلی میں ۲۳/نومبر ۱۹۹۱ء کو آئندہ سہ سالہ میقات کے لئے متفقہ طور پر اس عہدہ کے لئے منتخب کئے گئے اور اس وقت سے وفات تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے۔

● جس وقت آپ نے بورڈ کی قیادت سنبھالی ان دنوں رہ رہ کر ملک کی فضاء کو زہر آلود کیا جا رہا تھا اور اس کی آڑ میں پورے ملک کے اندر قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنا ایک عام سی بات ہوگئی تھی، اور مسجد کی شرعی حیثیت پر شدت کے ساتھ سوال اٹھایا جانے لگا، آپ ہی کے دور میں بورڈ نے تاریخ ساز قرارداد منظور کی کہ ''عرش تا فرش مسجد ہے اور قیامت تک اس کی حیثیت مسجد ہی کے حکم میں رہے گی'' یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ ہی کے دور میں الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں ۱۹۶۱ء سے چل رہے بابری مسجد حقیت کے مقدمہ کو قوم وملت کے اصرار وخواہش پر بورڈ نے اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد نگرانی اور پیروی کی، ہائی کورٹ کے متنازعہ فیصلہ کے بعد بورڈ کی طرف سے ۶/اپیلیں سپریم کورٹ میں داخل کی گئیں اور بورڈ پورے طور پر بابری مسجد کے تمام مقدمات کی پیروی کر رہا ہے، اور بورڈ کے سینئر رکن ومشہور قانون داں جناب یوسف حاتم مچھالا صاحب ایڈوکیٹ کی سربراہی میں ایک کمیٹی اس کو دیکھ رہی ہے، بورڈ کی طرف سے داخل کی گئی اپیلیں بحث وشنوائی کے لئے سپریم کورٹ میں منظور کر لی گئی ہیں لیکن ابھی اس کی شنوائی کا نمبر نہیں آیا ہے جب نمبر آئے گا تو اس سلسلہ میں بنائی گئی بورڈ کی کمیٹی مضبوطی کے ساتھ اپنا کام کرے گی، حکومت ہند کی طرف سے اسباب انہدام کی جانچ کے لئے بنائے گئے جسٹس لبراہن کی سربراہی میں لبراہن کمیشن کے سامنے بار بار بورڈ نے پیروی کی اب اس کی رپورٹ بھی

کمیشن کی طرف سے حکومت کو پیش کی جا چکی ہے، اور اس کے مطابق بورڈ ایف آئی آر درج کرنے نیز اس رپورٹ کے مطابق مجرمین پر کارروائی کرنے کے لئے کوششیں کر رہا ہے، اور بابری مسجد کے انہدام کے جرم سے متعلق فوجداری مقدمات میں بورڈ کی مجلس عاملہ کے رکن جناب ظفریاب جیلانی صاحب کی نگرانی میں لکھنؤ ورائے بریلی کی عدالتوں میں پیروی کر رہا ہے۔

● شروع سے بورڈ کے ذمہ داروں کے پیش نظر تھا کہ بورڈ کے دفتر کے لئے کوئی جگہ یا مکان دہلی میں حاصل کیا جائے، یہ کارنامہ بھی آپ ہی کے دور میں انجام پایا اور بورڈ کے مرکزی دفتر کے لئے مین مارکیٹ اوکھلا گاؤں، نئی دہلی میں تقریبا سوا دوسو گز کا ۵/کمروں اور میٹنگ ہال پر مشتمل ایک فلیٹ خریدا گیا تاکہ بورڈ کے بڑھتے کاموں کی انجام دہی میں سہولت ہو، اور اس کا مستقل اپنا ایک آفس ہو۔ پھر ۲۰۰۱ء میں صدر بورڈ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی دلچسپی سے بورڈ کے مرکزی دفتر کے اوپر کا نصف حصہ بھی آپ ہی کے دور میں خریدا گیا۔

● یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ برسوں سے کوشاں رہا ہے کہ اوقاف کے قانون میں ایسی ترمیم کرائی جائے جس سے وقف بورڈ کی جمہوری حیثیت نمایاں ہو اور اوقاف کی جائیداد کو قانونی تحفظ حاصل ہو۔ آپ کے دور سے پہلے بھی اس سلسلہ کی مسلسل کوششیں کی گئیں اور آپ کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، بزرگوں کے رہنما خطوط پر چل کر آپ نے بھی کوشش جاری رکھی جس کے نتیجہ میں نیا وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء میں بنا۔ جس میں بورڈ کی کئی تجاویز کو شامل کیا گیا۔ اور باقی کے لئے یہ وعدہ کیا گیا کہ آئندہ اس میں ترمیم کردی جائیگی۔ مگر آپ کی سربراہی میں بورڈ حکومت کے سربراہوں سے جھوجھتا رہا، اور یہ بھی سچائی ہے کہ وقف ترمیمی بل کے سلسلہ میں حکومت کی اور نہ ہی اس کے وزیروں کی کبھی نیت صاف رہی، لیکن بورڈ کی حساس اور ذمہ دار قیادت اس پر مستقل نگاہ جمائے ہوئے تھی

اوراس قیادت نے اپنے منشور میں یہ داخل کرلیا تھا کہ جب تک حکومت اس میں ہماری ترمیمات کو شامل نہیں کرلیتی بورڈ اس وقت تک چپ چاپ نہیں بیٹھ سکتا ہے، چنانچہ آپ نے مولانا محمد ولی رحمانی صاحب اور جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب جیسے اپنے جواں ہمت سکریٹریوں کی مدد سے خاموشی کے ساتھ وقف کے قانون میں تبدیلی کے لئے اپنے طور پر مستقل کوشش کروائی، حکومت اور حکومت کے وزراء پر بھی نظر رکھی اور اس سلسلہ میں ہر اونچ نیچ کا سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ جائزہ کا کام بھی کراتے رہے، اور جب کبھی نمائندگی اور کوششوں کی ضرورت محسوس ہوتی تو حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رکھوایا، الحمدللہ بار بار ملاقاتوں کا حکومت کے ذمہ داروں پر اچھا اثر ہوا، اور ۱۹؍اگست ۲۰۱۳ء کو ترمیمی بل کا مسودہ راجیہ سبھا سے منظور ہوگیا اور جلد ہی ۵؍ستمبر ۲۰۱۳ء کو لوک سبھا سے بھی منظور ہوگیا، اس طرح گویا کہ اب یہ قانون کی شکل اختیار کرگیا، یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے جو ترمیمات حکومت کو دی تھیں اس میں تقریبا ستر سے پچھتر فیصدی ترمیمات بورڈ کی شامل کرلی گئیں لیکن اب بھی اس میں بہت اہم حصہ باقی رہ گیا ہے جس کے لئے بھی کوششیں جاری ہیں اور یہ بھی اپنی جگہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حکومت نے اوقافی جائیدادوں کے انخلاء کا قانون بنانے میں سست رفتاری دیکھائی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ جماعت اپوزیشن کے لائق بھی نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ شروع سے کوشش کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا کہ قانون وقف مکمل طور پر قانون شریعت سے ہم آہنگ ہوتا کہ جائیداد وقف کی حفاظت وصیانت کا معقول نظم ہوسکے اور اوقافی جائیدادوں پر جن لوگوں کا ناجائز قبضہ ہے اس کو قانون سازی کے ذریعہ آزاد کرایا جاسکے تاکہ ملت کی بیش قیمت جائیداد صحیح مصرف میں استعمال کے قابل ہوسکے۔

● ایک اہم مسئلہ مسلم مطلقہ کے لئے تاحیات یا تا نکاح ثانی سابق شوہر سے نفقہ دلانے کی تجویز کے خلاف شروع دن سے مسلم پرسنل لا بورڈ قانونی لڑائی لڑ رہا ہے، اور

حکومت کے ذمہ داروں سے اس بابت کوششیں بھی برابر کررہا ہے، حالانکہ بورڈ کی کوشش اور تگ ودو سے جو قانون بنایا گیا اس قانون کے بعض نقائص کو اس وقت بھی محسوس کیا گیا تھا، اور اس کے ازالہ کے لئے ترمیمات مرتب کرکے حکومت کے حوالہ بھی کی گئی تھیں۔ جواب میں یہی کہا گیا کہ اس وقت تو قانون کو پاس ہوجانے دیجئے، ترمیم تو آرڈیننس کے ذریعہ بھی ہوجائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں تحفظ حقوق مسلم مطلقہ قانون کے دستوری جواز کو چیلنج کیا گیا اور اس کے خلاف کئی رٹس سپریم کورٹ میں فائل ہوئیں۔ علاوہ ازیں کئی ہائی کورٹس کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں بھی دائر ہوئیں۔ پٹنہ اور حیدرآباد ہائی کورٹس کے فیصلے قانون شریعت سے ہم آہنگ تھے، ممبئی اور گجرات ہائی کورٹس کے فیصلوں نے اس کی تعبیر بالکل مختلف کرتے ہوئے مطلقہ کے لئے تاحیات یا تا عقد ثانی سابقہ شوہر کی جانب سے گزارہ کی رقم ضروری قرار دی۔ سپریم کورٹ میں ان مقدمات کی سماعت جولائی و اگست ۲۰۰۰ء میں ہوئی، مگر اس دستوری بنچ نے فیصلہ ایک سال بعد ستمبر ۲۰۰۱ء میں سنایا جس کی وجہ سے تحفظ حقوق مسلم مطلقہ قانون کے بنانے کا مقصد فوت ہوگیا۔ ماہ مئی ۲۰۰۱ء میں بمبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد کی فل بنچ نے وقوع طلاق کے بارے میں ایک فیصلہ دیا جو قانون شریعت سے متصادم ہے۔ اس سلسلہ میں بورڈ کی طرف سے ماہرین قانون کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اسی پس منظر میں نفقہ مطلقہ کے ایک مقدمہ کی بورڈ سپریم کورٹ میں پیروی بھی کررہا ہے تاکہ سابق میں جو کمیاں رہ گئی ہیں اس میں اس کی تلافی کی جاسکے۔ اس کے لئے آپ کی نگرانی میں بورڈ کی ہر طرح سے کوششیں ہنوز جاری ہیں۔

● یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عائلی قوانین پر مشتمل ایسا کوئی مستند مجموعہ پہلے سے موجود نہیں تھا جو زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامی کی صحیح ترجمانی کرتا ہو اور اس پر علماء کا اتفاق ہو، اور اسے عدالتوں میں بھی بطور سند پیش کیا جاسکے، ۱۹۸۶ء میں شاہ بانو مقدمہ کے موقع پر اس کی شدت سے

ضرورت محسوس کی گئی، چنانچہ قوانین اسلامی کو دفعہ وار مرتب کرنے کا کام بورڈ کے بانی جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے اس کی ابتدا فرمائی اور اس کے لئے ملک کے علماء اور فقہائے کرام کی خدمت میں ایک مفصل تحریر روانہ فرمائی اور اس تحریر کے جوابات کی روشنی میں نقشہ تیار فرمایا پھر ان ہی کی رہنمائی اور نگرانی میں کام شروع کیا گیا اور اس کام کے لئے چند فاضل علماء اور قانون داں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں، بڑی محنتوں اور کاوشوں کے بعد آپ کی زندگی میں ہی یہ کام مکمل ہو گیا لیکن زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا، لیکن اس کی طباعت کا مرحلہ بھی آپ ہی کے زمانہ میں آیا اور ۲۰۰۱ء میں اس کی طباعت ہوئی ۱۹/اگست ۲۰۰۱ء کو اس کی رسم اجراء ہوئی، اور بورڈ کی اس کوشش کو پورے ملک میں عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، بلاشبہ یہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کے دور کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

● آپ کے دور میں ایک بڑا کام یہ بھی ہوا کہ بورڈ نے کئی بار غور وخوض کرنے کے بعد ایک ایسا نکاح نامہ ۲۰۰۵ء میں بھوپال اجلاس کے موقع سے منظور کرلیا جس میں نکاح سے متعلق تمام شرعی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے اور زوجین کے لئے ضروری ہدایتوں کی تذکیر تاکہ آئندہ ازدواجی زندگی میں وہ اس کو ملحوظ رکھیں۔ اس نکاح نامہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے صفحہ اول پر نکاح پڑھانے والے کے لئے ضروری معلومات درج ہیں، صفحہ دوم پر عاقدین اور گواہوں کے نام وپتے، صفحہ تین پر زوجین کے لئے چند ہدایات اور حقوق بیان کئے ہیں، اور صفحہ آخر پر ایک مختصر اقرار نامہ ہے جس میں خوشگوار ازدواجی زندگی گذارنے اور نزاع کی صورت میں دار القضاء کی طرف رجوع کرنے کا عہد وپیمان ہے۔

● ۲۰۰۵ء میں وشولوچن مدن ایڈووکیٹ نامی شخص نے ایک پٹیشن سپریم کورٹ میں دار القضا کے خلاف داخل کی تھی جسمیں عدالت نے دار العلوم دیوبند، حکومت ہند اور مسلم پرسنل لا بورڈ کو بھی فریق بنایا تھا اس رٹ میں کہا گیا تھا کہ مسلمان سرکاری

عدالتوں کے خلاف شریعہ کورٹ قائم کر رہے ہیں، بورڈ نے اس نوٹس کا بھرپور اور مدلل جواب سپریم کورٹ میں داخل کیا اور بورڈ نے اپنے جواب میں بتایا کہ یہ عدالت ملکی عدالت کے بالکل خلاف نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں نظام قضا کا سسٹم شروع سے رہا ہے، انگریزوں کے عہد میں بھی رہا ہے، یہاں خاص طور پر عائلی مسائل پر شریعت کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے ہیں ایک طرح سے یہ عدالت کے بوجھ کو کم کرتا ہے، مخالفت نہیں، بورڈ نے صرف اتنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ وقتاً فوقتاً اس پر گہری نگاہ بھی رکھی اور جب جیسی ضرورت پیش آتی آپ کی قیادت میں حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کا نظم بھی کرتا رہا۔ بالآخر کئی سالوں کی پیشی اور شنوائی کے بعد ملک کی معزز عدالت سپریم کورٹ کے دو فاضل ججوں جناب چندرا مولی کمار پرساد اور پنا کی چندرا گھوش نے ۷/جولائی ۲۰۱۴ء کو اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا، یہ فیصلہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششوں کا ایک کامیاب زینہ بھی ہے اور آئندہ کے لئے ایک تجربہ بھی ہے اس فیصلہ میں جج صاحبان نے کہا کہ ایسے اداروں کا قیام قابل تعریف ہے مگر ان کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے، یہ غیر رسمی طور پر انصاف رسائی کا سسٹم ہے تاکہ فریقین کے درمیان امن وہم آہنگی سے تصفیہ کیا جائے، یہ فریقین پر منحصر ہے کہ اس کو قبول کریں، نظر انداز کریں یا رد کریں، بہرحال یہ فیصلہ بھی بورڈ کی کامیاب کوششوں کا نہ صرف ایک اہم حصہ ہے بلکہ بورڈ کے تحفظ شریعت کے میدان میں تاریخی کارناموں کی فہرست میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔ اور یہ تاریخی کارنامہ آپ کے دور کا انتہائی اہم اور تاریخی کارنامہ ہے۔

● دہلی ہائی کورٹ نے ۲/جولائی ۲۰۰۹ء کو ناز فاؤنڈیشن کی جانب سے دائر کردہ رٹ پر فیصلہ دیتے ہوئے دو بالغ افراد کے درمیان ہم جنسی کے فعل کو جرائم کی فہرست سے خارج کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ دو بالغ افراد کے درمیان باہمی رضامندی سے ہم جنسی جرم نہیں ہے۔ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ 377 کی رو سے ہم جنسی کا عمل عمر کے کسی

مرحلہ میں ہو، رضامندی سے ہو یا عدم رضامندی سے جرم ہے، دہلی ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں قانون کی اس دفعہ میں ترمیم کی بھی ہدایت دی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے بورڈ کا ایک اعلیٰ سطحی وفد آپ کی قیادت میں مؤرخہ ۱۵ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو وزیر اعظم سے ملا اور دہلی ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی اور ایک میمورنڈم بھی پیش کیا، چنانچہ بورڈ نے اولاً اپنے آپ کو اس مقدمہ میں فریق بنایا اور ملک کے مشہور اور ماہر قانون دانوں کی خدمات حاصل کر کے پوری قوت کے ساتھ قانونی لڑائی جاری رکھی، الحمدللہ سپریم کورٹ کے دو معزز ججوں (جی ایس سنگھوی اور سدھانشو جیوتی موکو پادھیائے) نے ۱۱ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو اپنا فیصلہ سنایا جس میں جج صاحبان نے اس عمل کو بدبختانہ قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت بھی کی اور آئندہ کے لئے اس پر روک لگا دی، آپ کے زمانہ کا یہ فیصلہ بھی بورڈ کی تاریخی کامیابی کا ایک اہم حصہ ہے۔

● داڑھی کا ایک مقدمہ ملک کی سب سے بڑی عدلیہ سپریم کورٹ میں پہونچا اور وہ معاملہ یہ تھا کہ ایرفورس کے ایک مسلم آفیسر نے سپریم کورٹ میں رٹ داخل کرتے ہوئے بتایا کہ اس کو داڑھی رکھنے کے لئے منع کیا گیا ہے جبکہ داڑھی شعائر اسلام میں داخل ہے اور حکومت کا یہ قانون مذہبی آزادی کے بنیادی حق میں مداخلت ہے اس کیس میں حکومت ہند کی طرف سے جو جواب داخل کیا گیا اس میں کہا گیا کہ داڑھی رکھنا اسلام میں فرض نہیں ہے یہ صرف سنت ہے جس کی فرض کی طرح اہمیت نہیں ہے، حکومت ہند کا یہ جواب انتہائی قابل اعتراض تھا، آپ کی قیادت میں بورڈ نے حکومت کو دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا کہ "داڑھی شعائر اسلام میں داخل ہے اور یہ سنت ہے اور مسلمانوں کو اپنے رسول ؐ کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے، حکومت ہند کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ بتلائے کہ اسلام میں کیا چیز فرض ہے۔ کیا واجب ہے، کیا سنت ہے، اور ان تینوں چیزوں کا مقام کیا ہے، اسے طے کرنے کا حق ہم حکومت کو نہیں دے سکتے، جب فوج اور ایرفورس میں سکھ ہم

وطنوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت ہے تو مسلمانوں کو بھی داڑھی رکھنے کی اجازت دی جائے اور داڑھی نہ رکھنے کی جو ہدایات فوج اور ایرفورس میں ہے انہیں واپس لیا جائے۔" بورڈ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بورڈ نے اس مسئلہ پر اپنی نشستوں میں کئی بار غور کیا، اور قانونی و سیاسی پیروی بھی کی، جب مقدمہ فیصلہ کے مرحلہ میں آیا تو سپریم کورٹ کے جج جناب جسٹس مارکنڈے کاٹجو صاحب نے فیصلہ سے پہلے اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرتے ہوئے ایک عجیب وغریب بدبختانہ تبصرہ کرتے ہوئے داڑھی کو طالبانیوں کی شناخت سے تعبیر کیا تھا، اس پر بورڈ کے سکریٹری حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے بڑا سخت موقف اختیار کیا یہاں تک کہ عدلیہ سے لے کر ایوان حکومت تک جج صاحب کے خلاف اپنی تحریک چھیڑ دی اور الحمدللہ اس کا نتیجہ ہوا کہ ملک اور عدلیہ کی تاریخ میں پہلی بار کسی جج نے اپنے ریمارک سے تحریر معافی مانگی، آپ کے جنرل سکریٹری رہتے ہوئے یہ بورڈ کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے جو لوگ ملکی اور عدالتی نظام کو سمجھتے ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ کتنا بڑا اور اہم تاریخی کارنامہ ہے۔

● بورڈ شروع دن سے عدالتوں اور قانون ساز اداروں سے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی لڑائی لڑتا رہا ہے یہ الگ بات ہے کہ یکے بعد دیگرے بورڈ نے مختلف لڑائیاں لڑیں، متبنیٰ بل، یونیفارم سول کوڈ، جبری نسبندی، نفقہ مطلقہ، داڑھی، ہم جنسی اور دارالقضاء وغیرہ لیکن اس وقت بھی بورڈ شعائر اسلامی اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے کئی طرح کی قانونی لڑائی لڑ رہا ہے، جس میں ایک اہم مسئلہ کیرالا ہائی کورٹ میں قرآن وسنت سوسائٹی کی جانب سے ۲۰۰۸ء میں داخل ہونے والی وہ رٹ ہے جس میں اسلامی قانون وراثت کو چیلنج کیا گیا ہے، کیرالا ہائی کورٹ نے اس میں حکومت ہند اور حکومت کیرالا کو فریق بنایا ہے، بورڈ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے قانون دانوں سے مشورہ کر کے اولاً بورڈ کو بھی اس میں فریق بنوایا اور پیروی شروع کر دی۔ اور اس کے لئے کیرالا ہائی کورٹ کے مشہور وکلا کی

خدمات بھی حاصل کی گئیں، حالانکہ اس سلسلہ میں بورڈ کا ایک مؤقر وفد آپ کی قیادت میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ سے ملا تھا اور میمورنڈم پیش کرتے ہوئے یہ درخواست کی تھی کہ اس میمورنڈم کی روشنی میں مرکزی حکومت وہاں جواب داخل کرے، اس کے علاوہ وزیر قانون سے بھی آپ کی ہدایت پر بورڈ کے سکریٹریوں کا ایک وفد ملا اور اس ملاقات کا اچھا اثر ہوا کہ مرکزی حکومت نے بورڈ کی خواہش کے مطابق اپنا جواب داخل کیا، یہ مقدمہ جب کیرالا ہائی کورٹ کے ججوں چیف جسٹس جناب اشوک بھوشن جی اور جسٹس اے۔ایم۔شفیق کے سامنے مؤرخہ ۲/جولائی ۲۰۱۵ء کو جب شنوائی کے لئے پیش ہوا تو جج صاحبان نے اس پٹیشن کو ہی خارج کردیا۔ایک طویل انتظار کے بعد بزرگوں کی انتھک محنت کے نتیجہ میں بورڈ نے اس میں بھی کامیابی حاصل کرلی۔

● بورڈ کے اخراجات کا معاملہ اور خاص کر مرکزی دفتر میں ہونے والے یومیہ اخراجات اور کارکنوں کی تنخواہوں کی ادائیگی وغیرہ جیسے مستقل خرچ کے لئے ۲۰۱۱ء میں ایک خطیر رقم کے ذریعہ بنگلور میں چار ہزار اسکوائر فٹ پر مشتمل ایک حصہ حاصل کیا جس سے ماہانہ کرایہ کی شکل میں اتنی رقم حاصل ہوجاتی ہے کہ بورڈ کے دفتر کے بنیادی اخراجات پورے ہوجاتے ہیں، اور آپ کے زمانے میں اس کام اور اقدام کی جس قدر ستائش کی جائے وہ کم ہے، اس کے علاوہ چار درجن کے قریب بیش قیمت رسائل بھی بورڈ نے اب تک شائع کئے ہیں جس میں اسلامی قانون کا دفعہ وار مرتب مجموعہ ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کے نام سے کافی اہمیت کا حامل ہے، اسی طرح نظام قضا، تفہیم شریعت، اصلاح معاشرہ اور آئینی حقوق بچاؤ تحریک جیسے اہم موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے کافی اہم ہیں، گذشتہ دس سالوں سے پابندی کے ساتھ بورڈ کا ترجمان سہ ماہی خبرنامہ آپ کی ادارت میں شائع ہورہا ہے اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

● آپ کی سرپرستی میں اب تک مجلس عاملہ کے اکسٹھ اجلاس اور پندرہ اجلاس

عام ہوچکے ہیں جس میں ایک دہلی کا اجلاس جزوقتی جنرل سکریٹری کی حیثیت سے تھا لیکن نگرانی آپ ہی کی تھی، بہرحال قصہ مختصر یہ کہ آپ کی پوری زندگی ملی امور وخدمات کے اردگرد گھومتی ہے پیرانہ سالی، بیماری واعذاری کے باوجود آپ حتی المقدور قوم وملت کی خدمت میں لگے رہے۔آپ کی زندگی کی آخری مجلس عاملہ کی میٹنگ ۷/جون ۲۰۱۵ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی جس میں آپ نے صدر محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے گذارش کی کہ اب میری صحت نہیں ہے مجھے بورڈ کی ذمہ داریوں سے معاف کردیں حضرت صدر محترم دامت برکاتہم نے حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کے اصرار پر اور ارکان عاملہ کے مشورہ سے حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کو بورڈ کا بااختیار کارگزار جنرل سکریٹری بنانے کا اعلان فرمایا۔آپ کی زندگی کی آخری نشست میں ہی دین اور دستور بچاؤ تحریک اور مجلس عمل کی تشکیل کا فیصلہ ہوا۔اور آپ نے مجھے یہ ہدایت دی کہ اب تمام معاملات حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب دیکھیں گے۔

● بورڈ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کی مختلف کمیٹیاں اسکے دست وبازو ہیں، سماجی اصلاح وفلاح کی خاطر اصلاح معاشرہ کمیٹی ہے، وکلاء ودانشوروں کو اسلامی قانون سے واقف کرانے کے لئے تفہیم شریعت کمیٹی ہے، پورے ملک میں خاص طور پر شریعت اسلامی کی روشنی میں عائلی مسائل کے حل وتصفیہ کے لئے دارالقضا کمیٹی ہے، نکاح کے لازمی رجسٹریشن کے لئے لازمی نکاح رجسٹریشن کے نام سے ایک مستقل کمیٹی ہے، آثار قدیمہ کے نام سے بھی ایک کمیٹی ہے، بابری مسجد ملکیت مقدمہ کی نگرانی اور سپریم کورٹ میں زیر دوراں حقیت مقدمہ کی نگرانی کے لئے ایک علیحدہ کمیٹی ہے، اس کے علاوہ دیگر شرعی مسائل کے خلاف پورے ملک میں دائر ہونے والے مقدمات اور اپیلوں کے جائزہ اور نگرانی کے لئے مستقل قانونی کمیٹی ہے اور ملک کے قانون ساز اداروں کے ذریعہ نئے وضع ہونے والے قانون پر نگاہ رکھنے اور اسلامی شریعت کے مطابق دستور ہند کی دفعہ

۲۵/۲۶/۲۹/اور ۳۰/ کے تحت شریعت مخالف قوانین کی شقوں کے خلاف قانون ساز اداروں اور حکمراں جماعت کے وزراء سے مستقل رابطہ کے لئے ملک گیر آئینی حقوق بچاؤ تحریک ہے جو حکومت اور اس کے عملے کو بروقت متوجہ کرنے اور حکومت کے خلاف عوام کے اندر بیداری پیدا کرنے کے فریضہ کو بھی بخوبی انجام دیتے رہے۔

● آپ کی پوری زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم کی عملی تصویر تھی، کس طرح ماتحتوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ملت کو سمیٹنے اور ساتھ لے کر کام کرتے رہنے کی خو آنے والی نسلوں کے لئے درس عبرت ہے، اس راہ میں بے شمار اڑچنیں بھی آئیں مگر آپ کے جگر نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ نہ صرف برداشت کیا بلکہ ملت کی خاطر ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے پورے تن من کے ساتھ گونا گوں خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۷/اگست ۲۰۱۵ کو کی شام ۶/بجے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی سرپرستی میں ایک طویل عرصہ تک بری بھلی خدمت انجام دینے کا موقع ملا، بہت سی یادیں اور باتیں ہیں جو آج کی امت اور ملت کے لئے نقوش راہ سے کم نہیں، انشاء اللہ اپنا اخلاق، دینی اور ملی فریضہ سمجھتے ہوئے آئندہ سپرد قلم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ حضرت مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے سئیات کو حسنات سے مبدل فرما کر اعلیٰ علیین میں اولیاء وصلحاء کی جماعت میں شامل فرمائے۔ آمین

(مضمون نگار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی کے مرکزی دفتر میں آفس سکریٹری ہیں)

☆☆

مولانا سید نظام الدین اوران کا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ندوۃ العلماء سے تعلق

● مولانا محمد رابع حسنی ندوی

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کی شخصیت سے مجھے واقفیت آج سے نصف صدی قبل ہوئی تھی، وہ اس وقت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے مرکزی دفتر پھلواری شریف کے ذمہ دار تھے، میں ایک تقریب میں جو مولانا عبداللہ عباس ندوی کے گھر کی تھی، پھلواری شریف گیا تھا، اس موقع سے امارت شرعیہ بھی جانا ہوا، وہاں مولانا سے ملاقات ہوئی، امارت شرعیہ کے کاموں کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے، میں نے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا، بعد میں عرصہ تک براہ راست ملاقات کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کی مؤقر حیثیت ان کے کام ومقام کے لحاظ سے ذہن میں رہی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے کاموں کے سلسلہ میں ان کے متعلق معلومات حاصل ہوتی رہیں، اور بورڈ کے اس وقت کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی نے ان کو تحفظ شریعت کے کاموں میں شریک کار بنایا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے صدر ہونے کی وجہ سے بورڈ کی مشاورتی نشستیں لکھنؤ میں اور خصوصاً ندوۃ العلماء میں بھی ہوتی، وہ اس میں تشریف لاتے اس طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ان کا تعلق بڑھا، دونوں کے درمیان قدردانی کا تعلق قائم ہوا، ملی مسائل کے سلسلہ میں مشارکت سے اس تعلق میں اضافہ ہوا اور ملت کے

قابل فکر معاملات میں تبادلہ خیال ہوا، اور دین وملت کی خیر خواہی اور اخلاص عمل اور علم وفہم اور فکری ومزاجی ہم آہنگی کے لحاظ سے دونوں کے درمیان ربط بڑھا، اسی کا اثر تھا کہ جب حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی کا سانحہ ارتحال پیش آیا، تو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ میں ان کے جانشین کی حیثیت سے مولانا سید نظام الدین صاحب پر ان کی نگاہ پڑی اور بورڈ کے ارکان عاملہ کے مشورہ سے ان کو بورڈ کا جنرل سکریٹری نامزد فرمادیا، جس کی پھر انتخابی اجلاس میں ارکان بورڈ نے توثیق وتصدیق کی۔

انھوں نے ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل میں جس طرح ہوشمندی حکمت وتدبر، توازن واعتدال کے ساتھ مشورے دیئے اور رہنمائی کی، اس سے ان کو بہت جلد بلند مقام حاصل ہوگیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو بھی ان کے تعاون وحسن کارکردگی سے بڑی تقویت حاصل ہوئی، بورڈ کے کئی بڑے اجلاس ملک کے بڑے اور اہم شہروں میں منعقد ہوئے، جن کے تحت ضروری مشورہ وتجویز عمل کے سلسلہ میں مشارکت ہوئی اور جے پور اجلاس میں دارالقضاء کی تحریک اور اصلاح معاشرہ کو زیادہ قوت سے پیش کیا گیا۔

احمد آباد کے اجلاس میں ان کے مشورے کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑی اہمیت دی، جس میں انھوں نے ندوۃ العلماء سے بعض کارگزار افراد کو اس اجلاس کے کامیاب اور موثر بنانے کے لئے مانگا تھا، چنانچہ مولانا سید محمد مرتضیٰ مظاہری اور نوجوان اساتذہ میں عزیزان مولوی سلمان حسینی، مولوی خالد ندوی غازی پوری اور مولوی محمد رضوان ندوی وغیرہ کو بھیجا اور بڑا کامیاب جلسہ احمد آباد میں منعقد ہوا، جس میں مقامی لوگوں میں مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری، مولانا غلام محمد وستانوی اور ظفر سریش والا وغیرہ تشریف نہ لے جاسکے تھے، باقی ہر اجلاس میں انھوں نے شرکت فرمائی تھی، یہاں ان کا خطبہ صدارت ان کی نمائندگی کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس ندوی نے پیش کیا تھا، مولانا سید نظام الدین صاحب اراکین کے انتخاب اور حکومت سے رابطہ اور میڈیا سے گفتگو وغیرہ کے امور میں

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی منشاء تک کا لحاظ کرتے اور جو قدم بھی وہ اٹھاتے اس میں ان کی فکر ورائے کا پورا احترام ولحاظ کرتے، اس میں بورڈ کے دوسرے عہدیداران اور ارکان میں وہ زیادہ ممتاز نظر آتے تھے۔

وہ حضرت مولانا سے صرف انتظامی تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ تعلق رکھتے تھے جو ایک مسترشد کا اپنے مرشد کے ساتھ، شاگرد کا اپنے استاد کے ساتھ اور مرید کا اپنے پیر کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہر ملاقات میں دینی استفادہ کو ملحوظ رکھتے تھے اور ان کے رائے و مشورے کو عمل میں لانے کے لئے بڑی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ ان کے اندر سعادت و شرافت کی یہ باتیں زمانہ طالب علمی سے موجود تھی، جب وہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور اسی زمانے سے ان کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق خاطر تھا۔ حدیث کی تعلیم انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں جن اساتذہ سے حاصل کی، ان میں ان کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے زیادہ تعلق تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، شیخ الحدیث کے ساتھ صدر المدرسین کے منصب پر بھی فائز تھے اور ان سے حضرت مولانا علی میاں ندوی کو بھی پڑھنے کا شرف اور عقیدت کا تعلق تھا، دونوں کے زمانہ تعلیم میں خاصہ فرق تھا، جو پندرہ سال کا تفاوت رکھتا ہے۔ 47-1946ء کا سال مولانا نظام الدین کے دورہ حدیث کا سال تھا اور 1946ء میں میرا بھی دیوبند میں بحیثیت طالب علم قیام تھا، مگر طلباء کی کثرت کی وجہ سے میرا ان سے تعارف نہ ہوسکا تھا وہ دیوبند سے تعلیمی فراغت کے بعد اپنے وطن بہار آگئے تھے اور تدریس اختیار کرلی، ان کو تدریس سے امارت شرعیہ آنے کی، امیر شریعت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی نے دعوت دی تھی، لیکن مدرسہ والوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ابھی نہ جائیں ان کے فوری طور پر چلے جانے سے مدرسے کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ 1965ء میں وہ امارت شرعیہ آگئے اور اس طرح انھوں نے پورے پچاس سال امارت شرعیہ کی خدمت انجام دی اور وہیں سے

ان کو سفر آخرت کے لئے الوداع کہا گیا اور پھلواری شریف کے ایک قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا سید نظام الدین صاحب سے حضرت مولانا علی میاں کو جو مناسبت تھی اور ان کے فہم وبصیرت اور علم وآگہی کی انھیں جو قدر تھی اس کا اعتراف انھوں نے ان کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا رکن بنا کر کیا اور ان کے امیر شریعت کے انتخاب میں بھی دلچسپی لی۔

مولانا نظام الدین صاحب نے علمی وملی خدمت اور اس میں ایک منصب ومقام حاصل کرنے کے باوجود دینی ترقی میں قناعت کو اختیار نہ کیا، بلکہ برابر تعلق مع اللہ اور دینی ترقی میں مؤثر صفات واخلاق کو اختیار کرنے میں لگے رہے، دینی شخصیات نے استرشاد اور استفادہ کا تعلق جاری رکھا۔ ان کا یہ تعلق دارالعلوم دیوبند میں اپنی طالب علمی کے اختتامی زمانے میں اپنے استاد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے ہوا تھا اور اس کے چند سال بعد 1952ء میں وہ ان سے بہار میں بیعت ہوگئے تھے اور اس موقع پر ان کو حضرت مدنی نے جو نصیحتیں فرمائی تھیں ان پر وہ تاعمر عمل پیرا رہے اور ان وظائف واوراد کی بھی ہمیشہ پابندی کی، جو ان کو حضرت مدنی نے تلقین فرمائی تھی، ان کو وہ نصیحتیں ہمیشہ انہی الفاظ میں یاد رہیں، جنھیں وہ اسی طرح دہرا دیتے تھے۔ جیسا کہ مولانا نے خود بتایا کہ دیر تک کلمات تلقین فرمائے، پہلا دوسرا کلمہ پڑھایا اور عہد لیا کہ جھوٹ نہیں بولو گے، اذیت نہیں پہنچاؤ گے اور نصیحتیں فرمائیں، مولانا فرماتے تھے، میں نے سر سے ٹوپی اتاری، حضرت نے سر پر ہاتھ پھیرا، سنت کی اتباع اور استغناء عن الخلق اور حق پر قائم رہنے پر زور دیا اور فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کا ہوجاتا ہے، اس کی کوشش کرو کہ اللہ راضی ہوجائے، چنانچہ مولانا نے پوری زندگی اس وصیت کو پیش نظر رکھا اور تمام اعمال میں رضائے الٰہی کا مقصد حیات بنایا۔

حضرت مدنی کے بعد باضابطہ انھوں نے کسی سے بیعت نہ کی، اس لئے کہ حضرت

مدنی کا جو مقام اور رتبہ تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت کے مشائخ ان کے مریدین کو باضابطہ بیعت نہیں کرتے تھے اور اسی بیعت پر قائم رکھتے ہوئے سرپرستی فرماتے تھے۔ بہار کے مشائخ نے حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے خلیفہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری اور صاحبزادے مولانا شاہ منت اللہ رحمانی دونوں بزرگوں سے انھیں عقیدت ومحبت تھی، بعد میں یہ تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ہوگیا تھا۔ حضرت مولانا سے انھیں جو عقیدت کا تعلق ہوا اس میں دو اہم باتوں کو انھون نے اپنے بعض احباب سے ذکر کیا، ایک تو یہ کہ ان کی مجلس میں کسی کی غیبت کا گزر نہیں ہے اور ایک بات اور جس نے ان کو متاثر کیا کہ ان کے اندر داعیانہ کردار اور عالمانہ وقار کا بڑی بلندی سے دیکھا تھا، انھیں حضرت مولانا کے سلسلہ میں خلافت بھی حاصل ہوئی اور بعض طالبین کو ان کی اصرار پر بیعت میں بھی داخل کیا، جبکہ عمومی طور پر اخفاء سے ہی کام لیا اور پوری زندگی میں سادگی وقناعت وتواضع و اخلاق واعتدال، توازن انفرادی واجتماعی بہی خواہی، ہمدردی تحمل، صبر وبرداشت، شکر کے مواقع پر شکر اور جذبہ احسان مندی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

حضرت مولانا کی زندگی میں ہی اور وفات کے بعد میرا اور ان کا باہمی ربط خاص طور پر اپنائیت کا اور شفقت کا بڑھ گیا تھا اور وہ ایک چاہنے والے بھائی کی طرح پیش آتے تھے، ندوۃ العلماء کے مسائل میں بھی وہ بڑے خیرخواہانہ اور مفید مشوروں سے نوازتے اور تقویت پہنچاتے تھے، اعذار کے باوجود ندوۃ العلماء کی مجلسوں میں شرکت کا اہتمام فرماتے۔

بورڈ کے کاموں اور مسائل میں ان کے ساتھ بڑی فکری ہم آہنگی رہی اور جب کبھی کوئی ایسی بات بعض مصلحتوں سے کہنی پڑی، جس میں ان کی رائے مختلف ہوئی، تو بھی عموماً میری رائے کو نظر انداز نہیں کیا، بورڈ کی عاملہ کے آخری جلسہ میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، وہ اپنی صحت کی خرابی اور اعذار کی وجہ سے دست برادری کی بات کہہ رہے تھے، میں ان کو ایسا نہ کرنے کی درخواست کی اور ان کے سکریٹریوں میں ایک اہم سکریٹری حضرت مولانا منت

اللہ رحمانی کے صاحبزادے مولانا شاہ سید ولی رحمانی کو کارگزار سکریٹری جنرل کے طور پر اضافے کی بات رکھی اور عاملہ نے بھی اس کو قبول کیا اور یہ بڑی اچھی شکل سامنے آئی، مجھے ان سے بڑی اپنائیت معلوم ہوتی تھی اور ان کو جو اپنائیت کا تعلق تھا اس میں حضرت مولانا علی میاں کے رشتے کو بڑا دخل تھا، کہ وہ میرے ماموں تھے، مولانا علی میاں سے ان کو جو ربط وتعلق تھا وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور اپنے خاندان کے بزرگوں کا ان کے خاندانی بزرگ حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق کا ذکر کرتے تھے، کہ ان کے اجداد میں بعض حضرات حضرت شہید کے قافلہ میں شامل تھے اور ان کے جدامجد سید صادق علی جو بذات خود حضرت سید صاحب کے ساتھ سفر ہجرت و جہاد میں نہیں گئے تھے، لیکن ان کو افراد و سامان رسد مہیا کرانے کا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مخلصانہ برکات ہمیں بھی عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔ (آمین)۔

☆☆

حضرت مولانا سید نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ

ایک عظیم قائد اور رہبر شخصیت

● مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبيين محمد بن عبدالله الامين، وعلى آله و صحبه اجمعين و بعده.

تعلیمی وتدریسی زندگی وعلمی امتیاز:

حضرت مولانا سید نظام الدینؒ ملت اسلامیہ ہند کی ان گنی چنی شخصیات میں سے ایک تھے جنھوں نے اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ دین وملت کو تقویت پہنچانے کا کام انجام دیا، بہار میں ضلع گیا کے گھوری گھاٹ میں 31/مارچ 1927ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد 1941ء میں بہار کی مشہور قدیم درسگاہ "مدرسہ امدادیہ دربھنگہ" میں داخل ہوئے، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے 1942ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں 1946ء میں دورۂ حدیث کے امتحان میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے، مزید ایک سال رہ کر فقہ وتفسیر میں اختصاص کیا اور 1947ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، جہاں ان کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی سرپرستی حاصل رہی اور ان کے درس حدیث سے استفادہ کے بعد انھوں نے بیعت واسترشاد کا تعلق بھی قائم کیا تھا، پھر وہ اپنے وطن بہار آگئے اور مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی چمپارن میں صدر مدرس کی حیثیت سے

ان کا تقرر ہوا، وہاں 1962ء تک تقریباً پندرہ سال درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ دوسال 1963-1964ء مدرسہ رشید العلوم چترا میں بحیثیت صدر مدرس تدریسی خدمات انجام دیں، ان کی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے 1965ء میں مدرسہ رشید العلوم سے امارت شرعیہ پھلواری شریف بلا لیا اور وہ ناظم امارت شرعیہ کے طور پر عرصہ دراز تک خدمات انجام دیتے رہے، امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد یکم نومبر 1998ء میں مولانا نظام الدین امیر شریعت سادس منتخب ہوئے۔ مولانا کو علوم شرعیہ اور خاص طور پر فقہ وقضا میں رسوخ حاصل تھا۔

اعلیٰ ادبی ذوق اور شعری مذاق:

دینی وعلمی امتیاز، خصوصیت اور قائدانہ مقام و کردار کے ساتھ مولانا نظام الدین صاحب اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے، زمانہ طالب علمی ہی سے شعر وشاعری کا شغل بھی تھا، حمد اور نعت پاک کے اشعار کہے، مدارس کے ترانے کہے، منقبت کہی اور جامعہ رحمانیہ مونگیر کا ترانہ بھی کہا جس سے ان کی شعری خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا کی طبیعت میں روانی تھی، جوش تھا، احساسات کا ابال تھا، جو شعر بن کر ان کی زبان سے نکلا کرتا تھا، ان کے سینے میں جو دردمند دل تھا اور فکر ارجمند تھا اس کا خمیر بھی ایمان ویقین سے اٹھا تھا۔

حمد کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں: ع

تیرا ہی نام ہے ورد زباں، ہر نام سے پہلے
پکارا ہے تجھی کو میں نے ہر اقدام سے پہلے

چند نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں: ع

سلام اس پر کہ جس نے قلب انساں کو جلا بخشی
خرد کا نور بخشا، علم و حکمت کی ضیاء بخشی

عداوت کیش فطرت کو محبت کی ادا بخشی
سزا کے مستحق بندوں کو مولا کی رضا بخشی

مدینہ منورہ کو دیکھ کر کہا: ع

مدینہ سامنے تھا یا تمنا زندگی بھر کی
زیارت اک فقیر بے نوا کو شاہ کے در کی
زباں تھی تر مری صلی علی کے ذکر پیہم سے
بہے جاتے تھے آنسو سرخوشی کے چشم پرنم سے

غزل کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں: ع

وہ میری بزم شوق میں کیا آئے کیا گئے
فردوس بن کے آئے جہنم بنا گئے

دینی خصوصیات:

مولانا نظام الدین صاحب کو اپنے خاندان کی اعلیٰ دینی وایمانی صفات وخصوصیات جس طرح ورثے میں ملیں اور بچپن میں ان کو بہترین ایمانی تربیت ملی اسی طرح ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعام رہا کہ انھیں اپنے اساتذہ و مشائخ کی بڑی شفقت حاصل ہوئی اور انھوں نے اپنے محسنوں کو دل و جان سے چاہا، خاص طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت اس سلسلہ میں قابل ذکر اور اس فہرست کی سب سے ممتاز شخصیت ہے، پھر حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی رفاقت ان کو حاصل ہوئی۔ مولانا نظام الدین صاحب کے علمی و دینی مقام، تواضع، بے نفسی، خلوص وللّٰہیت، علمی بصیرت، دینی غیرت اور دوسری صفات و امتیازات کے ان کے معاصرین بھی قدرداں اور معترف تھے، احسان وسلوک میں اخفائے حال اور استقامت جیسی خصوصیات کے حامل تھے۔

قائدانہ مقام بحیثیت جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لاء بورڈ:

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے ساتھ رہ کر مولانا نظام الدین صاحب نے جو صلاحیتیں پیدا کی تھیں، ان سے انھوں نے مسلم پرسنل لاء کے کاز کو بہت تقویت پہنچائی اور ان کی صلاحیتوں کی قدردانی کرتے ہوئے اس وقت کے صدر بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے انہیں مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وفات کے بعد اپنے خصوصی اختیار سے ارکان کے مشورہ کے ساتھ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ متعین کیا اور وہ اخیر تک اس منصب پر فائز رہے اور اپنی صلاحیتوں اور تجربات کی بنا پر بورڈ کے نظام کو مستحکم کیا، اس کے دائرہ کو وسیع کیا اور اس کی سرگرمیوں میں اضافہ کیا، ملک میں جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو ان کو فکر لاحق ہوتی اور فوراً ورکنگ کمیٹی یا ذمہ داروں کی میٹنگ طلب کرتے تاکہ مسئلہ پر غور کیا جائے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ اور پھر ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ بورڈ اور ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی کی حیثیت سے جو کام کیا، اس سے ان بزرگوں کے ساتھ رائے کا توافق، اظہار حق، فکری توازن و اعتدال، دین وشریعت میں رسوخ، ملی مسائل کا درد اور تعلیم میں جامعیت جیسی خصوصیات و خوبیاں سامنے آئیں۔

مولانا نظام الدین صاحب کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے شروع سے بڑی مناسبت تھی اور وہ ان کی ایمانی بصیرت کے ساتھ ان کے دینی جذبات وصفات کے بڑے معتقد اور قدردان تھے، بعض موقعوں پر انھوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ جن شخصیات سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں ایک شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تھی اور اس کا بھی اظہار کیا کہ ان کی صفت حیا اور ان کے عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار نے خاص

طور پر بہت متاثر کیا، انھوں نے اس کا بھی اظہار کیا کہ صفت حیا ان میں بہت وسیع مفہوم میں جلوہ گر تھی اور جن مشائخ وعلماء سے صحبت انھوں نے اٹھائی ان میں حضرت مولانا کو اس صفت میں زیادہ امتیازی حیثیت سے دیکھا۔

وہ حضرت مولانا کا بہت ہی ادب و پاس رکھتے تھے اور ان کی ایماء کو حکم کا درجہ دیتے تھے اور صرف ان کے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا، بلکہ دینی استفادہ واسترشاد کا رابطہ بھی رکھتے تھے اور پھر ان کی وفات کے بعد جس کی خبر انھوں نے اپنے قیام مدینہ منورہ میں سنی تھی اور بہت متاثر ہوئے تھے، وہیں سے فیکس کے ذریعہ پیغام بھیج کر ان کے بھانجہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی پر تعلق اور اعتماد کا اظہار کیا اور جب مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے ایک خصوصی نشست کر کے مولانا رابع حسنی ندوی کو ناظم ندوۃ العلماء مقرر کیا تو مولانا نظام الدین صاحب نے فوراً ان کی تائید کی اور ان پر اعتماد کا اظہار کیا۔

مولانا نظام الدین صاحب کے مزاج میں نرمی غایت درجہ تحمل اور تواضع کی خصوصیات تھیں، اس کی وجہ سے کسی بھی عہد میں پرسنل لاء بورڈ کے ساتھ ان کا اختلاف یا ٹکراؤ نہیں ہوا، بلکہ توافق، تفاہم اور تعاون کا ماحول بنائے رکھا اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب جب صدر منتخب ہوئے تو بورڈ کے امور میں دونوں کے درمیان اس توافق، تعاون اور تفاہم میں اضافہ ہوا، مولانا رابع حسنی صاحب کے ساتھ مولانا علی میاں کے تعلق کی وجہ سے بہت زیادہ احترام اور محبت کا معاملہ کرتے تھے، کسی مسئلہ کے بارے میں اگر اختلاف ہوا تو آپس کی گفتگو سے مفاہمت ہوجاتی اور ایک دوسرے کی رعایت کی وجہ سے کوئی اختلاف ظاہر نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کے ساتھ ان کا تعلق برابر بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ وہ ان کو حضرت کہہ کر مخاطب فرماتے اور دوسرے اہل تعلق کو ان کی قدر کرنے اور ان کی صفات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے اور بڑے ادب ولحاظ سے اور دینی وملی معاملات

میں سمع وطاعت کا معاملہ رکھتے، جبکہ وہ عمر میں ان سے کچھ بڑے اور دارالعلوم دیوبند کے زمانہ تعلیم میں ان سے کچھ سینئر رہے تھے، ان سے تعلق کی وجہ سے مجھ ناچیز سے بھی شفقت فرماتے اور اپنائیت کا اظہار کرتے جس کا برابر راقم کو تجربہ ہوتا رہا، ان کے یہاں حاضری پر بھی اور ان کی ندوہ تشریف آوری پر بھی اور دوسرے موقعوں پر بھی جو مختلف مناسبتوں سے سامنے آتے تھے۔ انھوں نے تین صدور کے ساتھ کام کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اور پھر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ بحیثیت جنرل سکریٹری کام کیا اور ہمیشہ ان صدور کا احترام اور ان کے ساتھ تعاون کا معاملہ رہا اور کبھی ان کی درمیان کوئی کشمکش نہیں ہوئی، اختلاف رائے طبعی بات ہے، اس پر بھی گفتگو اور تبادلہ خیال سے ظاہر نہیں ہونے دیا، جس سے پرسنل لاء بورڈ کے کام میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی، بلکہ بورڈ کا دائرہ اور وسیع ہوا اور اس کے بڑے کامیاب اور عظیم الشان اجلاس ہوئے، جن میں بعض تاریخ ساز اجلاس ثابت ہوئے، ان اجلاس کو مفید سے مفید تر بنانے میں مولانا جس فکرمندی، توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے، اس کا سبھی کو اعتراف ہے، مولانا کے دور میں بورڈ کے ارکان کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا، اس میں سبھی مسالک اور مکاتب فکر کی نمائندگی کا خیال رکھتے ہوئے فعال اور نوجوان لوگوں کا بھی خیال رکھا گیا۔ دارالقضاء، اصلاح معاشرہ، تفہیم شریعت اور بابری مسجد کے مسئلہ کو اس حکمت وتدبر کے ساتھ پیش کیا کہ جس سے مسلمانوں کے لئے اپنے احکام دین پر عمل آسان ہو اور برادران وطن کی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو اور حکومت کا ٹکراؤ کا احساس نہ ہونے پائے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق اور اس کی رکنیت:

مولانا نظام الدین صاحب کو ندوۃ العلماء کے حالات سے اتنی دلچسپی تھی جتنی امارت شرعیہ یا مسلم پرسنل لاء بورڈ سے، وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے ممبر ہونے کے بعد

سوائے چند جلسوں کے برابر شریک ہوئے اور مفید مشورے دیئے، مجلس انتظامی کے ساتھ مجلس نظامت کے جلسوں میں بھی وہ برابر شریک ہوتے رہے، ان کی موجودگی اور مشوروں کی وجہ سے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب ان کی شرکت کو بہت اہمیت دیتے اور اہم امور میں ان سے مشورہ کرتے اور ان کے مشورہ کے مطابق فیصلے کرتے۔

اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور بے مثال صبر وتحمل:

مولانا نظام الدین صاحب کی بنیادی خصوصیت اصابت رائے، نظم ونسق کا اہتمام تھی، وہ شدید اعتراضات اور ذاتی حملوں پر بھی مشتعل نہیں ہوئے، جس کا مشاہدہ پرسنل لاء بورڈ کے متعدد اجلاس میں ہوا، یہ خصوصیت مولانا نظام الدینؒ اور مولانا رابع حسنی ندوی صاحب دونوں میں پائی جاتی ہے، اس کی وجہ سے بورڈ اتنے عرصہ تک کسی ٹکراؤ اور داخلی انتشار سے محفوظ رہا۔ ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں بعض ممبران نے بعض مسائل میں سخت موقف اختیار کیا اور پرسنل لاء بورڈ کے انتظامی مسائل میں مولانا کی کارگزاری پر نامناسب الفاظ استعمال کئے، لیکن مولانا نے کبھی اس پر اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور نہ ان ممبران کے بارے میں ان کے رویہ میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی کسی مجمع میں اس کا اظہار کیا۔

انسانی بنیاد پر تعاون وہمدردی:

مولانا سید نظام الدین صاحب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ظاہر ہوئی کہ انھوں نے امارت شرعیہ پھلواری شریف میں اپنے عہد نظامت اور پھر عہد امارت میں مظلوم اور مصیبت زدگان کی ریلیف کے سلسلہ میں وسیع پیمانہ پر تعاون کیا، جو ملک کے مختلف حصوں میں سیلاب، طوفان، زلزلوں، فسادات اور وبائی امراض سے نقصانات سے سامنے آئی تھی، انھوں نے امارت شرعیہ کے وفود بھیج کر مالی مدد کا سہارا دیا اور یہ سب کچھ انسانی بنیاد پر بلاتفریق مذہب وملت انجام پایا، انھیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تحریک

پیام انسانیت سے مزاجی اور ذوقی مناسبت بھی تھی اور اس کے پیغام کو وہ عملی طور پر پیش کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، جس کے لئے انھوں نے موثر اقدامات کئے، جس کی تفصیل کا موقع نہیں، لیکن امارت میں اس کے شواہد وتفصیلات موجود ہیں، مولانا نے اپنے وطن ’گیا‘ میں پیام انسانیت کا پروگرام بھی منعقد کیا تھا، جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے شرکت بھی فرمائی تھی، جس کا انھوں نے اپنی کتاب ’’کاروان زندگی‘‘ حصہ ہفتم میں تذکرہ بھی کیا ہے اور جب پیام انسانیت کی کمیٹی رجسٹرڈ ہوئی، تو وہ اس کے نائب صدر بھی بنائے گئے۔

مردان کار کی تربیت اور ملت کی رہنمائی:

مولانا کا ایک بڑا اور اہم وصف مردان کار کی تربیت ہے، انھوں نے مختلف مقامات پر کارگزار لوگوں کی خدمات اس طرح لیں کہ وہ اپنی سطح سے بلند ہو کر کام کرنے لگے، خاص طور پر نوجوان علماء کی انھوں نے بڑی قدردانی کی اور جو جس کام کے لئے زیادہ کارگر ہو سکتا تھا، وہ کام اس کو دے کر اس کی شخصیت کی تشکیل کی، ہمیں کئی ایسے افراد کے متعلق معلوم ہے جن کی پہلے کوئی خاص پہچان نہیں تھی، لیکن مولانا کی نظر عنایت اور توجہ سے انھوں نے اہمیت حاصل کر لی اور یہ محسوس کیا گیا کہ مولانا کا فیصلہ بالکل مناسب تھا، جن اداروں کے مولانا سربراہ تھے وہاں تو انھوں نے خود فیصلہ لیا اور اس کو نافذ کیا اور جہاں وہ سربراہ نہیں تھے اور مشورہ دینے کا حق رکھتے تھے اور رکن تھے، وہاں مشورہ کے ذریعہ انھوں نے مفید اقدامات کرائے، لوگوں سے کام لینے کو وہ شخصیت کی تشکیل کا اہم عنصر سمجھتے کہ ہر شخص میں کوئی صلاحیت ہوتی ہے جو دبی ہوتی ہے، اس کو ابھارنے کی ضرورت پڑتی ہے، مسلم پرسنل لاء بورڈ میں مختلف کمیٹیوں اور شعبوں کے قیام کے ذریعہ باصلاحیت افراد کو کام سپرد کر کے اور امارت شرعیہ میں کارگزار افراد کو ذمہ داریاں دے کر آگے بڑھانے کا موثر قدم اٹھایا اور ملت کی رہنمائی کیلئے اچھے افراد تیار کئے، بورڈ میں ایک سکریٹری کا اضافہ کرتے ہوئے مولانا خالد

سیف اللہ رحمانی کو ذمہ داری دی اور ایک کمیٹی کا کنوینر بھی بنایا اور امارت شرعیہ میں اپنے نائب کے طور پر مولانا ولی رحمانی صاحب کو مقرر کیا اور ناظم کی معاونت کیلئے نائب ناظم کے طور پر نوجوان افراد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں ذمہ داریاں دیں۔

اس کے علاوہ تعلیمی اور ملی کاموں کے لئے وہ اپنے زیر تربیت وارشاد افراد سے الگ الگ بھی کام لیتے تھے، ان کی رہنمائی میں ان کے صاحبزادہ عزیز گرامی مولانا عبدالواحد ندوی نے کئی کام اپنے ذمہ لئے ہیں، جن میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کا ادارہ بھی ہے پیام انسانیت کا مقامی کام بھی ہے۔ مولانا کا یہ بڑا امتیازی وصف تھا کہ وہ جن افراد کا انتخاب کرتے تھے تو پھر ان پر اعتماد بھی کرتے تھے اور ان کو کام کرنے کی آزادی دیتے تھے، اس طرح وہ افراد کی تربیت کا کام بھی کرتے تھے۔

دینی مقام:

اپنی علمی، فکری اور ادبی خدمات وکردار کے ساتھ بحیثیت امیر شریعت بہار واڑیسہ اعلیٰ دینی مقام پر فائز تھے، اس کے علاوہ تصوف وسلوک، تزکیہ اور احسان کی راہ سے بھی انھوں نے ترقی کی تھی اور اپنے زمانہ شباب سے ہی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سرپرستی میں اس کے نصاب پر عمل کیا تھا اور ان کی توجہ حاصل کی، حضرت کی وفات کے بعد بیعت کا باضابطہ تعلق کسی اور شیخ سے اگرچہ قائم نہیں کیا، لیکن حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے خلیفہ اجل مولانا شاہ عبدالرشید رانی ساگری اور فرزند جلیل حضرت مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانی کی صحبت وتوجہ حاصل کی اور ان کی صفات وخصوصیات سے فائدہ اٹھایا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کو شروع سے مناسبت تھی، لیکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ میں اشتراک عمل سے یہ مناسبت اور بڑھی اور دونوں میں اتحاد مذاق ومزاج محسوس کیا گیا، حضرت مولانا کی وفات کے بعد ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے ان

کا یہ تعلق اور گہرا ہوا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ان کے سلوک ومعرفت میں رسوخ کو دیکھتے اور مزاج و مذاق میں اتحاد و مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجازت وخلافت بھی دی تھی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے لے کر ان سبھی مشائخ کا انھیں جو اعتماد اور ان کی جانب سے جو عنایات حاصل رہیں بہت خاص ہی لوگوں کو اس کا علم ہوسکا، اخفائے حال اور سادگی کے ساتھ انھوں نے اپنے تمام دینی اور ملی کاموں کو انجام دیا اور بڑے منصبوں اور عہدوں پر ہونے کے باوجود ایک عام انسان کی طرح اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں رہے، اس کے ساتھ وہ ایک امین تھے اور امانت کی صحیح ادائیگی کا انہیں ہمیشہ برابر خیال رہا اور مالیات کو اپنی امارت میں اپنے پاس رکھا، جس کے استعمال میں انھیں ضرورت کا زیادہ خیال رہتا تھا اور وقت ضرورت پر اس کی وجہ سے اچھا تعاون دینے کی پوزیشن میں امارت رہتی تھی۔

مولانا نظام الدین صاحب جامع صفات شخصیت تھے، اعلیٰ انتظامی صلاحیت کے ساتھ صبر وتحمل، اخلاص وتواضع اور اپنے رفقاء اور معاونین کے ساتھ ہمدردی امتیازی وصف ہے اور ان کے ساتھ محبت وملطفت کا معاملہ کرنے میں ان کو بعض وقت سخت ناگواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ کبھی تلخ لہجہ مین نہ گفتگو کرتے اور نہ انتہائی اشتعال کے موقع پر مشتعل ہوتے، بلکہ ایسے موقعوں پر انتہائی تحمل کا مظاہرہ فرماتے تھے، اس لحاظ سے وہ مثالی اور اعلیٰ قائدانہ کردار کی حامل شخصیت تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو نعم البدل عطا فرمائے۔

اس ایک روزہ سیمینار میں ان کی تمام خوبیوں اور کاموں پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی، ان کی زندگی کے مختلف شعبوں پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک وسیع سیمینار کی ضرورت ہے، لیکن اس سلسلہ میں پہل کرنے میں ہم اس سیمینار کے منعقد کرنے والوں خصوصاً مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب اور مولانا شاہد الناصری صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس کی قبولیت کی دعا کرتے ہیں۔ والحمد لله اولاً و آخراً.

☆☆

مسلم اقلیت کے مسائل

1) آج سے تقریبا ایک سال پہلے بہار اقلیتی کمیشن نے سینٹرل فنڈ کے ذریعہ آدری ADRI (Asian Development Reserch Institutue) سے بہار کی اقلیتوں کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی صوررت حال کا جائزہ لینے کیلئے سروے کرایا تھا۔ یہ سروے رپورٹ تیار بھی ہوگئی، مگر جاری نہیں ہوسکی یہ سروے اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے اس لئے ہماری گزارش ہے کہ اسے جلد جاری کیا جائے اور اس کا جائزہ عمل درآمد کے لئے ایک کمیشن کی بحالی کی جائے۔

2) بہت سارے شعبوں میں وقت پر تنخواہ نہیں ملتی ہے، خاص کر اقلیتی اسکولوں اور مدرسوں کا برا حال ہے۔ وہاں کی تعلیم پر بھی توجہ دی جائے اور وقت پر تنخواہ بھی اور وہ جن سہولیات کے مستحق ہیں ان کو پورا کیا جائے۔ اقلیتوں کے تعلیمی ادارے، ٹیکنیکل سینٹر، پارا میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج کی منظوری میں بہت دشواریاں ہوتی ہیں اور ان کو آسان بنایا جائے۔ جیسا کہ بعض دوسری ریاستوں میں ہے۔ اردو اکادمی اور گورنمنٹ طبی کالج جیسے اداروں میں بہتری آنی چاہئے، اس کیلئے مناسب ہوگا کہ متعلقہ محکموں کے اعلیٰ افسران کی ایک میٹنگ آپ کی صدارت میں ہو، جس میں ان جیسے مسائل پر غور کر کے عملی اقدام کیلئے مقرر کیا جائے، جنرل ایجوکیشن، میڈیکل ایجوکیشن، ٹیکنیکل ایجوکیشن، مدرسہ ایجوکیشن اور سروسکشا ابھیان۔

3) سرکاری ملازمتوں میں اقلیتی طبقہ، خاص طور پر مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہ

تمام شعبوں میں ہے۔ چاہے پولیس کا محکمہ ہو یا دیگر، اس لئے ضروری ہے کہ سرکاری ملازمتوں کے لئے بحالی میں اقلیتی فرقہ کو ان کی آبادی کے تناسب سے جگہ دی جائے۔

4) اقلیت سے متعلق اداروں کو مستحکم کیا جائے، اوقاف کی زمینوں اور قبرستانوں سے ناجائز قبضے ہٹائے جائیں اور قبرستانوں کی گھیرابندی کی جائے۔ سرکاری افسران اس معاملے میں سیکولر ذہن کے ساتھ کام کریں تاکہ ظلم و ناانصافی کا خاتمہ ہو۔

5) بہار میں ہینڈلوم کافی ترقی پر تھا، مگر گزشتہ برسوں میں، اس میں کافی گراوٹ آئی ہے اور اکثر ہینڈلوم بند ہو گئے۔ کاریگر و بُنکر فاقہ کشی کے شکار ہو رہے ہیں اس لئے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، بُنکروں کی حالت بہتر بنائی جائے۔

6) ایک مسئلہ اور بھی اہم ہے۔ بہار میں انتہا پسندوں کے ہاتھوں جن لوگوں کا قتل ہوا ہے، گھروں سے اور اپنی زمینوں سے بے دخل کئے گئے، ان کو معاوضہ نہیں ملا، تحقیقات کر کے ان کو معاوضہ دیا جائے۔ اسی طرح بھاگل پور فساد کے متاثرین اور مارے جانے والوں کے ورثاء کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کو معاوضہ نہیں ملا ہے، ان سب کو 1984ء ایکٹ کے مطابق معاوضہ دیا جائے اور اس کے لئے ایک کمشنر رینک کا افسر مقرر کیا جائے۔

7) ہمارا ملک مذہبی ہے، اس کی عبادت گاہوں کے معاملے میں عوام کے جذبات بہت حساس ہیں۔ دانا پور آرمی کینٹ میں ایک قدیم مسجد تھی جس کی چھت گر گئی تھی۔ اس کی آواز پارلیمنٹ میں بھی اٹھی اور مسجد کو اصلی حالت میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چند دنوں پہلے فوجیوں نے مسجد کی دیوار کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا، جو ایک اشتعال انگیز کارروائی ہے آپ اس میں مداخلت کریں، نیز بہت سے دوسرے فرقوں کی عبادت گاہیں ہیں ویسے اس مسجد کو بھی بنا دیا جائے، اگر حکومت اپنے خرچ سے نہ بنا سکے تو مقامی مسلمانوں کو اس کی تعمیر کی اجازت دی جائے۔ اس میں سرکار کی نیک نامی اور

انصاف ہے۔

8) حج ہاؤس بہار سرکار کا ایک بڑا کارنامہ ہے مگر اس کی تعمیر نامکمل ہے۔ رقم موجود ہے اسے اس سال مکمل کیا جائے اور حج کمیٹی کو کام کرنے کا آرڈر دیا جائے۔ حج کا موسم قریب آرہا ہے۔ یہ چند باتیں جو اس وقت ذہن میں تھیں اس کو عرض کر دیا ہے۔

امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ بہت قدیم مذہبی، سماجی اور فلاحی ادارے ہیں، جس کا کام مسلمانوں کی صحیح رہنمائی، عوام کی فلاح، انسانیت کی خدمت اور ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اس کی ترقی اور استحکام کی جدوجہد ہے اس ادارہ میں صدر جمہوریہ بھی تشریف لا چکے ہیں۔ ہم چاہیں گے کہ آپ بھی کبھی تشریف لا کر ہمارے کاموں کو دیکھیں اور مفید مشورہ دیں، ہمیں بے انتہا خوشی ہوگی۔

نظام الدین

امیر شریعت امارت شرعیہ

بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ

☆☆

مولانا سید رابع حسنی ندوی کا خط

محترم و معظم جناب مولانا سید نظام الدین صاحب زید مجدہم

جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ مجھے محبین کا ایک عرصہ سے مشورہ تھا کہ موتیا کا آپریشن کرالوں۔ چنانچہ بیرونی سفر سے واپسی پر بمبئی میں آپریشن کرالیا جو احتیاطیں بتائی گئی ہیں ان کے تحت میں رخصت پر ہوں، رائے بریلی چلا گیا تھا، رات واپسی ہوئی، آج کے جلسے میں شرکت سے احتیاط کی خلاف ورزی ہوسکتی ہے، اس لئے جلسہ میں حاضر نہیں ہورہا ہوں، جس کی معذرت پیش ہے اور میری عدم شرکت سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا، بڑے بڑے اہل بصیرت کی موجودگی میں میری شرکت کوئی اضافہ نہیں بنتی، البتہ میرے درسگاہ میں جلسہ منعقد ہورہا ہے۔ میزبانی کا شرف مجھے ملتا جو شاید اب بالواسطہ ملے گا۔ میرے احباب و معاونین معہ بزرگ سرپرست کے وہاں تشریف رکھتے ہیں اور آپ کا تعلق بھی ایسا ہی ہے کہ آپ اس کی بنا پر میزبان بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں شام ملاقات کے لئے حاضر ہوجاؤں۔

ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ مسائل تو متعدد ہیں، جن میں خاص طور پر بابری مسجد کا مسئلہ بھی ہے، میں گزارش کروں گا کہ اس کے سلسلے میں کوئی ایسی قرارداد نہ ہو تو اچھا ہوتا، جو مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسے جامع، متوازن اور مؤقر ادارہ کے شایان شان نہ ہو، مسلم پرسنل لاء بورڈ، پارٹی، پالیٹکس کی مصلحتوں اور گرماگرمی اور عاجلانہ قراردادوں کے طرز عمل سے بلند

ہے۔ بابری مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کا اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کا جو موقف ہے اس سے بالکل ہٹنا نہیں ہے، البتہ اپنے موقف پر قائم رہنے کا اظہار کرتے ہوئے ممکن العمل اور سود مند اور سنجیدہ انداز کا ہی فیصلہ کرنا چاہئے، میں نے یہ بات اس لئے عرض کی کہ مشورہ میں گرم مزاج اور حربی سیاست اور محدود مصلحت بینی کا مزاج رکھنے والے حضرات بھی شریک ہوں گے، اللہ تعالی نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کو ملک میں جو وقار عطا کیا ہے اس کی حفاظت کی برابر ضرورت ہے۔

اس وقت ملک عجیب حالات میں ہے، کسی بات میں استقرار نہیں ہے، نہ حکومت وقت کے ارادوں اور فیصلوں میں نہ اس کے پیدا کئے ہوئے حالات میں، اس لئے کل کے متعلق آج جو فیصلے کئے جائیں وہ اس کے پیش نظر رکھ کر کئے جائیں کہ یہ ضروری نہیں کہ جو ہورہا ہے اور نظر آرہا ہے وہی قائم رہے گا۔ بین الاقوامی صحافت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے حالات اس وقت کسی کے قبضہ میں نہیں ہیں، اور باہر کے اثر ونفوذ سے باہر بھی نہیں ہیں۔ الحمدللہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رجحانات وفیصلوں کو ملک میں اہمیت سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ اس کے توازن، محدود مصلحتوں سے بلندی اور ٹھوس غور وفیصلے کا ربند ہونے کی وجہ سے ہے۔ میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، میں نے اپنی شرکت کا بدل اس اظہار کو بنایا ہے، جس کو امید ہے کہ آپ ناپسند نہیں کریں گے۔ آپ سے مجھے خصوصی تعلق ومحبت ہے اور آپ کا میرے دل میں ایک خاص جذبہ احترام ہے۔ دعاء کی درخواست ہے۔

والسلام

مخلص

محمد رابع حسنی ندویؒ

20/ستمبر 1998ء

☆☆

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کی تاریخ اور
کارکردگی کے چند نمایاں پہلو

الحمد لله وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ. وبعد

حضرات گرامی قدر! اس عظیم نمائندہ اجتماع کے لئے جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور مؤقر تنظیموں کے علماء وفضلاء اور ملک کے تمام دانشور جمع ہیں صدارت کسی ایسی بڑی اور نمایاں شخصیت کے سپرد ہونی چاہئے تھی جو اس عظیم اجتماع کے شایان شان اور اس کے لئے مزید عظمتوں کا باعث ہوتی۔ اس کے برخلاف ایک ایسے شخص کے سپرد کردی گئی ہے جو جسم وروح ظاہر وباطن دونوں کے لحاظ سے کمزور اور قلیل البضاعت ہے اور جتنی بضاعت ہے وہ مزجات ہے۔

دراں حالانکہ اس مؤقر مجمع میں ایسے اکابر علم وفضل موجود ہیں جو **بسطةً فی العلم والجسم** دونوں لحاظ سے اس ذمہ دارانہ منصب کے مستحق اور ملک وقوم پر اثر انداز ہونے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

اس صورت میں مجھ جیسے طالب علم کے لئے اس بڑی ذمہ سے بہ ادب معذرت کردینے کا موقع تھا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقویا کے مقابلے میں اس درجہ کا کمزور ہونا بھی بہرحال ایک امتیاز ہے اور بڑے کمال کے مقابلہ میں بڑا نقصان بھی کمال ہی سے نسبت رکھتا ہے، جو درحقیقت اس کمال کے نمایاں اور واضح کردینے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

وبضدها تتبین الاشیاء

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

ضد ہی سے اشیاء کی تبیین ہوتی ہے۔ اضداد نہ ہوں تو کمالات کی بہت سی قوتیں چھپی کی چھپی رہ جاتی ہیں۔ اگر ظلمت نہ ہو تو نور کے پہلو نہیں کھل سکتے۔ اگر رات نہ ہو تو دن کی قدر قیمت نہیں معلوم ہوسکتی اگر جہل نہ ہو تو علم کی عظمت نمایاں نہیں ہوسکتی، اگر ضعف نہ ہو تو قوت کی قدریں نامعلوم رہ جائیں۔ اگر ناقصین نہ ہوں تو کاملین کے کمالات کے پہلو سامنے نہیں آسکتے۔

اس حقیقت کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس ضعیف ونا کارہ کا انتخاب بہت ہی موزوں ومناسب ہوا اور جیسے انتخاب شدہ کو یہ بلا چوں وچرا قبول کرلینا چاہئے تھا اسی طرح انتخاب فرمانے والے بزرگ بھی میرے ہی نہیں بلکہ پورے اجتماع کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حقیقت شناسی کا پورا ثبوت دیا ہے۔

لیکن اس شکریہ سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ہم سب کو اس خداوند بزرگ وبرتر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جس کی عطا کردہ توفیق سے ہم سب یہاں ایک جگہ جمع ہیں اور کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے ہیں۔ نہ صرف ہمارے اجسام ہی ایک دوسرے سے قریب ہوگئے ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دل بھی ایک دوسرے سے قریب اور اخوت اسلامیہ کے جذبہ کے تحت قریب سے قریب تر ہوجانے کے آرزومند ہیں۔

بزرگان محترم! ہمیں ملانے والی چیز صرف اللہ کا نام اور اس کا مستند کلام ہے اور ہمارے دین کی واحد اساس کلمہ طیبہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ہی ہمیشہ کی طرح آج بھی ہمارے اس ملی اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ ہم اللہ کے نام سے زندگی حاصل کرتے ہیں اور اسی کے کلام کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتے ہیں، اور اللہ کے سچے رسول خاتم النبین حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات کو کمالات خداوندی کا نمونہ اور اپنی دنیا وآخرت کا کامل ومکمل رہنما اور مربی یقین کرتے ہوئے انہی اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اپنی زندگی کا آخری مقصد سمجھتے ہیں۔

اسی پاک اسوہ سے ہمارے زندگی بنی ہے اور اسی سے آئندہ بنے گی اور اسی پر خاتمہ سے ہماری آخرت کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔

امام مالک کا ارشاد ہے:

لایصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها یعنی اس امت کا آخری حصہ بھی اسی سے صلاح وفلاح پا سکتا ہے جس سے امت کے اول حصہ نے صلاح وفلاح پائی۔

یہی وہ روشنی اور رہنمائی ہے جس نے صدیوں کے خلاء کو پر کر کے ہمیں ایمانی عزیمت عطاء کی ہے اور ہم لوگوں کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھے، آج کے دن ایک جسم واحد کی طرح ایک جگہ جمع کر دیا اور ایک بار پھر اپنی شریعت اور اس کے مسائل کی حفاظت کے لئے اس مقام پر کھڑے ہونے کی ہمت بخشی۔

بلاشبہ جس طرح آج کا یہ اجتماع عظیم ہے اس طرح یہ دن بھی ایک عظیم بلکہ عظیم تر دن ہے جس میں بظاہر ایک ناممکن سی بات نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بن کر سامنے آگئی ہے۔ اور **واعتصموا بحبل لله جمیعاً ولا تفرقوا** کا پاکیزہ منظر آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔

حضرات گرامی! ہر دور میں تاریخ کا ظہور کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے لیکن اس دور کا تاریخی ظہور یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے مختلف مکاتب فکر کے علماء دانشور اور رہنما وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک نقطہ وحدت پر جمع ہیں۔ اس کی روشنی میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق توحید ورسالت اور جذبہ وحدت کی جو امانت امت کو سپرد کی گئی تھی ہم اس کی حفاظت کے فریضہ کو فرض کی طرح ادا کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ بلاشبہ یہ امانت ہمیں جان و مال اور آبرو سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنے جانوں سے دستبردار ہو سکتے ہیں مگر اس ازلی اور ابدی امانت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

بزرگان محترم! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ اسلام عام مذاہب کی طرح کوئی خاندانی، وطنی یا قومی قسم کی روایات کا مذہب نہیں ہے بلکہ روایت ودرایت کے لحاظ سے اس

کی ہمہ گیر فطرت کی خود اپنی ہی ایک مستقل اور امتیازی شان ہے۔ مذاہب کی دنیا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اور مذاہب کی مثال ایک ایسی مملکت کی سی ہے جس کی سرحدیں نہیں، اگر ہیں تو وقت کی دھارے سے ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسی مملکت ہے کہ جس کی سرحدیں اٹل ہیں اور وہ سرحدیں خداوندی دستور سے بنی ہوئی ہیں، جو قلعہ بند شہر پناہ کی مانند ہیں۔ زمانہ کی کسی ضرب سے نہ وہ ٹوٹ سکتی ہیں اور نہ ہل سکتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان سرحدوں سے باہر نکل جائیں مگر یہ ان کی تعدی ہوگی، حدود اپنی ہی جگہ اٹل رہیں گی۔

تلک حدود الله فلا تعتدوها ومن يتعد حدود الله فأولئك هم الظالمون

اسلام کا قالب جن قانونی دستاویزوں اور فطری اصولوں سے مشیت خداوندی نے تیار کیا ہے ان میں تمام ہنگامی اور دوامی اصلاحات اور ان کے اصول وقوانین جمع کر کے ان میں سے ان تمام سماجی برائیوں کو نکال دیا ہے جن کا نام جاہلیت تھا۔ اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کے معنی اسی جاہلیت کو دوبارہ لے آنے کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے، جس سے مالک مطلق نے انسانیت کو پاک کر کے درجہ کمال پر پہنچایا تھا۔

آج پرسنل لا کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح وترمیم پیش کیا جارہا ہے۔ کیا حقیقتاً یہ اصلاح اور کوئی اصلاحی تحریک ہے؟ یہ اصلاح اسی قسم کی ہے، جسے قرن اول کے منافقین انما نحن مصلحون کے نعرے کے ساتھ لے کر کھڑے ہوئے تھے، لیکن عالم الغیب والشہادہ نے کھلا اعلان فرمادیا تھا **الا انهم هم المفسدون ولكن لا يعلمون**

ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے۔ بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے، صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے، جو ہندوکوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے، سو یہ آپ کی سیاست ہے،

آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔

ہندوستان کا دستور، مذہب اور سیاست کو الگ الگ قرار دیتا ہے تو آپ ہمارے مذہب کے معاملے میں اپنی سیاست ملا کر حکومت اور عوام کو ناراض کرنے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟ آپ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ریفارمس چاہتی ہے اور ہم مصلح ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ملک میں سماجی برائیوں، اخلاقی گراوٹوں اور غلاظتوں کے جوڈھیر لگے ہوئے ہیں، حکومت کے قانون، حکام کی طاقت اور نام نہاد مصلحین کی اصلاحی مہم کا رخ اس طرف کیوں نہیں؟

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کا کتنا دیوث ہے، جو لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل ودیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے اور اس غلاظت پر ان مظلوم قسمت کی ماری بازار گنہگار عورتوں پر کتنے مرد ظلم توڑتے ہیں، نہ کوئی پابندی عائد کرتا ہے اور نہ کوئی دار وگیر کا روادار ہے، سماج نے گناہوں کے بازار لگا رکھے ہیں۔ آج بھی اس ملک میں ایسے فرقے ہیں جو اسی اسی بیویاں رکھتے ہیں اور سماج ان کے بارے میں چوں تک نہیں کرتا۔ بقول بابو ابھے چندرا اور بابو گریندر ناتھ دت

’اس ملک میں ایسے کامن برہمن بھی ہیں جن کی پچاس پچاس اور سو سو بیویاں ہیں، ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک نوٹ رہتی ہے جس میں وہ اپنی بیویوں کے نام مع ولدیت اور گاؤں کا نام لکھ لیتے ہیں اور (پھر بھی) انہیں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جسے وہ ایک اجنبی سمجھ کر ملتے ہیں وہ ان کی بیوی یا لڑکا ہوتا ہے۔‘ (پروفیسر کے ایم کپڑیا کی تصنیف ’میرا اینڈ فیملی ان انڈیا‘ ص 15 بحوالہ اخبار عزائم لکھنؤ 14 نومبر 1972)

لیکن اسلام نے سماج کے اس وحشی دستور کے خلاف سوسو بیویاں رکھنے کے قانون کو محدود کرکے اگر چار کی گنجائش دی اور وہ بھی کڑی شرائط کے ساتھ اور اسی بے قید غلاظت

سے سماج کو پاک رکھنے کے لئے تو مصلحین کی ٹولیاں قانون کے پشتارے لے کر دوڑ پڑیں، جس ملک میں راتوں کے کلب ہوں، مادر وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عصمت وعفت کا لباس رات بھر اتار کر تار تار کیا جا رہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو، ایسے ملک کے چند ایسے سرپھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لا کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود تو شرمانا چاہئے تھا جنہیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی بھی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کی فطری اور اعلیٰ وارفع قانون عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی؟ بے شمار بچوں کی تعداد پر تو پابندیاں عائد کی جائیں مگر بے شمار غلیظ گناہوں پر پابندیاں عائد کرنے کا کوئی جذبہ نہ ابھرے، خواہ وہ کتنی ہی تعداد میں ہوں، کہیں بھی ہوں اور کتنے ہی شرمناک انداز میں ہوں۔

برائیوں کے بازار کھلے ہوئے ہیں، جن میں ہر برائی اور ہر اخلاقی گندگی بکری کے مال کی طرح بکتی ہے۔ تباہ حال اچھوتوں کا کیا حال ہے، غریب ہندو عورتوں کا کیا حال اور مآل ہے، جوان نسل کے لڑکے اور لڑکیاں کن کن سماجی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، جھوپڑیوں میں عورتوں کی عزت عصمت کیسے درناک حالات سے دوچار ہیں، وہاں کوئی مصلح، کوئی لیڈر اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھنے کی تکلیف گوارہ فرما کر نہیں پہنچتا اگر وہ اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھیں تو میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سب اسی وقت ان مصلحین کے پروگراموں کا آخر تک ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔

شاید ان ہی غلاظتوں کی پردہ پوشی کے لئے پرسنل لا کے چند مسائل کو ہدف بنا کر ان میں ترمیمات اور اصلاحات کے نعرے لگائے جا رہے ہیں، یا ممکن ہے کہ اقلیتوں کو جذباتی ہیجان میں مبتلا رکھنے کی یہ کوئی تدبیر ہو۔ بہرحال نعرہ زنوں کا اندازہ قد ہر لباس میں عریاں ہے۔ خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں، یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا، لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد، دین خداوندی میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ بزعم خود کو کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا

ہے، تو میں اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشوران محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدہ پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ برتر نے اپنے نظام خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے، جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ لاتبدیل لخلق اللہ۔ اسی طرح اس نے اپنے نظام امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی اسی فطرت کے اساس پر قائم کیا ہے، اس لئے اس میں بھی تبدیلی ممکن نہیں، **لاتبدیل لکلمات اللہ.**

یہ قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب ونجوم کو نہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات وجزئیات، احکام وآداب، اخلاق وعقائد، معاملات ومعاشرات اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا، وہ صرف فائدہ اٹھانے کیلئے اتارے گئے ہیں، بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے، بدلنے کی جب بھی سعیٔ لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی ہی جگہ قائم رہیں گی، لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہوجائے گا۔ جس کی وجہ یہ کہ جس طرح خدا کی اس کائنات کا نظام خلق نہایت ہی مرتب اور فطرت کے اصول میں بندھا ہوا ہے، جس کا کوئی ایک جز، بھی عرش سے فرش تک اور ثریا سے ثریٰ تک بے جوڑ نہیں، اسی طرح اسی خدائے برتر وتوانا کا نظام امر یعنی شریعت بھی غیر مرتب یا بے جوڑ نہیں، بلکہ اس کا بھی ایک جزء اپنی ہی فطری اصولوں سے بندھا ہوا، اپنی فطری تنظیم سے وابستہ ہے، اور ایک ہی فطرت الٰہی ہے جو ان دونوں نظاموں کو تھامے ہوئے ہے، جو فطرت اس کے کام میں کار فرما ہے، وہی اس کے کلام میں بھی کارفرما ہے۔

الا له الخلق والأمر فتبارک الله رب العٰلمين

جس طرح اس نظام خلق یہ اربوں، کھربوں انفرادی جزئیات، حیوانات کی ہوں یا نباتات کی، جمادات کی ہوں یا مجردات کی، اپنی اپنی انواع سے جڑی ہوئی ہیں، جیسے

حیوانات میں مثلاً شیر، بکری، اونٹ، گھوڑا اور گدھا وغیرہ حیوان کی جنس سے وابستہ ہیں، نباتات کے بے شمار افراد، درخت گھاس، جھاڑ، بیل وغیرہ اپنی اپنی انواع سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور جمادات کے ان گنت افراد اینٹ، پتھر، ریت چونا سیمنٹ، لوہا، سونا، چاندی، پہاڑ اور دریا وغیرہ اپنی اپنی جمادی انواع سے وابستہ ہیں، اسی طرح یہ ساری انواع، حیوان ونباتات وجماد مل کر ایک اوپر کی کلی جنس کے نیچے جمع ہوجاتی ہیں، جس کا نام جسم ہے، کہ یہ ساری کی ساری نوعیں مجسمانی ہیں۔ پھر جسم کے دوش بدوش کچھ غیر جسمانی یا بے حد لطیف الاجسام مفردات کی لطیف انواع ہیں، جو اپنی لطافت کے سبب ان نگاہوں سے دیکھی نہیں جاسکتیں، جیسے ارواح، ملائکہ جنات وغیرہ یہ سب مل کر ایک نہایت ہی وسیع اور عام تر جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نما جوہر ہے، جو بلا کسی غیر کے سہارے خود سے قائم ہیں۔ پھر جوہر کے دوش بدوش کچھ غیر جوہری اشیاء بھی ہیں جو خود سے قائم نہیں ہیں بلکہ دوسرے کے سہارے قائم ہیں۔ جیسے ان جنسوں کے افعال وخواص رنگ وبو، کیف وکم اور مقدار وغیرہ۔ پھر یہ سب جوہری نوع عرضی موجودات مل کر ایک نہایت ہی وسیع حاوی اور محیط کائنات جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نام وجود ہے کہ ان کائناتوں میں اس سے بڑا احاطہ کسی کلی کا نہیں جو ساری موجودات کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ وجود عین ذات حق سے (جل ذکرہ) اس کی ذات وجود الگ الگ نہیں ہیں کہ وجود کا اس سے جدا ہوجانا ممکن ہو، اس لئے یہ ساری کائناتیں وجود کے واسطہ سے اس وجود مطلق اور موجود اصلی سے وابستہ ہوجاتی ہیں، جس سے ان سب کا ایک ہی سرچشمہ ثابت ہوتا ہے اور اسی پر ان کائناتوں کے وجود کی انتہا ہوجاتی ہے، جسے قرآن حکیم نے دو لفظوں میں کھول دیا ہے 'وان الیٰ ربک المنتهیٰ' یعنی بلاشبہ تیرا رب ہی منتہی ہے۔ جس پر ہر موجود کی انتہاء ہوئی ہے کہیں فرمایا 'وان الیٰ ربک الرجعی' (اور بلاشبہ تیرے ہی پروردگار کی طرف ہر چیز کا رجوع ہے) کہ وہ اسے چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں جاسکتی، لیکن ساتھ ہی ان موجودات پر

کائناتوں کی انتہا نہیں ہوجاتی، بلکہ موجودات سے کہیں زیادہ ان گنت معدومات بھی ہیں، جنہوں نے ابھی تک وجود کا جامہ نہیں پہنا، مگر ان کا موجود ہونا ممکن ہے اور وہ کائنات خلق میں شامل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یہ ساری موجودات و معدومات مل کر ایک اور انتہائی حاوی شامل اور محیط الکل کلی کے نیچے آئی ہوئی ہیں، اس جنس کا کلی نام علم خداوندی ہے، جو موجود معدوم سب پر حاوی ہے، پس موجودات عینی شکلوں میں موجود و معدومات علمی صورتوں میں علم الٰہی میں سمائی ہوئی ہیں۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان دو کلموں میں ارشاد فرمایا، ’**واحاط بکل شی علماً**‘ (اور اللہ جل ذکرہ ہر چیز پر خواہ وہ موجود ہوچکی ہو یا نہ ہوئی ہو) اپنے علم سے محیط ہے۔ بہرحال اس مرتب نظام کائنات کی کائناتوں سے جس کی انتہا علم الٰہی پر ہے، ہم فائدہ تو ضرور اٹھا سکتے ہیں اور ضرور اٹھانا چاہئے، جب کہ یہ ہمارے لئے بنائی گئی، اور مسخر کی گئی ہیں، لیکن انہیں بدل ڈالنے کا تصور جنون اور حماقت سے کم نہیں جب کہ فطرت علمی ہو یا عملی نہ بدلنے کی چیز نہ بدلی جاسکتی ہے۔ ’**لاتبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم والکن أکثر الناس لا یعلمون**‘ (اللہ کی خلقت میں تبدیلی نا ممکن ہے یہی اس کا طریقہ اور مستحکم دین ہے لیکن انسانوں کی اکثریت جہالت میں پھنسی ہوئی ہے) ٹھیک اسی فطرت پر خدا کا نظام امر بھی ایک عجیب حکیمانہ ترکیب اور تنظیم کے ساتھ قائم ہے، جس میں مسائل جزئیہ کے افراد بھی ہیں، اور ان پر کلی انواع بھی، پھر انواع کے اوپر اجناس اور اجناس پر جنس الاجناس کا احاطہ بھی، جس سے دینی مسائل کی کثرتیں سمٹ کر وحدتوں کی طرف اور وحدتیں سمٹ کر وحدت الواحدات کی طرف رجوع کئے ہوئے ہیں۔ اور دین مثل حسی کائنات کے ایک نہایت ہی منظم اور مرتب روحانی کائنات کی شکل میں جلوہ گر ہے۔

دین کے لاکھوں افراد مسائل کو ان کی انواع سمیٹے ہوئے ہیں۔ مثلاً نماز ایک نوع ہے، جس کے ہزاروں مسائل ہیں اور ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، حج ایک نوع ہے

جس کے ہزاروں مسائل ہیں، جن پر سینکڑوں تصنیفیں ہیں۔ مالیات و نفقات ایک نوع ہے جس کے نیچے ہزارہا جزئی مسائل ہیں اور ان پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، زکوٰۃ، صدقات، خیرات اور ہدایا، قرض و امانت وغیرہ مستقل نوعیں ہیں جن کے نیچے ہزاروں مسائل آئے ہوئے ہیں، تدبیر منزل ایک مستقل نوع ہے، جس کے نیچے ولادت، رضاعت، تربیت اور روابط و علائق کے ہزارہا مسائل ہیں۔ نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کی انواع ہیں، جن کے نیچے طلاق نکاح وغیرہ کے ہزاروں مسائل ہیں۔ پھر انتظام مملکت اور تعزیرات ایک نوع ہے، جس کے نیچے ہزاروں سیاسی اور اجتماعی مسائل آئے ہوئے ہیں۔ پھر بین الاقوامی معاملات کے لئے خلافت ایک مستقل نوع ہے، جس کے نیچے ہزاروں مسائل ہیں اور جن پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور پھر ان تمام انواع کے اوپر اجناس ہیں اور اجناس کو پھر ایک جنس کلی نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

بہرحال دینی انواع نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، مہر، خلع، ولادت، رضاعت، تربیت، لین دین، بیع و شراء، وقف و ہبہ، قرض، امانت، اجارہ، حدود، قصاص، کفارات وغیرہ وغیرہ کے لاکھوں جزئیات مسائل اور ان کی بے شمار عملی صورتیں اور نمونے ہیں، جن سے دینی کتابیں اور کتابوں سے دنیا کے لاکھوں کتب خانے بھرے ہوئے ہیں، جن سے امت کی خصوصیت ہی کثرت تصنیف قرار پاگئی ہے، جیسا کہ بعض علماء امت نے دعویٰ کیا ہے۔

پھر ان انواع کے اوپر اجناس کلیہ ہیں، جن کے نیچے یہ تمام نوعیں آئی ہوئی ہیں، جیسے اخلاق، اعتقادات، عبادات، منزلیات، معاملات، معاشرات، مدنیات، اجتماعیات اور آفاقیات وغیرہ، پھر ان ساری مصالح کلیہ کا تعلق صفات خداوندی سے ہے، جن کے تقاضوں سے یہ علل و اسرار اور ان سے یہ احکام نمایاں ہوئے، اور پھر ان تمام صفات الٰہی کا تعلق ایک ہی کلی الکلیات علم الٰہی ہے، جس کے واسطہ سے یہ سرا نظام ذات بابرکات الٰہی

سے جڑتا جاتا ہے اور خلق وامر کی ساری کثرتیں سمٹ کر ایک ہی ذات واحد پر جا کر منتہی ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح خلق وامر دونوں میں توحید الٰہی کا عقیدہ فطری طور پر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے، جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا موضوع بعثت ہے۔ **کان دین الانبیاء لاالٰہ الا اللہ**۔ (سارے انبیاء کا دین لا الٰہ الا اللہ ہی رہا ہے۔)

اس لئے اسلام نے توحید کو محض شرعیات ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عالم خلق میں بھی ایک ایک فعل، ایک ایک قول اور ایک ایک نیت اور ایک ایک ظاہری ہیئت تک وسیع کر کے توحید عملی کا مستقل نظام قائم کیا ہے، تاکہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر اور اس کی ایک ایک نقل وحرکت پر بندہ اپنے خدائے واحد کی طرف رجوع رکھے اور شرک کی آلائشوں سے ملوث نہ ہو۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ جیسے کائنات خلق کے اس فطری نظام میں، دخل اندازی انسانیت کی تباہی ہے اور جس طرح کائنات خلق اور اس کی اشیاء میں ترمیم وتنسیخ کا تصور یا عمل شرک اور خلاف توحید ہے، اسی طرح اس کائنات روحانی اور اس کے کسی جزوی مسئلہ میں بھی انسانی ترمیم وتبدیلی ایک کھلا شرک ہے جسے مٹانے کے لئے انبیاء معصومین مبعوث ہوئے۔

اس لئے جیسے کائنات خلق سے فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں، اسے بدل نہیں سکتے۔ اسی طرح کائنات امر یعنی شرائع سے بھی فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں اور اٹھانا چاہئے، اسے بدل نہیں سکتے۔ اگر کسی ایک جز میں تغیر وتبدل کا تصور باندھا جائے گا۔ تو یہ جزوی ترمیم نہ ہوگی، جس کا ایک چھوٹا سا جزو یہ ہے، بلکہ شریعت کے نظام عمومی کا رشتہ، جب کہ ساری انواع وجزئیات میں پرویا ہوا ہے، تو جس دانہ کو بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے گا، تو صرف وہ جزئی خرابی نہ ہوگی، بلکہ پوری مالا اور ہار کی بدزیبی اور بدنمائی ہوگی، جس سے ہار کی اصلی حسین شکل وصورت باقی نہیں رہ سکتی اسی درجہ میں روحانیت کی تباہی سامنے آجائے گی، جس کی صلاح وفلاح کے لئے یہ دین اتارا گیا ہے، بلکہ ان اصول وکلیات اور ان کے

واسطہ سے صفات الٰہی اور ان کے توسط سے علم الٰہی میں تغیر وتبدل کر ڈالنے کے ناپاک عمل کے مرادف ہوگا، جو ناممکن ہونے کے علاوہ انتہائی خباثت اور خیانت ہوگی، کہ آدمی بندگی کی حدود سے نکل کر خدائی حدود میں مداخلت کرنے کی شرارت کا مرتکب ہو۔ جب کہ پورے نظام دین ودیانت کا خاکہ، بحیثیت مجموعی ایک متصل واحد شیء ہے۔ اس کے کسی جزو کو چھیڑنا پورے نظام کو چھیڑنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک حوض کے متصل واحد پانی کی سطح پر اگر ایک سمت میں بھی، ایک ڈھیلا پھینک کر، اسے ہلا دیا جائے تو تو ناممکن ہے کہ یہ ایک سمت کی حرکت لہر بن کر درجہ بدرجہ دوسری طرف نہ پہنچے، اسی طرح یہ تمام اسلامی شعبے اپنے اپنے اصول وکلیات کے تحت، اور پھر یہ تمام اصول کلیات اپنے باہمی ربط سے جڑ کر، ایک کلی الکلیات کے تحت، باہم ایک دوسرے سے، اس طرح جڑے ہوئے اور گتھے ہوئے اور متصل واحد ہیں، کہ دین کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کے حقیر سے حقیر تغیر کا اثر بھی پورے نظام کے ڈھانچہ پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین خدائی آئین وقوانین کے مجموعے کا نام ہے جو بندوں کی ہدایت ورہنمائی اور ان کی دنیا اور آخرت کی صلاح وفلاح کے لئے، بتوسط انبیاء معصومین بھیجا جاتا ہے۔ اسلام اسی دین کا اور آخری مکمل نقشہ یا بعنوان ودیگر تمام زندگی کے ہر ہر گوشے کے لئے دستور فکر وعمل بنا کر اتارا گیا ہے، جس میں جزئی احکام بھی ہیں اور اصول کلیات بھی، علل احکام بھی ہیں اور مصالح واسرار احکام بھی، ہر حکم کسی نہ کسی علت پر مبنی، اور ہر علت کسی نہ کسی حکمت پر مشتمل، ہر جزئی کسی نہ کسی فطری کلی کے نیچے آئی ہوئی ہے، اور ہر کلی اپنے وسیع دامن میں ہزار ہا فطری جزئیات کا ذخیرہ لئے ہوئے، اس لئے دین ایک منظم اور منضبط ضابطۂ حیات کی صورت سے ہے، جس کی تمام جزئیات کلیات کی طرف سمٹتی گئی ہیں، اور کلیات، جزئیات کی طرف پھیلتی گئی ہیں، اور آخر کار یہ ساری کلیات، اپنی جزئیات سمیت، ایک ہی کلی الکلیات یعنی 'علم الٰہی' سے وابستہ ہوگئی ہے۔

یہ منظّم اور ظاہر و باطن کی اصلاح کا مکمل الٰہی قانون، جس کا اہم ترین جز 'پرسنل لا' بھی ہے۔ جو چار حجتوں پر قائم ہے۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) سنت رسول اللہ (حدیث محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم) اجماع و قیاس، جو اجتہاد کے دائرے کی چیز ہے جس کا اصطلاحی نام 'فقہ' ہے۔

قرآن تشریعی اصل ہے، جس سے شریعت بنتی ہے۔ حدیث تشریحی اصل ہے، جس سے شریعت کھلتی ہے۔ فقہ تفریعی اصل ہے، جس سے شریعت پھیلتی اور منضبط ہو کر آئین کی صورت اختیار کرتی ہے۔ پس جس طرح ہر مسلم فرقہ کے ہاتھ میں کتاب و سنت ہے، اسی طرح کوئی فرقہ اجتہاد سے بھی خالی نہیں، کہ نئے حوادث سب کے لئے ہیں اور ان کے پیش آنے پر سب ہی اپنے اپنے اصول تفقہ سے مسائل کا استخراج اور استنباط ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے فقہ ہر ایک کا الگ الگ اور اصول فقہ جدا جدا۔ بناء بریں کسی بھی فرقہ کے لئے ان چار حجتوں سے چارۂ کار نہیں، البتہ ان چار حجتوں میں سے پہلی دو اصلیں یعنی کتاب وسنت 'وحی الٰہی' جو بواسطۂ ملک یا بکلام خداوندی قلب نبوت پر اترتی ہیں اور دوسری دو اجتہادی اصلیں یعنی اجماع و قیاس 'القاء ربانی' جو کتاب و سنت کے علم راسخ، عقل صافی اور تقویٰ شعار ذوق و وجدان پر وارد ہوتی ہیں، اس لئے اسلام میں ایک شرائع اصلیہ ہیں، جو پہلی دو اصلوں سے متعلق ہیں۔ اور شرائع فرعیہ ہیں، جو دوسری دو اصلوں سے وابستہ ہیں، مگر وہ پہلی ہی دو اصلوں سے ملحق اور ان ہی پر متفرع ہیں۔

اندریں صورت ان چار اصولوں میں سے کسی ایک کو بھی غیر شریعت کہنے کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔ اور جو حصہ اجتہادی فرعیات کا ہے، خواہ وہ کسی بھی فرقہ کا ہو، وہ جب کہ اس کے علم و یقین کے مطابق، کسی نہ کسی قرآنی یا حدیثی کلیہ سے یا کسی جزئی حکم کی علت جامعہ سے، بتوسط اجتہاد نکلا ہوا ہے تو کتاب و سنت ہی میں سے نکلا ہوا، اس کا جزو ہوگا۔ جس سے واضح ہے کہ مجتہد کا فعل صرف استخراج و استنباط مسائل ہے، ایجاد مسائل نہیں، مخفی مسئلہ کا بتانا ہے، بنانا نہیں۔ اندریں صورت کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیر شریعت کہا جائے، اور

اسے شرعی حجت نہ مانا جائے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان تمام شرعی حجتوں کا درجۂ حجیت یکساں نہیں ہے، لیکن اس فرق سے چاروں کی نفس حجیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جب کہ تمام اجتہادی عناصر بالواسطہ اور بلاواسطہ کتاب و سنت ہی سے وابستہ ہیں، جو اس دین کی حقیقی اصلیں ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے اس امت میں ایسے مخصوص ورثاء انبیاء بھی ہر دور میں پیدا کئے، جنہوں نے وحی الٰہی کو جہاں بکمال صحت درایت وسند بامانت ہم تک پہنچایا، وہیں اس وحی خداوندی کی چھپی ہوئی جزئیات بھی بکمال روایت و تفقہ کھول کرامت کے سامنے رکھ دیں۔ پس جس طرح وحی کی درایت کو حفاظ اور محدثین نے ہم تک پہنچایا، اسی طرح اس کی درایت کو فقہائے ملت نے ہم تک پہنچادیا۔ اگر ان کی پہنچائی ہوئی روایت، شریعت الٰہی کا اہم جزو ہے، تو یہ درایت بھی شریعت کا دوسرا اہم جزو مانی جائے گی، اس لئے ان چار حجتوں، اور ان سے ثابت شدہ احکام میں سے کوئی ایک چیز بھی بوجہ شریعت ہونے کے، ایسی نہیں رہتی، جو انسانی ترمیمات کی گرفت میں آسکے۔ ورنہ یہ فطرت کی تبدیلی کے مرادف ہوگا۔

اسی لئے ہم نہ صرف مسلمانوں، بلکہ اس ملک کے عظیم رہنماؤں اور دانشور حکام سے یہ کہتے ہیں کہ اور بڑے خلوص سے کہتے ہیں، کہ ہم یکساں 'سول کوڈ' کے منصوبے کو مسترد کرکے، اپنے اس عقیدہ کا اعلان کرتے ہیں، کہ 'مسلم پرسنل لا' میں پارلیمنٹ کے ذریعہ سے ہو، یا حکومت کے راستے سے، یا کسی اسمبلی کی سفارش سے، کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ کیوں کہ اسلام کا قانون فطرت الٰہی پر قائم ہے اور وہ ناممکن التبدیل ہے۔ '**فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله** (اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے انسانوں کو بنایا۔ خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی ہے سیدھا دین، لیکن انسانوں کی اکثریت، اس سے جاہل اور ناواقف ہے۔)

اس دور جہالت و نادانی کا نتیجہ ہے کہ دین سے جاہل اور ناواقف اور بزعم خود واقف

کارایک طبقہ کچھ جزئیات لے کر کھڑا ہوا ہے اوران میں ترمیمات کا مطالبہ کررہا ہے۔ گویا اسے سارا دین چھوڑ کر جب اس میں کہیں بھی انگلی رکھنے کی جگہ نہ ملی تو ان چند جزئیات کو ہدف بنا کر سامنے آیا۔ اور بزعم خود اس نے گویا بڑی فلسفیت اور زعیمی کا کارنامہ انجام دیا لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان ساری خرابیوں کی جڑ اور بنیاد مذہب کے بارے میں ان لوگوں کا سیاسی تصور ہے۔ یہ لوگ دین اور خدائے برتر کو بھی معاشری نقطۂ نظر اور پیٹ ہی کی خاطر سمجھنا چاہتے ہیں اوراس کے لئے انہوں نے ایک کلیہ ایجاد کر رکھا ہے، جس کے یہ گل کھل رہیں۔ اور وہ یہ کہ مذہب انسان کا ایک نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اس تصور کی نامعقولیت سے تھوڑی دیر کے لئے الگ ہو کر، اس کے آثار کو دیکھا جائے، تو مشاہدات ہی سے اس کے اصول کا کھوکھلا پن سامنے آجاتا ہے۔ اس کے آثار میں پہلی مہلک صورت حال تو یہ پیدا ہوگی، کہ پرائیوٹ معاملات میں ظاہر ہے کہ صرف عبادات اور اذکار ہی مذہب میں داخل رہ سکیں گے، بقیہ دین کے تمام شعبے جیسے معاملات، مالیات اور وہ تمام رابطے کہ جس میں انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے، دین سے خارج ہو کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائیں گے، وہ جس طرح چاہیں گے اپنی من مانی کارروائی کر سکیں گے۔ یہی وجہ کہ انسان اگر رات بھر نفلیں پڑھے اور دن بھر ذکر وتلاوت میں مصروف رہے، تو ان لوگوں پر اور ان کے کاز پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نہ ان کی روٹی بند ہوتی ہے۔ نہ ان کی تنخواہیں رکتی ہیں اور نہ ان کے نظام میں کوئی فرق پڑتا ہے، لیکن جونہی انسان اس مفروضہ پرائیویٹ حد سے نکل کر میدان معاملات میں اترتا ہے، تو یہ لوگ فوراً قانون کے دفتر اور شکوک وشبہات کے پشتارے اور کیک تاویلات کے ڈھیر لے کر پہنچ جاتے ہیں، تاکہ ایک سادہ لوح انسان اپنے دینی طرز فکر اور فکری طرز عمل پر جم نہ سکے، اور ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے، اس کا مضر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبادات کو چھوڑ کر دین کے بقیہ تمام شعبے، ان کے اختیار اور تصرف میں آجائیں، اور اسلام جیسا جامع دین اور مکمل دستور حیات، جس کی بشارت انبیاء سابقین

دیتے آرہے تھے، ان حدثاء الثان سفہاء الاحلام (نوخیز ناتجربہ کار اور خام عقل لوگوں) کے ہاتھوں میں پڑ کر ناقص و ناتمام اور آدھا، تہائی رہ جائے۔

دوسری مہلک صورت یہ پیدا ہوگی کہ جب لوگ اسلام کے تمام معاملاتی اور اجتماعی کاموں کو اپنی ناقص رائے اور جزوی عقلوں سے طے کرنے لگیں گے تو دین وحی الٰہی اور نقل صحیح کی حکومت سے نکل کر عامۃ الناس کی عقلوں کے زیر حکومت آجائے گا۔ حالانکہ دین وحی خداوندی اور مستند نقل صحیح کی بنیادوں پر قائم ہے، نہ کہ عقلی اختراعات اور اوہام وخیالات پر، جس سے ان کے لئے دینی شعبوں میں کتر بیونت کی گنجائش پیدا ہو۔ تیسرے یہ کہ عقلوں میں تفاوت ایک مشاہد بات ہے۔ عوام ہوں یا خواص، عقلیں سب کی ایک درجہ کی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں، ظاہر ہے کہ جب دین اور اس کے تمام معاملاتی پہلوؤں کا محور یہی جزوی عقلیں ہوں گی تو دین طرح طرح کے خیالات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا اور جتنی عقلیں موجود ہوں گی اتنے ہی مذہب تیار ہو جائیں گے، جس سے نفس دین تو سرے سے گم ہو کر رہ جائے گا، ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ اسلامی دستور کی کوئی نوع اور نوع کا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں، جس میں قانون کے ساتھ اخلاق کا رنگ گھلا ہوا نہ ہو، حتی کہ اجتماعی اور سیاسی احکام کے ساتھ بھی کتاب وسنت میں تقویٰ، طہارت، خشیت اللہ، رضا جوئی حق، اور یادگاری آخرت کا جوہر شامل ہے، جس سے یہ تمام احکام ہم رنگ عبادت بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوری عقلیں اور وہ بھی بے قید، بے فکر، بے ذوق اور آزاد منش لوگوں کی دین مرتب کریں گی، تو اس میں فلسفیت اور فلفیست بھی نہیں۔ بلکہ سفسطیت، تو کسی حد تک ضرور آجائے گی۔ لیکن اخلاقیت کا کوئی شمہ شامل نہ ہو سکے گا اور اس طرح یہ نام نہاد دین سارا عام دنیوی قوانین کی طرح ایک روکھا پھیکا رسمی قانون اور دنیاوی دستور بن کر رہ جائے گا۔ جس میں دیانت، قرب الٰہی، محبت خداوندی اور آخرت کے آثار کی کوئی گنجائش نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ اسلام نے مذہب کا جو تصور دیا ہے، وہ اس تصور سے یکسر مختلف اور اس

کے منافی ہے۔اسلام ہرگز اس کا قائل نہیں، کہ بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو دو، اور پوپ کا حصہ پوپ کو دو، بلکہ اس نے بادشاہ اور پوپ کے سب حصے ختم کر کے، صرف ایک ہی واحد قہار خدائے لم یزل کا حصہ دین و دنیا دونوں میں قائم کیا ہے۔ دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا ایک ہی ذات واحد کی طرف اپنی نیت اور عمل اور طرز فکر ونظر کا رخ رکھنا اس نے سکھایا، اس کے نزدیک کے مذہب انسان کا کوئی نجی یا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے۔ جس سے دنیوی زندگی کے معاملات خارج ہوں، بلکہ عالم انسانیت کی صلاح وفلاح کا ایک کھلا دستور ہے، جس میں ولادت سے لے کر وفات تک کے تمام معاملات اور نشیب وفراز اس کی حدود میں داخل ہیں۔قرآن کریم کا کھلا اعلان ہے۔**قل إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العٰلمين. لاشريك له وبذلك أمرت وأنا أول المسلمين.** اس میں امہات عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے ساتھ بقیہ تمام عبادات موت وحیات کے درمیان ہر ایک نقل وحرکت، کھانا پینا، رہنا سہنا، ملنا جلنا، دوستی دشمنی، قومی اور بین الاقوامی معاملات سب کو دین کا جزو بنا کر، اسلام کہا گیا ہے اور سب کے حقوق کے بارے میں چاہے وہ انفرادی ہوں یا اہلی، پڑوس کے ہوں یا دوسری اقوام کے، بین الاقوامی ہوں بین الملی، جامع قوانین پیش کئے، جن سے قرآن کریم کتب حدیث اور کتب فقہ بھری ہوئی ہیں۔

اس لئے مذہب اور بالخصوص اسلام کو آدمی کا کوئی نجی اور پرائیویٹ معاملہ کہنا پورے اسلام کا تارو پود بکھیر دینا ہے، جسے اسلام قبول نہیں کرسکتا۔ اگر یہ نام نہاد مصلحین یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکتے ہوں، کہ ہندوستان کا قانون آدمی کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور اس میں جس کا جو جی چاہے، تغیر وتبدل کرسکتا ہے، تو دین اور خدا کے قانون کے بارے میں انہیں یہ جرأت کیوں ہے۔

بہرحال پرسنل لا کی ان جزئیات کے بارے میں شکوک وشبہات کی تو الحمدللہ علماء

نے قلعی کافی کھول دی ہے، جو آپ حضرات کے سامنے آئے گی۔ مجھے تو اس موقعہ پر یہ عرض کرنا ہے، کہ یہ جزئیاتی یا جزوی ترمیم کے خواہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر درحقیقت ان جزئیات کو اصول کے اور ان کے واسطے سے اسلام کے پورے نظام کو چیلنج کررہے ہیں، جن کے نیچے یہ ساری جزئیات آئی ہوئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس قسم کے جزوی منصوبوں کو لے کر کوئی دانا دشمن یا ناداں دوست کھڑا ہوا تو علماء حق نے اس حقیقت کو بھانپ کر، اس کا سامنا کیا اور کسی بھی سکوت واغماض سے کام نہیں لیا۔

ہندوستان میں انگریزی اقتدار آنے پر حالات بدلے، ان کے مسائل ہی نہیں، بلکہ نئے الحادی نظریات اور لادینی کے نئے نئے جذبات دلوں میں ابھرنے شروع ہوئے اور چند دن کے بعد ایک مستقبل گروہ، ان کے انداز فکر وعمل کا تیار ہوگیا، جس نے نہ صرف اسلامی انداز فکر وطرز معاشرت کو ترک کیا، بلکہ رفتہ رفتہ اسلامی معتقدات کو بھی ہدف ملامت بنانا شروع کردیا۔

لیکن حق تعالیٰ جزائے خیر دے امت کے علماء ربانی اور مشائخ حقانی کو، جنہوں نے اپنی فراست باطنی سے اندازہ لگا کر تحفظ دین کی داغ بیل ڈال دی۔

بالخصوص اسلامی مسائل میں عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کو علماً وعملاً محفوظ کردینے کا ایک حصار قائم کردیا ہے، جو آج تک قائم ہے، اس لئے مسلم پرسنل لا کا مسئلہ پندرہ بیس سال پرانا نہیں، جیسا کہ بعض حضرات یہی خیال کئے ہوئے ہیں اور اسے علماء کی خاموشی اور شکوے کے ساتھ، ان کی بے توجہی کو پیش کرتے ہیں، بلکہ یہ مسئلہ اور علماء کی طرف سے اس کے بارے میں اقدام ودفاع سو سال پرانا ہے۔

چنانچہ 1857 کے بعد جب انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوگیا، تو ان ورثاء انبیاء نے سب سے پہلے مسلم پرسنل لا ہی کے تحفظ کی فکر کی۔

1867 میں جب دارالعلوم، دیوبند کی بنیاد پڑی، تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ نے سب سے پہلے، ان ہی عائلی قوانین کے اجرا کی فکر کی۔ ان مقدسین سے یہ تو بعید تھا کہ وہ اسلام کے عائلی قوانین کی برقراری، اور اجراء کے لئے انگریز سے التجا کرتے، اس لئے اسی ابتدائی دور میں حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم ہی میں غیر رسمی انداز سے عہدۂ قضاء قائم کیا اور دارالعلوم کے اولین صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کو قاضی مقرر فرمایا، جس کے تحت پرسنل لا کے عائلی مسائل اور الجھے ہوئے معاملات، شرعی اصول پر طے ہونے لگے۔ انگریزوں کی طرف سے رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ مسلمان نامی لوگوں ہی کو، اس سلسلہ کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھایا گیا، بالآخر تغیر احوال سے ان کے دور کے ساتھ، اس نظام کا دور بھی ختم ہوگیا، لیکن مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی جو داغ بیل، ان بزرگوں نے ڈالی تھی، وہ دلوں کی زمین میں قائم ہوگئی، گو اس کے خلاف کی داغ بیل بھی اسی وقت سے مسلم صورت افراد کی طرف سے پڑ چکی تھی، اس لئے مسلم پرسنل لا کے بارے میں مرض اور علاج دونوں ہی سو برس پرانے ہیں۔

انگریزوں کے اقتدار پر نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ ہندوستانیوں میں سیاسی حقوق طلبی کا داعیہ پیدا ہوا، عامۃً سیاسی جماعتوں نے سیاسی مطالبات پیش کئے، لیکن مذہبی مطالبات کو نظر انداز کر دیا، جس سے ان دینی حقوق اور بالفاظ دیگر پرسنل لا کے کالعدم ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان بدلتے ہوئے حالات میں علمائے دیوبند نے اپنے اسلاف کے نقش قدم کو سامنے رکھ کر خود اسی مسئلہ پر میمورنڈم تیار کیا، جو دس دفعات پر مشتمل تھا۔ نومبر 1917 میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند، کی سربراہی میں ایک مؤقر وفد دہلی پہنچ کر وزیر ہند سے ملا اور میمورنڈم پیش کیا، جس میں صفائی سے پہلے ہی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں گورنمنٹ کوئی ایسا ایکٹ وضع نہ کرے جو شرعی قوانین سے متصادم ہو، وہ ہمارے لئے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

اس میمورنڈم میں بنیادی مطالبے دو تھے، ایک یہ کہ ہندوستان میں پرسنل لا کے اجراء کے لئے محکمۂ قضاء قائم کیا جائے۔ چونکہ شرعی اصول پر بہت سے مسائل کی تنفیذ کے لئے مسلم حاکم شرط ہے، اس لئے قاضیوں کا انتخاب وتقرر اہل سنت والجماعت سے ہو، لیکن اس کونسل میں ہر فرقہ کے علماء نمائندے اور ممبر ہوں اور مسائل کا فیصلہ ہر فرقہ کے اپنے فقہی اصول پر ہو۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر، مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف، خانقاہوں اور دوسرے دینی رفاہ عام کے اداروں کے تحفظ ونگرانی ونظم ونسق کے لئے 'شیخ الاسلام' کا عہدہ قائم کیا جائے، جو ان تمام شعائر کو تنظیم کے ساتھ چلانے کا ذمہ دار ہو۔

ان مطالبات پر اس دور کے تقریباً 5 سو علماء کے توثیقی دستخط حاصل کئے گئے، جو آج بھی دارالعلوم دیوبند کے 'محافظ خانہ' میں موجود ہے۔

اس کے بعد 1929 میں ہندوستان میں مسلم اوقاف کی تنظیم کا مسئلہ اٹھا، جو مسلم پرسنل لا ہی کا ایک اہم جزو تھا، گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی، جس نے استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے۔ اس کا یہ استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے۔ اس کا یہ استفساری مراسلہ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند کے نام موصول ہوا، جس کا ایک اصولی جواب انہوں نے روانہ کر دیا۔

فروری 1930 میں جب مجھے دارالعلوم کا اہتمام تفویض کیا جا چکا تھا، حضرت ممدوح کے وصال کے بعد اس مراسلت کا سلسلہ مجھ سے قائم ہوا۔ اور تا اختتام کار احقر ہی سے جاری رہا، اس پر وقف کے مسائل کی تفصیلات مرتب کرائی گئیں۔ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی قیادت میں سرکاری مسودہ وقف کے بل پر تنقید کے ساتھ پیش کردہ اشکالات کا تحریری حل پیش کر دیا گیا اور ساتھ ہی احقر ناکارہ نے ایک تحریر بھی بنام 'الانصاف فی قانون الاوقاف' پوری جماعت کی طرف سے مرتب کی، جس پر تمام اکابر علماء کے دستخط ثبت ہوئے۔ احقر ہی نے اس پر مقدمہ لکھا اور یہ ساری کارروائی ایک

کتابچہ کی صورت میں طبع کرا کر شائع کی گئی۔ اور ممبران اسمبلی کے نام بھی ارسال کی گئی اور اس سلسلہ میں مناسب وقت تمام مساعی عمل لائی گئیں، جس کی جملہ کارروائی ایک مطبوعہ کتابچہ کی صورت میں 'محافظ خانہ' دارالعلوم میں محفوظ ہے۔

پھر برطانوی حکومت ہی کے زمانہ میں شاردا ایکٹ کا مسئلہ اٹھا، جو پرسنل لا کا ایک مستقل جزو تھا۔ علماء دیوبند نے اس پر مضامین لکھے اور حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے ایک مستقل رسالہ شاردا بل کے بنیادی محرکات اور عمر نکاح کے شرعی قانون میں ترمیم کئے جانے کی تردید کے ساتھ، اس پر پیش کردہ اشکالات کا حل پیش کیا۔ اور اس پر مناسب وقت جدوجہد کی گئی۔ پھر برطانیہ ہی کے دور میں، ان ہی عائلی مسائل کو شرعی قوانین کے مطابق طے کرنے کے لئے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے بہار میں 'امارت شرعیہ' قائم فرمائی، جو آج تک الحمدللہ قائم ہے اور آج اس کے امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی ہیں، جو آپ کے سامنے موجود ہیں، یہ امارت مسلم پرسنل لا کی عملی صورت ہے، جو ترمیم وتبدیلی کے اوہام وخیالات کا عملی جواب بنی ہوئی ہے۔

پھر انقلاب 1947 سے کچھ قبل علماء دیوبند کی طرف سے حضرت تھانوی نے رسالہ 'الحیلۃ الناجزۃ' شائع کرایا، جس میں ظالم خاوندوں سے، بے کس اور بے بس عورتوں کی گلوخلاصی کی شرعی صورتیں یکجا فرمائی اور اسی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند میں علماء کی ایک کمیٹی قائم کی گئی، جس نے ان ہی شرعی اصولوں کی روشنی میں فیصلے کر کے، سینکڑوں عورتوں کو رہائی دلائی اور ان کی مشکلات کا قرار واقعی حل کیا۔

پھر 1947 کے انقلاب اور تقسیم ملک کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے 'تنسیخ زمینداری' کا مسئلہ اٹھا، جس کا اثر اوقاف کی زمینوں پر بھی پڑتا تھا۔ جو پرسنل لا ہی کا بنیادی جزو تھا، اس بارے میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ایک وفد، جس میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا، دہلی میں مولانا آزاد مرحوم کی خدمت میں پیش ہوا اور گفت وشنید کی، پھر مولانا ہی کی ہدایت پر دوبارہ

یہی وفد لکھنؤ جا کر پنڈت پنتھ وزیر اعلیٰ یوپی سے ملا اور بموجودگی دیگر وزراء یوپی کونسل اور چیئرمین اوقاف کے مسئلے میں بحث وتمحیص کی۔

غرض علماء حق 'نہی عن المنکر' کا فریضہ ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور اس عائلی قوانین کے مشترک، منصوبہ کو خلاف شرع ہونے کی وجہ سے بڑی قوت سے چیلنج کیا۔ مضامین اور مقالات شائع کئے اور آخر کار مسلم پرسنل لا کے تمام مسائل پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دارالعلوم دیوبند نے ایک مبسوط رسالہ بنام 'ہمارے عائلی مسائل' شائع کیا، جس میں ان تمام پیش پا افتادہ موانع کو، جن کی آڑ میں ترمیم قانون کی صدائیں بلند کی گئی تھی، معقول اور منقول انداز سے رد کر کے ان کا شرعی حل پیش فرما دیا۔

ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ عائلی مسائل اور پرسنل لا کے مرض نے جو روپ بھی اختیار کیا، علماء امت نے، اس کے معالجہ اور اصلاح میں قلمے، سخنے، درمے قدمے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

آج پرسنل لا پر وہی وقت پھر گزر رہا ہے، جو سو برس میں بارہا گزرا اور وہی علماء اس سلسلہ میں پھر کھڑے ہوئے ہیں، جو پہلے سے مدافعت کرتے چلے آرہے ہیں، نیز آج بھی وہی مسلم کہلانے والے چند لوگ اس کی ترمیم کے نعرے لئے ہوئے کھڑے ہیں، جن کا پرانا روگ ایک ہی تھا، اور وہ شرعی مسائل کو لادینی فکر، معاشی یا سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور سوچنا اور اسی خاکہ پر قانون شرعی کو ڈھالنے کی سعی کرنا، درآں حالیکہ وہ ان مسائل اور ان کی حقیقی بنیادوں سے نہ قطعاً واقف ہیں اور نہ ہی ان کے سمجھنے کے ذوق سے آشنا ہیں۔

پرسنل لا کا علمی جائزہ لینے اور اس کے بارے میں پیش کردہ شبہات کی جواب دہی کے لئے حضرات اساتذہ ارباب افتاء دارالعلوم دیوبند کی ایک کمیٹی بنام 'پرسنل لا کمیٹی' بنا دی گئی، کہ وہ ان مسائل کے بارے میں آج کے شکوک وشبہات کا مواد فراہم کر کے، مدلل دفاع کا فریضہ انجام دیں، چنانچہ کمیٹی نے اپنا کام خاطر خواہ طریقہ پر مکمل کر کے پیش کر دیا۔ کمیٹی

کے سامنے چند بنیادی امور رہے، جن کو بطور اصول موضوعہ احقر نے لکھ کر بھیج دیا تھا۔

کمیٹی نے انہیں اصولوں کی روشنی میں کام کیا اور امکانی حد تک پرسنل لا کے زیر بحث مسائل کی جمع وترتیب کے ساتھ زباں زدع اشکالات ومواقع اور ان کے شرعی جوابات کا مواد فراہم کر کے اسے مرتب کر دیا۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان مسائل کے خلاف جس شوراشوری سے مشکلات کا ڈھول پیٹا جارہا تھا، ان میں سے کوئی ایک مشکل بھی، کمیٹی کے سامنے ایسی نہیں آئی، کہ اسے عام معمول بہ پہلو کے خلاف کسی دوسرے غیر معمول بہ پہلو کی ترجیح وانتخاب سے کام لینا پڑا ہو، کیوں کہ عموماً پیش کردہ مشکلات کچھ تو ازقسم حیلہ جوئی ہیں کہ اپنی سہل انگاری اور کم ہمتی کی وجہ سے لوگوں نے عمل تو خود نہیں کیا اور خود ساختہ مشکلات کا الزام شریعت کے سر تھوپ دیا۔ ظاہر ہے کہ ان مشکلات کو تقاضائے نفس تو کہا جاسکتا ہے، لیکن تقاضائے فطرت یا مقتضائے حق کہنا بہت مشکل ہے۔

بعض مشکلات رسمی اور رواجی قسم کی ہیں، جو رسم ورواج کی کورانہ پابندیوں، ماحول کی خرابیوں اور غیر طبعی جکڑ بندیوں سے پیدا شدہ ہیں، مگر جب کہ شریعت کا موضوع ہی جاہلانہ رسوم رواج کو مٹا کر اسوہائے نبوت پر دنیا کو لگانا ہے، تو شریعت کو تو حق ہے کہ ان رسوم اور ان کے ماحول میں ترمیم تغیر کرے، لیکن رسوم ورواج کو قطعاً حق نہیں ہے کہ وہ شریعت میں ترمیم کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔

بعض مشکلات خیالی اور وہمی قسم کی ہیں کہ ایک طبقہ کو مظلوم اور محروم فرض کر کے شریعت کے دئے ہوئے حق سے اسے زائد حق دلوائے جانے کا شور مچایا گیا ہے، درآں حالیکہ اسے مقرر حق سے زائد حق دئے جانے میں کتنے ہی دوسرے اہل حقوق کی حق تلفیاں مضمر ہیں۔

مگر شک اندازوں کے سامنے زباں زد طریق پر حقوق کی کمی کا پہلو تو آ گیا مگر لاعلمی کی

وجہ سے تلافی کا پہلو نہ آیا، درآں حالیکہ شریعت ہر انسانی طبقہ کو اس کی خلقی اور فطری اور ساتھ ہی عقلی اور شعوری خصوصیات ہی قدر حقوق واختیارات وفرائض عطا کئے ہیں جو کمال عدل اور اعتدال پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ معتدل اور جامع احکام سے روگردانی اور تجاوز ہی کا نام افراط وتفریط اور ظلم ہے اور جسے مٹانے کیلئے یہ فطری شریعت بھیجی گئی ہے۔

بہر حال پرسنل لا کے مسائل کے سلسلے میں جس قدر بھی زباں زد مشکلات کمیٹی کے سامنے آئیں، ان میں کوئی بھی شکل اصولی رنگ لئے ہوئے نہیں تھی اور اگر اصولی رنگ بھر کر کسی چیز کو اصولی بنایا بھی گیا تو تو وہ فرضی اور خود ساختہ اصول سے بااصول کہلائی گئی تھی غرض نہ کوئی جزوی مشکل سامنے آئی اور نہ اصولی۔ بلکہ محض ناتربیت یافتہ دماغوں کی اپج لاعلموں کی خیالی مشکلات، بے عملوں کی حیلہ جوئی اور اسیرانِ رسوم ورواج کی پہلو بھی اور یا پھر دانا دشمنوں کی خوردہ گیریاں تھیں، جن کی وجہ سے قانونی توسعات تلاش کرنے کی کمیٹی کو کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے مسلم پرسنل لا میں دو ہی قسم کے مسائل ہیں یا کتاب وسنت میں منصوص ہیں یا کستاب وسنت سے ماخوذ۔

منصوص مسائل میں تو کسی ترمیم وتبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ کتاب وسنت کا کوئی بدل ہی ممکن نہیں ہے، اجتہادی مسائل تو اجتہادی کا بدل اجتہاد ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اصل اجتہاد پر عمل کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے لیکن اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو اجتہادی مسائل میں بھی انتخاب وترجیح کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا، چہ جائے کہ رد وبدل یا ترمیم وتنسیخ کا سوال پیدا ہو۔

کمیٹی کے سامنے اس قسم کا سوال ہی نہ تھا اور نہ ہی مسائل کے خلاف کوئی علمی یا عقلی مشکل اور رکاوٹ ہی سامنے آئی تو اسے مسائل میں تبادل یا ترجیح وانتخاب کی گنجائش تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا پیش آتی۔

اس کنونشن کا بنیادی کا مقصد پرسنل لا تحفظ اور فتنہ ترمیم سے اس کا بچاؤ کرتے ہوئے تمام مکاتب فکر کے اہل علم وفضل اور دانشوروں کو یہ اعلان کرنا ہے کہ مسلمانان ہند بہمہ مکاتیب فکرا پنے پرسنل لا سے نہ کسی حالت میں دستبردار ہو سکتے ہیں نہ اس میں کسی قسم کی ترمیم وتبدیلی گوارا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے مشترک قانون کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جو پرسنل لا کے کسی ایک جزئیہ پر بھی اثر انداز ہو خواہ وہ سول کوڈ یا بالواسطہ قانون سازی۔

بالفاظ دیگر مسلمان اپنی معاشرتی اور ثقافتی خصوصیات اور امتیازات کو فنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، جن پر ان کے ملی وجود کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور ان کا ممتاز شرعی اور قومی امتیاز قائم ہے۔

رہے وقت کے تقاضے تو اسلام کے جامع اور معتدل احکام میں وقت کے کونسے تقاضے ہیں، جو پورے نہیں ہوئے یا نہیں ہوسکتے۔ نزول وحی کے بعد سے اب تک چودہ قرون میں وہ کونسی ایسی مشکل اور کون سا ایسا حادثہ ہے، جس کے پیش آنے پر قرآن وحدیث اور اس سے مستنبط شدہ علوم نے قرار واقعی رہنمائی نہیں کی اور فتنوں کا استیصال نہیں کیا۔ لیکن جہاں شک اندازوں کو دین یا دین کی تاریخ کی خبر ہی نہ ہو اور وہ دین سمجھنے، سمجھانے کے راستے ہی نہ چلیں بلکہ اسی دینی لاعلمی اور بے بصیرتی پر قناعت کر کے اس ہی کو علم سمجھتے رہیں، درآں حالانکہ وہ جہل مرکب ہے علاج ہی کیا ہوسکتا ہے پھر جو شبہات وہ اٹھا رہے ہیں، وہ آج کے حوادث بھی نہیں اور کچھ نئے بھی نہیں ہیں، جو پیش نہ آچکے ہوں صرف روپ کا فرق ہے۔

وہی فتنہ لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے

چنانچہ شک انداز اگر کسی اصلی روپ میں بھی سامنے آئے تو انہیں ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں یہود ونصاریٰ حجت وبرہان سے سامنے آئے مگر اسلامی حجتوں کے سامنے عاجز ہو کر پسپا ہوئے۔ اس سے کام نہ چلا تو اسلام کے خلاف جنگیں لڑیں۔ سازشیں کیں، بالآخر شکوک وشبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو ڈگانا چاہا مگر

ناکام ہوئے، بالآخر انہوں نے نفاق کے راستے سے حملہ آوری کا میدان ہموار کیا۔ اور مسلمانوں میں ایسے گروہ کھڑے کر دیئے جنہوں نے اسلام ہی کے نام پر اسلام کے خلاف شور مچایا اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کی۔ یہی روش آج بھی اختیار کی گئی ہے اور مسلم نامی افراد کی طرف سے شک اندازی کر کے مسلمانوں کو ورغلانے کی سعی کی جارہی ہے لیکن اسلام کے فطری اصول کی کسوٹی پر پرکھ کر علماء اسلام نے جیسے ہر ہر زمانہ میں اس قسم کے دورخے لوگوں کے حربوں کو ناکام بنایا ہے اسی طرح آج بھی وہ اسی قسم کے منافقانہ حملوں کی زد سے اسلام کو محفوظ رکھ کر ان حربوں کو ناکام بنانے کی قدرت رکھتے ہیں، اور ان شاءاللہ یہ سب حربے ضرور ناکام ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ آج اس فطری قانون الٰہی کے خلاف بے بصیرتی سے شکوک وشبہات کے میدان ہموار کر کے انہیں ناقابل تسلیم اور ناقابل عمل باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں، لیکن کسی بھی صحیح فکر وخیال یا نظریہ وعقیدہ کی راہ میں پیش آمدہ دشواریوں ماحول کی ناسازگاریوں یا اس کے دلائل وبراہین سے لاعلمی وبے بصیرتی کسی درجہ میں بھی اس سے دستبرداری کے لئے وجہ یا معقول بنیاد قرار نہیں پاسکتی۔

پرسنل لا کے بارے میں سرکاری طور پر گو یہ بھی اعلان ہے کہ اس میں مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی بھی ترمیم وتبدیلی نہیں ہوگی لیکن ساتھ ہی بالواسطہ قانون سازی کے ذریعے تبنیت اور سرکاری ملازمین کے لئے نکاح ثانی کے حق پر پابندی نے جو پرسنل لا میں عمل ترمیم کا آغاز ہے پرسنل لا کے بارے میں مسلمانوں کی تشویش کو حق بجانب بنا دیا ہے۔ اس لئے وہ متفقہ آواز اٹھانے پر مجبور ہوئے اور جس کی گونج ان شاءاللہ رائیگاں نہیں جائے گی۔

شک اندازوں کے مضمرات اور دلوں کے چور کو سمجھنے کے لئے یہ پیش نظر رکھ لینا کافی ہے کہ مذہب اور دین کے بارے میں ارباب سیاست کا وضع کردہ مذہبی تصور یہ ہے کہ مذہب انسان کا ایک نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے یہ تصور درحقیقت انہوں نے محض اپنے

سیاسی مقاصد کو مذہب کی دستبرداری سے محفوظ رکھنے کے لئے وضع کیا ہے ممکن ہے کہ کوئی مذہب ایسا ہی پرائیوٹ ہو لیکن جہاں اسلام کا تعلق ہے میں تفصیل سے اوراق سابقہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا تصور اس تصور سے یکسر مختلف ہے وہ اپنے دائرہ وتربیت سے کسی گوشۂ حیات کو باہر تسلیم نہیں کرتا اور یہی اسلام کامل اور مکمل مذہب اور دستور حیات ہونے کی بڑی دلیل ہے جس کا نعرہ قرآن نے **ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شی وھدی ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین** کے پاکیزہ کلمات سے لگایا ہے اور جس کے اصولی وضاحت سطور سابقہ میں آپ کے سامنے آچکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے دائرہ حکم وتربیت سے کسی گوشہ زندگی کا مستثنیٰ نہ ہونا ہی غرض مند سیاست کی راہ میں سنگ گراں بن رہا ہے، اور اسلام ہی سنگ گراں بن بھی سکتا ہے لیکن اس پر یقین واطمینان کیا جائے کہ اس کے برخلاف یہ دماغی گمبھیر کے افکار ونظریات اور فلسفہ وسیاست کے شاطرانہ حربے نہ کبھی کامیاب ہوئے ہیں نہ آج ہوں گے۔

چوں کہ اسلام اپنے احکام کی نقل وعقل معقولیت ومنقولیت، مادیت وروحانیت انفرادیت واجتماعیت، عبادت ومعاشرت رابطہ انسانی اور علائق ربانی کا وہ حسین امتزاج ہے جو عقل انسانی کو صحت مند روایات کے ساتھ ساتھ حجت وبرہان اور روایت سے مطمئن کرکے دعوتِ قبول دیتا ہے اس لئے مسلمانوں کا تعلق اسلام سے پہلے فطری ہے پھر جذباتی، جبکہ بالعموم روایاتی خوش عقیدگی کی بنیادوں پر قائم شدہ مذاہب سے ان کے پیروؤں کا تعلق اول وآخر جذباتی ہے۔ اس لئے جب انہیں جذبات سے الگ کرکے خالص عقل ونقل کی کسوٹی پر رکھا جاتا ہے تو وہ پورے نہیں اترتے اس لئے ان میں بے تکلف ترمیم تنسیخ اور ردو بدل کا عمل جاری ہوجاتا ہے اور ہو رہا ہے مگر ناخواندہ یا بزعم خود خواندہ مگر ناخواندہ لوگ اسلام کو بھی اسی پر قیاس کرکے ترمیم وتنسیخ کے تصورات باندھنے اور اس کے نعرے لگانے کھڑے ہوگئے لیکن حجت وبرہان کا مرتب نظام جس سے وہ یکسر بے خبر ہیں، اس قسم

کے تصورات کو بیک جنبش ابرو کوڑے کچڑے کی طرح نکال کر باہر پھینک دیتا ہے آج اگر شدید ضرورت ہے تو مسلمانوں کو تعلیم وتربیت کی ہے کہ وہ اسلام کے قانون کو سمجھیں اور خلوص کے ساتھ اسے استعمال میں لائیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسی راہ عمل ہموار کردینے کی ہے جس پر پرسنل لا خود اپنی ہی معنوی قوت سے تعمیری انداز میں چلے اور آگے بڑھے جس کا عملاً چلتے رہنا ہی اس قسم کے فتن اور وسوسہ اندازیوں کا سدباب اور عملی جواب ہے۔

اس عظیم اجتماع سے جس میں ہر مکتب کے فضلاء جمع ہیں یہ توقع بجا طور پر قائم کی جاسکتی ہے وہ پرسنل لا کو عملاً جاری کردینے کے لئے کوئی راہ عمل متعین کرکے اس کی داغ بیل ڈال دے۔ آخر کلام میں اس گذارش پر اس طولانی دفتر کو ختم کرتا ہوں کہ گورنمنٹ کا اعلان اس بارے میں جیسا کچھ بھی ہو بہرحال اعلان ہے کہ پرسنل لا میں اس وقت تک تبدیلی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مسلمان خود ہی اس کی خواہش نہ کریں، اس نام پر تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار نمائندے متفقہ طریقے پر اعلان کرتے ہیں کہ ہم پرسنل لا سے کسی حالت میں بھی دستبردار نہیں ہوسکتے، ہم اس کی ترمیم وتبدیلی کبھی گوارا نہیں کرسکتے، اور ہم کسی ایسے مشترک قانون کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتے جو پرسنل لا کے کسی ایک جزئیہ پر بھی اثر انداز ہو بلکہ اسی کے ساتھ اگر ہم یہ بھی کہیں کہ پرسنل لا کے سلسلہ میں تبنیت اور ملازمین سرکار پر تعدد ازدواج کے بارے میں جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ مسلمانوں کی حد تک اٹھالی جائیں تو گورنمنٹ کے اس اعلان کی صداقت غیر مشتبہ ہوجائے گی، وہ شبہات باقی نہ رہیں گے جو اس اعلان کے بعد اس قسم کی جزئیات سے پیدا ہوگئے ہیں پرسنل لا کے فطری حصوں کے ساتھ اس کے عملی نظام کا کوئی خاکہ بھی اس تاریخی اجتماع کی طرف سے آجائے جس پر پرسنل لا اپنے پیروں پر چل پڑے اور چلتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس تاریخی اجتماع کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا جس کو آج اور مستقبل کی نسلیں کبھی فراموش نہیں کرسکیں گی۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی فرد یا طبقہ شریعت اور شرعی قوانین کو ماننے کے لئے تیار نہ

ہوں تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ اور وہ اپنا دنیوی اور اخروی انجام خود سوچ لے، قانون شریعت یا علماء اس کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے۔

میں آخر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے ممبئی کے مخلص دردمند اور باحمیت مسلمانوں کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اپنی روایتی حوصلہ مندیوں اور فراخدلانہ جذبات سے پرسنل لا کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بمبئی میں اس کنونشن کے انعقاد کا ذمہ لیا اور اسے عملاً کرکے دکھایا جس کی بدولت یہ مخلف رنگ کے پھولوں کا گلدستہ اس تاریخی اجتماع کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پھر مختلف مکاتب فکر کے اہل علم وفضل اور بزرگوں اور اطراف ملک سے آئے ہوئے دانشوروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے بمبئی کی استقبالیہ کمیٹی کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس عظیم اجتماع کو کامیاب اور اس کے کام کو مضبوط اور مستحکم بنایا۔

☆☆

امّت کے سامنے درپیش مسائل

پیش کردہ: اجلاس مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

بمقام دہلی 22/اپریل 2007ء

ایجنڈہ کے امور کے بارے میں نوٹس:

ایجنڈہ ۳:

ریاست جموں وکشمیر میں مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلیکیشن ایکٹ کی منظوری کے بعد وہاں سے مجموعہ قوانینِ اسلامی مرتبہ بورڈ اور اس کے انگریزی ترجمے منگوائے جارہے ہیں، یہ مجموعہ قوانین زیادہ تعداد میں نہیں ہے۔ ان شاء اللہ اس کو چھپوالیا جائے گا۔ اگر اس سلسلہ میں تبدیلی، ترمیم یا اضافے کی کوئی تجویز بورڈ کے علماء ارکان رکھتے ہوں تو اس سے مطلع فرمائیں، تاکہ اس کے اگلے ایڈیشن سے پہلے ان پر غور کیا جاسکے۔ اس مجموعہ کے انگریزی ترجمہ کا جہاں تک تعلق ہے جن قانون داں اصحاب نے اس کا مطالعہ کیا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ ترجمہ ناقص ہے اور مجموعے کی کئی دفعات کا ترجمہ کرنے کی بجائے اس کا خلاصہ انگریزی میں کردیا گیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس ترجمے پر نظرِ ثانی کروائی جائے اور اس کے بعد ہی اس کو شائع کیا جائے۔

ایجنڈہ ۴:

بورڈ کے ارکان کے انتخاب کے تعلق سے تجویز علیحدہ پیش ہے۔

ایجنڈہ ۶:

چنئی کے اجلاس عمومی میں مدھیہ پردیش سے تعلق رکھنے والے ارکان بورڈ سے کہا گیا

تھا کہ حکومت مدھیہ پردیش کے تمام اسکولوں میں سوریہ نمسکار کو لازمی قرار دینے کے حکم کے خلاف ہائیکورٹ میں رجوع ہوں۔ اس سلسلہ میں جناب منیر احمد خان صاحب رکن بورڈ (اندور) نے دلچسپی لی اور سیونی کے مسلم اداروں کی جانب سے رٹ داخل کروائی۔ جبل پور ہائیکورٹ نے ۲۴/جنوری ۲۰۰۷ء کو اس رٹ کو بحث کے لئے قبول کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ طلبہ کو سوریہ نمسکار کے لئے یا پرنام کے لئے مجبور نہ کیا جائے اور کوئی اسکول سوریہ نمسکار کا انکار کرتا ہے تو اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے، ہائیکورٹ نے ریاستی حکومت کو جواب داخل کرنے کے لیے چار ہفتوں کی مہلت دی تھی۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس کے بعد کیا ہوا، کیونکہ منیر احمد خان صاحب سے کسی ٹیلیفون پر بھی ربط نہیں ہو رہا ہے، ان کو ایک مراسلہ بھی تحریر کیا گیا تھا، وہ اس اجلاس میں شرکت کر رہے ہیں، موجودہ صورتحال سے وہ اجلاس کو واقف کرائیں گے۔

ایجنڈہ ۷، ۹، ۱۰:

جناب ظفریاب جیلانی صاحب ایڈوکیٹ چونکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک اہم میٹنگ میں شرکت کر رہے ہیں، اس لیے انہوں نے اس اجلاس میں شرکت سے معذرت کی ہے، جناب ظفریاب جیلانی صاحب سے یہ گذارش کی گئی تھی کہ وہ ان امور کے تعلق سے رپوٹس روانہ فرمائیں۔

ایجنڈہ ۱۱:

دار القضاء اور فتوؤں کے خلاف وشوا لوچن مدن نامی ایڈوکیٹ نے جب رٹ فائل کی تھی اس تعلق سے حکومت ہند اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے سپریم کورٹ سے گذارش کی گئی تھی کہ وہ اس سماعت کے لیے قبول نہ کرے۔ مگر ۵/اپریل ۲۰۰۷ء کو سپریم کورٹ نے اس کو سماعت کے لیے قبول کرلیا۔ اب یہ کیس کم سے کم تین سال بعد سماعت کے لیے سپریم کورٹ کی فہرست پر آئے گا۔ اس دوران میں کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جن

ریاستی حکومتوں کو رٹ میں فریق بنایا گیا ہے اور جن کی طرف سے ابھی تک جواب داخل نہیں ہوا ہے ان حکومتوں سے حکومتِ ہند کے موقف کی تائید میں جواب داخل کروانے کی کوشش کی جائے۔

ایجنڈہ ۸:

پارلیمنٹ نے وقف کے اُمور پر غور و رپورٹ کے لیے جوائنٹ پارلیمینٹری کمیٹی کی تشکیل دی ہے۔ جسکے صدر نشین جناب ایس ایم لعل جان پاشا صاحب رکن راجیہ سبھا ہیں۔ اس کمیٹی نے وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء میں ترمیمات کے لئے ۲/ مارچ ۲۰۰۷ء کو اشتہار شائع کرکے تجاویز پیش کرنے کے لیے ۳۰/دن کی مہلت دی تھی۔ یہ اشتہارات ۲/اور ۳/ مارچ کو شمالی ہند کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ مارچ کے اواخر میں اس کی اطلاع ملی جس پر جناب لعل جان باشا صاحب سے ربط پیدا کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء میں ترمیمات کی تجاویز پیش کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو مزید وقت دیں۔ اس گفتگو کے بعد ان کو بورڈ کی جانب سے تحریر دی گئی تھی کہ ۳۰/جون ۲۰۰۷ء تک بورڈ کو مہلت دی جائے۔ قبل ازیں جناب کے۔ رحمٰن خاں صاحب کی صدارت میں جو کمیٹی بنی تھی اس کے سوال نامہ کی روشنی میں بورڈ نے تجاویز پیش کی تھی۔ ان تجاویز کی روشنی میں جناب لعل جان باشا صاحب سے ۱۷/اپریل ۲۰۰۷ء کو حیدرآباد میں گفتگو ہوئی اور ان کا ردِ عمل ہمدردانہ محسوس ہوا۔

ایجنڈہ ۱۲:

شبنم ہاشمی صاحبہ کی داخل کردہ اس رٹ میں بورڈ کو فریق بنائے جانے کی درخواست سپریم کورٹ میں پیش کی گئی تھی۔ جولائی ۲۰۰۷ء میں یہ درخواست فیصلے کے لئے عدالت کے آگے آئے گی۔ اور توقع ہے کہ سپریم کورٹ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو بحث کرنے یا تحریری بحث داخل کرنے کا موقع ضرور دے گا۔ یہ رٹ جس انداز سے مرتب کی گئی ہے اس

کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ بورڈ کی طرف سے بہت ہی مدلل جواب داخل کیا جائے یا بحث کی جائے۔ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر علمائے کرام سے اور سماجی علوم کے ماہرین کی مدد درکار ہے۔ تبنیت کے مسئلہ پر اقوام متحدہ کی قرار داد میں متبادل کے طور پر اسلامی قانون کے نظامِ کفالہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے بھی علمائے کرام کی مدد چاہئے کہ وہ بتائیں کہ یہ نظام کیا ہے اور کس حد تک یہ ملک میں رائج تھا یا رائج ہے۔

ایجنڈہ ۱۴:

اس قانون کا جائزہ بورڈ کے لیگل سیل کے اجلاس میں لیا گیا اور اس کی رپورٹ اس اجلاس میں پیش ہوگی۔

ایجنڈہ ۱۵:

یہ ایک حقیقت ہے کہ چند ہائی کورٹس اور اس کے بعد دانیال لطیفی کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے نے قانونِ تحفظ حقوقِ مسلم مطلقہ کے مقصد ہی کو فوت کر دیا ہے اور اس قانون کے غلط تعبیر کر کے عملاً شاہ بانو کیس میں دئے گئے فیصلے کو قانون بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح قانونِ تحفظ حقوقِ مسلم مطلقہ کی تدوین کا جو منشاء قانون ساز یہ یعنی پارلیمنٹ کا تھا اس کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کے خلاف عدالتیں فیصلہ دے رہی ہیں۔ اس لیے اجلاسِ بھوپال میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اس تعلق سے ایک جامع اور مبسوط میمورنڈم تیار کیا جائے اور حکومت سے اس قانون کی تدوین کے منشاء کی بحالی کے لیے قدم اٹھانے کا مطالبہ کیا جائے۔ مناسب ہوگا کہ یہ اجلاس اس میمورنڈم کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے جو پارلیمنٹ کے مانسونی اجلاس تک اس کو تیار کر لے۔

ایجنڈہ ۱۶:

شمیم آراء کیس میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ اگر عورت کی طرف سے نفقہ کی درخواست عدالت میں پیش ہو اور اس کے شوہر کی طرف سے جواب میں یہ عذر پیش کیا

جائے کہ اس نے پہلے کسی تاریخ پر عورت کو طلاق دیدی تھی تو طلاق کے اس ادعا کو قبول نہیں کیا جائے گا، تا آنکہ وہ یہ ثابت کرے کہ پچھلی کس تاریخ میں اس نے طلاق دی تھی۔ اس سے پہلے طریقہ کار یہ تھا کہ عدالتیں مرد کے جواب کی نقل عورت کو وصول ہونے کی تاریخ سے طلاق کا واقع ہونا تسلیم کرتی تھی۔ مگر شمیم آرا کیس کے فیصلے نے صورتحال کو یکسر بدل دیا کہ اگر جواب میں شوہر طلاق دینے کا ادعا پیش کرے تو اس کو مانا نہیں جائے گا اور یہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حال ہی میں ایک فیصلہ دلشاد بیگم کیس میں ممبئی ہائیکورٹ نے دیا ہے، اخبار کی اطلاعات کے مطابق عدالت نے یہ کہا ہے کہ تحکیم کا مرحلہ طے کیے بغیر اگر طلاق دی جائے تو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی، یہ فیصلہ جسٹس مارلے پلّے نے دیا ہے، ایسا ہی فیصلہ جسٹس مارلے پلّے ۲۰۰۲ میں دے چکے ہیں، جبکہ وہ ہائی کورٹ کے اورنگ آباد بنچ کے سینئر جج تھے۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے فُل بنچ کی طرف سے تحریر کیا تھا۔ چونکہ دلشاد بیگم کیس کے فیصلے کی نقل سامنے نہیں ہے، اس لیے اورنگ آباد بنچ کے اس فیصلے کے نکات پیش کیے جاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ انہیں خطوط پر جسٹس مارلے پلے صاحب نے فیصلہ دیا ہوگا۔ اورنگ آباد بنچ کے دگڑو چھوٹو بنام رحیم بی پٹھان کیس میں ایک بات تو یہ کہی تھی کہ نفقہ کے دعویٰ کے جواب میں اگر پچھلی کسی تاریخ پر طلاق دینے کا عذر شوہر کی طرف سے پیش کیا جائے تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس فیصلے میں سورہ بقرہ، سورہ نسآء اور سورہ طلاق کی آیات کا حوالہ دیا گیا۔ نیز آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مرتبہ مجموعہ قوانین اسلامی کا حوالہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں طلاق کے موضوع پر ملاّ کی کتاب کی دفعات کا جائزہ لیا گیا اور یہ فیصلہ دیا گیا ہے کہ طلاق واقع ہونے کے لیے قرآنی احکامات کے مطابق تحکیم کے مرحلہ سے گذرنا ضروری ہے اور یہ کہ شقاق کے بغیر طلاق دینے کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور شقاق کے سلسلے میں قرآن نے جو ہدایت دی ہے ان کی تعمیل ضروری ہے۔ شمیم آرا کیس کے فیصلے نے اور ممبئی ہائی کورٹ کے اس فیصلے نے بڑی عجیب صورتحال پیدا کر دی ہے کہ شریعت کی رو

سے عورت جس کو طلاق دی گئی چاہے تحکیم کا طریقہ کار اختیار کیا گیا ہو یا نہ ہو وہ بیوی نہیں رہی۔ مگر ان فیصلوں کی رو سے طلاق واقع نہیں ہوگی اور وہ عورت اب بھی بیوی ہے اور کئی کیسس ایسے ہیں جن میں یہ عورتیں جو شرعاً مطلقہ ہیں عدالتوں کے احکامات کے تحت، بحیثیت بیوی، نفقہ حاصل کر رہی ہیں، اس صورتحال پر غور کر کے علمائے کرام یہ رہبری فرمائیں کہ شقاق کے تعلق سے قرآن کے احکامات کی پابندی کا طلاق سے کیوں تعلق نہیں ہے اور کیوں طلاق دینے سے پہلے قرآن کے مقرر کیئے ہوئے اس ضابطے کی تکمیل ضروری نہیں ہے، تاکہ اس تعلق سے مدلل طریقہ پر شریعت کے موقف کو پیش کیا جاسکے۔

☆☆

خراج عقیدت

جلالۃ العلم، وقار العلماء

مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڈکودرویؒ

● مولانا عبدالرشید ندوی

عظیم شخصیات کا تعارف اوران کی بافیض زندگی کی ورق گردانی مستحسن وممدوح ہی نہیں، بلکہ مبارک ونیک عمل بھی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کلام مقدس میں انبیاء کرام اور اپنے دیگر مقرب وبرگزیدہ بندوں کا تعارف جابجا کروایا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بقول پورا قرآن اخلاق نبوی کا مکمل تعارف نامہ ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے بھی اپنی لسان صدق سے مختلف افراد، قبائل اور بلاد کا تعارف، حسب ضرورت انکے کارہائے خیر کی تحسین وتکریم فرما کر لوگوں کو ان کی اتباع کرنے اور ان سے تعلق بنائے رکھنے کی تلقین فرمائی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے "**انا بن عبدالمطلب، انا افصح العرب اورانا سید ولد آدم**" جیسے اپنا ہی تعارفی خاکہ پیش فرما کر قدردانوں کو قدردانی کے آداب اور عاشقان زار کو عشق حقیقی کے راز سمجھائے ہیں۔ کسی کو 'اصدق' کسی کو 'اتقا' کسی کو 'اقرأ' اور کسی کو 'اعلم' کہا جانا اس بات کی بین دلیل ہے۔ کتب احادیث کے ابواب المناقب، حیاۃ الصحابہؓ پر لکھے جانے والے طویل سلسلے، طبقات وکتب رجال کے وقیع ذخیرے، وقائع، تاریخ اور اخبار کے وقیع اثاثے، اسلاف کرام کی سوانح کے لامتناہی نافع خاکے اور مردان حق آگاہ کی سیرت کو اجاگر کرنے والے اخبارات ورسائل کے تراشے اور خصوصی

شمارے، سب کے سب اس بات کے شاہد ہیں کہ کسی بھی بافیض زندگی کا تعارف کس قدر اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ وہ دوسروں کے لئے منارۂ نور ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کے قابل تقلید اعمال کا اظہار بجا ہے، کیونکہ دوسری بے شمار زندگیاں اس کی پیروی کر کے منزل مقصود پاسکتی ہیں، ان کے علمی مقام کا بیان ممدوح ہے کیونکہ لوگ ان کی علمی شخصیت سے مستفید ہوسکتے ہیں، ان کے پاکیزہ کردار کو اجاگر کرنا اچھا ہے، کیونکہ اصحاب شوق ان کے دامن سے وابستہ ہو کر سعی نیک میں مصروف ہوسکتے ہیں۔ ان کے علمی اثاثے کا ذکر مقصود ہے، کیونکہ ضرورت مند افراد اس کی جانب رجوع کر سکتے ہیں، ان کی دینی خدمات، امتیازات اور تفردات کو ضبط تحریر میں لانا وقت کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ دوسروں کے لئے سنگ میل اور نشان راہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

زیر نظر تحریر ایسے ہی بلند و بالا اہداف تک رسائی کے لئے ایک شاگرد کی ادنیٰ کوشش ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے استاذ و مربی کی بامقصد حیات کے چند مفید گوشے، غایت احتیاط کے ساتھ عمل کے متوالے، حوصلہ مند نوجوانوں کی نذر کرنا چاہتا ہے، اس دعا کے ساتھ کہ تعارف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تعریف کے میدان کی جانب قدم بڑھنے نہ پائے۔

حسن ابتدا:

چھوٹوں کو آگے بڑھانا سنت نبویہ و سنت الٰہیہ ہے، ترمذی شریف، ابواب المناقب کی روایت ہے:

”عن انس بن مالک رضی الله تعالیٰ عنه قال، قال رسول الله ﷺ لابی بن کعب ان الله امرنی ان اقرا علیک لم یکن الذین کفروا، قال وسمانی قال نعم فبکیٰ، هذا حدیث حسن صحیح.“

اسی سنت کی ترویج کے لئے اسلاف ہر زمانہ میں ذرہ نوازی اور خوردہ افزائی فرماتے رہے ہیں، تاکہ بڑوں کی موجودگی میں چھوٹے تیار ہوجائیں، تاکہ بڑوں کے اوصاف

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

چھوٹوں میں منتقل ہوجائیں اور افراد سازی کا یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری وساری رہے۔ حضرت الاستاذ نے بھی جب مجھے تعارفی کلمات لکھنے کا حکم فرمایا تو میں دریائے حیرت میں غرقاب ہوگیا کہ تعارف تو بڑے چھوٹوں کا کرواتے ہیں، کیونکہ وہ بحیثیت مربی انہیں خوب پہچانتے ہوتے ہیں، یہ الٹا کام کیسے ہوسکے گا؟ میں نے تو انہیں ابھی تک کما حقہ پہچانا بھی نہیں ہے اور اگر الفاظ ان کے ظاہر کی تصویر کشی کر بھی لیں تو ان کے باطنی احوال اور قلبی کیفیات کی منظر کشی کون کرے گا؟ بقول شاعر:

گر مصور صورت آن دل براں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش را کشاں باید کشید؟

تاہم بقول عربی مثل ”**تعرف الشجر بثمره**“ میں بھی اگر اس شجرۂ طوبیٰ کے ثمر ہونے کے باعث ان کا تعارف ہو! تو کیا حرج ہے۔ بحیثیت پھل کے اس باغبان چمن کی چمن بندی کی داستان بیان کردینے میں، جو پانی نہیں پسینے سے اور کھاد سے نہیں خون سینچنے کے عادی رہے ہیں۔

جب سوانحی خاکہ میں رنگ بھرنے اور ذیلی عناوین کی تفصیل معلوم کرنے کی نیت سے میں نے حضرت سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: ’یہ تحریر پڑھ لو، یہی میری مکمل سوانح عمری ہے، احقر نے بوجھ ہلکا ہوجانے کے احساس کے ساتھ تحریر کو ہاتھ میں لے کر پڑھنا شروع کیا تو، اس کے ایک ایک حرف نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ افکار و نظریات جو ذہن میں پہلے سے قائم تھے تہہ و بالا ہوتے نظر آئے۔

’مکمل سوانح عمری یہ ہے کہ مشت خاک یا قطرۂ ناپاک سے پیدا ہوا ہوں، مرنے کے بعد سڑ گل کر کھاد، کیڑوں کی غذا، خاک کے ذرات، ہوا کا غبار بننے والا ہوں، اب تک زندگی کا اکثر حصہ غفلت میں گزرا، بقیہ ایام کی نسبت کچھ نہیں جانتا، خاتمہ بالخیر کی آرزو رکھتا ہوں، اپنے گناہوں کو دیکھتا ہوں تو ڈرتا ہوں، خدا تعالیٰ کے رحم وفضل وکرم ومغفرت

وستاری پر نظر کرتا ہوں تو امید و مسرت سے لبریز ہو کر بہشت بریں کو اپنی جاگیر یقین کرتا ہوں، اگر خدانخواستہ مجھ کو میری غفلتوں اور گناہوں کی سزا دی گئی تو چوپائے اور حشرات الارض مجھ سے اچھے ہیں، لیکن اگر مجھ سے عفو و عطا کا سلوک ہوا اور جنت مل گئی تو میں دنیا کے ہزار ہا بادشاہوں سے زیادہ ذی عزت اور بلند مرتبہ ہوں، میرے مورث اعلیٰ کا نام آدم تھا جس کو فرشتے سجدہ کرتے تھے اور میرے روحانی والد کا نام حضرت محمد ﷺ ہے جو خیر البشر، افضل الرسل، خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین ہیں، باقی اس سے زیادہ تفصیل کے لئے گزارش ہے کہ:

ہیچم و ہیچ را نہ خرد ہیچ کس ہیچ
اے روزگار در گزار از چوں و چند ما

(میں معدوم ہوں اور کوئی شخص بھی معدوم کو کسی قیمت پر نہیں خرید سکتا، زمانے ہم سے سوال مت کر کہ کیسے ہوا، اور کتنا وقت گزرا؟)

جائے پیدائش کا تاریخی جائزہ:

بروص، باربد، ٹکری، کمبایت، بھاؤنگر یہ وہ نام ہیں جن سے قدیم عرب مؤرخین بھی بخوبی واقف ہیں اور جن ناموں کو وہ اشاعت اسلام کی تاریخ میں بکثرت استعمال کرتے رہے ہیں، یوں تو ہندوستان کی تاریخ میں گجرات کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں آنحضور ﷺ کے صحبت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذریعہ براہ راست اسلام پہنچا، جس میں خارجی و عجمی اثرات کی آمیزش نہیں تھی، تاہم گجرات میں بھروچ، کمبایت اور بھاؤنگر وغیرہ کو یہ اعجاز حاصل ہے کہ انہیں کے ساحل پر عربوں کے قافلے لنگر انداز ہوئے اور انہیں کی سرزمین کو عربوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ سکونت، حکومت اور اشاعت علم کے مقدس عمل کے لئے پسند فرمایا، ان علاقوں میں پائے جانے والے بے شمار آثار قدیمہ نیز اس علاقے

کی مہمان نوازی، حق گوئی، علم دوستی، سخاوت، شجاعت، ایثار، غیرت، اشاعت علم میں جانفشانی، تبلیغ دین کا بے مثال جذبہ اور دینی حمیت جیسے عربوں سے ملتے جلتے اوصاف اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عربوں سے اس علاقہ کا رشتہ ناتا نہ صرف ہندوستان، خود گجرات کے دیگر علاقوں کے مقابلہ میں باوجود تاریخی طور پر محفوظ و مستحکم نہ ہونے کے قدیم و مسلسل ہے۔ اس سلسلے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ رقم طراز ہیں کہ:

’میں گجراتی مسلمانوں کے عربوں سے نسلاً متعلق ہونے کی دو دلیلیں دے سکتا ہوں، ایک ان کے دسترخوان کی وسعت میں صحابہؓ کی سخاوت کی بو نظر آتی ہے، دوسرا ان کی تجارت اور اس غرض سے وہ جہاں بھی پہنچے وہاں دین کی اشاعت یہ بھی صحابہ کرامؓ میں پائی جانے والی خصوصیت ہے یہی ان کا مشن تھا‘۔

حضرت الاستاذ مولانا مفتی اسماعیل صاحب کا مولد و مسکن ’بھڑ کودرا‘ بھی بحیرۂ کھمبات کے ساحل پر واقع ہونے کے ناطے اس اعجاز کا یقیناً حامل ہے، کیونکہ یہی بحیرہ، آگے بحر عرب سے مل کر اپنا تعلق جنوب مشرقی جزیرۃ العرب سے قائم کر لیتا ہے، جہاں سے جہاز بہت ہی قلیل وقت میں اس زمانہ کی مشہور تجارتی منڈی یعنی سواحل عمان یا بندرگاہ یمن پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ بھڑکودارا کے قدیم آثار، انساب میں اوپر کے مخصوص نام نیز دیگر علامات اسی بات کی غماز ہیں کہ تحصیل جمبوسر کے قصبہ کاوی وٹنکاری بندر کی طرح امکان ہے، یہاں بھی خیر القرون کے تربیت یافتہ دعاۃ و مصلحین کا کوئی قافلہ مشعل رشد و ہدایت لے کر گزرا ہو جس نے اس کی ظلمت کو کافور کر کے اس پر ایمان و یقین کی ضیاپاشیاں کی ہوں اور یہاں وہ تخم خیر بویا ہو جو بعد کے زمانوں میں حسب ضرورت علاقے کو پھل دیتا رہے، حضرت مفتی صاحب کا وجود مسعود بھی یقیناً ہمارے اس مدعیٰ کی دلیل اور اللہ کی قابل قدر غنیمت نعمت جلیل ہے۔

یہاں کے دینی مزاج اور علمی مذاق رکھنے والے دیہات میں ۱۷؍ربیع الاول ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۷؍جنوری ۱۹۴۹ء بروز پیر مولانا مفتی اسماعیل صاحبؒ کی ولادت ہوئی۔ سن شعور کو

پہنچتے ہی حضرت کے والد محترم نے جو گاؤں کے اکثر دینی و تعلیمی اداروں کے ذمہ دار اور متفکر و مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ بارعب و باوقار شخصیت کے مالک تھے انہیں دینی تعلیم کے لئے مکتب بھیجا، جہاں حضرت مولانا موسیٰ کرماڈی و حضرت مولانا یعقوب قاسمی دامت برکاتہم جیسے اکابر اساتذۂ کرام سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

جامعہ آنند:

اس زمانے میں جامعہ آنند اس کے خداترس، دوربیں، مدبر، امانتدار، نڈر، اوالوالعزم، پیہم سعی، محکم عمل اور جامعہ کی ترقی میں جان و دل کی بازی لگا دینے والے مہتمم حضرت مولانا غلام محمد نوراللہ مرقدہ کی مخلصانہ جدوجہد اور مؤمنانہ فراست کے باعث جامعات گجرات کے سر کا تاج یا ہار کے درمیانی موتی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ان دنوں طلبہ جن گنے چنے جامعات کے لئے رخت سفر باندھتے تھے جامعہ آنند ان میں سرفہرست تھا۔ مولانا غلام محمد جیسے مرد مجاہد نے اپنی مجاہدانہ کوششوں کے ذریعہ جہاں جامعہ آنند کی تعلیم کو عربی چہارم سے دورۂ حدیث تک پہنچا دیا، دارقدیم میں تیسری منزل تعمیر کروائی اور جامعہ کو ایک وسیع وعریض قطعۂ اراضی میں منتقل کر کے مکمل جامعہ بنادیا، وہیں ہندوستان بھر کا دورہ کر کے مولانا اسماعیل سنبھلی، مولانا عبدالجبار اعظمیؒ، مولانا معاذ الاسلام جیسے دسیوں جبال علم اور اساطین فن سے جامعہ کو بھر دیا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب کی طرح جگمگانے والی ان علمی شمعوں پر علم کے پروانے پروانہ وار گرنے لگے اور اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اقتباس نور کر کے ظلمت کدۂ گجرات کو خصوصاً اور پورے ہندوستان کو عموماً منور کرنے لگے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کا جائزہ لینے والا انصاف پسند مؤرخ جامعہ آنند کی وسیع علمی خدمات کا وقیع الفاظ میں تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ خصوصاً اس بطل عظیم کا، جس نے اس وقت کے ضلع کھیڑا میں شدھی سنگٹھن کے نام سے ارتداد کی دعوت دینے والی

تنظیم کا جم کر مقابلہ کر کے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا انتظام کیا اور جس نے جمعیۃ علماء ہند کے منصوبوں کو اپنی پروزن شخصیت کے سہارے پروان چڑھایا، ضرورت ہے آج پھر ضلع آنند و کھیڑا میں ارتداد کے دہانے کھڑے بے شمار مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لئے اس مرد میدان کی خدمتوں کو یاد کر کے ان کی تقلید و اتباع میں کسی اچھے خلف کو آگے بڑھ کے میدان عمل سے گوئے توفیق و سعادت اٹھا لینے کی۔

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ ایم
کسی بمیدان برنمی آید سواراں را چہ شد

حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ حضرت غلام محمد صاحب مرحوم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

’انہیں جامعہ آنند کی فکر بے انتہا دامن گیر تھی، مرض الوفات میں چند احباب کے ساتھ جب میں بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوا تو رخصتی کے وقت مجھے کہا، اسماعیل اب زندگی کا بھروسہ نہیں، میرے لئے اور کوئی تو نہیں بس ایک فکر سوہان روح بنی ہوئی ہے کہ جامعہ کو کون سنبھالے گا؟ تم غور و فکر کر کے مادر علمی کو سہارا دینے کی نیت سے چند سال قربان کر دو اور یہاں آجاؤ تو میں یہ امانت تمہیں حوالے کر کے سکون کے ساتھ اپنے اللہ سے جاملوں۔‘

جامعہ آنند کے ذمہ داروں نے رواں سال میں حضرت مفتی صاحب کے سامنے جامعہ کی رکنیت قبول کرنے کی درخواست رکھی، حضرت نے باوجود ضعف و مرض کے شاید مرحوم مہتمم صاحب کی مذکورہ بالا خواہش کی تکمیل کی خاطر اسے قبول کر لیا۔ دیر آید درست آید۔ **لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا.**

جامعہ آنند کے اساتذہ ومشائخ:

طلبہ کی شخصیت سازی میں اساتذۂ کرام کا بنیادی رول ہوتا ہے، علم، عمل، صلاح،

تقویٰ، یقین، جرأت، غیرت، استقامت، اعلیٰ ظرفی، بلند ہمتی جیسی صفات طلبہ میں اساتذۂ کرام ہی سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں۔ ان کے دل کا یقین طلبہ میں یقین کو اوران کا ظن، ظن کو منتقل کرتا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ''**اطلبوا العلم قبل الظانین**''
خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحبؒ کو ابتدا ہی سے جن اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا وہ زہدوورع کے پیکر، تحقیق وجستجو کے خوگر، محنت وجانفشانی کے دلدادہ اور علم وفن کے امام وپیشوا تھے۔ حضرت مفتی صاحب جب بھی دوران درس یا دوران گفتگو اپنے اساتذہ کا ذکر فرماتے تو خاص طور پر حضرت مولانا احمد جو جارا گودھرویؒ کی فن نحو وصرف کی محنت، جداگانہ اصول تربیت، مخصوص انداز تعلیم، بے پایاں شفقت، کمزور طالب علم کی غلطی پر ذہین کی گرفت، گھول کر پلانے کی عادت اور رعب ووقار کو ضرور بیان کرتے۔ حضرت مولانا اسماعیل مجادریؒ کی انتھک محنت، بزرگانہ شفقت، خوردہ نوازی، انتظامی صلاحیت، اخلاص، جامعہ آنند کی ترقی کے شہ شریک اور علوم پر گہری نظر رکھنے والے جید عالم دین کی حیثیت سے یاد فرماتے، حضرت مولانا معاذ الاسلام سنبھلی عربیت کے شہ سوار، عبارت خوانی میں معمولی غلطی نہ چلانے والے، علم فرائض کے ماہر، حدیث وتفسیر کا خاص ذوق رکھنے والے اور کامیاب استاذ کی شکل میں عقیدت کا اظہار کرتے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا اسماعیل سنبھلیؒ کے تبحر علمی، درسی امتیازات، وسعت معلومات، حدیث بالخصوص ابواب بخاری شریف کی شرح کا البیلا انداز اور زہد وتقویٰ کا ذکر کرکے استاذ بخاری کی عظمت واحترام کا اظہار فرماتے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب گاڈی کی سادگی، فارسی کی امامت، جامعہ کی ترقی کی لگن اور مدۃ العمر جامعہ کی خدمت کو یاد کرکے سراہتے، اسی طرح آپ حضرت مولانا محمد اکرم بخاری صاحب، حضرت مولانا خیر الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا عبدالمجید گودھری صاحب، حضرت مولانا ابراہیم اندوروی صاحب ودیگر اساتذۂ کرام کا ذکر بھی وقیع الفاظ میں فرماکر محبت وعقیدت کا اظہار فرماتے۔ اللہ تعالیٰ اساتذہ اور اساتذۃ الاساتذہ کے زرین

سلسلے کو مبارک فرمائے اور تمام کی روحانی وعلمی خدمات کو قبول فرماکر سب کو اشاعت علم کے مبارک فریضے کی ادائیگی پر اپنی شایان شان بہترین بدلہ عنایت فرمائے۔ آمین۔

امّ المدارس دارالعلوم دیوبند میں:

جامعہ آنند سے اعلیٰ درجہ کی کامیابی کے بعد اساتذۂ کرام کے ایماء اور اولیاء کی اجازت وحوصلہ افزائی پر حضرت مفتی اسماعیل صاحب نے اسلاف کی یادگار سے وابستہ ہونے، نامور محققین سے کسب فیض کرنے اور اجل محدثین ومفسرین وفقہا سے مستفید ہونے کی غرض سے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کا قصد کیا اور مکمل تین سال قیام فرماکر موقوف علیہ، دورۂ حدیث اور افتاء کا نصاب مکمل کرکے اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحبؒ، حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاری صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ جیسے آسمان علم کے آفتاب وماہتاب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے اور فتویٰ نویسی کی مشق اپنے دوسرے پیرومرشد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نوراللہ مرقدہ کے پاس کی۔ خدارسیدہ شیوخ کی نظر اور مخلص اساتذہ کی کیمیا اثر صحبت سے جو نتیجہ مرتب ہونا تھا ہوا اور صوبہ گجرات میں فقہ وحدیث کی نمایاں خدمت انجام دینے والی شخصیات میں ایک اور نام کا اضافہ ہوگیا۔ **وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**. این سعادت بزور بازو نیست۔

جامعہ آنند میں بحیثیت استاذ:

جامعہ آنند کے مدبر رہنما اور مخلص پیشوا کی بیدار روح اور عقابی نظر سے جامعہ کا یہ قابل فرزند کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟ حضرت کے قیام دیوبند کے تیسرے سال میر کارواں،

پیرِ مغاں حضرت مولانا غلام محمد صاحبؒ نے اپنے معیار پر فٹ اترنے والے اس جوہر قابل پر پسندیدگی کی مہر ثبت کرتے ہوئے دیوبند کے ایک سفر میں اپنے ابن قدیم کو افتاء سے فراغت پر مادر علمی جامعہ آنند کی خدمت کا حکم صادر فرمادیا۔ مادر علمی کی خدمت کو سعادت اور بزرگوں کے انتخاب اور حکم کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے رمضان المبارک کے بعد بحیثیت استاذ و معلم کے جامعہ آنند کا رخت سفر باندھا۔ پہلے ہی سال باوجود ابتداء سے پڑھانے کی خواہش کے، اساتذہ و منتظمین کے حکم کو بالائے ادب گردانتے ہوئے ہدایہ اولین تک کی تعلیمی خدمت کو قبول فرمایا۔

انداز تدریس:

جامعہ آنند میں حضرت مفتی صاحب کی تدریسی عہد جس کا راقم الحروف شاہد ہے بلا تکلف و بلا مبالغہ ایک زرین عہد اور جامعہ کی تاریخ کا شاہکار روشن باب تھا۔ جو بھی کتاب آپ کے ذمہ ہوتی اس کا سبق قدرتی رعب و وقار کے باعث معدودے چند معذور طلبہ کو چھوڑ کر پوری جماعت کو سال بھر یاد ہوتا، آموختہ اور ہوم ورک سے غفلت کا کوئی طالب علم تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، پڑھانے کا محقق اور البیلا انداز، کتاب کے بجائے فن پڑھانے کی عادت، ذہین طلبہ کی ایک ایک حرکت پر نظر اور ایک ایک کوتاہی کی اصلاح، جدھر سے گزر جائے سکون و وقار چھا جائے، رات گئے تک کمرے میں روشنی اور مطالعہ کا اہتمام، مسجد، اجلاس، انجمن، امتحان اور طلبہ کے جمع ہونے کی دیگر جگہوں میں آپ کی موجودگی اطمینان کی ضامن اور آپ کی نگرانی حاضری کی کفیل، حفظ کرائے جانے والے قوانین و کتب قوی الحافظہ طلبہ کے حافظہ میں مدۃ العمر محفوظ، اسباق و اوقات کی بے مثال پابندی، افراد سازی کا خصوصی شوق، خوردہ نوازی کی عادت بلکہ قابل افراد کی ہمت افزائی و رہبری کا اہتمام، جامعہ کی تعلیمی و تربیتی ترقی میں ہمہ وقت کوشاں و متفکر اور سچ پوچھئے تو

آپ کے قیام آنند کے آخری سالوں میں جامعہ میں آپ کی حیثیت ہار کے درمیانی موتی کی طرح نمایاں و ممتاز تھی۔

دارالعلوم بھروچ کنتھاریہ میں:

دارالعلوم کنتھاریہ جو اپنی بھاری بھرکم خدمات، گوناگوں مصروفیات، جملہ جہتی پروگرام، متنوع مشروعات، وسیع تر اشاعتی کارنامے اور عظیمی تعلیمی تعمیری و تربیتی منصوبوں کے باعث ضلع بھروچ صوبہ گجرات کی ممتاز درسگاہ اور مرکزی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے خدا رسیدہ و ترسیدہ نائب مہتمم عارف باللہ حضرت مولانا علی کاویؒ نے ایک مجلس میں آنند میں حضرت مفتی صاحب کی ناسازیٔ طبع کی بات سنتے ہی موقع کو غنیمت جان کر دارالعلوم کنتھاریہ کی خدمت کی پیش کش کردی اور چند ہی لمحوں میں حضرت کا اپنے ادارے میں تقرر فرمالیا۔ ان کی دور بین نظر حضرت مفتی صاحب کی شخصیت میں ایک عربی کے استاذ کو نہیں دارالعلوم کے صدر مفتی، شیخ الجامعہ، ناظم تعلیمات، زبدۃ الفتاویٰ کے مؤلف کو بھی دیکھ رہی تھی اور وہ صرف ایک قابل استاذ ہی کا نہیں، ان تمام ہی عہدوں کے ذمہ دار کا تقرر کر رہے تھے۔ چنانچہ درسی خدمات کے ساتھ ساتھ اسی سال حضرت مفتی صاحب کو فتاویٰ نویسی کی خدمت بھی حوالے کی گئی اور دو چار سال کا قلیل عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ توحید کے علم بردار، توکل کے پہاڑ، مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا اسماعیل صاحب منوبری نے حضرت مفتی صاحب کو بلا کر باقاعدہ تخصص فی الافتاء کے شعبہ کے افتتاح کا حکم فرمایا اور آپ کو اسی سال صدر مفتی کے منصب جلیل پر بھی فائز فرمایا۔ آپ کی مثالی جانفشانی، کامل تندہی، بلند نگاہی اور عرق ریزی نے جو تادم تحریر جاری و ساری ہے شعبۂ تخصص فی الافتاء کو بہت جلد کامیابی کے اعلیٰ منازل تک پہنچا دیا اور امت بہت ہی قلیل وقت میں اس بار آور شجر کے ثمر ہائے بے بدل سے متمتع ہونے لگی، زیر نظر کتاب ''زبدۃ الفتاویٰ'' بھی اسی شعبہ کی کاوش

ہے جو ہزار ہا صفحات کی ورق گردانی اور صدہا کتب کو کھنگال کر طالبین ومستفدین کے سامنے اس کے نام ہی کی طرح بطور مکھن یا عطر پیش کی جا رہی ہے۔

دارالعلوم بھروچ کنتھاریہ میں آپ نے افتاء کی خدمت کے ساتھ ساتھ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا شرف پانے والی کتاب جامع امام بخاری کا درس بھی دیا جو تادم تحریر اب تقریباً چودہ سال سے گجرات کی مثالی درسگاہ جامعہ علوم القرآن، جمبوسر میں جاری ہے اور اب تک سینکڑوں طلبہ آپ سے سند واجازت حدیث حاصل کر کے خدمت حدیث کے اہم وممتاز منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ المختصر دارالعلوم بھروچ کنتھاریہ جیسی مرکزی درسگاہ کے مرکزی تقاضوں نے آپ کی صلاحیت کو پروان چڑھایا، آپ کے تفقہ کو جلا بخشی، آپ کی فکری پرواز کو نئے افق فراہم کئے اور نئے نئے مطالبوں نے وسعت مطالعہ کا خوگر بنا کر کے آپ میں ایک ایسی شخصیت پیدا کر دی کہ فقہ وفتاویٰ کے باب میں اگر علماء صوبہ گجرات کو آپ کی رائے کا انتظار رہنے لگا تو عوام کو بھی آپ ہی کے جواب پر اطمینان واعتماد ہونے لگا۔

فتاویٰ نویسی، خصوصیات وامتیازات:

سنت خداوندی ہے کہ اخلاص واستقامت کے ساتھ کی گئی محنت کو وہ ضائع نہیں کرتا، بلکہ رب شکورا سے پال کر پروان چڑھاتے ہیں، حضرت مفتی صاحب کی جسم وجاں جلانے والی محنت ہی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے فتاویٰ میں قوت پیدا فرمائی اور عوام وخواص میں مقبولیت ڈال دی، اس اعتماد وقبولیت کا راز حضرت کی وہ عادت ہے جو کسی بھی فقیہ اور مفتی کے لئے بنیادی شرط اور لابدی امر ہے اور وہ احوال زمانہ سے مکمل آگہی اور رفتار ایام کی نبض شناسی، اسی امتیاز نے آپ کے فتاویٰ کو لوگوں کے احوال سے ہم آہنگ کیا اور اسی عنصر نے عوام وخواص کے قلوب کو اپنی طرف کھینچا۔ لوگوں نے اس کے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی اور اس کی مدد سے اپنے کو شریعت کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

مثال کے طور پر ملٹی لیول مارکیٹنگ یا جدید نظام معیشت نے کمپنیوں کے شیئر ''حصص'' کی تجارت اور اس سے متعلق چھوٹے بڑے بے شمار مسائل کھڑے کر دیے۔ حضرت مفتی صاحب نے روزی میں حلت وحرمت پیدا کرنے والے اس اہم مسئلہ کی جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائی اور شیئر کے مسائل کے نام کا ایک مستقل رسالہ گجراتی زبان میں مرتب کر کے گجراتی مسلمانوں کی مکمل رہبری فرمائی اور جملہ مسائل کو یکجا کر کے اس تجارت میں حصہ لینے والوں کے لئے آسانی پیدا فرما دی۔ دیگر ایسے بے شمار مسائل ہیں جس کی جانب حضرت مفتی صاحب نے بطور خاص توجہ کی، سود کا مسئلہ، تقسیم میراث اور عورتوں کی میراث سے محرومی کا مسئلہ، نماز میں معذورین کے لئے کرسی کے استعمال کی تفصیل وغیرہ۔

انداز فتویٰ نویسی:

حضرت مفتی اسماعیل صاحب نے فتویٰ نویسی کا انداز بتاتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ جب کوئی اہم، کثیر الجہات اور جدید مسئلہ سامنے آتا ہے تو اولاً اس کے اہم نکات کو الگ کرتا ہوں۔ ثانیاً قدیم وجدید مراجع سے حتی المقدور رجوع کر کے اس کے دلائل اور حل کو جمع کرتا ہوں، ثالثاً مکمل اطمینان ہو جانے پر جواب مرتب کرتا ہوں، رابعاً حسب ضرورت کبار مفتیان سے بذریعہ خط، ٹیلی فون یا بالمشافہہ مراجعت کرتا ہوں، اپنی تحقیق، مراجع اور دلائل ان کے سامنے رکھ ان کی توثیق حاصل کرتا ہوں اور انتہائی اہم ونازک مسائل میں مزید اطمینان کے لئے جواب ارسال کرنے یا کتابچہ شائع کرنے سے پہلے ملک کے دیگر اداروں اور مفتیان کرام بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے بھی رجوع کر لیتا ہوں، جب ان کی جانب سے بھی تصدیق وتوثیق حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دفتر فتاویٰ میں نقل کروا کر مستفتی کو نیز دیگر ضروری مقامات تک روانہ کرتا ہوں، بصورت دیگر پیش آمدہ مسئلہ پر اپنی تحقیق جاری رکھتا ہوں اور عجلت وجلد بازی میں کوئی بھی فتویٰ صادر کرنے سے

مکمل گریز کرتا ہوں، تسامح پر چاہے اس کی نشاندہی میرے اپنے شاگرد نے کی ہو بلا لیت ولعل، شکریہ کے ساتھ رجوع کرنے میں ذرہ برابر خفت محسوس نہیں کرتا ہوں۔

مقامی مفتیان میں آپ بطور خاص صاحب فتاویٰ رحیمیہ حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ سے ان کی حیات تک رجوع فرماتے رہے، خود حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ بھی آپ کی بذات خود حاضری پر بے انتہا مسرور ہوتے اور مسئلہ پر قائم کردہ آپ کی وقیع رائے اور قوی دلائل کو سن کر تشجیعی کلمات کے ساتھ ساتھ دعائیہ جملوں سے نوازتے اور آپ کی تحریر یا فیصلہ پر اطمینان کا اظہار فرما کر تصدیقی دستخط ثبت فرماتے اور اگر کوئی مسئلہ اپنے شاگرد یا معین مفتی کو لے کر بھیجتے تو ان کے سامنے بھی حضرت مفتی علیہ الرحمۃ حضرت کی علمی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف فرماتے اور تحقیق وجستجو کی عادت کو سراہتے۔ حضرت مفتی لاجپوریؒ کے وصال کے بعد اہم مسائل میں اب حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم سے رجوع کرتے ہیں، حضرت اقدس مفتی خانپوری دامت برکاتہم بھی آپ کے علمی بلند پایہ اور تحقیق وکاوش کا اعتراف فرما کر قدردانی کا اظہار فرماتے۔ بیرون گجرات کے فقہاء ومفتیان میں آپ کو سب سے زیادہ اعتماد وتعلق حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نوراللہ مرقدہ سے تھا۔ حضرت قاضی صاحبؒ بھی آپ کے مداح وقدردان تھے، یہ تعلق فقہ اکیڈمی کے اجلاس میں شرکت، مختلف مسائل میں تبادلۂ خیال اور قاضی صاحب کی دیگر سرگرمیوں میں اتفاق وتعاون کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک رہا۔

مجلس الفقہ الاسلامی گجرات:

اسلامی فقہ اکیڈمی ہند کے بمقام عمرآباد، صوبہ تمل ناڈو کے ایک فقہی سیمینار کے سفر میں ۳۰ر دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق ۱۶ر رجب المرجب ۱۴۱۴ھ میں حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی، مولانا یعقوب شیخ دیولوی، مولانا یعقوب قاسمی دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی احمد

خانپوری دامت برکاتہم، مفتی احمد دیولوی دامت برکاتہم اور حضرت مفتی صاحب وغیرہم کی موجودگی میں اس موضوع پر مذاکرہ وگفتگو ہوئی کہ صوبہ گجرات میں کوئی ایسی تنظیم ہونی چاہئے جس کے زیر انتظام تمام مفتیان وعلماء مدارس گجرات جمع ہو کر فقہی مسائل کے متعلق اجتماعی غور وفکر فرمائیں اور اس کام کے لئے باتفاق رائے حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی دامت برکاتہم کو کنوینر بنانے کی تجویز تحریر کی گئی۔ اس کے بعد مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ نے اپنے وطن کاپودرا میں ۲۲ر اپریل ۱۹۹۴ء میں تمام حضرات ذمہ داران مدارس عربیہ گجرات وحضراتِ مفتیان وعلماء کرام کو دعوت دے کر ایک تاریخی جلسہ کا انعقاد فرمایا اور اس میں (مجلس الفقہ الاسلامی گجرات) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی اور تمام نے باتفاق رائے اس کی نظامت کے لئے حضرت مفتی صاحب کا انتخاب فرمایا۔

حضرت مفتی اسماعیل صاحب ہی کے بقول حضرت نے اس مجلس پر اپنی صحت، قوت، صلاحیت، فکر، وقت اور تجربات کا وافر حصہ خرچ کیا اور حسب ضرورت قرب وجوار اور دور دراز کے اسفار فرما کر امت مسلمہ کے مسائل کو حل کرنے میں خاص دلچسپی لی، اس معاملہ میں سفر کی سہولیات نیز دیگر اسباب مہیا کرنے میں حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی دامت برکاتہم کا خاص حصہ رہا، یہ مبارک سلسلہ ایک معتد بہ مدت تک سرگرمی کے ساتھ جاری رہا اور حضرت مفتی صاحب کے آنند کے سابق تجربہ کی بنیاد پر بے انتہا مفید ومثمر رہا جس میں بے شمار فقہی ودینی مسائل کی تحقیق وتفتیش کے ساتھ ساتھ بے انتہا نازک وحساس امور میں بھی مسلمانوں کی رہبری فرماتے رہے۔ اسی میں ایک حکومت کی جانب سے عصری اسکولوں میں وندے ماترم کے لازماً پڑھنے کا سرکلر تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے اسے غیر ایمانی وغیر اسلامی قرار دے کر مسلمانوں کو پڑھنے سے منع کیا اور اکابر علماء ومفتیان کے اتفاق کے ساتھ مجلس الفقہ الاسلامی کے پلیٹ فارم سے فتویٰ شائع کر کے اس شرکیہ عمل سے امت کو روکنے کی سعی نیک فرمائی۔

فقہ اکیڈمی اور ادارہ مباحث مفقیہ:

ادارۃ المباحث الفقہیہ کی متعدد مجالس میں بھی آپؒ نے شرکت کی اور اپنے مخصوص تحقیقی ذوق کی عکاسی کرنے والے مقالے پیش کئے۔ اسی طرح حضرت قاضی مجاہدالاسلامؒ کی وفات تک فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں بھی شرکت فرماتے تھے، جب کہ سوال ناموں کے جواب ارسال کرنے کا معمول اس کے بعد بھی باقی تھا۔ فقہ اکیڈمی کی جانب سے جب موسوعہ فقہیہ کویت کے اردو ترجمہ کا منصوبہ بنایا گیا تو اس کے اوّلین ترجمہ نگاروں میں آپؒ شامل تھے اور ایک جلد کے ترجمہ کی ذمہ داری بھی آپ نے نبھائی ہے۔

رؤیت ہلال کمیٹی:

دارالعلوم کنتھاریہ میں ۱۹۶۹ء میں تعلیمی کام کے افتتاح کے بعد سے ضلع بھروچ کے لوگوں کا رجوع رمضان اور عیدین کے چاند کے مواقع پر ہمیشہ دارلعلوم کے علماء کی طرف رہا اور دارالعلوم اس وقت سے ہمیشہ رویت کی تحقیق وفیصلہ کی ذمہ داری نبھاتا رہا، دارالعلوم میں حضرت مفتی صاحب کی آمد کے بعد اس سلسلہ میں ۱۹۸۰ء سے گواہوں کو بلانا ان سے گواہی لینا، فیصلہ لکھنا، پورے ضلع میں پرچوں کے ذریعہ اس کی اطلاع کرنا وغیرہ وغیرہ امور دارالعلوم کے اکابر کی نگرانی میں حضرت مفتی صاحب انجام دیتے رہے۔ فون وغیرہ کے شیوع ورواج کے بعد چاند کے معاملہ میں پیش آنے والے انتشار کے پیش نظر ۱۰/اپریل ۱۹۸۳ء میں امیر شریعت گجرات حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری نوراللہ مرقدہ کی صدارت میں جنوبی گجرات کے اضلاع سورت، بھروچ، بلساڑ کے لئے بمقام راندیر حضرات مفتیان وعلماء گجرات کے مشورہ سے ایک مرکزی چاند کمیٹی بنائی گئی، حضرت مفتی صاحب کو بھی اس کا رکن بنایا گیا، اس مرکزی کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے فیصلہ رویت کے سلسلہ میں محترم صدر کمیٹی حضرت مفتی صاحبؒ سے خط وکتابت اور روبرو ملاقات کے

ذریعہ ہمیشہ گہرا رابطہ رہا۔ حضرت مفتی صاحب کے فیصلہ پر عمل اور یہاں کے فیصلہ کی اطلاع اور حضرت مفتی صاحبؒ کو یہاں کے فیصلہ کی خبر ہونے پر گواہوں کے یا کتاب القاضی کے طلب فرمانے پر گواہوں کو یا کتاب القاضی کو بھیجنا یہ سب کارروائی حضرت مفتی صاحب ہی انجام دیتے رہے، جس کا کئی سالہ ریکارڈ آج بھی محفوظ ہے۔

اصلاحی تعلق:

حضرت مفتی صاحب کا بیعت واصلاح کا ابتدائی تعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاں رحمۃ اللہ سے قائم ہوا۔ آپ کے بعد اپنے استاذ اور حضرت شیخ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ سے رجوع فرمایا، گویا حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ آپ کے شیخ ثانی ہیں، بعدہ بلا مراجعت، حسب ضرورت حضرت مولانا قمرالزماں الہ آبادی دامت برکاتہم العالیہ سے استفادہ کرنے اور رمضان المبارک میں آپ کی مجالس میں شرکت فرمانے کا معمول رہا۔

آپ کو خصوصی تعلق اور قلبی لگاؤ حضرت مولانا علی صاحب کاوی نوراللہ مرقدہ سے بھی تھا۔ آپ ان کے خلاص، خوردہ نوازی، اخفاء حال، ادارہ کی ترقی کی لگن، افراد سازی، تقویٰ وطہارت، عبارت وریاضت، دور بینی ودور اندیشی، غیرت وخداری، تعلیم وتربیت، جانفشانی وجدوجہد اور دعا وانابت جیسے بے شمار صفات مع واقعات بیان کرکے ان کی وفات کو امت کے لئے عموماً اور علاقے کے لئے خصوصاً عظیم سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان بتاتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کو داعی کبیر، مربی جلیل، روح مرکز نظام الدین وسالار قافلہ دعوت وتبلیغ حضرت مولانا ابراہیم دیولوی دامت برکاتہم العالیہ سے بھی عقیدت وارادت کا خصوصی تعلق تھا۔ حضرت کی وطن موجودگی کے ایام میں حضرت مفتی صاحب کچھ اوقات بطور خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب کے ساتھ گزارنے کا اہتمام فرماتے اور خود حضرت مولانا ابراہیم صاحب بھی

حضرت مفتی صاحب سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ بارہا فوری حل طلب مسائل میں مفتی صاحب سے تبادلۂ خیالات فرماتے اور حضرت مفتی صاحب کی رائے کو وقیع بتاتے ہوئے تصویب وتحسین فرماتے۔ حضرت مفتی صاحب کا حضرت مولانا سلیمان کاپودرویؒ سے بھی خصوصی تعلق تھا، جو کاپودرا کے جید عالم دین تھے اور جنہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ شہر آنند میں ہاتھ کی کمائی پر گزارا، آپ مولانا سلیمانؒ کی علمیت، تقویٰ واحتیاط اور حکمت وفراست کے بھی بہت سارے واقعات سنا کر ان کا وقعت واحترام کے ساتھ تذکرہ فرماتے تھے۔

اداروں سے وابستگی:

وسیع حلقہ، اصابت رائے، بلند نگاہ، طویل تجربہ، دل نواز سخن، پرسوز جان، حکمت ودانائی، تعلق مع اللہ، پختہ علمی صلاحیت، حق وباطل کی معرفت، نفع وضرر کی پہچان، جرأت، فراست، حسن اخلاق یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل رجال کی اداروں کو تلاش اور جن کے مالک حضرات کی ہر زمانے میں نہ صرف اداروں میں امارت، خلافت اور قضاء جیسے امور میں بھی امت کو ضرورت رہی ہے، آپ کی بابرکت ذات اور پر تمکنت شخصیت سے استفادہ کرنے کی غرض سے گجرات وبیرون گجرات کے بے شمار اداروں نے آپ کا نام صدارت، سرپرستی یا شوریٰ کی رکنیت کے لئے منتخب فرمایا ہے اور وہ ادارے آپ کی رہبری وراہنمائی میں صحیح سمت اور کامیابی کی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ اس فیض سے آپ کا مادر وطن موضع بھڈکودرا بھی محروم نہیں بلکہ آپ اپنے والد مرحوم کے کارہائے خیر کو آگے بڑھاتے ہوئے وہاں کے جملہ امور میں بڑی باریک بینی اور دوراندیشی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں اور اسی غرض نیک کو لے کر بلاشدید عذر کے آپ ہر ہفتہ جمعرات کو وہاں پہنچنے کا بھی بلاناغہ اہتمام فرماتے تھے۔

مدارس کی تعلیم کے حوالے سے خصوصی مذاق:

آپ کا مدارس اسلامیہ کی تعلیم کے حوالے سے تقریباً وہ ہی مزاج ومذاق ہے جو

ہمارے جملہ پختہ کار اسلاف کرام کا تھا، آپ درسیات میں پختگی پیدا کرانے کے قائل اور زائد امور میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے خلاف تھے، آپ کی مضبوط اور واضح رائے تھی کہ درسیات پر گرفت سے خارجی امور ایسے ہی قابو میں آجاتے ہیں جیسے تنا پکڑنے سے شاخیں یا مرغی پکڑنے سے چوزے، کیونکہ درس نظامی جملہ علوم کی وہ شاہ کلید ہے جس سے جہالت کے جملہ تالے کھل جاتے ہیں، ہمارے اسلاف نے یہی نصاب پڑھ کر دنیا جہاں کے مسائل حل کئے تھے۔ شرط یہ ہے کہ اسے گھول کر پلایا جائے۔

آپ مدارس میں ایسے جلسے جلوس کے بھی خاص قائل نہیں تھے جس میں رٹی رٹائی باتوں کی نمائش اور جس کا مقصد ریاکاری ومنت شناسی ہو۔ ہاں آپ علم میں پختگی پیدا کرنے والے اجلاس کے قائل اور اس کے قدرداں تھے۔ مثلاً نحوی صرفی قوانین کو یاد کرانے اور اس کے اجراء کا مسابقہ، ادب وبلاغت میں مہارت کی کوشش۔ فن حدیث، تفسیر وفقہ میں پختگی پیدا کرنے والے مختلف اجلاس، آپ مضمون نگاری میں دسترس پیدا کرنے اور قلم کی راہ سے اسلام کی خدمت کے قائل اور موجودہ دور میں اس کی شدید ضرورت کے حامی تھے۔ آپ انتظامیہ سے اگر مکمل تعلیمی نگرانی، امانت داری، غیر جانبداری، احتیاط، اعتدال، خداترسی، انصاف پسندی، بے نفسی، بردباری، انکساری، پابندی اور ماتحتوں کی خبرگیری ورعایت کے خواست گار تھے تو تعلیمی عملہ سے انتھک محنت، وسیع مطالعہ، سبق کی تیاری، طلبہ کی تربیت، اوقات کی پابندی، نصاب کی تکمیل، فن کی تعلیم، طلبہ کے لئے مثالی کردار، انتظامیہ سے تعلیمی امور کے علاوہ میں بھی تعاون، دائمی وہنگامی فرامین پر عمل، اتحاد واتفاق، وفا شعاری، شخصیت سازی کی لگن، ادارہ کے جملہ پروگرام سے ہم آہنگی، فضول نکتہ چینی، رائے زنی اور بے ضرورت نظام میں دخل اندازی سے پرہیز اور اخلاق وکردار کی بلندی کے خواہشمند بھی تھے۔

تعلیم کے معاملہ میں علوم عالیہ سے قبل علوم عالیہ میں یعنی ابتدائی وثانوی درجوں کے

نحو، صرف اور ادب میں بے انتہا محنت کے قائل تھے۔آپ ہمیشہ فرمایا تے کہ کچی بنیاد پر پختہ عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی، آگے چل کر آدمی کتنی ہی محنت کرلے ابتدائی درجوں کی کمی پوری نہیں ہوسکتی، بلکہ یہی کمی آگے چل کر کبھی کبھی شہ سوار کو بھی میدان جنگ میں گھوڑے سے گرانے کا سبب بن جاتی ہے اور مناصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد بھی آدمی اس کمی کے باعث جانے انجانے میں ایسی غلطیاں کر بیٹھتا ہے، جس سے یا تو ماتحتوں کے مذاق کا نشانہ بنتا ہے یا ماتحتوں کو باوجود ان کی کمزوری کے اپنی کمزوری چھپانے کے لئے چلا لینے پر مجبور ہوجاتا ہے، اس لئے زندگی بھر تنگ کرنے والی اس کمی کو ہر مدرسہ سنجیدگی سے لے اور ابتدائی درجات کو نوخیز اساتذہ کی تجربہ گاہ بنانے کے بجائے پرانے، محنتی اور باذوق اساتذہ کے حوالے کرے اور ایسے اساتذہ کے موانعات وپریشانیوں کو دور کرکے ان کی ہمت افزائی کرتے رہیں۔آپ کو طلبہ میں سنت کے مطابق نماز کی ادائیگی کے رواج کا بھی خاص اہتمام ہے اس کے لئے آپ طلبہ کو وقتاً فوقتاً اسباق ودیگر مجالس میں نصائح فرماتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی مسجد میں بروقت ٹوکنے اور تادیب میں بھی تامل نہیں فرماتے، آپ عقیدے کی درستگی کا بھی خاص اہتمام فرماتے ہیں، اصل شریعت کو سمجھ کر مضبوطی سے پکڑنے اور زوائد کو چاہے وہ کیسے ہی خوبصورت نام وعنوان سے آئے شریعت میں اس کی سند وثبوت نہ ہوتو اصلاح کی کوشش کرنا اور از خود اس سے دور رہنا آپ کی خاص عادت ہے۔عوام وخواص کے مجمع میں ایسے امور پر دوٹوک تنقید کرنے سے بھی آپ نہیں کتراتے۔

اوصاف وعادات:

تحقیق وجستجو آپ کا امتیازی وصف تھا، کہا جاسکتا ہے کہ کاتب تقدیر نے جس منصب میں سب سے زیادہ تحقیق وتلاش کی ضرورت پڑتی ہے ایسے افتاء وقضاء کے شعبے کی خدمت کے لئے آپ کا پہلے سے انتخاب فرما کر آپ کی فطرت میں یہ دونوں اوصاف کوٹ کوٹ کر

ودیعت کردئے تھے۔ یہ عادت آپ میں اتنی راسخ ہوگئی ہے کہ ان امور میں جن میں اکثر لوگ تحقیق وتلاش ضروری نہیں سمجھتے یا وہ امور جو عادی ہوتے ہیں ان میں بھی آپ اس عادت کی بنیاد پر اپنے انداز میں سوچنے، گہرائی تک پہنچنے اور نئی بات تلاشنے کے خوگر نظر آتے ہیں۔فتویٰ نویسی میں غایت درجہ احتیاط کی عادت کی وجہ سے آپ دیگر جملہ امور میں بھی حد درجہ محتاط نظر آتے ہیں، مسئلہ پر غور وفکر کی خو کی وجہ سے دیگر معاملات اور امور میں بھی فوری طور پر تجزیہ کرنے یا رائے ظاہر کرنے کے بجائے غور وخوض کے بعد مضبوط رائے قائم کرنے کے عادی ہیں۔حق گوئی میں آپ اپنی مثال آپ ہیں۔خلیفہ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت میں کہا گیا مقولہ کہ حق گوئی کی عادت نے آپ کو تنہا چھوڑ دیا تھا، کسی نہ کسی درجہ میں یہاں بھی صادق ہوتا نظر آتا ہے، آپ بلاخوف لومۃ لائم کلمۂ حق کی ادائیگی فرمادیتے ہیں اور حق گوئی میں نتیجہ کی ذرہ برابر پروا نہیں فرماتے، بارعب اور پروقار شخصیت کے ساتھ ساتھ آپ میں سادگی، بے تکلفی اور چھوٹوں پر شفقت کا بھی بے مثال عنصر ہے، جس کا احساس آپ سے قریب ہونے والا ہر شاگرد بارہا کرتا ہے، مشورہ لینے پر مضبوط اور تجربہ پر مبنی مشورہ امانت داری کے ساتھ دینے کے عادی تھے، بدتہذیبی، بدنظمی، بدخلقی، بداحتیاطی، بدکلامی، بدعقیدگی، بدفکری، بددینی اور بدباطنی کو ذرہ برابر گوارا نہیں فرماتے اور منکر کو بدلنے کی تین صورتوں میں سے مناسب حال صورت کا ضرور استعمال فرماتے تھے۔اگر آپ کے تقویٰ، طہارت، انابت الی اللہ، سنت ونوافل کا اہتمام، ذکر وفکر اور اصلاحی کی متنوع کوششوں کو دیکھا جائے تو آپ میں ایک مصلح ومربی کی شان نظر آتی ہے گرچہ اس پر اخفاء حال، علمی شغل اور فقہ وفتاویٰ کے انہماک کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔

وفات:

فقہ وفتاویٰ کی شان، حدیث کی آن اور اداروں کی جان ایسے حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحبؒ، پچھلے دوسال سے گردے کے مرض میں مبتلا تھے۔ مورخہ ۲۶/جنوری

۲۰۱۳ شنبہ کے روز معمول کے مطابق دارالعلوم کنھاریہ تشریف لے گئے۔ ۲۸؍جنوری کے روز دوپہر بعد افتاء کے طلبہ کو درس پڑھایا اور بعد مغرب وضو کی تیاری فرما رہے تھے، اسی دوران روح پرواز کرگئی۔ **انا لله وانا اليه راجعون.**

آخری زمانہ میں معمول یہ تھا کہ ایک ہفتہ دارالعلوم کنتھاریہ رہتے تھے اور افتاء کی ذمہ داری نبھاتے تھے، فتاویٰ لکھتے تھے، افتاء کے طلبہ کو سبق پڑھاتے اور فتاویٰ کی مشق کراتے تھے، جب کہ دوسرا ہفتہ جامعہ علوم القرآن، جمبوسر میں بخاری شریف اور اصول افتاء کا درس دیتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

(مضمون نگار جامعہ علوم القرآن جمبوسر کے استاذ ادب عربی ہیں)

☆☆

آہ! مولانا عبداللہ حسنی علیہ الرحمہ

● پیر فقیر مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

۳۰؍جنوری کی صبح گیارہ بجے کے قریب بھٹکل جانے کے ارادے سے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور وہاں سے آئے ہوئے علماء کرام اور عزیز دوستوں کے ساتھ بھٹکل کے لئے ہمارا چھوٹا سا قافلہ کاروں میں روانہ ہوا۔ مہمان اور میزبان سب ہی اس ملاقات پر بے حد خوش تھے کہ اچانک عزیز القدر مولوی محمد الیاس ندوی نے کسی سے فون پر خبر سننے کے بعد بتایا کہ ابھی چند منٹ پہلے مولانا عبداللہ حسنی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ سب کی زبان سے نکلا: **انا لله وانا اليه راجعون**......اور پورے ماحول پر سناٹا چھا گیا، ہر ایک سکتے کے عالم میں تھا اور دعا اور رجوع الی اللہ میں ماسوا سے منقطع **"اللهم اغفرله وارحمه وادخله الجنة ونجه من النار، اللهم تقبل حسناته وتجاوز عن سيئاته، اللهم اعف عنه وعافه واكرم نزله ووسع مدخله، اللهم لا تحرمنا خيره ولا تفتنا بعده."**

مولانا عبداللہ حسنی کچھ عرصے سے بیمار تھے، مرض کی نوعیت بھی سنگین بتائی جاتی تھی، لیکن شاید کسی کو بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے......جنوری کے پہلے ہفتے میں یہ راقم الحروف ۷-۸ دن لکھنؤ میں رہا، مولانا کی علالت کی خبر سن کر عیادت کے لئے جانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ لوگوں سے ملاقات آج کل مولانا کے لئے اذیت ہی کا باعث بنتی ہے، تو نہ جانا اور دعا پر اکتفاء کرنا ہی بہتر سمجھا۔

مولانا عبداللہ حسنی برصغیر کے اس نہایت برگزیدہ اور عالی نسب خاندان کے چشم وچراغ تھے، جس میں شاید ہر دور میں دعوت وعزیمت کی تاریخ رقم کرنے والے عظیم علماء ربانیین پیدا ہوئے، ان کے جدامجد حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (رحمهما الله) سے کون پڑھا لکھا مسلمان ناواقف ہے...... حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں تو کچھ بھی عرض کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم ان کے بڑے بھائی اور ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کے دادا حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے بارے میں اتنا عرض کرنا مناسب ہوگا کہ وہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور علامہ انور شاہ کشمیری کے تلمیذ رشید تھے۔ شیخ الہند سے انہوں نے ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں صحیح بخاری اور سنن ترمذی پڑھی تھی اور علامہ کشمیری سے سنن ابی داؤد، بیعت وارادت کا تعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ سے تھا اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی بھی شفقت وتوجہ خاص انہیں حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ تشریف آوری کے موقع پر حضرت تھانویؒ کی مجالس میں بڑے اہتمام سے شرکت فرماتے تھے۔ حضرت تھانوی بھی ان کے مکان پر خود تقاضا کر کے تشریف لے گئے تھے بلکہ اسی موقع پر ان کے صاحبزادے محمدالحسنی (جو اس وقت ۳-۴ سال کے تھے اور جو بعد میں ہمارے ممدوح مولانا عبداللہ حسنی کے والد بنے) کی بسم اللہ کرائی۔ اسی طرح حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کو بھی ان سے خصوصی تعلق خاطر تھا، امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ سے بھی گہرا تعلق تھا اور ڈاکٹر صاحب ان کے اخلاص وللٰہیت کے بے حد معترف رہا کرتے تھے...... حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے بھی ان کو گہری عقیدت ومحبت تھی، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سفروں کے عادی نہیں تھے، مگر اس کے باوجود حضرت مولانا الیاس کی ملاقات اور ان کی صحبت میں چند دن گزارنے کے ارادے سے نظام الدین تشریف لے گئے......اور جب رخصت ہونے لگے تو حضرت مولانا الیاسؒ نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیم وبہار آخر شد

یہ ساری تفصیل صرف یہ بتانے کی غرض سے لکھی ہے کہ ہمارے نوجوان طلبہ اور نو واردان بساطِ علم کو خاص طور پر یہ معلوم ہو کہ خانوادۂ حسنی کی ایک بہت بڑی صفت اہل اللہ کی قدر، ان کا ادب واحترام اور ہر طرح کی عصبیت اور تحزب سے دور رہتے ہوئے اپنے کو بڑوں کا چھوٹا تسلیم کرنا اور کھلے دل سے سب سے استفادہ کرنا ہے...... یہ راقم سطور گواہی دیتا ہے کہ بڑوں کا تو ذکر ہی کیا، چشم بددور! ابھی تک اس خانوادے کے نوجوانوں میں بھی یہ ذوق دوسرے بہت سے خاندانوں کی بہ نسبت سلامت بلکہ نمایاں نظر آتا ہے اور شاید یہی اس خانوادے کے اقبال کا اصل سبب ہے...... اللہ سدا اقبال بلند رکھے...... جاننے والے جانتے ہیں کہ بزرگوں کا احترام اور ان کی دلی قدر ومحبت کس قدر مفید ہوتی ہے اور ان کی تنقیص وتنقید کا ذوق بلکہ چسکا جس درجہ تباہ کن اور ہلاکت خیز!

یہ تو ہوا مختصر سا تذکرہ مولانا عبداللہ حسنی کے جدامجد حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کا، جہاں تک ان کے عظیم والد گرامی مولانا محمدالحسنی کا تعلق ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں ان کے انتقال کے بعد صاحب الفرقان (ہمارے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ) نے جو مضمون لکھا تھا وہ پورا مضمون ذیل میں نقل کر دیا جائے......اس لئے کہ ہمارے موجودہ قارئین میں زیادہ تر وہ ہوں گے جن کی نظر سے وہ مضمون نہیں گزرا ہوگا اور جو پڑھ بھی چکے ہوں گے وہ بھی اسے بھول چکے ہوں گے......الفرقان: جولائی ۱۹۷۹ء کے ''نگاہ اولیں'' میں ''مولانا محمدالحسنی، مدیر البعث الاسلامی الی رحمۃ اللہ'' کے زیر عنوان انہوں نے لکھا تھا:

''اکثر ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے حقیقی بھتیجے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرۂ آفاق عربی جریدہ ''البعث الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمدالحسنی جو اپنی بعض خداداد خصوصیات اور وہبی کمالات

کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ سال کی تھی......صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھالئے گئے......**ان اللہ ما اخذو لہ ما اعطی و کل شئی عندہ باجل مسمیٰ**۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، مولانا علی میاں کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ ”رجل موھوب“ (یعنی ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کسبی نہیں، وہبی ہے۔ انہوں نے محنت کر کے حاصل نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ کرم سے یوں ہی عطا فرما دیا ہے)......واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مولانا علی میاں سے کہیں زیادہ ان کے مرحوم بھتیجے مولانا محمد الحسنی پر صادق آتی ہے۔

اب سے ۳۳ سال پہلے ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب یہ راقم سطور مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ ان ہی کی تحریک پر ”الفرقان“ کو بریلی سے لکھنؤ منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لئے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اور ان کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی (علیہ الرحمۃ) کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا۔ عزیز مرحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے، ان کو سب ”محمد میاں“ کہتے تھے۔ اس وقت وہ ۱۰ سال کے بچے تھے لیکن میں نے ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا تھا، بولتے بھی بہت ہی کم تھے......دریافت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ یہ پڑھنے کے لئے کسی اسکول یا مکتب مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں، والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک با ترجمہ پڑھاتے ہیں اور اسی کے ذریعہ عربی تعلیم بھی ہو رہی ہے اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا مطالعہ بھی کرتے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف ونحو کی کوئی کتاب ان کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے کا ارادہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد سنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں...... ہم جیسوں کو بجا طور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف ونحو بالکل نہیں پڑھی، جو ماضی،

مضارع، معرب، مبنی، مرفوع، منصوب، مجرور، منصرف، غیر منصرف کو نہیں جانتا وہ عربی کا کوئی جملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے......لیکن اللہ کی شان اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کہ محمد میاں صرف ونحو سے بالکل ناواقف اور نابلند ہونے کے باوجود بہت ہی اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے اور ان رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالباً یہ سمجھ کے شائع کئے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ ”المسلمون“ میں شائع ہوا تھا، جو اس زمانے میں دمشق سے نکلتا تھا اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی مؤقر مجلّہ تھا۔

پھر ان کی عمر کا ۲۰ واں سال تھا کہ انہوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور ”البعث الاسلامی“ کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہو گیا۔ اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، ان کا گھر ہی اس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لئے مضامین لکھتے، خود ہی کتابت کراتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اس کو روانہ کرنے کا اہتمام کرتے ”خوکوزۂ وخودکوزہ گروخودگل کوزہ۔“

راقم سطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی ذات کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارے کا سودا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ۲۰ سالہ محمد میاں کو یہ ہمت بخشی...... جلد ہی ”البعث الاسلامی“ عربی ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا......

پھر ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں (جس میں راقم سطور بھی بحیثیت رکن شریک تھا) اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ ”البعث الاسلامی“ کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے اور اس کی اشاعت کا اہتمام وانتظام ندوۃ العلماء

کی طرف سے ہواور مولانا محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوہ اور اس کے دارالعلوم کے لئے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لئے بہت مفید ہوگا۔

غور وفکر کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ نے (جو ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) اس کی منظوری دے دی اور ''البعث الاسلامی'' کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف منتقل ہوگئی۔ کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہ آیا، بلکہ مولانا محمد میاں کے لئے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاؤنس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کر کے اس کا کام کرتے رہے اور اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

قریباً دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لئے ''البعث الاسلامی'' کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف ۳۰۰ روپے کا الاؤنس منظور کیا گیا۔ انہوں نے اس کو بھی بخوشی قبول کرلیا، حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے دفتر کے بعض محرروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنا دیا تھا لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شان عالی کے مطابق ملا اور البعث الاسلامی ہی کے سلسلہ میں ان کے لئے ''**یرزقه من حیث لایحتسب**'' کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا وہ عربی زبان کی صرف ونحو سے بالکل ناواقف تھے۔ (راقم سطور نے خود مولانا علی میاں سے سنا ہے کہ غالباً ان کو ماضی کی پوری گردان بھی یاد نہ ہوگی) لیکن ''البعث الاسلامی'' میں ان کی جو تحریریں شائع ہوتی تھیں وہ زبان کے لحاظ سے عالم عربی کے مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے ہم پلہ ہوتی تھیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''**الاسلام الممتحن**'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کو دیکھ کر آج بھی ہر وہ شخص

جس میں اس کی اہلیت ہو یہ موازنہ کرسکتا ہے۔ وہ زبان واسلوب میں (عربی میں بھی اور اردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا تتبع کرتے تھے کہ گویا ان کا ''ثنیٰ'' اور ''دوسری کاپی'' بن گئے تھے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس و انداز اس باب میں معتبر ہوسکتا ہے محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریر میں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آ گئی ہے، خود مولانا علی میاں بھی کبھی کبھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔

ان کا شاہکار اور آخری یادگار:

۱۱؍جون دوشنبہ کی شام کو اسی مہینہ جون (مطابق رجب) کا ''البعث الاسلامی'' کا شمارہ میرے پاس آیا، مغرب وعشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا جو عزیز مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا ''**سوال حائر یحتاج الی جواب**'' یہ ۷ صفحے کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صاف صاف کہا جانا ان کی خیرخواہی کا بھی تقاضا تھا اور از روئے دین اب فرض ہوگیا تھا اور اس فرض کو اب وہی مرد خدا ادا کرسکتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو۔ اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسن کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور مؤثر سے مؤثر انداز میں انہوں نے یہ فرض ادا کردیا، میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے ''ندائے غیب'' سمجھا اور طے کرلیا کہ اس کو اردو میں منتقل کر کے ''الفرقان'' میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲؍جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا، ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تأثر ان کو بتلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی زیادہ سے زیادہ بس دو تین دن میں ''الفرقان'' کے لئے اردو میں منتقل کردیں یا کسی اور سے کرادیں، انہوں نے کہا بہت اچھا! انشاء اللہ ہو جائے گا! اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہوگا کہ آج ہی کا دن

ان کی زندگی اوران کے کام کا آخری دن ہے اورکل ہی ان کا سفرآخرت ہے۔

اس کے اگلے دن (۱۳/جون چہارشنبہ کو) انہوں نے پیٹ میں کچھ تکلیف اور نفخ کی سی کیفیت محسوس کی جس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی گئی، یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کو بھی (جو عزیزوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں) بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، بس فون پر حال کہہ دیا گیا۔انہوں نے دوا بتلادی، وہ دوا استعمال کی گئی، جب اس سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوا تو حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی کی طرف رجوع کیا گیا، جن کا مطب بالکل قریب ہی ہے اورجن سے ہم خاندانی جیسا تعلق ہے۔انہوں نے نسخہ تجویز فرمادیا، اس کے استعمال سے بھی تکلیف میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی، پھرایک ایلوپیتھ ڈیکٹر کو بلایا گیا، انہوں نے دوادی اورایک انجکشن تجویز کیا جولگوایا گیا، لیکن تکلیف میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔سہ پہرکوڈاکٹر قریشی صاحب کو پھرفون ہی سے حال بتلایا گیا، وہ عصر کے وقت خودتشریف لائے اورصورت حال دیکھ کرانہوں نے طے کیا کہ ان کو اسپتال میں داخل کردیا جائے۔ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی سے ان کو اسپتال لے گئے۔یہ ۱۳/جون بعدمغرب کا وقت تھا، راقم سطور کو اس وقت تک بھی ان کی اس علالت کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی، جب وہ اسپتال لے جائے گئے تو ان کے خلف الصدق مولانا عبداللہ سلمہ اللہ تقریباً آٹھ بجے میرے پاس آئے۔انہوں نے اطلاع دی، اس وقت مجھے علم ہوا، مولانا علی میاں قریباً دو ہفتے سے سفر میں تھے اور وہ دن ان کے بمبئی میں قیام کا تھا، مولوی عبداللہ سلمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہا کہ ہمارا فون کام نہیں کررہا ہے، آپ ہی مولانا کو بمبئی اطلاع دے دیں، حسن اتفاق کہ اس وقت صرف ۱۵ منٹ میں فون کے ذریعہ بمبئی سے رابطہ قائم ہوگیا اور مولانا کو علالت کی اطلاع دے دی گئی، ادھر یہ ہوا کہ اسپتال میں پہنچنے کے قریباً ایک گھنٹے کے بعد عزیز مرحوم کا وقت موعود آگیا اور وہ ہم سب کو الوداع کہہ کے اپنے غوررحیم رب کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون.** اس وقت ان کی عمر کا چوالیسواں سال تھا۔

اخیر شب میں ان کو غسل دیا گیا، جنازہ کی نماز طلوع آفتاب کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھی گئی اور تدفین کے لئے جنازہ اسی وقت رائے بریلی کے لئے روانہ ہوگیا، وہاں پہنچ کر دوبارہ نماز پڑھی گئی اور ۱۱-۱۲ بجے کے درمیان تکیہ شاہ علم اللہ میں اپنے والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب علیہ الرحمۃ کے پہلو میں دفن کردئے گئے۔**اللھم انزل علیہ شئابیب رحمتک ورضوانک.**

بمبئی میں مولانا علی میاں نے ۱۳/جون کی رات میں علالت کی خبر پاکر ہوائی جہاز سے جلد از جلد لکھنؤ پہنچنے کی کوشش کی وہ ۱۴/جون پنجشنبہ کے دن بمبئی سے دہلی پہنچ سکے اور ۱۵/جون جمعہ کی صبح دہلی سے لکھنؤ پہنچ کر رائے بریلی تشریف لے گئے، نسبی رشتہ کے لحاظ سے مولانا اگرچہ مرحوم کے چچا تھے لیکن تعلق وہ تھا کہ بہت سے باپ بیٹوں میں بھی نہیں ہوتا، اس لئے قدرتی طور پر مولانا اس حادثہ سے بے حد متاثر ہوئے اوراس وقت اپنے موجود نہ ہونے کا صدمہ مزید براں! اللہ تعالیٰ ان کو اور سب پسماندگان اور متعلقین کو خاص کر غمزدہ بیوہ اور بچہ کو صبر اور تسلیم ورضا کی توفیق عطا فرمائے۔**ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ ودرکا من کل فائت فباللہ مثقھا وایاہ فارج فانما المصاب من حرم الثوب.**

عزیز مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیرعادی طریقہ پر وہ علمی وقلمی کمال عطا فرمایا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑا فضل وانعام ان پر ان کے رب کریم نے یہ فرمایا تھا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لئے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد مشائخ کی تربیت میں رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے یہ بے بہا دولت بھی ان کو اپنے فضل خاص ہی سے عطا فرمادی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دئے گئے ہیں اور محاسن اخلاق بھرپور عطا فرمادئے گئے ہیں۔**ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء.**

امید ہے کہ آپ نے حضرت والد ماجد کی اس تحریر میں اس محبت اور شفقت واپنائیت کو بھی ضرور محسوس کیا ہوگا جو ان کے دل میں مولانا محمد الحسنی سے اور اپنے محبوب رفیق حضرت مولانا علی میاں سے اور ان کے خاندان کے ایک ایک فرد سے تھی، سچی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس محبت بھری رفاقت اور ملت اسلامیہ ہندیہ پر مرتب ہونے والے اس کے نہایت مثبت اثرات کو قریب سے دیکھا ہے وہ اب ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں، کاش کہ کوئی اٹھتا اور عہد رفتہ کو آواز دیتا اور ان پرانی یادوں کو پھر سے تازہ کرتا کہ آج ہم اس خلوص ومحبت کے پہلے سے زیادہ ضرورت مند ہیں......

اب آگے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مولانا محمد الحسنی کے بارے میں ان کے عظیم چچا اور مربی وآئیڈیل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے جو طویل مضمون لکھا تھا اس کے بھی کچھ اہم اقتباسات آپ کی نظر سے گزر جائیں، پڑھنے کے بعد انشاء اللہ آپ خود سمجھ لیں گے کہ یہ ''قصہ پارینہ'' میں کیوں آپ کو دوبارہ پڑھوا رہا ہوں؟ لیجئے پڑھئے ہمارے حضرت مولانا نے اس وقت کیا لکھا تھا؟

جون ۱۹۷۹ء کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ تھی اور میں بمبئی میں تھا، رات کو میں نے خواب دیکھا کہ لکھنؤ میں محمد علی لین والا ہمارا پرانا مکان ہے، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا زمانہ ہے اور گھر کا وہی نقشہ ہے، جو ان کی زندگی میں تھا، وہ خود زندہ سلامت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا انتقال ہو گیا ہے، میں عالم برزخ سے اپنے اس پرانے مسکن میں جس میں بچپن اور جوانی گزری، گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، مجھے اس کا رنج بھی ہے کہ جلد ان عزیزوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور تھوڑا سا سہم بھی کہ مجھے قبر میں جانا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا فسوس بھی کر رہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، خواب ہی میں مجھے اس کا شعور ہے کہ بھائی صاحب نے عمر

طبعی پائی اور میں اس عمر کو نہیں پہنچا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں خاص طور سے معنی خیز جن میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ یا کسی امر کا انکشاف ہو، میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟ غالباً اگلے ہی دن شب میں ایک دوست کے یہاں سے دیر میں واپس آیا معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے مولانا محمد منظور نعمانی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ میرے بھتیجے محمد میاں اچانک علیل ہو گئے، ان کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، میں جتنی جلد ہو سکے لکھنؤ پہنچ جاؤں...... سنتے ہی ماتھا ٹھنک گیا، کہ اللہ خیر کرے، طبیعت پر فکر وتردد سے زیادہ حزن ویاس کی ایک کیفیت طاری ہو گئی، خواب بھی یاد آیا، دنیا میں اگر (اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے احساس کے ساتھ میرا کوئی مثیل بلکہ ''صورت مثالی'' ہو سکتا ہے تو محمد میاں ہی ہو سکتے ہیں، وہ جب بچے تھے تو ان کی والدہ مرحومہ دعا کرتی تھیں کہ وہ اپنے چچا کے بالکل مثیل ہوں اور اردو کے زنانہ محاورہ کے مطابق ''اپنے چچا کو پڑیں'' ...... اللہ نے جن کو دو پیدا کیا ہے وہ دو ہی رہتے ہیں۔ پورے طور پر کبھی ایک نہیں ہو سکتے، لیکن دو میں جو زیادہ سے زیادہ وحدت، مماثلت اور مشابہت ہو سکتی ہے وہ ہم دونوں چچا بھتیجے میں تھی، اس کا گواہ خاندان کا ایک ایک فرد ہے، اس لئے دل کو اور دھڑکا لگ گیا کہ دیکھئے خدا کو کیا منظور کیا ہے؟ کہیں میں نے اپنی شکل میں ان کی مفارقت کو نہ دیکھا ہو...... ٹیلی فون کا پیغام پہنچنے کے بعد ہی ہم لوگ ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے کہ پہلی پرواز سے دہلی اور صبح کی پرواز سے لکھنؤ پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ محرومی نہ ہوتی جو قسمت میں لکھی تھی اور جو ان کے والد اور اپنے باپ کی طرح بھائی کے معاملہ میں اس سے پہلے مئی ۱۹۶۱ء میں پیش آ چکی تھی اور اس کا داغ زندگی بھر رہے گا...... مولوی معین اللہ صاحب نے یہ بھی انتظام کر لیا تھا کہ دہلی میں بھی یہ بات مجھ سے راز رہے اور لکھنؤ پہنچ کر ہی مجھے اس روح فرسا واقعہ کا علم ہو...... گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو ایک بڑا مجمع پلیٹ فارم پر موجود تھا، سوگوار اور غم میں ڈوبا ہوا، لیکن زبانیں بند، لیکن زبان بے

زبانی کہہ دیتی تھی کہ واقعہ پیش آچکا ہے......رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب گلوگیر اور مرتعش آواز میں واقعہ کی خبر دی۔

ان سطور کے لکھواتے وقت اچانک وہ دن یاد آگیا جب اکتوبر ۱۹۳۵ء کی کسی تاریخ کو بمبئی سے (جہاں بھائی صاحب مرحوم ہی نے ڈاکٹر امبیڈاکر سے ملنے کے لئے بھیجا تھا) واپسی پر اچانک گھر میں محمد میاں کی ولادت کا مژدہ سننے میں آیا جو میرے پہنچنے سے دو چار دن پہلے کا واقعہ تھا......

پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لے آئے، بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ محمد کو لاؤ، میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا، مولانا نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا، پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو ان کی مکتب نشینی کا وقت آگیا تھا، مولانا (تھانوی) ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی، کیا عجب ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی شامل رہی ہو......

آگے حضرت مولانا نے مولانا محمد میاں کی تعلیم وتربیت میں ان کے والد گرامی کے مجتہدانہ طرز اور پھر عربی تحریر کے ان کے غیر معمولی ملکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کو میں بھی صاحب کی ایک کرامت ہی سمجھتا ہوں، انہوں نے اپنے کم سن یتیم بھائی (راقم سطور) کو جس خلوص، دل سوزی اور جانکاہی کے ساتھ عربی زبان وادب اور دینیات کی تعلیم دلائی اور اس بارے میں اپنے والد ماجد کا منشا پورا کیا، جس طرح ہر فن کے ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا اور اس دور بینی اور بلند نگاہی کے ساتھ (جس کا ہندوستان کے حالات اور وقت کے دینی وعلمی مشاغل سے کوئی جوڑ نہ تھا) اس کو عربی زبان میں دعوت وتبلیغ کے کام کے لئے تیار کیا، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا صلہ اور انعام محمد میاں کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کی ساری لیاقت وصلاحیت کا معاملہ محض وہبی اور

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

خداداد تھا اور **عمل قلیلا و اجر کثیرا** کا مصداق تھا۔

گھر کے ماحول، خاندانی اثرات اور فطرت سلیمہ کی بنا پر محمد میاں کو اہل قلوب اور خاصان خدا سے گہری عقیدت تھی اور وہ تزکیۂ نفس اور تعلق مع اللہ کی اہمیت وضرورت سمجھتے تھے......حضرت مولانا حسین احمد مدنی ان کے گویا خاندانی شیخ تھے اور ان کے والد والدہ دونوں ان سے بیعت تھے، مولانا لکھنؤ میں بھائی صاحب کے گھر کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے جو تعلق خاص تھا اس کی بنا پر محمد میاں پر بھی بڑی شفقت کی نظر تھی......اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ مولانا محمد میاں نے مولانا کی سیرت لکھنے کا ارادہ کیا......انہوں نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا، لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے وہ مکمل نہ ہوسکا۔

اپنے زمانے کے شیوخ وصلحاء میں ان کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بڑی عقیدت تھی، حضرت کی لکھنؤ کی مجلسوں میں تو وہ شریک ہوتے ہی تھے، رائے پور بھی گئے اور وہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کی آخری علالت میں ان کو لاہور پہنچا دیا، حضرت کا حادثۂ وفات ان کے سامنے ہی پیش آیا، جنازہ کے ساتھ گئے اور حضرت کے وطن ڈھڈیاں جا کر تدفین میں شرکت کی۔

اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے بھی عقیدت ومحبت تھی، متعدد بار وہ رمضان المبارک میں سہارنپور جا کر ان کی صحبت اور ان کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے۔ حضرت شیخ کی مشہور کتاب فضائل نماز کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو **الصلوٰۃ ومکانتها فی الاسلام** کے نام سے چھپی ہے، جس سے حضرت کی دعائیں ان کو حاصل ہوئیں اور تبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ آخری دور میں ان کو حضرت مولانا محمد احمد پھولپوری سے بڑا تعلق ہوگیا تھا، مولانا کے عارفانہ کلام کو جمع ومرتب کرنے میں خاص طور پر ان کی تحریک شامل تھی اور ان ہی کے بار بار تقاضے سے دیوان محبت کے نام سے مجموعہ مرتب ہوا، جس کے عناوین ان ہی کے تجویز کئے ہوئے ہیں۔

ان ذاتی اوصاف اور سلامتی طبع کے ان مظاہر کے علاوہ عالم اسلام اور بالخصوص عالم عربی کے حالات پر جس طرح کی وہ نظر رکھتے تھے، اس کا بھی حضرت مولانا نے بہت تفصیلی تذکرہ کیا ہے، راقم الحروف کا دل تو چاہ رہا ہے کہ اس سلسلہ کی کچھ عبارتوں کے ۲-۳ اقتباس یہاں نقل کردوں، مگر بے جا طوالت کے خوف سے گریز کررہا ہوں...... جانتا ہوں کہ اپنے ممدوح حضرت مولانا عبداللہ حسنی کے والد گرامی اور جد بزرگوار کے تذکرہ میں ہی جو درازنفسی میں نے کی ہے اسی کی ''لذیذ بود حدیث دراز تر گفتم'' کہہ کر مجھے معذرت کرنی چاہئے اور سچی بات یہ ہے کہ مسئلہ صرف لذیذ بود کا نہیں ہے...... بلکہ اس ذوق ومزاج کے تذکرہ کا ہے جو ان دونوں بزرگوں والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کی باہم رفاقت نے ایک پورے حلقے کا بنادیا تھا، جس میں صفائے باطن کے لئے خانقاہی اعمال بھی تھے اور اللہ والوں سے نیازمندانہ تعلق اور ہر ایک کی قدردانی کا معمول بھی تھا، نیز علم وتحقیق کے لئے درس ومطالعہ اور تحقیق وتصنیف کا اہتمام بھی تھا اور ''خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات'' کے ساتھ ''وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل'' بھی تھی، جس میں صحافت اور حالات حاضرہ پر نظر کے ساتھ ساتھ تبلیغی جدوجہد کی قدر بلکہ اس میں انہاک بھی تھا......غرض کہ ان دونوں بزرگوں کی عدیم المثال رفاقت کی وجہ سے جس میں سے ایک دیوبند اور دیوبندیت کی اور دوسری ندوہ اور ندویت کی شخصیت مثالیہ تھے۔ واقعتہً ایک نہایت مکمل متوازن اور جامع مکتب فکر وجود میں آیا تھا۔ میں اپنے دل کو کیا کروں بچپن سے اسی مکتب فکر کا شیدائی ہوں اور اس موضوع پر جب بھی گفتگو چھڑتی ہے تو اپنی زبان وقلم کو روکنا میرے بس میں نہیں رہتا، کاش کہ ان دونوں بزرگوں کی رفاقت کا جو اثر فکر اسلامی پر پڑا، اسے کوئی صاحب نظر اجاگر کرسکتا تو بہت بڑی خدمت انجام پاجاتی۔

بہرحال یہ تھے ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کے باپ دادا، اب آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ ایسے بزرگوں سے شرف انتساب رکھنے والا خود کیسا ہوگا

ایں خانہ ہمہ آفتاب است   ایں سلسلۂ طلائے ناب است

مولانا خاموش طبع تھے، عربی اور اردو دونوں میں تقریر وتحریر پر اچھی قدرت رکھتے تھے، اپنے ابا میاں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تو تھے ہی ان کی عقیدت کا اصل مرکز، تاہم وقت کے دوسرے بزرگوں سے بھی عقیدت واحترام کا تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا کی تو خاص نظر ان پر تھی، تربیت کے مرحلہ سے گزار کر انہوں نے ان کو تزکیہ وارشاد اور عمومی دعوت کے کاموں پر مامور بھی کردیا تھا اور وہ نہایت خاموشی اور سنجیدگی ووقار کے ساتھ ان سب کاموں میں لگے رہتے تھے......ان کے قریبی لوگوں کو بھی ان کے حلقے کی وسعت اور کام کے پھیلاؤ کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد ہی ہوا۔ ان کے والد کی پیدائش ان دنوں میں ہوئی تھی جب ان کے والد کے جواں سال چچا (حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی) اپنے بڑے بھائی اور سرپرست کے ایماء پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ پھر ان کے والد (مولانا محمد الحسنی) کی وفات جب ہوئی تب بھی حضرت مولانا علیہ الرحمۃ پیام انسانیت کے عنوان پر ایک دعوتی سفر پر ہی نکلے ہوئے تھے......اور میرا خیال تو بعض قرائن کی وجہ سے یہ ہے کہ ہمارے مولانا عبداللہ حسنی کو بھی اسی دعوت کی راہ میں شہادت کا شرف ملا ہے۔ حقیقت اللہ بہتر جانے!

برادران وطن میں دعوت کا کام مولانا اس انداز سے کرتے تھے کہ نہ لمبی چوڑی فتوحات کی کارگزاریاں اور نہ کراماتی واقعات کی لن ترانیاں، ایک خاموش اور سنجیدہ انداز تھا، نہ صلے کی تمنا اور نہ ستائش کی پرواہ!

بھٹکل اور حیدرآباد کے سفر سے واپسی پر جب یہ راقم تعزیت کے لئے تکیہ کلاں رائے بریلی حاضر ہوا تو مولانا مرحوم کے چھوٹے بھائی مولانا سید بلال حسنی نے جو آخری تین ماہ علالت کے دوران مستقل اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہی رہے، بتایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ایک نماز نہ صرف یہ کہ قضا نہیں ہوئی بلکہ ہر نماز باجماعت ادا کرتے تھے اور سخت تکلیف کے

باوجود بیٹھ کر ادا کرنے کا اہتمام کرتے تھے، آخری دن پوری سورۂ بقرہ ریکارڈ سے سنی اور اس کے بعد دوسری سورہ بھی سننی شروع کر دی تھی کہ سانس میں تغیر محسوس ہوا ایک ہچکی سی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

سچ عرض کرتا ہوں کہ موت سے متصلاً قبل کے یہ احوال سن کر بے حد رشک آیا۔ مولانا عبداللہ حسنی کی قسمت پر، ان کی زندگی ہم جیسوں کے لئے قابل رشک تو تھی ہی، موت زندگی سے بھی بڑھ گئی!۔ اس خانوادے کے بزرگ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ العالی نے ان تمام کاموں کی ذمہ داریاں مولانا سید بلال حسنی کے سپرد کر دی ہیں۔ یہ ناکارہ دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بحسن وخوبی تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کو آسان فرمائے، قدم قدم پر غیبی نصرت شامل حال فرمائے۔

یہ راقم اپنی طرف سے، اپنے پورے خاندان کی طرف سے اور ادارۂ الفرقان کی طرف سے مولانا عبداللہ حسنی کے اہل خانہ اور ان کے اکلوتے بچے، ان کے دونوں بھائیوں مولانا عمار حسنی اور مولانا بلال حسنی اور پورے خانوادۂ حسنی کی خدمت میں، نیز مولانا سے دینی واصلاحی تعلق رکھنے والے سب ہی عزیزوں اور دوستوں کی خدمت میں پیام تعزیت پیش کرتا ہے اور سب سے دعاؤں کا سائل ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ کے نام

حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کا نامہ تعزیت:

مولانا عبداللہ حسنی کے انتقال سے چند دن پہلے جب مجھے ان کی حالت کی غیر معمولی سنگینی اور اسپتال میں داخل ہونے کی خبر ملی تھی تو اسی وقت سے میں برابر اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کو ان کی حالت سے مطلع کرتا رہا اور ان سے دعاؤں کی گزارش کرتا رہا پھر حادثۂ انتقال کی خبر دینے کا فریضہ بھی مجھے ادا کرنا

پڑا۔ حضرت نے جو تعزیتی خط اس راقم ہی کے ذریعہ سے حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ کی خدمت میں ارسال کیا وہ خط بھی ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

باسمہ تعالیٰ

اللہ اللہ اللہ

من فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی

یکم فروری ۲۰۱۳ء   حال نزیل مکہ مکرمہ

محترم المقام یادگار اسلاف حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

دامت فیوضکم وطال بقائکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

چند روز پہلے عزیز القدر مولانا سجاد نعمانی زید مجدہ کے ذریعہ حضرت مولانا عبداللہ حسنی علیہ الرحمۃ کی شدید علالت کا علم ہوا تھا، فقیر نے حسب توفیق ان کی شفائے کاملہ عاجلہ مستمرہ کے لئے بارگاہ الٰہی میں خوب آہ وزاری کی، مگر ہوتا وہی ہے جو رب کائنات کی مرضی ومنشاء، چنانچہ مورخہ ۳۰؍جنوری کی شام ان کے انتقال پرملال کی خبر وحشت اثر ملی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون. كلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَان** کا قانون اٹل ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ حسنی (علیہ الرحمۃ) سے ایک یادگار ملاقات کی سعادت فقیر کو دیارحرم میں نصیب ہوئی۔ مرحوم نے جس محبت والفت اور مسرت وگرم جوشی کا اظہار اس فقیر سے کیا اس کی مٹھاس آج بھی دل میں موجود ہے۔ یہ الفاظ صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے مرحوم کا مسکراتا منور چہرہ آنکھوں کو پرنم اور دل کو پرغم کر رہا ہے۔ بقول ع

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی

عجیب بات ہے کہ اس پرفتن دور میں اللہ جل شانہ کے نیک بندے اپنی انوار وبرکات

سمیت جس تیزی سے اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، یہ جگہ ظلمات سے بھر رہی ہے، شیاطین اس خلاء کو پورا کر رہے ہیں، یوں لگتا ہے کہ یہ فانی دنیا اپنے انجام کو پہنچنا چاہتی ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں ایک علمی و عملی شخصیت داعی الی اللہ کا عالم جوانی میں داغ مفارقت دے جانا ہم فقیروں کے لئے سانحہ فاجعہ کی مانند ہے۔ ع

جو بادہ خوار تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
وَمَا کَانَ قیس هلکه هلکَ واحد
ولٰکِنَّهُ بُنیانُ قَوم تَهَدَّمَا

بس حکم الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اتنا کہہ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ "اللّٰهُمَّ لاَ تحرِمناَ أجرَهُ وَلاَ تَفْتِنَّا بَعْدَه"

اللہ رب العزت مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ اپنے قرب کے اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے۔ بقول شخصے ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

نیز آنجناب اور دیگر متعلقین کے لئے اس صدمہ کو مقام تسلیم و رضا میں مزید ترقی اور رسوخ حاصل ہونے کا ذریعہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ان کے اہل خانہ اور دیگر پسماندگان یقیناً غم سے نڈھال ہوں گے۔ ان کی تسلی واطمینان کے لئے ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔ سیدنا عباسؓ جب فوت ہوئے تو ان کی تعزیت کے لئے ایک بدوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ع

اصْبِرْ نَکُنْ بِکَ صَابِرِیْنَ
صَبْرُ الرَّعِیةِ بَعْدَ صَبرِ الرأسِ

خَیرٌ مِنَ العَبَّاسِ أجرُکَ بَعْدَهُ
وَاللّٰهُ خَیرٌ مِنکَ لِلعَبَّاسِ

جب سید الاوّلین والآخرین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا تو صحابہ کرام کے لئے اس صدمۂ عظیمہ کو برداشت کرنا اک غم کا پہاڑ اٹھانے کی مانند تھا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے یوں کہا کرتے تھے۔

فَاصْبِرْ لِکُلِّ مُصِیبَةٍ وتَجَلَّد
وَاعْلَمْ بِأنَّ الْمَرْءَ غَیرُ مُخَلَّد
فَاِذَا ذَکَرْتَ مُصِیبَةً وَمُصَابَهَا
فَاذْکُرْ مُصَابَکَ بِالنبی محمد

الحمد للہ فقیر نے آج رات عمرہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں مولانا مرحوم کے لئے مغفرت و بلندئ درجات کی دعائیں کیں۔ آئندہ بھی یہ فقیر اس خانوادہ کے ہر فرد کے لئے دعا کرنا اپنی سعادت سمجھے گا۔

اگر فقیر کا محبت بھرا سلام، دعائیں اور پیام تعزیت مولانا مرحوم کے اہل خانہ، برادران اور دیگر اکابر واصاغر تک بآسانی پہنچ سکے تو فقیر پر احسان ہوگا۔ اپنی دعائے نیم شبی میں اس فقیر کو یاد فرمائیں تو زہے نصیب۔ وَلِلاَرْضِ مِنْ کَأسِ الْکِرامِ نَصِیب.

دعا گو و دعا جو
(پیر فقیر مولانا) ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی
کان الله له عوضا عن کل شئی
(مکہ مکرمہ)

(مضمون نگار معروف پیر و مرشد ہیں)

☆☆

مولانا عبداللہ حسنیؒ

چمکتا چاند، جو روپوش ہوگیا

● پروفیسر محسن عثمانی ندوی

چاند چمکتا ہے اور پھر روپوش ہوجاتا ہے، سورج طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوجاتا ہے اسی طرح سے اس تماشا گاہِ عالم میں بھی عبقری شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دنیا سے رخصت ہوجاتی ہیں اور جب رخصت ہوتی ہیں تو چشم پرآب سے اور دل بے تاب سے یہ نالہ بند ہوتا ہے۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
حادثہ سخت ہے اور جان عزیز

مولانا عبداللہ حسنی نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ ان کے والد مولانا محمد الحسنی کا بھی کم عمری میں انتقال ہوا تھا اور اسی کم عمری میں انہوں نے عربی اور دو زبان میں کئی تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ انہوں نے البعث الاسلامی کے نام سے عربی مجلّہ جاری کیا تھا جو آج بھی وقت کی پابندی کے ساتھ ہر مہینہ اس طرح شائع ہوتا ہے جس طرح ہر روز سورج پابندی کے ساتھ نکلتا ہے۔ انہوں نے مصر میں عرب قومیت اور فرعونیت کو جامۂ تقدیس عطا کرنے پر اور اس پر فخر کرنے کی دعوت پر اپنے اداریوں میں طاقتور تنقید کی تھی۔ عرب قومیت اور فرعونیت کی تحریک کے روح رواں جمال عبدالناصر تھے۔ انہوں نے قاہرہ کے چوراہے پر فرعون کا مجسمہ نصب کروایا تھا۔ جب مولانا محمد الحسنی نے بہت گرم اور پرزور تنقیدیں لکھیں تو

مصر سے مشہور اخبار ''الاہرام'' نے اداریہ لکھا کہ مصر اور ہندوستان کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ اس دیرینہ تعلقات میں آئندہ کوئی رخنہ پڑا تو اس کی ذمہ داری ندوۃ العلماء کے عربی مجلّہ البعث الاسلامی کے سر پر ہوگی۔ ان کے طاقتور مضامین کا مجموعہ ''الاسلام الممتحن'' اور ''مصر تتنفس'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

مولانا عبداللہ حسنی، مولانا محمد الحسنی کے فرزند ارجمند تھے، صرف فرزند نسبی نہیں تھے بلکہ فرزند معنوی بھی تھے، نابغۂ روزگار شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خاندان کے چشم وچراغ تھے اور ان کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ وہ پاک دل اور پاک باز انسان تھے۔ وہ ندوۃ العلماء میں حدیث کے استاذ تھے۔ عربی جریدہ الرائد کے نائب مدیر تھے۔ خاندانی شرافت اور ذوق عبادت اور مولانا علی میاں کی جانب سے اجازت وخلافت نے انہیں سرحلقۂ اتقیاء اور وارث دعوتِ انبیاء بنا دیا تھا۔ وہ ندوہ میں تدریس کے فرائض کے ساتھ طلبہ کی تربیت کرتے تھے اور بڑی خاموشی سے غیر مسلموں میں دعوتی کام انجام دے رہے تھے اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کے انتقال کے بعد مولانا علی میاں کی تحریک پیام انسانیت کو بھی وہ چلا رہے تھے۔ ملک اور معاشرہ میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو صالح بھی ہوں اور مصلح بھی ہوں۔ عالم دین بھی ہوں اور اسی کے ساتھ بہترین معلم اور مربی بھی ہوں۔ صاحب تاثیر بھی ہوں اور صاحب تسخیر بھی ہوں جو علم اور عمل دونوں اعتبار سے ایک نمونہ اور روشنی کا مینار ہوں۔ جنہوں نے اپنے فیض محبت سے عشق الٰہی اور محبت رسول کی چنگاری سینوں میں لگائی ہو اور ایمان کی حرارت پیدا کی ہو، جو لوگ عبداللہ حسنی صاحب کے نام سے اور ان کے کام سے اور ان کی دعوتی اور اصلاحی خدمات سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے ایک خاص حلقہ میں کیسا اصلاح وانقلاب برپا کردیا تھا اور ان کو یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے انتقال پر ملال سے کیسا افسوس ناک خلاء پیدا ہوگیا ہے۔

وفات پاچکے سب رہ روان جادۂ عشق
ملال یہ ہے کہ دہلیز عاشقاں بھی گئی

ایک بار رمضان کے زمانہ میں راقم سطور کا رائے بریلی جانا ہوا تھا۔ حیرت وتعجب کی انتہاء نہ رہی تھی جب اس نے یہ دیکھا کہ پندرہ، سولہ نومسلم حضرات مسجد میں اعتکاف کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ مولانا عبداللہ حسنی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں چندلوگ اعتکاف کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان نومسلموں میں ایک اچھی خاصی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ بہت سے لوگوں کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ ایک شنکر آچاریہ بھی اندر سے مسلمان ہو چکے ہیں اور اسلام کے دفاع میں انہوں نے کتاب بھی لکھی ہے اور وہ سیرت کے جلسوں میں تقریریں بھی کرتے ہیں۔

اگر مولانا عبداللہ حسنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ طویل عمر ملی ہوتی جو عام طور پر سے لوگوں کو مل جاتی ہے تو ان کا علمی ادبی اور دعوتی کام بہت نمایاں ہوتا اور لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ مرشد ومربی مولانا علی میاں کی کیسی کیسی نسبتیں ان کی طرف منتقل ہوئی ہیں اور وہ کن اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حامل ہیں۔ ان کی صحبت کیمیاء پر اثر تھی۔ ان سے جو بھی قریب ہوتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ایک ادارہ تھے، تربیت کا مرکز تھے، کئی دینی اداروں کے روحِ رواں تھے، خود ایک تحریک تھے، دین کے سپاہی بھی تھے، سپہ سالار بھی تھے، لشکر جرار بھی تھے، مردم گری اور انسانیت کی چارہ سازی کے لئے بے چین رہتے تھے۔ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ طلبہ کی تعلیمی اور اخلاقی تربیت کا فریضہ بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ ان کے عربی مضامین جو ''الرائد'' میں شائع ہو رہے تھے وہ دینی اور علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے۔ اگر حالات اپنے طبعی رفتار سے چلتے رہتے اور قدرت نے انہیں کچھ زیادہ وقت دیا ہوتا تو مسلمانوں کی بہت مقبول نمائندہ اور مثالی

شخصیت بن جاتے۔

مولانا عبداللہ حسنی نے مولانا علی میاںؒ سے کسب فیض کیا تھا۔ روحانیت عربی زبان میں انشاء پردازی اور دعوتِ دین کی نسبتوں کے علاوہ مولانا علی میاں کی بہت منفرد اور اعلیٰ اخلاقی خصوصیات ان کی طرف منتقل ہوئیں تھیں۔ جن کو ''مزاج علی'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ ''حب علی'' کچھ اور شئے ہے اور ''مزاج علی'' کچھ اور چیز ہے۔ مولانا علی میاں کو چاہنے والے، ماننے والے اور ان سے محبت اور عقیدت رکھنے والے دنیا میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہ ''حب علی'' دنیا میں جتنا عام ہے ''مزاج علی'' اتنا ہی کم یاب بلکہ تقریباً نایاب ہے۔ ''حب علی'' تو اتنا عام اور عالم اسلام پر محیط ہے کہ وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو سمندر کی مچھلیاں بھی اس سے محبت کرنے لگتی ہیں اور فضاء کے پرندے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ مولانا علی میاں کے چاہنے والے ہر مسلک ہر جماعت اور ہر گروہ میں ملیں گے اور دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں پائے جائیں گے جیسے کہ قدرت کی جانب سے مولانا علی میاں کے لئے محبت کی کوئی تحریر لکھ دی گئی ہو اگر کوئی شخص مولانا علی میاں سے بغض اور عداوت رکھنے والا بن جائے گا تو لوگ اس کی شرافت اور نیکی پر شبہ کریں گے۔ یہ ''حب علی'' جس قدر عام وسیع تر اور ہمہ گیر ہے ''مزاج علی'' اسی قدر نادر اور تقریباً دنیا میں ناپید اور نایاب ہے۔ ''مزاج علی'' صرف روحانیت اور تصوف اور تقویٰ اور طہارت کا نام نہیں اگر چہ یہ خصوصیت بھی اس میں داخل ہے۔ ''مزاج علی'' صرف علمی کمالات اور تصنیفات اور خطابات کا نام نہیں اگر چہ یہ وصف بھی اس میں داخل ہے۔ ''مزاج علی'' کا مطلب ہے دولت دنیا سے مکمل بے نیازی اور استغناء ''مزاج علی'' نام ہے انتہائی بے نفسی اور تواضع اور فروتنی کا، ''مزاج علی'' نام ہے دین کے بارے میں شدید غیرت وحمیت کا ''مزاج علی'' نام ہے ہر چھوٹے بڑے شخص کی دل داری اور دل بدست آوری کا، ''مزاج علی'' نام ہے

خوردنوازی کا اور ایک کی عزت افزائی کا، ''مزاج علی'' نام ہے اصلاح وتربیت میں حکمت اور تدریج سے کام لینے کا، ''مزاج علی'' نام ہے کسی کی مخالفت نہ کرنے کا اور اختلاف میں بھی اعتدال پر قائم رہنے کا، ''مزاج علی'' نام ہے دوست تو دوست دشمن کی تشہیر نہ کرنے کا اور کسی کو رسوانہ ہونے دینے کا، ''مزاج علی'' نام ہے مخالف کا بھی، اعزاز واکرام کرنے کا بھی اور اس کی خیر خواہی اور اس کو فائدہ پہنچانے کی فکر بھی۔ مولانا علی میاں نے یہ ساری خوبیاں اور یہ ساری خصوصیات سیرت نبوی ﷺ سے جذب کی تھیں اور یہ خصوصیات مولانا عبداللہ حسنی تک منتقل ہوئی تھیں اور وہ ان خصوصیات کے وارث تھے اور امید یہ تھی کہ ان کے ذریعہ یہ متاع گراں بہا مسلم معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ عام ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے شریفانہ اخلاق، تقویٰ اور عبادت اور دعوتِ اسلام کا ثواب عطا کرنے کے لئے اپنے پاس بلالیا وہ اپنے مرشد روحانی مولانا علی میاں کے جوار میں آسودۂ خاک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر کرے، ان کو ان کی نیکیوں کا اجر جزیل اور حضرت مولانا محمد رابع حسنی اور تمام اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

(مضمون نگار سیفیل یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ عربی کے سابق پروفیسر ہیں)

☆☆

مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ

خانوادہ شاہ علم اللہ کے روشن چراغ!

● محمد نوشاد عالم ندوی

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم آتے ہیں جو آفتاب ہدایت بن کر طلوع ہوں، انسانیت کے ہر فرد کو اس کی صلاحیت اور ضرورت کے اعتبار سے روشنی اور حرارت عطا کریں اور جب وہ اپنی مختصر زندگی پوری کر کے غروب ہونے لگیں تو پورے ایک عالم کو نئی زندگی عطا کر کے جائیں۔ خانوادہ شاہ علم اللہ کا چراغ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی قدس اللہ سرہ انہی مایہ ناز شخصیات میں سے ایک تھے۔ آپ 29/جنوری 1957 میں پیدا ہوئے۔

مولانا رحمہ اللہ علیہ ایسے لوگوں میں سے تھے جو ہمیشہ خود کو چھوٹا سمجھتے تھے۔ مولانا کے خاندان کے بارے میں پہلے ہی سے سب کو امیدیں تھیں کہ وہ آگے چل کر قیادت سنبھالیں گے۔ مولانا نے خدمتِ خلق کے تعلق سے بڑا کام کرتے ہوئے انسانیت کی رہنمائی کے لئے بہت اچھا کام کیا ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت حسنی خاندان کی اہم ہستی، داعی، تحریک پیامِ انسانیت کے جنرل سکریٹری، الرائد کے ایڈیٹر اور استاد حدیث وتفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء تھے۔ مولانا کی عمر ۶۵ برس کی تھی۔ مولانا مرحوم مایہ ناز اسکالر، مؤسس وایڈیٹر عربی مجلّہ البعث الاسلامی، عربی ادیب مولانا محمد حسنی مرحوم کے فرزند، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کے پوتے، ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے داماد تھے۔ مولانا عبداللہ حسنی ندوی تبلیغ دین کے لیے

ہمیشہ سرگرم رہے۔خاص طور پر غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات سے واقف کرانے اور انہیں قریب لانے کے لئے جو محنت کی وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

مولانا نے ابتدائی تربیت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء سے 1977ء میں فراغت حاصل کی۔مولانا موصوف مولانا علی میاں کے خلیفہ ہونے کے ساتھ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ مولانا سید رابع حسنی ندوی کے داماد تھے۔مولانا کو شروع ہی سے اپنے جد امجد مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ ندوی کی سرپرستی حاصل رہی۔اکثر و بیشتر اسفار میں آپ حضرت مولانا علی میاںؒ کے ساتھ رہتے۔ صرف ہندوستانی اسفار میں ہی نہیں بلکہ بیرونی اسفار مثلاً سعودی عرب، ملیشیا، قطر وغیرہ میں بھی آپ کے ساتھ رہے۔اس طرح مولانا موصوف کو سفر و حضر میں حضرت مولاناؒ سے کافی کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ مولانا عبداللہ کی شخصیت کو عبقری بنانے میں حضرت مولاناؒ کی تربیت کا اہم رول رہا۔آپ کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔کتب بینی کا ذوق وشوق پہلے عادت میں پھر لت اس کے بعد بیماری کی حد تک پہنچ گیا تھا۔مولانا ایک عظیم استاد ہی نہیں بلکہ دین کے بہت بڑے داعی تھے۔وہ ایک مقرر دوراں اور خطیب سحر انگیز بھی تھے۔وہ شعلہ بیاں خطیب، بے باک صحافی، بالغ نظر مفسر قرآن، تاریخ اسلامی کے رمز شناس تھے۔مولانا کا اہم موضوع فکر اسلامی تھا، جس میں لاتعداد خطابات کئے، سیکڑوں لیکچر دئے۔اس کے علاوہ مولانا کی ایک بڑی خصوصیت افراد سازی کی تھی۔

مولانا موصوف نہایت خلیق، ملنسار، پاکباز، تقویٰ شعار اور داعی اسلام تھے۔ندوہ کے علاوہ رائے بریلی میں بھی مولانا موصوف کے دم قدم سے جو روح اور روشنی تھی افسوس کہ اب وہ نہیں رہی۔مولانا کی صلاحیتوں اور لیاقتوں پر حضرت مولانا علی میاں ندوی کو بہت ہی اعتماد تھا۔مولانا موصوف حضرت مولانا ابوالحسن علی ندی کے پیغام کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھے، مولانا سید احمد شہید اکیڈمی کے اہم رکن اور ماہنامہ پیام عرفات کے مدیر

بھی تھے۔رائے بریلی میں مولانا ابوالحسن علی ندوی سینٹر شروع کرنے میں حضرت نے بڑی محنت کی۔علم و فضل کی دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی، لیکن اخلاص اور دین کی سچی تڑپ وہ جنسِ گراں ہے جو مشکل سے ملتی ہے، اس اعتبار سے مولانا کی شخصیت اپنی مثال آپ تھی۔

مولانا نے اپنی علمی تقریروں سے بھی ہمیشہ سامعین کے دلوں کو گرمایا۔موضوع کا احاطہ کرنے میں بھی مولانا ید طولیٰ رکھتے تھے۔مجمع کی مناسبت سے بات کرنا مولانا کا ایک خصوصی وصف تھا۔مولانا کو جہاں عوامی دلوں میں بلاکسی رکاوٹ کے رسوخ تھا، وہیں حکمرانوں کے دلوں میں بھی دھڑکنے کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔ہر جگہ مولانا نے بلاخوف لومۃ لائمہ حکمت سے بھرپور انداز میں حق کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کیا۔تمام اہل علم اس بات کے معترف اور شاہد ہیں کہ مولانا پر جو اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں مولانا نے ان کو کما حقہ پوری زندگی نبھایا۔مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی عبقری شخصیت اس قدر جامع، ہمہ گیر اور مجموعہ کمالات تھی کہ ان کے نقوش اسلامی اور عالمی سطح پر اور مختلف ومتنوع شعبہ جات میں ثبت ہیں۔ان کی علمی و دینی، تعلیمی و اصلاحی، ادبی و تاریخی، قومی و ملی خدمات اور داعیانہ و مصلحانہ کارناموں کی تفصیل کے لیے ایک دفتر بے پایاں درکار ہوگا۔

مولانا موصوف دارالعلوم ندوۃ العلماء میں برسہا برس تک صحیح بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود کلاس میں پابندی سے درس دیتے تھے۔ طلبہ میں بہت زیادہ مقبول تھے۔اس طرح آپ مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد مولانا نے ان کی قائم کردہ تحریک پیام انسانیت کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے کر اس کو بحسن خوبی انجام تک بھی پہنچایا۔مولانا کی وفات کے بعد ایک باعمل اور باکردار ہی نہیں بلکہ باصلاحیت عالم کی ضرورت تھی جو اس سرگرم اور فعال تحریک کے لیے مناسب ہو۔جو مولانا علی میاںؒ کے خوابوں کو تکمیل کرکے ’پیام انسانیت‘ جیسے اہم عمل اور کام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے جتنی کوشش ہوسکی انہوں

نے کی۔ یہی نہیں بلکہ ضرورت پڑے تو وہ اپنے آپ کو وقف کردے۔ بالآخر اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لیے جن پر نظر پڑی وہ شخصیت کوئی اور نہیں بلکہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ ہی تھے۔ ان جیسی شخصیات کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کے لیے یہ بھی ایک بڑی بات ہے کہ یہ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کے پوتے بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک پیام انسانیت کے تحت برادران وطن کو اسلام سے متعارف کرانے کا کام مولانا کو اپنے دادا سے ورثہ میں ملا تھا۔ مولانا نے تحریک پیام انسانیت کے تحت جو کام انجام دیا وہ کسی سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ انہوں نے ان نوجوان طبقے کو اسلام کی طرف بلایا جنہوں نے اسلامی گھروں میں آنکھیں کھولیں لیکن اسلام سے ناواقف ہی نہیں بلکہ ناآشنا تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اسلام کیا ہے؟ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مولانا نے اپنی سنجیدگی اور بردباری کی مثال پیش کی۔ انہوں نے العافیہ نام سے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پیغام کو آسانی سے لوگوں تک پہنچاسکیں۔

مولانا جانتے تھے کہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کوئی کام نہیں ہونے والا ہے اس لیے انہوں نے افرادسازی پر بھی خوب زور دیا اور قرآن کی آیت ادعوا الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنہ کا عملی پیکر بن کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کی زبان میں وہ تاثیر عطا کی تھی کہ لوگ ان کی دعوت پر جوق درجوق اسلام کی طرف آتے گئے۔ اس کام میں انہوں نے غیرمسلم بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ جوڑا۔ اس تحریک کے تحت جو لوگ کام کررہے تھے ان میں ایک بڑی تعداد غیرمسلموں کی بھی تھی۔ مولانا کا ایک خاص انداز تھا، جس کو ہر کس وناکس پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اس دعوتی تحریک سے بہت سے لوگوں کو اللہ نے ایمان کی توفیق عطا کی۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں اسلام سے متعلق لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ مولانا کا ہی یہ امتیاز تھا کہ

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

جو لوگ اسلام کو غلط اور دہشت گردی کو فروغ دینے والا مذہب سمجھتے تھے ان لوگوں کو اسی تحریک کے ذریعہ یہ درس دیا کہ اسلام امن وآشتی اور بھائی چارہ کا مذہب ہے۔ اسی تحریک کے ذریعہ مولانا نے اسلام مخالف پروپیگنڈے کا خاطر خواہ جواب بھی دیا۔

ہم جب ندوہ میں عالیہ رابعہ میں زیر تعلیم تھے تو مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ ترمذی ثانی پڑھایا کرتے تھے، لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ جس سیکشن میں پڑھاتے تھے بدقسمتی سے ہم اس سیکشن میں نہیں تھے، لیکن چونکہ ایک سیکشن کے طلبہ سے دوسرے سیکشن کے طلبہ سے بات چیت ہوتی رہتی تھی، اور لوگ ایک دوسرے استاد کے بارے میں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے۔ طلبہ ان کے تدریسی انداز بیاں کے بارے میں بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تدریس کا جو انداز ان کو عطا کیا تھا اس کو صفحہ قرطاس پر بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان کی زبان میں بلا کی تاثیر تھی، وہ ایک بار جو کچھ طلبہ کو پڑھادیتے تھے طلبہ اس کو حفظ کرلیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جب وہ چلتے تھے تو نہایت ہی انکساری وعاجزی کے ساتھ چلتے تھے۔ ان کے اس انداز کے بارے میں یہ کہا جائے کہ: کچھ فرشتے چل رہے تھے جیسے انسانوں کے ساتھ، تو بجا ہوگا۔ اس کے علاوہ طلبہ کے تئیں بہت ہی نرم اور مشفق تھے۔

اللہ رب العزت نے آپ کو اعلیٰ درجے کا فہم، اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھنے والا دل، نپی تلی، جانچی، پرکھی وزن دار اور اذہان وقلوب کو اپیل کرنے والی رائے، طاقتور قلم، پر تاثیر زبان جیسی خوبیوں سے نوازا تھا۔ مولانا کی ایک نمایاں صفت فکری اعتدال بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں بلا کی تاثیر رکھی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کا دعوتی انداز بڑا ہی موثر تھا۔ مولانا ایک ممتاز عالم دین اور محقق تھے۔ آپ کی صلاحیتوں، کوششوں، کاوشوں، قربانیوں اور خدمات کی وجہ سے آج ہندوستان کے مختلف حلقوں میں تحریک پیام انسانیت کا کام زور وشور سے چل رہا ہے۔ مولانا اکثر کہا کرتے تھے دعوت وتبلیغ کا کام بہت ہی مشکل

ضرور ہے لیکن بہت اہم بھی ہے۔اس کام کو تنظیم اور میڈیا کے پروپیگنڈے سے بلند و برتر ہوکر کرنا چاہئے۔مولانا کو پورے عالم اسلام میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ وہ بہت سارے مکاتب و مدارس کے ذمہ دار بھی تھے۔مولانا کو عربی زبان میں دسترس حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہم عربی رسالے کی ادارت کی ذمہ داری بھی ان ہی کے ذمہ تھی، جس کو وہ تاحیات بحسن اسلوبی انجام دیتے رہے۔اس کے علاوہ 'تعمیر حیات' کی بھی اہم ذمہ داری ان کے ذمہ تھی۔مولانا معہد الدعوۃ کے صدر بھی تھے۔انہوں نے مولانا علی میاںؒ ندوی کی کئی کتابوں اور تقریروں کا ترجمہ بھی کیا۔

موت تو برحق ہے،اس سے کس کو رستگاری ہے۔بالآخر مولانا موصوف نے بھی 30؍جنوری2013ءکو داعی اجل کو لبیک کہا۔مولانا کی وفات کی خبر پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ہر چہار جانب سے، ملک اور بیرون ملک سے، مدارس و مکاتب سے، دینی، تعلیمی، اصلاحی، دعوتی اور سیاسی تنظیموں کی جانب سے تعزیتوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ امام حرمین شریفین شیخ خالد بن علی الغامدی، مسجد نبوی مدینہ منورہ کے امام شیخ فلاح البدیر و دیگر اہم شخصیات نے بھی ٹیلی فون پر تعزیت کی۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کے جانشیں برادر خورد مولانا سید بلال حسنی ندوی کو ان کی دعوتی، اصلاحی اور تعلیمی مشن کو بحسن خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اس راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کرے۔پسماندگان، لواحقین اور دیگر چاہنے والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ہم سب کو چاہئے کہ مولانا کے محاسن کو یاد کرتے ہوئے ان کیلئے دعا کریں اور ان صفات و عادات کو اپنے اندر لانے کی کوشش کریں۔اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔

(مضمون نگار ندوہ سے فارغ التحصیل وصحافی ہیں)

☆☆

پیام انسانیت

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

'متاعِ کمال انسانیت'

● متکلم اسلام مولانا محمد سالم قاسمی
جانشین حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مہتمم دارالعلوم دیوبند

''کمال انسانیت'' اس حقیقت کو اعتقاد اور عملاً قطعیت کے ساتھ سمجھ لینے میں ہی دائر ہے کہ انسانی زندگی اور عالم دنیا اور اس کی تمام موجودات بلا استثناء صرف مسائل بنا کر قدرت فیاض نے انسانیت کو عطا فرمائی ہیں۔ ان کا مقصدیت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

دوسری جانب نا قابل انکار مدت کے بعد کی نہ ختم ہونے والی زندگی اور پائیدار عالم کبھی نہ ختم ہونے والی ہر مقصدیت کا حامل ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے

''**ان الدنیا خلقت لکم و انکم خلقتم للآخرة** '' اس کی تفاصیل کا اجمال ہے۔

''اسلام'' اسی حقیقت کا مکمل و مدلل ترجمان ہے، جبکہ مختلف اہل مذاہب نے اس نا قابل انکار حقیقت کے اعتراف کے باوجود عقلاً اور عملاً اس کے برعکس عالم دنیا کے ساتھ مقصدیت کو وابستہ کر کے صراط مستقیم اور راہ نجات سے منھ موڑ لیا ہے۔ دین اسلام نے ناپائیدار عالم دنیا میں طاعات، عبادات، معاملات، عقوبات سیاسیات، معاشرات اور تجارات وغیرہ کو باوقعت وسائل کی اہمیت عطا فرما کر، عالم آخرت کی نہ ختم ہونے والی بے قراری کو بے مثل و بے مثالی مدلل فکری متاع بنا کر انسانیت کو بطور میراث عطا فرمائی ہے۔

جس کی فکری صداقت، علمی عظمت اور انمٹ دوامیت، نہ تو کبھی باشعور انسانی معاشرے میں کمزوریوں سے اور ہزیمت سے دوچار ہوئی ہے اور نہ کبھی اس کو وقت کے چیلنجوں کے منھ توڑ جواب دینے کی ضرورت پیش آئی۔ بس یہ ہی صداقت کا انسانیت نواز اسلامی پیغام، انسانیت کیلئے جس طرح ہمیشہ ذریعہ نجات رہا ہے۔ آج بھی بلا خوف تر دد یہی پیغام انسانیت کیلئے سچا رہنما رہے گا۔

احقر محمد سالم قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف)
۱۸،۵،۱۴۳۱ھ
مطابق ۳،۵،۲۰۱۰

☆☆

پیغام

● شیخ الادب حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پیام انسانیت کنونشن، خیر کثیر کا باعث:

بخدمت گرامی حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی دامت برکاتہم بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار۔

آپ نے پیام انسانیت کے موضوع پر ''جامعۃ القاسم'' کے وسیع میدان میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد کر کے جملہ وابستگان علم وآگہی کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ **جزاکم اللّٰہ خیر الجزاء.**

میں سمجھتا ہوں کہ اس عظیم اجلاس سے وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی، اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے، اتنی بڑی تعداد میں جو تین لاکھ کے قریب تھی، لوگوں کا شریک ہونا بھی ایک فال نیک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس طرح کے بامقصد اجتماعات کے لئے ہمہ تن انتظار ہیں، اس وقت امت مسلمہ کے ساتھ انسانیت کا مسئلہ بہت زیادہ قابل فکر ہے، ہمارے معاشرے جرائم اور خودغرضی کی کگار پر کھڑے ہیں، لوگوں کے دلوں میں اعتماد واتحاد اور محبت واخوت کی فضا پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

آپ نے بتوفیق الٰہی اس ضرورت کو نہایت اچھے انداز سے پوری کرنے کی کوشش

فرمائی، بہار کے وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار صاحب اور جناب عزیز برنی گروپ ایڈیٹر راشٹریہ سہارا کی شرکت بہت زیادہ بامعنی ہے، حضرت مولانا سید محمد شاہد مظاہری امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا سلیم محمد کریم صدر ''دعوت القرآن، انٹرنیشنل جنوبی افریقہ'' لندن سے حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری ''چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم لندن'' کی شرکت مزید باعث خیر ثابت ہوئی، ایوارڈ پیش کرنا بھی ایک اہم ترین ضرورت سے کسی طرح کم نہیں ہے، میں آنجناب کو اس کامیاب اور مفید ''پیام انسانیت کنونشن'' پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ سے اپنے دین اور انسانیت کی خدمت کا کام لیتا رہے اور آپ کے ذریعہ دوسروں کو حوصلہ اور بہترین نمونہ عمل عطا ہو۔ (آمین)

اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھیں، میں دعاؤں کا بیحد محتاج ہوں۔ اللہ کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

آپ کا مخلص
سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۹/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ، بمطابق ۵/مئی ۲۰۱۰ء

☆☆

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

پیغام

● حضرت اقدس مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری مدظلہ العالی
نواسہ شیخ محمد زکریا کاندھلویؒ وامین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

خیر الناس من ينفع الناس:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل میں امت محمدیہ کو ''خیر امت'' کا تمغہ واعزاز ملا ہوا ہے، اس لئے خیر امت کے لئے ''خیر الناس'' ہونا شرط اولین اور دلیل کامیابی ہے۔

آج پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے یہی صدا لگائی جا رہی ہے کہ یہ امت اپنے بھولے ہوئے سبق کو دوبارہ یاد کرے۔ اپنے فرض منصبی کو پہچانے اور پوری دنیائے انسانیت پر محنت کرکے ان کو خیر کے راستوں پر لائے اور محبت ورواداری، حسن اخلاق اور صفائی معاملات کا عمدہ اور مخلصانہ برتاؤ کر کے اس ذمہ داری کو پورا کرے جو بارگاہ خداوند سے اس کو سونپی گئی ہے۔

بندہ
محمد شاہد غفرلہ
امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور۔ یوپی
۱۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ

☆☆

پیغام

● **عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری مدظلہ العالی**

خلیفۂ اجل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند،
مہتمم جامعہ عربیہ نورالاسلام میرٹھ یوپی

عزیزم محترم جناب مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی حفظ اللہ
بانی مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار
مدیر اعلیٰ معارف قاسم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
خدا کرے آں عزیز مع رفقاء کے ہر طرح بعافیت ہوں!

ہندو نیپال کی سرحد پر تعلیم وتربیت اور دعوۃ وتبلیغ کے سلسلہ میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آں عزیز نے اپنی جہد مسلسل اور کدوکاوش کے ذریعہ خود اپنی ایک تاریخ بنائی ہے، جس کی ماضی قریب میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ ۲۶ اپریل ۲۰۱۰ء کا ''پیام انسانیت کنونشن'' نے ملک اور بیرون ملک میں تہلکہ مچادیا ہے۔ آپ کی آواز پر تقریباً تین لاکھ سے زائد مجمع کا جمع ہونا غیر معمولی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ آں عزیز کو مزید حوصلہ عنایت فرمائے اور قدم بہ قدم پر اپنی نصرت اور غیبی مدد سے ہم کنار فرمائے، آمین۔

مولانا حکیم محمد اسلام انصاری
مہتمم جامعہ عربیہ نورالاسلام میرٹھ یوپی

☆☆

پیغام

● **ناموس مدارس کے پاسبان حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی مدظلہ العالی**

بانی ومہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ گجرات

الحمدللہ حمداً کثیراً۔

دنیا فکری بحران کی شکار ہے اور ہر چہار جانب کسی ایسے پیغام کی پیاس محسوس کی جارہی ہے جس میں امن واخوت اور بقائے باہم کی تلقین ہو اور 'جیو اور جینے دو' کی پالیسی پر عمل پیرائی کی بات ہو۔ بلاشبہ وہ پیام جس میں انسانیت کی بقا اور تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے وہ صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں پایا جاتا ہے، چنانچہ آج پیاسی دنیا کو اس پیام سے روشناس کرانے کی ذمہ داری مسلمانوں اور خاص کر علماء امت پر ہے۔ دنیا بھر میں پیام انسانیت کی جو بھی تحریکیں چلائی جارہی ہیں وہ یقینی طور پر خوش آئند اور دوررس ومثبت نتائج برآمد کرنے والی ہیں، اس مہم میں جو بھی صاحب فکر ودانش لگے ہوئے ہیں وہ قابل مبارکباد ہی نہیں، بلکہ قابل ستائش بھی ہیں۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ رفیق محترم مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی ضلع سپول بہار نے 26 اپریل 2010 کو ایک تاریخی اجلاس ''پیام انسانیت کنونشن'' منعقد کیا جس میں بلاتفریق مذہب وملت لاکھوں مرد وخواتین نے شرکت کی۔ یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ کنونشن سے قبل ''جامعۃ القاسم'' کے مؤقر وفود نے ایک درجن اجلاس اور کئی درجن میٹنگیں اسی عنوان سے گیارہ اضلاع میں

کیں، یقینی طور پر پیام انسانیت کی اس مہم کے اچھے اثرات سماج میں پائے جا رہے ہیں۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب اور ان کے دیگر معاونین کو دینی مہمات کو سر کرنے کی مزید ہمت وحوصلہ دے۔ آمین۔

بلا شبہ ہندوستان کے حالات کے تناظر میں مدارس اسلامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ پیام انسانیت کے عنوان سے دین کی بات مختلف مذاہب میں پھیلائیں اور بزرگان دین ایسی مہمات کی سرپرستی کریں۔ ’’جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ‘‘ کے زیر اہتمام ہونے والے اس تاریخی ’’پیام انسانیت کنونشن‘‘ کے بعد اسی موضوع پر ماہنامہ ’’معارف قاسم جدید‘‘ کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہونے جا رہا ہے، میں اس موقع پر مدیر اعلیٰ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس اہم دستاویز کے ذریعے بھی پیام انسانیت کی مہم کو دور دور تک پھیلایا جاسکے گا۔ اللہ رب العزت تمام احباب ومخلصین کو جزائے خیر دے۔ آمین!

احمد دیولوی

بانی ومہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر، گجرات

۱۶ر مئی ۲۰۱۰ء مطابق یکم جمادی الآخر ۱۴۳۱ھ

☆☆

پیغام

● حضرت مولانا محمد ابراہیم مظاہری مدظلہ العالی
بانی ومہتمم جامعہ قاسمیہ کھروڈ بھروچ، گجرات

مورخہ ۵؍ مئی ۲۰۱۰ء بدھ کے روز کی بات ہے کہ میرے رفیق محترم جناب مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار نے اپنے ایک کرم فرما محسن جناب حافظ احمد پٹیل صاحب کی عیادت کیلئے گجرات کا سفر فرمایا، اسی سفر میں جامعہ قاسمیہ کھروڈ گجرات کی نسبت سے مجھے بھی ملاقات کا شرف دیا، برسبیل تذکرہ پیام انسانیت کنونشن اور اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی معارف قاسم جو دینی اہم ماہ نامہ رسالہ ہے آپ کی زیر نگرانی سرانجام پا رہا ہے۔ مجھے بطور ملاحظہ عنایت فرمایا، پھر فرمایا کہ: آئندہ کا شمارہ پیام انسانیت کے عنوان سے آرہا ہے، آپ بھی پیغام لکھ دیں، من آنم کہ من دانم دل ہی دل میں اپنی ذات پر اپنی نااہلی کا اعتراف کرتے ہوئے نادم ہوا، تاہم ایک اچھی بات اور اچھے کام کا مطالبہ اور پیش کش تھی، اللہ سے دعا کرتے ہوئے انشاء اللہ کہہ دیا، مندرجہ ذیل تحریر اسی کا تکملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عامل بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

علم بھی عظیم امانت ہے، علم صحیح کی تبلیغ امانت ہے، اپنے مفاد وغرض کے پیش نظر کوئی بات نہ چھپائے، ادھوری ناقص اور غلط نہ کہے۔ راز وبھید بھی امانت ہے کسی کی خفیہ بات کا جان لینا امانت ہے۔ لہذا کسی کی پوشیدہ بات کو ظاہر کرنا اور لوگوں کو بتلا دینا خیانت ہے، اللہ تعالیٰ افشائے راز سے ہماری حفاظت فرمائے۔ ’’المجلس بالامانۃ‘‘ یہ حضور پاک

ﷺ کا ارشاد ہے: اس سے صاف عیاں ہے کہ مجلس میں ہونے والی گفتگو امانت ہے، مجلس میں بات سننے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ بات کو اپنے سینے میں محفوظ رکھے پانی کے ریلے کی طرح آگے نہ بڑھائیں، اسی طرح حکومت یا کوئی بھی ادارہ کے جو عہدے اور مناصب ہیں وہ امانت ہے۔ اہل حکومت اور اہل اقتدار اپنے مفاد کے خاطر کوئی عہدہ اور منصب کسی ایسے شخص کو سپرد کرے جو علماً وعملاً تجربۃً کوئی اہلیت اور لیاقت نہیں رکھتا، یہ بھی خیانت ہے۔ حدیث میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کسی شخص نے ایسے شخص کو کوئی عہدہ ومنصب سپرد کیا جسے اس کو علم تھا کہ دوسرا اس عہدہ کے لئے زیادہ مناصب اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی اور اللہ کے رسول کی خیانت کی اور تمام مسلمانوں کی خیانت کی۔ غرض کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے بیان نہ کیا ہو، یہ سارے پیغامات نبوی ﷺ حق انسانیت کی تکمیل کی زبردست نشانی ہے۔

محمد ابراہیم مظاہری

خادم جامعہ قاسمیہ کھروڈ، گجرات

۵/مئی ۲۰۱۰ء مطابق ۲۰/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ

☆☆

پیغام

● **حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی مدظلہ العالی**

ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ وچیئرمین حج کمیٹی بہار

جناب مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب

بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' کے زیر اہتمام ''پیام انسانیت کنونشن'' میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا اس کیلئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، لیکن بعض اہم مشغولیتوں کی بنا پر میں اس تاریخی کنونشن میں شریک نہ ہوسکا جس کا مجھے ملال ہے۔ کنونشن کی غیر معمولی کامیابی کی اطلاع پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس کے دوررس نتائج تادیر قائم رہیں۔ پیام انسانیت کنونشن میں امارت شرعیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (نائب ناظم امارت شرعیہ) نے جو تجاویز پیش کیں وہ قابل عمل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح قادیانی مہم کے سدباب کے لیے جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ نے ''تحریک تحفظ ختم نبوت'' چلائی اور اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے اسی طرح پیام انسانیت کی تحریک جو آپ نے شروع کی ہے اللہ رب العزت آپ کے اس تحریک کی کاوشوں کو بھی مفید نتائج کے ساتھ بارآور فرمائے۔ آمین!

''پیام انسانیت کنونشن'' میں ریاست کے وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار، روزنامہ راشٹریہ

سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی، حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن)، مولانا سلیم محمد کریم (جنوبی افریقہ)، حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری، حافظ محمد شہاب الدین (العین متحدہ عرب امارات) رکن پارلیمنٹ جناب علی انور صاحب جیسے صاحب نظر وفکر لوگوں کو جمع کر کے آپ نے اچھا پیغام دیا اور اس کے اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ پیام انسانیت کنونشن میں مجھ ناچیز کو ''ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد ایوارڈ'' سے نوازا ہے۔ اس کیلئے میں بے حد شکر گذار ہوں اور اللہ سے دعا گو ہوں کہ جامعۃ القاسم کی سرگرمیاں مزید مفید و بار آور ہوں۔ مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ پیام انسانیت کنونشن کی روداد اور اس کے پیغامات پر مشتمل ''ماہنامہ معارف قاسم جدید'' کا خصوصی شمارہ شائع ہونے جا رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ پیام انسانیت کی مہم میں سرگرم افراد کے لیے یہ خصوصی شمارہ مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اس موقع پر میں اپنے احباب اور علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کے درمیان جو دوری اور کشیدگی پائی جاتی ہے اس کو ختم کرنے کے لیے وہی پیام تیر بہ ہدف ثابت ہوگا جو پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو برس قبل دیا تھا۔ آج بین المذاہب وبین المسالک پروگراموں کی بات کی جاتی ہے، لیکن ان کے درمیان پیام انسانیت کی تحریک سب سے زیادہ مؤثر ہے جو انسان کو ایک بہتر سماج کی دعوت دینے اور پر امن بقائے باہم کی تلقین میں ممد و معاون ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں پیام محمدی صلی علیہ وسلم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

انیس الرحمٰن قاسمی

ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

۱۹ر مئی ۲۰۱۰ء بمطابق ۴ر جمادی الآخر ۱۴۳۱ھ

☆☆

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

پیغام

● حضرت اقدس قاری اسماعیل بسم اللہ مدظلہ العالی
بانی ومہتمم جامعۃ القرأت کفلیتہ، سورت، گجرات

رفیق محترم مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

۷ر مئی ۲۰۱۰ء کو ''امن انگلش میڈیم اسکول'' ڈابھیل گجرات کی خصوصی تقریب کے موقع پر آنجناب کی تشریف آوری ہمارے لیے خوشی کا باعث تھی، اس موقع پر آپ نے پیام انسانیت کنونشن کی جو تفصیلات بتائیں تھیں اور اخبارات میں شائع رپورٹ کا ہم نے مشاہدہ کیا تھا اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ کار خیر، خیر امت کا اہم ترین فریضہ ہے۔ آنجناب نے ''ماہنامہ معارف قاسم جدید'' کے خصوصی شمارہ کے لیے ایک پیغام لکھنے کا حکم دیا تھا، تعمیل حکم میں چند سطور حاضر خدمت ہیں۔

پیام انسانیت کی تحریک کی نشاۃ ثانیہ ملک گیر سطح پر عالم کبیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے ذریعے ہوئی تھی اور یہ تحریک اب بھی ان کے منتسبین چلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ توفیق دی کہ پیام انسانیت کے عنوان سے اجلاس منعقد کریں، ماشاء اللہ یہ جان کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ ''پیام انسانیت کنونشن'' تاریخی نوعیت کا ہوا اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہو رہے ہیں، اللہ سے دعا گو ہوں کہ آپ کے ذریعے دین وملت کا

زیادہ سے زیادہ کام ہو۔آمین ۔بلاشبہ پیام انسانیت کی اولین صداعرب کے ریگستان میں محسن کائنات ﷺ نے سب سے پہلے بلند کی تھی اور ہر عہد میں اس کی اہمیت باقی رہے گی، یہ وہ پیام ہے جس میں انسانوں کوانسان کی عظمت کا پیغام دیا گیا تھا،آج کے عہد میں اس پیام کو پھیلانے کی شدید ضرورت ہے۔

سال گذشتہ برادر مکرم حضرت مولانا مفتی عباس بسم اللہ (مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وشیخ الحدیث جامعۃ القرات کفلیتہ) اور جامعۃ القراءات کے مؤقر استاذ مفتی دبیر عالم قاسمی کی رفاقت میں جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ ضلع سپول بہار حاضری ہوئی تھی، ماشاء اللہ آپ کا حسن انتظام جامعہ کی وسیع وعریض چہار دیواری کے ذرہ ذرہ سے نمایاں ہو رہا تھا، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ چاہے فرقہ باطلہ کا تعاقب ہو، پیام انسانیت کی ترسیل ہو یا دینی ورفاہی خدمات ہو ہر میدان میں آپ کی مہمات کو قبول فرمائے اور مساعی جمیلہ کا بہترین بدل عنایت فرمائے۔آمین۔

اسماعیل بسم اللہ
مہتمم جامعۃ القراءات کفلیتہ،سورت گجرات
۷ مئی ۲۰۱۰ء مطابق ۲ جمادی الآخر ۱۴۳۱ھ

☆☆

دل بدست آور کہ حج اکبر است

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

اسلام واحد ایسا مذہب ہے جس نے انسانیت نوازی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔یہ اور بات ہے کہ اسلام دشمنی میں دنیا اس صداقت سے انحراف کرتے ہوئے مذہب اسلام کے ماننے والوں کو انسانیت کا عظیم دشمن قرار دینے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے۔حالانکہ یہ بات روز وروشن کی طرح عیاں، اور اس حقیقت کو ہر مذاہب کے پیروکار تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اسلام ہی امن وآشتی کا مذہب ہے، نیز اسلام نے ہی اس راہ کے راہی اور انسانیت کے علم برداروں کی کھل کر ہی نہیں جم کر ستائش کی ہے۔پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی سیرت مبارکہ اور آپ کے جانثار اصحابؓ کی حیات مبارکہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ رسول عربی ﷺ کی پوری زندگی انسانیت، محبت ومساوات، یکجہتی، بھائی چارہ اور امن وامان سے عبارت ہے۔یہ اس مذہب کا طرۂ امتیاز ہے کہ جس نے بھی نبی امیؐ کے آفاقی وابدی پیغام کو مشعل راہ بنایا، اپنی زندگی تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں بسر کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا وہ چاہے جس مذہب کا بھی متبع ہو کامیاب اور کامران ہو گیا۔

اسلام نسلی برتری اور کمتری کا قائل نہیں، نہ اس کے نزدیک محض رنگ وروپ فضیلت وشرافت کی بنیاد ہے، نہ کوئی گروہ اس لیے افضل ہوسکتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقہ میں پیدا ہوا ہے، نہ کسی جماعت کو اس لیے برتری حاصل ہوسکتی ہے کہ وہ کسی خاص زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ حالانکہ قبل اسلام رنگ ونسل اور زبان ووطن کی بنیاد پر اونچ نیچ کی جو سرحدیں قائم کر لی گئی تھیں

اسلام کی عدل وحقیقت پسندی پر مبنی فکر نے اپنے قدم کی ٹھوکروں سے ان کو پاش پاش کر دیا اور آج دنیا میں انسانی مساوات کی حمایت اور نسلی تفریق کی مخالفت میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، چاہے لوگ اس سچائی کا اعتراف کریں یا نہ کریں، وہ اسلامی تعلیمات ہی کی بازگشت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ حکم ”کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر.“ (آل عمران) بھی دعوت انسانیت کی سمت میں عظیم مثال ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے والے کبھی راہ راست سے بھٹک نہیں سکتے۔ آج دنیا میں بسنے والا نوع بنی آدم قرآن کریم کے اس پیغام کی تعمیل صدق دل سے کرلے تو پوری دنیا محبت والفت کے گلشن سے گلزار ہو جائے گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ فریضہ بھی خیر امت کا لقب حاصل کرنے والوں کو ہی انجام دینا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ امت محمد یہ خالق کائنات اور رحمت للعالمین کی تعلیمات اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور ان پر تن من دھن سے عمل پیرا ہوں۔

آج انسانی زندگی انتشار وبدنظمی اور تباہی وبربادی سے دوچار ہے۔ ظلم وعداوت شباب پر ہے، فرد فرد میں اور جماعت جماعت میں تصادم وآویزش کا سلسلہ جاری ہے۔ قومی سطح پر ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر بھی منصوبہ بند طریقے سے انسانیت دشمن کوششیں جاری ہیں جن کی بنا پر لمحہ بھر میں ہزاروں اور لاکھوں افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ طاقت وقوت اور زور ودبدبہ کی حکمرانی ہے۔ کمزوروں کا کوئی پرسان حال نہیں، غربت زدہ طبقہ امیروں کے شکنجہ میں ہوتا ہے۔ خودغرضوں کا بول بالا ہے۔ انسان انفرادی واجتماعی طور پر غیر یقینی اور تشویشناک صورت حال سے دوچار ہے۔ غرض یہ کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اور دنیا کا کوئی خطہ بدعنوانیوں اور فسادکاریوں سے پاک نہیں ہے۔ ایسے میں اپنی زندگی پر خودساختہ انسانی قوانین وضوابط کے بجائے خدائی قانون واحکامات پر عمل پیرا ہوکر معاشرہ کو امن وسکون کی دولت بے بہا سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔

عالمی برادری اور انسانی مساوات کے جو اصول نبی کریم ﷺ نے پیش کئے اس نے

انسانیت کو معاشرتی طور پر سربلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تمام عظیم مذاہب نے اسی نظریہ کو پیش کیا ہے، لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے اس نظریہ کو حقیقی طور پر عملی جامہ پہنایا۔ اسلام کے اس پہلو کے بارے میں سروجنی نائیڈو نے جس حقیقت پسندی سے کام لیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ان کے بقول ”اسلام ہی پہلا مذہب ہے کہ جس نے جمہوریت کی تلقین کی اور اس کو نافذ کرکے بھی دکھایا ہے۔ جب بھی مسجد میں صدا بلند ہوتی ہے ایک کسان سے لیکر بادشاہ تک سب مسلمان مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر دن میں پانچ مرتبہ جمہوریت کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں“

اپنی ریاست، اپنے ملک اور پوری دنیا میں ’محسن انسانیتؐ‘ کے ’پیام انسانیت‘ اور تحریک تحفظ ختم نبوت کو پھیلانے اور عام کرنے کی سمت میں ”جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ“ کے بانی ومہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی اور ’معارف قاسم‘ کی جو تحریک چل رہی ہے۔ ”پیام انسانیت کنونشن“ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے پرمسرت موقع پر ۱۰۰ بیڈ پر مشتمل ’شیخ زکریا چیریٹیبل اسپتال‘ کا سنگ بنیاد اکابرامت حضرت مولنا سید محمد شاہد سہارنپوری، حضرت مولانا عیسیٰ منصوری لندن، حضرت مولانا سلیم محمد کریم جنوبی افریقہ اور وزیراعلیٰ بہار جناب نتیش کمار اور رکن پارلیمنٹ علی انور کے ہاتھوں 29 اپریل 2010 کو رکھا گیا۔ اس اسپتال کے قیام کا مقصد اصلی بھی خدمت انسانیت ہے۔ اگر سبھی بنی آدم کے دلوں میں یہ جذبہ صادق رچ بس جائے اور چراغ پیام انسانیت منور کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا جائے تو دنیا سے جبر واستبداد، ظلم وستم، نفرت وظلمت اور رشوت وبدعنوانی کا تاریک بادل چھٹ جائے گا۔ اور ہر سمت، ہر جگہ، گلی گلی اور کوچہ کوچہ یہی پیغام گونجے گا کہ:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

☆☆

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ

● مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

الحمدلله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام على سيدالمرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد وعلى آله و صحبه و على من تبعهم و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين ، امابعد.

سب سے پہلے ہم جملہ اراکین، ذمہ داران، اساتذہ اور ''طلباء جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' پیام انسانیت کنونشن میں آنے والی محترم شخصیتوں کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں اور اپنے تمام مہمان وسامعین کے بے حد ممنون ومشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت پر یہاں آنے کی زحمت اٹھائی۔ خاص طور پر وزیر اعلیٰ بہار جناب نتیش کمار، روز نامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر جناب عزیز برنی، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف) شیخ زکریاؒ کے علوم ومعارف کے ترجمان حضرت مولانا سید محمد شاہد صاحب امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری چیئر مین ورلڈ اسلامک فورم لندن، حضرت مولانا محمد سلیم کریم صدر دعوۃ القرآن انٹرنیشنل جنوبی افریقہ، جناب علی انور صاحب ممبر پارلیمنٹ، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے نائب ناظم حضرت مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، حضرت مولانا صغیر احمد رحمانی رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ ہم دیگر علمائے کرام کے بھی بے حد ممنون ہیں جنہوں نے ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشا۔ نیز اپنے تمام احباب اور اس علاقے کے عوام کی جانب سے ان کا تہہ دل سے

استقبال کرتے ہیں۔

سرزمین سیمانچل کے باشندو!:

آج کے پرآشوب عہد میں جب چہار جانب مذہبی کشمکش، ذات پات کی عصبیت اور لسانی امتیازات کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہیں آپ انسانی اخوت و بھائی چارگی کے پیغام کو پھیلانے کی غرض سے ایسی جگہ جمع ہیں جس کی تاریخ ہی انسان دوستی اور بقائے باہم سے عبارت ہے۔ لہٰذا یہ احساس تفاخر بے جا بھی نہیں ہے، کیونکہ بہار کی یہ سرزمین ان عظیم شخصیتوں کیلئے میدان عمل رہی ہے جن کے کارناموں اور ان کی انسانیت نوازی پر آج پورا ملک فخر کررہا ہے۔ ایسی مقدس سرزمین پر اگر ایک بار پھر تاریخ خود کو دہرانا چاہتی ہے اور انسانیت کی پے در پے تاراجی کے اس دور میں انسان دوستی کا چراغ جلانے کی کوشش ہو رہی ہے تو یقیناً ہمیں مرحبا کہتے ہوئے بے پناہ خوشی ہوگی کیونکہ سسکتی اور دم توڑتی انسانیت کو استحکام بخشنا وقت کی اولین ضرورت ہے۔

محترم حاضرین!:

آج جب بہار کو پورے ہندوستان کے نقشے پر ایک اعلیٰ مقام دلانے کی جدوجہد میں مصروف وزیر اعلیٰ نتیش کمار جی ہمارے درمیان موجود ہیں تو اس حقیقت کو بھی آپ کے گوش گزار کراتے چلیں کہ دنیا کے تین قدیم مذاہب جین مت، ہندومت اور بودھ مت کی تاریخ ریاست بہار سے ہی وابستہ ہے۔ ہندو عہد میں پٹنہ جو بہار کی راجدھانی ہے، ملک کا صدر مقام تھا، جو پاٹلی پوترا، پھر پاٹلی پتر کہلایا۔ بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجوں سے اس شہر کی رونق تھی۔ بودھ عہد کی عظیم یونیورسٹی نالندہ اور وکرم شیلا میں واقع تھی جو اسی صوبہ کا حصہ ہے، جن کی باقیات اب زمین کی کھدائی میں مل رہی ہیں اور وہ باقیات ان دانش گاہوں کی وسعت وعظمت کا پتہ دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کو اسی خطہ علم ومعرفت میں 'گیان'

حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ ’گیا‘ میں اب بھی ان کی یادگار موجود ہے۔ مسلم عہد حکومت سے قبل کی تاریخ میں دو بڑے حکمراں گزرے ہیں جن کی مملکت کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان کا عدل و انصاف، رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور امن وامان کے قیام کے سلسلہ میں ان کی کوششیں ضرب المثل تھیں۔ چندر گپت اور اشوک کا ’پاٹلی پتر‘ پایۂ تخت تھا اور یہیں سے ان کے انصاف کا چشمہ جاری ہوتا تھا۔ الغرض بہار ایسی ریاست ہے جس کی تاریخ مذہبی اعتبار سے بھی روشن ہے اور یہاں ہر عہد میں امن وآشتی کے دیے بھی روشن رہے ہیں، اس زاویہ سے اہل بہار کو یہ کہنے کا حق ہے کہ:

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا

معزز سامعین!:

ہم اس قابل فخر حقیقت کو بھی نہیں بھلا سکتے کہ بہار اپنے ابتدائی مسلم دور سے ہی علماء اور صوفیاء کا مرکز بنا رہا، بہار کے ایک مشہور صوفی شیخ خضر پارہ کی شہرت ہندوستان کے مغربی علاقہ تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ) نے بھی آپ سے استفادہ کیا، پھر سلطان ناصر الدین (متوفی ۱۲۶۶ھ) کا دور وہ عہد میمون ہے جس میں بہار پورے برصغیر کے علماء وصوفیا کا قبلہ عقیدت بن گیا۔ جب امام تاج فقیہ کے پڑپوتے مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ (متوفی ۷۸۲ھ) کی ولادت ہوئی، وہ ایسے صاحب نسبت بزرگ تھے کہ ان کی خانقاہ برصغیر کے طول وعرض میں علماء اور طالبین ہدایت و اصلاح کا سب سے بڑا مرجع تھی، خود فیروز شاہ تغلق (متوفی ۱۳۸۸ھ) ان کا بے حد معتقد تھا اور اسی نے ان کی خانقاہ تعمیر کرائی، شیخ مظفر شمس (متوفی ۷۸۸ھ) اور شیخ منہاج راستی وغیرہ اسی سلسلہ کے بزرگوں میں تھے، جن کے وجود سے طویل عرصہ تک یہ خطہ مطلع انوار بنا رہا۔

یہ خطہ جہاں صاحبِ دل صوفیاء اور درویشوں کے لئے مشہور ہے، وہیں محقق علماء اور صاحبِ نظر فقہاء کی وجہ سے بھی اس کو خاص شہرت حاصل رہی ہے، شیخ بڈھیں حقانی ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک اہم نام ہے، جو منیر کے رہنے والے تھے، آپ کا حلقہ درس اس قدر مقبول تھا کہ شیخ طاہر ملتانی آپ سے استفادہ کے لئے ملتان سے یہاں پہنچے، شیر شاہ سوری ان کا ایسا معتقد تھا کہ اپنے ہاتھوں سے آپ کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ مغلوں کے دور میں بھی علماء بہار کی امتیازی شان قائم رہی، شاہ جہاں اپنے لڑکے اورنگ زیب عالمگیر کی تعلیم وتربیت کے لئے کسی عبقری عالم کی تلاش میں تھا، یہ تلاش ملا موہن بہاری کی صورت میں ثمر آور ہوئی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کا جو کام کرایا، وہ اسلامیان ہند کا سب سے نمایاں اور یادگار علمی کارنامہ ہے، اس کام کے لئے اس خداترس، صاحبِ نظر اور علم پرور بادشاہ نے پورے ملک سے اہم اور ممتاز علماء واصحابِ بصیرت فقہاء کا انتخاب کیا تھا، سرزمین بہار کے لئے مایۂ افتخار ہے کہ ان مرتبین میں چار چار نام علماء بہار کے ہیں، ملا فصیح الدین پھلواری، شیخ ریاض الدین بھاگلپوری، قاضی عنایت اللہ مونگیری اور ملا ابوالحسن دربھنگوی۔

بزرگو اور دوستو!:

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ریاست بہار ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے، علماء، صلحا، اتقیاء غوث وقطب اور دانشوران قوم وملت یہاں بڑی تعداد میں پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ علمی، تحقیقی، تربیتی، تصنیفی، اصلاحی، تبلیغی، تحریکی کاموں میں علماء بہار کا اہم حصہ رہا ہے، امام منطق وفلسفہ صاحب سلم العلوم حضرت علامہ محبّ اللہ بہاریؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، صاحب عون المعبود شیخ شمس الحق عظیم آبادیؒ، اسلامی معاشرے کی تشکیل کے نقیب اور بانی امارت شرعیہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اور فاتح قادیانیت حضرت سید شاہ محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کردار ہمارے دل ودماغ کو جھنجھوڑتا رہا ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ

رحمانیؒ اور حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے نقوش جمیل سے ایک جہان مستفید ہوا ہے، مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ ،رئیس القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ،سلاطین گجرات کے مورخ مولانا ظفر ندویؒ اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے علمی، تحقیقی و تصنیفی کارناموں کو کسی طرح نہیں بھلایا جاسکتا۔اسی طرح لاتعداد علمائے دینِ متین اس سرزمین میں پیدا ہوئے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ،انہی شخصیات میں سے حضرت اقدس مولانا بشارت کریم صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ، مولانا ولایت علیؒ اور مولانا یحییٰ علی عظیم آبادیؒ،شاہ ولی اللہ تحریک کے علم بردار بن کر سامنے آئے اور سب سے اخیر میں علم وادب اور فقہ وشریعت کے رمز شناس حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ ولی اللہی تحریک کے میر کارواں کی حیثیت سے عالم اسلام میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی علماء ومفکرین نے علم وتحقیق کی بزم میں چار چاند لگایا اور پیام انسانیت کی تحریک اور اصلاح معاشرہ کی مہم کو اپنا فریضہ جان کر زبردست محنت کی۔

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کے دشمن کا گھر ملے

عزیز دوستو!:

قصہ مختصر یہ کہ بہار کے جس خطے کی جانب بھی آپ نگاہ اٹھا کر دیکھئے انسان دوستی اور اخوت و بھائی چارگی کی انتہائی زرخیز تاریخ آپ کا استقبال کرتی نظر آئے گی۔نہ مذہب کی تخصیص ہے، نہ دھرم کا بندھن۔کہیں مہاتما گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کی بازگشت سنائی دے گی تو کہیں گوتم بدھ کا فلسفۂ حیات ہمارے درمیان امن وآشتی کا چراغ روشن کرتا نظر آجائے گا۔الغرض جدھر دیکھئے محبت ویگانگت کا پرچم تھامے کوئی نہ کوئی صوفی اور کوئی نہ کوئی مصلح قوم بقائے انسانی کی خاطر سینہ سپر مل جائے گا۔خود ہم اور آپ آج جہاں بیٹھ کر پیام انسانیت کا پرچم بلند کرنے کے آرزومند ہیں، یہ خطہ بھی اللہ کے ولی قاضی اشرف حسین مختار

رحمانیؒ متوفی 1929 کی توجہ کا خاص مرکز رہ چکا ہے جن کی انسان دوستی کے پیغامات کے احسانات سے یہ خطہ ارض دبا ہوا ہے۔ایسی مقدس ہستیوں کے گہوارے میں بصد احترام معزز مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ہمیں خوشی ہورہی ہے، بلکہ امید کا ایک دیا بھی منور ہوتا نظر آرہا ہے کہ اکیسویں صدی کی اس بھاگ دوڑ والی زندگی میں دنیا کو گہوارۂ امن بنانے کی تمنا لئے ہم یہاں اس امید ویقین کے ساتھ جمع ہوئے ہیں کہ ہم دنیا کے سامنے بالعموم اور ہندوستانی قوم کے درمیان بالخصوص پیام انسانیت کا درس دیں گے، اخوت و بھائی چارے کا پیغام پیش کریں گے، انسانیت نوازی کی قدر وقیمت کا احساس دلائیں گے اور دلوں سے نفرتوں، کدورتوں اور بغض وعناد کو ختم کرنے کی کوششیں کریں گے۔

قابل صد احترام حاضرین!:

مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بہت ہی عام فہم اور سادے لفظوں میں انسانیت کے پیام عظیم کو واضح کیا ہے۔چنانچہ پیام انسانیت کے تعلق سے آپ نے تحریر فرمایا ہے:

’’سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، عالم بے عمل کی مذمت، عفو عام، درگذر، توکل، صبر وشکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی، قرابت مندوں، یتیموں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی وبھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، برے ناموں سے یاد نہ کرنا، والدین کی خدمت واطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی وسلامتی کی دعا دینا، حق گوئی وانصاف پسندی، سچی گواہی دینا، فیصلہ میں عدل وانصاف، دشمنوں سے بھی عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں کو احسان

دھرنے کی برائی، فسق وفجور سے نفرت، چوری اور ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لینے کی ممانعت، حسن نیت اور دل کی پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار ومتانت، مجالس میں حسن اخلاق، ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک، شوہر کی اطاعت اور بیوی کے حقوق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغل خوری اور طعنہ زنی کی ممانعت، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز کرنا۔''

علامہ سید سلیمان ندوی کے ان زریں فرمودات پر غور کریں تو یہ ایسے اعمال نہیں ہیں جن پر عمل کرنے کے لیے صرف مسلمانوں سے کہا گیا ہے، بلکہ جتنی باتیں بتائی گئی ہیں وہ سبھی مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یکساں مفید اور عام سماج میں اصلاحی انقلاب لانے والے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم انسانیت نواز اور انسان دوست بننے کا صدق دل سے عزم کرلیں۔

جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

اصحاب نظر دانشور حضرات!

چونکہ ہمارے درمیان ایک ایسے وزیر اعلیٰ تشریف فرما ہیں جن کی قدر ومنزلت ہر مذہب کے لوگوں میں ہے اور ان کے کارہائے نمایاں کا اعتراف خود ان کے مخالفین کو بھی ہے، اس کے علاوہ ہر سطح کے سیاستداں وسماجی قائدین بڑی تعداد میں یہاں موجود ہیں اس لئے میں ماضی کی ایک رپورٹ کے حوالے سے کچھ حقائق پیش کردینا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ اس پر غور کرتے ہوئے یہ حضرات کچھ ٹھوس عملی خاکہ مرتب کریں اور ترقی کی راہیں تلاش کریں۔

میں یہاں 2001 کی سروے رپورٹ سے اخذ کردہ کچھ حقائق پیش کررہا ہوں جو فکر وتشویش میں مبتلا کرنے والی ہیں، لیکن یہ وضاحت یہاں ضروری ہے کہ موجودہ عہد میں

بہار میں ترقی کی کچھ ہوا چلی ہے اور کئی میدانوں میں اس ریاست کی شکل وشبیہ بدلی ہے اور خوش آئند تبدیلی کے امکانات روشن ہیں، لیکن جتنی تبدیلی اور ترقی آنی چاہیے، نہیں آئی، خاص طور پر مسلمانوں کے گھر آنگن میں ترقی کا سورج طلوع نہیں ہوا ہے۔ باوجودیکہ سچر کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات کے بعد مرکزی حکومت نے جن 90 اضلاع کو اقلیتی قرار دیا ہے ان میں پورنیہ کمشنری کے چاروں اضلاع شامل ہیں۔ صورتحال کو دیکھ کر خوش آئند پیش رفت اور روشن مستقبل کی توقع ضرور کی جاسکتی ہے، لیکن ابھی ترقی کا قفل کھلا نہیں ہے۔

حضرات قائدین!

اس موقع پر کچھ تلخ حقائق سرسری طور پر پیش کردینا چاہتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ وزیر اعلیٰ کوسی اور پورنیہ کمشنری کی زبوں حالی کو ختم کرنے کے لیے ایک انقلابی تبدیلی کی جدوجہد کریں گے۔ ایک بات میں واضح کردوں کہ سچر کمیٹی نے گرچہ مسلمانوں کی صورتحال کو دلتوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے، لیکن اس علاقہ کے راست مشاہدہ کے بعد میرا یہ ماننا ہے کہ یہاں مسلمان بھی پسماندہ ہیں اور ہندو بھی، اس لیے یہاں کی ترقی تو خصوصی پیکیج کے ذریعے ہوسکتی ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ریاست بہار میں 78.7 فیصد مسلمان یا تو غریب ہیں یا غریبی سطح سے نیچے کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ ریاستی حکومت سے دستوری درجہ حاصل کردہ ''بہار اقلیتی کمیشن'' کی رپورٹ کہتی ہے۔ سابقہ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ریاست میں محض 47.3 فیصد مسلمان ہی خواندہ ہیں اور 60.3 فیصد مسلمانوں کی تعداد ایسی ہے جو گاؤں میں رہتی ہے۔ کمیشن کی رپورٹ میں مسلمانوں کی اقتصادی، سماجی اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے بارے میں کئی چونکادینے والی تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ 2001 کی مردم شماری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بہار کی 8.38 کروڑ آبادی میں تقریباً 50 فیصدی لوگ غریبی سطح سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں، جبکہ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا

ہے کہ مسلمانوں کی 59.5 فیصد آبادی غریبی سطح سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ 19.2 فیصد لوگ غریب ہیں۔ اگر ہم دونوں کو ملا دیں تو 78.7 فیصد ہوتا ہے، یعنی محض 21.3 فیصد مسلم آبادی قدرے بہتر حالت میں ہے۔ کمیشن کی رپورٹ میں مسلمانوں میں ذات برادری کی حقیقت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ عام مسلمانوں کی حالت بے حد خراب ہے جو متوسط طبقے کے لوگ ہیں وہ بدترین زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ حکومتوں نے ان کی زندگی میں خوشحالی لانے کے لئے ٹھوس اقدامات نہیں کئے۔ رپورٹ کے مطابق اوسط مسلمانوں کو مناسب خورد ونوش تک کا انتظام نہیں ہے۔ دو وقت کی روٹی کے حصول کی جدوجہد میں مسلمان بیمار بھی خوب پڑتے ہیں۔ عموماً شہروں میں رہنے والے مسلمان بیڑی بنانے، ہتھ کرگھا، بنکر جیسے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جہاں کام کرنے کے لئے نہ مطلوبہ روشنی فراہم ہے اور نہ جگہ۔ سیلن بھرے کمروں میں وہ قید رہتے ہیں۔ اعداد وشمار رونگٹے کھڑے کردینے والے ہیں کہ شہری علاقوں میں تو علاج ومعالجہ پر مسلمان توجہ دیتے بھی ہیں، لیکن دیہی علاقوں میں 54 فیصد مسلمان علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس نہیں جا پاتے ہیں، بلکہ ان کے علاج کا ذریعہ جھاڑ پھونک اور دعا تعویز ہے۔ بہار میں سرکاری اسپتالوں کی حالت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بہار 2001 کی مردم شماری اور قومی فروغ انسانی وسائل کے محکمہ کی رپورٹ 2001 میں کہا گیا ہے کہ بہار میں صحت کے متعلق سہولیات پر سب سے کم رقم خرچ ہو رہی ہے۔ 2969 افراد (قومی اوسط 1498 افراد) پر اسپتال کا ایک بستر مہیا ہے۔ 30 ہزار کی آبادی پر ایک طبی مرکز کے ضابطہ کے خلاف 5 گنا زیادہ 169898 افراد پر ایک طبی مرکز ہے، یعنی صرف 9 فیصد آبادی کو طبی سہولیات مہیا ہیں۔ رپورٹ کے مطابق صرف 1.6 فیصد مسلمان کو ہی ایلوپیتھ علاج کے لئے سرکاری اسپتالوں کا فائدہ مل پاتا ہے۔ 0.1 فیصد مسلم یونانی علاج اور 0.9 فیصد مسلمان ہومیوپیتھ علاج پر منحصر ہیں۔

مفکرین قوم!:

بہار میں تعلیم وتدریس کی حالت بھی بدتر ہے۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق بہار میں عمومی تعلیم کا گراف 47.7 فیصد ہے۔ جب کہ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس سے تھوڑا کم 47.6 فیصد مسلم آبادی خواندہ ہے۔ مسلمانوں میں 6.7 فیصد گریجویٹ ہیں۔ سکنڈری پاس صرف 14.5 فیصد ہیں۔ عمومی آبادی کا فیصد اس سے دوگنے کے آس پاس ہے۔ رپورٹ پر سوال اٹھایا گیا ہے کہ 60-50 سال پہلے تک تعلیم کے ہر شعبے میں آگے رہنے والے مسلمانوں کی تعلیمی حالت آج ایسی کیوں ہے؟ بے چین کردینے والا سوال یہ ہے کہ میڈیکل، انجینئرنگ، کمپیوٹر، آئی ٹی، زراعت اور ڈیری کے شعبوں میں مسلمان پچھڑ گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں دیگر ترقیاتی اسکیموں اور سرکاری پروگراموں کا فائدہ بھی بہار میں مسلمانوں کو نہیں مل پاتا ہے۔ اندرا آواس بنانے کے معاملے میں بہار اول مانا جاتا ہے، مگر رپورٹ بتاتی ہے کہ صرف 4.1 فیصد مسلمانوں کو ہی اس کا فائدہ مل پاتا ہے۔ جواہر روزگار یوجنا میں 0.5 فیصد، آئی آر ڈی پی میں 4.5 فیصد مسلمان ہی فائدہ اٹھا سکے۔ صرف 1.3 فیصد مسلمانوں کو ضعیفی پینشن مل رہا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ 7-6 سالوں سے ضعیفی پینشن میں نئے نام شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ''انپورنا یوجنا'' صرف 0.9 فیصد مسلمانوں تک پہنچی ہے۔ حالت یہ ہے کہ ریاستی سرکار ایسے غریب کنبوں کی شناخت ہی نہیں کر پائی جس کے لئے انپورنا یوجنا اور انتودے جیسی اسکیمیں ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی آبادی بڑھی ہے، لیکن روزگار گھٹ گیے ہیں۔ رپورٹ کہتی ہے کہ بھوک اور غریبی سے پریشان مسلمانوں نے اپنی زمینیں اور جائیداد بیچی زیادہ ہیں خریدی کم ہیں۔ رپورٹ کے اوسط میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے 51.9 فیصد زمین یا املاک بیچیں اور صرف 45.7 فیصد خریدی۔ وزیراعلیٰ نتیش کمار کی

کوششوں سے تھوڑی تبدیلی ضرور آئی ہے، لیکن مجموعی صورتحال تقریباً ویسی ہی ہے۔
حضرات میں نے یہ ایک سرسری مطالعہ پیش کیا ہے جو ضروری نہیں کہ صد فیصد صحیح ہوں، لیکن کم وبیش یہی صورتحال ہے جس کا اعتراف بہت سے تجزیہ کاروں کو ہے، مجھے یقین ہے کہ ریاست کی موجودہ حکومت نے کچھ کارگر قدم اٹھائے ہیں لیکن ابھی شاید ابتدا ہوئی ہے اس لیے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی انقلابی تبدیلی آچکی ہے۔

معزز سامعین!:

جس مقام پر آپ حضرات تشریف فرما ہیں وہ کوسی کمشنری کا ایک نہایت پسماندہ گاؤں ہے، اس کے پیچھے تاریخی بیرج ہے جو ۵۶ دروازوں پر مشتمل ہے، جس کی تعمیر سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو اور ویر وکرم شاہ مہندر سابق شاہ نیپال کے دور حکومت میں ہوئی تھی۔ اس علاقے میں ہندوستان کی تاریخی ندی کوسی بڑے آب وتاب کے ساتھ بہتی ہے، یہ ندی کہیں بہار لاتی ہے تو کہیں تباہی مچاتی ہے، بالخصوص جولائی / اگست میں یہ ندی اپنے شباب پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے مکانات اور فصلیں زیر آب ہوجاتی ہیں اور ہر سال یہاں کے مزدوروں اور کسانوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ چونکہ اس علاقے کے نوے فیصد لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت ہے اس لیے سیلاب ان کے لیے ہر برس قہر بن جاتا ہے اور شاید اس علاقے میں غربت کی ایک بڑی وجہ سیلاب بھی ہے۔ اگست 2008 میں کوسی کا تباہ کن سیلاب جس کا دائرہ شمال وجنوب کوسی کو رسیلا تک تقریبا 200 کلو میٹر لمبا اور نرپت گنج سے راگھو پور تک مشرق سے مغرب کی جانب 50 سے 60 کلو میٹر چوڑا تھا جس نے لاکھوں انسانوں کو زندگی اور موت کے بیچ تڑپتا چھوڑ دیا اور ہزاروں انسان کی خوشیاں چھین لی، لاکھوں کی تعداد میں جانور ختم ہو گئے یا بہہ گئے۔ لاکھوں ہیکٹر فصلیں تباہ ہو گئیں۔ دعا فرمائیں کہ رب کریم ہماری آسمانی آفات و آلام سے حفاظت فرمائے (آمین)۔

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

یہاں دو کمشنریاں ہیں، کوسی کمشنری اور پورنیہ کمشنری، دونوں کمشنریاں سات اضلاع پر محیط ہیں۔ ان دونوں کمشنریوں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ شمال میں نیپال کی لمبی سرحد ہے، شمال مشرق میں ہندوستان کی سات ریاستوں سمیت ارونا چل پردیش کا وہ علاقہ بھی ہے جس پر چین ہمیشہ اپنا دبدبہ قائم کر کے ہندوستان کی مشکلیں بڑھاتا رہتا ہے، جبکہ مشرق میں مغربی بنگال کے ساتھ ساتھ بنگلہ دیش کی کھلی سرحد ہے، یوں سمجھا جائے کہ یہ علاقہ نیپال، چین اور بنگلہ دیش کے ہندوستان میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ چنانچہ جب جب ہند۔چین کے آسمانوں میں جنگ کے بادل منڈلاتے ہیں تو یہاں کے لوگ سراسیمگی کی کیفیت سے دوچار ہوجاتے ہیں، لیکن جب جب موقع آیا ہے یہاں کے لوگوں نے ہندوستانی افواج کی دل کھول کر مدد کی ہے اور حب الوطنی سے سرشار ہو کر ان کا جوش وحوصلہ بڑھایا ہے۔

حضرات!:

’’پیام انسانیت کنونشن‘‘ میں وزیر اعلیٰ بہار عالیجناب نتیش کمار صاحب کا بالخصوص ہم استقبال کرنا چاہیں گے جن کی رہنمائی میں بہار کو روشن مستقبل کا ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔ بحیثیت وزیر اعلیٰ انہوں نے بہار کو کیا مقام دلایا؟ یہ ریاست ان کی رہنمائی میں ترقیات کے کن منازل ومراحل سے گزر رہی ہے؟ اس پر تبصرہ سے قطع نظر ہم یہ ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ اس ریاست پر حکمرانی کا موقع محترم وزیر اعلیٰ کو ایسے عہد میں ملا جب انسانیت کو مقدم ٹھہرانے والے افکار وخیالات کو پس پشت ڈال کر ذات وفرقہ اور طبقے کی سیاست کاری کو پروان چڑھانے کی پرزور کوشش کی جارہی تھی۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ طبقاتی کشمش پر مبنی سیاست انسانیت کی بقاء کیلئے سم قاتل سے کم نہیں، لیکن اسے کیا کہئے کہ انسانیت کو پیچھے ڈھکیل کر ہم نے ذات و مذہب اور طبقات و دھرم کو درمیان میں لاکھڑا کرنے کی کم کوششیں نہیں کیں، جس کا نقصان ہم سبھوں نے اٹھایا، مگر شکر ہے کہ ہمیں بہت

جلد ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کا احساس ہوگیا کہ دوستی، رواداری، اخوت، بھائی چارگی اور امن ومحبت کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کی کوشش کریں اور انسانیت کی بقاء اور تحفظ کو یقینی بنانے کیلئے یکجا ہوں۔ بقائے باہم کا نظریہ وفلسفہ جس پر انسانیت کی تشکیل وتعمیر کا مکمل انحصار ہے، غائب ہو چکا ہے۔ آج سسکتی انسانیت اور دم توڑتی شرافت چیخ چیخ کر ہم سے یہ تقاضا کررہی ہے کہ ہم انسانی مساوات کی قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور محاسبہ کے عمل سے گزرتے ہوئے دنیا کو گہوارۂ امن بنانے کیلئے میدان عمل میں کود یں، مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم عدل وانصاف کے چشمے سے حضرت انسان کو دیکھنے کی عادت ڈالیں گے اور مذہب ونسل کی عینک کو اتار پھینکیں گے۔

محترم حضرات!:

میں اس موقع پر جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کی حصولیابیوں کی جانب سرسری طور پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

حضرات! ہندوستان میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے اور سبھی علوم اسلامی کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں، ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' اسی سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے جو ہند۔ نیپال کے سرحدی علاقے میں دینی، اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہے، جس کا شمار ملک کے ممتاز اداروں میں ہوتا ہے۔ جامعۃ القاسم کا قیام ۱۶ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ بمطابق 25 مارچ 1989ء کو عمل میں آیا۔

اس علاقے کے لوگ تعلیمی، اقتصادی وسیاسی پسماندگی کی وجہ سے بے حد غربت اور قبائل کی سی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ غربت وجہالت کا فائدہ اٹھا کر مشنری تحریک اور قادیانی بھولے بھالے عوام کو گمراہ کرتے ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ قادیانی مہم کے دام میں سیکڑوں مسلمان آگئے اور اپنا عقیدہ گنوا بیٹھے، چنانچہ تحریک تحفظ ختم نبوت جامعۃ القاسم نے کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں قادیانی اور دیگر

باطل طاقتوں کے خلاف مہم چلائی جس کے نتیجے میں سیکڑوں لوگ تائب ہوئے اور راہ راست پر آئے، یہ مہم مسلسل جاری ہے۔

جامعۃ القاسم 10 ایکڑ اراضی میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی 18 شاخیں بھی ہیں جہاں دینی تعلیم کا معقول نظم ہے اور جامعہ کے تحت تعلیمی بیداری، اصلاح معاشرہ اور پیام انسانیت کی تحریک چلائی جاتی ہے۔ جامعہ اور اس کی شاخوں میں کل 3125 طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں جبکہ ان میں سے 750 غریب ویتیم طلبہ جامعہ کے ہاسٹل میں مقیم ہیں جن کے قیام وطعام، علاج ومعالجہ اور دیگر ضروری اخراجات جامعہ کی جانب سے پورے کیے جاتے ہیں۔ جامعہ کے اخراجات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں، فی الوقت اس کا سالانہ خرچ تقریباً 11314338.00 روپے ہے، جبکہ آئندہ برسوں میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے سے زائد خرچ ہونے کے امکانات ہیں اور تعمیری اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔

جامعۃ القاسم کے احاطے میں 16000 اسکوائر فٹ اراضی پر ایک عظیم الشان مسجد (جامع امام قاسم) زیر تکمیل ہے، چھت کا کام باقی ہے جو انشاء اللہ اہل خیر کے تعاون اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جلد ہی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ خوشی کی بات ہے کہ جامعۃ القاسم کے احاطے میں رواق الیاس کی دوسری منزل کی تعمیر کا کام چل رہا ہے۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے سیکڑوں طلبہ ٹین شیڈ کے دارالاقامہ میں رہنے پر مجبور ہیں۔ جامعہ کے احاطے میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یاد میں ایک عمارت بنام ''مرکز الامام ابی الحسن علی حسنی ندوی'' کا سنگ بنیاد شیخ الادب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے ہاتھوں رکھا جاچکا ہے۔ ''کوسی ہیومن انٹر کالج، شیخ زکریا چیریٹیبل اسپتال جو 100 بیڈ پر مشتمل ہوگا جس کی تعمیر کا تخمینہ تقریبا ساڑھ چار کروڑ روپے ہے، جس کا سنگ بنیاد رکھا گیا، معہد عائشہ للبنات'' جامعہ کے تعمیری منصوبے میں شامل ہیں۔ جامعہ کی جملہ تعلیمی، اصلاحی وفلاحی سرگرمیوں کو جاری وساری رکھنے اور جملہ تعمیری منصوبوں کو

عملی جامہ پہنانے کے لیےضروری ہے کہ اہل خیر وصاحب توفیق حضرات جامعہ کے خصوصی تعاون کے لئے آگے آئیں۔''الحمدللہ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' کوحضرت اقدس مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری (نواسہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ)امین عام جامعہ مظاہرعلوم سہارنپور کی خصوصی توجہ وسرپرستی حاصل ہے۔

حضرات!میں اس موقع پر وزیراعلیٰ بہار محترم نتیش کمار کا ایک بار پھر خیرمقدم کرتے ہوئے انہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ آزاد دینی مدارس حکومت وقت سے کسی طرح کے مالی تعاون کی نہ توقع رکھتے ہیں اور نہ لینا چاہتے ہیں،لیکن بہت سے مدارس انسانیت کے نام پر عوامی فلاح کا کام کرتے ہیں ان کی مدد اگر کی جائے تو اس کا زبردست فائدہ سماج میں نظر آئے گا،کیونکہ اہل مدارس عوامی خدمت دینی جذبہ سے کرتے ہیں،اس سلسلے میں وزیراعلیٰ سے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جو مدارس رجسٹرڈ ٹرسٹ کے تحت چلتے ہیں انہیں عام سماجی تعمیروترقی، ریلیف اور دیگر ترقیاتی کاموں کے لیے فنڈ فراہم کرانے کی آسان راہ نکالیں، اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس سے بہار کے مسلمانوں کی تصویر بدل سکتی ہے اور رشوت وبدعنوانی کے جس جال کی خبریں آتی رہتی ہیں ان سے نجات مل جائے گی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے مخلص دوست محترم علی انور رکن پارلیمنٹ کا تہہ دل سے استقبال نہ کروں، کیونکہ انہوں نے پسماندہ طبقے کو انصاف دلانے اور اچھوت قرار دی جانے والی برادریوں کو معاشرے میں یکساں مقام دلانے کیلئے لمبی لڑائیاں لڑی ہیں اور پسماندہ مسلمانوں کو ان کے حقوق دلانے کی جدوجہد میں وہ اب بھی مصروف ہیں۔ہمارا ماننا ہے کہ علی انور صاحب کو ابھی منزل نہیں ملی ہے،انہیں ابھی اور آگے بڑھنا ہے۔

اس یقین واعتماد کے ساتھ میں تمام آئے ہوئے مہمانوں کا ایک بار پھر استقبال کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا کہ پیام انسانیت کنونشن میں تاراج ہوتی انسانیت کی بقاء پر نہ صرف یہ کہ بھرپور انداز میں روشنی ڈالیں گے، بلکہ اپنے اسوہ سے انسانیت نوازی کی

ایسی مثالیں بھی پیش کریں گے جو دنیا کیلئے نشان عبرت اور مشعل راہ قرار پاسکے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو کہنے سننے سے زیادہ عمل کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین۔اخیر میں میں اپنے تمام معاونین ومخلصین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی شب وروز کی محنت سے یہ تاریخ ساز کنونشن ہم منعقد کرنے میں کامیاب ہوئے،خاص طور پر میرے کرم فرما جناب علی انور صاحب ایم پی کا جن کا تعاون مجھے ہر مرحلہ میں حاصل رہتا ہے،جن کی معاونت سے گذشتہ دو برس قبل وزیراعلیٰ تک ہماری رسائی ممکن ہوئی اور ہم وزیراعلیٰ کو سپول کے ضلع مجسٹریٹ شریف عالم قادیانی کی غیراسلامی وغیرآئینی سرگرمیوں سے واقف کراسکے جس کے نتیجے میں ضلع مجسٹریٹ کا تبادلہ ہوا۔اسی کے ساتھ میں اپنے معاون اور امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری مولانا محمد یوسف انور، روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی کے سینئر سب ایڈیٹر عبدالقادر شمس، روزنامہ ہندوستان ایکسپریس کے سب ایڈیٹر ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب،مولانا رضوان الحق روزنامہ راشٹریہ سہارا، سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل کے جنرل سکریٹری جناب شاہ جہاں شاد، مولانا حمیدالدین مظاہری، مولانا ضیاء اللہ رحمانی، مولانا اخلاق الرحمٰن قاسمی، مفتی عقیل انور مظاہری، مولانا علی احمد رازی، سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل کے سکریٹری مظفرحسین رحمانی، جامعۃ القاسم کے معاون ناظم مظہرحسین رحمانی، ہمارے طباعتی کاموں کے ڈائریکٹر مصعب انیس عرف گڈو، آرٹ ڈیزائنر مولانا ارشد عالم ندوی، شاہد عبداللہ آفس سکریٹری امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفئر ٹرسٹ انڈیا اور جملہ کارکنان کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کی شب وروز کی محنت سے ہی یہ تاریخ ساز کنونشن کامیاب ہو پایا۔**ذلک فضل اللہ یوتیه من یشاء۔**

☆☆

نسل انسانی کی تربیت اور اسلام

● امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

دنیا میں آج اربوں انسان آباد ہیں، ان میں بے شمار ٹولیاں، بہت سارے فرقے اور طرح طرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں، یہ اختلاف رنگ ونسل کا ہے، زبان وبیان کا ہے، طرز فکر اور انداز فکر کا ہے اور مذہب وملت کا ہے، نہ جانے کتنی طرح کی دھڑے بندیاں دنیا میں موجود ہیں اور یہ سب وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر رہی ہیں۔

اپنے گردوپیش کا جائزہ لیجئے۔ حالات پر ایک سرسری نظر ڈالیے، تو جو جھگڑا سب سے زیادہ پھیلا ہوا اور مرض عام طور پر آپ محسوس کریں گے وہ نسلی امتیاز اور برادری کی برتری ہے۔ اس ملک میں بھی نسلی برتری اور ذات پات کی تفریق دوسرے ملکوں سے کچھ کم نہیں، یہاں ایک عرصہ تک ذات اور برادری کی بنیاد پر کاموں کی تقسیم ہوا کرتی تھی۔ یہاں ایسی قوم آباد ہے جس نے مخصوص نسل اور ذات کو مذہبی امور کی انجام دہی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ بعض کے حصہ میں حکمرانی اور امور سلطنت کی دیکھ بھال آئی۔ کسی ذات کو تجارت وزراعت کا ذمہ دار قرار دیا اور کسی کو اونچی ذات والوں کی خدمت اور غلامی کے لیے وقف کر دیا گیا۔ یہ تقسیم فطرت اور عقل دونوں کے خلاف ہے، بہتر کارکردگی کے لیے برتر صلاحیت کی ضرورت ہوا کرتی ہے، روشن دل، بلند دماغ اور محنت کے بھرپور جذبہ کو ترقی کا معیار ہونا چاہئے۔ مذہبی امور کی انجام دہی کا معاملہ ہو، حکمرانی اور امور سلطنت کی انجام دہی کا مسئلہ ہو، تعلیمی ترقی کی بات ہو یا کوئی اور کام، اس کے لیے صلاحیت چاہئے، ذات

اور برادری نہیں۔ لیکن دنیا کے بہت سارے ممالک میں ان سارے کاموں کے لیے ذات اور نسل کو امتیازی حیثیت دی گئی ہے۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ ذہن زندہ ہے اور پوری قوت اور چابکدستی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اسی ہندوستان میں اچھوتوں کیساتھ آج بھی جو طرز عمل اختیار کیا جا رہا ہے وہ شرمناک ہے۔ آج بھی ہندوستان میں بہت سی جگہیں ایسی ہیں جہاں اچھوتوں کے قدم نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ بہت سی سڑکیں ایسی ہیں جہاں انہیں چلنے کی اجازت نہیں اور آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ہندوستان میں آج بھی بعض ایسے اونچے درجہ کے مفکر اور ماہرین تعلیم موجود ہیں جو اچھوتوں کو مذہبی کتاب پڑھنے اور سننے کا حق دار نہیں سمجھتے۔ پرانا نظریہ یہ تھا کہ اچھوت اگر ''وید'' کے اشلوک سن لیں تو ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے۔ اس ترقی یافتہ اور نام نہاد تہذیبی بلندی کے دور میں اونچی ذات والے اس قسم کی سزائیں نہیں دے سکتے، لیکن ان کا جذبہ اب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

یہ مرض صرف ہندوستان ہی کا نہیں ہے، آپ جس ملک کے حالات کا جائزہ لیں، اس قسم کی تفریق آپ کو ضرور ملے گی۔ اور یہ ایک تلخ، مگر سچی حقیقت ہے کہ اس درجہ کا تو ہرگز نہیں تاہم مسلمانان ہند بھی کچھ نہ کچھ اس ذہن سے ضرور متاثر ہیں۔ ہمارے یہاں بھی کسی نہ کسی درجہ میں ذات پات کی تفریق موجود ہے۔ ہم لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ یہ تفریق جو مسلمانوں میں بھی کہیں کہیں پائی جا رہی ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح ہے یا غلط۔ اور مختلف قوموں اور ملکوں میں یہ مرض جو عام ہو چکا ہے، مفید ہے یا مضر ومہلک۔

کاموں کی انجام دہی کے لیے صلاحیت اور جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے، نسلی اور طبقاتی تفریق کی وجہ سے عام طور پر اونچی صلاحیت کے لوگ دب جاتے ہیں، ان کی قوت کارکردگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے اور کم درجہ کی صلاحیت کے لوگ ایسے منصب اور کاموں کو سنبھالنے کے لیے سامنے لائے جاتے ہیں، جن میں ان کاموں کو انجام دینے کا بھرپور

سلیقہ نہیں ہوتا اور وہ منصب کی ذمہ داری کے بوجھ کو صحیح طور پر اٹھا نہیں پاتے۔ نتیجتاً کام اچھا نہیں ہو پاتا۔ اس لیے ملکی، ملی اور قومی کسی بھی حقیقت سے یہ تفریق مناسب نہیں ہے اور نہ اس کے جواز کے لیے کوئی راہ نکالی جاسکتی ہے۔

اسلام نے اس طرح کی کسی بھی تقسیم یا تفریق کو صحیح نہیں کہا ہے، نسل انسانی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ساری دنیا ایک باپ آدم علیہ السلام اور ایک ماں حضرت حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی، کلکم من آدم و آدم من تراب."

(کسی عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل نہیں ہے اور کسی عجمی کو عربی پر برتری حاصل نہیں ہے تم میں سے ہر شخص آدم علیہ السلام کی اولاد ہے اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے)۔

حضور اکرم ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ ذات، برادری، رنگ و نسل اور مشرقی و مغربی ہونے کی بنیاد پر کسی بھی قسم کی برتری کو یکسر ڈھا دیا اور وحدت انسانیت کا عظیم درس دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد دنیا میں پھیلتی گئی، ضرورتوں نے آبادی کو پھیلایا، جیسے جیسے زندگی کا شعور نکھرا انسان متمدن ہوتا گیا، اس نے غاروں کی زندگی ترک کی، جنگلوں کو چمنستان بنایا، ویرانہ کو آباد کیا، ضرورت کی چیزیں بنائیں، تخیل انسان کی پرواز اور خوب سے خوب تر کی تلاش نے نئی نئی چیزیں دریافت کرائیں، آبادی پھیلی تو کوئی گرم ملکوں میں آباد ہوا، کسی نے سرد خطوں کو اپنا مسکن بنایا تو انسانوں کا رنگ بدلا، حالات کے تحت زبانیں بنیں، نئے نئے لباس بنے، تہذیبیں ابھریں، یہ سب کچھ ہوا اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ مغرب اور مشرق کے انسانوں کی صورت میں بھی بڑا فرق معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پوری انسانی آبادی کی اصل حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اس لیے صورتوں،

رنگوں، زبانوں اور تہذیبوں کے اختلاف کے باوجود یہ سب ایک ہیں۔ غور کیا جائے تو اس غیر معمولی کثرت کو بھی ایک مضبوط وحدت اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اس لیے رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ہر انسان مساوی حقوق رکھتا ہے اور اگر ان میں کوئی ترجیح یا فوقیت کی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ خیر و شر ہے۔ جو شخص اچھا ہے وہ بلند ہے، خواہ وہ اونچی ذات کا ہو یا نیچی ذات کا، جو شخص برا ہے وہ نیچا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی برادری سے ہو...... اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلام کے اس نظریہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو ایک بار برا ہو گیا وہ ہمیشہ برا رہے گا یا جو اچھا قرار پایا وہ ہمیشہ اچھا ہی رہے گا۔ برا شخص برائی سے توبہ کر کے اچھے کام کرنے لگے تو وہ بلند ہو جائے گا اور اچھا انسان برائیوں کو راہ دے تو وہ نیچا بن جائے گا۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے "انسان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے نفرت برائیوں سے ہونی چاہئے۔"

رنگ و نسل کا یہ اختلاف نفرت اور بُعد پیدا کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے میں دشواری محسوس نہ کریں۔ یہ اختلاف اس لیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کریں، برتری کا ذریعہ تو نیک کام ہی ہو سکتے ہیں۔

"یا یھا الذین امنو ا انا خلقنک من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان أکرمکم عند الله اتقاکم." (الحجرات)

(اے مسلمانو! میں نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری مختلف ٹولیاں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک خدا کے نزدیک وہی شخص باعزت ہے جو متقی ہو۔)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: **"لافضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علیٰ عربی انما الفضل بالتقوی."**

کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے اور نہ عجمی کو عربی پر، ہاں فضیلت اس شخص کو حاصل ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔

ہم اپنے وطن، اپنے صوبہ اور اپنے گرد و پیش میں اس قسم کے جو اختلافات دیکھتے ہیں، جو تفریق نظر آرہی ہے اور بلندی و برتری کے جو زینے تلاش کیے جارہے ہیں، شریعت میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام نے وحدت انسانی کا یہ عظیم نظریہ دے کر انسان کے باہمی اختلافات و نزاع کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، بلکہ انسانوں کی یہ آبادی ایک مضبوط رشتہ میں بندھی ہوئی ہے، ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے، ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ہر شخص کا دوسرے پر حق ہے، کیونکہ ہر شخص کے درمیان خونی رشتہ موجود ہے، جو مٹانے سے مٹ نہیں سکتا۔

اس رشتہ کا تقاضا ہے کہ نسل انسانی میں نفرت و عداوت کے بجائے محبت و اخوت ہو، انفرادیت اور غلط قسم کی برتری کے جذبہ سے زندگی کا کارواں منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتا اور نفرت و عداوت کی آگ سب سے پہلے نفرت کرنے والے کو جلاتی ہے، اس لیے اسلامی نظام حیات میں محبت، اخوت اور اجتماعیت کا بڑا دخل ہے۔ ساتھ ہی اسلام نے ہر شخص کے کچھ حقوق متعین کیے ہیں اور کچھ فرائض بھی۔ یہ حقوق و فرائض اجتماعی زندگی سے بھی متعلق ہیں اور انفرادی زندگی سے بھی۔

اجتماعی زندگی میں بہت سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں، انسان جہاں رہتا ہے، جس ماحول میں زندگی گزارتا ہے وہاں کی کچھ چیزیں اسے پسند آئیں گی اور کچھ ناپسند۔ ناپسندیدہ چیزوں کو انسان خوش دلی کے ساتھ اسی وقت برداشت کرتا ہے، جب محبت اور اخوت کا رشتہ استوار ہو، کبھی انسان محبت کی وجہ سے ناپسندیدہ چیزوں کو بھول جاتا ہے اور کبھی اخوت کی وجہ سے ناپسندیدہ چیزوں کے لئے بھی احترام کا جذبہ ہونا ضروری ہے، تاکہ خلاف طبع باتیں انسان کے لیے تکلیف کا سبب نہ بن سکیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنی غلطیوں کی وجہ سے معاشرہ کو نقصان پہنچاتے ہیں، ایک شخص دوسرے کے حقوق غصب کر لیتا ہے، دوسرے پر ظلم کرتا ہے یا کوئی شخص فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے جس سے معاشرہ پر برا اثر پڑتا ہے، اس لیے معاشرہ کی اصلاح، مفید کاموں کو منظم طریقہ پر پھیلانے اور برے کاموں سے روکنے کے لیے شریعت نے یہ تعلیم دی کہ ایک ایسے شخص کو اپنا ذمہ دار مان لیا جائے جو خدا کے قانون سے واقف ہو، تاکہ وہ شخص کتاب و سنت کی روشنی میں تمام امور کی دیکھ بھال کرے اور معاملات طے کر سکے، اس شرعی ذمہ دار کا کام یہ نہیں ہے کہ نئے نئے قوانین بناتا رہے، نئی باتیں گڑھتا رہے۔ خدا نے انصاف کے اصول بتلا دیئے ہیں، حقوق و فرائض کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان چیزوں کی تفصیل بتا دی ہے اور انہیں زندگی میں برت کر دکھا دیا ہے۔ اسلامی زندگی کا پورا نقشہ موجود ہے، تمام قوانین مرتب ہیں جن کا تفصیلی علم ہمیں فقہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ ایک شرعی ذمہ دار کا کام یہ ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق انسانوں کے حقوق کے فیصلے کرے، ان میں نیکی پھیلائے اور برائی دور کرنے کا جذبہ پیدا کرے۔ معروف کو پھیلائے اور منکر سے روکے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نسل انسانی میں کسی قسم کی تفریق اسلام نے نہیں کی ہے۔ اسلام وحدت انسانیت کا داعی ہے۔ اسلام نے ہر شخص کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ اسلام نے محبت، احترام اور اجتماعیت کی راہ دکھائی ہے اور زندگی کو صحیح راہ پر چلانے کے لیے تعلیم دی ہے کہ ایک شخص کو ذمہ دار اور امیر مان لیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ دنیا میں اسلام کے بتائے ہوئے اس طریقہ پر چل کر ہی امن و سکون قائم ہو سکتا ہے اور انسانوں کا چھینا ہوا اطمینان لوٹایا جا سکتا ہے۔ ماضی میں بھی اس راستہ کو اختیار کر کے کامیابی حاصل کی گئی ہے اور مستقبل میں بھی یہی راہ کامیابی، عظمت اور بلندی تک پہنچا سکتی ہے۔

امارت شرعیہ کامیابی کی اسی یقینی راہ کا عملی نمونہ پیش کرنا چاہتی ہے۔اس کی جدوجہد کا مقصد بھی اچھی اور صالح سوسائٹی کا قیام ہے۔

امارت شرعیہ کی ذمہ داری اب میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی ہے۔اس اہم، طویل الذیل اور پھیلے ہوئے کام کو میں آپ کے بھرپور مخلصانہ تعاون کے بغیر انجام نہیں دے سکتا۔ میں آپ سے اس نیک اور خالص اسلامی کام میں تعاون کی اپیل کرتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ جب تک میں بھلائی اور معروف کا حکم کرتا رہوں، آپ کا فرض ہے کہ اس پر عمل کریں اور اگر خدانخواستہ میں کسی منکر اور برائی کا حکم دوں تو اسے میرے منہ پر پھینک ماریں۔

☆☆

انسانی تمدن کا خلاصہ اسلام کا اصول امن وسلامتی

● مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادیؒ

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده '' (صحیح مسلم) (کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان ہر نقصان و تکلیف اور رنج سے صحیح سلامت اور محفوظ رہیں)۔اس کو اپنے اوپر منطبق کیجئے اور سوچئے کہ مسلم کا لقب ہم پر کہاں تک صادق آتا ہے۔ جو چیزیں مسلمانوں میں ہونی چاہئیں، جیسا کہ اس حدیث میں بتلایا گیا ہے، اگر وہ ہم میں پائی جاتی ہیں اور اس حدیث کے مطابق ہمارا حال ہے تو ہم اس لقب مسلم کے لائق اور مسلمان کہلانے کے قابل ہیں، ورنہ نہیں۔

صاحبو! یوں تو ہم میں سے ہر ایک اپنے کو مسلمان خیال کرتا ہے، مگر درحقیقت مسلمان اور صحیح معنی میں مسلمان کون ہے اس کو اس حدیث میں ارشاد فرمایا۔اس میں مسلمان کے معنی اور اس کی تعریف بیان فرمائی ہے کہ مسلمان وہ ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اہل اسلام سلامت اور محفوظ رہیں۔پس جس پر یہ تعریف صادق آئے گی وہی صحیح مسلمان ہوگا۔ اب اپنے کو جانچ لیجئے۔

ہر چیز کی ایک تعریف ہوتی ہے جس سے وہ چیز پہچانی جاتی ہے۔ چنانچہ عورت کو لیجئے کہ نسوانی حالات کی بنا پر اس کو عورت کہتے ہیں، پس اگر اس میں حیاء اور پردہ ہے اور دیگر نسوانی امور ہیں تو اس کو عورت کہیں گے۔ اگر ایسا نہیں تو حقیقی معنی میں وہ نسوانیت اور عورت ہونے سے خارج اور دور ہو جائے گی، کیونکہ لفظ عورت میں خود پردہ کے معنی ہیں اور

یہ اس میں پایا نہ جائے تو اب اصلیت کے اعتبار سے اس پر عورت کا اطلاق نہیں ہوگا اور صحیح معنیٰ میں وہ عورت کہلانے کے قابل نہیں رہے گی۔

عورت اصل وہی ہے جو اپنے کو چھپا کر رکھے، بلکہ اپنے لباس اور زیور کو بھی چھپا کر رکھے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ولا یبدین زینتھن**''. (اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں)، مگر اب عجیب حال ہو چلا ہے کہ عورتوں میں بالکل عریانی اور بے حیائی آتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ اب برقعہ بھی محض فیشن کے لیے رہ گیا ہے جس پر رنگ برنگ کے پھول ہوتے ہیں جو اور بھی زیادہ گناہوں کا سبب ہوتا ہے، انتقال ذہنی کا سبب قریب ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے مسلم کی تعریف یہ فرمائی ہے: ''**المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ**'' (یعنی مسلمان وہ ہے جس کے زبان اور ہاتھ (دونوں ہی) سے مسلمان محفوظ رہیں۔ پس اگر کسی مسلمان میں یہ بات نہ پائی جاوے تو وہ صحیح معنی میں مسلمان، یعنی پورے طور سے مسلمان نہیں)، کیونکہ صحیح اسلام اور کامل دین پانچ چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اول عقائد، پھر عبادات اور انہیں کے ساتھ ساتھ معاشرت اور اخلاق ومعاملات۔ ان میں سے اس حدیث شریف میں معاشرت اور اخلاق ومعاملات یہ تین چیزیں تو دلالت قریب بصراحت سے مذکور ہیں اور عقائد وعبادات اشارۃً مذکور ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہاتھ اور زبان کی ایذا سے دوسرے لوگوں کا محفوظ وسالم رہنا حدیث کے صریح الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تکلیفیں اور ایذائیں پہنچنے کے اسباب کیا ہیں۔ سو غور کرنے اور سوچنے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ تکلیفیں پہنچتی ہیں وہ یا تو بد معاملگی سے پہنچتی ہیں، یا بد معاشرتی اور بد اخلاقی سے پہنچتی ہیں، جیسے کسی سے کوئی معاملہ خرید وفروخت یا توکیل وتفویض یا شرکت ومضاربت کمپنی وغیرہ کا طے کیا، پھر اس کے خلاف کیا۔ یا کسی کی امانت قبول کی پھر اس میں خیانت کی اس سے دوسروں کو تکلیف اور دکھ پہنچا یا کسی کے ساتھ معاشرت، رہن سہن اچھا نہیں کیا، مثلاً عمر کے اعتبار سے

یا علم وعمل، یا منصب وعہدہ یا قرابت ورشتہ کے اعتبار سے جو بڑے ہیں ان کے ساتھ توقیر وعزت کا طریق اختیار نہیں کیا۔ یا چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہیں کیا۔ یا برابر والوں کے ساتھ مساویانہ اور برابری کے طور طریق کے بجائے کمتری اور تحقیری انداز سے پیش آئے تو ظاہر ہے کہ اس سے دوسروں کو اذیت اور تکلیف ہوگی۔ یا ذرا خلاف طبع پیش آنے پر صبر وتحمل کے بجائے سخت الفاظی، تلخ گوئی، لعن طعن وغیرہ کے ذریعہ بد اخلاقیوں کا ظہور ہوا جس سے دوسروں کو ایذا وتکلیف پہنچی۔

یا کسی کی چیز چرالی یا غصب کرلی، یعنی بغیر مالک کی اجازت کے اس کی چیز استعمال کرلی پھر مزید برآں یہ کہ استعمال کے بعد واپس بھی نہیں کی، مالک کو اطلاع بھی نہیں دی کہ تمہاری فلاں چیز میرے پاس ہے، یا کسی کی چیز جگہ سے بے جگہ کردی تو ان غلطیوں سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہیں۔ رات دن یہ غلطیاں ہوتی ہیں۔

غرض بد اخلاقی بد معاملگی، بد معاشرتی سے طرح طرح کی جسمانی، جانی، مالی، قلبی ایذائیں پہنچتی ہیں، اس لیے اس حدیث ''**المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ**'' سے اخلاق اور معاملات اور معاشرت کی خرابیوں کو دور کرنے کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور یہ تینوں چیزیں مخلوق کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ مخلوق کے ساتھ تعلق صحیح رکھا جائے۔ جب مخلوق سے تعلق کی درستی ہوگی تو یہ مستلزم ہوگا اس کو کہ خالق کے ساتھ تعلق صحیح اور درست رکھا جائے، اسی کو فرماتے ہیں:

کارہا باخلق آری جملہ راست
باخدا تزویر وحیلہ کے راست

کہ جب مخلوق کے ساتھ کاموں کو درست کر رہے ہو تو پھر خالق برتر کے ساتھ مکروفریب اور ٹیڑھ در ٹیڑھ، زیغ وکجی کے ساتھ پیش آنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

لامحالہ خالق کے ساتھ تعلق کو بطریقِ اولیٰ درست کرنا ضروری ہوگا اور خالق سے تعلق

کا صحیح ہونا منحصر ہے تصحیح عقائد و تصحیح عبادات میں، تو اس طرح یہ حدیث التزاماً و دلالۃً عقائد اور عبادات کی درستگی اور اصلاح پر بھی مشتمل ہے۔

ایک اور دوسرے طریقہ سے بھی یہ بات واضح ہے کہ ''**المسلم**'' کا لفظ اس حدیث میں موجود ہے جو ''**الاسلام**'' بمعنی گردن نہادن بطاعت سے بنا ہے، مطلب یہ ہے کہ مسلمان حکم برداری کے لیے گردن جھکا دینے والا، ہر حکم کی تعمیل کرنے والا ہوتا ہے اور اس میں اولین چیز توحید ہے، یعنی خدا کی ذات وصفات کو ہر نقص ہر کمی و کمزوری سے پاک اور بالاتر جاننا اور یہ مستلزم ہے نبوت و رسالت کے ماننے کو چونکہ خدا تعالیٰ کی صفات و کمالات میں ایک صفت کلام بھی ہے اور اس کلام کا صادق ماننا ہے۔ اور کلام الٰہی میں نبوت و رسالت کو ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ''**محمد رسول الله**'' کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس لیے توحید مستلزم نبوت ہے، پھر ان دونوں کے ماننے نہ ماننے پر جزا، سزا کا مرتب ہونا ہے، اور جزا، سزا کی اصل جگہ قیامت و آخرت ہے، لہٰذا توحید و نبوت مستلزم آخرت ہے پھر ان تینوں چیزوں کو مان لینا مقتضی ہے عبادت کو جس کے اہم ترین شعبے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہیں، پھر قربانی، صدقات و کفارات اور نذر وغیرہ ہیں تو اس طرح ''**المسلم**'' کے لفظ میں اصول عقائد اور عبادات بھی رکھے ہوئے ہیں۔

پس ثابت ہو گیا کہ یہ حدیث: ''**المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده**'' دین کے تمام شعبوں اور اجزا کو شامل ہے پس پورا مسلمان وہی ہے جس میں یہ پانچوں شعبے پائے جاتے ہیں، لیکن ظاہر الفاظ سے دوسروں کو تکلیف و ایذا سے بچانے کو خاص علامت کامل دینداری کی قرار دی ہے۔ مقصود اور غرض یہ ہے کہ مسلمان کی ذات سے اس کے کسی بھی قول و فعل اور حرکت و سکون، نشست و برخاست طور طریق سے کسی بھی قسم کی تکلیف کوئی بھی ناگواری ناپسندیدگی دوسرے کو نہ پہنچے۔ اس قدر بیدار مغزی اور ہوشیاری، اور نگاہ چوطرفی پورے دھیان اور اہتمام کے ساتھ اس کا تمدن اس کی معاشرت اور زندگی گزرے۔ یہ حضور

اکرم ﷺ کا فرمان بس پورے تمدن کی جان ہے۔ غرض مسلمان کی طرف سے علی الاطلاق سلامتی اور امن ہے تمام مخلوق اس کی طرف سے مامون و محفوظ رہے۔ صحیح منصب مسلمان کا یہی ہے کہ کسی کو بھی کوئی دکھ اس سے نہ پہنچے۔ مگر چونکہ عادتاً انسان کو اپنے ہم مذہب لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، اس لئے اسی عرف و عادت کے لحاظ سے اس حدیث میں فرمایا ہے مسلمان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے ''**كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه**''. (**بخاری و مسلم**) کہ مسلمان کی ہر چیز (دوسرے) مسلمان پر حرام ہے اس کا خون اس کا مال اس کی عزت و آبرو، اس لیے ان تینوں چیزوں میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا کوئی نقصان نہیں کرے گا ایسی احتیاط کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ غیر مسلم پر ظلم کرنا درست ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا: '**من كان يومن بالله واليوم الآخر فلايوذ جاره**' کہ جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے کسی پڑوسی کو تکلیف نہ دے۔ معلوم ہوا کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ کسی بھی انسان کو تکلیف و ایذا نہ دے مسلم ہو یا غیر مسلم سب کے بارے میں عام حکم فرمایا۔

معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ کو یہ مقصود ہے کہ مومن کی زندگی مسلمان کا جینا نہایت پر امن اور چین و سکون سے بھرپور ہونا چاہئے۔ کسی بھی انسان کو اس کی طرف سے ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے، لیکن چونکہ اکثر و بیشتر دوسرے کو تکلیف پہنچانے میں کسی کی حق تلفی اور اس پر ظلم کرنے میں یا تو ہاتھ استعمال ہوتا ہے یا زبان چلتی ہے، اس لیے انہیں دو اعضا کو قابو میں رکھنے کی طرف خاص عنوان کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ سالم اور محفوظ رہیں۔

☆☆

انسانیت کے زوال کا سبب
علم کو اسم باری سے جدا کرنا

● مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

حضرات! میرے لیے یہ خوشگوار اور مسرت بخش انکشاف ہوا کہ میں اس موقع پر آج یہاں حاضر ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس گنہگار کے ہاتھوں سے جس عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے بعد یہ بنیاد اتنی بلند ہوگی اور ایسی وسیع ہوگی جو اس وقت ہمارے اور آپ کے سامنے ہے، اس وقت میں اپنے عزیز رفقاء اور ساتھیوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں جو روح کام کر رہی ہے وہ حقیقت پسندی، تعمیری ذہن اور ملی تقاضوں کو پورا کرنے کا جذبہ ہے، علوم کے پیدا ہونے، پھیلنے، ترقی اور پھلنے پھولنے کے باوجود اس وقت ساری دنیا خطرہ سے دوچار ہے اور وہ خطرہ ایسا ہے کہ جس طرح سے تلوار لٹک رہی ہو کسی کے سر پر، عالم انسانی پر، آج ساری مالی ترقیات اور جدید ترین انکشافات کے باوجود پوری انسانیت جو خطرہ میں ہے اس کا راز یہ ہے کہ خدا نے علم کو اسم کے ساتھ جوڑا تھا، خدا کے آخری نبی خاتم النبیین سید المرسلین حضرت محمد مصطفی ﷺ پر پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ اپنے اندر تفکر، تدبر، بصیرت، دانش، ذہانت اور عظیم ترین صلاحیت رکھتی ہے۔ دنیا کے اخلاقی احساس کا خدا نے علم کو اس کے ساتھ جوڑا تھا اور خدا نے جو پہلی آیت نازل کی تھی وہ یہ ہے: ''اقرا بسم ربک الذی خلق'' (علق: ۱) اس میں سمجھنے، سوچنے اور بصیرت کا بہت بڑا سامنا ہے، خدا نے انسانوں کو یہ سہولت عطا کی

اور یہ طریقہ عطا کیا کہ وہ اپنی زندگی کی فکر کریں اپنے اہل وعیال کی فکر کریں، اپنے ماحول کی فکر کریں اور یہ سب اس کی مربوبیت کے سایہ میں ہو وہ رب العالمین ہے اس پر یقین کرنا چاہئے اور اس کا اثر ہم پر ہونا چاہئے، لوگوں کی آسائش کا لوگوں کے امن وامان کے ساتھ رہنے کا زندگی سے لطف اٹھانے کا ان کو موقع دینا چاہئے۔ پہلی جو آیت نازل ہوئی نبی امی بلا دامی اور عالم امی میں وہ حکام کے یہاں ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔

اور نبی سے صاف صاف کہا گیا کہ کبھی آپ نے نہ پڑھا اور کبھی آپ نے نہ لکھا اور کہا گیا کہ پڑھو، اقرأ اب جو امت پیدا ہوگی وہ قرات والی امت ہوگی اور اس کا رشتہ علم کے دامن سے باندھ دیا جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی جارہی ہے جس کو اکثر قوموں نے نظرانداز کیا اور ترقی یافتہ مغرب میں جب سے وہاں بیداری شروع ہوئی، ''اقرأ'' (پڑھو)، لیکن صرف پڑھنا کام نہیں آئے گا، بلکہ وہ علم بہت تخریبی بن جائے گا وہ تخریبی ذہن پیدا کرے گا اور انسانوں میں خود پرستی پیدا کرے گا، دوست پرستی پیدا کرے گا اور شہوانیت کی طرف لے جائے گا۔ ''اقرأ'' پڑھو، لیکن خالی ''اقرأ'' پڑھنا کام نہیں آئے گا۔ ''اقرأ بسم ربک الذی خلق'' اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ پڑھو دنیا میں اب اگر تاریخ منصفانہ طریقہ پر، حقیقت پسندانہ طریقہ پر لکھی جائے اور دیکھا جائے کہ دنیا میں انسانیت کا زوال کب سے شروع ہوا تو یہ عنوان قرار دینا ہوگا جب سے علم اور اسم کا رشتہ ٹوٹا جب علم اسم سے آزاد ہوا، اور انسان نے اسم کو بھلاتے ہوئے فراموش کرتے ہوئے انکار کرتے ہوئے بلکہ بغاوت کرتے ہوئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے۔

اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے بھی تو اس کا مالک نہیں اور وہ اس کا منتظم نہیں ہے وہ کریٹر ہے ایڈمنسٹریٹر نہیں ہے کہ یہ تاج محل ہے، دنیا کا شاہجہاں بنا کر رخصت ہوا اور جو انتظامی ڈھانچہ ہے اس کے رحم وکرم پر ہے وہ جو چاہے سلوک کرے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ دنیا تاج محل نہیں ہے قطب مینار نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کا بنایا ہوا کارخانہ ہے وہ تنہا چلا رہا ہے اسی کا

کام ہے،"**الا لہ الخلق والأمر**" حکم دینا اور چلانا، اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمارے اس طرح کے ادارے سائنٹفک ادارے، ٹیکنالوجی کے ادارے، ایجوکیشن کے ادارے، انجینئرنگ کے ادارے اسی اسم کے ساتھ وابستہ ہوں اور یہ کام وہی جماعت کرسکتی ہے جس کی بنیاد ہی اس صفت پر پڑی اس کی زندگی اس کی تاریخ ہی سے شروع ہوئی اور امت مسلمہ پیدا ہوئی۔ وحی آسمانی سے اور نبی امی کی رہبری سے اور اس کے پیغام سے اور اسی سے امت کی تاریخ شروع ہوئی ہے اور اس کے مذہب کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ علم کو اسم سے برابر جوڑے رہیں، آج یوروپ وامریکہ میں جو سانحہ اور المیہ پیش آیا وہ انسانی المیہ ہے کہ اس وقت ان کے ہاتھ میں باگ ڈور ہے دنیا کی، وہ اس کی قیادت کر رہے ہیں، فکری قیادت کر رہے ہیں۔ انہوں نے علم کا رشتہ اسم سے توڑ دیا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، ضرورت اس کی تھی کہ علم کو اسم کے ساتھ لے کر چلا جائے، علم اسم کی رہنمائی میں اسم کے سایہ میں اس کی سرپرستی میں آگے بڑھے اور اسم کی برکت بھی اس کے ساتھ ہو، تب جا کر ہماری ٹیکنالوجی اور سائنس کی جتنی شاخیں ہیں اور جتنے تعمیری کام ہیں اور تعمیری ادارے ہیں اور ہماری دانش گاہیں ہیں، ہمارے تحقیق کے مراکز ہیں وہ سب اسی وقت مفید ہوسکتے ہیں کہ جب اسم کے سایہ میں ہوں اور وہ اسم نہ بھولیں اور نہ بھولنے دیں۔

مجھے اس سے پہلے کمپیوٹر کا کوئی تجربہ نہیں تھا، میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں کتابوں اور قلم سے تعلق ہے۔ میں نے جب انگلی رکھی تو فوراً کچھ نقوش سامنے آگئے، اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو درحقیقت اور خاص طور سے مسلمانوں کو کمپیوٹر ہی بنایا تھا اس میں وہ سب چیزیں موجود تھیں، لیکن اس کی ضرورت تھی کہ انگلی رکھی جائے اور وہ چیزیں ابھر آئیں اور وہ سامنے آجائیں۔ وہ انگلی پیغمبر کو پہنچاننے والوں کی انگلی اپنے اپنے زمانے میں اور زمانے کے تقاضے کی انگلی جو قوم وملت کی ضرورت کی انگلی ہے وہ بھی انگلی ہے اور وہ ایسی انگلی ہے جس نے قوم کو روح دیا ہے اور قوموں کو منزل تک پہنچایا

ہے وہ انگلی رکھی جائے اور نقوش ابھر کر سامنے آجائیں۔ افسوس ہے کہ آج انسان تو انسان خود مسلمان کمپیوٹر نہیں رہا، اس مسلمان میں اس کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور اس کے اندر اس کا شعور بھی باقی نہ رہا کہ ہم کس چیز پر مامور ہیں، ہمیں کیا چیز پلادی گئی ہے، ہمارے اندر کیا چیز سرایت کرگئی ہے، ہمارے اندر وہ اتار دی گئی ہے۔ جو ہمارے دماغ اور ہمارے ذہن کا ایک جزو بن گئی ہے، عقیدہ تو عقیدہ ہمارے فہم کا ایک جزو بن گئی ہے، جب اس پر اشارہ کیا جائے، جب اس کی تحریک پیدا ہو ہمیں اپنے اندر کے خزانے کو فوراً باہر لانا چاہئے۔ آج جو کام کمپیوٹر کر رہا ہے یہ کام مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا کہ جس وقت امر الٰہی ہو اور جس وقت شرعی حکم سنایا جائے اور جس وقت ملت کی ضرورت کا اظہار کیا جائے اور جس کو ملت خود پکارے اور ہمیں جیسا کہ بعض عزیزوں اور رفیقوں نے اس کا اظہار کیا اپنی تقریروں میں یا جس کی ملت خود ضرورت پیش کر رہی ہے اور فریاد کر رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ انگلی نہیں اٹھتی جو کمپیوٹر پر لگے، اور اگر وہ انگلی نہیں اٹھتی تو وہ کمپیوٹر کام نہیں کر رہا ہے اور وہ چیز وہاں نہیں نکلتی ہے جس کی آج ضرورت ہے اور اس طرح کے ادارے جیسے کہ یہ ادارہ ہے اور یہ ادارہ جس شعور کے ساتھ اور اس عہد معاہدہ کے ساتھ اور عزم وارادے کے ساتھ اور اس فیصلہ واعلان کے ساتھ یہ ادارے قائم ہوں کہ ہم صرف فن نہیں سکھائیں گے۔ خدا شناسی بھی سکھائیں گے اور جو ہم علم دیں گے خدا کی معرفت اور اس کے وجود کے اقرار کے ساتھ اس کے خالق کائنات اور قادر مطلق ہونے اور اسی کو راضی کرنے کا سب سے ضروری کام سمجھنا اور اس کے پیغمبروں کے پیغام کے احترام نہیں، بلکہ اس پر عمل کرنے کی روشنی میں اس کو جوڑ کر وہ علم دیں گے، آج دنیا میں اسی چیز کی کمی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں اور یوروپ کے بعض دیگر ملکوں میں سارے وسائل ہونے کے باوجود مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے، انسانوں کی خدمت نہیں ہو رہی ہے اور وہ حفاظت کا سامان نہیں ہے، بلکہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔

میں نے واشنگٹن میں ایک تقریر میں کہا تھا، میں پہلے سے تیار نہ تھا اور وہاں برابر دورے ہو رہے تھے۔ یونیورسٹیوں میں تو میں نے سوچا کہ قاری صاحب جب آیتیں پڑھیں گے اس دن اسلامی سینٹر میں میری تقریر تھی، واشنگٹن ڈی سی میں تو میں نے کہا کہ قاری صاحب کی تلاوت سے مضمون حاصل کروں گا اور پیش کروں گا۔ قاری صاحب نے سورہ کہف کی آیت پڑھی جس میں ایک باغ والے سے ایک ساتھی نے کہا:

”ولو لا اذ دخلت جنتک قلت ماشاء الله لا قوة الا بالله“ (الکهف)

اس نے کہا تھا یہ میرا باغ ہے اور ہمیشہ رہے گا اور بڑے فخر سے کہا تھا اور بڑا غرور کیا تھا تو اس کے مومن صاحب ایمان دوست نے کہا کہ میرے بھائی بہتر تو یہ ہوتا کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوتے تو یہ کہتے **”ماشاء الله لا قوة الا بالله“**۔ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ میں نے کہا امریکہ میں سب کچھ ہے، لیکن ماشاء اللہ یاد دلانے والا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج امریکہ سب کچھ کرتا ہے، احسان بھی کرتا ہے، لیکن اس کا شکرانہ نہیں ادا ہوتا اور اس کا جواب نہیں ملتا۔ اور پھر وہ نتائج نہیں ظاہر ہو رہے ہیں جو دنیا کے امن وامان کی شکل میں رفاہ عام کی شکل میں اور ایک دوسرے پر اعتماد اور عزت کرنے کی شکل میں ہونا چاہئے، اس لیے کہ اس کے ساتھ خلوص نہیں ہے، اس میں ایمان کی وہ چنگاری نہیں ہے، وہ ایمان کا محرک نہیں ہے۔

ہم نے کہا آج امریکہ میں سب نعمتیں موجود ہیں اور ہر طرح کی راحت کے سامان موجود ہیں، لیکن حقیقت میں وہ راحت حاصل نہیں جو ہونی چاہئے۔ اس لیے کہ ”ماشاء اللہ“ نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ ادارے قائم ہوں، لیکن ”ماشاء اللہ“ کے سائے میں، اسم الٰہی کے سایہ میں قائم ہوں۔ علم واسم مل کر چلیں، میں آج صاف کہتا ہوں اگر چہ یہ محدود مجلس ہے، اپنے دوستوں اور رفقاء کی یہ بات دنیا کے بہت بڑے وسیع ترین اور بلند ترین پلیٹ فارم پر کہنے کی ہے کہ جب تک علم واسم ساتھ نہیں ہوں گے اس کا پھر جوڑ نہیں ہوگا اس

کا رشتہ علم واسم کے سایہ میں نہیں ہوگا۔ اس وقت دنیا تخریب کی طرف جائے گی اور ہلاکت کی طرف جائے گی اور خودکشی کرے گی اور وہ امن وامان رفاہ عام اور وہ باہمی اعتماد تعاون نیک کاموں میں دوسرے کا ساتھ دینا، یہ بات حاصل نہیں ہوگی، خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کے سامنے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ الحمدللہ یہ ادارہ اسی بنیاد پر قائم ہے، مجھے امید ہے کہ اسی بنیاد پر قائم رہے گا۔ یہ دین کے سائے میں دینی مقاصد کے سائے میں اور انسانی ہمدردی کے سائے میں اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو ذمہ داری ڈالی ہے جس منصب سے انہیں سرفراز کیا ہے اس کے شعور واحساس کے ساتھ یہ ادارہ چلے گا اور ایسے اداروں کی آج ضرورت ہے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ایسے اداروں کا قیام جا بجا ہو اور وہ ترقی کریں اور مسلمان صرف صنعتی ادارے ہی نہیں، بلکہ جیسے کہ ہمارے فاضل دوستوں نے کہا کہ یہ دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں سے لے کر پرائمری اسکولوں تک، بلکہ ابتدائی مکاتب تک اسم الٰہی ضرور موجود ہو اور اسم الٰہی کی روشنی اور اسم الٰہی کی رہنمائی ہو، اسم الٰہی کا ادب ہو، اسم الٰہی کا احترام ہی نہیں، بلکہ اس کے سائے میں اس کی رہنمائی حاصل کر کے کام ہو، اس کے نہ ہونے ہی سے تمام علوم کے ترقی کرنے اور پھیلنے کے باوجود دنیا کو وہ امن وسکون نہیں حاصل ہو رہا ہے اور ان علوم سے وہ منافع نہیں حاصل ہو رہے ہیں جو ہونے چاہئے تھے۔ اس لیے کہ ان کا رشتہ مذہب سے ٹوٹا ہوا ہے، بس میں اس پر ختم کرتا ہوں اور جو آپ نے اعزاز بخشا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس ادارہ کو قائم ودائم رکھے اور ترقی عطا فرمائے۔

☆☆

اسلام کے مضبوط عقیدے پر ہی ترقی کی راہ ہموار ہوسکتی ہے

● مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلام کا سارا دارو مدار توحید کے عقیدے، رسالت کے عقیدے اور آخرت کے عقیدے پر ہے۔ ہر شخص کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ان تین چیزوں میں شک پیدا ہوجانے کے بعد کوئی شخص اسلامی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ ہر وہ چیز جو ان عقائد میں شک پیدا کرتی ہے درحقیقت وہ اسلامی تہذیب کی جڑ کاٹ دینے والی ہے۔

سب سے زیادہ جس چیز کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے جن نوجوانوں میں کوئی اسلامی شعور موجود ہے وہ اپنی درس گاہوں میں الحاد و دہریت اور تشکیل پیدا کرنے والی ہر تحریک کا مقابلہ کریں۔ کسی ایسی تحریک کو پنپنے نہ دیں جو ان بنیادی عقیدے سے منحرف کرنے والی ہو۔ جس طریقے سے بھی ممکن ہو ایسی ہر تحریک کا مقابلہ کرنا عالم اسلام کی بقا اور ملت اسلامی کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ان تین چیزوں کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کرتا ہے تو وہ صرف ایک کفر ہی کا ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ حقیقت میں وہ ملت اسلامی کے ساتھ غداری کرتا ہے اور عالم اسلام کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس احساس کو اچھی طرح دلوں میں جاگزیں کرلیجئے۔ اگر آج تک اس

معاملے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو آئندہ نہ ہونی چاہئے۔ ہمارے ملک کی کسی درسگاہ میں، کسی کالج، کسی یونیورسٹی اور کسی مدرسے میں بھی اب ملحدانہ نظریات وافکار کو ہرگز پھیلنے نہ دیا جائے اور نہ کسی ایسے فلسفے کو جڑ پکڑنے دی جائے جو اسلام کے بنیادی عقائد میں شک پیدا کرنے والا ہو۔

دوسری اہم چیز جس کی طرف ہمارے نوجوان طلبہ کو متوجہ ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہماری بقا کا انحصار جس طرح اسلام کے عقیدے پر ہے اسی طرح اسلامی اخلاق پر بھی ہے۔ عقیدے اور اخلاق میں ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ ہی ہم سے چند خاص اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری درسگاہوں میں ایک مدت دراز سے اخلاق کے معاملہ میں شدید غفلت ہی نہیں برتی جارہی ہے، بلکہ ایک ایسی ثقافت کی پرورش کی جارہی ہے جو اسلام کے تمام تصورات کی اور اس کے تمام بنیادی اخلاقی نظریات کی ضد ہے۔ ہمیں یہ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وہ اخلاق جن کے بل پر کوئی مغربی قوم اٹھ سکتی ہے ہم اس کے بل پر نہیں اٹھ سکتے۔ ہم اگر اٹھ سکتے ہیں تو ان اخلاقی نظریات کی بنیاد پر اٹھ سکتے ہیں جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں۔ مغرب کا ایک آدمی ناچ گا کر، شراب پی کر اور فواحش کا ارتکاب کرکے بھی اپنے ملک کے لیے قربانی دینے کھڑا ہوسکتا ہے، کیونکہ جن مادی فلسفوں پر اس کے اخلاق کی تعمیر ہوئی ہے، یہ چیزیں ان کی ضد نہیں ہیں، لیکن ایک مسلمان جس کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ ان چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے وہ جب اس ثقافت کو اختیار کرتا ہے اور اس طرز زندگی کی پیروی کرتا ہے تو وہ حقیقت میں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے منہ موڑ کر ایسا کرتا ہے۔ ایک مغربی آدمی یہ کام کرکے اپنے اخلاقی اصولوں سے منہ نہیں موڑتا، لیکن ہم اس تہذیب کو اختیار کرتے ہیں تو ان تمام اصولوں کو توڑ ڈالتے ہیں جن پر ہمارے اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ ایک مسلمان اگر شراب پیتا ہے تو اس کی حیثیت ایک مغربی کے شراب پینے

سے بہت مختلف ہے۔ اگرچہ شراب کے جسمانی اور نفسانی نقصانات سب انسانوں کے لیے یکساں ہیں خواہ پینے والا مسلمان ہو یا کافر۔لیکن ایک کافر کے دین میں چونکہ شراب حرام نہیں ہے، اس لیے وہ جب اس کو استعمال کرتا ہے تو صرف ایک مضر چیز کا استعمال کرتا ہے، اپنے عقیدے پر لات نہیں مارتا۔اس کے برعکس ایک مسلمان اس حرام فعل کا ارتکاب اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک اس کے اندر خدا اور رسول سے بغاوت اور آخرت سے بے پروائی کا جذبہ پرورش نہ پا چکا ہو اور اس کے بعد معاملہ صرف ایک حرمت کے توڑنے پر نہیں رکتا، بلکہ پھر وہ تمام حرمتیں توڑتا اور اخلاقی بندشیں کاٹتا چلا جاتا ہے۔ پھر تو کوئی چیز اس کے لیے ایسی مقدس نہیں رہ جاتی جسے پامال کردینے سے وہ باز رہ جائے۔

اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک غیر اسلامی تہذیب اگر مسلمان قوم کے اندر رواج پا جائے تو اس کے نقصانات اس سے بدرجہا زیادہ ہیں جو کسی غیر مسلم قوم میں اس تہذیب کے رواج پانے سے ہوسکتے ہیں۔ غیر مسلم پر اس تہذیب کے برے اثرات صرف اس حد تک ہوتے ہیں جتنے ہر غلط چیز کے اثرات کسی شخص یا قوم پر ہوا کرتے ہیں۔لیکن ہم اگر کسی فاسقانہ تہذیب کو اختیار کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہمارے ایمان پر بھی زد پڑتی ہے۔اس سے ہمارے ایمان کی جڑیں کمزور ہوتی ہیں۔ ہمارے اندر خدا اور رسول کی اطاعت کے بجائے بغاوت پیدا ہوتی ہے اور اس بغاوت کے بعد یہ ممکن نہیں رہتا کہ ہم دنیا میں کسی وفاداری پر اور کسی نظم کی اطاعت پر قائم رہ سکیں۔ کیونکہ سب سے بڑھ کر جس کی وفاداری واطاعت ہم پر لازم تھی اس سے ہم پہلے ہی بغاوت کرچکے ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے جب کوئی مسلمان ایک مرتبہ اسلامی احکام کی نافرمانی پر اتر آتا ہے تو وہ ایک نافرمانی پر بس نہیں کرتا، بلکہ نافرمانیاں کرتا ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اندر کوئی احساس فرض باقی نہیں رہتا، کسی قانون کا احترام باقی نہیں رہتا، کسی حد پر جاکر اس کی اخلاقی گراوٹ نہیں رکتی۔آپ اندازہ کیجیے کہ جب ایک شخص نبی کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی

کتاب ماننے کے باوجود کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ خدا نے اس سے منع کیا ہے، رسول نے اس کی مذمت کی ہے، قرآن نے اسے حرام کیا ہے اور آخرت کے عذاب کی وعید سنائی ہے تو اس کے بعد آخر کیا چیز اسے کسی اخلاقی قدر کا احترام ملحوظ رکھنے پر آمادہ کرسکتی ہے؟ کسی لیجیسلیچر کے قانون کا وہ کیسے پابند رہ سکتا ہے جسے وہ خدا نہیں مانتا، کسی قوم یا ملک کے لیے وہ اپنی ذات اور اپنی خواہشوں کو کیسے قربان کرسکتا ہے جسے وہ معبود نہیں سمجھتا، اس کے اندر تو مقدس ترین چیزوں کی بے احترامی پیدا ہو چکی ہے۔ اس کو تو قانون شکنی کا مرض لگ چکا ہے اور اپنے ایمان کی رو سے وہ بلند ترین قانون کو توڑ چکا ہے۔یہ قانون شکنی کسی حد پر جاکر نہ رکے گی بلکہ وہ مستقل طور پر قانون کی بے احترامی کے مرض میں مبتلا ہوجائے گا۔اس کے بعد توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی معاملہ میں کسی قانون کا پابند رہے گا۔ایسا شخص تو کسی مہذب سوسائٹی کا رکن بننے کے قابل نہیں رہتا کجا کہ وہ ایک مسلم سوسائٹی کا رکن رہے۔

اس چیز کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ جو لوگ ہماری درس گاہوں میں ہمارے نوجوانوں کو عیاش بنا رہے ہیں، ان کو طاؤس ورباب کا شیفتہ بنا رہے ہیں، غیر اسلامی ثقافت کو ان میں رواج دے رہے ہیں اور اسلامی اخلاق کی بندشوں کو توڑ ڈالنے کی بیماری انہیں لگا رہے ہیں، وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور کتنی بڑی بدخواہی اس ملک کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان طلبہ کو خود اس کے نقصانات محسوس کرنے چاہئیں۔اگر ملک کا نظام چلانے والے اپنی نادانی سے یہ غلطی کر رہے ہیں تو طلبہ کا یہ کام ہے کہ وہ خود اس سے بچیں اور اپنے آپ کو جہاں تک ہوسکے اس سے محفوظ رکھیں۔انہیں اپنی درس گاہوں میں ایسی رائے عامہ پیدا کرنی چاہئے کہ طلبہ اس غلط تہذیب کو نہ خود اختیار کریں نہ اپنی سوسائٹی اور اپنی درس گاہوں میں اسے رواج پانے دیں۔سوال یہ ہے کہ اگر خود طلبہ ہی کے اندر ایسی عام رائے پیدا ہوجائے اور وہ خود اس چیز کے مخالف

ہو جائیں تو وہ کون سی طاقت ہے جو ان درس گاہوں میں زبردستی اس ثقافت کو رواج دے سکے۔ ظاہر بات ہے کہ آپ کو پولس کے ذریعے سے نچوایا نہیں جاسکتا۔ کوئی قانون بنا کر آپ کو غیر اسلامی ثقافت اپنانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ صرف ایک شیطانی ترغیب ہی تو ہے جس سے لوگوں کو لاسہ لگایا جا رہا ہے اور ان کی عادتیں بگاڑنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ طلبہ اگر یہ محسوس کرلیں کہ یہ ایک بیماری ہے جو انہیں لگائی جارہی ہے تو وہ خود اس سے بچنے کی کوشش کرسکتے ہیں اور اپنی درسگاہوں میں اس طرح کی خرابیوں کے رواج پانے کی مزاحمت کرسکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ طلبہ میں یہ عام رائے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ دو باتیں تو وہ ہیں جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ خود طلبہ کے اپنے کرنے کی ہیں اور اگر وہ اس کے اوپر عمل کریں تو بہت بڑی حد تک ان خرابیوں کو دور کرسکتے ہیں جو اس وقت ہماری درسگاہوں میں پھیل رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے نوجوان طلبہ کو اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ ان کو دین اسلام سے واقف کرانے کے معاملے میں جو کچھ بھی کوتاہی ہمارے نظام تعلیم میں کی گئی ہے اس کی تلافی وہ اپنی کوششوں سے کریں۔ میں بعد میں عرض کروں گا کہ حکومت کو اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن فرض کیجیے کہ حکومت اس طرف توجہ نہیں کرتی تو دین اسلام کو جاننے کا جو فرض خود آپ پر شخصی حیثیت سے عائد ہوتا ہے وہ ساقط نہیں ہوجاتا۔ ہر بالغ مسلمان کو جس کے اندر شعور پیدا ہوچکا ہو اور جو خود اپنے اختیار سے کام کرنے کے قابل ہوچکا ہو اس کا فرض ہے کہ جس اسلام کی نسبت سے وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس کو جاننے کی آپ ہی کوشش کرے۔ یہ علم حاصل کرنے کے لیے کچھ بہت زیادہ دینی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ دین کا کم سے کم خلاصہ تو آسانی کے ساتھ آدمی کو اپنی ذرا سی کوشش سے حاصل ہوسکتا ہے۔ آپ کی اپنی زبان میں جو اسلامی لٹریچر موجود ہے اسی کا مطالعہ کیجیے اور کم از کم اتنا جان لیجیے کہ کافر اور

مسلمان میں کیا فرق ہے، کیا بنیادی چیزیں ہیں جن سے ایک آدمی کافر سے مسلمان ہوتا ہے، ایک مسلمان کو کن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ اس کے فرائض کیا ہیں، اس کے لیے ممنوع کیا چیزیں ہیں۔ اس کے لیے اخلاق کے کیا اصول ہیں جن کی اسے پابندی کرنی چاہیے۔ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کے لیے کسی دینی درس گاہ میں ہی آپ کا جانا اور برسوں علوم دینی پڑھنا ضروری ہو۔ تھوڑی سی توجہ اور تھوڑی سی محنت سے ہمارا ہر نوجوان اسلام کا کم از کم اتنا علم تو حاصل کرہی سکتا ہے اور اس علم کے لیے ہر زبان میں کافی مواد موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان خود اس علم کی ضرورت محسوس کریں اور اسے حاصل کرنے کی فکر کریں۔ یہ علم آپ کو امتحان پاس کرنے اور ڈگری لینے کے لیے نہیں، بلکہ مسلمان بننے کے لیے درکار ہے۔

☆☆

قومیت و صوبائیت اور رنگ و زبان

کاش! ہوتے جو مسلماں بھی ایک

● عارف باللہ حضرت اقدس مولانا حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ

زبان و رنگ کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی نشانی:

سب مسلمان بھائی ہیں۔ ’’انما المومنون اخوة.‘‘ (الحجرات)

کوئی افریقہ سے آیا ہے کوئی لندن سے، کوئی بلوچستان سے کوئی پنجاب سے، کوئی سندھ سے، کوئی کہیں سے آیا ہے کوئی کہیں سے، لیکن میں سب کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’ومن آیتہٖ خلق السموٰت والأرض وأختلاف ألسنتکم و الوانکم‘‘ (روم:22)۔

زبان و رنگ کا اختلاف یہ میری نشانیاں ہیں، اگر کوئی اللہ کی نشانی کو حقیر سمجھے تو اس کی بہت بڑی نالائقی ہے، وہ بڑا بیہودہ آدمی ہے۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ زبان و رنگ کے اختلاف سے ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ لوگ گناہ کی حقیقت کو سمجھتے نہیں، اگر کوئی اللہ کی نشانی کو نہیں مانتا، انکار کرتا ہے تو یہ کفر ہے۔ کوئی پنجابی بولتا ہے، کوئی سندھی زبان بولتا ہے تو اردو زبان والے ہنستے ہیں۔ اردو اچھی زبان تو ہے، لیکن اس کو تمام زبانوں سے اچھا اور افضل سمجھنا جائز نہیں اور کسی زبان کو حقیر سمجھنا جائز نہیں۔ انگریزی زبان کو بھی حقیر نہ جاننا چاہئے، اگر کوئی انگریز مسلمان ہو جائے تو کیا بولے گا؟ انگریزی ہی تو بولے گا۔ پس جتنی

زبانیں ہیں سب کو اچھا سمجھو۔ اگر تم لندن میں پیدا ہوتے تو انگریزی بولتے، پنجاب میں پیدا ہوتے تو پنجابی بولتے، سندھ میں پیدا ہوتے تو سندھی بولتے لہٰذا جو زبان تمہاری ہوتی کیا اس کو حقیر سمجھتے؟ لہٰذا کسی زبان کو حقیر نہ سمجھو۔

جب ہم بنگلہ دیش گئے تو کبھی کسی بنگلہ دیشی کو حقیر نہیں سمجھا، اسی وجہ سے سب بنگلہ دیشی عاشق ہو گئے، کیونکہ مجھ میں عصبیت نہیں ہے، عصبیت کا نہ ہونا یہ بات بہت کم پاؤ گے۔ میرے کتنے دوست پنجاب کے ہیں، لیکن ان کی پنجابی سے مجھے مزہ آتا ہے۔

عصبیت: سوء خاتمہ کا پیش خیمہ:

اپنے قلب کا جائزہ لیتے رہو کہ عصبیت کا کوئی ذرہ دل میں تو نہیں ہے۔ اگر عصبیت کا ایک ذرہ بھی دل میں ہوا تو سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ ایک غزوہ میں ایک شخص بہت بہادری سے لڑ رہا تھا۔ ایک صحابی نے اس کی تعریف کی تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ جہنمی ہے۔ وہ صحابی اس کے پیچھے لگ گئے۔ آخر میں دیکھا کہ وہ زخمی ہو گیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر اپنی تلوار سے اس نے خودکشی کرلی۔ صحابی نے آکر یہ واقعہ حضور ﷺ سے عرض کیا اور پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص اسلام کے لیے نہیں عصبیت کے لیے لڑ رہا تھا کہ میرے قبیلہ کا نام ہوگا۔ پس خوب سمجھ لو کہ عصبیت جہنم میں لے جانے والی ہے، زبان اور رنگ کو حقیر سمجھنا جہنم میں جانے کا سامان کرنا ہے۔

اس مضمون کو پھیلاؤ، اس کا بہت فائدہ ہوگا، آج کل اس کی ہر جگہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان اس مضمون کو آگے پھیلائے۔ کسی زبان کو حقیر نہ سمجھو، زبان اور رنگ کی وجہ سے کسی کو حقیر سمجھنا دلیل ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی نشانی کا انکار کر رہا ہے۔

جتنے آدمی یہاں موجود ہیں سب اس مضمون کو پھیلائیں ’’واختلاف ألسنتکم وألوانکم‘‘ آدمی اپنے باپ کی نشانی کی عزت کرتا ہے، اس کو دیکھ کر باپ کو یاد کرکے

روتا ہے کہ یہ میرے باپ کی نشانی ہے۔ وہ بندہ کتنا نالائق ہے جو اللہ تعالیٰ کی نشانی کو جھگڑے کا ذریعہ بناتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، چاہے لندن کے ہوں، چاہے یوگنڈا کے ہوں، کالے گورے اللہ تعالیٰ بناتے ہیں، خود نہیں بنتے، اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والے ہیں۔ رنگ وزبان کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔ جو قرآن پاک کی کسی آیت پر ایمان نہ لائے وہ قرآن پاک کا انکار کرنے والا ہے۔ (ماخوذ از ماہنامہ الابرار 2006)

زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ذریعۂ معرفت الٰہی ہے:

اب ایک نئی بات سنو! جو شاید مجھ ہی سے سنو گے۔ ملاوی میں ایک رات دو بجے میری آنکھ کھل گئی تو کتا بھونک رہا تھا۔ میں نے سوچا کیا بات ہے کہ یہاں کا کتا بھی اسی زبان میں بھونکتا ہے جس زبان میں کراچی کا کتا بھونکتا ہے۔ کتے بلی اور تمام جانور ہر ملک کے ایک ہی طرح بولتے ہیں۔ انگلینڈ کا کتا یہ نہیں کہتا کہ I am a dog اور انگلینڈ کی بلی یہ نہیں کہتی کہ I am a cat بلکہ ہر ملک کی بلی میاؤں ہی کہے گی۔ بنگلہ دیش کے ایک عالم نے مزاحاً کہا کہ بلی جو میاؤں کہتی ہے تو دراصل کہتی ہے کہ میں آؤں؟ لیکن انسانوں کی زبانیں ہر ملک اور ہر علاقہ کی مختلف ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ دل میں یہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی معرفت کے لیے پیدا کیا ہے، اس لیے ان کی زبانوں میں اختلاف کر دیا، تاکہ اس اختلاف سے وہ مجھے پہچانیں۔ واہ رے میرے اللہ! آپ کی کیا قدرت ہے کہ آپ نے کتنی زبانیں پیدا فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

(ومن آيته خلق السموات والارض و اختلاف السنتكم و الوانكم)
(سورہ الروم، آیت:22)

تمہارے اختلافِ زبان اور اختلافِ رنگ میں میری نشانیاں ہیں اور نشانیاں

جانوروں کو نہیں دی جاتیں، کیونکہ ان کے اندر معرفت الٰہی کی صلاحیت ہی نہیں ہے ورنہ انگلینڈ کی بلی انگریزی بولتی اور پاکستان کی بلی اردو بولتی اور بنگلہ دیش کا کتا بنگلہ بولتا، لیکن ساری دنیا کے جانور ایک ہی طرح بولتے ہیں، پاکستان کا گدھا اسی طرح بولے گا جس طرح انگلینڈ کا گدھا بولتا ہے اور انسانوں کو کیونکہ اپنی معرفت کے لیے پیدا کیا اس لیے ان کی زبان اور رنگ میں اختلاف کر دیا، لیکن یہ ہماری نادانی ہے کہ ہم اس کو وجہ فضیلت بنالیں کہ ہم گورے ہیں تم کالے ہو۔ معلوم ہوا کہ زبان اور رنگ کا اختلاف لڑنے کے لیے نہیں اللہ کی معرفت و محبت کے لیے ہے۔ اگر ابا اپنی کوئی نشانی دے تو بچے اس کو دیکھ کر ابا کو یاد کرتے ہیں، یا آپس میں لڑتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ تو اختلاف اَلسنہ و اختلاف اَلوان کو اپنی نشانی بتارہے ہیں اور ہم بجائے اپنے مالک کو یاد کرنے کے اس پر لڑ رہے ہیں اور اس کو اپنی فضیلت کا سبب بنا رہے ہیں۔ اس لیے دوسری جگہ فرمادیا:

ان أكرمكم عند الله اتقاكم. (الحجرات، آیت:13)

تمہاری فضیلت اور کرامت زبانوں اور رنگوں پر نہیں ہے تقویٰ پر ہے جو جتنا زیادہ متقی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا ہی مکرم ہے۔ (ماخوذ از ارشادات درددل)

زبان ورنگ سے بالاتر ایک بے مثل قوم:

لہٰذا جو دین سے بے وفا ہو کر اور اللہ اور رسول کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور دوبارہ یہودی اور عیسائی ہو گئے تو کوئی فکر مت کرو "**فسوف يأتى الله بقوم يحبهم ويحبونه**" (ہم عنقریب عاشقوں کی ایک قوم پیدا کریں گے جن سے ہم محبت کریں گے اور جو ہم سے محبت کرے گی اور قوم نازل فرمایا اقوام نازل نہیں فرمایا)، جس سے معلوم ہوا کہ ساری کائنات میں جتنے لوگ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں۔ چاہے وہ ملاوی کا ہو یا پاکستان کا ہو، امریکہ کا ہو یا افریقہ کا ہو، کالا ہو یا گورا ہو، سارے عالم کے اللہ کے عاشق اور

اللہ سے محبت کرنے والے سب ایک قوم ہیں۔ اگر اللہ کے عاشقوں میں بہت قومیں ہوتیں اور کالے گوروں کا فرق ہوتا تو اللہ لفظ قوم نازل نہ فرماتا، اقوام نازل کرتا کہ ہم اپنے عاشقوں کی اقوام نازل کریں گے، لیکن ''فسوف یاتی اللہ بقوم'' فرمایا کہ پوری دنیا میں جتنے میرے عاشق ہوں گے وہ سب کے سب ایک قوم ہیں، عاشقوں کی قوم الگ تھلگ نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے عاشق سب ایک قوم ہیں:

البتہ محبت کی تعبیر کے لیے ان کی زبانوں میں اور رنگ میں اختلاف ہے۔ یہ دلیل اختلاف قومیت کی نہیں ہے، یہ اختلاف تعبیرات ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مختلف زبانوں میں ہمارا نام لیا جائے اور مختلف رنگ کے لوگ ہمیں یاد کریں، یہ ہمارا انتظام ہے۔ اختلاف السنۃ اور اختلاف الوان، یعنی زبان ورنگ کے اختلاف میں ہم نے اپنی نشانی اور اپنی قدرت کا تماشہ دکھایا ہے کہ کوئی بنگالی بول رہا ہے کوئی انگریزی بول رہا ہے اور کوئی گجراتی بول رہا ہے:

(ومن آیتہٖ خلق السموت والارض واختلاف السنتکم والوانکم) (الروم، آیت:22)۔

تمہارے رنگ اور کلر اور تمہاری زبانیں جو الگ الگ ہیں یہ میری نشانیاں ہیں لہٰذا اس سے یہ مت سمجھنا کہ ہمارے عاشقوں کی کئی قومیں ہیں۔ رنگ اور زبان کے اختلاف سے قوم کا مختلف ہونا لازم نہیں آتا۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے چاہے وہ کسی رنگ اور کسی زبان کا ہو ایک قوم ہے، ساری دنیا بھر کے عاشق ایک قوم ہیں، لہٰذا آپ کو ملاوی مل جائے، افریقی مل جائے، ایشیا کا مل جائے، انڈین مل جائے، گجراتی مل جائے، لیکن وہ اللہ ورسول سے پیار کرتا ہو تو اس سے معانقہ کرو، محبت کرو کہ واہ رے میرے پیارے ہم تم ایک برادری ہیں، یہاں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ سارے عالم کے عاشق خدا ایک قوم ہیں، دلیل

میں قرآن پاک کی آیت پیش کررہا ہوں، ملاوی کے علماء یہاں موجود ہیں جنوبی افریقہ کے علماء موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ''فسوف یاتی اللہ بقوم'' میں ایک قوم پیدا کروں گا جس کی کیا شان ہوگی؟ ''یحبھم'' اللہ تعالیٰ ان سے محبت کریں گے، اور ''و یحبونہ'' (اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے)۔ تو اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کی قوم کی پہلی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت فرمائیں گے اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے اور ''بقوم'' میں جو ''با'' داخل ہے یہ ''اَتی یاتی'' جو لازم تھا اس کو متعدی کررہا ہے۔ کیا مطلب ہوا؟ کہ ہمارے دیوانے خود سے نہیں بنتے، دیوانے بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ''با'' یہ معنیٰ پیدا کررہا ہے کہ ہم لائیں گے اپنے عاشقوں کی ایک جماعت اور قوم جس کو ہم اپنا دیوانہ بنائیں گے۔

محبت دونوں عالم میں یہی جا کر پکار آئی
جسے خود یار نے چاہا اسی کو یادِ یار آئی

اللہ جس کی قسمت میں اپنا عشق اور اپنی محبت رکھتا ہے وہی اللہ کا دیوانہ ہوتا ہے، جس کو اللہ پیار کرتا ہے وہی اللہ کو پیار کرتا ہے، یہ بہت خوش نصیب لوگ ہیں یہ بڑی قسمت والے ہیں بادشاہوں کو یہ قسمت نصیب نہیں ہے، اگر اللہ کو بھولے ہوئے ہیں تو بادشاہ زندگی بھر اپنی بادشاہت میں پریشان ہیں۔ تاج شاہی سر پر ہے اور سر میں دردِ سر ہے:

شاہوں کے سروں میں تاجِ گراں سے دردسا اکثر رہتا ہے
اور اہلِ صفا کے سینوں میں اک نور کا دریا بہتا ہے

اللہ والوں کے سینوں میں نور کا دریا بہہ رہا ہے اور شاہوں کے سروں میں اپوزیشن کے ڈنڈے سے دردِ سر ہو رہا ہے۔ تاج شاہی سر پر اور خود سلطنت کی کرسی پر اور کرسی کے نیچے سے اپوزیشن کے ڈنڈے کی فکر ہر وقت پریشانی میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔

(ماخوذ از اللہ کے باوفا بندے)

عاشقوں کی قومیت:

دوران درس مثنوی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت ''یحبھم و یحبونه'' نازل کرکے بتادیا کہ میں اپنے عاشقوں سے محبت کرتا ہوں اور یہ مجھ سے محبت کرتے ہیں، لیکن ''قدم اللہ تعالیٰ محبته علی محبة عبادہٖ لیعلموا أنھم یحبون ربھم بفیضان محبة ربھم'' اللہ نے اپنی محبت کو اپنے بندوں کی محبت سے پہلے بیان کیا، تاکہ میرے بندے جان لیں کہ ان کو جو محبت میرے ساتھ ہے یہ میری ہی محبت کا فیض ہے:

محبت دونوں عالم میں یہی جا کر پکار آئی
جسے خود یاد نے چاہا اسی کو یاد یار آئی

یہ آیت مرتدین کے مقابلہ میں نازل ہوئی کہ جو مرتد ہوئے یہ بے وفا تھے، ان کو مجھ سے محبت نہیں تھی، یہ اہل محبت نہیں تھے اب ان کے مقابلے میں ''فسوف یاتی اللہ بقوم'' نازل کررہا ہوں کہ میں ایک قوم عاشقوں کی پیدا کروں گا جن سے میں محبت کروں گا اور جو مجھ سے محبت کریں گے۔ معلوم ہوا کہ عاشقوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے فسوف یاتی اللہ کا ظہور ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا چونکہ اتیان میں تو سوف ہے، لیکن اس کا تسلسل منقطع نہیں ہے، لہٰذا آج بھی جو اللہ کی محبت میں مست ہو یا جو اپنے اللہ والے شیخ پر عاشق ہو تو سمجھ لو کہ یہ ''فسوف یاتی اللہ بقوم'' کا ایک فرد ہے۔ کون سی قوم؟ ''یحبھم و یحبونه'' کی قوم یہ ایک قوم ہے، اپنے عاشقوں کو اللہ نے ایک قوم قرار دیا ہے، لہٰذا ہم سب ایک قوم ہیں اگرچہ کوئی پنجابی، کوئی بنگالی، کوئی ہندوستانی، کوئی فارسی، کوئی عربی ہو ہزاروں ملکوں کے ہوں، ہزاروں زبانوں کے ہوں، مگر ہم مختلف اقوام نہیں ایک ہی قوم ہیں۔ معلوم ہوا قومیت ملکوں سے نہیں بنتی، معلوم ہوا قومیت رنگ و نسل اور زبانوں سے نہیں بنتی ملکوں علاقوں خاندانوں اور قبائل سے نہیں اللہ کے عشق سے قومیت بنتی

ہے۔ عالم میں جتنے اللہ کے عاشق ہیں سب ایک قوم ہیں۔ اگر ہر ملک اور ہر علاقے کے عاشقان خدا الگ الگ قومیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ ''فسوف یأتی اللہ باقوام'' نازل فرماتے کہ ہم بہت سی اقوام پیدا کریں گے لیکن ''فسوف یأتی اللہ بقوم'' مفرد نازل کرکے بتادیا کہ سارے عالم کے عاشق ایک ہی قوم ہیں، جو بھی اللہ کا عاشق ہے وہ ہماری قوم میں داخل ہے اور جو ان کا عاشق نہیں وہ ہماری قوم سے نہیں، اگرچہ ہمارے وطن کا ہو، اگرچہ ہمارا قریبی رشتہ دار، ہمارا خون، ہماری زبان، ہمارا ملک، ہمارا صوبہ، ہمارا علاقہ ہماری قوم نہیں ہے۔ ہماری قوم اللہ کے عاشقین سے بنتی ہے، اس قومیت کے اجزائے ترکیبی دو ہیں ایک ''یحبھم'' اور دوسرا ''یحبونه''، یعنی جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور جو اللہ سے محبت کرتے ہیں یہ قوم وہ ہے جس کو خالق اقوام نازل فرمارہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور دنیا بھر کے کافر اس قوم کو کیا جانیں، ان کی قومیت تو رنگ و نسل ملک اور قوم اور زبانوں کے اختلاف کی بنیادوں پر بنتی ہے جس کا نتیجہ بغض و نفرت و عداوت ہے۔ پیدا کرنے والا جانتا ہے کہ قومیت کیا چیز ہے، جس نے ہم سب کو پیدا کیا اس کی بتائی ہوئی قومیت معتبر ہے یا ان کافروں کی بنائی ہوئی؟ اس قوم کی امتیازی شان رنگ و نسل زبان اور ملک نہیں ہے اس کی امتیازی شان ''یحبھم و یحبونه'' ہے کہ یہ قوم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے پہلے ''یحبھم'' فرمایا کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے مگر کیسے معلوم ہو کہ اللہ ان سے محبت کررہا ہے؟ ''یحبھم'' کی ضمیر ''ھم'' کے افراد کو اب متعین نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ نزول وحی بند ہوچکا، اب جبرئیل علیہ السلام نہیں آسکتے، نص قطعی سے تعین نہیں ہوسکتا کہ فلاں فلاں اشخاص سے اللہ کو محبت ہے پھر اللہ تعالیٰ کی محبت کے ادراک کا اب کون سا تھرمامیٹر ہے، کون سی دلیل ہے، کیونکہ اللہ کی محبت اپنے بندوں کے ساتھ مخفی ہے، لیکن اللہ کے بندوں کی محبت اللہ کے ساتھ تو ظاہر ہے:

عشق من پیدا ودلبر ناپدید

میرا عشق تو ظاہر ہے، لیکن میرا محبوب پوشیدہ ہے میرا عشق، یعنی وضو کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، طواف کرنا، جہاد کرنا، سرکٹانا سب ظاہر ہے مگر محبوب پوشیدہ ہے:

در دوعالم ایں چنیں دلبر کہ دید

دونوں عالم میں ایسا محبوب دکھاؤ کہ جس کو دیکھا بھی نہیں، لیکن ایک ہی دن میں ستر شہید احد کے دامن میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح آج بھی بندوں کی محبت تو میرے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے لیکن اے دنیا والو! ''**یحبھم**'' کا علم تمہیں کیسے ہوگا تم کیسے جانو گے کہ میں بھی ان سے محبت کرتا ہوں، کیونکہ نزول وحی بند ہو چکا، لہٰذا آگے دلیل موجود ہے ''**ویحبونه**'' جو لوگ مجھ سے محبت کر رہے ہیں تو سمجھ لو کہ میں بھی ان سے محبت کر رہا ہوں جس پر ''**یحبونه**'' کے آثار دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ میری ہی محبت کا فیضان ہے۔ ''**یحبھم ویحبونه**'' اللہ تعالیٰ نے مضارع نازل فرما کر بتا دیا کہ میرے عشاق حال میں بھی میرے باوفا رہیں گے اور مستقبل میں بھی میرے باوفا رہیں گے۔ یہی آیت دلالت کرتی ہے کہ اہل محبت کی صحبت میں رہنا چاہئے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی دائمی وفاداری حاصل ہو جائے۔

اور اس آیت کا نزول سارے عالم کے عاشقوں میں رابطہ اور محبت میں اضافہ کا ضامن ہے، کیونکہ جب ان کو معلوم ہوگا کہ ہم سب ایک قوم ہیں تو ہر قوم اپنی قوم کو محبوب رکھتی ہے۔ جن بچوں کو معلوم ہو کہ ہم ایک باپ کی اولاد ہیں ان میں آپس میں محبت ہوتی ہے اور جن کا تعلق باپ سے کمزور ہوتا ہے انہیں کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے، جو اللہ کی محبت سے محروم ہیں وہی آپس میں لڑتے ہیں اور اہل محبت چونکہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک قوم ہیں، ایک جان ایک قالب ہیں اسی لیے ان کے قلب اور قالب پر اللہ کی محبت غالب ہے۔ ایک قوم ہونے کے احساس سے محبت میں خود بخود اضافہ ہو جاتا ہے۔ سارے عالم میں کسی ملک کسی علاقہ کا کوئی اللہ والا پا جاتا ہے تو ہر اللہ والا اس کی محبت محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اللہ کے عاشقوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوتی ایک عاشق دوسرے عاشق سے مل کر مست ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ ''**فسوف یاتی الله بقوم**'' کا فرد ہے:

یوں تو ہوتی ہے رقابت لازماً عشاق میں
عشق مولیٰ ہے، مگر اس تہمت بد سے بری

بتائیے! کیا یہ علوم اختر پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم نہیں ہیں کہ قرآن پاک کی آیات سے تصوف کے مسائل کا استخراج واستنباط ہو رہا ہے اور آج زندگی میں پہلی بار ''**یحبھم و یحبونه**'' سے عاشقوں کا ایک قوم ہونا اللہ تعالیٰ سے قلب پر منکشف فرمایا اور میرا دل کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اختر کو اس علم میں خاص فرمایا شاید ہی کسی کا ذہن اس طرف گیا ہو کہ اللہ کا ہر عاشق خواہ کسی ملک، کسی علاقے، کسی رنگ، کسی نسل کا ہو یہ سب ایک قوم میں داخل ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ''**فسوف یاتی الله بقوم**'' نازل فرمایا ''**باقوام**'' نازل نہیں فرمایا۔ قرآن پاک کے علوم غیر محدود ہیں، جب صاحب کلام غیر محدود ہے تو اس کے کلام کے لطائف اور خوبیاں کیسے محدود ہوں گی، غیر محدود ذات کی ہر صفت بھی غیر محدود ہوتی ہے اور یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ یہ تفسیر نہیں، بلکہ اسرار ولطائف قرآنیہ ہیں۔ (ماخوذ از انعامات ربانی)۔

خاندان وقبائل کا مقصد تعارف ہے نہ کہ تفاضل وتفاخر:

''**انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا**'' (الحجرات آیت:13)۔

حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا یعنی بابا آدم علیہ السلام اور مائی حوا علیہا السلام سے ''**وجعلنا کم شعوبا وقبائل**'' اور ہم نے تم کو مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا لیکن یہ تقسیم تفاخر کے لیے نہیں، بلکہ اس کا مقصد ہے

"لتعارفوا" تا کہ تم کو ایک دوسرے کا تعارف حاصل ہو سکے، لیکن ہم لوگوں نے بجائے تعارف کے تفاضل اور تفاخر شروع کر دیا۔ جو پٹیل ہے وہ کہتا ہے کہ ہمارے مقابلہ میں سب گھٹیا ہیں، کوئی لمبات ہے کوئی گنگات ہے۔ اس آیت سے یہ مسئلہ نکلا کہ اپنے خاندان پر، اپنی برادری پر، اپنے القاب پر فخر کرنا نادانی ہے جو مقصد تعارف کے خلاف ہے۔ اس وقت مجھے بس یہ تھوڑی سی نصیحت کرنی ہے کہ "لتعارفوا" کا خیال رکھئے۔ تفاخر و تفاضل جائز نہیں کیونکہ تفریق شعوب وقبائل سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے تعارف ہو جائے کہ فلاں خاندان سے ہے، وہ فلاں قبیلہ سے ہے۔ خاندان وقبائل سبب عزت وشرف نہیں ہیں۔ پھر عزت وشرف کس چیز میں ہے؟ آگے ارشاد فرماتے ہیں "ان اکرمکم عند الله اتقکم" اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ جو جتنا زیادہ متقی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا ہی زیادہ معزز ہے۔ (ماخوذ از معارف ربانی)

جنت میں کوئی صوبہ نہیں:

اسلام کی حقانیت کی ایک بڑی دلیل ہے کہ کالے، گورے، سانولے ہر رنگ کے آدمی جمع ہو گئے اور یہاں رنگ اور زبان کی کوئی تفریق نہیں، کیونکہ جنت میں کوئی ملک اور کوئی صوبہ نہیں ہے، نہ وہاں فرانس ہے نہ امریکہ نہ ہندوستان نہ بنگلہ دیش، نہ پنجاب، نہ سندھ، نہ بلوچستان، لہٰذا جن کو جنت میں جانا ہے ان کے دل میں عصبیت نہیں ہوتی۔ یہی علامت ہوتی ہے کہ یہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں سب کی زبان عربی ہوگی اور جو عربی نہیں پڑھا ہوگا اللہ تعالیٰ اس کو سکھا دیں گے، ہر جنتی عربی بولے گا۔ وہاں قومیت، صوبائیت لسانیت نہیں ہوگی کہ پنجابی پنجابی بول رہا ہے، سندھی سندھی بول رہا ہے، گجرات کا گجراتی بول رہا ہے۔ وہاں سب عربی بولیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"وجبت محبتی للمتحابین فی والمتحالسین فی والمتزاورین فی والمتباذلین" (مؤطا امام مالک)۔ میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہو جاتی ہے جو میری وجہ سے آپس میں محبت رکھتے ہیں، ان کی آپس میں محبت کا سبب میں ہوں، نہ رشتہ داری، نہ قرابت داری، نہ بزنس پارٹنری کسی قسم کا رشتہ نہیں، نہ ملکی، نہ علاقائی، نہ لسانی، کوئی انگریزی بول رہا ہے، کوئی عربی بول رہا ہے، کوئی اردو مگر میری وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کر رہے ہیں تو ان کو اپنی محبت عطا کرنا میرے ذمہ واجب ہو جاتا ہے:

میں ڈھونڈتا ہوں تجھ کو محبت کہاں ہے تو
اک قلب شکستہ ترے قابل لیے ہوئے

قیامت کے دن اعلان ہوگا "این المتحابون فی" (کہاں ہیں وہ لوگ جو دنیا میں میری وجہ سے آپس میں محبت کرتے تھے)، ان کی زبان ایک نہیں تھی، علاقے ایک نہیں تھے، قومیت ایک نہیں تھی، خاندان ایک نہیں تھا، لیکن صرف میری وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے وہ لوگ میرے عرش کے سائے میں آجائیں تو معلوم ہوا کہ اہل جنت کو جنت میں عرش اعظم کی چھت کا جو سایہ ملے گا اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کو وہ سایہ میدان محشر ہی میں مل جائے گا اور ان کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔

زبان اور رنگ: اللہ تعالیٰ کی دو عظیم الشان نشانیاں:

اللہ تعالیٰ نے آج ایک علم عظیم عطا فرمایا کہ کسی زبان کو دل سے حقیر سمجھنا یا زبان سے ظاہر کرنا اس میں خوف کفر ہے۔ چنانچہ تھانہ بھون میں حضرت تھانویؒ نے ایک شخص کا خط پڑھا جو بنگال سے آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ہم بہت ہانستا ہے اس کا علاج بتائیے۔ حضرت کی مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ یہ بنگالی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہارے اس جملے سے حقارت کی بو آرہی ہے کہ تم نے اہل بنگال اور ان کی زبان کو حقیر سمجھا، لہٰذا تم

جا کر دوبارہ کلمہ پڑھو اور دو رکعات نماز توبہ پڑھو۔ لہٰذا زبان کو حقیر سمجھنا اس لیے حرام ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ’’**واختلاف السنتکم و الوانکم**‘‘ اے دنیا والو! تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف میری نشانی ہے اور نشانی سے پہچان ہوتی ہے یعنی تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف میری معرفت کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا کسی زبان کو یا کسی رنگ کو مثلاً کالوں کو حقیر سمجھنا اس میں اندیشہ کفر ہے۔ ایک شخص کسی بونے کو دیکھ کر ہنسنے لگا تو اس نے کہا کہ پیالے پر ہنس رہے ہو یا کمہار پر۔ پیالہ پر ہنسنا، پیالہ بنانے والے پر ہنسنا ہے، کسی کی بنائی ہوئی چیز کا مذاق اڑانا گویا کہ بنانے والے کا مذاق اڑانا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں مجدد زمانہ حکیم الامت کا مذکورہ بالا عمل ہماری تائید کرتا ہے۔ ہر انسان خواہ کسی رنگ کا ہو اور کسی زبان کا ہو اس میں ولی اللہ بننے کی صلاحیت موجود ہے، ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کرے ولی اللہ ہو گیا لہٰذا عقلاً بھی کسی کو حقیر سمجھنا جائز نہیں۔ لیکن زبانوں کے بارے میں غیر شعوری طور پر شیطان حقارت ڈال دیتا ہے۔ اس کا خاص دھیان رکھنا چاہئے کہ کسی کی حقارت دل میں نہ آنے پائے۔ مولانا شاہ محمد احمد صاحبؒ فرماتے ہیں:

نہ کوئی راہ پا جائے نہ کوئی غیر آ جائے
حریم دل کا احمد اپنے ہر دم پاسباں رہنا

(ماخوذ از خزائن شریعت وطریقت)

عصبیت کفر کی نشانی:

اس کے بعد حضرت والا نے مولانا عبد المتین صاحب سے فرمایا کہ بنگلہ زبان میں اس کا ترجمہ کرو۔ بنگلہ دیش سے پندرہ حضرات، حضرت والا کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ترجمہ کے بعد فرمایا کہ دیکھو! بنگلہ زبان سے سب کو مزہ آیا۔ یہ کس وجہ سے ہوا؟ اس لیے کہ ایمان دل میں اتر گیا۔ اگر عصبیت اور نفسیات ہوتی

تو مزہ نہ آتا، اسی لیے ہمارے دوست آپس میں بہت محبت رکھتے ہیں۔ ہم سب ایک امت ہیں۔ رسول اللہؐ ہر زبان کے نبی ہیں۔ بنگلہ دیشی، ہندوستانی، پاکستانی، برطانوی، افریقی، امریکی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے نبی ہیں، مختلف زبانیں رکھنے والوں کا نبی ایک ہی ہے۔ اس لئے ہم سب ایک ہیں۔ جب ہمارا اللہ ایک ہے اور ہمارا رسول ایک ہے تو ہم سب ایک ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو ایک قوم فرمایا ہے:

’’**من یرتد منکم عن دینه فسوف یاتی الله بقوم یحبهم و یحبونه**‘‘

(سورہ المائدہ، آیت: 54)

(تم سے جو مرتد ہو جائیں گے ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ ایک قوم پیدا کرے گا، جن سے اللہ محبت کرے گا اور جو اللہ سے محبت کریں گے)۔

اللہ نے قوم نازل فرمایا، اقوام نازل نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے عاشقین سب ایک قوم ہیں چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی ہوں، گورے ہوں یا کالے ہوں، چاہے وہ عربی بولتے ہوں یا انگریزی بولتے ہوں، بنگلہ بولتے ہوں یا اردو بولتے ہوں چاہے کوئی زبان بولتے ہوں، لیکن اللہ سے محبت رکھنے والے سب ایک قوم ہیں، ایک امت ہیں۔

اس لئے اختلاف زبان اور اختلاف رنگ سے خود کو ایک دوسرے سے برتر یا کمتر سمجھنا کفر ہے۔ فرض کرلو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہمارے درمیان آ جائیں تو آپؐ تو عربی میں بولیں گے، لیکن ہر زبان میں ایک ترجمان بنائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ ہر زبان میں ہوگا۔ معلوم ہوا کہ ہر زبان ہماری ہے۔ اسی طرح ایک عالم دین کو دوسروں تک دین پہنچانے کے لیے ہر زبان کا ترجمان چاہئے، اس لیے زبانوں سے نفرت مت کرو، زبانوں سے نفرت میں بوئے کفر آتی ہے۔ ہر زبان کو اللہ نے اپنی نشانی فرمایا ہے۔ ’’**واختلاف السنتکم و ألوان**‘‘کم زبانوں کا اختلاف اور تمہارے رنگوں کا اختلاف اس میں ہماری نشانیاں ہیں۔ اللہ کی نشانی کو حقیر سمجھنا، اس سے نفرت کرنا کفر ہے۔ زبان

سے نفرت کرنا اور رنگ سے نفر کرنا کہ یہ کالا ہے وہ گورا ہے یہ سب کفر کی باتیں ہیں۔ کوئی رنگ ہو اور کوئی زبان ہو، انگریزی ہو، فارسی ہو، عربی ہو، بنگالی ہو، اردو ہو، پشتو ہو سب اللہ تعالی کی نشانیاں ہیں، اس لیے اللہ کی نشانی کو حقیر سمجھنا، ذلیل سمجھنا، کمتر سمجھنا کفر ہے۔

پس عصبیت اور صوبائیت کہ یہ فلاں ہے، وہ فلاں ہے اس لیے فلاں، فلاں سے بہتر ہے یہ فکر کی نشانی ہے اور جنت سے محرومی کی علامت ہے۔ جو لوگ جنت میں جانے والے ہیں وہ عصبیت سے پاک ہوتے ہیں، کیونکہ جنت میں رنگوں اور کا اور زبانوں کا اختلاف نہیں د ہے، جنت میں کوئی صوبہ نہیں د ہے، جنت میں سب کی زبان عربی ہوگی، سب عربی بولیں گے۔ اب کوئی کہے کہ ہم تو عربی نہیں جانتے ہیں، کیونکہ ہم عربی پڑھے ہوئے نہیں ہیں تو جواب یہ ہے کہ وہاں اللہ سکھا دے گا، جنت کی نعمتوں کا استعمال کرنے کا طریقہ اللہ الہام فرمادے گا۔ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں:

"مالا عین رات ولا اذن سمعت و لا خطرہ علیٰ قلب بشر".

(صحیح البخاری).

کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں، نہ کسی قلب پر اس کا خیال گزرا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا تو جنت یاد بھی نہ رہے گی کہ جنت کدھر ہے اور جنت کی حوریں کہاں ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ایسا مزہ آئے گا:

سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے
آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بلد امین کی برکت سے اور کعبہ شریف کی برکت سے جنتی ہونا مقدر فرمادیں، جنت میں دخول اولیں نصیب فرمادیں۔ دوزخ میں سزا پا کر جانے سے اللہ بچائے، جنت نصیب فرمائے اور جنتی اعمال کی توفیق دے اور اللہ جہنم سے بچائے اور اعمال جہنم سے بھی بچائے اور اللہ ہماری نالائقیوں کو، کوتاہیوں کو، خطاؤں کو معاف فرمادے۔ اللہ

اپنی رحمت سے ہمیشہ خوشی دکھائے اور غم سے بچائے۔ بلا استحقاق اپنے فضل اور رحمت محضہ سے ولایت کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرماتے، ہم لوگوں کو بھی، ہمارے بچوں کو بھی، ہمارے گھر والوں کو بھی اور جو ہمارے دوست احباب یہاں نہیں ہیں ان کو بھی نصیب فرما دیجئے اور سارے مسلمانوں کے حق میں میری دعا قبول فرمالیجئے اور تمام کافروں کو بھی آپ ایمان عطا فرما کر ولی کامل بنا دیجئے، اپنی رحمت سارے عالم پر برسا دیجئے، مچھلیوں کو پانی میں، جانوروں کو جنگلوں میں اور پرندوں کو فضاؤں میں عافیت عطا فرمائیے، سارے عالم پر رحمت کی بارش برسا دیجئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمدو آلہ وصحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین.

(ماخوذ از سفر نامہ حرمین شریفین)۔

☆☆

دعوتِ ایمان اور پیامِ انسانیت

● مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

دعوت کی خاصیت:

دوستو اور بھائیو! آج میں آپ کی خدمت میں دو باتیں عرض کروں گا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح اشیاء میں خاصیتیں پیدا کی ہیں اور وہ ہزاروں، بلکہ شاید لاکھوں برسوں سے چلی آرہی ہیں، زمانہ میں کتنے انقلاب آئے، سلطنتوں کے چراغ گل ہوگئے، کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں خلیج عربی کا کوئی وجود نہ تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبھی شام اور ہندوستان کی سرحد ایک تھی، مصر اور ہندوستان کی تہذیب میں جو مماثلت پائی جاتی ہے ان کے عقائد میں، بلکہ مزاج تک میں جو اشتراک ہے اس سے لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ کسی زمانہ میں مصر و ہندوستان قریب تھے اور یہ ایک تختہ تھا جو یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ یہ سب انقلابات ہوئے، لیکن اللہ تبارک تعالیٰ نے اشیاء میں جو خصوصیات رکھی تھیں وہ آج تک چلی آرہی ہیں، پانی آگ بجھاتا ہے، آگ جلاتی ہے، سنکھیا اور زہر کی جتنی قسمیں ہیں وہ کام تمام کردیتی ہیں، سردی گرمی کے وہی اوصاف ہیں اور انسانوں کو کھانے کی ضرورت ہزاروں لاکھوں برس سے ہے، غلہ ہمیشہ سے پایا جاتا ہے، انسان کے لئے اس کے ماحول میں جو چیزیں رکھ دی گئی ہیں ان سے اس کا تعلق بہت قدیم ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اخلاق میں، اعمال میں اور معنویات میں تاثیر رکھی ہے، ایمان میں اس نے جو اپنے تعلق کی صفت رکھی ہے اپنی یاد میں، اپنے ذکر اور اپنی عبادت میں، توجہ میں

جو خصوصیت رکھی ہیں وہ لاکھوں برس سے ہے اور اگر ابھی دنیا کے مقدر میں ہزاروں برس باقی رہنا ہے تو یہ خاصیت رہے گی۔

تاریخ کی کسی ایک شہادت سے نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان اخلاق، اعمال اور عقائد کی خاصیت کسی زمانہ میں کچھ اور تھی، تاریخ تو کیا بتاتی کوئی صحیفہ آسمانی بتاتا کہ توحید میں جو خاصیت ہے وہ کبھی شرک میں تھی جو نیک اعمال میں خاصیت ہے کبھی بداعمالی میں تھی، جو ہمدردی میں خاصیت ہے وہ کبھی بے دردی میں تھی، جو عدل میں خاصیت ہے وہ کبھی ظلم میں تھی کوئی آسمانی صحیفہ یہ نہیں بتاتا، توریت ہو، انجیل ہو، صحف ابراہیم ہوں، زبور ہو اور پھر آخری صحیفہ قرآن مجید ہو، سب یہ بتاتے ہیں کہ ایمان میں توحید میں، نیک اعمال میں، عبادات میں، عدل میں، انصاف میں، ہمدردی میں، محبت میں یہ ہے، جب یہ حقیر اشیاء جو انگلیوں سے مسلی جاسکتی ہیں، پیروں سے روندی جاسکتی ہیں جنہیں استعمال کرکے انسان نہایت خراب حالت میں پہنچا سکتا ہے جن کو جانور چر جاتے ہیں، کھا جاتے ہیں، جن کو پانی بہالے جاتا ہے ان میں یہ خاصیت ہے تو وہ چیزیں جو خدا سے اور اس کی ذات عالی سے تعلق رکھتی ہیں ان میں یہ خاصیت کیوں نہ ہوگی۔

صفات میں تغیر پیدا کیجئے:

میرے دوستو اور بزرگو!

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اور آپ کے لئے دنیا میں نجات کا، عزت کا اور حفاظت کا راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات پر چلیں اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں جن کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

’’وان جندنا لھم الغالبون. وان جندنا لھم المنصورون.‘‘

’’بے شک ہمارا ہی لشکر غالب آنے والا ہے، بے شک ہمارے ہی لشکر کی مدد کی

جائے گی۔''

وہ اخلاق پیدا کریں جو دلوں کو کھینچتے ہیں، جو دشمنوں کو دوست بناتے ہیں، ہمارے اندر سچی ہمدردی پیدا ہو، بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا ہو، ہمارے اندر درد پیدا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہم اپنے اندر سے حسد نکال دیں، کینہ کو نکال دیں، خودغرضی کو نکال دیں، ہماری سطح بلند ہو جائے، ہم مال و دولت کے پرستار نہ ہوں، ہم نوکریوں اور آسامیوں کے عبادت گزار نہ ہوں، ہم عروج و اقبال، طاقت و دبدبہ اور اقتدار کے پجاری اور غلام نہ ہوں، ہم ابن الوقت اور موقع پرست نہ ہوں، ہم پیسہ پر جان دینے لینے والے نہ ہوں، یہ اخلاق اگر ہم اپنے اندر پیدا کرلیں گے تو سارے عالم کی کیفیت بدل جائے گی اور ہم خدا کے محبوب بن جائیں گے اور پھر آسمان سے صدا آئے گی کہ مجھے اپنے فلاں بندہ سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو، اس سے بڑھ کر کوئی شمشیر، اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر پیغمبر سے لے کر اولیاء اللہ تک اور اولیاء اللہ سے لے کر عام مسلمانوں تک نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی، کوئی سیاسی رہنما کوئی دنیا کا فلسفی و دانشور آپ کو اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا اور کسی کے مشورہ سے آپ کو فائدہ نہیں ہوسکتا جو آپ کو خدا کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے ہے، یہ عالم بہت وسیع ہے اور اس کثرت میں اتنا انتشار ہے اور اس میں اتنی چیزیں اتنی اکائیاں پھیلی ہیں کہ آپ ان کو سمیٹ بھی نہیں سکتے، آپ ایک شہر کی ایک محلّہ کی بھی اکائیوں کو نہیں سمیٹ سکتے، اس کثرت میں اگر آپ وحدت پیدا کریں، اس کثرت میں اگر اس ذات واحد سے آپ کا تعلق پیدا ہو جائے اور اس کو آپ اپنا بنالیں تو پھر سارا عالم آپ کا بن جائے گا۔ صفات میں جب تک تغیر نہ ہوگا حالات میں تغیر نہ آئیگا۔ آپ اپنی صفات میں تغیر پیدا کیجئے، اپنی افادیت ثابت کیجئے اور اس لئے ثابت نہ کیجئے کہ آپ کو فائدہ ہو، بلکہ آپ مجسم افادیت بن جائیے، ثابت کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، ثابت کرنا بھی ایک طرح کا تصنع ہے، نہیں آپ مفید بن جائیے یہ نہ دیکھئے کہ دوسروں نے آپ کو مفید مانا یا نہیں، پانی

کب کہتا ہے کہ میں پیاس بجھاتا ہوں، کیا آپ نے کبھی سنا ہے پانی کے وکیل آئے ہوں، پانی کے مبلغ آئے ہوں، پانی کے سفیر آئے ہوں کہ پانی یہ کہتا ہے کہ میں بہت کام کی چیز ہوں مجھے پینا چاہئے، مجھ سے پیاس بجھتی ہے؟ آگ نے کبھی کہا تھا یا اپنا سفیر بھیجا تھا کہ میں کھانا پکاتی ہوں، میں بہت کام نکالتی ہوں، یہ سب بے زبان چیزیں ہیں یہ نہ کبھی بولی ہیں اور نہ بولیں گی، مگر ان کی افادیت مسلم ہے، ساری دنیا ان کی پابند اور محتاج ہے، ایسے ہی مسلمان کسی ملک میں بھی محبوب بن کر رہنا چاہتے ہیں تو اپنی صفات میں تغیر پیدا کریں۔

تمام سیرت کی کتابیں اور تاریخ کی کتابیں اس کے دلائل سے بھری ہوئی ہیں، آپ نے بارہا ایمان افروز واقعات سنے ہیں۔

☆☆

لوگوں کے نام انسانیت کا پیغام

● مورخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عفو عام، درگذر، توکل، صبر وشکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی، تاکید، قرابت مندوں، یتیموں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر وغرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ وخیرات، نیکی وبھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت واطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی وسلامتی کی دعا دینا، حق گوئی وانصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی اتحاد اتفاق، اسلامی برادری، اکل حلال، روزی کو خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی اور کسی دوسرے کی جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال وجائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت نہ داخل ہونا، ستر وحجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی باز پرسی، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی

رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلے نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل وانصاف، دشمنوں تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی، الہانے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری اور ڈاکہ، رہزنی اور دوسروں کے مال کو بے ایمانی سے لینے کی ممانعت، حسن نیت اور دل کی پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار ومتانت، مجالس میں حسن اخلاق، ضعیفوں اور کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، شوہر کی اطاعت، بیوی کی حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرم گاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا اور قرض معاف کردینا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثبات قدم، استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی، گھمسان کی لڑائی سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال ودولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانت داری۔

☆☆

اصل پیامِ انسانیت

● مولانا عبداللہ عباس ندویؒ

مسلمانوں کا تشخص صرف دین سے وابستہ ہے، نام ونسب اور وطن یا درسگاہ کی طرف نسبت فخر ومباہات کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف آپس میں پہچان قائم رکھنے کے لیے ہے، اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے کہ ایک ماں باپ کے متعدد فرزند ہیں اور ہر ایک کا نام دوسرے سے مختلف ہے، آپ اس ذریعہ سے ہر ایک کو علاحدہ علاحدہ پہچانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ''(الحجرات:13) یعنی ہم نے تمھیں مختلف قوموں اور مختلف خاندانوں میں بنایا، تا کہ ایک دوسرے کی شناخت کرسکو۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے فطری نظام سے ناواقف ہوں۔ قدآور اور پستہ قد، برتر اور ابتر، عال وجاہل، دھوپ اور چھاؤں، روشنی اور تاریکی کے درمیان فرق کو ہر ذی روح محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح نیکی اور بدی کو فطرت انسانی جانتی ہے۔ ظلم وزیادتی کو ہر بشر برا سمجھتا ہے۔ عدل وانصاف کو سب پسند کرتے ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ ہمدردی اور ایثار کا جذبہ اس کے اندر موجود ہے۔ وہ کسی مظلوم کی مظلومیت پر ترس کھاتا ہے، کسی دم توڑتے ہوئے انسان کی بےبسی پر اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ بھوک کی تکلیف کو وہ جانتا ہے، اس لیے بھوکے انسان پر سب کو رحم آتا ہے۔ شرم وحیا بھی انسانی زیور ہے۔ اپنے جیسے انسان کی خدمت کر کے اس کو

خوشی ہوتی ہے، یہ سب باتیں فطرت انسانی میں داخل ہیں اور طبیعت بشری ان کو پہچانتی ہے اور اس کے لیے اچھے خصائل، انسان دوستی، مظلوموں سے ہمدردی ''معروف'' صفت ہے۔ معروف کہتے ہیں اس کو جسے فطرت پہچانتی ہے۔

اس کے برخلاف ظلم وزیادتی دوسروں کے ہاتھوں سے لقمۂ حیات چھین کر عیش کرنا فطرت کے لیے غیر پہچانی ہوئی شئے اس غیر پہچانی چیز کو عربی میں 'منکر' کہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے خصال کی دعوت دینا جس کو فطرت پہچانتی ہے معروف کی طرف بلانا ہے اور وہ باتیں جو فطرت کے خلاف ہیں وہ انسان کے لیے انجان اور اجنبی چیز ہے۔ اسی کو ہم 'منکر' فطرت کی غیر پسندیدہ ان پہچانی بات کو کہتے ہیں اور اس سے روکنا بڑائی کی بات ہے۔ ''کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر ''(آل عمران:110) مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو۔ یہی پیام انسانیت ہے۔ واضح اور کھلی ہوئی بات فطرت انسانی کی آواز، جس آواز پر لبیک کہنا بنی نوع انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے۔ (خیر امت) پسندیدہ ترین قوم بنا دیتی ہے ''تومنون بالله ''ان تمام انسانی خوبیوں کو چمکا دیتا ہے۔

انسانی سرشت اگر اپنی جگہ پر قائم رہے، جس کو سب جانتے ہیں تو دنیا کا فساد ختم ہو جائے، اسی انسانی سرشت کو ابھارنے کا نام ''پیام انسانیت'' ہے۔

☆☆

محبت ومساوات کا پیغام عظیم

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

مواخات کا معنی بھائی چارہ قائم کرنا ہے، اس کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب نبی کریم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے یثرب (مدینہ) تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر آپ نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر فرمائی، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

''جب اونٹنی وہاں بیٹھ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا انشاء اللہ اب یہی منزل ہوگی، آپ ﷺ نے ان دونوں لڑکوں کو بلا بھیجا اور ان کی یہ جگہ مسجد کی تعمیر کے لیے خریدنا چاہی مگر انہوں نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! یہ ہماری طرف سے آپ کے لیے ہدیہ ہے، پھر آپ ﷺ نے اس جگہ مسجد تعمیر کرائی۔''

مواخات مدینہ مادی ماحول میں ایک رہنما تجربہ تھا، محبوب خدا ﷺ نے اس کے ذریعہ اسلام کی نرمی اور لچک کی ایک مثال قائم کی اور اسے دلوں کی تالیف اور احساسات و جذبات کو سنوارنے اور نکھارنے کا ایک ذریعہ بنا دیا۔ عہد جاہلیت میں عربوں کی زندگی کا امتیاز یہ تھا کہ قبائلی عصبیت کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل کرتے اور خود بھی قتل ہوجاتے تھے، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون کرنا ان کے نزدیک نیکی اور خدا ترسی کے کاموں میں تعاون کرنے سے زیادہ موزوں اور قابل ترجیح تھا، اس لئے کہ ہر شخص اپنے قبیلے کا پیرو ہوتا تھا خواہ وہ صحیح راستے پر ہو یا غلط، اس تعلق سے عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

ما انا الا من غزية ان غوت
غويت و ان ترشد غزية ارشد

''یعنی میں قبیلہ غزیہ کا ایک فرد ہوں اگر وہ غلط راستے پر چلے گا تو میں بھی غلط راستے پر چلوں گا اور اگر وہ سیدھا راستہ اختیار کرے گا تو میں بھی اسی راستے پر چلوں گا۔''

دلوں میں بیٹھی ہوئی ان کدورتوں اور عصبیتوں کے درمیان اسلام نے تمام اہل ایمان کو بھائی بھائی قرار دیا۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اے ایمان والو! اللہ کی جو نعمتیں تم پر ہیں انہیں یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، تم بہ فضل ربی بھائی بھائی بن گئے اور تم تو آگ کے کنارے پہنچ گئے تھے، اللہ نے ہی تمہیں وہاں سے بچالیا اور اللہ ہی اپنی نشانیاں تم پر واضح کر رہا ہے تاکہ ہدایت پاؤ۔'' تاریخ وسیر کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مواخات دو مرتبہ ہوئی ایک مرتبہ صرف مہاجرین کے درمیان مکہ میں اور دوسری مرتبہ مواسات و ہمدردی کی بنیاد پر مہاجرین و انصار کے درمیان مدینہ میں اور مواخات مدینہ کے ذریعہ ہی سے اوس وخزرج کی تفریق مٹی اور مدینہ کے تمام مسلمان انصار کہلائے۔ مہاجروں کا پردیسیوں کی حیثیت سے مستقل وجود نہیں رہا بلکہ مدنی آقا ﷺ نے مہاجرین وانصار کو باہم ایک امت کی شکل میں ڈھال دیا'' ولتكن منكم امة''

چونکہ مہاجرین مکہ میں اپنے اہل وعیال اور دوست واحباب کو چھوڑ آئے تھے اور ان کے تعلقات اپنے رشتہ داروں سے کٹ گئے تھے جس سے ان کے دلوں میں تنہائی، وحشت اور اشتیاق وطن کے احساسات پیدا ہورہے تھے، اسی لئے اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے مواخات کرائی، تاکہ ان کے دلوں سے وطن سے دوری کی وحشت ختم ہوجائے اور اہل وعیال وخویش واقارب سے منقطع ہوجانے کے نتیجے جوان کے دل اُچاٹ ہوگئے ہیں مانوس ہوجائیں اور باہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مہاجر وانصار کے درمیان مواخات کرائی اور دو دو صحابہ بھائی بھائی بن گئے۔ سب سے پہلے آپؐ نے علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا یہ میرا بھائی ہے، اسی طرح حمزہؓ اور زید بن حارثہ بھائی بھائی بن گئے۔ جعفر بن ابی طالب اور معاذ بن جبلؓ بھائی بھائی بنے۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق یہ نوے آدمی تھے اور ایک قول کے مطابق سو۔ اس حل کو انصار نے کس طرح سنا اور اس پر کس طرح عمل کیا۔ بخاری شریف میں ہے:

''انصار نے اپنی طرف سے یہ پیش کش کی کہ ہمارے نخلستان کو ہمارے بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا 'نہیں، بلکہ نخلستان کی محنت ومشقت اور اخراجات کی ذمہ داری تم اپنے ہاتھ میں رکھو اور پھلوں میں مہاجرین کو شریک کرو' انصار نے کہا منظور ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ انصار کے پاس جو کچھ کائنات تھی وہ یہی نخلستان تھے اس کی پیش کش کے معنی اپنی پوری کائنات کی نذر تھی اس پر مستزاد یہ کہ جب حضور پرنور ﷺ نے فرمایا کہ مہاجرین آمدنی میں تو شریک ہوں گے، لیکن محنت واجرت سب تم ہی کو ادا کرنے ہوں گے سب نے بلا کسی تردد کے خندہ پیشانی اور پوری بشاشت قلب سے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔

مواخات کے سلسلے میں حضرت سعد بن ربیعؓ کا یہ واقعہ مزید حیرت انگیز ہے، دنیا انصار کے اس ایثار پر جتنا ناز کرے کم ہے ''عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن ربیعؓ کے درمیان جب رسول اللہ ﷺ نے مواخات قائم کردی تو حضرت سعد نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا ''میں انصار میں سب سے زیادہ مالدار ہوں تم میرے مال کو نصف نصف تقسیم کرلو، میری دو بیویاں ہیں ان میں سے تم کو جو پسند ہو مجھ کو بتادو، تاکہ میں اس کو طلاق دے دوں اور تم عدت کے بعد اس سے نکاح کرلو، لیکن حضرت عبدالرحمٰن نے اس بات کو گوارہ نہ کیا اور

فرمایا مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ حضرت سعد نے قینقاع کے مشہور بازار کا راستہ بتادیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے گھی اور پنیر سے اپنی تجارت شروع کی اور چند روز میں اتنا سرمایہ ہوگیا کہ شادی کرلی، رفتہ رفتہ ان کی تجارت نے اتنی ترقی حاصل کرلی کہ خود ان کا قول تھا کہ ''خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے'' ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لدا کرآتا تھا اور جس دن مدینہ پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔

ان کے علاوہ دیگر مہاجرین نے بھی دکانیں کھول کر تجارت شروع کردیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا کارخانہ مقام ''سخ'' میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ حضرت عثمان بنوقینقاع کے بازار میں کھجوروں کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی تجارت میں مشغول ہوگئے اور ان کے تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی۔

مواخات کا یہ معاملہ 6ھ تک اسی طرح قائم رہا۔ 7ھ میں جب خیبر کی فتح ہوئی تو مہاجرین نے انصار کو نخلستان واپس کردیے۔ ''آنحضرت ﷺ جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کردیے۔'' (صحیح بخاری)

مدینہ میں انصار نے مہاجرین کے معاش کے ساتھ ساتھ انتظام قیام کا بھی بندوبست کیا انہوں نے اپنے گھروں کے پاس کی افتادہ زمین مہاجروں کو دے دیے اس کے علاوہ اپنے مسکونہ مکان میں بھی حصہ دار بنالیا۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نے بہت ہی عمدہ بات فرمائی ہے:

''مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہوجائے، لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام تہذیب، اخلاق وتکمیل فضائل کی شہنشاہی ہے اس سلطنت الٰہی کے لیے وزراء، ارباب تدبر، سپہ سالاران لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں۔ شرف صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان کی درسگاہ تربیت سے ارباب استعداد تربیت پاکر نکلیں، اس بنا

پر جن لوگوں میں رشتہ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد و شاگرد میں وہ اتحاد و مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لیے ضروری ہے۔ تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا دونوں میں یہ اتحاد مذاق ملحوظ رکھا گیا اس بات کا بھی لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سیکڑوں اشخاص کی طبیعت اور فطرت کا اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا تقریباً ممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شان نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔ اسلام عالمی مشن ہونے کے لحاظ سے اول روز سے عالمی مرکزیت اور عالمی وحدت کا داعی تھا اور ان مقاصد میں اس بات کو اولیٰ درجہ حاصل تھا کہ اپنے پیروؤں میں اول روز سے تنظیم شرعی کی روح پیدا کردے اور اجتماعی مقصد پر مرمٹنا سیکھیں اور ساری دنیا کے سامنے اس کا نمونہ اور اسوہ بن کر پیش ہوں کہ اسلامی ناطے سے ہم سب بھائی بھائی ہیں اور ہم سب کی گردن میں ایک ہی قلادہ 'لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' کا ہے۔

الغرض مواخات ''انما المومنون اخوة'' (سورة الحجرات) کی عین تعمیل اور قرآن حکیم کے مطابق پوری انسانیت کے لیے اخوت و رحمت، محبت و مساوات کا پیغام عظیم تھی۔ اسی کے ذریعہ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے سیکڑوں مسلمانوں کو مدینہ میں آباد کرنا آسان ہو گیا۔ یہ حکم معلم اعظم کا نہیں، بلکہ عین حکم الٰہی تھا جس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کے باہمی تعلقات خاندانی عصبیت اور تفرقوں سے پاک ہو گئے اور ان کے لیے آئندہ کے کام آسان ہو گئے، مواخات کی تعریف کرتے ہوئے خالق کائنات نے ان دونوں گروہوں کی تعریف اس طرح فرمائی۔

''وہ مفلسان تارک الوطن جو اپنے گھر بار مال و دولت سے نکال دیے وہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی رضا جوئی کے طلب گار ہیں اور خدا و خدا کے رسول کے مددگار رہیں۔ دراصل یہی لوگ سچے ایماندار ہیں۔''

پھر قادر مطلق نے انصار کی یوں تعریف فرمائی:

''دارالہجرت میں رہنے والے وہ لوگ جو پہلے سے ایمان لا چکے ہیں وہ ان مہاجرین سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملتا ہے اس سے اپنے دلوں میں خلش محسوس نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں خواہ ان کو خود ہی احتیاج ہوں تو جو اشخاص حرص نفس سے بچیں گے وہی مراد پانے والے ہیں۔''

انصار نے مہاجروں کی مہمان نوازی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا ہے دنیا کے قوموں کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بحرین جب فتح ہوا تو حضورت اقدس ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں مگر انصار نے کہا پہلے ہمارے بھائی مہاجرین کو اتنی ہی زمین عنایت فرما دیجئے تب ہم لینا منظور کریں گے۔

انصار کے ایثار کا اندازہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ''ایک پردیسی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کوئی ہے جو آج کی رات اس شخص کی مہمان نوازی کرے کہ اللہ اس پر رحم فرمائے۔ ایک انصار اٹھا اور اس نے عرض کیا ''میں ہوں اے اللہ کے رسول ﷺ پھر وہ اس مہمان کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا ''یہ اللہ کے رسول کا مہمان ہے اس کی خاطر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنا۔ بیوی نے کہا ''خدا کی قسم اس وقت میرے پاس صرف بچوں کی خوراک ہے۔ انصار نے کہا بچے کو بغیر کھلائے سلا دو اور چراغ گل کر کے ہم مہمان کو کھانا کھلا دیں، تا کہ اسے معلوم نہ ہو سکے اور ہم لوگ بغیر کھائے سو لیں گے۔ بیوی نے ایسا ہی کیا صبح جب وہ مہمان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فلاں مرد اور عورت کے عمل سے خوش ہوا۔'' اور پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ''اور وہ اپنی ذات پر لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں' صحیح مسلم کی روایت کے مطابق اس صحابی رسول کا نام حضرت ابو طلحہؓ تھا۔

☆☆

اسلام میں مزدور کے حقوق وفرائض

● مولانا ندیم الواجدی

مئی کا مہینہ آتے ہی مزدوروں کے حقوق وفرائض کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو گذشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جاسکتا ہے اور یہ فطری بات ہے، دنیا کی ساری بہار دراصل انہی کے دم سے ہے، بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور بل کھاتی ہوئی نہریں، سب کو ان کے خون و پسینہ اور قوتِ بازو سے غذا ملتی ہے، یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی ترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے، حالانکہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔

اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں، جس میں آجر اور مزدور دونوں کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال و توازن بھی ہے۔سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا، جو اب تک باقی ہے، کی نفی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

حضرت موسیٰ ؑ نے آٹھ سال یا دس سال تک حضرت شعیب ؑ کی مزدوری کی۔(مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذر ؓ) ☆ حلال روزی کی تلاش میں محنت وکاوش کو عند اللہ پورے ایک سال امامِ عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا۔(ابن عساکر

عن عثمان ؓ) چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپ ﷺ نے اللہ کی راہ میں جد وجہد بتایا۔(طبرانی عن کعب بن عجرۃ) ☆ آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں کمائے (بیہقی عن علی ؓ، طبرانی عن ابی بردہ ؓ) اور خدا کے نبی حضرت داؤد ؑ اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کھایا کرتے تھے۔(بخاری عن ابی ہریرۃ ؓ ومقدام ؓ) ☆ اللہ تعالیٰ ایسے مومن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت وحرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو (**ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف**) (طبرانی عن ابن عمر ؓ) ☆ آپ ﷺ نے فرمایا تمام انبیاء کرام نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(بخاری و ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ ؓ) ☆ کاشتکاری کو مبارک کہا گیا اور اس کا حکم دیا گیا۔(ابوداؤد عن علی بن حسین ؓ مرسلاً) ☆ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام ؓ سے ارشاد فرمایا سب سے حلال کمائی وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو۔(دیلمی عن حکیم بن حزام ؓ)۔

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور مؤقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے، جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اجرت کی مقدار کا تعین ہے۔اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں حضور ﷺ نے غلاموں کے سلسلہ میں درج ذیل ہدایات دی ہیں: ''وہ تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو، اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔''(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)۔

پیغمبر اسلام اور ان کے اصحابؓ کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا، ان کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے تھے، غلاموں اور ان کے مالکوں کے کپڑے ایک ہی معیار کے ہوتے تھے، ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابوذر غفاریؓ اور ان کے غلام اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود ہی اوڑھ لیں، تاکہ اس کا جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی اور چادر دے دیں۔ حضرت ابوذرؓ نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضور ﷺ کی اسی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی اس کو پہناؤ۔ (بخاری عن معرورؓ)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اجرت اس قدر ہونی چاہئے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اس کا معیارِ زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔ دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کر سکے، حسبِ ضرورت خادم رکھ سکے اور مکان بنا سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے اسے چاہیے کہ بیوی حاصل کرلے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کرلے (ابوداؤد عن سقورد بن شدادؓ) حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا: میرا ذریعۂ معاش میرے اہل وعیال کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں، اس لئے ابوبکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمان کے لئے کام کریں گے۔ (بخاری عن عائشہؓ)۔

اجرت کے سلسلے میں اس اصولی ہدایت کے بعد، کہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کی جائے، اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اُجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کر دی جائے اور مبہم نہ رکھی جائے۔

"ان رسول اللہ ﷺ نهى عن استجارة الأجير حتى يبين له أجره"
رسول اللہ ﷺ نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے تا آنکہ اس کی اجرت واضح کر

دی جائے۔

پھر آپ ﷺ کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے (بخاری عن انسؓ)
آپ ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، اس سے پورا کام لے لے اور اجرت نہ دے (**رجل استاجر أجيرا فاستوفى منه و لم يعطه أجره**). (بخاری عن ابی ہریرہؓ)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں یا تو خود آجر (Employer) کام سے پہلے اجرت دے دے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگا دی ہو، اب بھی اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی، یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کر دے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اجرت ادا کرنی ہوگی۔ (الفتاویٰ الهندیہ: 3/506)

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جو ان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو۔ (موطا امام مالک عن یحییٰ بن یحییٰ) یہ ایک اصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات تینوں ہی کا تعین کیا جاسکتا ہے، مثلاً اصولِ صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے کیا جا سکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقاتِ کار ہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جاسکتے ہیں، ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا دراز عمر بوڑھوں سے اتنا کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان آدمیوں سے۔ اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے، جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے لیے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے ملنے کے لئے تعطیل لازمی ہو اور بیماروں کے لئے خصوصی رخصتیں ہوں۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (رد المختار: 3/80).

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور ذمہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (انھم اخوانکم) یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں، بلکہ برادرانہ ہونا چاہئے ۔ قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بحیثیتِ آجر (Employer) یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں:

"وما أريد ان اشق عليک ستجدنی ان شاء الله من الصالحين" (القصص:27)

(میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، ان شاءاللہ تم مجھ کو صالح و نیک پاؤ گے)۔

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے، مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ ﷺ نے اونھ بھی کہا ہو یا پوچھا ہو کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ (بخاری وشمائل ترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کے خادموں میں ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے ۔ (بخاری) اسی حسن سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس کی انجام دہی میں بذاتِ خود بھی مدد کرے۔ (بخاری ومسلم)۔

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں شریک ہوں۔ "مضاربت" کی اصل یہی ہے۔ مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت، پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم متعینہ تناسب مثلاً پچاس فی صد وغیرہ میں تقسیم کردیا جائے۔ یہاں دوسرے فریق کو جو کچھ نفع مل رہا ہے، وہ عامل ہی کی حیثیت سے ہوگا، اس کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے جس میں آپ ﷺ نے کھانا پکانے والے خادم کو کھانے سے کم از کم ایک دو لقمہ کھلانے کی تلقین کی ہے۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)۔

مزدوروں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے صرف اخلاقی ہدایت ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی بخشا ہے اور حکومت کے لئے مداخلت کی گنجائش رکھی ہے، چنانچہ قاضی ابوالحسن ماوردی (م ۴۵۰ھ) "محتسب" کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "اگر کوئی شخص مزدور و ملازم (اجیر) پر زیادتی کرے، مثلاً، اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور حسبِ درجات دھمکائے اور اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو، مثلاً کام کم کرے اور اجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے۔" (الاحکام السلطانیہ للماوردی (مترجم)، باب ۲۰ ص:399)۔

سوال یہ ہے کہ مزدور یا ملازم سے کوئی چیز ضائع ہوجائے تو اس کا ضامن کون ہوگا؟ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے۔ مزدوری اور ملازمت کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ معاملہ کی بنیاد کام ہو، دوسرے یہ کہ معاملہ کی اساس وقت ہو، پہلے کی مثال سلائی وغیرہ ہے کہ آپ کسی کو کپڑا سلنے کو دیں، اس صورت میں وہ وقت کا پابند نہیں ہے، بلکہ کام کا پابند ہے کہ کپڑا سی کر دے، دوسرے کی مثال اس طرح ہے کہ کسی کو آپ مدرس مقرر کریں کہ وہ روزانہ پانچ یا چھ گھنٹے تعلیم دے، یہاں وہ وقت کا پابند اور اس میں حاضری کا مکلّف ہے، چاہے طلبہ ہوں یا نہ ہوں اور پڑھانے کی نوبت آئے یا نہ آئے، اسی طرح دن بھر کے لئے کسی مزدور کو مکان کی تعمیر کے لئے رکھا جائے، یہاں وہ اس بات کا پابند ہے کہ دن بھر اپنا وقت دے۔

پہلے قسم کے ملازم کو "اجیر مشترک" اور دوسرے قسم کے ملازم کو "اجیر خاص" کہتے ہیں۔ اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہوجائے تو وہ خود اس کا ضامن ہوگا اور تاوان ادا کرے گا، اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہوجائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیری:3/555)

بندھوامزدور کی ظالمانہ رسم باوجود ارتقاء اور علم وروشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے، مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے، نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو، بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کرسکتی، سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح، خرید وفروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی طرفین کی رضامندی اور آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ ''**وأمار کنها فالا یجاب والقبول**'' (الفتاویٰ الہندیہ: ۵۰۴/۳، کتاب الاجارۃ) اسی طرح اسلام میں ہر شخص کو نقل وحرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد ورفت کی آزادی حاصل ہے، اور یہ اس کا خالصتاً ذاتی وشخصی مسئلہ ہے، وہ جہاں اور جس شہر وعلاقہ میں جاکر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے، کرسکتا ہے: ''**ومن یهاجر فی سبیل الله یجد فی الارض مراغما کثیراً وسعة**'' (النساء:100)

جہاں مزدور اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں، وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کردیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا، وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ:

''**یا أبت استاجره ان خیر من استاجرت القوی الأمین**'' (القصص:26)

(ابا جان! ان کو مزدور رکھ لیجئے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے، وہ ہوگا جو طاقتور اور امانت دار ہو)۔

یہاں اچھے مزدوروں کی دو صفات بیان کی گئی ہیں: ایک قوت وصلاحیت اور دوسرے امانت ودیانت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے، اسی لئے

فقہاء نے فاتر العقل طبیب (الطبیب الماجن) کو علاج سے روک دینے کا حکم دیا ہے۔ (**الاشباہ والنظائر لابن نجیم**) .

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کا اپنی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی، چنانچہ علماء لکھتے ہیں: ''عدل کے ساتھ وزن کرو''، میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقاتِ ملازمت کا پورا پورا خیال رکھیں۔ (معارف القرآن مصنف مفتی شفیع صاحبؒ)۔

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے۔ رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کرلے۔ حضور ﷺ نے اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہے ''**الراشی والمرتشی کلاهما فی النار**'' (طبرانی عن ابن عمرو رضی اللہ عنہ) رشوت صرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے، بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عام لوگ کسی کے عہدے سے متاثر ہوکر ''ہدیہ'' اور نذرونیاز'' کے نام سے پیش کریں۔ رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے لوگ بھی داخل ہیں، چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کرے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے۔ (**ابو داؤد عن ابی امامه**) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عاملوں کو ہدایا وتحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقین مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں جو معصیت اور گناہ ہو، اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح گناہ کے لئے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو، اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے، چنانچہ

فقہاء لکھتے ہیں:

"لایجوز الاستجار علی شئی من الغناء والنوح والمزامیر ولاأجر لھم"

(مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں اور وہ اجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں)۔

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور کوئی شخص معاملہ طے پاجانے کے بعد یہ کام کر ہی لے تو اجرت واجب نہ ہوگی، تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیونکر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے۔

اسی حکم میں سینما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطّلی کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں کر لیجئے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے؟ اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے 55 یا 58 سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر اس حد تک پہنچنے تک کارگزار رہے گا اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے، نہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کر دے اور نہ ملازم کو حق ہوگا کہ بلا وجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہو جائے، چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"لو قال اجرتک ھذہ الدار سنة، کل شھر بدرھم جاز بالاجماع،

مجموعہ القاسم: جلد ششم — تیری عظمتوں کو سلام

فلا یملک أحدھما الفسخ قبل تمام السنة من غیر عذر".

(فتاویٰ عالمگیری:3/508)

(اگر کوئی شخص یوں کہے" میں نے تم کو یہ مکان ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ کے بدلے ایک درہم، تو بالاتفاق جائز ہے اور فریقین میں سے کوئی ایک سال کی تکمیل تک بلا عذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے)۔

ہاں اگر کوئی عذر پیش آجائے تو یک طرفہ اقدام کیا جاسکتا ہے، مثلاً ملازم کو غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کر سکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازی صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے، ایسے ہی پرائیوٹ اداروں کا بھی ہے۔

☆☆

انسانیت کا احترام انسان کا بنیادی حق

● ندیم اشرف

کسی بھی معاشرہ کی شناخت و پہچان اور اس کا امتیاز حقوق کی پاسداری کے لحاظ سے طے اور متعین ہوتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص معاشرہ جس کو ہم دوسرے معاشروں سے اعلیٰ اور ارفع قرار دیتے ہیں، حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں کس قدر حساس ہے سب سے پہلے ہم حقوق کی بات کرتے ہیں، حقوق حق کی جمع ہے کسی فرد یا جماعت کے لئے ثابت شدہ اور واجب حصہ کو حق کہا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"وفی اموالھم حق السائل ولمحروم."

انسان چونکہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کی فطرت میں مل کر رہنے کا جذبہ ہے وہ اپنی ضروریات کی تکمیل اور آفات ومصائب کے ازالہ کے سلسلے میں دوسرے انسانوں کے تعاون کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے ہر انسان کا یہ فطری حق بنتا ہے کہ دوسرا اس کی مدد کرے، اسی طرح ہر فرد وبشر پر یہ ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے کہ وہ دوسرے فرد یا مختلف افراد اور طبقوں کے حقوق کی پاسداری کرے۔

بنیادی انسانی حقوق:

بنی نوع انسان کے بنیادی اور فطری حقوق میں جن امور کو شامل کیا جاتا ہے۔ ان میں انسانیت کا احترام، مساوات کا حق، انسانی جان کی حفاظت، انسانی مال کی حفاظت، انسانی

عزت وآبرو کی حفاظت، مذہبی آزادی کا تحفظ، اظہار رائے کی آزادی کا تحفظ، ضروریات زندگی کا انتظام وکفالت، خواتین کی عصمت وعفت کا تحفظ، حقوق شہریت کا تحفظ، بچوں کے حقوق کی حفاظت، انسانوں کے معاشی ومعاشرتی اور ثقافتی وتعلیمی حقوق نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

اسلام سے پہلے حقوق انسانی کی پامالی:

چھٹی صدی عیسوی میں جب نبی رحمتؐ کی بعثت ہوئی تو پوری دنیا جہنم کے کنارے کھڑی تھی۔ انسان انسانیت کھو چکا تھا، انبیاء سابقین کی تعلیمات کو یکسر فراموش کیا جا چکا تھا۔ انسانی حقوق پامال کئے جا رہے تھے، لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو سے کھلواڑ کیا جا رہا تھا، بے کسوں اور معاشرہ کے کمزور طبقوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے، زنا، چوری، شراب خوری اور بدعہدی کا دور دورہ تھا، قرآن کریم کی زبان معجزہ میں "**ظهر الفساد فی البحر والبر بما کسبت ایدی الناس**" اس فساد کی منظر کشی کی گئی۔

رحمت عالمؐ کا ظہور قدسی:

اس پرفتن اور تاریک ترین دور میں ختم نبوت کا آفتاب مکہ مکرمہ کے افق پر طلوع ہوا، جس کی ضیاء پاش شعاؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے کفر وشرک اور ظلمت وتاریکی کا خاتمہ کر دیا اور سارے عالم کو ایمان ویقین، عدل وانصاف، صدق ووفا، امانت ودیانت، عفت وپاکبازی، تقویٰ وطہارت اور دیگر اسلامی اخلاق کی روشنی سے معمور ومنور کر دیا۔ آپؐ کی ذات اقدس نے تمام اخلاق ذمیمہ کا خاتمہ کیا اور تمام مخلوقات بالخصوص انسانوں کے حقوق کی رعایت وحفاظت کے لئے ایسی جامع ہدایات تلقین فرمائیں جو بڑی انقلاب انگیز تھیں، جس سے جزیرۃ العرب امن وامان اور سکون وعافیت کا گہوارہ بن گیا اور سارا عالم ان کے فیضان رحمت سے معمور ہو گیا۔

اسلام میں انسانی حقوق کا تصور:

اسلام نے بنی نوع انسان کو جو گونا گوں حقوق عطا کئے ہیں ان میں احترام انسانیت، بشری نفسیات ورجحانات اور انسان کے معاشرتی، شہری، ثقافتی اور معاشی تقاضوں اور ضروریات کا مکمل لحاظ کیا گیا ہے، اسلام چونکہ دین رحمت ہے، اس لئے وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل پر زور دیتا ہے جو تمام انسانیت کے لئے سراپا رحمت ہو، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں رحمت کا پہلو نمایاں ہے، انسانی حقوق کے سلسلے میں قرآن وحدیث میں یہ رحمت ومحبت جلوہ گر نظر آتی ہے، انسانوں سے جتنی محبت ہوگی ان پر اتنا ہی رحم وکرم ہوگا، ان کے حقوق کی ادائیگی کی اتنی ہی فکر ہوگی اور حقوق انسانی کی پامالی سے اجتناب کا جذبہ اتنا ہی بیدار ہوگا۔ یہی محبت ورافت انسانی حقوق اور اسلامی اخلاق کی بنیاد ہے۔

بنی نوع انسان پر سلام کی رحمت ورافت کا بنیادی مظہر عقیدۂ توحید ہے، توحید سے انسانی آزادی کا تصور ابھرتا ہے اور انسان اللہ کے سوا کسی اور طاقت کو حاجت روا اور نفع وضرر کا مالک نہیں سمجھتا، عقیدۂ توحید انسانی شرف وعظمت اور آزادی کا سرچشمہ ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اللہ پر ایمان اور عقیدۂ توحید سے انسان میں اپنے عمل کے تئیں احتساب، جواب دہی، خوف اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے، جس سے شریعت کے تمام احکام کی بجا آوری اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مدد ملتی ہے۔ حق کی ادائیگی کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اگر کسی شخص نے دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں کیا تو آخرت میں اس کو ادا کرنا پڑے گا ورنہ سزا بھگتنی پڑے گی، حتی کہ جانوروں کے آپسی ظلم وستم کا بھی انتقام لیا جائے گا۔ سرکار دوعالمؐ نے فرمایا:

''لتودن الحقوق الی أهلها یوم القیامة حتی یقاد اللشاة القلقاء من الشاة القرناء''.

(حق والوں کو ان کے حقوق تمھیں ضرور قیامت کے دن ادا کرنے پڑیں گے، یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کو سینگ والی سے بدلہ دلایا جائے گا)۔

اسلام میں انسانی حقوق کا جو جامع تصور پیش کیا گیا ہے اس میں انسانیت کا احترام، عام انسانوں پر رحم وکرم، انسانی اخوت ومساوات کی پاسداری، انسانی جانوں کی حفاظت، حق ملکیت کی آزادی، معاشرتی عدل وانصاف کا قیام، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ رواداری وغیرہ شامل ہیں۔ حقوق انسانی میں سب سے اہم چیز انسانیت کا احترام ہے اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اس کے احترام واکرام کی تعلیم دی ہے اور انسان ہونے کے ناطے اس کو پوری کائنات پر فضیلت وبرتری عطا کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''ولقد کرمنا بنی آدم حملنهم فی البر ولبحر ورزقناهم من الطیبات وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا''. (سورہ بنی اسرائیل).

(ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور خشکی ودریا میں ان کو سوار کیا اور روزی دی ان کو پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں انسانوں کو سب سے اچھی شکل وصورت عطا کی ہے: **''لقد خلقنا الانسان فی أحسن تقویم''.** (والتین) اسلام نے یہ علان کیا کہ دنیا کی تمام نعمتیں حق جل شانہ نے انسانوں کے لئے پیدا فرمائی ہیں اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ **''هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً''.**

اللہ نے انسانیت کا مقام اتنا بلند کیا کہ انسان کو دنیا میں اپنی نیابت کا شرف بخشا چنانچہ ارشاد ربانی ہے: **''هو الذی جعلکم خلف الارض ورفع بعضکم فوق بعض''.**

انسانی اخوت ومساوات:

انسانی اخوت کا تصور سب سے پہلے اسلام نے ہی پیش کیا اور ہر طرح کے تفریق وامتیاز اور اونچ نیچ کو مٹانے کا اعلان کیا۔

اسلام کی تعلیم ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، بحیثیت انسان ان میں کوئی فرق وامتیاز نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

"یایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیراً". (سوره نساء: ۱)

اسلام کی نظر میں ساری مخلوق اللہ کی کنبہ ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا:

"الخلق عیال الله فأحب الخلق الی الله من أحسن الی عیاله".

(مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اللہ کے نزدیک مخلوق میں سب سے پسندیدہ وہ شخص ہے جو اللہ کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہو)۔

قرآن کریم نے انسانی وحدت ومساوات کے تصور کو قلب وذہن میں راسخ کرنے کے لئے جگہ جگہ یا "**ایها الناس**" اور یا بنی آدم کے ذریعہ تمام افراد انسانی کو اپنے لازوال پیغام کا مخاطب بنایا ہے، اور سب کو یکساں طور پر دنیا وآخرت میں صلاح وفلاح کی دعوت دی ہے، جن افراد نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ان کو یا "**ایها الذین آمنوا**" سے خطاب کیا گیا، انسانوں میں نسلی یا طبقاتی امتیاز اور فرق کو روانہیں رکھا گیا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر سرکار دوعالمؐ نے اپنی تاریخی خطبہ میں جن بنیادی انسانی حقوق سے متعلق وصیت وہدایت فرمائی ان میں انسانی وحدت ومساوات کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

"یایها الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد، کلکم لآدم وآدم من

تراب، ان أکرمکم عند الله اتقاکم، ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقوی". (مسلم)۔

فتح مکہ کے موقع پر اہم ترین خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"لافضل العربی علی أحمر ولا لعجمی علی عربی ولا لأحمر علی اسود ولا لأسود علی أحمر الا بالتقوی ولا فضل لانساب".

نبی رحمتؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"اللهم اشهد ان الناس کلهم اخوة".

محسن انسانیتؐ نے صرف اس کا اعلان ہی نہیں فرمایا، بلکہ اس اصول کو انسانی زندگی کا دستور العمل بنا دیا، ساری زندگی اس پر عمل کر کے دکھایا اور اپنے پیروکاروں کے سامنے ایسا واضح نمونہ قائم فرمایا کہ وہ بھی اس دستور اور اصول کو فراموش نہ کر سکے اور انسانی اخوت ووحدت اور مساوات کا تصور ان کے اخلاق واعمال میں ہمیشہ جلوہ گر نظر آیا۔

عام انسانوں پر رحم وکرم:

اسلام دین رحمت ورافت ہے، بلا تفریق ومذہب تمام انسانوں پر رحم وکرم اس کی خصوصیات میں داخل ہے، اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب یا تہذیب میں انسانیت نوازی اور انسانوں پر رحم وکرم کا وہ تصور نہیں ملتا جو اسلام نے پیش کیا ہے، محسن انسانیتؐ فرماتے ہیں:

"الراحمون یرحمهم الرحمن، ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السماء". (ابوداؤد)۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

"لایرحم الله من لا یرحم الناس".

عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، ان کی خدمت، ان کی حاجت روائی، دکھ درد میں ان

کی دست گیری اور امداد سے اللہ بے حد خوش ہوتے ہیں، اسلام میں تو انسانوں کی خدمت کو اللہ تعالیٰ کی خدمت سے تعبیر کیا گیا ہے اس میں مذہب وملت کی کوئی تخصیص نہیں، مسلم وغیر مسلم سب برابر ہیں۔ حدیث قدسی ہے:

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے ابن آدم، میں بیمار ہوا تم نے عیادت نہیں کی وہ حیرت سے جواب دے گا پروردگار عالم میں کیسے تیری عیادت کرتا؟ تو ساری دنیا کا خود پالنہار ہے، اللہ فرمائے گا، کیا تجھے علم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ تم اگر اس کی عیادت کو جاتے تو مجھے وہاں پاتے، اے ابن آدم! میں تم سے کھانا مانگا؟ لیکن تم نے مجھے کھانا نہیں دیا، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا؟ آپ تو سارے جہاں کے پالنہار ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تجھ سے فلاں بندے نے کھانا مانگا تو تو نے اسے کھانا نہ دیا، یہ علم نہ تھا کہ اگر تو میرے بندے کو کھانا کھلاتا تو تو مجھے وہاں پاتا، پھر اللہ فرمائے گا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی طلب کیا تو تو نے مجھے پانی نہ پلایا، بندہ کہے گا کہ میں آپ کو پانی کس طرح پلاسکتا تھا جب کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں، اللہ فرمائے گا تجھ سے میرے فلاح بندے نے پانی مانگا تو تو نے اسے پانی نہ پلایا، اگر تو نے اس کو پانی پلایا ہوتا تو اس کا بدلہ میرے پاس ضرور ہوتا۔

انسانوں پر رحم وکرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"لایدخل الجنة الارحیم".

یارسول اللہ!" کلنا رحیم".

سرکارؐ نے ارشاد فرمایا:

"لاحتی یرحم العامة". نہیں! رحم دل وہ ہے جو عام مخلوق پر رحم کرے۔

تمام انسانوں کو بھائی بھائی بن کر رہنے کی تلقین کی گئی اور ہر ایسی بات سے روکا گیا جن سے تعلقات خراب ہوتے ہوں اور رشتۂ اخوت کمزور پڑنے کا خطرہ ہو، ارشاد نبویؐ ہے:

مجموعه القاسم: جلد ششم تیری عظمتوں کو سلام

"لاتقاطعوا ولا تدابروا ولا تباغضوا ولا تحاسدوا وکونوا عباد الله اخوانا". (بخاری و مسلم).

(ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، آپس میں بغض وعداوت نہ رکھو، باہمی حسد نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ)۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ کھائے اس کا ثواب اس درخت کے لگانے والے کو ملے گا۔ (بخاری شریف)۔

قرآن کریم نے تمام مخلوق کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کی ہے، ارشاد باری ہے:

"احسن کما احسن الله الیک".

تم دوسروں کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو، جیسا کہ اللہ تمہارے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

انسانی جان کی حفاظت:

اسلام سے پہلے انسانی جان کا کوئی احترام نہ تھا، قتل وخون ریزی عام تھی، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا، انسانی رشتوں کا کوئی پاس اور لحاظ نہیں تھا، اسلام نے تشدد پسندی اور دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور انسانی جانوں کی عظمت وحفاظت کا حکم دیا، امیر ہوں یا غریب، مرد ہوں عورت، صحت مند ہوں یا غیر صحت مند، تعلیم یافتہ ہوں یا ناخواندہ، مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، تمام لوگوں کی جانوں کی حفاظت کو ضروری قرار دیا گیا اور اس سلسلہ میں کسی امتیاز یا تفرقی کو روا نہیں رکھا گیا، اسلام نے انسانی جان کو حرمت وعظمت عطا کیا، اس کے بے حرمتی کی سختی سے ممانعت کی، قتل وخوں ریزی کا ترغیب وترہیب کے ذریعہ سدباب کیا اور ناحق کسی جان کے قتل کرنے کا تمام انسانوں کے قتل کے مساوی قرار دیا، ارشاد ربانی ہے:

''من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً''.

ان تمام گفتگو اور بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جہاں حقوق انسانی کے حوالے سے انسانیت کا احترام، انسانی اخوت ومحبت اور مساوات، عام انسانوں پر رحم وکرم، انسانی جان ومال کی حفاظت بلاتفریق مذہب وملت عمل میں آئے، تاکہ ان تمام خصوصیات معاشرہ کو ایک مثالی معاشرہ اور آئیڈیل سوسائٹی قرار دینا ہر انصاف پسند شخص کے لئے باعث شرف ہو اور یہ پیغام دینا ممکن ہو کہ اسلام سراپا امن ہے۔

آنسو کی کیا بساط، مگر جوش عشق نے
قطرہ کو موج موج کو دریا بنا دیا

(مضمون نگار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شعبہ دینیات کے ریسرچ اسکالر ہیں)۔

☆☆

رپورٹ پیام انسانیت کنونشن

جامعۃ القاسم میں وزیر اعلیٰ بہار جناب نتیش کمار کی آمد

● حسان جامی قاسمی

3 لاکھ سے زائد افراد کی شرکت اور شیخ زکریا چیریٹبل اسپتال کا سنگ بنیاد:

''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول'' میں منعقد ''پیام انسانیت کنونشن'' کا شاندار انعقاد ہوا۔ جس میں ملک کے نامور علماء کرام اور سیاسی، سماجی اور بڑی تعداد میں میڈیا کے لوگوں نے شرکت کی اس موقع پر بطور خاص وزیر اعلیٰ بہار جناب نتیش کمار، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر جناب عزیز برنی حضرت مولانا سید محمد شاہد صاحب سہارنپوری امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم لندن، حضرت مولانا محمد سلیم محمد کریم صدر دعوۃ القرآن انٹرنیشنل جنوبی افریقہ، جناب علی انور صاحب ممبر پارلیمنٹ، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے نائب ناظم حضرت مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف) کے نمائندہ مولانا شمشاد احمد قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند (وقف) حضرت مولانا صغیر احمد رحمانی رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے علاوہ مولانا محمد عثمان مظاہری صاحبزادہ مولانا محمد سلمان مظاہری ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد راشد مظاہری نواسہ شیخ زکریا کاندھلویؒ، مفتی محمد صالح مظاہری نواسہ حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ نے شرکت کی۔

مہمان خصوصی کے طور پر وگرام میں شریک وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے جامعۃ القاسم میں ’’شیخ زکریا ہاسپٹل‘‘ کا سنگ بنیاد رکھا اور جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے بانی و مہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ مرکزی حکومت نے سچر کمیٹی قائم کرکے اقلیتوں کی تعلیمی، مالی اور ہر طرح کی حالت کی رپوٹ مانگی تھی سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اقلیت پورے ہندوستان میں تعلیمی، معاشی اعتبار سے بہت پسماندہ ہے۔ اب تک سچر کمیٹی کی شفارشات نافذ نہیں ہوسکی ہے۔ بہار میں ہماری حکومت جب سے آئی ہم نے بہار کی ترقی کے لیے کام کیا ہے، اور رپورٹ بتاتی ہے کہ ہمارے اس چار سالہ دور میں بہار میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے، خاص کر گاؤں گاؤں میں تعلیمی بیداری آئی جس میں جہاں حکومت نے بہت سارے اقدام کئے ہیں، وہیں مجھے فخر ہے کہ مفتی صاحب جیسے فعال انسان پر کہ انہوں نے اس پسماندہ علاقہ میں علم کا ایک روشن چراغ جلا رکھا ہے۔ جہاں غریب طبقہ کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ مفتی صاحب اپنے علاقہ کی تعلیمی پسماندگی کے تئیں کتنا سنجیدہ ہیں۔ میں نے ایک سال پہلے ہی اس مدرسہ میں آنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اپنی پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ علی انور صاحب سے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ آج میں اس مدرسہ میں آکر بہت خوش ہوں۔ انہوں نے تقریباً تین لاکھ سے زائد بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں سیمانچل کے لوگوں سے اپیل کروں گا کہ وہ امن واتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھیں، اور ’’پیام انسانیت‘‘ کے جس عنوان سے اس کنونشن کا انعقاد کیا گیا ہے اس کے صحیح مقصد کو سمجھیں اور انسانیت کے فروغ مذہب، ذات برادری اور اونچ نیچ کے تفریق سے اوپر اٹھ کر کام کریں، تمام مذاہب اور دھرم نے انسانیت کا احترام سکھایا ہے اور اس کا سبق دیا ہے میں مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں کے انہوں نے لوگوں میں انسانیت کے فروغ کے لیے پورے ملک اور بیرون ملک کے علماء اور مذہبی پیشواؤں کو

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

یہاں اکٹھا کیا ہے۔ میں انہیں اس بات پر بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں میں بہار کے اس پسماندہ علاقہ میں تعلیم کی روشنی جلا رکھی ہے جس سے غریب بچے روشنی پارہے ہیں، انہوں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ میں ہر قربانی دے کر بہار کی ایکتا کو برقرار رکھنے کی کوشش کروں گا اور جہاں تک سیمانچل کی ترقی کا سوال ہے تو اس کے لیے ہماری سرکار پابند عہد ہے اور سرگرم بھی۔ مجمع سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ’کوسی اور پورنیہ کمشنری کے حالات سے میں آگاہ ہوں، خاص طور پر اس علاقے کی اقلیتوں کے مسائل کو میں سمجھتا ہوں اور ابھی ہمارے سامنے سہارا اردو کے ایڈیٹر عزیز برنی جی نے کشن گنج میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کیمپس اور ارریہ میں اقلیتی ہاسٹل کے تعلق سے کچھ سجھاؤ دیے ہیں، میں اس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔ میں اس سلسلے میں سیمانچل کے عوام کو آگاہ کردینا چاہتا ہوں کہ وہ نہ کسی خوف میں آئیں اور نہ کسی جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہوں، بلکہ ایک نیا بہار بنانے میں ہمارا ساتھ دیں۔

اس موقع پر روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی نے جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں اس سرزمین کو سلام کرتا ہوں، جس نے ’’سہارا انڈیا پریوار‘‘ کے چیئرمین عالی جناب سبرت رائے سہارا، مشہور فلم کار پھنیشور ناتھ رینو اور للت نارائن مشرا جیسی عظیم شخصیتوں کو جنم دیا۔ میں سلام کرتا ہوں اس سرزمین کو اور اس علاقہ کے عوام کو، اس لیے کہ یہ وہ سرزمین ہے، جسے اکثر طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس علاقہ کے عوام وہ بہادر قوم ہیں، جو ان طوفانوں کا مقابلہ کرکے ہمیشہ بہادری کے ساتھ کھڑی رہتی ہے۔ بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کے دور میں کچھ بہتر کام ہوئے ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب آپ بہار کی شاندار سڑکوں پر سفر کر رہے ہوتے ہیں، مگر میں چند باتیں اس وقت وزیر اعلیٰ کے گوش گزار کردینا ضروری سمجھتا ہوں، علاقہ کے کچھ ذمہ دار لوگوں نے آکر مجھ سے ملاقات کی اور علاقائی مسائل کو وزیر اعلیٰ تک پہنچانے کی ذمہ داری میرے سپرد کی۔

ایک خدشہ جوانہوں نے کشن گنج میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیمپس قائم کیے جانے کے حوالے سے میرے سامنے رکھا کہ کچھ فرقہ پرست تنظیمیں اس کی مخالفت میں آواز اٹھارہی ہیں، مجھے خوشی ہے کہ مائک پرآ کر اپنی بات کہنے سے قبل ہی جب میں نے نتیش کمار جی سے اس ضمن میں گفتگو کی تو انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ اس فیصلہ میں نہ کوئی تبدیلی ہے، نہ ہوگی، میں اپنی طرف سے گرین سگنل دے چکا ہوں، وہ تاریخ طے کریں اور کام شروع کریں۔اس موقع پر عزیز برنی ”نے جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ“ کے حوالے سے کہا کہ مجھے بے پناہ خوشی ہے اس بات سے کے بہت ساری رکاوٹوں اور مسائل میں گھرے ہونے کے باوجود ہماری قوم بیدار ہے اور اس کے افراد مختلف میدانوں میں کام کر رہے ہیں، لوگوں میں بیداری آئی اور اتنے پسماندہ، کوسی کے سیلاب زدہ اور بیابان علاقہ میں مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے انسانی خدمت اور عام لوگوں کی ترقی وسماج کے فلاح کیلئے ایک دینی ادارہ قائم کر رکھا ہے جہاں قوم کے پسماندہ اور غریب لوگوں کے نونہالوں کو تعلیم سے آراستہ کیا جارہا ہے، اگر ہر علاقہ کے علما اور دانشور اپنے اپنے میدان میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کے لیے آگے آئیں تو دیگر قوموں کی طرح مسلمان بھی ترقی سے ہمکنار ہوسکیں گے۔عزیز برنی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرضی انکاؤنٹروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم نتیش کمار جیسے صاف دل کے لوگوں سے یہ امید کرتے ہیں کہ جس طرح مہاراشٹر میں بہار کے راہل راج کا فرضی انکاؤنٹر کیے جانے پر وہ آواز بلند کرتے ہیں، اسی طرح گجرات میں عشرت جہاں کا فرضی انکاؤنٹر ہونے پر بھی وہ خاموش نہ رہیں۔ایک اور اہم بات جو اس موقع پر عزیز برنی نے کہی، وہ اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ سیکولرزم اس ملک کی سب سے بڑی ضرورت اور طاقت ہے۔اپنی بات کو ایک قول کے ذریعہ سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حضرت علیؓ نے ہمارے دوستوں اور دشمنوں کی شناخت کچھ اس طرح بتائی ہے کہ ہمارے تین دوست ہیں اور تین دشمن۔ ہمارے تین دوست وہ ہیں، جو

براہِ راست ہمارے دوست ہیں، ہمارے دوستوں کے دوست ہیں یا ہمارے دشمنوں کے دشمن ہیں۔اور ہمارے تین دشمن اس طرح ہیں ایک تو وہ جو سیدھے سیدھے ہمارے دشمن ہیں، دوسرے وہ جو ہمارے دوستوں کے دشمن ہیں اور تیسرے جو ہمارے دشمنوں کے دوست ہیں۔عزیز برنی نے وزیراعلیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ نتیش کمار جی آپ ذہین شخص ہیں، میرا اشارہ بخوبی سمجھتے ہیں، آپ کو تو ہم دوست کہہ سکتے ہیں، مگر آپ کے دوستوں کو اپنا دوست کیسے کہیں۔الیکشن نزدیک ہے، آپ کو اس پر غور کرنا ہوگا۔عزیز برنی کی اس بات پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے وزیراعلیٰ نے اپنی تقریر کے دوران مسلمانوں کی کثیر تعداد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ عزیز برنی نے جو کچھ کہا میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں، مگر ایسے لوگوں سے نجات تو آپ ہی لوگ دلوائیں گے۔

عزیز برنی کے بعد ”ورلڈ اسلامک فورم لندن“ کے چیئرمین مولانا عیسیٰ منصوری نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا اس پیام کی متلاشی ہے جس کو سب سے پہلے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے، آج اس پیام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ”جامعۃ القاسم“ کے زیراہتمام اس کنونشن سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ہوا چلے گی اور سماج میں بھائی چارگی، بقائے باہم اور خیرسگالی کی راہ ہموار ہوگی۔”دعوۃ القرآن انٹرنیشنل ساؤتھ افریقہ“ کے صدر مولانا سلیم محمد کریم نے کہا کہ اسلام انسانیت کی بقا اور باہمی ربط وہم آہنگی کی بے نظیر مثالیں پیش کرتا ہے اور اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ سماج میں یکجہتی، ایک دوسرے کے تئیں اعتماد اور انسانی ہمدردی کی فضا قائم کی جائے۔انہوں نے جامعۃ القاسم کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے پیام انسانیت کنونشن کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔

ممبر پارلیمنٹ جناب علی انور نے اپنے خطاب میں ملک وملت کی صورتحال اور مسلمانوں کے مختلف طبقات کے دیرینہ مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو متحد رہنے کی اپیل کی۔انہوں نے اپنی تقریر میں وزیراعلیٰ جناب نتیش کمار کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا کہ آپ نے بہار کو ایک خوبصورت بہار بنانے کی قسم کھائی ہے اس میں کوسی کمشنری کے ان لوگوں کا بھی آپ کو بھرپور تعاون حاصل ہے جو ابھی صرف چند ماہ قبل قیامت خیز سیلاب کا سامنا کر چکے ہیں، اپنا سب کچھ برباد کر چکے ہیں، لیکن آپ داد دیں ان کو کہ انہوں نے اپنا ہمت اور حوصلہ نہیں ہارا اور آپ کی آواز سے آواز ملایا ہے جس کی مثال آپ کے سامنے ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' ہے جس نے ایک چھوٹے سے گاؤں کا خوبصورت اور متبرک بنا دیا ہے اور آپ اس سرزمین پر انسانیت کا پیغام دینے آئے ہیں یہ گاؤں اس مدرسہ کے حوالہ سے پوری دنیا میں جانا جائے گا۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بہار کی پسماندگی دور کرنے میں یہ پچھڑا علاقہ بھی آپ کے ساتھ ہے یہاں ہماری قوم اور علاقہ کے لوگوں کی مدد سے جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ ایک 100 بیڈ کا ہاسپٹل بھی تعمیر کرنے جا رہا ہے جس کی ابھی آپ کو بنیاد رکھنی ہے یہی نہیں جب اس علاقہ میں قیامت خیز سیلاب تھا تو صرف انسانیت کی بنیاد پر اس مدرسہ نے ہزاروں لوگوں کی باز آبادکاری کا کام کیا ہے۔

جلسہ کے صدر حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری امین عام جامعہ مظاہر علوم، نواسہ شیخ زکریا علیہ الرحمہ نے اپنی صدارتی تقریر میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ دین اور شریعت پر چلنے میں لوگوں کی بھلائی اور کامرانی ہے اور ''پیغام انسانیت'' بھی شریعت کا ہی ایک حصہ ہے جس کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے نائب ناظم حضرت مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف) کے نمائندہ مولانا شمشاد احمد قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند (وقف) حضرت مولانا صغیر احمد رحمانی رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مولانا عبداللہ بخاری امام و خطیب جامعہ مسجد مونگیر، مولانا محمود الحسن ایوبی ناظم جامعۃ القاسم، مولانا اخلاق الرحمٰن قاسمی، صدر المدرسین جامعۃ القاسم، مفتی احمد اللہ قاسمی، مفتی

عبدالماجد قاسمی، مولانا حمید الدین مظاہری، مولانا محمد اسرائیل مظاہری، مولانا ضیاء اللہ رحمانی، قاری شمشیر عالم جامعی، مظفر حسین رحمانی سکریٹری سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل، مظہر حسین رحمانی معان ناظم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، شاہد عبداللہ جوائنٹ سکریٹری امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفئر ٹرسٹ انڈیا نے بھی خطاب کیا۔

''پیام انسانیت کنونشن'' میں 45 کلو پھولوں کا ہار پہنا کر وزیر اعلیٰ نتیش کمار اور عزیز برنی سمیت دیگر مہمانوں کا استقبال کیا گیا۔ ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' کے مہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں سیمانچل کے مسائل اور سیلاب کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ کی آمد کا شکریہ ادا کیا اور بہار میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے وزیر اعلیٰ کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ جس وقت ضلع سپول میں قادیانی شریف عالم ڈی ایم تھا اس نے انسانیت کی تمام حدیں پار کر دی تھیں اور اس نے محسن انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت کے منکر مرزا غلام احمد قادیانی کی مہم کو یہاں عام کر رکھا تھا ایسے وقت میں ہم نے جناب علی انور صاحب کی معیت میں ایک وفد کے ساتھ جناب وزیر اعلیٰ سے ملاقات کر کے صورت حال سے آگاہ کرایا میں ہی نہیں، بلکہ تمامسلمان وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے اس قادیانی ڈی ایم کو یہاں سے ہٹایا۔ مفتی عثمانی نے وزیر اعلیٰ سے درخواست کی کہ اس علاقہ کی جانب خصوصی توجہ دیں اور عوام سے اپیل کی کہ وہ پیام انسانیت کی تحریک کا استقبال کریں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جدوجہد تیز کر دیں۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ نتیش کمار کے ہاتھوں ''شیخ زکریا چیری ٹیبل ہاسپٹل'' کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ''سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل'' کی جانب سے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کو مولانا عیسیٰ منصوری چیئرمین ورلڈ فورم لندن کے ہاتھوں اور عزیز برنی کو جناب نتیش کمار کے ہاتھوں باوقار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے کہا کہ بہار کو ترقی کی راہ پر گامزن

کرنے اور پوری ریاست میں امن وامان کی فضا قائم رکھنے پر جناب تنیش کمار جی کو ''وکاس پرُش ایوارڈ'' دیتے ہوئے ہمیں بے انتہا خوشی ہورہی ہے۔انہوں نے کہا کہ آزادی سے قبل امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے عظیم صحافتی خدمات انجام دی تھیں، اسی مناسبت سے دورحاضر میں صحافتی خدمات دینے پر جناب عزیز برنی کو ''مولانا آزاد ایوارڈ'' دیتے ہوئے ہمیں فخر ہورہا ہے۔ مذکورہ دونوں شخصیات کے علاوہ مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن) کو فکر اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے ان کی خدمات کے پیش نظر ''سید سلیمان ندوی ایوارڈ'' خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کو علماء دیوبند کی ترجمانی پر ''حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ایوارڈ'' حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کے علوم و معارف کی ترجمانی پر حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری کو ''شیخ زکریا ایوارڈ' بہار اڑیسہ اور جھارکھنڈ میں ابو المحاسن مولانا محمد سجادؒ کی فکر کو عام کرنے پر' حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کو ''ابوالمحاسن محمد سجاد ایوارڈ'' قرآن کریم کی دعوت کو دعوۃ القرآن کی شکل میں عام کرنے پر حضرت مولانا سلیم محمد کریم چیئر مین دعوۃ القرآن انٹرنیشنل جنوبی افریقہ کو ''مولانا مناظر احسن گیلانی ایوارڈ'' غریبوں اور پسماندوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے والے رکن پارلیمنٹ جناب علی انور صاحب کو ''پھنیشور ناتھ رینو ایوارڈ'' اور کوسی کے تباہ کن سیلاب میں بے لوث انسانی خدمات کی بنیاد پر جناب شاہ جہاں شاد جنرل سکریٹری سیمانچل ڈیولپمنٹ کونسل کو ''کوسی ایوارڈ'' تحریک تحفظ ختم نبوت اور پیام انسانیت کے سچے علمبردار اور بہترین سماجی و معاشرہ کی تشکیل کیلئے کوشاں رہنے والے حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کو ''محسن انسانیت ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

سخت دھوپ میں دور دراز سے لاکھوں لوگوں نے اس کنونشن میں شرکت کی اور جامعۃ القاسم کی سرگرمیوں کو سراہا۔اس موقع پر جوکی ہاٹ کے ایم ایل اے منظر عالم، جنتادل یو ارریہ کے لیڈر نوشاد عالم، انندکمار رائے، رمیش سنگھ، جناب سیارام یادو، چندموہن مشرا،

مجموعہ القاسم: جلد ششم　　تیری عظمتوں کو سلام

شکتی ناتھ جھا، جناب رحمت اللہ، جناب انوارالحق، مطیع الرحمٰن، ابوالکلام، کامیشور جھا، سیتانند جھا، سبھ چند مشر، دھنش دھاری مہتا، ہارون انصاری، عبداللطیف انصاری، نظام انصاری، نورحسن انصاری، عبدالستار انصاری، حاجی جمن، حاجی محمد علی، مسلم صافی، رمضان صافی، شہاب الدین صافی، جسیر الدین صافی، محمد ہاشم راج گنج، عبدالصمد، محمد ہارون نرپت گنج، محمد اسمٰعیل سسوا، صمید الرحمٰن، ضیاء الرحمٰن گوکھلا پور، صلاح الدین کھابدہ، عابد بابو، ڈاکٹر ریاض الدین، مولانا عبدالمتین رحمانی، امین خان، حیدر عالم، محمد یونس، محمد روح اللہ، محمد شہاب الدین، مطیع الرحمٰن، فرحت، ریاض احمد، محمد اسلام، محمد شمس الحق، محمد حلیم، عبد الواحد، عبدالاحد، محمد صلاح الدین، دنیش چند یادو، بجو یادو، سشیل یادو، بچہ یادو، سریندر ڈاگا، شبھ کرن، گیمن انڈیا کے سی جی ایم، جی ایم و دیگر اہلکار، جملہ افسران سپول، سہرسہ، مدھے پورہ، ارریہ، پورنیہ، کٹیہار، کشن گنج اور الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا، سمیت درجنوں مقامی لیڈران موجود تھے۔امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ کے سکریٹری مولانا یوسف انور نے مہمانوں کا استقبال کیا۔اس موقع پر جامعۃ القاسم کے طالب علم معاذ احمد، محمد آفاق، ظفر اقبال، فیاض احمد اور اسماعیل نے بہت ہی دلکش اور پرترنم انداز میں جامعہ کا ترانہ پڑھا۔جامعہ کے جن اساتذہ نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں بھرپور تعاون پیش کیا ان میں مولانا رہبر راشد قاسمی، مفتی عقیل انور مظاہری، قاری منصور احمد، حافظ اعجاز احمد، حافظ محمود حسن، قاری رضوان احمد، قاری عزرائیل صدیقی، مولانا عبدالواحد رحمانی، قاری جمشید احمد، قاری سیف اللہ، قاری عیسی رحمانی، ماسٹر مرشد عالم اور مولانا علی احمد رازی قابل ذکر ہیں۔

☆☆

سفرنامہ

فخر صحافت ڈاکٹر عزیز برنی کی سیمانچل سے ذہنی وابستگی

● مولانا عبدالقادر شمس قاسمی

شمالی بہار کے 7 اضلاع پر مشتمل دو کمشنریوں کو سیمانچل کہا جاتا ہے۔ پورنیہ کمشنری کے تحت پورنیہ، ارریہ، کشن گنج اور کٹیہار جیسے اقلیتی اضلاع ہیں تو کوسی کمشنری میں سہرسہ، سپول اور مدھے پورہ شامل ہیں۔ سیمانچل کے نام سے الگ ریاست کا مطالبہ شروع میں سابق مرکزی وزیر جناب محمد تسلیم الدین نے کیا تھا، لیکن اب سیمانچل اس پورے خطے کو کہا جاتا ہے جو ہند۔ نیپال سرحد کے قریب واقع ہے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے اردو میڈیا نیٹ ورک روزنامہ راشٹریہ سہارا، ہفت روزہ عالمی سہارا، ماہنامہ بزم سہارا کے گروپ ایڈیٹر عالی جناب ڈاکٹر عزیز برنی کی سیمانچل سے ذہنی وابستگی تو عرصہ دراز سے تھی، کیونکہ اسی خطہ کے ارریہ شہر میں سہارا انڈیا پریوار کے سرپرست اعلیٰ سہارا شری سبرت رائے سہارا پیدا ہوئے تھے، تاہم جب وہ 2008 میں ''اردو کانفرنس'' میں شرکت کی غرض سے کشن گنج تشریف لائے اور اس خطے کے بھولے بھالے عوام کی عقیدت ومحبت دیکھی، یہاں کی پسماندگی کا مشاہدہ کیا اور اس سرزمین میں پلنے والی صلاحیتوں کو بھانپنے کی کوشش کی تو ان کی اس خطہ سے قربت بڑھتی گئی۔ سابق مرکزی وزیر جناب محمد تسلیم الدین اور بہار اسمبلی کے رکن جناب اختر الایمان کی دعوت پر منعقد اردو کانفرنس میں دو لاکھ سے زائد عقیدتمندوں کو خطاب کرتے ہوئے عزیز برنی نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کی ہرٹیس کو عوام کے سامنے

رکھ دی تھی۔ اس کانفرنس کے بعد کشن گنج ضلع کے ٹپوگاؤں میں ''ملی گرلز اسکول'' میں بھی محترم عزیز برنی صاحب کو جانے کا اتفاق ہوا تھا جہاں انہوں نے کہا تھا کہ اس مٹی میں بڑی صلاحیتیں موجود ہیں اگر انہیں مثبت رخ دیا جائے تو تعلیمی انقلاب آسکتا ہے۔ اسی سفر کے دوران مولانا اسرارالحق قاسمی کی تعلیمی خدمات کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرکے انہوں نے کانگریس پارٹی سے پارلیمنٹ کا ٹکٹ دلوا کر جیت سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی طرح 2009 میں ''دہشت گردی مخالف کانفرنس'' میں شرکت کے لیے ایک بار پھر برنی صاحب کو کشن گنج آنے کا اتفاق ہوا جس میں لاکھوں انسان ان کا خطاب سننے کے لیے صبح سے شام تک یکسو ہوکر بیٹھے رہے۔ چارٹرڈ فلائٹ سے اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں عزیز برنی کے ساتھ فلمساز مہیش بھٹ، مشہور سماجی کارکن تیستا سیتلواڈ، فلم اداکار رضا مراد، شہباز خان، سوامی اگنی ویش وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس کے داعی کشن گنج کے سیاسی وسماجی رہنما محمود اشرف تھے۔

سیمانچل سے غیر معمولی محبت وانسیت رکھنے والے ڈاکٹر عزیز برنی اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود 11 اپریل 2010 کو ضلع ارریہ کے جوکی ہاٹ میں منعقدہ ''مسلم کانفرنس'' میں شرکت سے خود کو روک نہ سکے۔ جوکی ہاٹ میں عزیز برنی کا خطاب سننے کے لیے ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم سہ پہر تین بجے سے ہی پنڈال میں موجود تھا۔ جب برنی صاحب نے قوم وملت کے درد میں ڈوبی ہوئی اپنی تقریر شروع کی تو سناٹے کا سا سماں تھا اور پوری یکسوئی سے لوگ خطاب عالیہ سے فیضیاب ہو رہے تھے اور جب وہ اپنی تقریر میں حق وانصاف کو معروضی رخ دیتے تو پورے مجمع میں تالیاں گونجنے لگتیں۔ یہ کنونشن ناموس رسالت کے علمبردار حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول، بہار کے زیر سرپرستی ونگرانی میں کامیابی کے ساتھ انہیں کی کاوشوں سے ہمکنار ہوسکا۔ اس اجلاس میں جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا احمد بخاری

اور رکن اسمبلی جناب اختر الایمان سمیت درجنوں علماء ودانشوروں نے بھی خطاب کیا۔اس سفر میں ڈاکٹر عزیز برنی کو سہارا شری سبرت رائے سہارا کی جائے پیدائش ارریہ شہر کی تاریخی اور جغرافیائی صورتحال سے واقفیت ہوئی، نیز انہوں نے ان گلیوں کا بھی مشاہدہ کیا جہاں سہارا شری کا بچپن گذرا تھا۔

اس سفر کے بعد تو عزیز برنی کی ارریہ شہر سے غیر معمولی محبت والفت چھلکنے لگی تھی اور وہ اس بات پر غور کرنے لگے تھے کہ اس چھوٹے سے شہر کی 1948 میں کیا کیفیت رہی ہوگی جب ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کرنے والی شخصیت سہارا شری سبرت رائے سہارا نے آنکھیں کھولی ہوں گی۔ چنانچہ انہوں نے اس تحقیقی پروجیکٹ پر غور کرنا شروع کردیا جس سے یہ پتہ چلایا جائے کہ آخر دنیا کی عظیم ترین شخصیات نے کس طرح نامساعد حالات میں ترقی کا انقلابی سفر شروع کیا۔اس نقطہ نظر سے سوچنے والے عظیم صحافی عزیز برنی کے ذہن ودماغ میں دراصل یہ نکتہ رقص کررہا تھا کہ اگر عزم محکم اور عمل پیہم ہو تو مشکل حالات میں بھی منزل کی حصولیابی ہوسکتی ہے، چنانچہ ان کی یہ فکر ہے کہ ان نکات سے ملک وملت کو آگاہ کیا جائے، تاکہ عظیم شخصیات کے دھندلے نقوش پر عمل آوری کی راہ روشن ہو۔

ارریہ شہر، اطراف وجوانب اور پورے سیمانچل کا تاریخی پس منظر نیز حال کی حقیقی صورتحال سے واقفیت کی کشش ڈاکٹر عزیز برنی کے اندر بڑھتی ہی جارہی تھی، چنانچہ 26 اپریل 2010 کو سیمانچل کے مدھوبنی ضلع سپول میں منعقد ہونے والے ''پیام انسانیت کنونشن'' میں شرکت کی دعوت ملی تو ہر چند کہ ان ایام میں آپ بے پناہ مصروفیت اور ہجوم کار کے دوران گھرے ہوئے تھے، لیکن اسے سیمانچل سے ان کی محبت ہی کہی جائے گی کہ انہوں نے ایک بار پھر سیمانچل کے سفر کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرلیا۔

25 اپریل 2010 کو ڈاکٹر عزیز برنی صاحب نئی دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز باگ ڈوگرا پہنچے اور وہاں سے بذریعہ کار چار بجے ارریہ شہر پہنچ گئے جہاں ان کا قیام ایورگرین

ہوٹل میں تھا۔اس سے قبل برنی صاحب جب ارریہ تشریف لائے تھے تو اس شہر سے واقفیت کی تشنگی باقی تھی اس لیے انہوں نے شہر پہنچتے ہی سہارا شری کے آبائی گھر میں حاضری دینے کو ترجیح دی جہاں پہلے سے ہی ماما شری (سہارا شری کے مامو) برنی صاحب کا انتظار کررہے تھے۔ برنی صاحب جب آشرم روڈ ارریہ میں واقع سہارا شری کے آبائی مکان میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے ہی ماما شری اور سہارا انڈیا پریوار کے کئی اعلیٰ اہلکار استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ڈاکٹر عزیز برنی صاحب کی ماما شری سے ایک یادگار ملاقات ہوئی اور تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ برنی صاحب نے اس شہر سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے جب ماما شری سے سہارا شری کے بچپن کی یادوں کے حوالے سے کچھ جاننا چاہا تو تفصیلات جان کر وہ بے خود ہوگئے۔ماما شری نے ارریہ شہر کی 1948 سے 1958 تک کی صورتحال کا اجمالی تعارف پیش کیا اور سہارا شری کے دو قریب ترین دوست ونود کمار رائے (سابق ایم ایل اے ارریہ) اور رنجودا (پجاری کالی مندر) نے سہارا شری کے ساتھ گذارے اپنے بچپن کی یادوں کی جھلکیاں پیش کیں جس سے اس بات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دنیا میں سب سے بڑے پریوار (سہارا انڈیا پریوار) کے سرپرست اعلیٰ سہارا شری کی عادت وخصلت بچپن میں ہی ایسی تھی جو کسی سماجی انقلاب کی کہانی بیان کررہی تھی۔ڈاکٹر عزیز برنی نے ''سمیتی بھون'' اور کالی مندر کا بھی دورہ کیا۔

ملک وملت کے مسائل کو بے باکانہ انداز میں اٹھانے والے عظیم صحافی ڈاکٹر عزیز برنی کی ارریہ آمد کی اطلاع جیسے ہی کچھ لوگوں کو ہوئی وہ ایورگرین ہوٹل کی جانب پروانہ وار کھنچے چلے آئے جہاں برنی صاحب کا قیام تھا۔ برنی صاحب کا مقبول ترین کالم پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ارریہ میں موجود ہے جو برنی صاحب کو اپنا حقیقی نمائندہ اور رہنما تصور کرتی ہے، چنانچہ ایورگرین ہوٹل میں درجنوں افراد ان سے ملاقات کے لیے شام کو جمع ہوگئے۔ ملاقات کرنے والوں میں ارریہ ضلع سے ہی تعلق رکھنے والے آندھرا پردیش کے آئی جی

آف پولس جناب احسن رضا، اس علاقے کے پہلے انجینئر جناب محمد زبیر صاحب، ماہر تعلیم جناب محسن صاحب، شمالی بہار جماعت اسلامی کے امیر جناب نیرالزماں، علاقائی زبان کے مشہور شاعر ہارون رشید غافل، جنتا دل یو کے لیڈر نوشاد عالم، شہر کی مشہور سماجی وملی شخصیت جناب غلام سرور، عبدالسبحان جامی، جمعیۃ علماء ہند کے مقامی صدر مفتی نسیم الدین قاسمی، دینک جاگرن کے مقامی نمائندہ قمر معصوم سمیت درجنوں ذمہ داران شہر شامل تھے۔ شدہ شدہ شہر کے ممتاز دانشوروں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر عزیز برنی صاحب نے مختلف موضوعات پر تفصیلات حاصل کرنی شروع کردیں۔ اسی درمیان شہر کے ذمہ داران نے برنی صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ وزیر اعلیٰ بہار نتیش کمار کے سامنے ارریہ سمیت پورے سیمانچل کے مسائل کو رکھیں، چنانچہ برنی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جملہ مسائل کو غور سے سنا۔ اس موقع پر مقامی زبان کاہیا میں سیلاب کی صورتحال پر مشتمل نظم جناب ہارون رشید غافل نے سنائی جسے سن کر برنی صاحب مبہوت ہوگئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس نظم کو مع ترجمہ اپنے ویب سائٹ پر شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

میٹنگ کے دوران عمومی طور پر سبھوں نے کہا کہ کشن گنج میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاخ کے قیام کی ودیارتھی پریشد مخالفت کررہی ہے اس لیے وزیر اعلیٰ سے یہ درخواست کی جائے کہ عمومی مفاد میں یونیورسٹی کی شاخ کی جو تجویز ہے اسے جلد عملی جامہ پہنایا جائے، اسی طرح ارریہ شہر میں اقلیتی ہاسٹل کی تعمیر ہوچکی ہے، لیکن قانونی رکاوٹوں کو بہانہ بنا کر ابھی تک اس عمارت کو اقلیتی طلبہ کے حوالے نہیں کیا گیا ہے، اس لیے اس کی جانب وزیر اعلیٰ کی توجہ مبذول کرائی جائے۔ کئی ذمہ داروں نے کہا کہ ارریہ ضلع حکومت ہند کے ان نوے اضلاع میں شامل ہے جنہیں اقلیتی اضلاع قرار دیا گیا ہے، لیکن صورتحال یہ ہے کہ اقلیتی فنڈ کا یا تو استعمال نہیں ہورہا ہے یا اقلیتوں کی فلاح کے لیے متعین فنڈ کو دوسرے مدات میں

خرچ کیا جارہا ہے۔ چند لوگوں نے برنی صاحب کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ 1992 میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ارریہ میں فساد پھوٹ پڑا تھا جس میں تین مسلمان مارے گئے تھے، لیکن انہیں آج تک معاوضہ نہیں دیا گیا۔ ارریہ ضلع اور سیمانچل کے نوع بنوع مسائل کو برنی صاحب نے بغور سنا اور یہ فیصلہ کیا کہ ارریہ ضلع کے ذمہ داروں کی ایک فہرست تیار کی جائے اور ان کی ایک میٹنگ ارریہ میں بلائی جائے جس میں وہ شریک ہوکر یہاں کے تمام بنیادی مسائل سے واقف ہوں۔ سیمانچل کو جاننے، سمجھنے کے لیے اصحاب فکر ونظر کی خصوصی میٹنگ کی تجویز پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 'اس علاقے سے مجھے غیر معمولی انسیت ہوگئی ہے اور میں یہاں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں' چنانچہ برنی صاحب نے راقم الحروف کو یہ ذمہ داری دی کہ میں ارریہ ضلع کے اہم ذمہ داروں کی ایک فہرست مرتب کرکے ارریہ میں میٹنگ کو یقینی بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دارالحکومت دہلی میں مقیم سیمانچل کے اہل فکر ونظر کی بھی ایک میٹنگ منظّم کروں، تاکہ موصوف ان سے یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں اور اس علاقے کی تعمیر وترقی کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار ہوسکے۔

26 اپریل 2010 کی صبح موسم نہایت خوشگوار تھا، عزیز برنی صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایور گرین ہوٹل سے نکل کر سب سے پہلے ماما شری سے ملاقات کی اور عالی جناب سہارا شری جی کی جائے پیدائش، یعنی اس خاص کمرے میں نماز ادا کی، نماز کے لیے نہایت ہی خوبصورت اہتمام جناب ماما جی نے کیا تھا۔ پھر اس کے بعد مدھوبنی ضلع سپول کے لیے روانہ ہوئے جہاں انہیں ''پیام انسانیت کنونشن'' میں شریک ہونا تھا۔ راستے میں انہوں نے اس علاقے کے لہلہاتے کھیتوں کا بھی مشاہدہ کیا اور گاؤں کے رہن سہن کو بھی دیکھا، جوٹ کی کھیتیاں بھی دیکھیں اور اس سے متعلق جملہ معلومات بھی دریافت کرتے رہے۔ راستے میں جگہ جگہ سیلاب کی تباہی کے نقوش سے بھی آگہی ہوتی رہی۔ عالمی شہرت یافتہ کہانی کار

اور فلم ''تیسری قسم'' کے مصنف پھنیشور ناتھ رینوؔ کے گاؤں کے قریب ہوکر جب گذرے تو رینو کا ہندی ادب میں مقام اور ان کی شہرت پر سر دھنتے رہے کہ اتنی عظیم شخصیتیں ایسے پسماندہ گاؤں میں بھی جنم لے سکتی ہیں۔

فاربس گنج، نرپت گنج ہوتے ہوئے جب برنی صاحب کا قافلہ مدھوبنی گاؤں پہنچا تو وہاں سینکڑوں افراد ان کے استقبال میں آنکھیں بچھائے کھڑے تھے۔ ہر طرف استقبالیہ گیٹ، استقبالیہ سلوگن کے رنگا رنگ بینر اور تا حد نگاہ شامیانوں سے بنا خوبصورت پنڈال اور اسی کے عقب میں ''جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ'' کی عظیم الشان مسجد اور کئی وسیع عمارتیں جنہیں دیکھ کر برنی صاحب دم بخود رہ گئے اور ''جامعۃ القاسم دار العلوم الاسلامیہ مدھوبنی ضلع سپول'' کے بانی و مہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کی انتظامی صلاحیتوں کے معترف ہوگئے۔

محترم عزیز برنی صاحب جب اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے تو لاکھوں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کررہا تھا اور ہر طرف زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ پیام انسانیت کنونشن کے مہمان خصوصی بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار تھے جب کہ مہمان ذی وقار کی کرسی پر ڈاکٹر عزیز برنی جلوہ افروز تھے۔ نتیش کمار نے جب عزیز برنی صاحب کو اسٹیج پر دیکھا تو ان کے چہرے پر بھی یک گونہ چمک بڑھ گئی۔ اس دوران وزیر اعلیٰ نتیش کمار اور ڈاکٹر عزیز برنی سمیت چند علماء کے ہاتھوں ''شیخ زکریا چیریٹیبل ہاسپٹل'' کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور کنونشن کے دوران نتیش کمار کو بہترین کارکردگی کی بنیاد پر ''وکاس پرش ایوارڈ'' دیا گیا جب کہ محترم عزیز برنی کو بہترین صحافتی خدمات کے عوض ''مولانا آزاد ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ اس موقع پر جامعۃ القاسم کے بانی و مہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے کہا کہ آزادی سے قبل مولانا ابوالکلام آزادؒ نے عظیم صحافتی خدمات انجام دی تھیں اسی مناسبت سے دور حاضر میں عظیم صحافتی خدمات کے عوض

جناب عزیز برنی صاحب کو ''مولانا آزاد ایوارڈ'' دینا ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔

کنونشن میں سب سے پہلے مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور وزیر اعلیٰ و ڈاکٹر عزیز برنی کا 45 کیلو کے پھولوں کا ہار پہنا کر استقبال کیا گیا۔ اسٹیج پر وزیر اعلیٰ سمیت ممبر پارلیمنٹ جناب علی انور، مولانا عیسیٰ منصوری (لندن)، مولانا سلیم محمد کریم (ساؤتھ افریقہ)، مولانا سید شاہد سہارنپوری، مولانا ثناء الہدی قاسمی (امارت شرعیہ)، رکن اسمبلی منظر عالم اور ملک کے نامور علماء موجود تھے۔

جب اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے ڈاکٹر عزیز برنی کا نام پکارا گیا تو پورے مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس موقع پر انہوں نے مجمع عام سے اپنے ولولہ انگیز خطاب میں کہا کہ ''پھنیشور ناتھ رینو، للت نرائن مشرا اور سہارا شری سبرت رائے سہارا کی اس سرزمین کو میں سلام کرتا ہوں۔ اس علاقے کے باہمت انسانوں کی ہمت و استقامت کو سلام کرتا ہوں کہ بار بار کے سیلاب اور طوفان کا مقابلہ کرنے کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اس علاقے کے بھولے بھالے عوام سے مخاطب ہوتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ نتیش کمار جی کی سربراہی میں بہار ترقی کی راہ پر گامزن ہے اس کے لیے وزیر اعلیٰ یقینی طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی بہار کو مزید ترقی کی ضرورت ہے۔' عزیز برنی نے اپنے نہایت مختصر خطاب میں عوام کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ قول مشعل راہ ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے تین دوست ہیں اور تین دشمن۔ دوستوں میں سے ایک تو وہ ہیں جو حقیقی دوست ہیں، دوسرے دوستوں کے دوست اور تیسرے وہ ہیں جو ہمارے دشمنوں کے دشمن ہیں، اسی طرح تین دشمن بھی ہیں جن کو ہمیں پہچاننا چاہیے، ایک تو جو ہمارے دشمن ہیں دوسرے وہ ہیں جو ہمارے دشمنوں کے دوست ہیں اور تیسرے وہ ہیں جو ہمارے دوستوں کے دشمن ہیں۔، چنانچہ دوست اور دشمن کو

پہچاننے کا یہی پیمانہ ہونا چاہیے۔انہوں نے سیمانچل کے مسائل کی جانب وزیراعلیٰ کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ وہ کشن گنج میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاخ کے قیام میں آنے والی جملہ رکاوٹوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ ارریہ میں تعمیر شدہ اقلیتی ہاسٹل کی قانونی اڑچنوں کو دور کرکے اسے اقلیتوں کے حوالے کریں۔ برنی صاحب نے کہا کہ کشمیر کے بعد سب سے زیادہ مسلم آبادی والے اس خطہ کے عوام امن پسند ہیں اس لیے یہاں سے پیام انسانیت کی ہر تحریک کے اثرات دوررس ہوں گے۔'واضح ہو کہ ایک دن قبل ارریہ شہر کے ممتاز دانشوروں نے عزیز برنی کو سیمانچل کے مسائل پر توجہ دلائی تھی اور ان سے توقع ظاہر کی تھی کہ اگر وہ وزیراعلیٰ کی توجہ مبذول کرائیں گے تو اس کا فائدہ ضرور ہوگا۔خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ برنی صاحب کی تقریر کے بعد وزیراعلیٰ نتیش کمار نے اپنی تقریر کے دوران ان کی ہر بات کو تسلیم کرتے ہوئے عوام کو یقین دہانی کرائی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کیمپس کے قیام میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں آنے دی جائے گی اور دیگر تمام مشوروں پر بھی سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔چونکہ برنی صاحب کو اسی دن دہلی لوٹنا تھا اس لئے جلد ہی انہوں نے مدھوبنی سے کٹیہار کا رخ کیا، لیکن راستے میں ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' اور اس کے بانی و مہتمم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کی کارکردگی کو سراہتے رہے اور اس دوردراز علاقے میں اتنے عظیم الشان تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کی تعریف کی۔مجموعی طور پر عزیز برنی صاحب کا یہ دورہ سیمانچل کے عوام کے لیے ایک یادگار تحفہ ثابت ہوا۔

☆☆

رمضان کریم

افتتاحیہ

رمضان المبارک اور مدارس اسلامیہ

● مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، اہلِ ایمان ہمیشہ ہی سے رمضان المبارک کی آمد کیلئے خود کو ماہِ شعبان المعظم ہی سے تیار کرتے آئے ہیں۔ ایمان والوں کو رمضان المبارک کے آنے سے خوشی اور اِسکے جانے کا غم ہوتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ رمضان المبارک ایسا مہمان ہے جو خالی ہاتھ نہیں آتا، بلکہ اپنے ساتھ انعامات کے بادل بھی ساتھ لاتا ہے۔

جس کی بارش میں نیکوکار ہی نہیں، گنہگار بھی نہاتے ہیں۔ اس ماہ مبارک میں نیکیوں کی بارش ایسے تواتر کیساتھ برستی ہے کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں یہ بارشِ انوار نہ برستی ہو۔ ہر دن کے اختتام پر دس لاکھ ایسے مجرموں کو جن پر عذاب لازم ہو چکا تھا وقتِ افطار آزادی کا پروانہ عطا کر دِیا جاتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جب ماہ رمضان کی پہلی شب آتی ہے تو جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پورے ماہ ایک بھی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور اللہ کریم ایک ندا دینے والے کو حکم دیتا ہے کہ یوں ندا دو۔ اے بھلائی کے طلبگارو آگے بڑھو، اے برائی کے پرستارو پیچھے ہٹو۔

پھر فرماتا ہے، ہے کوئی بخشش کا طلبگار کہ اسے بَخش دِیا جائے؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ جو مانگے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا، تاکہ اس کی توبہ قبول کی جائے صبح طلوع

ہُونے تک اِسی طرح صدائیں دی جاتی ہیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالی عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی رحمت نے شعبان المعظم کے آخری دن ارشاد فرمایا: اے لوگوں! تم پر ایک عظیم مہینہ سایہ کر رہا ہے، اس میں لیلتہ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے فرض کئے اور رات کا قیام نفلی (عبادت) ہے جس نے اس ماہ میں ایک نیکی کی گویا اس نے دوسرے مہینے میں فرض ادا کیا اور جس نے اس ماہ میں ایک فرض ادا کیا گویا اس نے دوسرے مہینے میں 70 فرض ادا کئے، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ مواسات کا مہینہ ہے، اِس میں ایماندار کی روزی فراخ کر دِی جاتی ہے جس نے اِس ماہِ مُبارک میں کِسی کا روزہ اِفطار کروایا، اس کے لئے ایک غلام آزاد کرنے کا اجر ہے اور اس کے گناہوں کیلئے معافی ہے۔

یہ وہ مبارک مہینہ ہے کہ جس میں گنہگاروں کے دل اللہ کریم کی جانب مائل ہوجاتے ہیں اور ہزار ہا گنہگار اس موسم بہار کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گناہوں سے تائب ہوجاتے ہیں یہ وہ ماہ مبارک ہے کہ جس کے سبب مسجدیں آباد ہوجاتی ہیں۔ مومنین کو شیاطین سے نجات مل جاتی ہے، گھروں سے قرآن مجید کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

لیکن آہ افسوس صد افسوس! بہت سے ایسے بدنصیب مسلمان بھی ہوتے ہیں کہ اس مہمان کا ادب نہیں کر پاتے اور فسق وفجور کی زندگی کو نہیں چھوڑ پاتے، اپنی زندگی میں فیضان رمضان سے استفادہ نہیں کر پاتے جن کے شب وروز میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ابتدائے رمضان میں تو خوب جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن جوں جوں ماہ رمضان گزرتا ہے واپس نفسانی خواہشات کا شکار ہوجاتے ہیں جسکی وجہ سے مسجدوں کی رونقیں معدوم ہونے لگتی ہیں، تراویح کی قطاروں میں کمی آنے لگتی ہے اور پھر وہی لہوولعب کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔

آیئے عہد کریں کہ اس سال ہم اس شان سے ماہ صیام کا استقبال کریں گے کہ انشاء

اللہ ماہ شعبان سے ہی اپنے گناہوں سے آلودہ جسموں کو رمضان کے استقبال کیلئے نیکیوں کی جانب مائل کریں گے، ابھی سے عبادت کے لئے پر کمر باندھیں گے، اللہ کریم سے مدد لیتے ہوئے اگر نماز نہیں پڑھتے تو نماز کی پابندی کریں گے، جھوٹ سے خود کو بچائیں گے اپنی زبان، اپنی نگاہوں کی، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں گے، تاکہ ہم رمضان الکریم کا استقبال اس کے شایان شان طریقے سے کرسکیں۔

نیکیوں کا موسم بہار:

خالق کائنات کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمیں ماہ رمضان المبارک جیسی نعمت بے بہا سے سرفراز فرمایا، اس ماہ کا ہر لمحہ رحمت وعنایت سے سب لبریز ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت اور نیک کام کا اجر وثواب نہ صرف بڑھ جاتا ہے، بلکہ نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر گنا کر دیا جاتا ہے۔ رحمت خداوندی کا یہ عالم ہے کہ روزہ دار کا سونا چلنا، اٹھنا بیٹھنا الغرض ہر فعل عبادت میں شمار کیا جاتا ہے۔ عرش اٹھانے والے فرشتے روزہ دار کی دعاء پر آمین کہتے ہیں، اور مچھلیاں روزہ دار کیلئے افطار تک دعاء مغفرت کرتی رہتی ہیں۔

عبادت کا دروازہ:

روزہ باطنی عبادت ہے، کیونکہ ہمارے بتائے بغیر کسی کو یہ علم نہیں ہوسکتا کہ ہمارا روزہ ہے اور اور اللہ تبارک وتعالیٰ باطنی عبادت کو زیادہ پسند فرماتا ہے، ایک حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ عبادت کا دروازہ ہے۔ (الجامع الصغیر:۱۴۶)

روزہ کی تعریف:

روزہ کو عربی زبان میں ''صیام'' کہتے ہیں جس کا مادہ صوم ہے جس کا معنی باز رہنا، چھوڑنا اور سیدھا ہونا ہے، شریعت میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک عبادت کی نیت سے کھانا

پینا اور شہوات نفس سے رک جانے کا نام صوم یعنی روزہ ہے۔ روزہ صرف بھوکے رہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ روزہ ہر اس فعل کا نام ہے جو انسان کے نفس پر بوجھ ڈالے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو جھوٹی باتیں اور برے کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے کو چھوڑ دینے کی کوئی پرواہ نہیں“۔ (بخاری)۔

20 رکعات تراویح:

دس سلاموں کے ساتھ ۲۰/ رکعات تراویح اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ائمہ اربعہ اور جمہور علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، اس کا حکم بھی حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہے، رمضان المبارک میں بہت سے لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ جلد سے جلد آٹھ دس دن میں کلام مجید سنالیں، پھر چھٹی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ سنت ہے۔ تمام کلام اللہ کا تراویح میں پڑھنا یا سنانا ایک اور پورے رمضان کی تراویح مستقل ایک سنت ہے۔

مذکورہ صورت میں ایک سنت پر تو عمل ہو جاتا ہے، مگر دوسری سنت سے محروم رہ جاتے ہیں، البتہ رمضان المبارک میں سفر وغیرہ یا کسی وجہ سے ایک جگہ تراویح پڑھنی مشکل ہو تو مناسب ہے کہ قرآن شریف چند روز میں سن لیں، پھر جہاں موقع ملے تراویح پڑھ لیا جائے۔

اعتکاف:

رمضان المبارک میں اعتکاف کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس کا اہتمام فرماتے تھے، معتکف کی مثال اس شخص کی ہے کہ کسی کے در پر جائے اور یہ کہے کہ جب تک میری درخواست قبول نہ ہو لوٹوں گا نہیں۔ ابن قیمؒ کے بقول ”اعتکاف کا مقصود اور اس کی روح دل کو اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ کر لینا ہے“۔

صاحب ”مراقی الفلاح“ کہتے ہیں کہ اعتکاف اگر اخلاص کے ساتھ ہو تو افضل ترین

اعمال میں سے ہے، اعتکاف کیلئے سب سے افضل جگہ مسجد حرام پھر مسجد نبوی، پھر بیت المقدس ان کے بعد مسجد جامع پھر اپنی مسجد۔

شب قدر:

رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات شب قدر کہلاتی ہے جو بہت خیر و برکت والی ہے، قرآن پاک میں اس رات کو ”**لیلة القدر خیر من الف شهر**“ (القدر) (ہزار مہینوں سے افضل) بتایا گیا ہے، خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو اس رات کی عبادت نصیب ہو جائے، جو شخص یہ رات عبادت میں گزار دے گویا اس نے تراسی سال اور چار مہینے سے زیادہ کا عرصہ عبادت میں گزار دیا۔ اور یہ بھی صحیح معلوم نہیں کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینے سے کتنے مہینے زیادہ افضل ہے۔

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے قدر دانوں کیلئے یہ نعمت بے بہا مرحمت فرمائی ہے، جو پہلی امتوں کو نہیں ملی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کیلئے) کھڑا ہو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ ”**من صام رمضان و اقام غفرله ما تقدم من ذنبه**“. (بخاری)۔

صدقۃ الفطر:

صدقۃ الفطر ہر اس آزاد مسلمان پر واجب ہے جو بنیادی ضروریات (مکان، لباس، سواری، ضروری ہتھیار وغیرہ) سے زائد نصاب کا مالک ہو اس میں عاقل و بالغ ہونا شرط نہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقۃ الفطر صرف اس شخص پر ہے جس کے ذمہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے، حالانکہ یہ درست نہیں زکوٰۃ صرف سونے، چاندی، مال تجارت اور نقدی میں فرض ہوتی ہے، جبکہ صدقۃ الفطر کے نصاب میں زائد ضروریات اشیاء نصاب (۶۱۲ء۳۵

گرام چاندی یا ۸۷،۴۷۹ گرام سونے کی قیمت) کی مقدار میں ہیں یا اموال زکوٰۃ مقدار نصاب سے کم مالیت کے ہیں، لیکن زائد از ضرورت اشیاء کو ملانے سے ان کی مجموعی مالیت نصاب کو پہنچ جاتی ہے تو ان دونوں صورتوں میں صدقۃ الفطر ادا کرنا واجب ہے۔

صدقۃ الفطر جب چاہیں دے سکتے ہیں، لہٰذا رمضان کے مہینے سے پہلے پہلے ادا کرنا بھی صحیح ہے بلکہ اگر کئی سالوں کا صدقۃ الفطر ایک ساتھ دے تو بھی جائز ہے۔

زکوٰۃ:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”جو شخص مال کی زکوٰۃ ادا کر دے تو اس کے مال کا شر اس سے جاتا رہتا ہے“ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زکوٰۃ نہ دینے والا قیامت کے دن دوزخ میں جائے گا“۔

مال داروں کے مال میں غرباء کا حق:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسلمان مالداروں پر ان کے مال میں اتنا حق (یعنی زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے غریبوں کو کافی ہو جائے اور غریبوں کو بھوکے، ننگے ہونے کی جب کبھی تکلیف ہوتی ہے۔ مالداروں ہی کی (اس کرتوت کی) بدولت ہوتی ہے (کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان سے (اس پر) سخت حساب لینے والا اور ان کو دردناک عذاب دینے والا ہے۔ (طبرانی اوسط وصغیر)

مال کا طوق:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو پھر وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے، قیامت کے روز وہ مال ایک گنجے سانپ کی شکل بنا دیا جائے گا جس کی آنکھوں کے اوپر دو نقطے ہوں گے (ایسا سانپ بہت زہریلا

ہوتا ہے) اور اس کے گلے میں طوق (یعنی ہار) کی طرح ڈال دیا جائے گا اور اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیری جمع ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی تصدیق میں) یہ آیت پڑھی (**ولا یحسبن الذین یبخلون الخ**) اس آیت میں مال کے طوق بنائے جانے کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی (مقبول) نہیں ہوتی۔

روزہ دار کے لئے دو خوشیاں:

”ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علی ماھدٰکم ولعلکم تشکرون“ (البقرہ: ۱۸۵).

حق جل مجدہٗ کا اس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ رب کریم نے اپنے فضل سے ہمیں رمضان المبارک کا مہینہ عطا فرمایا اور اس مہینے کی برکتوں سے ہمیں نوازا، اور اس میں روزے رکھنے اور تراویح پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی، پھر اس مبارک مہینے کے اختتام پر اس مہینے کے انوار و برکات سے مستفید ہونے کی خوشی میں ”عیدالفطر“ عطا فرمائی۔ حدیث شریف میں رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **”للصائم فرحتان فرحۃ عند افطار و فرحۃ حین یلقی ربہ“**۔ (نسائی، کتاب الصیام)

یعنی اللہ تعالیٰ نے روزہ دار کے لئے دو خوشیاں رکھیں ہیں: ایک خوشی وہ ہے جو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، اور دوسری خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب وہ یوم قیامت اپنے پروردگار سے جا کر ملاقات کرے گا۔ اصل خوشی تو وہی ہے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہر مومن کو نصیب ہوگی۔ انشاء اللہ۔

افطار کے وقت کی خوشی:

جبکہ اس آخرت کی خوشی کی تھوڑی سے جھلک اللہ رب العزت نے اس دنیا میں بھی

رکھ دی ہے، یہ وہ خوشی ہے جو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ افطار دو قسم کے ہیں: ایک افطار وہ ہے جو روزانہ رمضان المبارک میں روزہ افطار کے وقت ہوتا ہے، اس افطار کے وقت ہر روزہ دار کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دیکھئے! سارے سال کھانے پینے میں اتنا لطف اور اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی ہے جو لطف اور خوشی رمضان المبارک میں افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، ہر شخص اس کا تجربہ کرتا ہے۔ علماء کرام روزانہ کے اس افطار کو ''افطار اصغر'' کا نام دیتے ہیں۔ اور دوسرا افطار وہ ہے جو رمضان المبارک کے ختم پر ہوتا ہے جس کے بعد عید الفطر کی خوشی ہوتی ہے اس کو ''افطار اکبر'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ پورے مہینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں روزے رکھنے اور اس کی بندگی اور عبادت کرنے کے بعد حق جل مجدہٗ عید کے دن خوشی اور شادمانی عطا فرماتے ہیں، یہ خوشی آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت حاصل ہونے والی خوشی کی ایک چھوٹی سے جھلک ہے جو رب کریم نے اپنے بندوں کو عید کی شکل میں عنایت فرمائی ہے۔

اسلامی تہوار دوسرے مذاہب کے تہواروں سے مختلف ہے:

یہ بھی اسلام کا نرالا انداز ہے کہ پورے سال میں صرف دو تہوار اور دو عیدیں مقرر کی گئی ہیں، جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور مختلف الخیال لوگوں میں پورے سال کے دوران بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں، عیسائیوں کے تہوار الگ ہیں، یہودیوں کے اور ہندوؤں کے تہوار الگ الگ ہیں، جبکہ اسلام نے صرف دو ہی تہوار مقرر کئے ہیں، ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ۔ ان دونوں تہواروں کو منانے کے لئے جن دنوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ پوری دنیا کے تہواروں سے الگ اور نرالے ہیں، اگر آپ دوسرے مذاہب کے تہواروں پر غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ لوگ ماضی میں پیش آنے والے کسی واقعہ کی یادگار میں تہوار مناتے ہیں۔ مثلاً عیسائی ۲۵ر دسمبر کو ''کرسمس ڈے'' کا تہوار مناتے ہیں بقول

عیسائیوں کے ان کا یہ تہوار حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی مناسبت سے مناتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست بالکل ہی غلط ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ۲۵ر دسمبر کو ہوئی، یہ ایک تحقیق کا موضوع ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی۔ یہ ایک تحقیق کا موضوع ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟۔ پیدائش کی یاد میں تمام عیسائیوں نے ''کرسمس ڈے'' کو تہوار کے لئے مقرر کرلیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اسرائیل کو فرعون سے جس دن نجات ملی تھی اور فرعون غرق ہو گیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر دریائے نیل کو عبور کرلیا تھا، اس دن کی یاد میں یہودیوں نے اپنا تہوار منانا شروع کردیا۔ اسی طرح ہندوؤں کے یہاں بھی جو تہوار ہیں وہ بھی ماضی کے کسی نہ کسی واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

اسلام کا کوئی بھی تہوار ماضی کے واقعہ سے وابستہ نہیں:

اسلام میں جو دو تہوار مقرر ہیں وہ ''عید الفطر'' اور ''عید الاضحیٰ'' ہیں۔ ماضی کا کوئی واقعہ اس دونوں تہواروں کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، یکم شوال کو عید الفطر منائی جاتی ہے اور دس ذی الحجہ کو عید الاضحیٰ منائی جاتی ہے، ان دونوں تہواروں کی تاریخوں میں کوئی تاریخی واقعہ پیش نہیں آیا، اسلام نے نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی مناسبت سے مقرر کیا، نہ ہی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکۃ المکرّمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کے اس تاریخی واقعہ کو ''عید'' کا دن قرار دیا، اور نہ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے میدان میں فتح ونصرت سے ہمکنار ہونے پر ''عید'' کا دن قرار دیا، نہ ہی غزوہ اُحد اور غزوہ احزاب اور اسی طرح سے بیسویوں غزوات کے دن کو ''عید'' کا دن قرار دیا، جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا کفر ہمیشہ کے لئے حرمین کی زمین میں دفن ہوا اور بیت اللہ کی چھت سے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور اللہ اکبر کی صدا پہلی مرتبہ گونجی اس دن کو

بھی ''عید'' کا دن قرار نہیں دیا۔ اسلام کی پوری تاریخ اور خاص طور پر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھرپور ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی واقعہ کو ''عید'' کا دن قرار نہیں دیا، یہ بھی اسلام کی حقانیت کی علامت ہے۔

''عیدالفطر'' روزوں کی تکمیل پر اللہ کا انعام:

جن ایام کو اسلام نے تہوار مقرر فرمایا، ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ وابستہ نہیں جو ماضی میں ایک مرتبہ پیش آکر ختم ہو چکا ہو، بلکہ اس کے بجائے ایسے خوشی کے واقعات کو تہوار کی بنیاد قرار دیا جو ہر سال پیش آتے ہیں اور ان کے آمد کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے۔ اللہ نے دونوں عیدیں ایسے موقع پر مقرر فرمایا ہے جب مسلمان کسی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، چنانچہ عیدالفطر رمضان المبارک کے گزرنے کے بعد رکھی ہے کہ میرے بندے پورے مہینے میری بندگی کے اندر مشغول رہے، اور پورے مہینے انہوں نے میری خاطر کھانا پینا چھوڑے رکھا، نفسانی خواہشات کو چھوڑے رکھا، جبکہ ان کے سامنے فریجر کا ٹھنڈا پانی کھانے کے مواقع اور خواہشات نفس پوری کرنے کیلئے شریک حیات کی موجودگی کے باوجود صرف انہوں نے میری رضا کے لئے ہر چیز سے باز رہے اور پورا مہینہ عبادت کے اندر گزارا، اس کی خوشی اور انعام میں یہ عیدالفطر مقرر فرمایا۔

''عیدالاضحیٰ'' حج کی تکمیل پر انعامات ربانی:

عیدالاضحیٰ ایسے موقع پر مقرر فرمایا جب مسلمان ایک دوسری عظیم عبادت، یعنی حج کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس لئے حج کا سب سے بڑا رکن وقوف عرفہ ۹ر ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا ہے، اس تاریخ کو پوری دنیا سے آئے ہوئے لاکھوں بندگان خدا میدان عرفات میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عظیم عبادت کی تکمیل کرتے ہیں، اس عبادت کی تکمیل کے اگلے دن، یعنی دس ذی الحجہ کو اللہ رب العزت نے دوسری عید مقرر فرمائی۔ اس کے ذریعہ رب کریم نے یہ سبق

دیا کہ ماضی کہ وہ واقعات جو ایک مرتبہ پیش آئے اور ختم ہو گئے، وہ واقعات تمہارے لئے عید کی بنیاد نہیں، بیشک تمہاری تاریخ ان واقعات سے جگمگا رہی ہے اور تمہیں ان پر فخر کرنے کا بھی حق پہنچتا ہے، آپ کے آباء واجداد نے یہ تاریخی کارنامے انجام دئے تھے، لیکن آپ کیلئے ان کا عمل کافی نہیں، آپ کے لئے آپ کا ہی عمل ضروری ہوگا۔ کوئی شخص آخرت میں صرف اس بنیاد پر نجات نہیں پائے گا کہ میرے آباء واجداد نے اتنے بڑے کارنامے انجام دئے تھے، بلکہ وہاں ہر آدمی کو اپنے عمل کا جواب دینا ہوگا۔ بقول شاعر

عمل کہ اپنی اساس کیا ہے
بجز ندامت کہ پاس کیا ہے
رہے سلامت تمہاری نسبت
میرا تو بس یہی آسرا ہے

محض ماضی کے واقعات پر خوشی ومسرت کا احیاء کرتے رہنا صاحب ایمان کے لئے کافی نہیں، بلکہ خود آپ کو اپنے عمل کو دیکھنا ہے، اگر آپ کے اپنے عمل کے اندر اچھائی ہے تو خوشی منائیے اور اگر خرابی وبرائی ہے تو سر دھونئے اور یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ ندامت ورنج کا اظہار کرتے رہنا بھی تقاضائے ایمان ہے۔

عید کا دن ''یوم الجائزہ'' ہے:

خیر! یہ عیدالفطر خوشی منانے کا اور اسلامی تہوار کا پہلا دن ہے، حدیث شریف میں اس کو ''یوم الجائزہ'' بھی قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے مہینے کی عبادتوں پر انعام دئے جانے کا دن ہے جو ''مغفرت'' کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ گزر جانے کے بعد عید کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اصحاب ایمان کی طرف اشارہ کر کے فرشتوں پر فخر فرماتے ہیں۔

آج میں ان تمام کی مغفرت کر دوں گا:

خیر! عید الفطر کے دن جب مسلمان عید گاہ میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہی فرشتوں کے سامنے جنھوں نے اعتراض کیا تھا، فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے میرے فرشتو! یہ ہے میرے بندے جو میری بندگی میں لگے ہوئے ہیں، اور بتاؤ کہ جو مزدور اپنا کام پورا کرلے اس کو کیا صلہ ملنا چاہئے؟ جواب میں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جو مزدور اپنا کام پورا کرلے اس کا صلہ یہ ہے کہ اس کو اس کی پوری پوری مزدوری دے دی جائے، اس میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ اللہ رب العزت پھر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے ہیں، میں نے رمضان المبارک کے مہینے میں ان کے ذمے ایک کام لگایا تھا کہ روزہ رکھیں اور میری خوشنودی کی خاطر کھانا پینا اور اپنی خواہشات کو چھوڑ دیں۔ آج انہوں نے یہ فریضہ پورا کرلیا اور اب اس میدان کے اندر اکٹھے ہوئے ہیں اور مجھ سے مغفرت چاہنے کے لئے آئے ہیں، اپنی مرادیں مانگ رہے ہیں، میں اپنی عزت وجلال کی قسم کھاتا ہوں، اپنے علو مکان کی قسم کھاتا ہوں کہ آج میں سب کی دعائیں قبول کروں گا اور ان کے گناہوں کی مغفرت کردوں گا اور ان کی برائیوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کردوں گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب روزہ دار عید گاہ سے واپس جاتے ہیں تو اس حالت میں ہوتے ہیں کہ ان کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔

''عیدین'' کی نماز عید گاہ میں ادا کی جائے:

یہ معمولی انعام نہیں ہے کہ رب کریم پورے مجمع کی مغفرت فرمادیتے ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی نماز کے لئے اس بات کو سنت قرار دیا کہ مسلمان بڑی سے بڑی تعداد میں کھلے میدان میں آسمان کے نیچے جمع ہوں اور مجمع کثیر ہو، کیونکہ مجمع جب بڑا ہوگا اس مجمع میں نہ جانے کس اللہ کے بندے کی بندگی کی برکت سے اللہ

تعالیٰ پورے مجمع عام پر رحمت کی بارش فرمادیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی وکریمی تو دیکھئے کہ اگرچہ انعام کے مستحق چند ہی افراد ہوتے ہیں جنھوں نے صحیح معنی میں اللہ کی بندگی کی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو مجھ جیسے ناکارہ اور گناہوں سے لت پت بھی اگر وہاں موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ ان چند افراد کی تو مغفرت کردوں اور باقی لوگوں کی نہ کروں، یہ میری رحمت سے بعید ہے، لہٰذا سب کو اپنے فضل وکرم سے مغفرت فرمادیتے ہیں۔

(ماخوذ از اصلاحی خطبات: مصنف مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی)

مدارس اسلامیہ ضرورت واہمیت:

مدارس اسلامیہ اسلام وانسانیت کی بقا کا ضامن:

مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت سے اب انکار کی گنجائش نہیں رہی ہے تاہم دشمنان اسلام نے بھی اس کی قوت کو پوری طرح بھانپ لیا ہے، اس لیے آئے دن مدارس اسلامیہ کے تعلق سے طرح طرح کے منفی رویہ کا اظہار خیال کیا جاتا اور مدارس واہل مدارس کے تئیں مسلمانوں خاص طور پر محسنین مدارس کو گمراہ اور بدگمان کیا جاتا ہے۔ کبھی مدارس اسلامیہ کے وجود کو زمانے کے ساتھ نہ چلنے والا فرسودہ نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو کبھی علما واہل مدارس پر بے ہنر طلبہ کی کھیپ کو دھرتی کا بوجھ بنانے کا الزام لگایا جاتا ہے، لیکن جب معاندین اسلام اور ان کے غلط پروپیگنڈے کے شکار کچھ مسلمان بھائیوں نے بھی جب یہ دیکھ لیا کہ مدارس سے متعلق علماء اور طلبہ کی شکل میں یہ دیوانے اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تو اب مدارس اور اس کی انتظامیہ پر ہی سوالات کھڑے کیے جارہے ہیں اور چند برسوں سے اس میں کافی تیزی آگئی ہے۔ مدارس مخالف قوتوں نے اب مدارس چلانے والوں اور علماء پر بداخلاقی اور مالی بددیانتی کے الزامات لگانے کو بہترین ہتھیار تصور کرلیا ہے۔ ان حالات

میں علماء اہل مدارس کو منفی پروپیگنڈے سے بچنے کی سعی کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری ہے کہ مخلصین ومعاونین مدارس معاندین اسلام کی بدنیتی کو سمجھیں اور علماء کے تعلق سے منفی باتوں پر ہرگز دھیان نہ دیں۔

اس بات کو اچھی طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب جب شمع حق کی لو تیز ہوئی ہے باطل کے خیمے میں بے چینی پیدا ہوئی ہے اور حق بات کو دبانے کی ہر ممکنہ کوشش ہوئی ہے۔ چنانچہ طرح طرح کی رکاوٹوں اور منفی پروپیگنڈوں کے باوجود مدارس اسلامیہ پوری قوت وجوش عمل کے ساتھ دین حق کی تعلیم اور اسلام کی اشاعت میں مصروف ہیں، بلکہ یہ کہا جائے کہ چند دہائیوں سے مدارس نے علمی وباطنی سطح پر بھی ترقی کی ہے اور ظاہری طور پر بھی اسے وقار وترقی حاصل ہوئی ہے، اس لیے اسلام ومدارس مخالف قوتوں کا بے چین ہو جانا فطری ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی کلمہ گو بھائی بھی ایسی طاقتوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور ان ہی کی زبان بولنے لگ جاتے ہیں۔ جب کہ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ یہی مدارس ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور اسلامی تعلیم زندہ ہے اور اسلامی تشخص باقی ہے۔ ہمارے بھائیوں کو اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو توکل علی اللہ پر بڑے بڑے پروجیکٹ کی بنیاد رکھتے ہوں، کوئی تنظیم ایسی نہیں جو بے سروسامانی کی حالت میں کسی کام کا عزم رکھتی ہو اور کائنات میں کوئی ادارہ نہیں جو چندہ بشکل بھیک اکٹھا کر کے نونہالان قوم کو تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کی مکمل کفالت بھی کرتا ہو۔ تصور کیجیے کہ علماء کے علاوہ کوئی قوم ایسی دنیا میں ہے جو فرائض منصبی بھی ادا کرتی ہو اور ایک ایک روپیہ چندہ اکٹھا کر کے مدارس کا نظام بھی چلاتی ہو اور اپنا وظیفہ بشکل تنخواہ بھی لیتی ہو؟ یاد رکھیے علماء اور ذمہ داران مدارس کے سامنے محض اسلام کی خدمت اور اشاعت دین ہے اور وہ اس کے لیے مر مٹنے کے لیے تیار ہیں، ورنہ امت کی جو بے رخی ہے مدارس پر کب کے تالے لگ چکے ہوتے۔

ایک طرف اہل مدارس کو معاندین اسلام کا سامنا ہے تو دوسری طرف ان روشن خیال برادران اسلام سے سابقہ ہے جن کے نزدیک مدارس اور اس سے وابستہ جملہ سرگرمیاں کا رعبث ہیں، چونکہ ان کے نزدیک انسانیت کی خدمت سب سے بڑی عبادت ہے اور ایسے مدرسوں کو وہ لاحاصل سمجھتے ہیں جہاں صرف مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے، ایسے لوگوں کی خواہش ہے کہ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کو برابر شامل کیا جانا چاہیے، تاکہ دنیا میں ترقی یافتہ قوم کہلا سکیں، یعنی وہ ایسا مدرسہ چاہتے ہیں جہاں دینی تعلیم کی حیثیت اتنی ہی ہو جتنی کھانے میں چٹنی کی ہوتی ہے۔ اس سوچ کے افراد خالص اسلامی مدرسوں کے لیے نہ دست تعاون بڑھاتے اور نہ کسی کو اس کام کے لیے آمادہ کرتے ہیں، بلکہ بعض وقت تو وہ مدارس کے تعاون کرنے والوں کو روکتے ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ ہندوستان میں صاحب نصاب افراد میں سے دس فیصد لوگ بھی اپنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالتے اور جو نکالتے ہیں انھوں نے زکوٰۃ کی رقم کو کھپانے کے لیے نام نہاد قسم کے ٹرسٹ کھول رکھے ہیں، ظاہر ہے ایسے میں اہل مدارس کہاں سے یہ امید لگائیں کہ ان کی مالی مشکلات دور ہونگی اور وہ پوری تندہی کے ساتھ اشاعت دین میں منہمک رہیں گے۔ اتنی رکاوٹوں اور مسائل ومشکلات کے باوجود اہل مدارس اگر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں تو یہ کسی جہاد سے کم نہیں۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اہل اسلام اور صاحب ثروت لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے رہیں کہ وہ اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرنے کی کوشش کریں اور مدارس کی اہمیت سے بھی انھیں آگاہ کرتے رہیں، دوسری طرف صاحب ثروت کو چاہیے کہ وہ اسلامی مدارس کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہیں، کیونکہ یہی وہ مدارس ہیں جن کے دم سے آج ہندوستان کے جنگلوں میں بھی اذان واقامت ہو رہی ہے۔ روشن خیال طبقے کو بھی چاہیے کہ وہ مدارس کے مقاصد کو سمجھیں اور ان کے نشانہ کو پہچانیں، اگر وہ اس پر غور کریں گے تو ان پر یہ منکشف ہو جائے گا کہ مدارس اسلامیہ کی خدمات کا دائرہ کتنا

وسیع ہے اوراس کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہیں۔

علماء واہل مدارس کو ایسے حالات سے نہ گھبرانا چاہیے اور نہ کسی طرح کی مایوسی کا شکار ہونا چاہیے، کیونکہ جس قرآن کریم کی تعلیم میں وہ مصروف ہیں اس کے بقا کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے، دوسری طرف علماء کو اپنے اسلاف کی خدمات کو دیکھنا چاہیے کہ کن کن مسائل ومشکلات کو جھیل کر انھوں نے دینی تعلیم اور اشاعت دین کی شمع کو جلائے رکھا۔ بوریہ نشیں علمانے مدارس اور خانقاہوں میں بیٹھ کر جس طرح مدارس کے نظام کو رائج وعام کیا تھا وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے، انشاءاللہ علوم اسلامیہ کا چراغ یونہی جلتا رہے گا۔

ہندوستان میں مدارس دینیہ کے قیام کا پس منظر:

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں جب سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا، انگریزی سیاست ہندوستان پر پوری طرح حاوی تھی، اسلامی روایات ایک ایک کر کے رخصت ہورہی تھیں، اسلامی تہذیب اور علوم وفنون کے زوال کا وقت آ گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اسلامی تعلیمات خود مسلمانوں کے لیے ’’لاشئ‘‘ بن کر رہ جائیں گی، انگریزی حکومت انتہائی شدت سے زندگی کے اس ’’لطیف جوہر‘‘ کو اہل اسلام کے ذہن ودماغ سے محو کرنے کی سعی پیہم میں مصروف تھی، مسلمانوں کے تعلیمی اور اجتماعی نظامِ حیات کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، انقلاب کے بعد، قوم مسلم انھیں مصائب سے دوچار ہوگئی تھی، جن سے عموماً مفتوح قومیں دوچار ہوتی ہیں اور ذہنی اضمحلال و پراگندگی ایسے نامساعد وقت میں رونما ہورہی تھی، ان عام مشکلات سے صدیوں حکومت کرنے والی قوم اپنے آپ کو غیر مامون پارہی تھی، ایسے ظلمت آگیں دور میں، مردانِ حق کیش اٹھے اور انھوں نے جہل کی تاریکی کو علوم وفنون کی روشنی سے تابناک بنانے کے لیے، اسلامی قندیلیں مدارس کی صورت میں روشن کرنے کا باعزم فیصلہ کیا۔

قیامِ مدارس کا مقصد:

قرآن وحدیث کی تعلیمات کے بغیر کسی اسلامی معاشرہ کی تعمیر اوراس کے قیام کا تصور ممکن نہیں، اسلامی تعلیمات ہی پر صالح معاشرہ کی بنیاد اور داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے، قرآن وحدیث اسلامی تعلیمات کا منبع ومصدر ہیں اور دینی مدارس کا مقصد، اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کے ماہرین، قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھنے والے علماء اور علوم اسلامی میں دسترس رکھنے والے رجال کار پیدا کیے جائیں، جو آنے والی نسل کا اسلام سے ناطہ جوڑیں، مسلمانوں میں اسلام کی بنیادی اور ضروری تعلیم کو عام کرنے اور اسلامی تہذیب وتمدن کی ابدی صداقت کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دیں اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ مدارس اپنے اس بلند مقصد کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

مدارس اسلامیہ کی ہمہ گیرافادیت:

مدارس اسلامیہ نے اگر ایک طرف ملت اسلامیہ کی ہر میدان میں رہنمائی کی اور کروڑوں انسانوں کو شاہراہِ مستقیم پر گامزن کیا، تو دوسری طرف انہوں نے ایسے بے شمار بلند پایہ علماء پیدا کئے، جن میں سے ہرایک علم وفن کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا اور جن کی جامعیت، اخلاص وللّٰہیت، علمی رسوخ اور قوتِ عمل نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کردی، مدارس اسلامیہ نے آزادی کے بعد اٹھاون سال کی مختصر مدت میں لاتعداد علماء وصلحاء پیدا کر کے افراد سازی کا ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا کہ تاریخ کا ہر معلم اپنے سنہرے حرفوں سے مدارس اسلامیہ کی اس عظیم الشان خدمت کو رقم کرے گا، یہ بے مثال معنویت اس وقت اور دوچند ہو جاتی ہے جب اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ ان فضلاء میں اکثر نے مدارس اسلامیہ سے حاصل کردہ امانت دوسروں تک پہونچانے اور دنیا بھر میں علم کی شمع جلانے کا اہم فریضہ ہر دور میں انجام دیا ہے اور آج بھی ہمہ تن مصروف ہیں۔

مدارس اسلامیہ کی علمی خدمات:

مدارس اسلامیہ کے فرزندوں کی علمی خدمات ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں، تفسیر قرآن، حدیث نبوی، فقہ اسلامی، علم کلام، عربی ادب، تجوید وقرأت، تاریخ وسیر اور تحریر وصحافت میں ان کی خدمات نہایت وقیع ہیں، اس پر مستزاد اردو زبان کی خدمت بھی مدارس نے جس قدر انجام دیا ہے دیگر یونیورسٹی اور کالجز دینے سے قاصر ہیں، چنانچہ صرف ہندوستان میں دینی مدارس جو بغیر کسی سرکاری سرپرستی وامداد کے چل رہے ہیں، ان سے وابستہ بوریانشیں علماء نے پچاس سال کے عرصے میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں تحریر کی ہیں۔

فضلاء مدارس کے تصنیفی کارنامے:

مدارس اسلامیہ کی تعلیمی اور تدریسی خدمات کے علاوہ تصنیفی کارنامہ ایک معروف حقیقت ہے اور دنیا نے اس کا اعتراف کیا ہے، خصوصاً ازہر ہند دارالعلوم دیوبند اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیگر مدارس اسلامیہ کے فارغین نے درس وتدریس اور دوسرے دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے حوالے سے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے، بلکہ دنیائے اسلام کے لیے بھی ایک سرمایۂ افتخار ہے۔ علوم دینیہ سے متعلق کوئی علم وفن ایسا نہیں، جس میں ان کی تصنیفات وتالیفات موجود نہ ہوں، ان میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے بھی ہیں، یہ کتابیں زیادہ تر عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہیں، ان کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔

درحقیقت مدارس اسلامیہ کی خدمت کے دو رخ ہیں، ایک اندرونی، جس کا تعلق طلباء کی تعلیم وتدریس سے ہے، اس کا دوسرا رخ بیرونی ہے جو عام مسلمانوں اور ملک سے متعلق

ہے۔ عوام سے رابطہ، وعظ وتبلیغ، دینی وملکی معاملات میں قوم کی شرعی رہنمائی، تذکیر وتذکیہ اور تصنیف وتالیف اس کے اہم عنوانات ہیں۔ سید محبوب رضویؒ رقم طراز ہیں ''مدارس اسلامیہ سے جو قابل قدر خدمات انجام پائیں، وہ برصغیر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں، صرف تصنیف وتالیف کے میدان میں تنہا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام نامی سے کون ناواقف ہوگا، جنھوں نے اگر ایک طرف اپنی گراں قدر تصنیفات سے لوگوں کو علم وتحقیق سے روشناس کرایا تو دوسری طرف افراد سازی کا ایسا بے مثال کارنامہ انجام دیا کہ ان کی ذاتِ اقدس پر ''مجددیت'' کا لفظ صادق آنے لگا۔ دینی اصلاحی نقطۂ نظر سے ملت کے ہر گوشے کو بدعت وخرافات سے دور کر کے سنت وشریعت پر گامزن کرنے کی سعی پیہم کی اور اس میں بہت حد تک کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ حضرت تھانویؒ کو تو ہم نے ایک آئیڈیل بنا کر پیش کیا، ورنہ اس طرح کے بے شمار بزرگان دین نے ملت اسلامیہ کو روبہ ساحل کرنے میں اپنی عمر عزیز کو فنا کر دی۔

بیرونِ ہند مدارس کی خدمات:

افادۂ ملت کے لیے فضلاء مدارس نے جو گراں قدر تالیفی خدمات انجام دیں اس کا دائرہ صرف برصغیر تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کی افادیت عالم اسلام تک عام ہوئی۔ سید محبوب رضویؒ رقم فرماتے ہیں: ''علماء دیوبند کے اس تحریری سرمایے کا مدار، شام کے ایک جلیل القدر عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے الفاظ میں، گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ وصلاح، روحانیت اور استغراق فی العلم ہے، چنانچہ عبدالفتاح ابوغدہ نے علماء دیوبند کی تصانیف کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ، اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں جو کتابیں اردو اور فارسی زبانوں میں ہیں، ان کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے تا کہ ''عرب دنیا'' کو بھی ان سے استفادہ کا موقع مل سکے''۔

چنانچہ خود شیخ نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ (متوفی: ۱۹۳۶ء) کی تصنیف ’’التصریح بما تواتر فی نزول المسیح‘‘ کو نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع کیا، نیز انہوں نے مولانا عبدالحئ لکھنوی (متوفی: ۱۸۸۶) کی کچھ کتابوں کو بھی ایڈٹ طباعت سے آراستہ کر کے امت کے سامنے پیش کر کے زبردست خدمت کی۔

فضلاء مدارس اور تفسیر قرآن:

قرآن کریم، شریعت اسلامی کا محور ومصدر ہے، لہٰذا اس کی تفہیم واشاعت کسی بھی اسلامی ادارے کا بنیادی فریضہ ہے۔ علماء ربانیین نے اس سلسلے میں اپنے فرضِ منصبی کو خوب سمجھا اور اس میدان میں نہایت وقیع خدمات انجام دیں، تفسیر اور اس کے مختلف گوشوں اور ذیلی فنون پر فرزندان مدارس کی عظیم الشان اور معیاری تصانیف ہیں، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، مثلاً: ترجمہ شیخ الہند اور اس کے حاشیہ پر تفسیر عثمانی، ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری، بیان القرآن، مشکلات القرآن، معارف القرآن اور احکام القرآن جیسی بلند پایہ کتب پیش کی جاسکتی ہیں، اسی طرح تفسیر کی سربرآوردہ شخصیات میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا احمد حسن محدث امروہوی، حکیم الامت حضرت تھانوی، فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی، مولانا ادریس کاندھلوی اور عظیم انشاء پرداز، محقق عالم حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ومجاز حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفاسیر مشتے از خروارے کے طور پر پیش کی گئیں، ورنہ یہ عنوان سیکڑوں تصانیف اور شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔

فضلاء مدارس اور ترویج حدیث:

سرزمین ہند سے ایسی قدآور ہستیاں نمودار ہوئیں اور علم حدیث کی ترویج واشاعت میں ایسی نمایاں خدمات انجام دیں، جنھیں دیکھ کر ابن حجر اور عینی وطیبی کی یادیں تازہ ہوگئیں، جن

کے چند اسماء قابل قدر ہیں: شیخ الاسلام حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی، فخر المحدثین سید فخر الدین احمد مرادآبادی، حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی، صاحب بذل المجہول حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، رئیس القلم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا ادریس کاندھلوی، محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہم اللہ اجمعین۔ ان حضرات کے حوالے سے یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس فن میں امت کی امامت کا شرف انھیں حاصل رہا ہے، جن کی جدوجہد کے نتیجے میں لامع الدراری، فیض الباری، اعلاء السنن، فتح الملہم، اوجز المسالک، معارف السنن، تحفۃ الاحوذی جیسی بلند پایہ کتب اور دیگر بے شمار تصانیف معرضِ وجود میں آئیں۔

مدارس اسلامیہ فقہ اسلامی کا مرکز:

فقہ اسلامی درحقیقت کتاب وسنت کا عطر ہے، خصوصاً فقہ حنفی جو اپنی گہرائی وگیرائی کی بنیاد پر شریعت اسلامیہ کی روح ومزاج کا آئینہ دار ہے۔ مدارس اسلامیہ سے فقہ کے حوالے سے عظیم خدمات انجام دینے والے بے شمار افراد تیار ہوئے، جنہوں نے فقہی بصیرت اور تعمق نظری سے مستند کتابیں تالیف فرما کر امت کی تشنگی کو بجھایا، مزید آئے دن پیش آنے والے مشکل ترین مسائل کو حل کر کے امت مسلمہ کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا جس کی شہادت فتاوی دارالعلوم، امداد الفتاویٰ، کفایت المفتی، احسن الفتاویٰ، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ نظامیہ، فتاویٰ امارت شرعیہ اور صنوان القضاء جیسی کتابیں دے رہی ہیں۔

تاریخ وسیر میں علماء کا اہم کردار:

تاریخ وسیر نگاری میں بھی مدارس اسلامیہ کے سپوتوں نے پہلی صف میں مقام حاصل

کیا ہے، چنانچہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مجاہد فی سبیل مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا زاہد الراشدی، مفتی تقی عثمانی اور دیگر علماء کی سیکڑوں تالیفات سے ایک ذخیرہ معرضِ وجود میں آکر قبولیت عامہ حاصل کیا۔

تحریر وصحافت میں فضلاء مدارس کی سرگرمیاں:

تحریری صلاحیت کا ایک مظہر تو تصنیفات وتالیفات ہیں، جن کا جائزہ اوپر گذرا اور دوسرا تحریری کام صحافت سے متعلق ہوتا ہے، اس میدان میں بھی فضلاء مدارس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ شاید بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہو کہ فضلاء مدارس نے مختلف ادوار میں جو ماہانہ یا پندرہ روزہ رسائل وجرائد اور ہفت روزہ، سہ روزہ یا یومیہ اخبارات نکالے ہیں یا ان کی ادارت میں شائع ہوئے ہیں، مولانا سلمان احمد بجنوری کے مطابق ان کی تعداد دوسو سے زائد ہے، ان میں بعض پرچے ایک عرصے تک آسمانِ صحافت پر درخشاں رہے اور ان کی ایک بڑی تعداد آج بھی سرگرم ہے۔

شرح خواندگی بڑھانے میں مدارس کا کردار:

برصغیر میں شرح خواندگی کا تناسب افسوسناک حد تک کم، یعنی مردوں میں پچاس اور عورتوں میں چوبیس فیصد ہے، اس تناسب کی بنا پر ہندوپاک کا شمار میدان تعلیم کے لحاظ سے دنیا کے پس ماندہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ اتنی کم شرح خواندگی والے خطے کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس کا وجود بہت بڑی نعمت ہے، جو نہ صرف شرح خواندگی کی اس کمی کو کافی حد تک کنٹرول کرنے میں معاون ہیں، بلکہ یہ ان بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا بھی واحد ذریعہ ہیں، جن کے والدین عصری درسگاہوں میں ان کے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کرسکتے، اس طرح مدارس نے حکومت کے ایک ثقیل بوجھ کو بھی ہلکا کردیا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ مدارس کا نصب العین:

ہر مدرسہ میں یقینی طور پر ایک شعبہ ''اصلاح معاشرہ'' کے لیے ہوتا ہے، چونکہ مدارس کی بنیاد ہی صلاح وتقویٰ پر ہوتی ہے اور اس کے بانیان کی سرشت میں اس طرح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اس لیے مدارس نے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کا یہ حق اپنے تئیں خود لازم کرلیا ہے، جس کے ذریعہ معاشرہ کی برائیاں، فضول رسومات اور غیر انسانی اقدار وافکار کے ازالہ کے لیے تحریری وتقریری مساعی جاری وساری رہتی ہے، نیز وقتاً فوقتاً خدارسیدہ علماء ربانیین کے باعظمت اثر انگیز خطاب سے عوام وخواص کے دلوں میں ایمانی حمیت و جلا پیدا کی جاتی ہے۔ مدارس میں تعلیم دینے والے علماء صلحاء کی تعلیمات کے نتیجہ خیز ہونے کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں مدرسہ کی چہار دیواری میں اقامت پذیر طالبان علوم نبویہ، نازیبا حرکات، اخلاق سوز جرائم اور خودکشی جیسے دل سوز واقعات عدم کی حد تک، بلکہ اگر ناممکنات میں شمار کیا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی، اس کے برخلاف عصری علوم میں منہمک طلبہ جو بزعم خود مہذب ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں اس طرح کی حرکات سے ان کی تاریخ داغدار رہی ہے۔

مغربی تہذیب کی یلغار اور مدارس کا کردار:

کسی بھی قوم کے مذہبی تشخص کو ختم کرنے کے لیے اس پر دوسمتوں سے یلغار ہوتی ہے، ایک فکری، اعتقادی اور نظریاتی سمت سے، دوسری عملی اور تحریکی زندگی کی جہت سے، ان دونوں محاذوں سے حملہ آور ہو کر اگر کسی قوم کی نظریاتی واعتقادی تعمیر گرادی جائے اور عملی زندگی کو مذہبی قیود سے آزاد کردیا جائے تو سمجھیے کہ اس قوم کا مذہب کے حوالے سے تشخص بالکل مٹ جائے گا اور کچھ عرصہ بعد اس کی حیثیت تاریخ کے ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ نہیں رہے گی۔ ''مغرب'' عالم اسلام پر اس وقت دونوں جہتوں سے حملہ آور ہے، اسلامی

تہذیب کے خرمن کو نذر آتش کرنے کے درپے ہے چنانچہ اعتقادی فتنوں کے ساتھ ساتھ اباحیت پسندی، جنسی بے راہ روی، فحاشی وعریانی اور مادیت کی یورش، عالم اسلام میں اپنے عروج پر ہے، برصغیر میں دینی مدارس ہی مسلمانوں کی تہذیبی روایات وعقائد کی حفاظت کے امین وقلعہ ہیں، جہاں سے طوفانِ مغرب کی سرکش موجیں ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوجاتی ہیں اور بحمد اللہ اس خطے میں مسلمانوں کا دینی تشخص پورے آب وتاب کے ساتھ قائم ہے۔

مدارس ہر نئی ظلمت میں امید کی کرن:

آج ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور سے گذر رہے ہیں، ان کی زیست سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرہ ان کے دین وایمان اور اسلامی تشخص کو ہے، ان حالات میں امید کا سہارا پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے دینی وعربی مدارس ہیں، مدارس ہر نئی ظلمت میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور بیابان کی تاریک شب میں قندیلِ رہنمائی روشن کرتے ہیں۔ ڈاکٹر یونس بلگرامی لکھتے ہیں کہ ”یہ اسلامی مدارس جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں اور جہاں نبوت محمدی کی ابدیت پر یقین اور زندگی کا نمونہ پایا جاتا ہے، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا کا کون سا متحرک ومصروف ادارہ ہے جس کا سرا نبوت سے ملا ہوا ہے اور جو نبوت کے چشمہ سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے، مدرسہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کی کھیتیاں سوکھی رہ جائیں“۔ مدرسہ ہی ہر قدم پر جائزہ لیتا ہے، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرتا ہے، بہکے ہوئے قدموں کو جماتا ہے اور ملت کی دکھتی رگوں پہ ہاتھ رکھتا ہے۔

مدارس اسلامیہ اسلام کی بقا کا ضامن:

اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس وقت سرزمینِ ہند میں مدارس اسلامیہ مسلمانوں کے دین وتہذیب کے وجود وبقا کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں، اس وقت نہ صرف

ہندوستان میں، بلکہ پوری دنیا میں اگر اسلام کے باقی رہنے کی بظاہر کوئی صورت نظر آرہی ہے تو وہ مدارس اسلامیہ ہی ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کے تشخص کا سوال ہے تو مسلم قوم کو اپنا ہر طرح کا تشخص برقرار رکھنے کے لیے اپنے دین ومذہب سے کلی طور پر جڑے رہنا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اسلامی طرز فکر کی دانش گاہوں اور تربیت گاہوں سے وابستہ رہنا ہوگا کیونکہ مسلمانوں کا تشخص مدارس اسلامیہ کے ساتھ ربط باہم رکھنے پر ہی منحصر ہے۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

مدارس اسلامیہ غیروں کی نظر میں:

ہر منصف مزاج نے مدارس کو ملک کی سالمیت، امن پسندی اور عدم تشدد کا پیغامبر ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے، اس کی عالم گیر خدمات بہ نظر تحسین دیکھ کر اپنے منصفانہ و غیر جانبدارانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر راجندر پرساد سابق صدر جمہوریہ ہند سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جسٹس جناب جگدیش سہائے، ویر بہادر سنگھ سابق وزیر اعلیٰ یوپی، رام نریش نائب وزیر اعلیٰ یوپی یہ سب وہ حضرات ہیں جنھوں نے بچشم خود دیکھ کر مدارس کی خدمات کو سراہا ہے اور یہ آشکارا کیا ہے کہ ”مدارس اسلامیہ امن پسندی کے داعی ومحافظ ہیں، جہاں اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ صرف مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں، بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے، اسی طرح پندرہ بیس لاکھ انسانوں کے عظیم الشان اجتماع میں مسز اندرا گاندھی نے خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا، ان کی تقریر بہت صاف اور شستہ اردو میں تھی، انھوں نے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کی اسلامی تہذیبی اور قومی وملکی خدمات کا بھرپور الفاظ میں تذکرہ کرتے ہوئے پر زور الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

لیکن بدقسمتی سے آج انھیں مدارس کے خلاف ناپاک منصوبے اور پروپیگنڈے کیے

جارہے ہیں، بے تحقیق الزام تراشی کے ذریعے ان کو دہشت گردی کا ٹھکانہ قرار دیا جارہا ہے اوران کی کردارکشی اوراصل شبیہ بگاڑنے کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔

مدارس اسلامیہ اورحکومت ہند کا رویہ:

دینی مدارس نے ایسا صالح معاشرہ ہمیشہ سے قوم وملک کو دیا ہے، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، ان سب کے باوجود آج دینی مدارس کو ''دہشت گردی'' کا اڈہ گردانا جاتا ہے، دینی مدارس کے خلاف مغربی لابیوں اور حکومت کی موجودہ مہم کے پس منظر میں انسانی حقوق کے تحفظ یا ملک وقوم کے مفادات کا جذبہ کارفرما نہیں، عالمی حالات کے تناظر میں مدارس کے خلاف نئی مہم کا انصاف کے ساتھ جائزہ لینے والا ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ یہ تمام کوششیں دینی مدارس کے اسلامی معاشرے میں مؤثر کردار کی وجہ سے ان کی اہمیت و افادیت پرضرب لگانے اور دینی تعلیم کی طرف لوگوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کو کم کرنے کا ایک مغربی حربہ ہے۔ کمیونزم کی ناکامی کے بعد مغرب اب عالم اسلام سے برسرپیکار ہے، اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی مستحکم تعلیمات، اپنی شاندار روایات، صحت مند رجحانات اور اپنی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی وجہ سے ''مغرب'' کے لیے اس وقت سب سے بڑا چیلنج اور خطرہ بنا ہوا ہے، مغرب کی پالیسی ساز سوچ اسلامی تعلیمات کی حفاظت کی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہونچی کہ مسلم معاشرہ کے خشک کھیتوں کو سیراب کرنے والے چشمے ان مدارس سے ہی پھوٹتے ہیں، اسلامی تحریکوں کو ایندھن یہیں سے فراہم ہوتا ہے، اسلامی بنیاد پرستی بھی ان مدارس کی آغوش میں بڑھتی ترقی کرتی اور پروان چڑھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مدارس اسلامیہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف ہیں، کاروبار اور سیاست سے دور ملک کو اچھے با اخلاق شہری مہیا کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ روڈ جام نہیں کرتے وہ قومی املاک کو نقصان نہیں پہنچاتے، توڑ پھوڑ نہیں کرتے، ان اداروں

میں گولیاں نہیں چلتیں، بم نہیں پھٹتے، یہاں انسانیت سکھائی جاتی ہے اوراعلیٰ کیرکٹر کے انسان تیار کیے جاتے ہیں۔

ہندوستانی عوام اس سے اچھی طرح باخبر ہیں اگر کوئی گروہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مذکورہ حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے تو یہ اس کی کوئی سیاسی ضرورت تو ہوسکتی ہے، مگر اسے قوم وملک کی خدمت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ حد تو یہ ہے کہ بعض مسلم دانشوران بھی مدارس کے خلاف حکومت کے معاندانہ رویے میں دوش بدوش ہیں، ان کی کاسہ لیسی میں لگ کر خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سُر میں سُر ملا رہے ہیں۔

روشن خیال دانشوران سے علامہ اقبال کی فریاد:

آج انگلی پر شمار میں لائے جانے والے بعض مسلم روشن خیال دانشوران، مدارس کی خدمات کو نظر انداز کر کے ان کے نظامِ تعلیم کو نشانہ بناتے رہتے ہیں، جبکہ علامہ اقبال جیسے روشن خیال کی تحریر ان سے فریاد کر رہی ہے کہ ''ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کہ کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدارس کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے باوجود آج ''غرناطہ اور قرطبہ'' کے کھنڈرات اور ''الحمراء'' کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے ''تاج محل'' اور دلی کے ''لال قلعہ'' کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔

مدارس اسلامیہ امن کا پرزور داعی اور محافظ:

دینی تعلیم کے مدارس جو ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے

ہوئے ہیں ان کے قیام کا بنیادی مقصد علم دین کی تعلیم، اس کی ترویج واشاعت اور تزکیہ نفس و تربیتِ اخلاق ہے اس کے ساتھ ان مدارس میں احترام آدمیت، اکرام انسانیت، مثالی اخلاق، حق نوازی، رواداری اور حب الوطنی کا درس دیا جاتا ہے۔ان مدارس کے نصاب میں کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جس سے نفرت وعداوت کی بوآتی ہو یا دوسرے مذاہب کے پیرو کاروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو، بلکہ اس نصاب تعلیم کو پڑھ کر جو علماء تیار ہوتے ہیں وہ علوم شریعت کے ماہر، امور شریعت کے واقف کار، امن وانسان دوستی کے علمبردار، حب الوطنی کے جذبات سے سرشار اور ملکی و وطنی عظمت کے پاسدار ہوتے ہیں، اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آزاد ہندوستان کے موجودہ ماحول میں اگر ملک کو کوئی تعلیمی ادارہ اچھا انسان فراہم کرتا ہے تو وہ ہمارے ملک کے مدارس ہیں، کیونکہ ان مدارس کے فارغین میں اتحاد واتفاق، انسانیت نوازی، باہمی تعاون اور بقاء باہم کا ذوق ومزاج راسخ کردیا جاتا ہے اس کے نتیجے میں ان میں ایثار وہمدردی، اخوت ومحبت اور شجاعت جیسے مکارم اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ ایک ایسی معتدل نفسیاتی کیفیت سے آشنا ہوجاتے ہیں جو نہ کمتری کے احساس سے بوجھل ہوتے ہیں اور نہ برتری کے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں، بلکہ جس میں خوداعتمادی اور منکسر المزاجی، بہادری وخوش اخلاقی، شفقت وترحم اور عزم واستقلال دونوں قسم کی کیفیتوں کا متناسب امتزاج ہوتا ہے، اس لیے ان مدارس پر حملوں سے، اس کی کردارکشی سے صرف مسلمانوں کو نہیں، بلکہ ملک کے مفاد کو زبردست نقصان پہنچے گا۔

حرف آخر:

یہ تھا مدارس اسلامیہ کی اجمالی خدمات کا مختصر جائزہ اور ان کی سرگرمیوں کی ادنیٰ جھلک جو موجودہ حالات کے پیش نظر سنجیدہ وسلیم الطبع اور حق پسند ہم وطنوں کے لیے پیش کی گئی اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ باتیں ایک غیر جانبدار آدمی کو مطمئن کرنے، غلط فہمیاں دور

کرنے اور شبِ دیجور اور صبح پرنور کے درمیان فرق کرنے کے لیے کافی ہیں ورنہ ”نہ بیند ہنر، دیدۂ عیب جوئے“ کے مطابق، عیب کی متلاشی نظروں کو خوبی بھی عیب ہی دکھائی دیتی ہے بقول شیخ سعدی ؎

کرنہ بیند بہ روز شپرۂ چشم، چشمۂ آفتاب راچہ گنا

ضد اور عناد جن کا شیوہ اور بدگمانی ہی جن کا عقیدہ ہو ایسے دائم المرض روگیوں کے لیے آج تک کوئی دوا شافی تلاش نہ ہوسکی، ان کے لیے تو ہم باری تعالیٰ سے دعاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحیح سمجھ عطا کرے، تاکہ وہ مدارس اسلامیہ کی ناقابل فراموش خدمات کو فراموش نہ کرکے اپنی سلامت روی کا ثبوت دیں۔ واللہ ھو الموفق.

☆☆

رمضان کریم : فضائل و مسائل

رمضان توبہ واستغفار کا موسم

● ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی
(عربی سے اردو)

توبہ ایک ایسی شرعی اصطلاح اور زبانی عمل اور ترک معصیت کا عزم مصمم ہے جسے انسان اس وقت استعمال کرتا اور عمل میں لاتا ہے جب اس سے کوئی خطا سرزد ہو جائے، انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ بھی زیادتی کرتا ہے، دوسرے انسانوں کے ساتھ بھی خطا کا مرتکب ہوتا ہے اور رب کائنات اور اپنے خالق کی نافرمانی کر کے بھی گناہ کر بیٹھتا ہے، انسان کسی کام سے اپنی کمزوری، یا لوگوں سے اپنی ذات کے بارے میں کسی طرح کے خوف سے غلطی کا اقرار کر کے یا جس کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی کی ہے اس سے معافی مانگ کر اس سے باز رہنے کا عہد کرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی غلطیوں پر نادم و شرمندہ ہو کر اعتراف جرم کرتا ہے اور آئندہ ان غلطیوں کو نہ دہرانے کا عزم بالجزم کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ قبول بھی کرتا ہے، اس کی توقیر واقبال میں اضافے بھی کرتا ہے، نیکیوں کی سعادت اور غلط حرکت سے بچنے کی توفیق بھی عطا کرتا ہے، انھیں امور میں سے چند کی ہم توجیہہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں:

حقیقی عزت وتوقیر:

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کی عزت اس کی طرف سے جود وکرم اور عطا و بخشش کی وجہ سے کرتا ہے، اس سے محبت بھی کرتا ہے، لیکن اس کی غلطیوں کی وجہ سے اس کی

عزت کرنا چھوڑ دیتا ہے، اسے دیتا رہتا ہے تو عزت بھی کرتا رہتا ہے، بند کر دیتا ہے تو عزت کرنا بھی وہ چھوڑ دیتا ہے، اس میں کمی بھی آجاتی ہے یہیں سے بدگمانی جگہ پکڑنے لگتی ہے، گویا عزت وتوقیر تو محض احسان وامتنان کا مظہر ہے، حقیقی عزت وتوقیر تو یہ ہے کہ خالص بغیر کسی لالچ کے کرے، لیکن بندے اور اس کے رب کے درمیان جہاں تک توبہ کا تعلق ہے تو یہ بالکل اس سے مختلف چیز ہے، ایک گناہ گار بندہ جب توبہ کرتا ہے تو اس کا رب اسے قبول کرتا ہے، یہ رب کریم کی شان کریمی کا مظہر ہے، اور یہ شان اللہ کی ایسی ہے جس میں کبھی کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آتی، اس مفہوم کی بہت سی روایات احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

توبہ کرنے والے بندے اور رب کے درمیان محبت:

توّاب یہ اللہ رب العالمین کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہے، بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، یعنی اللہ تعالیٰ بہت زیادہ اور ہمیشہ توبہ قبول کرنے والا ہے، توبہ کی سب سے عمدہ خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو پسند فرماتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

''إن اللّٰہ یحب التوابین'' (اللہ تعالیٰ یقیناً توبہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان یہ نہ گمان کرے کہ وہ ملائکہ کے جنس ہے کہ کوئی گناہ ہی نہیں کرتا، اور گناہ نہ کرنا یہ کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ کمال یہ ہے کہ غلطی کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے، اس سے وہ خوش ہوتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے: (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، اگر انسان غلطی نہ کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا جو غلطی کرتی اور وہ اللہ سے معافی مانگتی اور رب کریم اس کو معاف کرتا)۔

(والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذھب اللّٰہ بکم ولجاء بقوم یذنبون

فیستغفرو ن اللّٰہ، فیغفرلھم)۔

معلوم ہوا کہ بندے کی طرف سے کبھی کبھی لغزش کا ہونا آقا کے لطف وکرم کو متوجہ کرنے کیلئے ضروری ہوجاتا ہے،توبہ کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ کا محبت کرنا اس کی شان عبودیت کو اجاگر کرتا اور اس بات کو بتاتا ہے کہ واقعی وہی معبود کریم ہے۔

توبہ کرنے والے کے لئے دعا کی خاطر ملائکہ کی تسخیر:

ملائکہ ایسی مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محض اپنی تسبیح وتحلیل اور ذکر کے لئے پیدا کیا ہے، ملائکہ کی تسخیر اور اللہ کی تابعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ملائکہ انسانوں میں سے جو مومن ہیں ان کے لئے اور ان کی اولاد اور ذریات کیلئے دعائیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے:

"الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمد ربھم و یؤمنون بہ و یستغفرون للذین آمنوا ربنا وسعت کل شئ رحمة و علما، فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک وقھم عذاب الجحیم، ربنا و ادخلھم جنات عدن التی وعدتھم ومن صلح من آبائھم و ازواجھم وذریاتھم إنک انت العزیز الحکیم، وقھم السیئات ومن تق السیئات یومئذ فقد رحمتہ و ذلک ھو الفوز العظیم" (سورہ مومن/ غافر:۷-۹)۔

(جو فرشتے کہ عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور وہ ایمان والوں کیلئے اس طرح دعا واستغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے پروردگار آپ کی رحمت اور علم عام اور ہر چیز کو شامل ہے، تو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنھوں نے شرک سے توبہ کرلی ہے، اور آپ کے راستے پر چلتے ہیں، اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچالیجئے، اے ہمارے رب ان کو ہمیشہ کی

جنت میں داخل کردیجئے، جن کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے، اور ان کے ماں باپ بیویوں اور اولادمیں جو اس کے لائق ہوں ان کو بھی جنت میں داخل کردیجئے، بلاشک آپ زبردست حکمت والے ہیں اور ان کو قیامت کے دن ہر طرح کی تکالیف سے بچالیجئے، اور جس کو آپ اس دن کی تکالیف سے بچالیں تو اس پر آپ نے بڑی مہربانی فرمائی اور سب سے بڑی کامیابی ہے)۔

توبہ کے فوائد، یعنی گناہوں کی نیکیوں سے تبدیلی:

یہ بندے کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اللہ کی طرف انابت کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اس بات کی توقع کرتا ہے کہ اسے اللہ کی رضا نصیب ہو، اور آقا کے دربار سے معافی کا پروانہ آئے، بلکہ انسان جس قدر گناہ کے پھندے میں خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے، اس سے زیادہ اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی، اور توبہ کی وجہ سے گناہ کو مٹائے گا یہی نہیں، بلکہ ان گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کردے گا (اللہ اکبر) اس سے بڑی کرم فرمائی اور کیا ہوسکتی ہے؟"**یضاعف لہ العذاب یوم القیامة ویخلد فیہ مھانا، إلا من تاب و آمن وعمل صالحا، فأولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات وکان اللہ غفوراً رحیماً**"۔(الفرقان:۶۸-۷۰)۔

(کہ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا وہ اس عذاب میں ہمیشہ کیلئے ذلیل وخوار ہوکر رہے گا، مگر جو شرک ومعاصی سے توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتا رہے، تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کیلئے گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے)۔

ممکن ہے قرآن نے تمام ہلاکت خیز چیزوں سے (گناہ کبیرہ) سے بچنے کی شرط پر اور دوبارہ اس کام کو نہ کرنے کی شرط پر اتنے بڑے انعام کا وعدہ کیا ہو، اس لئے کہ انسان جب

ایک مرتبہ کسی گناہ کی لذت سے آشنا ہوجاتا ہے تو اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، جب تک سچی توبہ کی توفیق نہ ہو، بلکہ کبھی کبھی توبہ سے غفلت میں انسان حد سے گذر جاتا ہے، ایسے موقعہ سے جو شخص توبہ کرلیتا ہے، اور نیک راہ اختیار کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ توبہ کے بعد معاصی میں مبتلا نہیں ہوتا اور صبر کو اپنا شعار بنالیتا ہے، اور مسلسل توبہ کرتے رہنے سے اللہ کے محبوبوں میں شامل ہوجاتا ہے۔

خالق کا مخلوق سے محبت کرنا:

ودود اللہ کے اسمائے حسنی میں سے ہے، اور انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کرنے اور آقا وغلام کے درمیان تعلقات میں بھی یہ مشاہدہ ہے کہ ایک شخص جو دوسرے کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے، اگر چہ وہ لغزش کرے اور غلطیوں کا ارتکاب کرتا رہے، لوگوں کے درمیان ایسا ہی تعامل رائج ہے، مگر رب ذوالجلال نے اپنے بندے کیلئے ہمیں مستقل یہ بات بتائی اور یہ بات صرف اللہ کی ذات ہی کے لائق ہے کہ وہ اپنے بندوں کی توبہ بھی قبول کرتا ہے، اور اسے اقبال وعزت بھی عطا کرتا ہے اور اپنے بندنوں کے ساتھ لطف وکرم اور محبت کا معاملہ بھی کرتا ہے، اسے آپ یک طرفہ محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔

رب کریم کی محبت:

اس سے بڑی کرم فرمائی اور کیا ہوگی کہ انسان مسلسل نافرمانی پر آمادہ ہے اور رب کریم عطا اور بخشش کی برسات کررہا ہے "**قل یا عبادی الذین اسرفوا علی أنفسهم لا تقنطوا من رحمة اللّٰه إن اللّٰه يغفر الذنوب جميعا إنه هو الغفور الرحيم**" (سورہ زمر:۵۳)۔

(آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے کفر وشرک کرکے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمام گذشتہ گناہوں کو معاف

فرمادے گا یقیناً وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے)۔

اس آیت پر ذرا غور کیجئے اس کے ایک ایک کلمہ پر کہ منعم حقیقی کی طرف سے انعام وعطا اور محبت کی کس طرح خوشخبری سنائی جارہی ہے، اللہ کی طرف انابت اور استغفار کی دعوت بھی دی جارہی ہے، گویا اسے اللہ سے مانگنے اور اس کی بخشش وعطا تلاش کرنے اور اس کی محبت لوٹنے کا طریقہ استغفار کو قرار دیا جارہا ہے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ایک طرف گناہگار بندوں کو بھی عباد میں شامل کیا گیا ہے، اور "عباد" وہ وصف ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء، وفقہا اور اپنے رسول کو یاد کیا ہے، اسی وصف سے اس گناہگار بندوں کو بھی یاد کیا ہے، گویا وہ اس لائق نہ ہونے کے باوجود وہ عباد کے زمرے میں ہے، دوسرے قبولیت کی امید کی تجدید کی گئی ہے، اور رحمت خداوندی سے مایوس نہ ہونے کی ترغیب دی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ صرف گناہ کا ارتکاب کرلینے کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگیا، اس لئے رحمت خداوندی کا امیدوار ضرور رہے۔

تیسرے تمام گناہوں سے معافی کا وعدہ کیا گیا ہے، گویا اللہ کی رحمت سے مایوسی اس گناہ سے بھی بڑا گناہ ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا ہے، یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی تھی جو حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ جو فرمارہے ہیں وہ بہتر ہے، مگر ہم لوگوں نے تو قتل بھی کیا ہے، چوری بھی کی ہے، زنا کا ارتکاب بھی کیا ہے، بھلا ہمارا کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ جب انسان توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کردیتے ہیں، اس لئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر:۴/۷۵)۔

رب رحیم کی محبت:

اس تودد اور محبت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مخاطب کیا ہے کہ اللہ کی رحمت بہت

وسیع ہے، اس کی مغفرت بے پایاں ہے، بس اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اسی کی طرف امید لگائی جائے۔

حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ابن آدم انک مادعوتنی و رجوتنی غفرت لک علی ما کان فیک، ابن آدم أن تلقنی بقراب الأرض خطا یا لقیتک بقرابھا مغفرۃ بعد أن لا تشرک بی شیئاً، ابن آدم إنک أن تذنب حتی یبلغ ذنبک عنان السماء ثم تستغفرنی أغفرلک ولا أبالی'' (ترمذی)۔

(اے ابن آدم یقیناً تم نے مجھ سے دعا کی اور امید لگائی تو میں نے تمہارے اندر جو خطائیں تھیں معاف کر دیا، انسان تو ہم سے زمین بھر گناہوں کے ساتھ ملتا ہے اور میں بھی اتنا ہی بھرے ہوئے جذبۂ مغفرت کے ساتھ ملتا ہوں، اے ابن آدم تو نے اتنے گناہ کئے کہ آسمان بھر گیا، لیکن تم نے مجھ سے مغفرت چاہی اور میں نے معاف کر دیا، اور میں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی)۔

رب عظیم کی محبت:

اللہ اپنے بندے کے ساتھ کس قدر عظمت کا معاملہ فرماتا ہے، ایک حدیث قدسی میں ہے:

أما عند ظن عبدی بی و أنا منه حین یذکرنی إن ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسه و إن ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منهم و من تقرب إلیّ شبرا تقربت إلیه ذراعا ومن تقرب إلیّ ذراعا تقربت إلیه باعا و من جاء فی یمشی جئته مھرولا''۔ (بخاری ومسلم) (میں تو اپنے بندوں کے خیالوں میں بھی سمایا ہوا ہوں، اور میں اس کے قریب رہتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، جب وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے میں بھی اس کو دل میں یاد کرتا ہوں، جب وہ مجھے اپنے دوستوں میں

یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اچھے دوستوں (ملائکہ) کے درمیان یاد کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اسے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں، اور جب وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں پورے باع قریب ہوتا ہوں، جب میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

توبہ کرنے والوں سے اللہ و رسول کی خوشی:

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت کا سب سے بڑا مظہر اس کو مغفرت کیلئے قبول کرنا ہے، لیکن اس قبولیت پر بھی اللہ کی خوشی کے مظاہر بڑھے ہوئے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی خوش خبری کی شکل میں توبہ کی قیمت و اہمیت کو واضح کیا: چنانچہ حدیث میں ہے:

(اللّٰہ أشد فرحاً بتوبة عبدہ حین یتوب إلیه من أحدکم الخ). (صحیح مسلم).

(اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس وقت بہت زیادہ خوش ہوتا ہے، جب تم میں کا کوئی شخص توبہ کے ذریعہ اللہ رب العالمین کی طرف متوجہ ہوتا ہے)۔

اس حدیث میں ان لوگوں کیلئے عبرت کی بات ہے کہ اسلام ہر ممکن اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ غلطیاں معاف کر دی جائیں اور کم سے کم سزا میں انسان آزمایا جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تائب سے خوش ہونا:

جب اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ سے خوش ہوتا ہے تو رب کریم کے خوش ہونے سے ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خوش ہونا لازمی بات ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اللہ خوش ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ بندہ بدبختی سے نجات پا رہا ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی بدبختی اور ایمان سے رکنے اور خالی ہونے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا صدمہ ہوتا تھا، اس کے گہرے اثرات آپؐ کے قلب مبارک پر پڑتے تھے، آپ بہت رنجیدہ

ہوتے تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نصیحت فرمائی:

’’فلعلک باخع نفسک علی آثار ھم‘‘ (الکھف:٦)۔

چنانچہ انتہائی فرحت وانبساط میں تیزی کے ساتھ آپؐ بلال ابن اُمیہ پہلے انسان تھے جن کے پاس اس قدر تیزی سے گئے اور اس کی طرف اللہ کی توجہ اور توبہ کی قبولیت کی بشارت دی۔

آج دنیا کی کون ایسی شریعت ہے جو اللہ کی محبت کی طرف لوگوں کو لے جاتی ہو؟ سوائے اسلامی شریعت کے، اور کون رب ہے جو ہمارے رب سے زیادہ لوگوں کے قریب ہوتا ہو، جس نے ہمارے اوپر دنیا کی نعمتوں کی بارش برسائی اور جب بندے نے اللہ سے معذرت چاہی تو اس کی کوتاہیوں کو بھی قبول فرمایا اور اسے معاف کر دیا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

(والذين إذا فعلوا فاحشة أو ظلموا أنفسهم ذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن يغفر الذنوب إلا الله ولم يصروا على مافعلوا وهم يعلمون ‘‘ (سورہ آل عمران:١٣٥)۔

(اور یہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کوئی ایسا کام کر گذرتے ہیں جو ناشائستہ ہو، یا ان کی ذات کو نقصان پہنچانے والا ہو تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اور ہے کون اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا؟ اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتا اور وہ جانتے ہیں)۔

اللہ سے زیادہ ہم سے کون قریب ہوسکتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کو نہ ہماری ضرورت ہے اور نہ حاجت وہ ہر چیز سے غنی و بے نیاز ہے۔

انسانی فطرت اور طبائع کا لحاظ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے معاملہ میں اس بات کی رعایت کی ہے اور اس کا لحاظ رکھا ہے کہ انسان بہرحال انسان ہے، وہ فرشتہ نہیں ہے، اس لئے اس کی طاقت سے زیادہ

مجموعه القاسم: جلد ششم　　تیری عظمتوں کو سلام

بوجھ نہیں ڈالا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے، وہ اپنے بندوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خیر اور شر دونوں کی صفت رکھی ہے:

’’ونفس وما سواها، فألهمها فجورها وتقواها قد افلح من زكاها، وقد خاب من دساها‘‘

اللہ تعالیٰ چونکہ کمزوریوں سے واقف ہے، اس لئے توبہ کے ذریعہ نیک انسان بننے اور عمدہ طریقہ پر بندگی کرنے کا اس نے سلیقہ سکھایا، بلکہ اس کے لئے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھا کہ جب بھی غلطی کرے، یا لغزش ہوجائے اور غلطی کر بیٹھے تو اللہ کے لطف وکرم سے اس کے بندوں میں داخل رہے۔

عمدہ توبہ کرنے والے:

اصل میں انسان کی فطرت ہے کہ وہ اکثر خطا میں گھر جاتا ہے کیونکہ وہ ملائکہ میں سے نہیں ہے، کیونکہ ملائکہ تو بخشے بخشائے ہیں، جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو خطاء تو اس کی فطرت میں ہے، لیکن سب سے اچھا خطاکار اللہ کے نزدیک وہ ہے جو توبہ کرے، **’’کل ابن آدم خطا وخير الخطائين التوابون‘‘** (الحاکم فی المستدرک) (ہر نبی آدم خطا کار ہے مگر سب سے اچھا خطا کار وہ ہے جو توبہ کرے)۔

وہ خطائیں جو معاف ہوجاتی ہیں:

یہ بات ثابت ہے کہ شریعت نے انسان کی فطرت اور طبیعت کا لحاظ کیا ہے، اور اس کی طبیعت میں خطا ہے، لہٰذا اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے اس نے غلطی کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا، شرمندہ ہوا اور مغفرت چاہ لی، تو اللہ کی یہ عبودیت اور الوہیت ہے کہ اس سے محبت کرے، اس بات کا ادراک صرف مسلمان ہی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے رب کی

معافی کا ضرورت مند ہے، اور لغزش معافی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، لہذا جب غلطی کرتا ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتا ہے، تو اللہ اس کو معاف کرتا ہے، اور جب اللہ معاف کردیتا ہے تو کوئی خطا اس پر باقی نہیں رہتی۔

عن ابی هريرة: ان رجلا أذنب ذنبا فقاله أی رب أذنبت ذنبا أو قال عملت عملا فاغفرلی! فقال تبارک و تعالیٰ عبدی عمل ذنبا فعلم أن له ربًّا يغفر الذنب ويأخذ به قد غفرت لعبدی، ثم أذنب ذنباً آخر أو قال عمل ذنبا آخر قال رب إنی عملت ذنبا فاغفرلی، فقال تبارک تعالیٰ علم عبدی أن له ربًّا يغفر الذنب ويأخذقدغفرت لعبدی...... الخ)

(صحیح بخاری و مسلم).

(ایک شخص نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا، اور پھر کہا کہ اے میرے رب میں نے گناہ کیا ہے، آپ میری مغفرت فرما دیجئے، تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے، کہ میرے بندے نے گناہ کیا، اور معافی مانگی تو گویا وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے، اس لئے وہ گناہ سے معافی بھی مانگتا ہے اور پھر کرلیتا ہے تو میں اپنے بندے کی مغفرت کردیتا ہوں)۔

اللہ تعالیٰ قطعی یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان گناہ کرے اور پھر وہ معاف کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ بندہ کی کمزوری کے ساتھ ہے اور معافی میں اس نے انسان کی بشریت کا لحاظ کیا ہے، نہ کہ یہ چاہا ہے کہ انسان گناہ کرتا پھرے اور میں تو معافی کے لئے تیار ہی بیٹھا ہوں۔ اس لئے حدیث میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو معاف کرتا رہتا ہے، اگرچہ وہ بار بار گناہ کرتا ہے، بشرطیکہ اعتراف کی ڈگر پہ چلے، اللہ تعالیٰ سے معذرت چاہے، جو غلط حرکت کی وجہ سے غلط راستہ پہ چلا گیا ہے، اس سے معافی چاہے۔

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کا دفاع کرتا ہے:

"إن الله يدافع عن الذين آمنوا"

خلاف عادت کسی چیز کا سامنے آنا:

بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے ۹۹ قتل کررکھے تھے، وہ اس ارادے سے نکلا کہ اس کے بارے میں سوال کروں، چنانچہ وہ راہب کے پاس آیا، اور پوچھا کہ میرے جیسے شخص کیلئے توبہ ہے؟ اس نے کہا نہیں، پس اس نے اس کا بھی قتل کردیا، چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو عذاب اور رحمت کے فرشتوں کے درمیان اس آدمی کو اپنے قبضہ میں لینے کے سلسلہ میں مخاصمت ہوئی، اللہ تعالیٰ نے زمین کے اس حصہ کو قریب ہونے کا حکم دیا جو رحمت کے فرشتہ سے قریب تھی، اور عذاب والے حصہ کی زمین کو دور ہونے کیلئے کہا اور صرف اس لئے کہا کہ وہ توبہ کے ارادے سے نکلا تھا، پورا قصہ بخاری میں اس طرح ہے:

(كان فی بنی اسرائيل رجل قتل تسعة و تسعين انسانا ثم خرج يسأل فأتی راهباً فسأله فقال له: هل من توبة قال؟: لا، فقتله، فجعل يسأل فقاله رجل اتت قرية كذا و كذا فأدركه الموت فناء بصدره نحوها فاختصمت فيه ملائكة الرحمة وملائكة الغداب فأوحی الله إلی هذه أن تقربی وأوحی اللهٰ إلی هذه ان تباعدی، وقال قيسوا ما بينهما، فوجد إلی هذه أقرب بشبر فغفرله)(بخاری)۔

اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ اس نے انسان کے اندر فہم وشعور کا ملکہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات بندوں کے گناہ کے مقابلہ بہت بڑی ہے، جو اسے معاف کردیتا ہے جب وہ توبہ کرتا ہے، اس پر فضل اور کرم کرتے ہوئے، لیکن انسان خود ہی اللہ کی معافی کی وسعت کے آگے کمزور وناتواں کھڑا رہتا ہے، ایسا ہی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس شخص کے ساتھ کیا اور اس کی مغفرت ہوگئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی سچی توبہ کو جانتا ہے، اور ہر خیر کی چیز کو قبول کرتا ہے، ورنہ وہ اتنی دور تھا کہ اس کو عذاب کا فرشتہ لے جاتا، مگر اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ وہ رحمت کے فرشتہ کے قریب کردے، برائی کی زمین کو حکم دیا کہ وہ دور ہوجائے، تاکہ موت کی

گھڑی اس شخص کیلئے جوتوبہ کرچکا ہے رحمت کے قریب ہوجائے، اس طرح اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول کرتا ہے، اور وہ بھی سفاک، سخت، قاتل شخص اگر وہ سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔

توبہ کی قبولیت میں جھگڑا:

بعض توبہ کرنے والے ایسے بھی ہوں گے جو عفو و درگذر کے قریب، دوسروں کے حقوق کی وجہ سے نہیں پہونچیں گے، بلکہ ان کی معافی بندے کی معافی پر موقوف ہوگی۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

(یجئ المقتول بالقاتل یوم القیامة ناصیته و رأسه بیده و أوداجه تشخب دما یقول یا رب هذا قتلنی حتی یدنیه من العرش)(ترمذی)۔

اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، لہٰذا خیانت کرنے والے سے قصاص ضرور لیا جائے گا، لہٰذا قاتل کا قتل ثابت ہوجائے، دیکھئے یہاں میں توبہ کرنے والے شخص کا اللہ تعالیٰ دفاع کررہا ہے، مظلوم بندوں کو اپنی رضا اور خوشی دے کر تائب کی دفاع کرتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے:

(رجلان من امتی جثیا بین یدی رب العزة، فقال أحدهما یا رب خذلی مظلمتی من أخی، فقال الله تبارک و تعالیٰ للطالب، فکیف تصنع بأخیک ولم یبق من حسناته شئ قال یا رب فلیتحمل من أوزاری قال: وفاضت عینا رسول الله صلی الله علیه وسلم بالبکاء ثم قال: إن ذالک الیوم عظیم یحتاج الناس أن یحمل عنهم من أوزارهم، فقال الله تعالیٰ للطالب ارفع بصرک فانظرفی الجنان فرفع رأسه، فقال یا رب أری مدائن من ذهب و قصورا من ذهب مکللة باللولو لأی نبی هذا أو لای صدیق هذا أو لأی شهید هذا قال هذا لمن اعطا الثمن قال یا رب ومن تملکه ، قال لماذا؟ قال بعفوک عن أخیک، قال یا رب فإنی عفوت عنه، قال الله عز وجل فخذ بید أخیک فأدخله الجنة، فقال رسول الله عند ذلک اتقوا

الله و أصلحوا ذات بینکم فإن الله تعالیٰ یصلح بین المسلمین)(الحاکم فی المستدرک)۔

دیکھئے اس طرح اللہ تعالیٰ مظلوم بندوں کو اپنی رضا دیتا ہے، اور جنت میں وہ محلات عطا کرتا ہے جس کی وہ خواہش کرتا ہے، اور یہ صرف توبہ کرنے والے کے اعزاز واکرام میں عطا کرتا ہے، حالانکہ وہ ان محلات قطعی حقدار نہیں ہوتا۔

(میری امت کے دو مرد اللہ رب العزت کے سامنے گھٹنہ ٹیکیں گے ان میں سے ایک کہے گا اے اللہ میرے بھائی کا گناہ میرے بدلہ معاف کردے۔ تو اللہ تعالیٰ طالب عفو سے کہے گا کیسے تم اپنے بھائی کے لیے معافی چاہتے ہو درآں حالیکہ اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہے طالب عفو بندہ کہے گا تو میرے گناہ کا بوجھ اس پر ڈالدے۔ (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھیں نم ہوگئیں پھر آپ ﷺ نے فرمایا وہ دن (روز محشر) سخت ہوگا لوگ اپنے گناہ کا بوجھ بھی دوسرے کے سر ڈالنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے طلب کرنے والے سے کہا اپنی نگاہ اٹھاؤ اور باغ کو دیکھو تو اس نے اپنے سر کو اٹھایا، پھر کہا اے اللہ! میں سونے سے معمور شہروں کو دیکھ رہا ہوں، اور ایسے محلوں کو جو موتی سے آراستہ ہیں یہ کس نبی کے لیے ہے یا کس دوست کے لیے ہے یا کس شہید کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ اس شخص کے لیے ہے جس نے قیمت ادا کی ہے بندہ نے کہا اے اللہ کون اس کی ملکیت کی قدرت رکھتا ہے، اللہ نے کہا کیوں؟ تمہارا بھائی کو معاف کردینا ہی اس کی قیمت ہے، بندہ نے کہا اے اللہ بے شک ہم نے اس سے درگذر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑو اور اسے جنت میں داخل کردو۔ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ نے اس وقت فرمایا: اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کے ساتھ رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بیچ صلح کو پسند فرماتا ہے)۔

توبہ کرنے والے کی پردہ پوشی:

اللہ تعالیٰ کے کرم واحسان میں سے یہ ہے کہ توبہ کرنے والوں کی خطاؤں کو دنیا میں

چھپانے کا اہتمام کرتا ہے، گناہ کو چھپانا اس بات کی دلیل ہے کہ گناہ کو قطعی ظاہر اور اعلان نہ کیا جائے۔ مؤطا امام مالک میں ہے:

''من ارتکب شیئا من هذه القاذ و رات فلیستتر بستر الله''

انسان کمزور ہے، اور اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے گناہ کر بیٹھتا ہے، اور اس سے توبہ کرتا ہے، اور مغفرت کا طلب گار رہتا ہے، تو اس کے لئے قطعی مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کو ظاہر کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتا ہے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ: (**یدنی المؤمن یوم القیامة من ربه عز وجل حتی یضع علیه کنفه فیقرره بذنوبه فیقول هل تعرف، فیقول أی رب أعرف قال فإنی قد سترتها علیک فی الدنیا وإنی اغفرها لک الیوم فیعطی صحیفة حسناته، و أما الکفار والمنافقین فینادی بهم علی رؤس الخلائق هؤلاء الذین کذبو علی الله**) (بخاری)۔

(مومن بروز قیامت اپنے رب کے قریب ہوگا حتی کہ اپنے مونڈھے کو ان کے اوپر رکھدے گا اور اپنے گناہوں کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تم اسے جانتے ہو، تو بندہ کہے گا ہاں! یا اللہ میں اسے جانتا ہوں، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے اس کی دنیا میں ستر پوشی کی اور آج میں اسے درگزر کرتا ہوں، پھر اس کے اچھے اعمال کا ایک صحیفہ عنایت فرمائے گا۔ اور کفار و مشرکین کو اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے حاضر فرمائیں گے اور کہیں گے یہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتے تھے۔)

غور فرمائیے جب اللہ تعالیٰ اپنے گناہگار بندوں کے ساتھ اس طرح کا عفو و درگزر کا معاملہ فرماتا ہے تو اطاعت وفرماں گزاروں کے لئے کیا کچھ نہیں فرمائے گا۔

☆☆

رمضان مکمل انسانیت نوازی کے اظہار کا مہینہ

● ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی

(عربی سے اردو)

رمضان مسلمانوں کیلئے روحانی حلاوت اور تازگی کا مہینہ ہے، اس مہینہ میں جو شعور و آگہی امت مسلمہ کو حاصل ہوئی ہے، وہ دوسرے مہینوں سے بالکل ممتاز ہے، ایک مومن بندہ کو اس مہینہ کو مکمل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، احساس رضا جوئی اور عالی ہمت کے ساتھ قبول کرنا ہے، یہ مہینہ ایک نئے انداز سے تعلق مع اللہ کو قائم اور اس کی تجدید کرتا ہے، سال کے گیارہ مہینہ جو کاہلی اور سستی چھائی رہتی ہے اس کے گردوغبار کو پوچھ کر ختم کر دیتا ہے، اس ماہ کریم کا جب مومن بندہ استقبال کرتا ہے تو اپنے آپ میں ایک نئی تازگی اور مستعدی محسوس کرتا ہے، روح مکمل طور سے تیار اور قلوب بخشش، عطا اور فیاضی سے مسرور و معمور ہوتا ہے، یہ مہینہ حوصلے اور نئی نشاط کو پروان چڑھاتا ہے، اور انسان پورے فرائض منصبی کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرتا ہے، اس لئے اس مہینہ کو اللہ کا خصوصی مہینہ، خیر و برکت، گناہوں سے برأت کا مہینہ اور اللہ تعالیٰ کی لامحدود عطا اور بخشش کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ اور اسی لئے انسان اس ماہ مبارک میں دنیا کی ساری لذتوں کو ٹھکرا کر صرف وہی کام کرتا ہے جو رضائے الٰہی کا ذریعہ ہو۔ رمضان المبارک مکمل بندوں کی اصلاح کا مہینہ ہے، بندہ اپنی مصروفیات کو خیر باد کہہ دیتا اور اس کے اور خواہشات نفسانی کے درمیانی ایک دیوار حائل ہوجاتی ہے۔

یہ مہینہ خیر و برکت کے متلاشی کیلئے ایک بہترین موقعہ ہوتا ہے، اور بندہ جس خیر کی

امید کرتا ہے، وہ سعادت اس کا استقبال کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی خاص رحمت سے نیکیاں عطا کرتا، اور دعائیں قبول کرتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ جو لوگ ہمہ وقت شر اور فساد کی فراق میں رہتے ہیں ان کے لئے بھی یہ بہترین موقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو شر و فساد، منکرات وفواحش اور فسق و فجور سے رکے رہنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے، اور ان کے قلوب کو بھی نازل ہونے والی رحمتوں کیلئے کھول دیتا اور اس کی خواہشات کے علی الرغم ان کی اصلاح کا سامان کرتا ہے۔

روحانیت کا مہینہ:

یہ مہینہ روحانی تربیت کا مہینہ ہے، اللہ تعالیٰ روح کی تربیت کا خاص انتظام کرتا ہے، اس کو شائستگی کے سانچے میں ڈھالتا ہے، بلندی عطا کرتا ہے، نظافت اور پاکیزگی کے اعلی مقام تک پہونچاتا ہے، اور جو گناہوں کے گرد وغبار سے قلب بوجھل ہو چکا ہوتا ہے، اس کی کثافت کو دور کرتا ہے۔ رمضان ایک سایہ دار ہرے بھرے اور گھنے درخت کی مانند ہے جو ہمیشہ ابر رحمت اور تازگی کی برسات انسانی زندگی کے صحرا میں کرتا رہتا ہے، نور وصفا بکھیرتا رہتا ہے، جس کے سائے تلے روح آسودہ ہوتی ہے اور پورے ماہ اس کی چھاؤں میں ٹھنڈک حاصل کرتی رہتی ہے، تاکہ روزہ داروں کی روح چین وسکون اور تازگی کی فضا میں عالم ارواح تک سلامتی کے ساتھ جاسکے۔

تقویٰ اور احسان کا مہینہ:

یہ مہینہ تقویٰ، احسان، انسانیت نوازی اور ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ اظہار اخوت اور ہمدردی کے جام پلانے کا مہینہ ہے، یہ مہینہ اللہ سے مکمل لو لگانے اور روزہ دار کا اپنی ذات سے اللہ کی عظمت و کبریائی کے اظہار کا مہینہ ہے، روزہ دار کسی سے لو نہیں لگاتا، سوائے رب العالمین کے، وہ روزہ جیسی اپنی عبادت میں مخلص ہوتا ہے، اس کا

اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تنہائی میں بھی جب اس کے سامنے کوئی نہیں ہوتا وہ روزہ کو توڑنے والی چیزوں سے اجتناب کرتا ہے اور جس طرح وہ لوگوں کے سامنے ہر چیز سے بچتا ہے، وہ تنہائی میں بھی اگر ہوتا ہے تو وہ واقعی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم: ''**أن تعبد اللّٰه كأنك تراه، فإن لم تكن تراه، فإنه يراك**'' (بخاری حدیث جبرئیل) کا سراپا مظہر ہوتا ہے۔

وہ تنہائی میں حقیقتاً اس احساس سے سرشار ہوتا ہے کہ یہاں پر کوئی نہیں ہے، مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے، مگر میرا پروردگار دیکھ رہا ہے، اور وہ اس احساس کے نتیجہ میں ہر اس چیز سے بچتا ہے جو اس کے روزہ جیسی عبادت کو توڑنے والی اور فساد سے دوچار کرنے والی ہوتی ہے، یقیناً وہ تنہائی میں اللہ کی عظمت کا اپنی ذات سے اظہار کرتا ہے، اگر اللہ کے دیکھنے کا احساس نہیں ہوتا تو یقیناً تنہائی میں بیٹھ کر کھا پی لیتا (نعوذ باللہ) اور باہر آکر لوگوں سے کہتا کہ میں روزے سے ہوں، یہ ہے رتبہ احسان جسے حدیث میں بیان کیا گیا ہے، اور کسی استثناء کے بغیر روزہ دار اس کیفیت کے ساتھ چاہے چھوٹا ہو، بڑا ہو، مرد ہو عورت ہو بچہ ہو یا جوان ہو روزے کا اہتمام کرتا ہے، اور غالباً یہی وہ روزہ دار کا رتبہ ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔'' (**إلا الصوم فإنه لي و أنا أجزي به**)۔

روزہ میں یہی جذبہ جو تنہائی اور خلوت وجلوت میں کھانے پینے کے تعلق سے ہوتا ہے، اسی جذبہ اور عمل کا مظاہرہ جسم کے ہر ہر عضو سے ہونا چاہئے، تب ہی ایک روزہ دار حقیقی معنی میں صائم کہلانے کا حقدار ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی آنکھ بھی روزہ رکھتی ہے، اس لئے کہ اس حالت مین کسی غیر محرم کو نہیں دیکھتی، ہاتھ بھی روزہ رکھتا ہے، جو کسی کے خلاف نہیں اٹھتا، زبان بھی روزہ رکھتی ہے، جو غیبت نہیں کرتی، کان بھی روزہ رکھتا ہے، جو غلط بات نہیں سنتا، دل بھی روزہ سے ہوتا ہے، جو غلط خیال اپنے اندر نہیں لاتا، اور دماغ بھی روزہ رکھتا ہے جو کوئی غلط بات نہیں سوچتا، غرضیکہ ہر ہر عضو روزہ سے ہوتا ہے اور غلط

چیزوں سے باز رہتا ہے جو روزہ فرض کرنے والے پروردگار نے حرام قرار دیا ہے، اور جب روزہ دار اس رتبہ کو پہنچ جاتا ہے تو رمضان کی حقیقت اور نعمت وفضل کو پانے والا ہوجاتا ہے، یہی روح ہے ”**لعلکم تتقون**“ کی، اس لئے کہ روزہ مکمل طور پر انسان کو ہر عیب سے پاک کردیتا ہے، روزے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کھانے پینے کے کم ہونے کی وجہ سے نفس انسانی میں شہوت انگیزی میں کمی آتی ہے، جو بجائے خود عمل صالح اور خیر کی طرف انسان کو راغب کرتا ہے، نیکی کے کام اسے انجام دینا آسان اور سہل ہوجاتا ہے، اس مناسبت سے روزے کے چند اہم فوائد آیت قرآنی: ”**لعلکم تتقون**“ کی روشنی میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں:

اول:

خیر کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، اور بھلائی کے کاموں کیلئے اپنے آپ کو آمادہ کرنا، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کیلئے پیش پیش رہنا، ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا، اگر کوئی کسی طرح کے دین اور قرض کے بوجھ تلے دبا ہو تو اس سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کرنا، تاکہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرسکے، اور اگر خود کسی کا قرض خواہ ہو تو اپنے مقروض شخص کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا، کیونکہ قرض دینے والا شخص اس مال کا مالک ہے جو اس نے دیا ہے، نہ کہ اس شخص کا کہ غیر ضروری طور پر اس پر دباؤ بنائے رکھے، یہ جذبہ دراصل انسانیت کے اعلی اقدار کو پروان چڑھاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ماہ میں آپؐ کے اندر جود وسخا میں اضافہ ہوجاتا تھا، حدیث شریف میں ہے: ”**عن ابن عباسؓ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أجود الناس وکان أجود مایکون فی رمضان حین یلقاہ جبریل فیدارسہ القرآن**“ (بخاری ومسلم) (حضرت ابن کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ میں لوگوں میں سب سے زیادہ سخی ہوجایا کرتے تھے اور سخاوت کی یہ صفت رمضان اس وقت اور دوچند ہوجاتی تھی جب حضرت

جبریل آتے اور آپؐ ان سے قرآن ریہرسل فرماتے)۔

ثانی:

الفت ومحبت، دینی افکار وخیالات کے تبادلہ کی فضا قائم کرنا، اس کی اشاعت پر مساجد و مجالس میں توجہ دینا، بھائی چارے کو فروغ دینا، اور یہ فضاء افطار کے اہتمام، بخشش اور عطا کا ماحول اور رمضان کی مناسبت کا اہتمام، یتیم، ارامل اور بیواؤں کی امداد پر توجہ دینے، زکوۃ و خیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے قائم ہوتی ہے، چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں ہے: ”**من فطر صائماً کان مغفرة لذنوبه و عتق رقبته من النار، وکان له مثل أجره من غير أن ينقص من أجره شئی، قالوا یا رسول اللّٰه ليس کلنا يجد ما يفطر به الصائم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم يعطى الله هٰذا التواب من فطر صائما على ثمرة أوشربة ماء أومذقة لبن**“۔ (صحیح ابن حزیمہ: ۷/۱۱۵)

(جس نے ایک روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ افطار کرانا اس کے گناہ کی معافی اور جہنم سے آزادی کا سامان ہوگا، اور اس کے لئے اتنا ہی اجر لکھا جائے گا جتنا کہ روزہ رکھنے والے کیلئے ہے، اور بغیر کمی کے صحابہ نے عرض کیا کہ ہم میں کا کوئی بھی یہ استطاعت نہیں رکھتا کہ کسی روزہ دار کو افطار کرائے، آپؐ نے فرمایا کہ یہ ثواب ہر اس آدمی کو ملے گا جو کسی روزہ دار کو ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ لسّی سے افطار کرائے)۔

رمضان کا موقعہ مالدار اور غریب وفقیر مرد اور عورت اور بوڑھے جوان سب کیلئے حصول خیر کا ذریعہ ہے، کھجور کا ایک دانا، پانی کا ایک گھونٹ، اور دودھ کی ایک چھوٹی پیالی کسی کے لئے ناممکن نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ ایمان میں عزیمت، نیت میں اخلاص، ہمت و جذبہ میں انسانیت نوازی اور برادرانہ محبت کا شعور ہو۔

ثالث:

دعا واستغفار، ذکر واذکار اور تلاوت قرآن کیلئے اپنے دل کو آمادہ کرنا اور جمانا، تاکہ

اس کے ذریعہ دلوں کے زنگ کو صاف کیا جاسکے، اور دلوں پہ گیارہ مہینوں کے جمے ہوئے میل کچیل کو دھویا جاسکے، چہرے سے روح کی تجلی ظاہر ہو، ہمت میں بلندی آئے اور مسکن روح، یعنی دل کی مکمل صفائی ہوسکے، اس سلسلہ کی بہت سی روایات ہیں جو احادیث کی کتابوں میں درج ہیں۔

رابعاً:

اپنے آپ کو مکمل طریقے سے قیام لیل اور تراویح کیلئے فارغ کرنا، اطاعت الٰہی کیلئے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا، قبولیت کے اوقات میں اللہ سے التجاء کیلئے خود کو پیش کرنا، اور بالخصوص لیلۃ القدر میں، جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: **من قام رمضان إیمانا و احتساباً غفر له ما تنقدم من ذنبه**"۔(بخاری)

(جس نے رمضان کا روزہ ایمان واحتساب کے ساتھ رکھا تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردئے جائیں گے)۔

اس طرح اس ماہ کی ہر رکعت جہری اور سری تسبیح ہر اچھی بات اللہ کے نزدیک بندہ کے لئے دہرا اجر رکھتی ہے۔

خامساً:

حرام چیزوں کے دیکھنے سے اپنی نگاہوں کو بچائے، اور اللہ کو راضی کرنے والی چیزوں میں مشغول رکھے، جو ایمان میں اضافہ کا ذریعہ اور قلب کے یقین کو دوبالا کرنے کا سبب ہے، بدنگاہی کا فتنہ ہمارے زمانے کا عظیم فتنہ ہے، جس میں ہمارا پورا معاشرہ مغرب کی طرح اس شیطانی عمل میں مبتلا ہے جس نے ہر کس وناکس کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اس سنگین فتنہ سے بچنے کے لئے انسان کہاں جائے، کوئی راستہ نہیں مل رہا ہے، ہر گلی، ہر چوراہا اس کی زد میں ہے، اس فتنہ سے صرف اور صرف اللہ کا خوف ہی بچا سکتا ہے، جس دل میں اللہ کا خوف ہوگا اس کی نگاہیں ضرور اس سے محفوظ رہیں گی، چنانچہ حضرت حذیفہ ابن الیمان

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نگاہ ابلیس کی، جس پر کہ اللہ نے لعنت بھیجی ہے، زہر آلود تیر میں سے ایک تیر ہے، جو شخص اللہ کے خوف سے اس سے بچے تو اللہ تعالیٰ اسے ایمان عطا کرتا ہے جسکی حلاوت وہ اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے:

(عن حذیفة ابن الیمان رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: النظرة سهم مسموم من سهام ابلیس لعنه اللّٰہ، فمن ترکها خوفا من اللّٰہ عزوجل أتاه اللّٰہ عزوجل ایمانا یجد حلاوته فی قلبه). (رواه الحاکم وصححه).

(حرام نگاہیں اللہ کے غصہ اور اس کی ناراضگی کو دعوت دیتی ہیں، ابلیس کے راستہ کو کھولتی ہیں، خواہ یہ نگاہیں جہاں بھی پڑیں، میں نہیں سمجھتا کہ ایک عقل مند آدمی شیطان کو اپنے اندر لینے سے خوش ہوگا، لیکن عقل مند شخص وہ ضرور ہے جو ایمان کی لذت اور اس کی حلاوت کو حرام چیزوں سے محفوظ رہ کر حاصل کرے گا)۔

سادساً:

آدمی نفس کو ایسا مضبوط بنائے جس سے کہ اپنے اعضاء کو محرمات سے بچا سکے، ہلاکت خیز چیزوں سے دور رکھ سکے، اپنے روزے کو منکر اور فواحش سے پاک رکھ سکے، کیونکہ محارم ومنکرات ایک روزہ دار کو بے روزہ بنادیتے ہیں، صرف ہمارے کھانے سے رکے رہنے اور روزے کے آداب کو ملحوظ نہ رکھ کر دن بھر اپنے آپ کو بھوک اور فاقہ کے عذاب میں مبتلا رکھنے کی اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دن بھر کھانا پینا چھوڑے رکھے:

(قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من لم یدع قول الزور والعمل به، فلیس للّٰہ حاجة فی أن یدع طعامه و شرابه)۔(بخاری)۔

روزے کی حالت میں فسق وفجور سے بچنے کی حکمت:

روزے کی حالت میں جھگڑے، لڑائی، نازیبا کلمات نکالنے سے باز رہنے اور صبر و ضبط اور حلم وبردباری اختیار کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان کے مزاج پر جو اثر کھانے پینے سے پڑتا ہے، روزے کا اثر اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے، انسانی نفس کا جو روز کا کھانے پینے کا معمول ہوتا ہے، اس سے روزے کی وجہ سے زندگی کا روٹین بالکل بدل چکا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے کبھی کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ سکتا ہے، انسان کسی ایسی چیز کا ارتکاب کرسکتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو، بلکہ خود اس کے اپنے نفس ومزاج کے خلاف ہو، اگرچہ انسان سنجیدہ طبیعت اور مزاج ہی کا کیوں نہ ہو، مگر غیض وغضب کی حالت میں اس سے غیر متوقع حرکت کے سرزد ہوجانے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس حالت میں انسان کی دواء سوائے غضب اور غصہ پیدا کرنے والے اسباب سے حفاظت کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، اور جو آدمی جھگڑے لڑائی پر آمادہ ہو اس کے لئے یہ کہے کہ بھائی میں روزے سے ہوں اور کچھ نہیں، نیز اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ آدمی کھانا پینا جو حلال چیز ہے اس سے دن بھر رکا رہے اور حرام چیز سے روزہ افطار کرے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جن کا روزہ سوائے بھوک اور پیاس کے اور کچھ نہیں ہے۔

(کم من صائم لیس له من صیامه إلا الجوع والعطش)

یہ ایسے ہی لوگوں کیلئے کہا گیا ہے جو دن بھر کھانے پینے سے تو رکا رہے، لیکن چغلی، غیبت اور دوسری چیزوں کے معاملہ میں بالکل مطلق العنان ہو۔

سابعاً:

یہ کہ ہر حال میں روزہ دار اللہ سے لو لگائے رکھے اور مراقب رہے، اس لئے کہ اللہ سے لو لگانے کی صفت اللہ کی معرفت رکھنے والوں اور اللہ سے ملنے کی امید رکھنے والوں کی

ہوتی ہے، یہی دراصل تقوی اور مراقبہ کا خلاصہ اور فلسفہ ہے، یہی وہ مقام ہے رضا کا جہاں بندہ اللہ کے نور سے مانوس ہوتا ہے، اپنی معرفت اور علم کے نور سے محظوظ ہوتا ہے، اب روزہ داروں کیلئے سوچنے کا مقام ہے کہ کہاں ہے وہ رضائے الٰہی کا مقام ومرتبہ جسے تلاش کرے، حقیقی روزہ تو دل کا روزہ ہے، جس کا جلوہ افطار سے ظاہر ہوتا ہے، اور جب افطار کے وقت راحت وسکون اور قلبی مسرت سے لطف اندوز ہوتا ہے، تو ایسا لگتا ہے کہ وہ رب ذوالجلال کی رویت سے شرف یاب ہو رہا ہے۔

☆☆

رمضان کریم کی خیر و برکت

● مترجم: مفتی نادر القاسمی

(عربی سے اردو)

رمضان المبارک کا استقبال ہم کیسے کریں؟

رمضان المبارک کے استقبال کا طریقہ یہ ہے کہ اس شہر مبارک کی آمد اور اس ماہ مبارک کے میسر ہونے پر سب سے پہلے ہم رب ذوالجلال کی حمد وثنا کریں، اس ذات باری کا شکر بجالائیں اور اس عظیم نعمت کے ملنے پر ہم اپنے دل میں فرحت وانبساط کی لذت محسوس کریں، اور اب تک جو کوتاہیاں ہم سے سرزد ہوئی ہیں، اور جانے انجانے میں معاصی اور گناہ ہم سے ہوگئے ہیں ان سے توبہ واستغفار کریں اور اللہ سے مکمل لولگانے کا عزم بالجزم کرلیں۔

ہر طرح کی ظلم وزیادتی سے خود کو دور رکھنے کا تہیہ کریں اور دوسروں کے حقوق جو ہمارے اوپر ہیں انھیں ادا کریں، اور ایام رمضان میں شب وروز اصلاح اور خیر کے کاموں کا خود کو عادی بنائیں اگر یہ احساسات ہمارے اندر پیدا ہوگئے تو یقیناً رمضان کے آنے والے دنوں کی خیر وبرکت کے مستحق بھی ہم ہوں گے اور ہر کام ہمارے لئے آسان سے آسان تر ہوتا چلا جائے گا۔

اس مبارک وعظیم ماہ کی آمد پوری امت کیلئے سامان مبارک بادی ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس ماہ مبارک کے آغاز پر ہم تمام مشرق ومغرب کے مسلمانوں کو اس کی مبارک

باد پیش کریں، اور بتائیں کہ یقیناً یہ عمل صالح میں اضافہ کیلئے سنہری موقع ہے، اور رمضان اللہ سے لولگانے والوں کیلئے بہترین لمحات ومواقع (Opportunities) ہیں، اس مبارک موقع پر بھلا کیسے ایک مومن بندہ جنت کے دروازوں کے کھلنے سے خوشی ومسرت اور فرحت وانبساط محسوس نہیں کرے گا؟ اور کیسے اللہ کی طرف جھکنے والا ایک بندہ جہنم کے دروازوں کے بند ہونے پر مسرور نہیں ہوگا؟ کیا ہی خوب لمحات ہیں یہ، ان کی لطف اندوزی سے کوئی محروم القسمت انسان ہی محروم ہوسکتا ہے، یقیناً خوشخبری ہے مسلمانوں کیلئے اس ماہ صیام کی آمد، فرحت وانبساط کے اس پر بہار موقع پر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو تروتازہ اور باہمت محسوس کریں، نہ کہ رمضان کے روزہ کو گرانبار اور ثقیل اور ماہ صیام کو ایک لمبی مدت کا بوجھ باور کریں، اور روزے میں کسی بھی قسم کی کمی پیدا کرنے والے امور سے خود کو بچانے اور ظاہری ومعنوی طور پر روزے کو توڑنے والی چیزوں سے اجتناب کرنے کا حتمی فیصلہ کریں، یہ ہے دراصل استقبال رمضان کا صحیح مفہوم ومطلب۔

رسول کریم ﷺ کا صحابہ کرام کو رمضان کی بشارت دینا:

روایات سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ اس ماہ مبارک کی آمد کی خوشخبری صحابہ کرام کو دیا کرتے تھے، اور بتاتے تھے کہ دیکھو یہ وہ مہینہ ہے جس میں جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں، اور شیاطین قید کردئے جاتے ہیں، اور یہ اس لئے ہوتا ہے، تاکہ بندہ مومن اور روزہ داروں کو مکمل اللہ سے لولگانے میں کوئی روکاوٹ پیدا نہ ہو۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، اور پورے مہینے کھلے رہتے ہیں اور جب مہینہ ختم ہوتا ہے تب بند کئے جاتے

ہیں، اور جہنم کے سارے دروازے بند کرئے جاتے ہیں اور مہینہ ختم ہوتا ہے تب ہی کھلتے ہیں، اور مردود شیاطین باندھ دئے جاتے ہیں، اور ہر افطار کے وقت جہنم سے آزادی کا اللہ تعالیٰ خاص اہتمام کرتا ہے اور وہ لوگ جس پر جہنم واجب ہوچکی ہوتی ہے ان کو جہنم سے آزاد کرتا ہے:

(فعن عائشة رضی اللّٰه تعالیٰ عنها قالت: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: إذا دخل رمضان فتحت أبواب الجنان كلها، فلم يغلق منها باب إلى آخر الشهر، وغلقت أبواب النار فلم يفتح منها باب إلى آخر الشهر، وسلسلت مردة الشياطين، ولله عتقاء عند وقت كل فطر يعتقهم من النار) (المعجم الأوسط للطبرانی ۴۵۱/۱۷).

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ رمضان کی آمد کے موقعہ پر فرمایا کہ تمہارے لئے رمضان ایسا برکت کا مہینہ آچکا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ تم سب کو اس کے ذریعہ ڈھانپ لیتا ہے، رحمت نازل فرماتا ہے، گناہوں کو معاف کرتا ہے، اور اس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں تمہارے ایک دوسرے سے عبادت میں سبقت لے جانے اور تنافس کے منظر کو دیکھتا ہے، اور تمہارے بارے میں ملائکہ سے فخر ومباہات کا اظہار کرتا ہے، اس لئے تم اپنی ذات سے اللہ تعالیٰ کو اچھی چیز دکھاؤ، یقیناً کوئی بد بخت ہی اس ماہ میں رحمت خداوندی سے محروم رہ سکتا ہے۔

(عن عبادة بن الصامت رضی اللّٰه عنه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: يوماً و حضر رمضان "أتاكم رمضان شهر بركة يغشاكم اللّٰه فيه، فينزل الرحمة و يحط الخطايا و يستجيب فيه الدعا، ينظر اللّٰه تعلیٰ إلى تنافسكم فيه و يباهي بكم فأروا اللّٰه من أنفسكم خيرا، فإن الشقي من حرم فيه رحمة اللّٰه عزو جل) (الترغيب والترهيب).

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیاطین اور مردود جن قید کردئے جاتے ہیں، جہنم کے سارے دروازے بند کردئے جاتے ہیں، کوئی دروازہ اس کا کھلا نہیں رہتا، اور جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، اور کوئی بھی دروازہ بند نہیں رہتا، اور ایک آواز دینے والا آواز دیتا ہے، اے خیر کے طلب گارو! تمہارا استقبال ہے، اے شر کے طالبو! تمہارے لئے محرومی ہے، آج کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص جہنم سے آزادی کا پیکیج ہے اور یہی کاروائی رمضان کی ہر رات جاری رہتی ہے۔

(عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: إذا كان أول ليلة من شهر رمضان صُفِّدَت الشياطين و مردة الجن غلقت أبواب النار فلم يفتح منها باب، و فتحت أبواب الجنة، فلم يغلق منها باب و ينادی مناديا يا باغي الخير أقبل، و يا باغي الشر أقصر ولله عتقاء من النار و ذلک كل ليلة) (سنن الترمذی ۱۰۳/۳).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت مروی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے پورے ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردئے گئے۔'' **من صام رمضان ایمانا و احتسابا فقد غفرله ماتقدم من ذنبه**'' (بخاری ومسلم)۔

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کے نیک اعمال بغیر مکمل احتساب اور صدق نیت کے نہ تو قبول ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کے بغیر اللہ تعالیٰ اس کا تزکیہ فرماتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ ایک اور روایت میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کے لئے ہوتا

ہے سوائے روزے کے، روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، روزہ ایک ڈھال ہے، اس لئے تم میں کا کوئی بھی رمضان کے دن میں ہو تو اس میں کوئی بھی ناشائستہ کام نہ کرے اور نہ ہی کوئی نازیبا حرکت کا مرتکب ہو، اگر کوئی گالی کلوج کرے، یا لڑائی جھگڑے پہ آمادہ ہو تو اس سے کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک قیامت کے دن مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہوگی، روزے دار کو دو فرحتیں میسر ہوتی ہیں، ایک جب وہ افطار کرتا ہے تو رو روزہ افطار سے، اور دوسرے جب وہ اپنے رب سے جا ملے گا تو اپنے روزے کی وجہ سے انبساط کی لذت محسوس کرے گا۔

(عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم: قال اللّٰه عزوجل: كل عمل ابن آدم له، إلا الصيام، فإنه لی و أنا أجزی به، والصيام جنة، فِإذا كان يوم صوم أحدكم فلا يرفث يومئذ ولا يسخب، فإن سابّه أحد أوقاتله فليقل إنی امرؤ صائم، والذی نفس محمد بيده لخلوف فم الصائم أطيب عند اللّٰه يوم القيامة من ريح المسک، وللصائم فرحتان يفرحهما إذا أفطر فرح بفطره، وإذا لقی ربه فرح بصومه) (مسلم ۶/۱۷۱).

زیادہ سے زیادہ عبادات کی کوشش کرنا:

اس ماہ کریم میں مسلمانوں کیلئے خوب سے خوب اور زیادہ سے زیادہ عبادات کی کوشش کرنے کو نہ صرف یہ کہ شریعت نے جائز کہا ہے، بلکہ اس پر ابھارا ہے، زیادہ نوافل کا اہتمام کرنا، غور وفکر کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کرنا، تسبیحات اور حمد وثنا کا اہتمام کرنا، تکبیر و استغفار اور دعاؤں میں مشغول رہنا، امر بالمعروف، یعنی لوگوں کو خیر کی دعوت دینا، منکرات

سے بچنے کی تلقین کرنا، لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا، فقراء اور مساکین کے ساتھ ہمدردی کرنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، عزیز واقارب کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، پڑوسیوں کا اکرام کرنا اور مریضوں کی عیادت کرنا، اسی طرح دیگر نیک کاموں میں زیادہ سے زیادہ مصروف رہنا چاہئے'' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری دن ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: لوگو! تمہارے اوپر ایک عظیم مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے، جو بڑا مبارک ہے، اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار راتوں سے افضل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس ماہ کے روزے فرض قرار ادئے ہیں، اور اس کی راتوں کو نوافل کے ذریعہ آباد رکھنے کو مستحب اور مندوب قرار دیا ہے، اس مہینہ میں خیر کے ذریعہ اللہ کی قربت حاصل کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے غیر رمضان میں فرض ادا کرنے والا، اور ایک فرض ادا کرنے والا غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرنے والے کے برابر ہے، یہ صبر و ضبط کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے، یہ ہمدردی ومواخات کا مہینہ ہے، یہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کی روزی میں اللہ تعالیٰ اضافہ فرمادیتا ہے، جو شخص اس ماہ میں کسی روزہ دار کو افطار کراتا ہے، تو یہ افطار کرانا اس کے گناہوں کے معافی اور جہنم سے اس کی گردن آزاد کرانے کا ذریعہ ہوتا ہے، اس کے لئے بھی اتنا ہی اجر مقرر ہوتا ہے جتنا روزہ دار کیلئے ہوتا ہے، اور بغیر کسی کمی کے، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم میں سے تو کسی میں اتنی حیثیت نہیں ہے کہ جو کسی روزہ دار کو افطار کرا سکے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس آدمی کو بھی عطا فرماتا ہے جو کسی کو ایک کھجور یا پانی اور دودھ کے ایک گھونٹ سے افطار کرادے، یہ وہ مہینہ ہے جس کا پہلا عشرہ رحمت کا ہے، اور درمیانی عشرہ مغفرت کا ہے، اور آخری ہفتہ جہنم سے آزادی کا ہے، جو شخص اپنے غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ اس ماہ مبارک میں نرمی کا برتاؤ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا اور اسے جہنم سے گلو خلاصی دے دے گا، اس ماہ عظیم میں چار چیزیں ایسی ہیں جن کا کثرت سے اہتمام کرنا چاہئے،

جن میں دو چیزیں ایسی ہیں جن سے اللہ کی رضا نصیب ہوتی ہے، اور دو چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان بے نیاز نہیں ہوسکتا، جو دو چیزیں رب العالمین کی خوشنودی کی ہیں، ان میں ایک ہے کلمہ شہادت ''**لا الہ إلا اللہ محمد الرسول اللہ**'' کا کثرت سے ورد اور دوسرے کثرت سے اللہ سے مغفرت طلب کرنا اور معافی مانگنا۔ اور دو چیزیں جن سے انسان بے نیاز نہیں ہوسکتا ان میں سے ایک ہے اللہ سے جنت کا سوال کرنا اور جہنم سے پناہ چاہنا، رمضان میں جو شخص کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کھانا کھلانے کا اہتمام کرے گا اللہ تعالیٰ حوض کوثر سے اسے ایسی جام پلائے گا کہ اسے کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔'' (صحیح ابن خزیمہ ۷/۱۱۵)

رمضان میں آپ ﷺ کی طرف سے بعض خصوصی ہدایتیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی کیفیت رمضان میں دوسرے مہینوں کے مقابلہ بالکل مختلف ہوتی تھی، اور تقرب الی اللہ، عبادت و ریاضت کا یوں تو ہر لمحہ اہتمام رہتا تھا، مگر ظاہری اعتبار سے رمضان میں اللہ کی طرف سے خصوصی ہدایت اور لوگوں کی تعلیم اور رغبت میں اضافہ کے پیش نظر اس کا زیادہ مظاہرہ ہوتا تھا، اور اس بات کو ظاہر کرنے کیلئے کہ رمضان کے شب و روز کو اللہ تعالیٰ نے فضیلت و برتری میں دوسرے ماہ سے ممتاز رکھا ہے، اور جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے کوئی گناہ اور خطا آپ ؐ کے پاس سے بھی نہیں گذرتی تھی، مگر پھر بھی آپ ؐ عبادات، نوافل اور قیام لیل میں امت کے افراد سے سب سے زیادہ مشغول و مصروف رہتے تھے۔

سخاوت میں اضافہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تو تھے ہی، مگر رمضان میں اس میں مزید اضافہ ہوجاتا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ

''آپ ؐ یوں تو دنیا کے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، مگر رمضان میں آپ ؐ اور سخی ہوجاتے تھے بالخصوص جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ سے ملاقات کرتے، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا رمضان کی ہر رات میں آپ ﷺ سے ملاقات کا معمول رہتا اور قرآن کریم کے درس اور تعلیم کا سلسلہ رہتا تھا، اور جب حضرت جبرئیل کی ملاقات سے فارغ ہوتے تو آپ ﷺ چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوجاتے، یعنی جس طرح جب ہوا چلتی ہے تو دنیا کی ہر شئی کو فیضیاب کرتی اور تازگی فراہم کرتی ہوئی گذرتی ہے، ایسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت ہر مخلوق اور ہر انسان کیلئے عام ہوتی تھی، حدیث کے الفاظ اس طرح ہے:

(عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: کان من أجود الناس، وأجود مایکون فی رمضان، حین یلقاہ جبرئیل، یلقاہ کل لیلة یدارسه القرآن، فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین یلقاہ جبرئیل أجود من الریح المرسلة) (مسند احمد ۷/۲۶۱).

علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ آپ ؐ رمضان کے مہینہ میں رشد و ہدایات کی مکمل تصویر ہوتے تھے، اور آپ ؐ کی ہدایات بھی کامل مقاصد کے حصول میں (بھرپور اور عظیم، لوگوں کیلئے نہایت ہی آسان مختلف عبادتوں میں کثرت پر ابھارنے والی اور مکمل ہوتی تھیں) حضرت جبرئیل آپ ؐ سے رمضان میں قرآن کی درس و تدریس اور مکمل سننے کا اہتمام کرتے تھے، اور جب جبرئیلؑ سے ملاقات ہوتی تو خیر کے معاملہ میں بہنے والی ہواؤں سے بھی زیادہ سخاوت کا دریا آپ ؐ کی ذات سے رواں ہوجاتا تھا، اور وہ صدقات و احسان، تلاوت قرآن، نماز، ذکر و اذکار اور اعتکاف کی شکل میں سامنے آتا تھا، اور رمضان کے پورے مہینہ کو دوسرے مہینوں کے مقابلہ عبادت کیلئے خصوصیت کے ساتھ، خاص فرما لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ۲۴ گھنٹہ کا ہر لمحہ عبادت میں مشغول ہوتا تھا، اور صحابہ کو صوم وصال سے منع

فرماتے تھے، اور جب صحابہ عرض کرتے کہ حضور آپ تو مسلسل روزہ سے ہوتے ہیں تو آپ ؐ فرماتے کہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں، میں رات کو سوتا بھی ہوں، اور مزید یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی میں ہوتا ہوں، مجھے کھلایا بھی جاتا ہے، اور پلایا بھی جاتا ہے۔'' (زاد المعاد ۲/۳۰)۔

(عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یفطر علی رطبات قبل أن یصلی، فإن لم تکن رطبات فعلی ثمرات، فإن لم تکن حسا حسوات من ماء) (ابوداؤد ۳۰۶/۲)۔

(حضرت انس بن مالک سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ ؐ چند تازہ کھجوروں سے افطار کیا کرتے تھے، نماز مغرب سے قبل، اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو پھر سوکھی، اگر وہ بھی نہ ہوتے تو شوربے کے چند گھونٹ، اگر وہ بھی نہ ہوتے تو پانی کے چند گھونٹ سے)۔

جہاں تک سحری میں تاخیر کی بات ہے تو سحری اور اذان فجر کے درمیان تھوڑا ہی وقفہ ہونا چاہئے، چنانچہ حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سحری فرمائی اور جب دونوں سحری سے فارغ ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کیلئے روانہ ہوگئے، اور نماز پڑھی، میں نے حضرت انس ؓ سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زید ؓ کے سحری سے فارغ ہونے اور نماز میں مشغول ہونے میں کتنا فرق رہا ہوگا تو انہوں نے فرمایا کہ بس اتنا ہی جتنے میں آدمی پچاس قرآنی آیات کی تلاوت کرلے''۔

(عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ أن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تسحرا فلما فرغا من سحورھما قام نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلی الصلاۃ، فصلی، فقلنا لأنس کم کان بین فراغھما من سحورھما و دخولھا فی الصلاۃ؟ قال: کقدر مایقرأ الرجل خمسین آیۃ) (بخاری: ۲۹۸/۴)۔

حضرت امام نووی ؒ کہتے ہیں کہ اس روایت میں سحری کے نماز فجر سے کچھ پہلے تک تاخیر کرنے تک کی ترغیب کا پتہ چلتا ہے۔ (شرح نووی علی مسلم: ۷۴/۴)۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اذان کے بعد اور نماز فجر سے پہلے جماعت کھڑی ہونے تک سحری کرنے کی اجازت ہے۔ بلکہ اذان فجر تک سحری کو مؤخر کرنا مستحب ہے، دیہی علاقوں میں لوگ خاص طور سے جلدی سحری کرلیتے ہیں اور پھر گھنٹوں بعد فجر کی اذان ہوتی ہے، یہ طریقہ سحری میں بیان کردہ، تاخیر سنت کے خلاف ہے۔

افطار کے وقت دعاء کی ہدایت:

افطار کے وقت دعاء کا اہتمام کرنا چاہئے، افطار سے پہلے بھی اور افطار کے بعد بھی، چنانچہ ایک روایت میں ارشاد نبوی ؐ ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ روزہ دار کیلئے افطار کے وقت کی وہ دعاء ہے جو رد نہیں ہوتی، ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے سنا جب وہ افطار کرتے تو کہتے: اے اللہ ہم تیری اس رحمت کا سوال کرتے ہیں جو ہر چیز کیلئے وسیع ہے، کہ میری مغفرت فرمادیجیو:

(فعن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أن للصائم عند فطرہ لدعوۃ ماترد، قال ابن أبی ملیکۃ، سمعت عبداللہ بن عمرو یقول إذا أفطر: اللھم إنی أسالک برحمتک التی وسعت کل شی أن تغفرلی) (سنن ابن ماجہ، والمستدرک علی الصحیحین: ۲۶/۴)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم افطار کے وقت فرمایا کرتے تھے: پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہوگیا انشاءاللہ:

"کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم إذا أفطر قال: ذهب الظمأ و ابتلت العروق و ثبت الأجر إن شاء اللّٰہ" (ترمذی ۵/ ۳۰۸)۔

اور "ابوداؤد" کی روایت میں ہے کہ حضرت معاذ بن زہرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس یہ بات پہونچی ہے کہ نبی صلی اللہ جب افطار فرماتے تو کہتے: "اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا اور تیری ہی دی ہوئی رزق سے افطار کیا:

(عن معاذ بن زهرة رضی اللہ عنه أنه بلغه أن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم كان إذا افطر قال: الهم لک صمت و علی رزقک افطرت) (ابوداؤد:۶/ ۳۰۹)۔

سحری پر آمادہ کرنا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو رمضان میں سحری کرنے کی ترغیب دیتے تھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تسحروا فإن فی السحور بركة " (سحری کرنے کا اہتمام کیا کرو، کیونکہ سحری میں برکت ہے) (بخاری ومسلم)۔

حضرت امام ابن المنذ رفرماتے ہیں کہ سحری کے مندوب اور مستحب ہونے پر علماء کا اجماع ہے، اگر کوئی شخص سحری نہ کھائے تو کوئی گناہ نہیں ہے، البتہ سحری پر اس لئے امت کو آپؐ نے ابھارا ہے، تاکہ روزہ کی حالت میں قوت باقی رہے اور نقاہت کا احساس نہ ہو، اور یہ روزے کے تحفظ وصیانت کے نقطہ نظر ہے، ورنہ سحری نہ کرنے کی وجہ سے بڑے دنوں میں ممکن ہے صحت کو خطرہ لاحق ہو اور روزہ توڑنے کی نوبت آجائے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سحری کے ذریعہ روزے کو تقویت دو اور رات کے قیلولہ اور آرام کے ذریعہ قیام لیل اور تراویح کو تقویت دو:

(عن ابن عباس رضی اللہ عنه عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أنه قال: استعينوا بطعام السحر علی صيام النهار، وبالقيلولة علی قيام الليل)۔

اسی وجہ سے آپؐ نے سحری کو برکت والی غذا قرار دیا اور فرمایا آؤ بابرکت کھانے کی طرف:

(عن العرباض بن سارية قال: دعانی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم إلی السحور فی رمضان، فقال: هلم إلی الغذاء المبارک)(ابوداؤد۶/ ۲۸۹، شرح ابن بطال ۷/ ۵۱)۔

افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کی ہدایت:

افطار میں جلدی کرنا چاہئے، یہ بہتر اور خیر کی بات ہے، جولوگ افطار میں تاخیر کرتے ہیں اور فقہ جعفری وغیرہ کا حوالہ دیکر دس منٹ تاخیر سے افطار کو بہتر قرار دیتے ہیں یہ بالکل ثابت شدہ صحیح روایات کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "افطار میں جلدی کرنے والے لوگ ہمیشہ خیر پر باقی رہیں گے، چنانچہ "صحیح بخاری" میں ہے:۔

(عن سهل بن سعد أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: لا يزال الناس بخير ماعجلوا الفطر)(بخاری ۷/ ۵۹)۔

اس حدیث کی شرح میں امام نووی لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں غروب آفتاب کے بعد افطار میں جلدی کرنے کی تحریض وترغیب دی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کے تمام معاملہ خیر پر اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک اس سنت کی یہ قوم حفاظت کرتی رہے گی، اور اگر اس میں تاخیر کردے گی تو یہ اس کے فساد اور بگاڑ میں مبتلا ہوجانے کی علامت ہوگی (شرح نووی علی مسلم ۴/ ۷۵)۔

ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند تازہ کھجوروں سے نماز مغرب سے قبل قبل افطار فرمالیا کرتے تھے، اور اگر رطب، یعنی تازہ کھجوریں نہیں ہوتیں تو پھر خشک کھجور سے افطار کرلیتے تھے، اور اگر وہ بھی نہیں ہوتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار لیتے تھے۔(ابوداوٗد ۶/ ۳۰۶)۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تازہ کھجور سے افطار کرنا مستحب ہے۔(تحفۃ الاحوذی ۲/۲۳۴)۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ جب روزہ دار افطار کرے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ افطار کے وقت جو بھی دعائیہ کلمات اسے آتے ہوں ان کے ذریعہ اللہ سے دعاء کرے۔

افطار سے پہلے دعاء:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین اشخاص ایسے ہیں جن کی دعاء اللہ تعالیٰ رد نہیں فرماتا ہے ایک روزہ دار یہاں تک کہ افطار کرلے، دوسرے انصاف پرور اور عادل خلیفہ اور امام اور تیسرے مظلوم، اللہ تعالیٰ اس کی دعاء کو بادلوں سے اوپر لے جاتا ہے اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے: میری عزت وشرافت کی قسم میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ اگرچہ کچھ دیر بعد ہی سہی:

(عن أبی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: ثلاثة لا ترد دعوتهم: الصائم حتی يفطر، والإمام العادل، و دعوة المظلوم يرفعها فوق الغمام ويفتح لها أبواب السماء، ويقول الرب: وعزتی لأنصرنک ولو بعد حين)(ابوداوٗد:۱۲/ ۲۵)۔

اس سے مراد وہ کامل روزہ دار ہے جس نے اپنے اعضاء کو منافی اور منکر چیزوں سے

بچایا ہو تو اس کی دعاء جسمانی پاکیزگی اور نفسانی خواہشات کی مخالفت کی وجہ سے قبول کی جاتی ہے۔(فیض القدیر:۳/ ۲۹۷)۔

رمضان کے آخری عشرہ کی ہدایت:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری عشرہ رمضان کا داخل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات عبادت کا اہتمام فرماتے اور اہل وعیال کو جگاتے اور اپنا ازار کس لیتے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کا جتنا اہتمام کرتے، اتنا دوسرے عشروں میں اہتمام نہیں فرماتے، گویا سب سے زیادہ اہتمام کرتے تھے، چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے:

(فعن عائشة رضی الله عنها قالت: كان رسول الله صلی الله عليه وسلم إذا دخل العشر أحيا اليل و أيقظ أهله وجد و شدالمئزر) (مسلم:۶/ ۹۵) و فی روایہ: **(كان رسول الله صلی الله عليه وسلم يجتهد فی العشر الأواخر مالا يجتهد فی غيره)**(مسلم:۶/ ۹۶)۔

امام نووی کہتے ہیں کہ رمضان کے آخری عشرہ میں زیادہ سے زیادہ عبادات کرنا اور راتوں کو عبادات سے آباد رکھنے کا اس روایت سے مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے۔(شرح نووی: ۴/ ۲۰۸)۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عبادت ہے، ظاہر ہے کہ ہمارے اوپر لازم وضروری یہی ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کریں، اسی کو لازم پکڑیں، عبادتوں میں انھیں کو اختیار کریں، اور انھیں کے ذریعہ اللہ رب العالمین کا تقرب حاصل کریں، ہم تو بندے ہیں محتاج ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ ہماری عبادتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات تک نہیں پہنچ سکتیں، تاہم ہمیں اپنے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا ہی حکم دیا گیا ہے اور اسی کے ذریعہ ہمیں اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے، اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری نجات صرف اور صرف اپنے رسول کی اتباع اور پیروی میں ہے، اور ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہی عبادت کرنے اور زندگی گذارنے میں ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے اوپر میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو اختیار کرنا لازم ہے، تم انھیں مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، اور انھیں اپنے دانتوں سے دبالو۔

"**قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: فعلیکم بسنتی و سنتة الخلفاء الراشدین المھدین تمسکوا بھا و عضوا علیھا بالنواجذ** "ابوداؤد: ۲/۲۱۱)۔

☆☆

رمضان کریم میں دعاؤں کا اہتمام

● ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی
(عربی سے اردو)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعاء کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور ہماری دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"**ادعونی استجب لکم** "(غافر:۶۰) (تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"**واذا سألک عبادی عنی فإنی قریب أجیب دعوة الداع إذا دعانِ فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون** "(غافر:۶۰)۔

(اور جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی بھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں، اس لئے لوگوں کو بھی چاہئے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں، یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے)۔

ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کی دعاء دربار ایزدی سے رد نہیں ہوتی، ایک انصاف پرور امام (خلیفہ) دوسرے روزہ دار جب وہ افطار کیلئے بیٹھے اور تیسرے مظلوم۔ (ترمذی: ۸۶/۹)۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات واحادیث ہیں جن میں دعاء کی اہمیت، فضیلت اور اس کی دینی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے، دعاء عبادات کی روح ہے، جو بندے اور رب کے درمیان گہرے رشتہ کی تعمیر کرتی ہے، اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ بندہ ہر حال میں اپنے رب کا محتاج ہے، رمضان المبارک میں دعاء کا ایک خاص مقام ومرتبہ ہے، روزہ دار کی دعاؤں کی قبولیت مسلم ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں کثرت سے دعاؤں کا اہتمام کرتے تھے، اور امت کو اس ماہ مبارک میں دعاء کی فضیلت بھی بتاتے اور اس کی تاکید بھی فرماتے تھے۔

دعاء کی فضیلت:

دعاء کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ دعاء کو بھی شریعت میں عبادت کا مقام حاصل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد ہے کہ دعاء بھی عین عبادت ہے اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیت کریمہ ”**قال ربكم ادعوني استجب لكم... الخ**“ (کہ تمہارا رب ارشاد فرماتا ہے کہ تم مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا اور تم کو دوں گا) فرمائی چنانچہ ترمذی کی روایت ہے:

”**الدعاء هو العبادة وقرأ: ”قال ربكم ادعوني استجب لكم...(إلى قوله) وآخرين**“ (سنن ترمذی:۱۰/ ۲۲۹)۔(دعاء عبادت ہے، اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: تمہارے رب کا کہنا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا)۔

دعاء عبادت کا مغز ہے:

ترمذی شریف ہی کی روایت ہے کہ دعاء عبادت کا مغز ہے۔(ترمذی:۱۱/ ۲۲۰)۔

دعاء کرنے والے کیلئے اللہ کی محبت:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعاء سے زیادہ مکرم ومحترم کوئی اور چیز نہیں ہے، اس لئے کہ دعاء

بھی دین کا ایک ستون ہے، اس لئے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی کرے اور اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک و برباد کردے چنانچہ حدیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اس کا فضل مانگتے رہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس سے مانگا جائے اور افضل ترین عبادت، اللہ کی وسعت ورحمت کا انتظار ہے۔

(أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: سلوا الله من فضله، فإن الله عز وجل يحب أن يسأل و أفضل العبادة انتظار الفرج)(المعجم الكبير للطبراني: ۸/ ۴۳۱)۔

ایک روایت میں یہ بھی ارشاد ہے کہ دعاء میں عاجزی اور گریہ زاری کرنے والے کو پسند کرتا ہے، چنانچہ ”شعب الایمان“ میں ہے:

(إن الله يحب الملحين في الدعاء)(شعب الایمان:۲/ ۱۶۷)۔

دعاء سے رک جانا غضب الٰہی کو دعوت دیتا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس سے خفا ہوتا ہے اور اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے، چنانچہ ترمذی کی روایت ہے:

(من لم يسأل الله يغضب عليه)(ترمذی:۱۱/ ۲۲۳)۔

جس پر بلا نازل ہوچکی اور جس پر ابھی نازل نہ ہوئی ہو دونوں کیلئے دعاء مفید ہے:

دعاء اس بلا کو بھی دور کرتی ہے جو نازل ہوچکی ہے، اور اس بلا کو بھی روک دیتی ہے جو نازل ہونے والی ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اللہ کے فیصلوں کو صرف دعاء ہی روکنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، ترمذی میں روایت ہے:

”**لا يرد القضاء إلا الدعاء**“(ترمذی:۸/ ۲۷)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ دعاء قضاء اور قدر کو ٹال سکتی ہے، چنانچہ دعاء

قنوت میں ہے:

”وقنی شر ماقضیت“(ابوداؤد:۲۱۰۴)۔

اگر دعاء قدر وقضا کے ٹالنے کا سبب نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت نہ دیتے اور نہ ہی امت کی اس جانب رہنمائی فرماتے، اس لئے جو شخص مصیبت کے وقت چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کردے تو اسے چاہئے کہ بدحالی اور مصیبت کی حالت میں عاجزی کے ساتھ دعاء میں مشغول رہے، اس لئے کہ جب کوئی بندہ مومن اللہ سے دعاء کرتا ہے اور اس میں کوئی بری چیز نہیں مانگتا اور نہ قطع رحمی کی کوئی چیز اس میں ہوتی ہے تو اس میں تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور حاصل ہوتی ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ جلد اس کی دعاء قبول کرلیتا ہے۔

(۲) یا اس کے لئے اللہ تعالیٰ سامان آخرت کے طور پر ثواب کا ذخیرہ کردیتا ہے۔

(۳) یا اس جیسی ناخواہی چیز کو دور کردیتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کوئی مسلمان جب کوئی دعاء کرتا ہے اور اس میں کسی بری چیز کا مطالبہ نہیں ہوتا، یا اس میں کسی رشتہ کو ختم کرنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزیں ضرور عنایت فرماتا ہے: یا تو فوراً اس کی دعاء قبول ہوجاتی ہے، یا آخرت کیلئے اسے ذخیرہ کردیتا ہے، یا اس کی اس جیسی کسی آنے والی مصیبت کو ٹال دیتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا ہم چاہے جتنا مانگیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ دینے والا ہے، چنانچہ مسند احمد میں ہے:

(یقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ما من مسلم یدعو بدعوۃ لیس منہا إثم ولا قطعیۃ رحم إلا اعطاہ اللہ بہا إحدی ثلاث: إما أن تعجل لہ دعوتہ، اما أن یدعوہا لہ فی الآخرۃ، وإما أن یصرف عنہ من السوء مثلہا، قالوا: إذا تکثر، قال: اللہ أکثر)۔(مسند احمد: ۲۲/۲۵۴)۔

دعاء کے نتائج:

دعاء کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ امید وکشادگی کی راہ اور رحمت کے دروازے کو کھولتی ہے، جو آدمی دعاء کے دروازے کھولتا ہے، اس کی مٹھاس چکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے خیر، برکت، رحمت اور قبولیت کے دروازے وا کرتا ہے۔

دعاء کے آداب:

دعاء کے کچھ آداب ہیں اور دعاء کرنے والوں کو چاہئے کہ ان آداب کا خیال رکھیں، جو آدمی ان آداب سے محروم ہوگا وہ توفیق ایزدی اور عنایت ربانی سے بھی محروم ہی رہے گا۔

۱۔ حلال اور طیب کا التزام اور حرام سے اجتناب:

اکل حلال کا اہتمام اور حرام خوری سے کلی اجتناب، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: آدمی لمبی مسافت طے کرکے آیا ہے، جس کے بال پراگندہ ہیں، اور وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے، اور کہتا ہے اے میرے رب، اے میرے رب، حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا لباس حرام ہے، اور اسے غذا بھی حرام ہی کی دی گئی ہے، بھلا ایسی صورت میں اس کی دعاء کیسے قبول ہوگی، اور حضرت سعد بن وقاصؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے سعد اپنے کھانے کو پاکیزہ رکھو، تم مستجاب الدعوات ہوجاؤ گے۔**(فقد ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الرجل یطیل السفر أشعث و أغبر یمدیدیہ إلی السماء یا رب یارب، و مطعمہ حرام، ومشربہ حرام و ملبسہ حرام و غذی بالحرام، فأین یستجاب لذلک، (ملسم: ۵/۱۹۲) وقال صلی اللہ علیہ وسلم لسعد بن أبی وقاص: یاسعد أطب مطعمک تکن مستجاب الدعوۃ) (المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۴/۲۶۱)۔**

۲۔ حمد وثناء سے دعاء کا آغاز کرنا:

دعاء کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ دعاء حمد وثنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے ساتھ شروع کی جائے، اس کے بعد اپنی حاجات کی اللہ تعالیٰ سے التجا کی جائے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز میں دعاء کرتے ہوئے سنا کہ اس نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کی اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس نے جلد بازی سے کام لیا، پھر اسے بلایا اور اس سے یا دوسرے سے فرمایا کہ جب تم میں کا کوئی شخص دعاء کرے تو اپنے رب کی کبریائی سے دعا شروع کرے، اس کی حمد وثناء کرے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، پھر اس کے بعد جو چاہے اللہ سے مانگے:

(فقد سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا يدعو فى صلاتة لم يمجّد الله تعالىٰ ولم يصل على النبى صلى الله عليه وسلم، فقال رسول اللّهِ ﷺ: ”عجل هذا، ثم دعاه. فقال له أولغيره إذا صلى أحدكم فليبدأ بتمجيد ربه جل وعزوالثناء عليه، ثم يصلّى على النبى ﷺ ويدعو بعد ما شاء)(ابوداؤد:۴/۲۸۰)۔

دعاء میں دونوں ہاتھ پھیلانا:

دعاء میں دونوں ہاتھوں کے پھیلانے میں بندے کیلئے اپنے رب کے سامنے عجز وانکساری کا اظہار بھی ہے، اور اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ہر حال میں انسان اپنے رب کا ہی محتاج ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ تمہارا رب حیّی ہے، کرم کرنے والا (کریم) ہے، وہ اپنے بندے سے اس بات پر شرماتا ہے کہ کوئی بندہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور وہ اسے خالی واپس کردے، یا یہ فرمایا کہ اسے محروم ونامراد کردے۔

(إن ربكم حيى كريم يستحى من عبده أن يرفع إليه يديه فيردهما صفرا أو قال خائبسين)(ابن ماجہ:۱۱/۳۲۸)۔

دعاء کے وقت اپنے قلب ودماغ کو حاضر اور قبولیت کا یقین رکھے:

یوں تو عام حالات میں ہمیشہ اپنے رب کے سامنے دعاء کرتے وقت اپنے دل ودماغ کو اللہ تعالیٰ کی طرف لگائے رکھے، البتہ سجدے میں دعاء کا اہتمام کرے، اس لئے اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کی سب سے موضوع ترین چیز سجدہ ہی ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، لہذا اس حالت میں زیادہ سے زیادہ دعاء کا اہتمام کرنا چاہئے: **(أقرب ما يكون العبد من ربه وهوساجد فأكثروا الدعاء)**(صحیح مسلم:۲/۲۹)۔

قبولیت کے بارے میں عجلت پسندی کا شکار نہ ہو:

دعاء کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جب یہ بات طے ہے کہ دعاء بھی عبادت، بلکہ عبادت کا مغز اور جان ہے، اور انسان اللہ کی عبادت ہی کیلئے پیدا کیا گیا ہے تو اس کے لئے یہ بالکل مناسب نہیں ہے کہ دعاء میں اکتاہٹ اور عجلت پسندی کا شکار ہو، اس لئے کہ جب آدمی عجلت پسندی سے کام لیتا ہے تو پھر اس کی دعاء قبول نہیں ہوتی، چنانچہ حدیث میں وارد ہے کہ تم میں کے ہر شخص کی دعاء قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ جلد بازی نہ کرے اور یہ نہ کہے کہ میں دعاء تو کرتا ہوں اور (برسوں سے) کررہا ہوں، مگر قبول ہی نہیں ہوتی۔

(يستجاب لأحدكم مالم يعجل، فيقول قد دعوت فلم يستجب لى)
(المؤطا لامام مالك: ۲/۱۴۷).

رمضان میں دعاء کی فضیلت:

چونکہ رمضان کریم تمام مہینوں میں سب سے افضل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اتنی

خصوصیات اور فضیلت بخشی ہے، جسے اعداد وشمار اور گنتی میں نہیں لایا جاسکتا، مگران میں سب سے اہم فضیلت یہ ہے کہ اس ماہ میں اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے، اس ماہ میں گناہ معاف ہوتے ہیں، جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند ہوجاتے ہیں، مردود شیطان قید کردئے جاتے ہیں، اسی مہینے میں وہ راتیں بھی ہیں جو ہزار مہینوں سے افضل ہیں، نیکیاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، اس میں لغزشیں کم ہوجاتی ہیں، اس میں اللہ دعائیں قبول کرتا ہے، چنانچہ ''نسائی'' کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تمہارے لئے رمضان کا مبارک مہینہ آیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تمہارے لئے فرض کئے ہیں، جس میں آسمان کے رحمت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں، شیاطین قید کردئے جاتے ہیں، اللہ کیلئے اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل اور بہتر ہے، جو اس کی برکت سے محروم کردیا گیا وہ محروم ہی رہا:

(قال رسول اللّٰہ صلی علیه وسلم: أتاکم رمضان شهر مبارک فرض اللّٰہ عزوجل علیکم صیامه تفتح فیه أبواب السماء، و تغلق فیه أبواب الجحیم، و تغل فیه مردة الشیاطین، للّٰہ فیه لیلة خیر من ألف شهر، من حرم خیرها فقد حُرِم)(النسائی:۷/۲۵۶)۔

دعاء کی قبولیت کیلئے آسمان کے دروازوں کا کھلنا:

قرآن کریم کی آیت: ''**إذا سألک عبادی**''(آیت:۱۸۶) روزے سے متعلق نازل احکام کے درمیان ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ روزہ دار مومن بندہ اپنی نیکیوں میں کثرت کرے، دعاؤں میں اضافہ کرے، اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ سے زیادہ جھکا رہے، تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ روزہ دار کی دعاء اللہ تعالیٰ رد نہیں کرتا۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اوپر رمضان کا مہینہ آیا ہے جو برکت والا مہینہ ہے، اس میں خیر وبرکت سے اللہ تعالیٰ تم کو ڈھانپ لیتا ہے، اس میں رحمت نازل ہوتی ہے، خطائیں معاف ہوجاتی ہیں، دعائیں قبول ہوجاتیں ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کو دیکھتا ہے، اور فرشتوں کے درمیان اس پر اظہار فخر کرتا ہے، اسی لئے تم بھی ہر ممکن کوشش کروکہ تم اپنی ذات سے اللہ تعالیٰ کے سامنے خیر ہی ظاہر کرو، وہی شخص اس ماہ مبارک میں رحمت خداوندی سے محروم رہتا ہے، جو نہایت ہی شقی اور بدبخت فطرت کا انسان ہو۔(مسند الشامیین للطبرانی:۹/۴۲۹)

ایک مسلمان رمضان سے پہلے رمضان کی آمد کی دعا کرتا ہے، اور رمضان آجانے کے بعد شکر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مبارک مہینہ مقدر فرمایا، اور پھر اپنی نیکیوں کی قبولیت کیلئے دعا کرتا ہے، جب رمضان کا چاند دیکھتا ہے، تب دعاء کرتا ہے، افطار کے وقت دعاء کرتا ہے، روزے کی حالت میں دعاء کرتا ہے، رات کو نوافل کے درمیان اور تراویح کے ترویحہ میں دعاء کرتا ہے، اس لئے اس مہینہ کو ''شہر الدعاء'' یعنی دعاؤں کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے، اور کہا جاسکتا ہے، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: روزہ دار کیلئے افطار کے وقت دعاء ہے،'' **اَللّٰهم إنی أسألک برحمتک التی وسعت کل شئی أن تغفرلی ذنوبی** ''(المستدرک:۴/۶۶)(اے اللہ میں تیری رحمت کا طلب گار ہوں، تیری اس رحمت کا جو ہر چیز کیلئے عام اور پھیلی ہوئی ہے، کہ تو میرے گناہوں کو معاف فرمادے اور میری مغفرت فرمادے)۔

رمضان کے استقبال کی دعاء:

رمضان کا مہینہ بندۂ مومن کیلئے بہت سی امیدوں، امنگوں اور آرزوؤں کا سامان لے کرآتا ہے، یہ وہ مہینہ ہے جس کی آمد کی ہر مومن تمنا کرتا ہے، ہمارے پیارے حبیب صلی

اللہ علیہ وسلم بھی نہ صرف یہ کہ رمضان کی آمد کی آرزو فرماتے تھے، بلکہ اپنے رب کریم سے اس ماہ مبارک کے پانے کی دعاء اور درخواست کرتے تھے، اور جب رجب کا مہینہ آتا تو فرماتے: میرے پروردگار ہمیں رجب، شعبان اور رمضان کی برکتیں عطا فرما''

(اَللّٰھم بارک لنا فی رجب و شعبان و بارک لنا فی رمضان '' (مسنداحمد۲۰۳۶م.وفی روایة: (وبلغنارمضان)شعب الایمان:۸/ ۳۳۱).

رمضان المبارک کے چاند دیکھنے کی دعاء:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ چاند دیکھتے تو فرماتے کہ اے اللہ اس مہینہ کو برکت کا، نورِ ہدایت کا، اجر وثواب کا اور باہمی عفو و درگذر کا مہینہ بنا دیجئے، اے اللہ آپ اپنے نیک بندوں کے درمیان خیر و برکت تقسیم کرنے والے ہیں، ہمارے لئے بھی اس میں سے کچھ خیر و برکت کا حصہ مقدر فرما دیجئے جو آپ اپنے نیک بندوں کے درمیان تقسیم فرمارہے ہیں، اسی طرح یہ بھی فرماتے تھے، خیر وہدایت کا چاند، خیر و برکت کا چاند، خیر و ہدایت کا چاند، میں اس پر ایمان لاتا ہوں جس نے تمہیں بنایا ہے، تین مرتبہ فرماتے تھے، اس کے بعد فرماتے: تمام تعریفیں اس ذات کیلئے ہیں جو گذشتہ مہینہ کو لے گیا اور اس مہینہ کو لایا، چنانچہ مصنف بن ابی شیبہ اور ابوداؤد میں ہے:

(کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم عند رویة الهلال: اللهم اجعله شهر بركة و نور و أجر و معافاة، اللّٰهم إنک قاسم بين عباد من عبادک فيه خيرا فاقسم لنا فيه من خير ما تقسم لعبادک الصالحين'' (مصنف ابن ابی شيبه۳/ ۹۹م و کان يقول ايضاً :هلال خيرو رشد، هلال خير ورشد أمنت بالذی خلقک ثلاث مرات ثم يقول: الحمد للّٰہ الذی ذهب بشهر كذا وجاء بشهر كذا)(ابوداؤد:۱۱/ ۲۸۶)۔

اور جب رمضان المبارک کا چاند آپ دیکھتے تو دعاء فرماتے: اے اللہ آپ نے ہمارے اوپر برکت وایمان اور سلامتی واسلام کا چاند نمودار فرمایا ہے، میرا رب اور تیرا رب اللہ ہی ہے۔

(اللهم اهله علينا باليمن والإيمان والسلامة والإسلام ربی و ربک اللّٰہ) (مسند احمد: ۳۳۲).

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چاند دیکھتے تو فرماتے: اللہ اکبر، تونے ہمارے اوپر برکت وایمان اور سلامتی واسلام کا چاند نمودار فرمایا ہے، اے ہمارے رب ہمیں توفیق عطا فرمائے اسی کی جسے آپ پسند فرماتے ہیں اور جس سے آپ راضی ہوتے ہیں، ہمارا اور تمہارا رب اللہ ہی ہے۔

(عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنهما قال: كان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ عليه وسلم إذا رأى الهلال قال: اللّٰه اكبر، اللّٰهم أهله علينا بالأمن الإيمان والسلامة والإسلام والتوفيق لما يحب ربنا و يرضی، ربنا وبک اللّٰہ) (سنن الدارمی:۵/ ۱۷۳)۔

افطار کے وقت دعاء:

افطار کا وقت بھی ان اوقات میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دعاء کی قبولیت کیلئے خاص فرمایا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہوتی ہے۔

(للصائم عند إفطاره دعوة مستجابة) (شعب الایمان للبیہقی:۸/ ۴۳۴)۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو فرماتے: پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہوگئیں اور روزہ کا اجر انشاء اللہ ثابت ہوگیا۔

(وكان رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم إذا أفطر قال: "ذهب الظمأ ابتلت العروق، و ثبت الأجر إن شاء الله) (ابوداؤد:٦/ ٣٠٨)۔

اس طرح افطار کے وقت دعاء فرماتے: اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا ۹۷اور تیری ہی دی ہوئی رزق سے روزہ افطار کیا:

(اللهم لك صمت و على رزقك أفطرت) (ابوداؤد:٦/ ٣٠٩٣)۔

اور کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے: تمام حمد وثنا اس ذات کیلئے ہے جس نے میری مدد فرمائی تو میں نے روزہ رکھا، اور رزق عنایت فرمایا تو میں نے افطار کیا۔

(الحمد لله الذى أعانني فصمت، و رزقني فافطرت) (شعب الایمان للبیہقی:۳/ ۱۰۰)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء فرماتے اے اللہ میں تیری اس رحمت کی درخواست کرتا ہوں جو ہر چیز کیلئے وسیع اور عام ہے آپ میری مغفرت فرما دیجئے۔

(اللّٰهم إن اسألك برحمتك التي وسعت كل شئى أن تغفرلى) (ابن ماجہ:۳/ ۱۷۵)۔

افطار کے وقت اجتماعی دعاء:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ جب افطار کیلئے بیٹھتے تو اپنے اہل و عیال کو بلاتے اور پھر دعاء کرتے۔

(كان ابن عمر رضى الله عنهما إذا افطر دعا أهله و ولده و دعا)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ افطار کے وقت روزہ داروں کو چاہئے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ دعاء کا اہتمام کرے، یا کسی مجلس میں افطار کیلئے حاضر ہو تو اپنے دوست و احباب کو دعوت دے اور کہے کہ یہ افطار کا وقت ہے، دعاء کی قبولیت کا وقت ہے، آئے

بارگاہ ایزدی میں دعاء کر لیتے ہیں، اس سے اجتماعی دعاء کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: افطار کے وقت ہر مومن روزہ دار کیلئے قبول کی جانے والی دعائیں ہیں، یا تو دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ اس کو عطا کر دیتا ہے جو اس نے مانگا ہے، یا آخرت کیلئے اللہ تعالیٰ اس کا ذخیرہ کر دیتا ہے۔

(وقال: إن لكل مؤمن دعوة مستجابة عند إفطاره، إما أن يجعل فى دنياه أو يدخرله فى آخرته) (شعب الایمان للبیہقی:۸/ ۴۳۴)۔

اور افطار کے وقت فرماتے اے بے پایاں مغفرت کرنے والے میری مغفرت فرما۔

''يا واسع المغفرة اغفرلى'' (شعب الایمان للبیہقی:۸/ ۴۳۲)۔

اور یہ بھی فرماتے: ''اللهم إنى اسألك برحمتك التى وسعت كل شئى أن تغفرلى'' (ابن ماجہ:۵/ ۲۹۵)۔

اس شخص کیلئے دعاء جس کے پاس افطار کرے:

حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادۃ کے پاس تشریف لے گئے، حضرت عبادۃ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں افطار کیلئے روٹی اور زیتون پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا، اور اس کے بعد فرمایا: روزہ داروں نے تمہارے پاس افطار کیا، نیک لوگوں نے تمہارا کھانا کھایا اور فرشتوں نے تمہارے لئے رحمتیں بھیجیں۔

(عن انس بن مالك أن النبى صلى الله عليه وسلم جاء إلى سعد بن عبادة' فجاء بخبز و زيت، فأكل، ثم قال النبى صلى الله عليه وسلم: أفطر عندكم الصائمون، وأكل طعامكم الأبرار، وصلت عليكم الملائكة) (ابوداؤد:۱۰/ ۳۳۹)۔

سحری میں دعاء کا اہتمام:

سحری کرنا بجائے خود کھانا بھی ہے اور خیر و برکت کی چیز بھی ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ سحری کرنے کا اہتمام کیا کرو، اس لئے کہ اس میں برکت ہے، چنانچہ ''بخاری'' کی روایت میں ہے:

(قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: ''تسحروا فإن فی السحور برکة) (بخاری: ۳/۷)۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری اور ثرید میں برکت کی دعاء فرمائی، چنانچہ مسند احمد میں ہے:

(عن ابی ھریرة رضی اللہ عنه قال: دعا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بالبرکة فی السحور و الثرید)(احمد: ۱۶/۱۵)۔

رمضان میں خفگی اور غصہ کی حالت میں دعاء:

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ روزہ ہر قسم کے منکرات اور ناشائستہ چیزوں سے بچنے کا ایک ڈھال ہے، اس لئے تم میں کا کوئی بھی شخص روزہ کی حالت میں نازیبا حرکت کا ارتکاب نہ کرے اور نہ ہی جہالت پر آمادہ ہو، اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں لڑائی مار پر اتر آئے یا گالی گلوج اور مغلظات بکنے لگے تو اسے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرے کہ بھائی میں روزے سے ہوں، بھائی میں روزے سے ہوں، بات ختم کرو، چنانچہ ''موطا امام مالک'' کی روایت ہے:

(قال رسول اللہ صلی علیه وسلم ''الصیام جنة، فإذا کان أحدکم صائما فلا یرفث ولا یجھل، فإن امرأ قاتله أو شاتمه، فلیقل إنی صائم، إنی صائم) (الموطا: ۲/۴۱۳).

شب قدر میں دعاؤں کا اہتمام:

شبِ قدر امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، ایسی بابرکت اور قدر و قیمت کی

راتیں دوسری امتوں کو نہیں ملیں، یہ وہی راتیں ہیں جن میں ہدایت و نور کی شعائیں نمودار ہوئیں، کتاب ہدایت نازل ہوئی، دنیائے انسانیت کو روحانی سکون و اطمینان کا سامان میسر ہوا، چنانچہ قرآن نے خود اس کی شہادت دی ہے:

(شھر رمضان الذی أنزل فیه القرآن ھدی للناس بینات من الھدی والفرقان)(سورہ بقرہ: ۱۸۵)۔

(ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں)۔

اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

(إنا انزلناہ فی لیلة القدر، و ماأدراک ما لیلة القدر، لیلة القدر خیر من ألف شھر)(سورہ: القدر: ۱-۳)۔

(یقیناً ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا، تو کیا سمجھا کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے)۔

نور ہدایت کی پہلی کرن اس ارشاد باری سے پھوٹی:

اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ و ربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم''(سورہ: علق: ۱-۵)

(آپ اپنے رب کے نام سے پڑھئے جس نے پیدا کیا، جس انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپ پڑھتے رہئے آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، جس انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا)۔

ان آیات میں جن سے امت مسلمہ نے علم و عرفان اور زندگی کی انمول راہیں تلاش کی، علوم و فنون پر مبنی تہذیب و ثقافت کے اصول میسّر کرے، اور اسی علمی برتری نے دوسری اقوام پر صاحبِ عز و شرف بنایا، اور اسی لئے لیلۃ القدر کی وجہ سے اس امت کو صاحب قدر و

منزلت کے وصف سے نوازا گیا ہے۔

لیلۃ القدر کو لیلۃ القرآن بھی اس لئے کہا جاتا ہے کہ نور ہدایت کی پہلی کرن اسی رات نمودار ہوئی تھی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(إنا انزلناه فی لیلة مبارکة إنا کنا منذرین، فیها یفرق کل امر حکیم) (الدخان:۳۔۴)۔

(یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں اتارا ہے، بیشک ہم ڈرانے والے ہیں، اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا)۔

اس رات کو لیلۃ السلام، یعنی سلامتی کی رات بھی کہا جاتا ہے، اس لئے اسی رات فرشتے اہل جہاں کیلئے سلامتی کا پیغام لے کر جلوہ گر ہوتے ہیں۔

اسی رات کو لیلۃ الشرف، یعنی عزت ورفعت والی رات بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ یہ راتیں امت مسلمہ کو بلندیوں تک پہونچانے والی راتیں ہیں۔

اس رات کو لیلۃ التجلی بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے روزہ دار اور راتوں کو عبادت کرنے والے بندوں پر نور وہدایت سے خوب خوب فیض یاب کرتا ہے اور تجلیات ربانی کا ظہور ہوتا ہے۔

اس رات کا ایک عمل ہزار راتوں کے عمل سے افضل ہے، اس لئے بندہ مومن کو راتوں میں زیادہ سے زیادہ عبادت وریاضت اور ذکر واذکار کی جدوجہد کرنا چاہئے، اس لئے کہ ان راتوں کو عبادتوں سے آباد کرنے، اس کو اللہ کی فرمانبرداری اور طاعت وعبادت میں گزارنے اور خوب خوب توبہ واستغفار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

(من قام لیلة القدر إیمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه) (بخاری: ۶/۴۶۸)۔

خاص طور سے لیلۃ القدر میں دعاء مانگنے کا اہتمام کرنا چاہئے اور ہر وقت زبان وقلب پر ذکر ودعا جاری رہنی چاہئے، اس کے بارے میں ہمیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بتایا ہے، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے اگر میں کسی رات کے بارے میں جان لوں کہ یہی لیلۃ القدر ہے تو اس میں کیا پڑھنے کا اہتمام کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(یا رسول اللّٰه أرایت إن علمت أی لیلة لیلة القدر ما أقول فیها؟ قال: قولی!(إنک عفو کریم تحب العفو فاعف عنی) (ترمذی:۱۱/۴۱۹)۔

یہ ایسی جامع دعا ہے کہ ہر شخص کو یاد ہونی چاہئے، اور اس کو ہمیشہ پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے، کیونکہ اس میں دین، دنیا اور آخرت کی ساری سعادتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

☆☆

۲۰ رکعات تراویح
ایک جائــزہ

● مولانا محمد شفیع قاسمی، بھٹکلی

تراویح ترویحہ کی جمع ہے۔یعنی اطمنان سے پڑھی جانے والی نماز، ہر چار رکعات کو ایک ترویحہ کہتے ہیں۔ پانچ ترویحہ یعنی بیس رکعات تراویح دس سلاموں کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وامام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ وجمہور علماء اہل سنت و الجماعت کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔

(۱) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھے رمضان المبارک میں رات کو تراویح پڑھانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگ دن میں روزہ تو رکھ لیتے ہیں، مگر قرآن (یاد نہ ہونے کی وجہ سے) تراویح نہیں پڑھ سکتے، اس لئے ان لوگوں کو رات میں تراویح پڑھاؤ، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ یا امیر المومنین! یہ ایسی چیز کا حکم ہے جس پر عمل نہیں ہے (یعنی با جماعت تراویح) حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: میں جانتا ہوں، لیکن یہی بہتر ہے، تو انھوں نے (حضرت ابی بن کعبؓ نے) بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھائی۔(اسـنـاده حسن، المختاره للضياء المقدسی ۱۱۶۱)

(۲) حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں رمضان المبارک کے مہینے میں حضرات صحابہ وتابعین بیس (۲۰)

رکعات تراویح پڑھتے تھے اور وہ سو سو آیتیں پڑھا کرتے تھے اور امیر المومنین حضرت سیدنا عثمان بن عفانؓ کے دور خلافت میں شدت قیام، یعنی طول قیام کی وجہ سے اپنی لاٹھیوں پر ٹیک لگایا کرتے تھے۔(الصیام للفریابی مخرج ۱۷۶، وسنن بیہقی ۴۸۰۱، اس حدیث کے صحیح ہونے پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے)۔

(۳) علامہ ابن حجر عسقلانیؒ امام مالک کی روایت نقل کرتے ہیں۔اور امام مالک نے یزید بن خصیفہؒ کے طریق سے حضرت سائب بن یزیدؓ سے بیس ۲۰ رکعات نقل کی ہے۔ (فتح الباری) .

(۴) علامہ ابن حجر عسقلانیؒ تلخیص الحبیر میں حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک کی ایک رات صحابہ کرامؓ کو بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھائی، دوسری رات بھی صحابہ جب جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو بیس رکعات تراویح پڑھائی اور جب تیسری رات صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد مسجد میں جمع ہوئی تو آپ ﷺ تشریف نہیں لائے پھر صبح میں ارشاد فرمایا: مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ نماز (تراویح) تم پر فرض کردی جائے اور تم کر نہ سکو۔

بیس ۲۰ رکعات تراویح پر صحابہ وعلماء امت کا اجماع ہے۔

(۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ کی امامت میں لوگوں کو تراویح با جماعت پڑھنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تراویح کی پہلی عام جماعت تھی۔(صحیح ابن حبان)۔

(۲) حضرت یزید بن رومانؒ (تابعی) فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں صحابہ تئیس (۲۳) رکعات (بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر) پڑھا کرتے تھے۔ (موطا امام مالک ۲۵۲، اسناده مرسل قوی، آثار السنن ۲ / ۵۵)۔

(۳) امام شافعیؒ (تبع تابعی) فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں بیس (۲۰)

ہی رکعات تراویح پڑھتے دیکھا ہے۔(الاُم وسنن ترمذی)۔

(۴) امام ترمذی لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور صحابہ کہ عمل کی بنا پر اکثر علماء کے نزدیک تراویح بیس (۲۰) رکعات ہے۔(سنن ترمذی)۔

(۵) علامہ علاء الدین کاسانی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ صحیح قول جمہور علماء کا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تراویح پڑھانے پر جمع فرمایا تو انہوں نے بیس رکعات تراویح پڑھائی۔تو یہ صحابہ کی طرف سے اجماع تھا۔(بدائع الصنائع)۔

(۶) علامہ ابن رشد قرطبی مالکیؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کے ایک قول کے مطابق اور امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام داؤد ظاہریؒ کے نزدیک وتر کے علاوہ بیس (۲۰) رکعات تراویح سنت ہے۔(بدایۃ المجتہد)۔

(۷) علاّمہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں کہ تراویح کی بیس رکعات سنت مؤکدہ ہے، سب سے پہلے اس سنت کو رسول اللہ ﷺ نے ادا فرمایا۔(المغنی)۔

(۸) علاّمہ نووی شافعیؒ لکھتے ہیں۔تراویح کی رکعات کے متعلق ہمارا (شوافع) کا مسلک وتر کے علاوہ بیس رکعات (۲۰) رکعات پانچ ترویحات ہیں اور ایک ترویحہ چار (۴) رکعات کا دو سلاموں کے ساتھ، یہی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام احمد بن حنبلؒ اور امام داؤد ظاہریؒ کا مسلک ہے اور قاضی عیاضؒ نے بیس (۲۰) رکعات تراویح کو جمہور علماء سے نقل کیا ہے۔(المجموع)۔

(۹) علاّمہ ابن تیمیہ حنبلیؒ لکھتے ہیں: حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (صحابی) نے لوگوں کو بیس ۲۰ رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھائی، اس لئے جمہور علماء کے نزدیک یہی سنت ہے۔کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ نے مہاجرین اور انصار کی موجودگی میں بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھائی تو کسی نے اعتراض

نہیں کیا۔(فتاویٰ ابن تیمیہ)۔

(۱۰) استاذ الاساتذہ مجاہد آزادی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرزند اوّل وسابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ جب کبار صحابہ اور خلفاء راشدین بیس ۲۰ رکعات تراویح پر متفق ہوگئے، تو اس سے بڑھ کر کونسی قوی ترین دلیل ہوسکتی ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کو سب سے زیادہ جاننے والے وہی حضرات تھے۔جب انھوں نے بیس ۲۰ رکعات کے علاوہ کے قول وعمل کو ترک کیا تو معلوم ہوا کہ بیس رکعات کے سلسلہ میں ان کے پاس قوی ترین ثبوت موجود تھا اور اہل حدیث حضرات جو آٹھ (۸) رکعات تراویح کہتے ہیں، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، یہ ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ تہجد اور تراویح میں فرق نہیں کرتے، حالانکہ تہجد اور تراویح میں بہت بڑا فرق ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تہجد پوری رات پڑھنے کی نفی کرتی ہیں جب کہ تراویح سحری تک پڑھی گئی ہے۔

☆☆

رمضان المبارک میں خواتین کے معمولات

● مترجم: مفتی احمد نادر القاسمی
(عربی سے اردو)

شریعت محمدی جو دین حنیف ہے اس کے اہم مقاصد میں سے یہ ہے کہ ایمان جس کا آغاز اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب سے ہوتا ہے، اس نظری ایمان کی حقیقت کو عملی شکل میں زندگی میں نافذ کیا جائے، اس طرح کہ عبادت کا اثر ایمانی زندگی میں دکھائی دے اور ایمان کی حقیقت نفس کی گہرائیوں میں اتر جائے۔

یوں تو ہر عبادت تزکیہ نفس کا ذریعہ ہے، تاہم روزہ تزکیہ نفس میں اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے، روح کو بلندیوں تک پہونچاتا ہے، اور عبادات کے وہ اثرات جو انسان کی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ انھیں جس طرح مرد عبادت، معمولات اور اطاعت ربانی کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہے، اسی طرح خواتین بھی کرسکتی ہیں اور ان سے بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ انسانی معاشرے کی بقا اور صلاح کی اساس و بنیاد دراصل عورت ہی ہے، اور یہ بات خواتین کی عملی زندگی کیلئے سب سے زیادہ نصیحت آمیز بھی ہے اور اسے چاہئے کہ وہ اس کا زیادہ مظاہرہ بھی کرے۔

اس روزے جیسی عبادت کی اہمیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ روزہ داروں کے جنت میں داخلے کا خاص دروازہ ہے، جسے باب الریان، حدیث میں کہا گیا ہے، جس دروازے سے صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے اور کہا جائے گا کہاں ہیں روزہ دار لوگ، ان کے

علاوہ کوئی دوسرا اس دروازے سے داخل نہ ہو، جب سارے روزہ دار داخل ہوجائیں گے تو دروازہ بند کردیا جائے گا، اور دوسرا کوئی اس میں داخل نہیں ہوگا، چنانچہ بخاری کی روایت ہے: (**وفی الجنة باب يقال له: الريان يدخل منه الصائمون يوم القيامة لا يدخل منه أحد غيرهم، يقال : اين الصائمون؟ فيقومون لا يدخل منه أحدغيرهم، فإذا دخلُوا اغلق، فلم يدخل منه أحد**) (بخاری)۔

رمضان کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنا وقت بھی عبادت میں گذر جائے کم ہے، خاص طور سے خواتین مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کریں:

۱۔ رمضان کے روزے جس طرح مردوں پر فرض ہیں اسی طرح خواتین پر بھی فرض ہیں، سب سے پہلے ان پر فرض یہ ہے کہ رمضان کے روزے پابندی سے رکھیں (سوائے مخصوص ایام کے، اور بعد میں ان کی قضاء کرلیں)، راتوں کو قیام لیل اور تراویح کا اہتمام کریں، بھلائی اور خیر کے کاموں میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ تمام اوقات اللہ سے اس کی رضامندی کی التجا کریں، اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں گذاریں، رمضان کا مہینہ جو انھیں میسر ہوا ہے اسے زندگی کا قیمتی لمحہ تصور کریں، اور اس پر ہمیشہ کاربند رہنے کا خود کو عادی بنائیں، تاکہ پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت میں گذارنے کے خود کو لائق بناسکیں۔

مثلاً: قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام اور اس نیت سے کہ یہی وہ مبارک مہینہ ہے جس میں یہ مقدس کتاب نازل کی گئی ہے، اس مہینہ میں تلاوت کی کتنی فضیلت ہوگی، اس کی تاثیر کیا ہوگی؟ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس کے دل میں اس کی عظمت ہو۔ ''**شهر رمضان الذی أنزل فيه القرآن**'' (سورہ بقرہ: ۱۸۵) (ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روزہ اور قرآن . دونوں قیامت کے دن

بندے کی سفارش کریں گے۔''**الصیام و القرآن یشفعان العبد یوم القیامۃ**''(احمد)

قرآن کریم کی تلاوت سے نہ صرف یہ کہ دل تروتازہ رہتا ہے، روشنی اورنور کے منور رہتا ہے، بلکہ مردہ دلوں میں جان پیدا ہوتی ہے، مایوسی کے عالم میں امید ونشاط شمع روشن ہوتی ہے، سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے، کیونکہ یہ ذکر ہے، اورافضل الذکر ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

''**افضل الذکر القرآن** ''(کہ سب سے افضل ذکرقرآن کی تلاوت ہے، کہ یہ ذکر بھی ہے، علم بھی ہے، احکام الٰہی کی معرفت کا ذریعہ بھی ہے، اورطمانیت قلب کا سامان بھی ہے، اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے:

''**ألابذکر اللہ تطمئن القلوب**''(سورہ رعد:۲۸)۔

اس لئے ہرمسلم خاتون کیلئے رمضان بہترین موقعہ بھی ہے، اورضروری بھی ہے کہ تلاوت کلام کا خوب خوب اہتمام کرے، تاکہ قلب میں انشراح پیدا ہو، حزن ومایوسی دور ہو اوررضائے الٰہی حاصل ہو۔

۲۔قیام لیل، تراویح اورراتوں کونوافل کی مشروعیت نے اس کے روزے کوخوشگوار اور بارآور بنادیا ہے، جب آدمی دن میں روزہ رکھتااورراتوں کوتراویح اورنوافل میں مشغول ہوتا ہے تواس کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے مئی اور جون کے مہینہ میں دھوپ اورگرمی کی شدت سے سوکھتے ہوئے پودوں کوشام کو پانی سے سیراب کردیا جائے، اور چند گھنٹوں بعد اس کی ہریالی لوٹ آئے، اور وہ خوشگوار ہوکرصبح کے وقت بادنسیم کے جھونکوں سے جھومنے لگے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشادفرمایا:

(**تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعا امھا رزقناھم ینفقون**)(سورہ سجدہ:۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جن کی کروٹیں اپنے بستروں سے لگ رہتی ہیں، اوراپنے رب کوامیداورخوف کے ساتھ بلاتے رہتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو

عنایت کررکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں)اسی طرح ارشادربانی ہے:

''**إن ناشئۃ اللیل ھی أشد و طأً و أقوم قیلا** ''(سورہ مزمل:۹)(بیشک رات کااٹھنادل جمعی کے لئے انتہائی مناسب ہے، اوربات کوبہت درست کردینے والا ہے)۔

یہی وہ شان ہے رمضان کی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے رمضان کے مہینے میں راتوں کوقیام لیل کامعمول ایمان واحتساب کے ساتھ بنایا اللہ تعالیٰ اس کے تمام سابقہ گناہوں کومعاف کردے گا(بخاری)۔

مذکورہ بالانصوص اورآیات واحادیث سے قیام لیل کی عظمت وبرکت کا اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور جہاں تک اس کے فوائد کاتعلق ہے تو وہ یہ ہیں کہ اس سے انسان کانفس پاک وصاف ہوتا ہے، اس کی تربیت ہوتی ہے، درجات بلند ہوتے ہیں، لہٰذاہماری ہربہن کوچاہئے کہ ہرطرح کی کاہلی اورسستی کوبالائے طاق رکھ کرہرممکن جہاں تک ہوسکے راتوں کوتراویح اورنوافل کا اہتمام کرے، تاکہ ان کے ذریعہ ساری خطائیں معاف ہوجائیں، دنیاوآخرت کے بلند درجات حاصل ہوجائیں۔

۳۔اللہ کے راستے میں خرچ کرنااوربھوکوں کوکھانا کھلانا:

مسلم خواتین کوچاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی ان کو مال ودولت کی شکل میں نعمت دے رکھی ہے، اس میں سخاوت کا اظہار کریں، اللہ کے راستے میں خرچ کریں، بھوکوں کو کھانا کھلائیں، یتیموں اور بیواؤوں کو کفالت کریں، مریضوں اورمحتاجوں کی ہرممکن مدد کریں، تواللہ تعالیٰ اس ماہ مبارک میں بطورخاص دوگنا، بلکہ دس گنا اجرعطافرمائے گا، اللہ تعالیٰ کاارشادہے:''**ومانفقتم من شئی فھو یخلفہ**''(سورہ سبأ:۲۹)۔

(اور جو کچھ بھی تم خرچ کروگے وہ تمہارے لئے بعد کی زندگی میں ذخیرہ ہوگا)۔

اسی طرح اللہ کاارشادہے:

''**وماتنفقوا من خیر یوف إلیکم و أنتم لا تظلمون**''(البقرۃ:۲۷۲)۔

(اور جو کچھ بھی تم مال خرچ کرتے ہو وہ تمہاری طرف پورا پورا لوٹایا جائے گا اور تمہارا حق نہیں مارا جائے گا)۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ کون سا صدقہ اجر وثواب کے لحاظ سے بڑا ہے، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم صدقہ کرو اس حال میں کہ تم تندرست ہو، تمہارے اندر بخل ہو، فقر میں مبتلا ہوجانے کا خدشہ لگا ہوا ہو، مالداری کی تمنا اور امید ہر وقت لگی ہو، ایسے وقت کا خرچ کے لئے انتظار مت کرو کہ تمہارا آخری وقت آجائے اور موت تمہاری گردن کے قریب ہو اور تم کہو فلاں کیلئے یہ ہے، فلاں کیلئے وہ ہے، اور فلاں کیلئے یہ ہے:

(عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: جاء رجل إلى النبی صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: يا رسول اللّٰه أی صدقة اعظم أجراً؟ قال: أن تصدق و أنت صحيح شحيح تخشى الفقر و تأمل الغنى، ولا تمهل حتما إذا بلغت الحلقوم قلت لفلان كذا، ولفلان كذا وقد كان لفلان) (بخاری ومسلم)۔

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی مختلف شکلیں ہیں، مثلاً کسی محتاج کو کھانا کھلانا، روزہ دار کو افطار کرانا، اس میں تالیف قلب بھی ہے، اور محتاجوں کے ساتھ لطف وعنایت کا معاملہ بھی ہے، غریب ومسکین اور بے سہارا لوگوں کو کپڑے پہنانا بھی ہے اور یتیم کی کفالت بھی ہے، رمضان میں خرچ کرنا دوسرے مہینوں کے مقابلہ زیادہ افضل ہے، اس لئے آپؐ اس ماہ میں زیادہ خرچ کیا کرتے تھے، لہٰذا مسلم خواتین کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ کو اختیار کریں اور اس جود وکرم کی عادت تمام اوقات میں ڈالیں اور خاص کر رمضان میں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

رمضان میں خرچ کرنے کی فضیلت اور اس پر شریعت کی طرف سے اس قدر ترغیب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اجر وثواب کی فضیلت اور زیادتی کی تمنا میں دوسرے مہینوں میں اللہ

کے راستے میں خرچ ہی نہ کیا جائے اور پورے سال خرچ کرنے کیلئے رمضان کا انتظار کیا جائے بلکہ شریعت کے پیش نظر موقعہ اور انسان کی ضرورت ہے کہ ضرورت کے وقت خرچ کی طرف توجہ دی جائے، اور ضرورت رمضان میں بھی ہوتی ہے اور غیر رمضان میں بھی، مگر رمضان خاص طور سے ضرورت، بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت کا موقعہ ہوتا ہے، ایک طرف غربت وافلاس کی وجہ سے کمزوری اور دوسری طرف دن بھر روزہ کی وجہ سے جسمانی نقاہت اگر اس حالت میں ان فقراء اور غربا پر خرچ نہیں کیا جائے گا تو اس بات کا غالب امکان ہے کہ ایسے لوگ روزہ رکھنے کی تاب نہ لاسکیں اور اس کی وجہ سے اللہ کی نافرمانی بھی اور رمضان کی بے حرمتی بھی ہو، معاشرہ کے مفلس لوگ جو بال بچے دار ہوں انھیں نعمت میسر نہ ہونے کی وجہ سے دن میں مزدوری اور مشقت آمیز کام کرنا پڑے گا اس کی وجہ سے خود ان کی بھی صحت متاثر ہوگی اور زیر کفالت چھوٹے چھوٹے بچے بھی فاقہ کشی پر مجبور ہوں گے، اسے غذائی بحران بھی ہوسکتا ہے، غریبوں اور محروموں میں قلت غذا سے دیگر پریشانیاں بھی پیش آسکتی ہیں، اگر اس طرح کی پریشانیاں رہیں گی تو رمضان میں جس طرح کثرت سے عبادت وریاضت کا حکم اور ترغیب دی گئی ہے اس سے وہ طبقہ محروم ہوجائے گا، اور روزے اور قیام لیل کی حقیقی مسرت جو حاصل ہونی چاہئے اس میں رخنہ پڑے گا اور رمضان بے کیف ہوکر رہ جائے گا، یہ ہے وہ حکمت اور مصلحت جس کی وجہ سے رمضان میں زیادہ خرچ کرنے کو کہا گیا ہے اور اس کا ثواب دوگنا رکھا گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام ضرورت کی مکافات کا قائل ہے، رمضان میں غریبوں کی ضرورت زیادہ ہوجاتی ہیں اور عام دنوں میں خود ان کے کمانے اور کسب معاش میں لگے رہنے کی وجہ سے ضرورتیں کم ہوتیں ہیں، سوائے ہنگامی حالات کے، مثلاً جہاد وقتال کا موقعہ، ناگہانی حادثات اور آفات وبلیات، اس لئے جہاں بھی خرچ کرنے کی بات قرآن وسنت میں آئی ہے وہاں بنیادی طور پر ضرورت مندوں کی ضرورت کے پس منظر میں آئی ہے۔

اس لئے جہاں ضرورت داعی ہوگی اللہ کے راستہ میں بندگان خدا سے خرچ کا مطالبہ متوجہ ہوگا، رمضان ہی ایک طرف اس ماہ مقدس کا احترام باقی رکھنا ہے، دوسرے طرف معاشی اعتبار سے کماحقّہ نہ کر پانے کی وجہ سے کمزور ہونے کے سبب غریب طبقہ کو ہلاکت سے بچانا اوران کو معاشی الجھنوں سے آزاد رکھ کر انہیں بھی اس ماہ کے مبارک لمحات کے فیض یاب ہونے کا موقعہ فراہم کرنا ہے، اور ہر چیز تمام اہلِ خیر حضرات کی طرف سے ہنگامی طور پر خرچ کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

رمضان میں خاوند کے ساتھ خواتین کا برتاؤ:

خواتین کو چاہئے کہ اس ماہ مبارک کی عبادات کو اپنے شوہروں کے ساتھ بہتر اور پختہ تعلقات کا ذریعہ بنائیں، ان کے ساتھ لطف ومحبت، رفق ونرمی، حسن سلوک اوراعلیٰ اخلاق و اقدار اور قربت کا برتاؤ کریں، اس لئے کہ یہ وہ خصلتیں ہیں جن سے انسان خوش اخلاق کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے، کشش اور ہمدردی کے جذبات کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، اور خوشگوار گھریلو معاشرہ پروان چڑھتا ہے، اس لئے کہ جس چیز میں نرمی ہوتی ہے وہ نرمی اس کو خوشنما بناتی ہے، اور جس چیز سے نرمی اور لچک نکل جاتی ہے اس کو عیب دار اور بدنما بنا دیتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

(قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن الرفق لایکون فی شئ إلا زانه ولا ینزع من شئ إلا شانه'' (مسلم)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نرمی جس چیز میں ہوتی ہے اس کو خوشنما بنا دیتی ہے، اور جس چیز سے نرمی نکل جائے تو وہ عیب دار ہو جاتی ہے)۔

عفوودرگذر سے کام لینا اور کوتاہیوں کو معاف کرنا یہ محسنین کی عادت اوران کی صفت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **''والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ**

یحب المحسنین (سورہ آل عمران: ۱۳۴) (غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کی غلطیوں کو معاف اور درگذر کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ محسنین کو پسند فرماتا ہے)۔

اس لئے خواتین پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے شوہروں کیلئے نرمی کے ساتھ نچھاور کرے، تاکہ وہ اللہ کے بندوں کیلئے معین ومددگار بن سکے، اسی لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرماتا ہے جو خود بھی رات کو اٹھ کر عبادت کرتی ہے اور اپنے شوہروں کو بھی عبادت کیلئے بیدار کرتی ہے، چنانچہ ''ابوداؤد'' میں ہے: **''رحم اللّٰہ امرأة قامت من اللیل وفصلت و أیقظت زوجها''** (ابوداؤد)

اس لئے اس پر لازم ہے اور خواتین کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ خیر کے کام میں اپنے شوہر کی مددگار رہنے، اس کو سہارا دے اور اپنے شوہروں کو اللہ کے نزدیک بہتر سے بہتر بدلہ پانے کا حقدار بنانے کی کوشش وتعاون کرے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''سب سے اچھی عورت وہ ہے جسے اس کا شوہر دیکھے تو دیکھتے ہی خوشی سے جھوم جائے اور جب وہ کسی کام کا حکم دے تو فوراً اسے بجا لائے، اور آنا کانی نہ کرے، ناک بھوں نہ چڑھائے اور جب اس کا شوہر دور چلا جائے تو اپنی عزت وآبرو اور نفس کی اور اپنے شوہر کے مال واسباب اور اپنے بچوں کی نگرانی وحفاظت کرے:

(خیر النساء من إذا نظر إلیها سرته وأمرها أطاعته وإذا غاب عنها حفظت فی نفسها وماله و ولده)۔ (ابوداؤد)۔

اپنے بچوں کے ساتھ خواتین کا برتاؤ:

خواتین کی مادرانہ ذمہ داریوں میں سے سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ برتاؤ کرے، بچوں کی سلیقہ مند تربیت پر توجہ دے، تاکہ معاشرہ کیلئے صالح اور عمدہ افراد تیار ہوسکیں اوران میں یہ سلیقہ پیدا ہو جائے کہ وہ ان

کے لئے یہ کہہ سکے کہ:

"وقل ارحمهما كماربيان صغيراً" (سورہ اسرا:۲۴) (اے میرے پروردگار ہمارے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں شفقت ومحبت کے ساتھ میری تربیت کی)۔

ایک سلیقہ منداور فرض شناس وشریف ماں وہ ہوتی ہے جو صحیح اور صالح زندگی اختیار کرے اور جس فطرت پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اس پر قائم رہے اور اخلاق وکردار، اور تقدس وشرافت کی حامل اور عظیم المرتبت خوبیوں اور صفات سے آراستہ ہو، اس کا دل ودماغ مکمل طور سے اپنے بال بچوں کیلئے فارغ ہو، جسے گھریلو تربیتی نظام کی اساس کہا جاسکتا ہے، اور گھر کا ہر سکون اور فعال تربیتی نظام اسی سے مکمل طور پر جاہت وامانت کے ساتھ باقی رہتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے: "يايها الذين آمنوا قوا أنفسكم و أهليكم نارا وقودها الناس و الحجارة" (سورہ تحریم:۶) (اے ایمان والو خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر جس پر سخت دل فرشتے مقرر ہیں)۔

نماز نہ پڑھنے پر بچوں کی پٹائی:

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کی تلقین بھی کرے اور تاکید بھی کرے، اور جب اس کی عمر ۹ رسال کی ہو جائے تو نماز کی پابندی نہ کرنے پر پٹائی بھی کرے، اور رمضان کے روزے کا عادی بنانے کے مقصد سے بچوں کو رمضان کے دیگر امور میں مشغول رکھے، حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ کہتی ہیں کہ ہم لوگ ہمیشہ اپنے بچوں کو عاشوراء کا روزہ رکھوایا کرتے تھے، اور ان کے لئے کھلونے تیار کرتے تھے، تو ان میں سے اگر کوئی کھانے کے لئے روتا تو یہ

کھلونا اس کو دیدیتے، یہاں تک کہ افطار کا وقت آن پہونچتا:

(عن الربيع بنت معوذ رضی اللہ عنها قالت: فی صيام عاشورا، كنا نصوم صبياننا و نجعل له اللعبة من العهن، فإذا بكى أحدهم على الطعام أعطيناه ذلک حتى يكون عند الافطار) (بخاری)۔

اسی طرح بچوں کو تلاوت قرآن اور حفظ کی تلقین کرے، اور ان کی ذہنی تربیت اور حفظ کلام پاک کرانے والے مراکز اور تعلیمی اداروں کی تعلیمی مجالس میں بھیجنے کا اہتمام کرے، پیارے لب ولہجہ اور کلمات کے ذریعہ ان کو اس کے لئے تیار کرے اور کبھی کبھی عمدہ قسم کے ہدایا اور گفٹ کے ذریعہ ان کی حوصلہ افزائی کرے، اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ بچوں کو ان کی طاقت اور صلاحیت کے بقدر عبادت و ریاضت کیلئے تیار بھی کرے، اور ترغیب بھی دے، اور ان کے قلب وجگر میں ایمان کی بیج بونے کی کوشش کرے، ان کے اندر عمدہ اخلاق واقدار پیدا کرنے کی سعی مسلسل کرے، اس طرح کہ اگر عبادت کروگے تو اللہ تعالیٰ عبادت کا اجر عطا کرے گا، دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ اچھی زندگی عطا کرے گا، امتحان میں اچھے نمبرات آئیں گے وغیرہ وغیرہ اس سے نہ صرف یہ کہ بچوں کی اچھی تربیت ہوگی، بلکہ ان کو بھی عبادت کا اجر ملے گا اور ماؤں کو بھی بچوں کی عمدہ تربیت کا اجر ملے گا۔

عزیز واقارب کے ساتھ عمدہ برتاؤ:

روزے جیسی عظیم عبات کے اثرات ایک مسلم خاتون کی زندگی پر عزیز واقارب کے ساتھ لطف وعنایت اور حسن واخلاق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور اس کی سعی بھی کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ ہمارا دین اس کی تعلیم وتاکید بھی کرتا ہے اور عزیز واقارب سے جڑنے اور ان کے ساتھ صلہ رحمی اختیار کرنے پر زور بھی دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"واتقوا الله الذی تساء لون به والأرحام" (سورہ نساء:۱)۔

(اوراس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تقوی اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تعریف بھی کی ہے، اسکی عظمت وتوقیر کرنے کی تاکید بھی کی ہے، اور ہمیشہ ان سے جڑے رہنے کو محمود بھی بتایا ہے۔قرآن کریم میں بہت سی آیات نازل ہوئیں ہیں جن میں اس کی قدر ومنزلت کو اور ان کے ساتھ احسان و ہمدردی کو واضح کیا گیا ہے، اوران کے حقوق کی ادائیگی کے احساس کو جگایا گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں کا حقیقی معنوں میں صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو اپنوں کے ساتھ اس کا مظاہرہ کرے، جیسا کہ بخاری کی روایت ہے:

(قال علیه الصلاة والسلام: لیس الواصل بالمکافی، ولکن الواصل الذی إذا قطعت رحمه وصلها) (بخاری)۔

(صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہے جو برابر اس کے تقاضے کو پورا کرتا رہے، لیکن اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کا رشتہ کسی رشتہ دار سے ٹوٹ جائے تو اس کو جوڑ لے)۔

یہی نہیں، بلکہ اپنے عزیز واقارب کے ساتھ صلہ رحمی اتنی بڑی چیز ہے کہ ہمارے دین نے تو اپنے عزیزوں کیلئے وصیت تک کرنے کی بات کہی ہے، اگرچہ رشتہ دار غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں؟ چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''إن آل أبی فلان لیسوا باولیائی إنما ولی اللہ وصالح المومنین، ولکن لهم رحم أبلها ببلاها'' (رواہ البخاری ومسلم) (آل ابی فلاں ہمارے دوست نہیں ہیں، بلکہ اللہ اور صالح مؤمن ہمارے دوست ہیں، لیکن اصل ان کی صلہ رحمی ان کے ساتھ جڑے رہنا ہے، اور ان کو مناسب نصیحت کرنا ہے) اس روایت میں صلہ رحمی کو شبنم کی تری اور سخاوت سے تشبیہ دی گئی ہے، اور ''فتح الباری'' میں اس کو اس زمین سے تشبیہ دی گئی

ہے جسے پانی سے کماحقہ سیراب کیا جائے اوراس سیرابی کے نتیجہ میں وہ زمین سبزہ زاروں سے لہلہا اٹھتی، اور ہر دیکھنے والے کو محبت وکشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔

لہٰذا عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہروں کو یاد بھی رکھے، اور صلہ رحمی میں ان کا بھرپور تعاون کرے، ان کی غلطیوں اور خامیوں کو نہ دہرائے، بلکہ حسن وخوبی میں اضافہ پر ان کو آمادہ کرے، ان کا استقبال کرے، اور گھر آنے پر ان کو خوش آمدید کہے، اور اپنے شوہر کو باہر سے آنے والا معزز مہمان تصور کرے، تاکہ اس کے مزاج ومذاق اور دین وایمان میں پاکیزگی پیدا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ اپنے آنے والے مہمانوں کا اکرام واحترام کرے:

''من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفه'' (بخاری ومسلم)۔

اخیر میں بس یہی عرض ہے کہ مسلم خواتین ماہ صیام کو اپنے اخلاق وعمل کی آبیاری کا مقدس مدرسہ تصور کریں، عقیدہ اور شخصیت سازی اور عبادت کا بہترین موقعہ اور منہج حیات تصور کریں، اگر ان پاکیزہ جذبات سے رمضان مقدس میں داخل ہوں گی تو رضائے ربانی ان کا استقبال بھی کرے گی اور معاشرے میں تبدیلی بھی آئے گی، نبوی مجتمع اور سماج بھی تیار ہوگا اور پوری انسانی برادری میں صلاح وہمدردی کی روایت بھی قائم ہوگی، اس لئے کہ سماجی ڈھانچہ کی تشکیل کا بنیادی عنصر خواتین ہی ہیں، انہیں کی شب وروز کی اندر اور باہر کی طرز زندگی سے صالح اور فاسد اچھے اور برے سماج کا پیمانہ ہوتا ہے، اور مرد تو محض اس سماج کا محافظ ونگراں ہے۔

☆☆

روزہ کے اسرار اور باطنی شرائط

● حجۃ الاسلام امام غزالیؒ

روزے کے تین درجات ہیں:

(۱) عام لوگوں کا روزہ

(۲) خاص لوگوں کا روزہ

(۳) خاص الخاص لوگوں کا روزہ

عام لوگوں کا روزہ پیٹ اور شرمگاہ کو خواہش کی تکمیل سے روکنا ہے۔

خاص الخاص لوگوں کا روزہ دل کو تمام بڑے خیالات اور دنیوی افکار، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے کلیتًا خالی کر دینا ہے، اس صورت میں جب اللہ تعالیٰ اور قیامت کے سوا کوئی دوسری فکر آئے گی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ دنیوی فکر سے اگر دین کا قصد نہ ہو تو بھی یہی حکم ہے، کیونکہ دین کی فکر زاد آخرت سے ہے دنیا سے نہیں، حتیٰ کہ اہل دل حضرات نے کہا ہے کہ جو شخص دن کے وقت یہ بات سوچے کہ رات کو کس چیز کے ساتھ افطار کرے گا اس کے ذمہ گناہ لکھ دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد اور اس کے رزق موعود پر مکمل یقین نہ ہونے کی علامت ہے۔ یہ درجہ انبیاء کرام، صدیقین اور مقرّبین کا ہے۔ اس کی تفصیل میں زیادہ گفتگو نہیں کی جائے گی، البتہ اس کی عملی تحقیق بیان کریں گے یعنی یہ روزہ اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ آدمی اپنی مکمل توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کر دے اور غیر خدا سے پھیر دے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کو لباس بنانے لے ''**قول اللّٰہ لمّ ذرھم فی**

حوضھم یلعبون '' آپ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ہے، پھر انہیں چھوڑ دیں اپنی بیہودگیوں میں کھیلتے رہیں۔

خاص لوگوں کا روزہ اولیاء کرام کا روزہ ہے، اور یہ اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچانا ہے، یہ روزہ چھ باتوں سے مکمل ہوتا ہے۔

(۱) ان چیزوں کو دیکھنے سے نظر کو روکنا جو بری اور مکروہ ہیں۔ نیز وہ چیزیں جو دل کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکتی ہیں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ''**النظرۃ سھم مسموم من سھام ابلیس لعنۃ اللہ فمن ترکھا خوفا من اللہ أتاہ اللہ عزوجل ایمانا یجد حلاوتہ فی قلبہ**'' (رواہ الحاکم وصححہ) نظر زہر میں بجھا ہوا ایک شیطانی تیر ہے، اللہ اس پر لعنت بھیجے پس جس شخص نے اسے (غیر محرم کو دیکھنا) چھوڑ دیا، اسے اللہ تعالیٰ ایسا ایمان عطا فرماتا ہے جس کی شیرنی وہ اپنے دل میں پاتا ہے۔

حضرت جابر، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور وہ رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا ''**خمس یفطر ان الصائم الکذب والغیبۃ والنمیمۃ والیمین الکاذبۃ والنظر بشھودۃ** '' پانچ چیزیں روزہ دار کے روزے کو توڑ دیتی ہیں جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، چغلی کھانا، جھوٹی قسم کھانا اور شہوت کے ساتھ کسی کو دیکھنا۔

(۲) زبان کو بیہودہ گفتگو، جھوٹ، غیبت، چغلی فحش کلامی، ظلم و زیادتی، جھگڑے، دکھاوے، اور خاموشی اختیار کرنے سے محفوظ رکھنا اور اسے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت قرآن مجید میں مشغول رکھنا، یہ زبان کا روزہ ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا غیبت روزے کو توڑ دیتی ہے، یہ بات ان سے حضرت بشر بن حارث نے نقل کی ہے۔ حضرت لیث، حضرت مجاہد سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ دو باتیں روزے کو توڑ دیتی ہیں (۱) غیبت اور (۲) چغلی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ’’**انما الصوم جنة فاذا کان أحدکم صائما فلایرفث ولایجهل وان امروء قاتله اوشاتمه فلیقل انی صائم انی صائم**‘‘ بے شک روزہ ڈھال ہے، پس جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو نہ وہ بے حیائی کی بات کرے اور نہ جہالت کی اور اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا گالی گلوچ کرے تو کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں دوعورتوں نے روزے رکھا، تو ان کے آخر میں انہیں بھوک اور پیاس نے ستایا حتیٰ کہ قریب تھا وہ اپنے روزے کو ضائع کردیں، انہوں نے کسی کو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیج کر روزہ توڑنے کی اجازت طلب کی آپ نے ان کی طرف ایک پیالہ بھیجا اور فرمایا کہ ان سے کہو جو کچھ کھایا تھا اس میں قے کردیں، تو ان میں سے ایک نے تازہ خون اور تازہ گوشت کی قے کی اور دوسرے نے بھی اس جیسی قے کی حتی کہ دونوں نے پیالہ بھر دیا لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ان دونوں نے اس چیز سے روزہ رکھا جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا اور جسے اللہ نے حرام کیا اس سے روزہ توڑ دیا، ان دونوں نے ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر لوگوں کی غیبت کی تو یہ لوگوں کا گوشت ہے جو انہوں نے (غیبت کی صورت میں) کھایا۔

(۳) ہر مکروہ بات کو سننے سے کانوں کو روکنا، کیونکہ جو بات کہنا حرام ہے، اس کی طرف کان لگانا بھی حرام ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے غور سے سننے والے اور حرام مال کھانے والے کو برابر قرار دیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ’’**سماعون للکذب اکالون للسحت**‘‘ وہ جھوٹ کو خوب سننے والے اور خوب حرام کھانے والے ہیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے ’’**ولاینهاهم الربانیون والاحبار عن قولهم الاثم واکلهم السحت**‘‘ ان کے علماء اور درویش ان کو گناہ کی بات اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے۔

تو غیبت سن کر خاموشی اختیار کرنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ’’**انکم اذا**

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

مثلهم‘‘ بے شک تم اس وقت ان کی مثل ہو گے۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ’’**المتاب والمستمح شریکان فی الاثم**‘‘ غیبت کرنے والا اور اسے قصداً سننے والا دونوں گناہوں میں شریک ہیں۔

(۴) باقی اعضا یعنی ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کو بھی گناہوں سے نیز مکروہ امور سے بچانا اور افطار کے وقت پیٹ کو شبہے والی اشیاء سے بچانا اگر وہ حلال چیز سے روزہ رکھے اور حرام سے افطار کرے تو روزے کا کیا مطلب ہوگا؟۔

ایسے روزے دار کی مثال اس شخص جیسی ہے جو محل بناتا ہے اور شہر کو گرا دیتا ہے، کیونکہ حلال کھانا زیادہ ہونے کی وجہ سے نقصان دیتا ہے، اپنی کسی نوع کی وجہ سے نہیں اور روزے کا مقصد کھانے کو کم کرتا ہے اور زیادہ دوائی کو اس کے نقصان کے باعث چھوڑ کر زہر کھانے والا بیوقوف ہوتا ہے اور حرام بھی ایک زہر ہے جو دین کو ہلاک کرتا ہے اور حلال چیز وہ ہے جو تھوڑی ہو تو نافع ہے اور زیادہ ہو تو نقصان دیتی ہے، اور روزے کا مقصد اس حلال غذا کو کم کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ’’**کم من صائم لیس له من صومه الا الجوع والعطش**‘‘ کتنے ہی روزہ دار ہیں جن کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو حرام کی طرف نظر کرتا ہے اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو حلال کھانے سے رکتا ہے اور غیبت کے ذریعے لوگوں کے گوشت سے روزہ توڑ دیتا ہے۔ کیونکہ غیبت حرام ہے اور یہ قول بھی ہے کہ وہ شخص مراد ہے جو اپنے اعضا کو گناہوں سے محفوظ نہیں رکھتا۔

(۵) افطار کے وقت حلال کھانا بھی زیادہ نہ کھائے اس طرح کہ پیٹ بھر لے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پیٹ سے برا برتن کوئی نہیں جو حلال رزق سے بھر جائے روزے سے اللہ تعالیٰ کے دشمن پر غلبہ پانے اور شہوت کو توڑنے کا فائدہ کیسے حاصل ہوگا جب وہ دن کے وقت جو کچھ رہ گیا اس کی کسر افطاری کے وقت نکالے۔

اور بعض اوقات اس کے پاس طرح طرح کے کھانے جمع ہوجاتے ہیں حتی کہ یہ عادت بن گئی ہے کہ رمضان المبارک کے لئے کھانے جمع کئے جاتے ہیں اور اس وقت وہ کھانے کھائے جاتے ہیں جو دوسرے مہینوں میں نہیں کھائے جاتے ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ روزے کا مقصد پیٹ کو خالی رکھنا اور خواہش کو توڑنا ہے، تاکہ نفس کو تقویٰ پر قوت حاصل ہو، اور جب صبح سے شام تک معدے کو ٹالتا رہا حتی کہ خواہش جوش میں آئی اور رغبت مضبوط ہوگئی، پھر اسے لذیذ کھانے دے کر سیر کیا گیا اور اس کی قوت زیادہ ہوگی اور وہ خواہشات ابھریں جو عام عادت پر رہنے کی صورت میں پیدا نہ ہوتی پس روزہ کی روح تو یہ ہے کہ ان قوتوں کو کمزور کیا جائے جو برائیوں کی طرف لوٹنے کو کم کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے، یعنی ہر رات اتنا کھانا ہی کھائے جو روزہ نہ رکھنے کی صورت میں کھاتا ہے، اور اگر دن اور رات کا کھانا جمع کر کے کھائے تو روزے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ مستحب یہ ہے کہ دن کے وقت زیادہ نہ سوئے، تاکہ اسے بھوک اور پیاس کا احساس ہو، اور اعضاء کی کمزوری محسوس ہو، اس وقت اس کا دل صاف ہوجائے گا اور ہر رات اسی قدر کمزوری پیدا ہوگی تو اس پر تہجد اور وظائف پڑھنا آسان ہوجائے گا اور ممکن ہے شیطان اس کے دل کے قریب نہ آئے اور وہ آسمانی بادشاہت کا نظارہ کرے اور لیلۃ القدر اسی رات کو کہتے ہیں جس میں ملکوت سے کئی چیز اس پر منکشف ہو، اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے فرمایا ''انا انزلناہ فی الیلۃ القدر '' (سورہ القدر) بے شک ہم نے اس (قرآن پاک) کو لیلۃ القدر میں اتارا، اور جو آدمی اپنے دل اور اپنے سینے کے درمیان کھانے کی رکاوٹ ڈال دے، وہ اس سے پردے میں رہتا ہے اور جس نے اپنے معدے کو خالی رکھا تو صرف یہ بات بھی پردہ اٹھنے کے لیے کافی نہیں جب تک وہ اپنی توجہ غیر خدا سے ہٹا نہ دے یہی سارا معاملہ ہے اور اس تمام معاملے کی بنیاد کم کھانا ہے۔

(۶) افطار کے بعد اس کا دل خوف اور امید کے درمیان معلّق اور متردد رہے کیونکہ

اسے معلوم نہیں کہ اس کا روزہ قبول ہوا، اور وہ مقرّبین میں سے ہے یا رد کر دیا گیا اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے اسے ہر عبادت سے فراغت کے بعد اسی طرح ہونا چاہئے۔ حضرت حسن بن ابوالحسن بصریؒ سے مروی ہے آپ ایک جماعت کے پاس گزرے اور وہ لوگ ہنس رہے تھے، انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے مہینے کو لوگوں کے لیے مقابلے کا میدان بنایا ہے، وہ اس کی عبادت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک جماعت آگے بڑھ گئی اور کامیاب ہوئی اور دوسرا گروہ پیچھے رہ گیا، اور اس نے نقصان اٹھایا تو اس شخص پر بہت زیادہ تعجب ہے جو اس دن ہنستا اور کھیلتا ہے، جس میں سبقت کرنے والے کامیاب اور پیچھے رہنے والے ناکام ہوئے۔

سنو! اللہ تعالیٰ کی قسم! اگر پردہ اٹھ جائے تو نیکی کرنے والے اپنی نیکی میں اور برائی کرنے والے اپنی برائی میں مشغول ہوں، یعنی مقبول کی خوشی اسے کھیل سے روک دے اور مردود کا افسوس اس پر ہنسی کا دروازہ بند کر دے، حضرت بن قیسؒ سے منقول ہے ان سے کہا گیا کہ آپ بہت بوڑھے ہیں اور روزہ آپ کو کمزور کر دے گا، انہوں نے فرمایا میں اسے ایک طویل سفر کا سامان بناتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا، اس کے عذاب پر صبر کرنے سے زیادہ آسان ہے، تو روزے میں باطنی امور یہ ہیں۔

سوال: جو شخص پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت سے رکنے پر اکتفا کرے اور ان امور کو نظر انداز کر دے تو فقہا فرماتے ہیں اس کا روزہ صحیح ہے اس کا کیا مطلب ہے؟۔

جان لو کہ ظاہری فقہائے کرام ظاہری شروط کو نہایت کمزور دلائل سے ثابت کرتے ہیں یعنی وہ دلائل ہماری ذکر کردہ باطنی شرائط کے مقابلے میں کمزور ہے۔ خصوصاً غیبت اور اس جیسی دوسری باتیں فقہا نے ظاہران تکلیفات کا ذکر کرتے ہیں جو عام غافل اور دنیا کی طرف متوجہ ہونے والے لوگوں کے لئے آسان بات کو سمجھتے ہیں کہ روزے کا مقصد اللہ کے اخلاص سے متصف ہونا ہے اور وہ بے نیازی ہے اور جس قدر ممکن ہو شہوات سے بچ کر فرشتوں کی اقتداء

کرے کیونکہ وہ شہوات سے پاک ہیں اور انسان کا رتبہ جانوروں کے رتبہ سے بلند ہے، کیونکہ وہ نورِ عقل کے ذریعے شہوات کو ختم کرسکتا ہے اور فرشتوں کے رتبہ سے (عام انسانوں کا رتبہ) کم ہے، کیونکہ اس پر شہوت کا غلبہ ہے اور اسے مجاہدے میں مبتلا کیا گیا، لہٰذا جب وہ شہوات میں بڑھتا ہے تو سب سے نچلے گڑھے میں گرتا ہے اور جانوروں کے درجے میں چلا جاتا ہے اور جب شہوات کا قلع قمع ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ علیّین میں چلا جاتا ہے اور ملائکہ کی دنیا سے جاملتا ہے اور فرشتے کی طرح اللہ تعالیٰ کا مقرب بن جاتا ہے۔ کیونکہ قریب کی مشابہت اختیار کرنے والا بھی قریب ہوتا ہے اور وہاں مکان کا قرب نہیں، بلکہ صفات کا قرب ہوتا ہے۔

جب عقلمندوں کے اور اہل دل کے نزدیک روزے کا مقصد اور راز یہ ہے تو ایک کھانے کو موخر کر کے دونوں کو شام کے وقت اکٹھا کرلے۔ نیز دن بھر شہوات میں غرق رہنے کا کیا فائدہ ہے، اگر اس کا کوئی فائدہ ہے تو نبی اکرم ﷺ کے اس اشادِ گرامی کا کیا مطلب ہوگا جس میں آپؐ نے فرمایا:

''**کم من صائم لیس له من صومه الاالجوع والعطش** '' (کتنے ہی روزہ دار ہیں جن کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا)۔

اس لیے حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا کہ دانا آدمی کا سونا اور افطار کرنا کیسا اچھا ہے، وہ کس بیوقوف آدمی کے روزے اور بیداری کو برا نہ جانے، البتہ یقین اور تقویٰ والوں کا ایک روزہ دھوکے میں مبتلا لوگوں کی پہاڑوں کے برابر عبادت سے افضل اور راجح ہے۔ اسی لیے بعض علماء کرام نے فرمایا کہ کتنے ہی روزے دار روزے کے بغیر اور کتنے ہی بے روزہ، روزہ دار ہوتے ہیں، روزہ نہ رکھنے کے باوجود، روزہ دار وہ شخص ہے جو اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچاتا ہے، اگر چہ وہ کھاتا پیتا بھی ہے اور روزہ رکھنے کے باوجود بے روزہ شخص ہے جو بھوکا اور پیاسا رہتا اپنے اعضا کو کھلی چھٹی دیتا ہے۔

روزے کے مفہوم اور اس کی حکمت کو سمجھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو شخص کھانے

اور جماع سے رکے اور گناہوں میں ملوث ہونے کے باعث روزہ توڑ دے، وہ اس شخص کی طرح ہے جو وضو میں اپنے کسی عضو پر تین بار مسح کرے، اس نے ظاہر میں تعداد کو پورا کیا، لیکن مقصود، یعنی اعضاء کو دھونا جو کھانے کے ذریعہ روزہ دار نہیں، لیکن ناپسندیدہ افعال سے اعضاء کو روکنے کی وجہ سے روزہ دار ہے وہ اس آدمی کی طرح ہے جو اپنے اعضاء کو ایک ایک بار دھوتا ہے تو اسکی نماز ان شاءاللہ قبول ہوگی، کیونکہ اس نے اصل کو پکا کیا اگر چہ زائد کو چھوڑ دیا اور جو آدمی دونوں کو جمع کرے وہ اس آدمی جیسا ہے جو ہر عضو کو تین تین بار دھوتا ہے، اس نے اصل اور زائد دونوں کو جمع کیا اور یہی کمال ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **ان الصوم امانة فلیحفظ أحدکم أمانته**'' (بے شک روزہ امانت ہے تو تم میں سے ایک کو چاہئے کہ وہ اپنی امانت کی حفاظت کرے)۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی! ''**انّ اللّٰہ یامرکم انْ تودّوا الامانات الی اھلھا**'' (سورہ نساء) بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کی طرف لوٹا دو۔

تلاوت کے بعد آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اپنے کان اور آنکھ پر رکھ کر فرمایا سماعت وبصارت بھی امانت ہے اور اگر یہ روزے کی امانتوں میں سے نہ ہوتی تو نبی اکرم ﷺ یہ بات نہ فرماتے کہ اسے کہنا چاہئے کہ میں روزے سے ہوں۔ بخاری) دوسری حدیث میں گزر چکا ہے، یعنی میرے پاس میری زبان امانت ہے، تاکہ میں اس کی حفاظت کروں تو میں کس طرح تجھے جواب دینے کے لیے اسے کھلا چھوڑ دوں۔

اب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ہر عبادت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، چھلکا بھی ہے اور مغز بھی اور اس کے چھلکوں کے کئی درجات ہیں اور ہر درجے کے کئی طبقے ہیں اب تجھے اختیار ہے کہ تو مغز کو چھوڑ کر چھلکے پر قناعت کرے، یا عقلمندوں کی جماعت میں شامل ہو۔

☆☆

اے مومنو! یہ آمدِ ماہِ صیام ہے

اے مومنو یہ آمد ماہِ صیام ہے
بخشش کا عاصیوں کیلئے اک پیام ہے

افطار ہے سحر ہے رکوع و قیام ہے
کیا ساعت صیام ہے کیا فیض عام ہے

جس سمت دیکھ فیض سراپا ہے ہر طرف
سایہ فگن جو رحمت یزداں ہے ہر طرف

وہ اہل دل ہوا وہی اہل نظر ہوا
ماہ مبیں کے فیض کا جس پر اثر ہوا

رکھنے کا روزہ، دل میں ارادہ اگر ہوا
بیدار اپنی نیند سے وقتِ سحر ہوا

اے مومنو یہ قول رسالت مآب ہے
رکھتا ہے جو بھی روزہ وہی کامیاب ہے

بے شک یہ برکتوں کا مہینہ ہے مومنو
بے شک یہ رحمتوں کا مہینہ ہے مومنو

حق کی عنایتوں کا مہینہ ہے مومنو
یعنی شفاعتوں کا مہینہ ہے مومنو

قرآن کی صبح و شام تلاوت کیا کرو
عقبیٰ کی فکر کرلو عبادت کیا کرو

سرور نگینوی

فریضہ رمضان اور چھوٹے بچے

● ادارہ

رمضان کریم کے بارے میں بڑی پر لطف بات کسی نے کہی ہے، کہ ''رمضان'' کا لفظ اپنے معنوی لحاظ سے اور مادہ اشتقاق کے نقطہ نظر سے تو اس کا معنی گرمی، تپش اور شدت کے ہے، مگر لطیفہ کے طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''ر'' سے مراد رحمت ہے، ''م'' سے مغفرت ہے، ''ض'' سے جنت کی ضمانت ہے، ''الف'' سے جہنم سے امان ہے، ''ن'' سے اللہ کا نور ہے، مگر ان تمام چیزوں کو ہم کیسے حاصل کریں گے، یہ ہمارے لئے غور وفکر اور تیاری کا مقام ہے کہ یہ اپنے ساتھ اپنے گھر اور معاشرے کے چھوٹے بچوں کو رمضان کی عظمت و برکت سے کیسے قریب کریں اور ان کو اس ماہ مبارک کی برکت سے کیسے محظوظ ہونے کا موقعہ فراہم کریں، تا کہ رفتہ رفتہ وہ ہمارے ساتھ آئندہ آنے والے وقتوں میں مکمل روزے رکھنے اور رمضان کا احترام واہتمام کرنے والے بن جائیں۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ رمضان اور عید و بقرعید کے موقعہ پر بچوں میں کس قدر خوشی اور مسرت کا احساس پایا جاتا ہے، یہی نہیں جب چھوٹے چھوٹے بچے شام کو افطار کے وقت گھر کے روزہ داروں کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور جب افطار میں شریک ہوکر انواع واقسام کے پھل فروٹ، شربت اور کھانے پینے کی چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تراویح اور قیام لیل میں شرکت اور قرآن مجید کی تلاوت سننے کا ان کو موقعہ ملتا ہے تو ان کے دلوں میں داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ میں بھی روزہ رکھوں گا، میں بھی قرآن مجید حفظ کروں گا، میں بھی دین

سیکھوں گا، تو اس طرح کے جذبات کو بچوں میں پروان چڑھانا، آئندہ ان کو اس کے لئے تیار کرنا، رمضان کی عظمت ان کے دل میں بیٹھانا ان کو قریب رکھنا، افطار، تراویح، تہجد اور سحری میں بچوں کو شریک کرنا، کبھی کبھی ان کو روزہ رکھنے کی ترغیب بھی دینا، اس طرح اگر دیکھا جائے تو رمضان بڑوں کی تربیت کا موقعہ تو ہے ہی، بچوں کیلئے تشجیع و تربیت کا بھی بہترین موقعہ ہے، اس لئے چھوٹے بچوں کو رمضان میں افطار میں نماز میں، افطار کے وقت دعاء میں، سحری میں، درس قرآن میں، درس حدیث میں اپنے ساتھ شریک بھی کرنا چاہئے، اور چھوٹی قرآنی سورتیں اور منقول دعائیں وغیرہ بھی یاد کرانا چاہئے، ان کی دینی اور اخلاقی تربیت پر اس ماہ میں بھر پور توجہ دینی چاہئے۔

معذور بچوں کے ساتھ برتاؤ:

اس کے ساتھ جہاں ہم اچھے بچوں کے بارے میں غور کر رہے ہیں کہ ان کو حتی الامکان روزہ ورمضان کی معروضات ونقل وحرکت میں شریک کرنے کی کوشش کی جائے، وہیں ہمیں ان بچوں کو بھی ساتھ رکھنا چاہئے جو ذہنی، عقلی اور آنکھوں کے معذور و نابینا یا کسی اور اعتبار سے مریض ہوں، البتہ امراض واعاقہ کی بھی بہت شکلیں ہیں، مثلاً آنکھ اور کان میں پرابلم، یا ہاتھ اور پاؤں میں چلنے پھرنے میں دشواری وغیرہ، ظاہر ہے اس طرح کے مرض والے لوگ بھی جو عاقل اور بالغ ہوں مکلّف ہیں اور ان پر بھی روزہ فرض ہے، تاہم ذہنی اعتبار سے کوئی بیمار ہو، پاگل پن اور جنون کی کیفیت ہو تو ظاہر ہے ایسا شخص احکام کا مکلّف ہی نہیں ہے، لیکن پھر بھی ان کو تمام دینی مناسبات وتقریبات میں شامل رکھنا چاہئے، تا کہ ان کے اندر سے جھجک ختم اور ان کو اپنی اجنبیت کا احساس نہ ہو، خاص طور سے اگر چھوٹا بچہ ہو تو ان کا مزید خیال رکھنا چاہئے۔

رمضان ایک مہینہ کا ایسا مدرسہ ہے جس میں انسان بہت سے ایمانی فوائد حاصل کرتا

ہے، روحانی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، دینی اور دنیوی زندگی گذارنے کے طریقے سیکھتا ہے، یہاں ہم خواتین کو خاص طور سے مخاطب کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ انسان کی تربیت کا سب سے پہلا مدرسہ خواتین ہی ہوا کرتی ہیں وہ کس طرح اپنے گھر کے لوگوں کے کام آسکتی ہیں، رمضان جیسی عبادت کیلئے معاون و مددگار ہوسکتی ہیں، مردوں کو قیام لیل اور تہجد کیلئے ابھار سکتی ہیں، تلاوت قرآن کا اپنے گھروں میں بچوں اور بالخصوص اپنی بچیوں کے ساتھ اہتمام کرسکتی ہیں، یہ ساری چیزیں اس وقت تک انسان انجام نہیں دے سکتا، جب تک اس کے اندر سخاوت اور دوسروں کیلئے خیرخواہی کا جذبہ نہ پایا جائے، اس لئے میری بہنوں!۔

اگر ہم اپنے گھر میں بچوں کو رمضان کیلئے تیار کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے اندر نرمی اور رقت پیدا ہونی چاہئے کہ ہم نہایت ہی نرم لب ولہجہ میں اور نصیحت آمیز انداز میں بچوں کے دلوں میں رمضان کی اہمیت بٹھانے کی کوشش کریں، خود اس ماہ مبارک کی بے شمار حکمتیں اور اس نصیحت کی چیزیں ہیں کہ بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان میں وہ چیز پیدا کرنا دینی تربیت کے لحاظ سے بہت مفید ہوسکتا ہے، مثلاً بڑے بچوں کے دماغ میں روزے کی اہمیت بٹھانا، اس سے چھوٹے بچوں میں نماز کی اہمیت بٹھانا، سحری اور افطاری کے فوائد بتانا، اللہ اور رسول کی معرفت کرانا، اچھے اعمال کے نتائج وثمرات سے واقف کرانا، اور دنیا وآخرت کی حقیقت بتانا، تلاوت قرآن کے فوائد بتا کر ان کو قرآن سیکھنے اور حفظ کرنے پر آمادہ کرنا۔

اہل خانہ کے ساتھ افطار کا اہتمام:

افطار تمام افراد خانہ کے ساتھ ایک دسترخوان پر کرنے کا روزانہ اہتمام کرنا، اگر ممکن ہوسکے تو روزانہ اپنے بھائیوں کے تمام بچوں کے ساتھ افطار کا نظم کرنا، ورنہ کم از کم ہفتہ میں

ایک بار تمام رشتہ داروں کے ساتھ روحانی و ایمانی فضاء میں افطار کرنے اور افطار سے قبل اجتماعی دعاء کا اہتمام کہ وہ دعاء کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔

افطار کے وقت بچوں کی تعریف کرنا، ان کا حوصلہ بڑھانا وغیرہ، ان کو روزہ رکھنے، نماز پڑھنے کا اہتمام زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن کرنے پر عید کے موقعہ سے اچھے انعامات اور گفٹ دینے کا وعدہ کرنا، ان چیزوں سے ان میں شوق و جذبہ پیدا ہوگا۔

☆☆

روزے سے متعلق احکام ومسائل

● ادارہ

اسقاط حمل کی دواء کی وجہ سے جاری ہونے والا خون کیا صوم وصلاۃ کیلئے مانع ہے؟

اس سلسلہ میں اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسقاط حمل کی دواء کھانے کی وجہ سے اگر بچہ ساقط (abarshan) ہوجائے اور خون بھی جاری ہوجائے تو اس خون کا حکم نفاس، یعنی بچہ پیدا ہونے کے بعد جاری ہونے والے خون کا ہوگا، اور نفاس کی وجہ سے جو چیزیں حرام ہوتی ہیں وہ اس خون سے بھی حرام ہوں گی، لہذا عورت خون جاری رہنے کی حالت میں صوم وصلاۃ سے رکی رہے گی، جب تک کہ اس خون کا بہنا مکمل طور پر بند ہوجائے، سفیدی نظر نہ آجائے، یا خشک ہونے کی وجہ سے پاک نہ ہوجائے۔

اب اس خون کے بند ہونے یا خشک ہونے یا نفاس سے پاک ہونے کی کم سے کم مدت کی کوئی تعین کتاب وسنت میں مذکور نہیں ہے، تاہم زیادہ سے زیادہ مدت کے بارے میں علماء کے درمیان کئی رائیں پائی جاتی ہیں، فقہاء احناف کے یہاں اس کی مدت چالیس دن ہے، بعض علماء کے نزدیک ساٹھ اور بعض کے نزدیک ستر دن ہے۔

ان ممالک میں روزہ جہاں دن لمبا ہوتا ہے:

فقہاء کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ روزہ نام ہے کھانے پینے اور جماع سے طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک رکے رہنے کا، اب طلوع فجر اور غروب آفتاب یہ

دو علامتیں ایسی ہیں جو زمین کے درمیانی حصہ، جن کو خط استواء کہتے ہیں، پر بالکل واضح اور بین ہیں، اور شمال وجنوب کے وہ خطوط جو استواء سے نسبتاً قریب ہیں، ان جگہوں پر روزہ کا دن طلوع آفتاب سے تھوڑا پہلے جب معمولی اندھیرا رہتا ہے، اس وقت شروع ہوتا ہے، اور سورج کے غروب ہونے کے وقت لوگ افطار کرتے ہیں، یعنی جب معمولی روشنی افق پر باقی رہتی ہے، اس وقت جب ہم شمال وجنوب کی طرف جتنا بڑھتے جاتے ہیں، اس قدر فجر یا غروب کا وقت جسے ہم شفق کہتے ہیں زیادہ ہوتا جاتا ہے، یعنی معمول کے ۲۴ر گھنٹے والے دن کے مقابلہ، اور یہی رات ودن کے درمیان فاصلہ کی وقتی یا زمنی تحدید ہے، جو قدرے مشکل امر ہے، اور اس فن کے ماہرین کی خصوصی بحث وتحقیق کا متقاضی ہے۔

جہاں تک سیدھے سادے اصول کی بات ہے تو دن اور رات کے فاصلہ کی تحدید کرتے ہوئے جس میں کہ روزے کا دورانیہ پورا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل'' (سورہ بقرہ: ۱۸۷)۔

(اور تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے پھر رات تک روزے کو پورا کرو)۔

اس آیت کی تفسیر میں ابوبکر جصاص رازیؒ نے اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' میں کہا ہے:

''فأباح الأكل إلى أن يتبين، والتبين أيضا هو العلم الحقيقي'' (احكام القرآن للجصاص).

اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ نے اس سلسلہ میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ روزے میں اسی کا التزام ضروری ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یعنی طلوع فجر صادق سے روزے کا آغاز اور غروب کے وقت افطار، یہ ان لوگوں کیلئے جن کے یہاں ۲۴ر گھنٹے کا دن ورات

کا دورانیہ ہے، البتہ بعض متاخرین علماء نے اس کا بھی فتوی دیا ہے کہ جہاں دن کا حصہ ۱۸ر گھنٹوں سے متجاوز ہو جائے ان لوگوں کیلئے وقت کی تقسیم وتقدیر، یعنی دن اور رات کی مقدار مقرر کر کے روزہ شروع کرنے اور افطار کرنے کی گنجائش ہے، یعنی جو قریب کے شہر کی تقویم ہے اسے اختیار کرے، یا مکہ اور مدینہ کی تقویم کے مطابق اندازہ مقرر کرے۔

البتہ اس سلسلہ میں بہتر بات یہ ہے کہ جن جگہوں پر ۲۴ر گھنٹہ کا دن اور رات مقرر ہے، ماہرین سے معلوم کرلیا جائے کہ فجر صادق کا آغاز کب ہوتا ہے کہ وہاں سے روزہ شروع کیا جائے اور رات کب سے شروع ہوتی ہے، کہ اس وقت روزہ افطار کیا جائے۔

☆☆

شہ پارے

’’اسلام کا حکم، صحابہ کا عمل اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ ہونی چاہئیں۔‘‘

’’زکوٰۃ اسلام کا اتنا جامع اور اکمل اصول ہے کہ دنیا کا کوئی قانون اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔‘‘

’’اسلام نہیں چاہتا کہ دولت کسی کی اجارہ داری میں آجائے۔ یا کوئی شخص اپنے پاس ڈھیر لگائے۔ اسلام ڈھیر کا سخت مخالف ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت تقسیم ہوتی رہے۔ اس کا اصول زکوٰۃ و وراثت میں بالکل مساوی بنیاد پر قائم ہے۔‘‘

’’اسلام حق مساوات تسلیم کرتا ہے، لیکن مساوات تسلیم نہیں کرتا۔‘‘

’’اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب آدمی پیدا ہو تو اس کی زندگی سوسائٹی پر فرض ہوگئی۔ سوسائٹی کا فرض ہے کہ اسے زندہ رہنے دے۔‘‘

’’سوشلزم جس قسم کی مساوات کی بات کرتا ہے، وہ بالکل غیر فطری ہے۔ دنیا کو وجود ہی کشاکش پر قائم ہے۔ پھر غیر فطری مساوات کس طرح قائم ہوسکتی ہے۔‘‘

’’اگر آج ساری دنیا اسلام کے اصول اختیار کرے تو سوشلزم اور اشتراکیت کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ صرف اسلامی اصول ہی دنیا کی پیاس اور تشنگی کو دور کرسکتا ہے۔‘‘

☆☆

زکوٰۃ اور اس کا مصرف

● ادارہ

برادرانِ عزیز! عید کا خطبہ جتنا اہم ہے اتنا ہی اس کا وقت مختصر ہے۔ میں طوالت کو نظر انداز کر کے آپ سے بہت ہی مختصر عرض کروں گا۔

برادرانِ عزیز! تم کو معلوم ہے کہ ہر اسلامی حکم میں انفاق کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ انفاق کے معنی یہ ہیں کہ اسلام تمہاری جیبوں سے کچھ چاہتا ہے، حج، زکوٰۃ اور دوسرے احکام میں یہی بات پاؤ گے۔ تفصیل کا موقع نہیں۔

عید کے موقع پر تم لوگوں میں سے بہت سے لوگوں نے فطرہ دے دیا ہوگا اور بہت سے لوگ فطرہ دیں گے۔ لیکن میں تم سے کہوں گا کہ تم میں فطرہ، صدقہ اور زکوٰۃ تقسیم کرنے کا اچھا طریقہ نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس موقع پر ہندوستان کے ہر گوشے سے بھیک مانگنے والے اور گداگر اپنی جھولیاں لئے پہنچ جاتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! تم جانتے ہو کہ زکوٰۃ کیا ہے۔ زکوٰۃ ایک انکم ٹیکس ہے، جو اسلام نے ہر آدمی پر عائد کیا ہے۔ جس نے سال کے بارہ مہینوں میں کھا پی کر ایک خاصی رقم جمع کر لی ہو۔ اسلام کی زکوٰۃ یہ ہے کہ جس آدمی نے سال بھر میں چالیس روپے جمع کر لئے ہوں۔ وہ ایک روپیہ ٹیکس داخل کرے۔ انگریزی حکومت بھی ٹیکس لیتی ہے، لیکن اس ٹیکس میں فرق یہ ہے کہ حکومت ٹیکس لے کر اپنے کاموں پر خرچ کرتی ہے اور اسلام یہ رقمیں غرباء مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کرا دیتا ہے۔ اسلام نے ٹیکس کی رقموں کو تقسیم کرنے کے لئے آٹھ حلقے

بنائے ہیں اور یہ حلقے غرباء اور محتاجوں کے حلقے ہیں۔

برادران عزیز! قرآن حکیم میں زکوٰۃ کا صاف وصریح حکم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ہر صاحب نصاب پر فرض کی ہے۔ قرآن حکیم میں نماز، زکوٰۃ کا ایک ساتھ بار بار ذکر آیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان اس اہم فرض کی ادائیگی کی طرف متوجہ نہیں۔ تم میں سے بعض زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں۔ لیکن زکوٰۃ دینے والے بھی نہ دینے والوں کے برابر ہیں۔ کیونکہ وہ اسلامی احکام کے مطابق زکوٰۃ نہیں دیتے۔

تم کو معلوم ہے کہ انکم ٹیکس وصول کرنے کے لئے حکومت کی طرف کلکٹر مقرر ہوتے ہیں، جو دفاتر اور کھاتوں کی جانچ پڑتال کر کے ٹیکس کی رقمیں متعین کرتے ہیں، لیکن اسلامی ٹیکس ''زکوٰۃ'' نکالنے میں اس قسم کی کوئی صورت پیش نہیں آتی۔ اسلام نے ٹیکس کی ادائیگی میں تمہیں کتنی آسانیاں دے رکھی ہیں۔ تم خود اپنے کاروبار کا جائزہ لو۔ اپنی زندگی کا تعین کرو اور اپنے ہی ہاتھوں سے زکوٰۃ نکالو۔ کیا اس سے بھی زیادہ آسانیاں ممکن ہیں۔

برادران عزیز! یقین مانو کہ تم میں سے جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں وہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں نکالتے اور وہ ان لوگوں کے برابر ہیں جو زکوٰۃ نہیں نکالتے۔ تمہاری زکوٰۃ کی رقمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور تم انفرادی ہاتھوں سے خرچ کرر ہے ہو۔ اسلام کا حکم، صحابہ کا عمل اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ ہونی چاہئیں، انفرادی طور سے خرچ کرنے کی بدعت خلفاء راشدین کے بعد سے پڑی۔

تم کو معلوم ہے کہ خلفاء بنوامیہ کے ابتدائی دور میں صحابہ کرام میں یہ سوال پیش ہوا کہ موجودہ خلیفہ بہت ہی فاسق وفاجر ہے، زکوٰۃ کی رقمیں کیونکر بیت المال بھیجی جائیں، لیکن تمام صحابہ نے اس سے اتفاق کرلیا کہ خلیفہ کے فسق وفجور سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی خلل نہیں آتا، زکوٰۃ کی رقمیں اسی خلیفہ کو بھیجی جائیں، چنانچہ یہی ہوا۔ عباسی دور حکومت میں

جب تاتاری کافروں اور مشرکوں نے بغداد پر قبضہ کرلیا اور خلافت کا خاتمہ کرڈالا تو اس وقت کے مسلمان داعیان واکابر نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر موجودہ حالات کے ماتحت حکومت نہیں بدلی جاسکتی، تو حکومت سے درخواست کی جائے کہ ہماری زکوٰۃ کی رقمیں وصول اور تقسیم کرنے کے لئے قاضی اور عمال مقرر کرے۔

بعض لوگ یہ عذر لاسکتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، اس لئے زکوٰۃ کی اجتماعی تقسیم کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ عذر بالکل لنگ اور بے بنیاد ہے۔ وہ تمہارا کون سا کام ہے، جو رکا رہتا ہے۔ اس حالت میں بھی اگر تم اجتماعی تقسیم کا انتظام کرسکتے ہو، تو یہ عذر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تم فضول، لغو اور غیر اسلامی کاموں کیلئے آئے دن انجمنیں بناتے رہتے ہو، کیا ایک اسلامی کام کے لئے ایسی انجمنیں نہیں بناسکتے، جو تمہاری زکوٰۃ کو اسلامی طریقہ پر خرچ کرسکیں۔

برادران عزیز! دراصل بات یہ ہے کہ یہاں اسلام کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اسلام کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بدل چکا ہے۔ جس طرح تم مکان بناتے ہو۔ اس میں مختلف خانے ہوتے ہیں۔ کوئی خانہ سونے کا ہوتا ہے کوئی باورچی خانہ ہوتا ہے۔ کوئی سامان رکھنے کا خانہ ہوتا ہے۔ ایک انسان اپنے تمام کاموں کے لئے اگر ایک ہی خانہ متعین کرلے اور دوسری ضرورتوں کے لئے اگر اس کا کوئی خانہ نہ ہو تو بتاؤ وہ گھر کا صحیح لطف اٹھا سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح جب تک اسلام کے تمام خانوں کو سامنے نہیں رکھو گے۔ اس فیوض وبرکات سے لطف نہیں اٹھاسکتے۔

دراصل مسلمانوں نے اسلامی احکام کو چھوڑ دیا ہے، البتہ ان میں نمائشی اور بے روح سرگرمیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک زکوٰۃ ہی کے حکم کو دیکھو، اگر مسلمان اس پر عامل ہوتے تو آج ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔ زکوٰۃ اسلام کا اتنا جامع اور اکمل اصول ہے کہ دنیا کا کوئی قانون اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اسلام نے زکوٰۃ کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اس سے غرباء اور

مساکین اورمحتاجوں کی امداد ہوتی ہے۔

اسلام نہیں چاہتا ہے کہ ساری دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع رہے۔اسلام نے مسلمانوں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ اس کی مٹھیاں کھلی رہتی ہیں۔وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں اور کافروں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ ان کی مٹھیاں بند رہتی ہیں۔یعنی نیک کاموں پر وہ خرچ نہیں کرتے۔اسلام نہیں چاہتا کہ دولت کسی کی اجارہ داری میں آجائے یا کوئی شخص اپنے پاس ڈھیر لگائے۔اسلام ڈھیر کا سخت مخالف ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ دولت تقسیم ہوتی رہے۔اس کا یہ اصول زکوٰۃ اور وراثت میں بالکل مساوی بنیاد پر قائم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بارے میں سوشلزم اور اسلام کے اصول ایک ہی ہیں۔ ایسا کہنے والے نہ صرف یہ کہ غلط کہتے ہیں۔ بلکہ دیانتداری کے خلاف کہتے ہیں۔سوشلزم چاہتا ہے کہ دولت کی برابر تقسیم ہو۔اگر ایک آدمی کے پاس سو روپئے ہوں تو سب کے پاس سو روپئے ہونے چاہئیں،لیکن اسلام یہ نہیں کہتا۔اسلام صرف یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کے پاس روپے ہوں۔اسلام حق مساوات تسلیم کرتا ہے۔لیکن مقدار مساوات تسلیم نہیں کرتا۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب آدمی پیدا ہوا،تو اس کی زندگی سوسائٹی پر فرض ہوگئی، سوسائٹی کا فرض ہے کہ اسے زندہ رہنے دے۔اسلام نے اقتصادی مساوات تسلیم نہیں کی ہے۔بے شبہہ اسلام میں اونچ نیچ کا کوئی طبقہ نہیں ہے۔لیکن اسلام نے غرباء اور امراء کے طبقات تسلیم کئے ہیں۔قران میں خداوند کریم نے صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

سوشلزم جس قسم کی مساوات پیش کرتا ہے وہ بالکل غیر فطری ہے۔دنیا کا وجود ہی کشاکش پر قائم ہے۔پھر غیر فطری مساوات کس طرح قائم ہوسکتی ہے۔میں کہتا ہوں کہ آج دنیا میں سوشلزم اور اشتراکیت کے اصول پھیلائے جارہے ہیں اور دنیا ایک اصول کی تلاش میں سرگرداں ہے۔اگر آج ساری دنیا اسلامی اصول اختیار کرلے تو سوشلزم اور اشتراکیت کی قطعی

ضرورت باقی نہیں رہتی صرف اسلامی اصول ہی دنیا کی پیاس اور تشنگی کو دور کرسکتا ہے۔

برادران عزیز!میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں،ان کی رقم برباد ہوجاتی ہیں۔میں تمہارے سامنے اس منبر پر پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ زکوٰۃ کی جو رقمیں اس طرح خرچ کی جاتی ہیں غلط ہے۔میں جانتا ہوں کہ شرعی ذمہ داری کی کیا اہمیت ہے اور اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تم سے بار بار کہتا ہوں کہ زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور سے خرچ کرو۔

تم جانتے ہو کہ اجتماعی طور سے خرچ کرنے میں اسلامی احکام کی بجاآوری کے علاوہ کیا فوائد ہیں۔کاش میں اس کے فوائد سمجھانے کے لئے اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں اور تم اس کی رگوں کو پڑھ سکو۔میں بالکل یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر مسلمان اسلام کے اصولوں کی پابندی نہ کریں اور صرف زکوٰۃ ہی کے اصول پر پابند ہوجائیں۔جب بھی ان کی حالت بہت جلد بدل سکتی ہے،اگر تم نے زکوٰۃ کی رقموں کو اجتماعی طور پر خرچ کرنے کا فیصلہ کرلیا تو یقیناً 24 گھنٹہ کے اندر تمہاری حالت کیا سے کیا ہوسکتی ہے۔

میں نہیں کہتا کہ تم جن فقیروں،ملاؤں،پیروں اور جن لوگوں کو بھی دیتے ہو نہ دو۔میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اجتماعی ہاتھوں سے دو۔اگر تم ان ہی لوگوں کو اجتماعی ہاتھوں سے دے سکتے ہو تو تمہیں کیوں ضد ہوگئی ہے کہ انفرادی ہاتھوں سے دے کر اسلام کے احکام کے خلاف کام کرتے ہو۔

میں کم سے کم کلکتہ کے مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ کوئی ایسی جماعت بنائیں جو ان کی زکوٰۃ کا صحیح مصرف کرسکے اور اس میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے نمائندے شریک ہوں یا ہر طبقہ میں اس قسم کی جماعت بنائی جائے،جو اسلام کی بنائی ہوئی حدود کے اندر ان زکوٰۃ کی رقموں کو خرچ کرسکے،اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری رقمیں ان لوگوں پر خرچ کی جائیں جنہیں تم دینا چاہتے ہو تو یہ کرسکتے ہو کہ اپنی جمعیت کو ان اشخاص کے ناموں کی اطلاع کرو بہرحال کلکتہ کے

مسلمانوں کو میرا مشورہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقمیں اجتماعی طور سے خرچ کرنے کے لئے کوئی ایک نمائندہ جماعت یا متعدد نمائندے جماعتیں بنائیں اور کلکتہ میں اس کی پہلی مثال قائم کریں۔ انشاءاللہ العزیز یہاں کی دیکھا دیکھی اور شہروں میں بھی ایسی ہی جماعتیں بن جائیں گی۔

زکوٰۃ سے متعلق چند اہم مسائل

☆ زکوٰۃ ہر ایسے عاقل، بالغ، آزاد مسلمان مرد عورت پر فرض ہے جس کے پاس حوائج اصلیہ سے زائد اور دیون سے فارغ ساڑھے سات تولہ (87/گرام میلی گرام) سونا یا ساڑھے باون تولہ (612/گرام 36/میلی گرام) چاندی ہو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے بقدر کوئی دوسرا سامان تجارت ہو۔

☆ اگر کسی شخص کے پاس صرف سونا یا صرف چاندی ہو تو ایک کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے۔ اگر سونا اور چاندی دونوں ہوں اور دونوں اپنے اپنے نصاب سے کم ہو تو ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے اور جس کے ساتھ ملانے میں نصاب پورا ہو جائے اور جس میں فقراء کا فائدہ ہو اس کے ساتھ ملایا جائے گا اور اس زمانے میں سونا کو چاندی کے ساتھ ملانے میں فقراء کا فائدہ ہے۔ اس لئے سونا کو چاندی کے ساتھ ملایا جائے گا اگر وہ چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ فرض ہوگی ورنہ نہیں۔

☆ عورتیں جو زیورات استعمال کرتی ہیں اگر وہ بقدر نصاب ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس لئے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

☆ سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے ہر ماہ لازماً جو رقم کاٹ لی جاتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس پر اضافہ کر کے سرکار رقم دیتی ہے جسے پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے یہ پوری رقم سرکار کی جانب سے انعام ہے اس کا استعمال اپنے مصرف میں جائز ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ اس وقت تک فرض نہیں جب تک کہ رقم وصول ہونے کے بعد سال نہ گزر جائے۔

☆ مقروض کو قرض سے بری کر دیا جائے تو اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوگی، اس لئے ادائیگی زکوٰۃ کے لئے رقم دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت ضروری ہے۔

☆ جو مکان یا فلیٹ تجارت کی نیت سے خریدے جائیں ان کی اصل مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ جس مکان یا فلیٹ میں تجارت کی نیت نہ ہو، بلکہ رہائش کا مقصود ہو یا کرایہ پر لگانے کا ارادہ ہو تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ اگر کرایہ پر لگا دیا جائے تو کرایہ کی آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے۔

☆ سامان تجارت اگر بقدر نصاب ہو تو سال پورا ہونے کے بعد اصل سرمایہ کے ساتھ منافع کی بھی زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ یعنی سال پورا ہونے وقت جتنی مالیت ہوگی پوری کی زکوٰۃ دینی ہوگی، خواہ درمیانِ سال میں مالیت گھٹتی بڑھتی رہی ہو۔

☆ بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ خود بیوی پر فرض ہے نہ کہ شوہر پر۔ البتہ اگر شوہر اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

☆ مالک مکان کرایہ دار سے بطور زر ضمانت کچھ رقم پیشگی لیتا ہے تو اس پیشگی لی گئی رقم کی زکوٰۃ نہ تو مالک مکان پر واجب ہے اور نہ کرایہ دار پر۔ اس لئے کہ یہ رہن ہے اور رہن کی زکوٰۃ نہ تو راہن پر ہے اور نہ ہی مرتہن پر۔

☆ صاحب نصاب سال پورا ہونے سے قبل زکوٰۃ کی رقم ادا کر سکتا ہے شرعاً جائز اور درست ہے اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی۔

زکوٰۃ دینے والوں کو خوف وغم لاحق نہ ہوگا:

"ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت وأقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ لهم أجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا یحزنون". (البقرہ۔۲۷۷).

'بے شک جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا اور نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کی، تو

ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس ثواب واجر ہے اور نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن وغم ۔

”الذین ینفقون أموالهم باللیل والنهار سرا وعلانیة فلهم أجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون“. (البقرة ۲۷۴).

(جو لوگ اللہ کی راہ میں رات اور دن پوشیدہ یا کھلم کھلا خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب واجر ہے اور نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)۔

ان دونوں آیتوں میں اللہ پاک (انفاق اور اداء زکوٰۃ کا ثواب واجر دینے کے علاوہ) یہ بشارت دیتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے خوف وڈر اور حزن وملال لاحق نہ ہوگا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اس لیے اس کی صحت میں نہ کوئی کلام ہوسکتا ہے اور نہ تردد۔

خوف وغم کی دو قسمیں ہیں: ایک اخروی، دوسرے دنیوی، پس ایمان کے بعد عمل صالح، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد فی سبیل اللہ سے خوف وغم اخروی کا نہ ہونا تو ظاہر ہے، کیونکہ وہاں خوف وغم جب ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جائے اور احکام اسلام سے روگردانی کی جائے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں زندگی بسر ہو تو پھر خوف وغم کا نام ونشان نہ ہوگا اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے کے بندے اس کی اطاعت کریں اس کو بھی وہ دوزخ میں جھونک دے اور عذاب میں مبتلا کرے۔

زکوٰۃ کا نفع چند گنا ملتا ہے:

”عن أبی امامة قال: قال أبوذر رضی الله عنه: یا نبی الله ﷺ! ارایت الصدقة ما ذا هی؟ قال: أضعاف مضاعفة وعند الله المزید“.

(حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ سے دریافت کیا کہ صدقہ (زکوٰۃ) دینے کا کیا نفع ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند درچند بڑھا کر ملے گا اور اللہ یہاں (آخرت میں) مزید برآں ملے گا)۔

زکوٰۃ سے ستر بلائیں ٹلتی ہیں:

”عن رافع ابن خدیج رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم الصدقة تسدسبعین باباً من السوء“.

(حضرت رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ (زکوٰۃ) برائیوں، یعنی بلاؤں کے ستر دروازے کو بند کردیتا ہے)۔

ادائے زکوٰۃ سے عمر زیادہ ہوتی ہے:

”عن عمرو بن عوف رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم: ان صدقة المسلم تزید فی العمر، ویمنع میتة السوء، ویذهب اللّٰہ بها الکبر والفخر“.

(حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کا صدقہ (زکوٰۃ) دینا عمر کو بڑھاتا ہے اور بری موت (سوئے خاتمہ) سے بچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ صدقہ کی وجہ سے تکبر وفخر کو زائل کردیتا ہے)۔

زکوٰۃ نہ ادا کرنے کا عذاب:

”ولا یحسبن الذین یبخلون بما آتهم الله من فضله هو خیرلهم بل هو شرلهم سیطوقون مابخلوابه یوم القیٰمة ولله میراث السمٰوٰت والارض، واللّٰہ بما تعملون خبیر“. (آل عمران)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے مال ودولت دیا ہے اور اس کی زکوٰۃ نہیں دیتے اور بخل کرتے ہیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل اور منع زکوٰۃ ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ وہ ان کے لیے شر ہے، یعنی عذاب ہے قریب ہے کہ اس مال کا کہ جس میں بخل کیا گیا ہے قیامت کے دن ان کو طوق پہنا جائے گا۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہے اللہ تعالیٰ کی ملکیت تو تمام آسمان وزمین میں ہے اللہ تمہارے عمل سے خوب واقف ہے۔ اس آیت کریمہ میں

تمام اموال زکوٰۃ کی زکوٰۃ نے دینے پر وعید ہے، سونا چاندی کی تخصیص نہیں ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

ہندوستان میں چونکہ نہ اسلامی حکومت ہے اور نہ ہی بیت المال کا سسٹم، اس لئے علماء نے بالاتفاق مصارف صدقات (زکوٰۃ) میں مدارس اسلامیہ کے غریب ونادار طلبا کو بھی شامل کیا ہے۔ درحقیقت قرآن کریم کی آیت مصارف زکوٰۃ: ''اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِنَ اللّٰه''. میں بیان کردہ فی سبیل اللہ میں طلبہ مدارس شامل ہیں۔ چونکہ حدیث میں کہا گیا'' مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِع''.

اس حدیث کی روشنی میں طالبان علوم نبوت فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، اس لئے مدارس اسلامیہ کو زکوٰۃ دینا دوہرا ثواب ہے، ایک امداد غرباء ومساکین کا اور دوسرا اشاعت اسلام کا۔

چونکہ مدارس اسلامیہ کسی مستقل آمدنی یا کسی ریاست کی کفالت میں نہیں چلتے اور مدارس کا وجود اسلام کی بقاء کے لئے نہایت ضروری ہے، اس لئے زکوٰۃ وصدقات سے مدارس کو مضبوط ومستحکم کرنا نہ صرف ضروری ہے، بلکہ یہ زکوٰۃ کے اولین مستحق ہیں۔ جہاں تک مولانا آزادؒ کا موقف ہے اس پر کوئی کلام نہیں، اس کی تاویل ہم اس طور پر کر سکتے ہیں کہ ارباب مدارس بھی زکوٰۃ وصول کرکے اس کے صحیح مصارف پر ہی خرچ کرتے ہیں۔ دوسری طرف اگر زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کی تقسیم کی انجمنوں کو رائج کیا گیا تو اس سے مدارس کو مالی مشکلات کا سامنا ہوگا اور اس کے منفی نتائج سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ علماء دیوبند نے متفقہ طور پر مدارس اسلامیہ کو زکوٰۃ صدقات اور عطیات کا مستحق قرار دیا ہے۔

☆☆

رمضان کے روزے فرض کرنے کا مقصد

● محمد ارشد عالم

رمضان المبارک اسلامی کلینڈر کا نواں مہینہ ہے۔ اس کے آغاز کیلئے ضروری ہے کہ چاند نظر آجائے اگر نظر نہ آئے تو شعبان کے تیس دن پورے ہونے پر رمضان شروع ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مہینہ تیس دنوں کا ہوتا ہے یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کیلئے تیس کی گنتی پوری کرو رمضان المبارک میں بارگاہ الٰہی کی جانب سے رحمتوں اور برکتوں کی بارش ہوتی ہے۔ اس کا ہر لحظہ انوار وتجلیات اور رحم وکرم لئے ہوتا ہے اس ماہ مبارک میں اللہ تعالیٰ کے خزانے مومنوں کیلئے کھلے ہوتے ہیں، سوال کے دامن پھیلانے والے جھولی بھر دی جاتی ہے، سوالی اپنے دامن کو بھرتے بھرتے تھک تو سکتے ہیں مگر دینے والے داتا کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ماہ رمضان کو ایک برکت والا مہینہ کہہ کر فرمایا'' کہ اے لوگو! تم پر ایک عظیم برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے''۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت کے مطابق شعبان کے خطبے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا'' رمضان کے مہینے میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے روزوں کو فرض کیا ہے اور اس میں رات کے قیام کو ثواب کی چیز بتایا ہے، جو شخص اس مہینے میں کوئی نفلی عبادت کرے وہ ایسی ہے جیسے رمضان کے علاوہ دنوں میں فرض عبادت کی اور جو اس مہینہ میں فرض ادا کرے ایسا ہے جیسے اس نے ستر فرض ادا کئے یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غمخواری کرنے کا ہے اور اس

مہینے میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، رمضان المبارک کی سب سے بڑی فضیلت اور برکت یہ ہے کہ اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا جو انسانوں کیلئے نہ صرف خیر و برکت کا موجب ہے، بلکہ ایک ضابطہ حیات اور سرچشمہ رشد و ہدایت بھی ہے۔ نبی پاک ﷺ نے اس مبارک مہینہ کے بہت سے فضائل سے اپنی امت کو آگاہ فرمایا ہے حدیث میں ہے کہ جو کوئی ایمان کے پیش نظر ثواب کی نیت سے رمضان المبارک کے روزے رکھے گئے اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کردئے جائیں گے۔ ماہ رمضان المبارک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیطان کو قید کردیا جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ تو ویسے ہی بہت صدقہ وخیرات کیا کرتے تھے، مگر رمضان میں جود وسخا پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب جبرئیلؑ سے ملاقات ہوتی تھی۔ ہمیں بھی اس مبارک مہینہ میں زیادہ مال اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرنا چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ رمضان کی راتوں کے اکثر حصہ میں قیام فرمایا کرتے تھے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے ’’جس نے ایمان کے پیش نظر اللہ سے ثواب لینے کی خاطر رمضان میں قیام کیا اس کے سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ رمضان المبارک کی راتوں کو نماز تراویح کے بعد اس طرح روزہ رکھا جاسکتا ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر اور عبادت کے بجائے حج کرنا صاحب استطاعت مسلمانوں پر فرض ہے، جبکہ زندگی میں ایک مرتبہ عمرہ کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ رمضان المبارک کے مہینہ میں اگر عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہوجائے تو سونے پہ سہاگہ ہوجاتا ہے، کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ’’رمضان میں عمرہ کرنا میرے ہمراہ حج کرنے کے برابر ہے‘‘ خوش قسمت ہیں وہ جن کو رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں عمرہ کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

☆☆

اسلام: موبائل فون اور رنگ ٹونز

● عبدالجلیل منشی

سائنس کی ترقی نے جہاں انسانوں کے لئے بے شمار آسانیاں پیدا کی ہیں وہاں کئی فتنوں کو بھی جنم دیا ہے اور مسلم امہ ان فتنوں کا خصوصیت کے ساتھ شکار بنی ہے، ان بے شمار فتنوں میں سے ایک موبائل رنگ ٹون کا فتنہ ہے جس نے اچھے خاصے باشعور اور دینی رجحان رکھنے والے لوگوں کو بھی اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ موبائل فون ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ہی بے شمار کمپنیوں نے طرح طرح کے رنگ ٹون متعارف کرائے جن میں عام گھنٹی کی جگہ فلمی گانوں اور موسیقی کے سر فون یا پیغام کے آمد کی اطلاع دینے لگے اور دن بدن اس قسم کی ٹونز میں جدت اور تبدیلی آتی چلی گئی۔

دوسری جانب جب دینی حلقوں میں اس قسم کی رنگ ٹونز کی مخالفت شروع ہوئی تو ان کمپنیوں کو اپنی آمدنی بڑھانے کا ایک اور نادر موقع ہاتھ لگا اور انہوں نے اس طبقے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسلامی رنگ ٹونز کے نام پر اک نئے فتنے کو جنم دیا جس کے سبب مختلف قاری حضرات کی آواز میں قرآن کریم کی آیات کی تلاوت، کہیں اسلامی ترانے تو کہیں حمد و نعت کی گونج موبائل فونوں سے گونجنے لگیں تو کسی کے موبائل فون میں حرم مکی و مدنی میں مانگی گئیں دعائیں رنگ ٹون کی شکل اختیار کر گئیں اور اس طرح دین دار طبقہ اپنے تئیں مطمئن ہوگیا کہ وہ اپنے موبائلوں میں اسلامی ٹونز کا استعمال کر کے ایک طرف تو اجر و ثواب کا مستحق بنا تو دوسرے جانب غیر اسلامی ٹونز سے بچ کر گناہ کے ارتکاب سے محفوظ رہا۔

پہلے مساجد میں نماز کے دوران سادہ ٹونز بجا کرتی تھی پھر موبائل ٹکنالوجی میں ترقی کے ساتھ بدقسمتی سے اللہ کے گھر میں دوران نماز موسیقی گونجنے لگی اور اسی دوران اسلامی ٹونز کی آمد کے ساتھ مختلف اسلامی ٹونز نمازیوں کے خشوع واستغراق میں خلل پیدا کرنے کا سبب بننا شروع ہوگئیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ جاہل، ناسمجھ اور دین سے دور مسلمانوں نے تو اپنے فونوں میں مشرقی اور مغربی موسیقی اور گانے رنگ ٹونز کی جگہ سیٹ کر ہی رکھے ہیں، مگر حیرت ان مسلمان بھائیوں پر ہوتی ہے جو پنجگانہ نماز اللہ کے گھر میں ادا کرتے ہیں اور ان کے موبائلوں سے بھی مساجد میں موسیقی ابھرتی ہے اور انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں کہ موسیقی ہمارے دین اسلام میں حرام قرار دی گئی ہے اور موبائلوں سے موسیقی اور گانوں کی بازگشت جہاں اللہ کے گھر کے احترام کو مجروح کرنے کا باعث بنتی ہے تو دوسری جانب نمازیوں کی عبادات اور خشوع وخضوع میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ جبکہ گانے بجانے اور موسیقی سننے سنانے کا مطلق حرام ہونا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے بھی ثابت ہے، مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے موبائل فونوں میں فلمی گانے اور موسیقی بطور رنگ ٹون سیٹ کر رکھی ہے اور جب قرآن مجید کی تلاوت یا باجماعت نماز کے دوران بیک وقت کئی کئی فونوں سے موسیقی اور فلمی گانے گونجنے لگتے ہیں تو اللہ کی عبادت یا قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول نمازیوں کو شدید دکھ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عام مساجد کے علاوہ حرمین شریفین میں بھی یہ بات دیکھی گئی ہے کہ مکہ المکرّمہ میں دوران طواف یا ادائیگی عمرہ سے متعلق دیگر مناسک کے دوران اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے سامنے بھی رنگ ٹون اور خصوصاً موسیقی اور گانے والے رنگ ٹون معتمرین اور مصلین کے موبائلوں سے بجتے سنے گئے ہیں جو کہ یقیناً ایک گناہ کبیرہ اور حرام کے درجے میں آتا ہے اور جو مسلمانوں کے سب

سے زیادہ مقدس اور محترم مقامات کے تقدس اور احترام کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مساجد کے باہر نمازیوں کے لئے واضح ہدایات تحریر ہوتی ہیں کہ ازراہ کرم مسجد میں داخل ہونے سے پیشتر اپنے موبائل فون بند کردیں، مگر نمازی دیدہ و دانستہ یا نادانستگی میں ان ہدایات پر عمل پیراں نہیں ہوتے۔ بعض بھائی اپنے فون وائبریشن پر سیٹ کر دیتے ہیں۔ فون کو وائبریشن پر رکھنے میں یہ قباحت ہے کہ فون یا پیغام آنے کی صورت میں نمازی کی توجہ نماز سے بھٹک کر آنے والی کال کی جانب مبذول ہو جائے گی اور اس طرح عبادت کی روح متاثر ہوگی، لہٰذا تمام مسلمانوں اور خصوصاً نمازی حضرات کو چاہئے کہ وہ اپنے موبائلوں میں عام سادہ سی رنگ ٹون سیٹ کرلیں، تاکہ اگر وہ مسجد میں داخل ہوتے وقت اپنے موبائل بند کرنا بھول بھی جائیں تب بھی ان سے موسیقی کی بجائے عام سی تنبیہی ٹون برآمد ہوگی اور وہ مسجد میں موسیقی اور فلمی گانے نشر کرنے کے گناہ عظیم سے محفوظ رہ سکیں گے اور عام زندگی میں بھی فون کی آمد پر موسیقی اور گانے سننے سے بچ پائیں گے۔

میوزیکل اور اسلامی فون ٹونز کے بارے میں علمائے دین نے فتوے بھی جاری کئے ہیں جن پر عمل کر کے مسلمان بھائی اور بہنیں نہ صرف یہ کہ گناہوں سے بچ سکتے ہیں، بلکہ اس سہولت سے باحسن طریقے سے مستفید بھی ہوسکیں گے۔ اس بات پر تو یقیناً ہر مکتبہ فکر کے علماء کرام کا اجماعی اتفاق ہے اور اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ عام زندگی میں عموماً اور مساجد اور مقامات مقدسہ میں خصوصاً میوزیکل اور گانوں پر مشتمل رنگ ٹونز کا استعمال حرام ہونے کے ساتھ ساتھ گناہ کبیرہ کا موجب بھی ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہئے۔

اب جس بات پر مسلمانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہے اسلامی رنگ ٹونز. مسلمانوں کا ایک طبقہ علمائے کرام کی رائے کے احترام میں اسلامی رنگ ٹونز کو بھی درست نہیں سمجھتا، جبکہ دوسرا طبقہ اسے باعث برکت و اجر وثواب سمجھتا ہے۔ اسی لئے یہاں علمائے کرام کے فتاوی کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیا جائیگا کہ اسلامی رنگ ٹون کا استعمال جائز اور

مناسب ہے یا نہیں۔

سعودی عربیہ کی علماء کونسل نے اپنے متفقہ فتوے میں قرآنی آیات کو رنگ ٹون کے طور پر استعمال کرنا حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ انکا موقف یہ ہے کہ جب قرآنی آیات پر مبنی رنگ ٹون بجتی ہے تو فون کا جواب دینے کے لئے کال وصول کرنے والا فوراً رنگ ٹون کاٹ کر کال وصول کر لیتا ہے جس کی وجہ سے آیت مکمل نہیں ہو پاتی اور ادھوری اور غیر مکمل آیت کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ویسے بھی قرآن کا نزول انسانیت کی بھلائی اور راہنمائی کے لئے کیا گیا ہے، نہ کہ اسکی آیات مقدسہ کو رنگ ٹون کے طور پر استعمال کرنے کے لئے۔

مصر کے مفتی اعظم مفتی علی جمعہ نے اسلامی رنگ ٹون کی مخالفت میں فتوی صادر کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ قرآنی آیات، آذان، ادعیہ اور احادیث کو رنگ ٹون کے طور پر استعمال کرنے سے گریز کریں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس قسم کی رنگ ٹون غیر مناسب اور گمراہ کن ہیں اور اللہ کے نازل کردہ قرآن کے الفاظ کے معنی تبدیل کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ اللہ کے نازل کردہ کلمات مقدس ہیں اور اللہ نے ہمیں انکی تلاوت اور تسبیح کرنے کا حکم دیا ہے نہ کہ انہیں اجر وثواب کی نیت سے فون رنگ کے طور پر استعمال کرنے کا۔

مفتی اعظم نے کہا کہ مسلمانوں کو پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنی چاہئے اور نماز کے لئے اذان صرف مساجد سے اور اپنے وقت پر دی جانی چاہئے. موبائل فون سے سنائی دینے والی اذان نمازیوں کے لئے پریشانی اور الجھن کا سبب بنتی ہے اور ایک گمراہ کن بات ہے۔

بحرین کے ممتاز عالم شیخ عصام اسحاق نے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ قرآنی آیات کو رنگ ٹون کے طور پر استعمال نہ کریں. انہوں نے کہا کہ عام مسلمان قرآنی آیات کو بطور رنگ ٹون اجر وثواب اور مذہب کی تعظیم کے لئے استعمال کرتے ہیں، مگر عوام الناس دین سے نابلد ہونے کے باعث نادانستگی میں اجر وثواب کی بجائے گناہ سمیٹتے ہیں اور دین کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن رشد وہدایت کا ذریعہ ہے اسے رنگ ٹون کے

مجموعہ القاسم: جلد ششم — تیری عظمتوں کو سلام

طور پر استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

اسلامی رنگ ٹون کی شرعی حیثیت کا تعین کرنے کے لئے دارالعلوم کراچی سے جو فتوی صادر ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ:

”فقہی عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات، ذکر وتسبیح، درود شریف وغیرہ کے کلمات اور ایسی نظمیں یا نعتیں جو ذکر اللہ پر مشتمل ہوں اور ان سے مقصود ذکر اللہ ہو، مثلاً اسمائے حسنی پر مشتمل نظم وغیرہ ایسی تمام چیزوں کو ذکر کے علاوہ کسی اور جائز مقصد کے لئے استعمال کرنے کے جواز اور عدم جواز کا مدار اغراض ومقاصد پر ہے، اگر مقصد شرعا درست ہو تو اس مقصد کے لئے انکا استعمال جائز ہے ورنہ جائز نہیں مثلاً وہ مقاصد دو قسم کے ہو سکتے ہیں: (۱).... تذکیر لذکر اللہ.... (۲).... اعلام.

مذکورہ بالا مقدس کلمات کو فون سننے کی گھنٹی کی جگہ استعمال کرنے سے اگر یہ مقصد ہو کہ کوئی شخص فون کرے تو جب تک فون نہ اٹھایا جائے اس وقت تک وہ اللہ کے مقدس کلام، ذکر اللہ یا دینی یا اصلاحی مضامین پر مشتمل نظموں یا نعتوں سے مستفیض ہوتا رہے تو اس مقصد کے لئے مذکورہ بالا مقدس کلمات کو فون سننے کی گھنٹی کی جگہ استعمال کرنے کی فی نفسہ گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن چونکہ مذکورہ بالا مقصد کے حصول میں شرعا درج ذیل دو خرابیاں لازم آسکتی ہیں، اس لئے ان سے بچنا ضروری ہوگا۔

۱۔ پہلی خرابی یہ لازم آتی ہے کہ اچانک درمیان میں فون اٹھانے کی صورت میں قرآنی آیات درمیان میں کٹ جائیں گی، جس سے ان آیات کی بے ادبی لازم آتی ہے، لہذا قرآنی آیات اس مقصد کے لئے استعمال نہ کی جائیں، نہ سننے میں نہ سنانے میں۔

۲۔ دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے کہ جس شخص کو فون کیا گیا ہے بعض اوقات وہ بیت الخلاء میں ہوتا ہے تو فون آنے پر ایسی حالت میں مذکورہ مقدس کلمات کے موبائل فون پر جاری ہونے میں بے ادبی ہوگی، لہذا مقدس کلمات فون سننے کی گھنٹی کی جگہ استعمال نہ کئے جائیں۔

اور اگر دوسرا مقصد یعنی ''اعلام'' پیشِ نظر ہو، یعنی مذکورہ مقدس کلمات کو اس لئے موبائل فون میں مقرر کیا جائے، تاکہ اسکے ذریعے فون آنے کی اطلاع ملنے کا فائدہ حاصل ہو تو اس مقصد کے لئے مذکورہ بالا کلمات کو استعمال کرنا درست نہیں، مکروہ ہے۔

۳۔ فون کرنے والا اگر کسی شخص کو فون کرے اور اس نے اپنے موبائل میں قرآنی آیات کی ریکارڈنگ لگا رکھی ہو اور اسکے فون اٹھانے کی صورت میں آیت درمیان میں کٹ جاتی ہے تو اس کی ذمے داری اس شخص پر ہے جس نے اپنے فون میں اس قسم کی ریکارڈنگ لگائی ہے۔

اگر کسی شخص نے گانے کی ریکارڈنگ اپنے فون میں مقرر کر رکھی ہے اور فون کرنے والے شخص کے کان میں اس گانے کی آواز بلا اختیار آئے تو اس صورت میں وہ فون کرنے والا شخص گناہ گار نہ ہوگا، ہاں قصداً سننے سے وہ گناہ گار ہوگا، اس لئے حتی الامکان سننے سے اجتناب ضروری ہے۔

۴۔ گاڑی کی اسٹارٹنگ میں مقرر کی گئی ''دعاءِ سفر'' کی ریکارڈنگ اگر گاڑی اسٹارٹ ہونے کے بعد مکمل ہو کر ختم ہوتی ہے، درمیان میں ناتمام طور پر نہیں کٹتی تو اس کے مقرر کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس صورت میں دعاءِ سفر کی تذکیر پائی جاتی ہے، جو ایک نیک مقصد ہے۔

مندرجہ بالا فتاوی کی روشنی میں ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اجر و ثواب اور دین سے محبت کے اظہار کے لئے کیا جانے والا عمل علم کی کمی کے سبب کہیں ہمیں اللہ کی رحمت و مغفرت کی بجائے اسکے غضب اور ناراضگی کا سزاوار ٹھرانے کا سبب نہ بن جائے۔ ہر مسلمان کو دین کا اتنا بنیادی علم تو ضرور ہونا ہی چاہیئے کہ جس کی بنیاد پر وہ نیک اور بدعمل کا فرق سمجھ سکے اور لاعلمی کے سبب نیکی کے بجائے معصیت کا ارتکاب نہ کر بیٹھے۔

☆☆

برما اور روہنگیا مسلمان

سفرنامہ برما

● ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

گزشتہ چند سالوں سے ’برما‘ کے جو ناگفتہ بہ حالات ہیں اس نے وہاں کی پوری تاریخ بالخصوص مسلم تاریخ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے، جو امت مسلمہ کیلئے نہایت ہی المناک ہے۔ معارف قاسم کے گزشتہ رمضان المبارک کے شمارہ میں بھی میں نے برما کے موجودہ حالات پر اسی خصوصی پیش کش کالم کے تحت ایک ضمیمہ شائع کیا تھا، جس میں برما میں مسلمانوں کی نسل کشی، عبادت گاہوں اور دینی مدارس کو نذر آتش کیے جانے اور خواتین و معصوم بچوں پر انسانیت سوز مظالم کی داستاں ’برمی حکومت کے دلخراش مظالم‘ کے نام سے مولانا محمد صدیق ارکانی صاحب کی تحریر کو من وعن شائع کیا تھا جسے قارئین اور ہمدردان ملت نے بہت پسند فرمایا۔

برما کی قدیم تاریخ اور وہاں کے علماء، دینی مدارس اور مذہبی علوم وفنون کی روشن تاریخ کو جاننے کیلئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، کے ۱۹۵۶ء کے ’’سفر برما‘‘ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے جو برما کی ماضی کی شاندار تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ اس سفرنامہ کو خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف) جو حضرت مہتمم صاحبؒ کے اس تاریخی دورہ کے رفیق سفر تھے، نے مرتب فرمایا ہے۔ ہم بے حد ممنون ومشکور ہیں حضرت مولانا قاری یعقوب پٹیل فلاحی امام وخطیب جامع مسجد روسٹین برگ (جنوبی افریقہ) شاگرد رشید حضرت مولانا

ابراراحمد دھولیویؒ استاذ حدیث دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر گجرات، خلیفہ ومجاز حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند) جن کے توسط سے مذکورہ دونوں کتابچے مجھے دستیاب ہوئے۔ **جزاکم الله احسن الجزا**"

میں نے اس کتابچے کو اس شمارہ میں اس لئے شامل اشاعت کیا ہے تاکہ برما کے اس عہد کا موجودہ حالات سے موازنہ کرنے میں آسانی ہو۔ مجھے امید ہے کہ معارف قاسم کی یہ دلچسپ پیش کش بھی قارئین کرام کو خوب خوب پسند آئے گی۔

☆☆

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے تاریخی سفر برما کے دلچسپ واقعات

سفرنامہ برما

● خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی

انتساب:

عالیجناب سیٹھ اسمٰعیل محمد باگیا صاحب باگیا اینڈ سنز رنگون کی دعوت پر ۱۹/دسمبر ۱۹۵۶ء کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے برما کا سفر فرمایا۔ دارالعلوم دیوبند کی عالمگیر شہرت و مقبولیت اس کے علمی فیضان کی مرہون منت ہے۔ اہل برما کے ساتھ بھی دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی علاقہ کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ نہایت قدیم ہے۔ جس کی سب سے بڑی دلیل دارالعلوم دیوبند کے وہ ہزاروں برمی علماء وفضلاء ہیں جو اسوقت رنگون، مانڈلے، مولمین، مکٹیلا اور اکیاب کے دور دراز علاقوں میں نہایت خاموشی کے ساتھ اسلاف کرام کے نقش قدم پر تعلیم وتدریس وغیرہ کے ذریعہ دینی رہبری فرمارہے ہیں۔

عالم اسلام کی اس عظیم مرکزی درسگاہ کے ساتھ جو مخلصانہ تعلق اہل برما کو ہے، باگیا صاحب کی دعوت اس کی تجدید وتوثیق کا ایک روشن بات تھی، میزبان محترم کی فیاضانہ میزبانی جہاں لائق صد تشکر ہے وہاں آپ کی دارالعلوم دیوبند کے حق میں بے لوث وشب و روز کی جدوجہد لائق صد ہزار تشکر ہے کہ جس سے دارالعلوم کے اخلاقی حلقہ اثر میں تاریخی وسعت پیدا ہوئی اور اسی کے ساتھ موصوف کی مساعی جمیلہ سے برما کے بافیض مسلمانوں

نے دو لاکھ سے زائد کی گرانقدر رقم سے دارالعلوم کی خدمت فرمائی۔ یہ رقم برما سے واپسی کے چند ماہ بعد قانونی مراحل سے گزر کر دارالعلوم میں پہنچ گئی۔ ادھر کثرت کار کی بنا پر ترتیب سفرنامہ میں بھی قدرے تاخیر ہوئی اور حسن اتفاق کہ ترتیب سفرنامہ اور وصولیابی رقم قریب قریب زمانوں میں ہوئی، اسی تقریب زمانی کی مناسبت سے یہ سفرنامہ میں داعی محترم جناب اسمٰعیل باگیا صاحب کی خدمتمیں بصد خلوص وتشکر پیش کرتا ہوں۔ع

”گر قبول افتد زہے عزو شرف“

(احقر) محمد سالم قاسمی دیوبند

سفرنامہ برما:

دارالعلوم دیوبند کی یہ ایک تاریخی صداقت ہے جس میں اس کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ کے اخلاص کامل کو حقیقت بیں نگاہیں فوراً پالیتی ہیں کہ اس کی مرکزیت کو اس کے یوم تاسیس سے ہی قلوب نے تسلیم کرلیا تھا، اور اس کا بہت ہی مختصرترین وقت میں مفکرین نے زبان وقلم سے اعتراف کرلیا، اور یہ اعتراف ایک حقیقت کا اعتراف تھا، اس لئے آج تک اس عظیم درس گاہ کا مؤید من اللہ وقار ہمہ روز مائل بہ ترقی ہے اور اس کے بانی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص مقبول کے طفیل یقین واثق ہے کہ مینارۂ نور ہمیشہ علم وہدایت کی ضیاپاشیوں سے گمراہی کی تاریکی کا پردہ فاش کرتا رہے گا۔ع

ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین باد!

”دارالعلوم دیوبند“ کی مرکزیت کو آج دلائل وشواہد کی ضرورت نہیں رہی لیکن اخلاص مند قلوب کو اپنے ”مرکز علم“ کی ہر کامرانی کی لذیذ حکایت سے دراز ہونے کے باوجود ناآشنا ذہنوں تک یہ حقائق مستقبل میں ان کے لئے راہ استفادہ ہموار کرتے ہیں، اس لئے حکیم الاسلام حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کے تاریخی سفر برما

کے جستہ جستہ واقعات نذر قارئین کئے جارہے ہیں، جو تاریخی حیثیت سے دارالعلوم کی بین الاقوامی مرکزیت پر ناقابل شکست دلیل بھی ہیں اور مسلمانان ”برما“ کے محسنانہ سلوک پر سپاس وشکر گزاری بھی۔

۲۲ر محرم الحرام ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹ر اگست ۱۹۵۷ء بروز دوشنبہ ”دارالعلوم دیوبند“ کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے جس میں مسلمانان برما کا مخلصانہ اور گرانقدر دو لاکھ روپے سے زائد کا عطیہ پانچ ماہ تک قانونی مراحل طے کرنے کے بعد دارالعلوم کو بصورت ڈرافٹ وصول ہوا۔ **فللہ الحمد والمنۃ** جس کے لئے دارالعلوم مسلمانان برما کے ساتھ ساتھ ”حکومت برما“ کا عموماً اور عالی جناب مسٹر اونو وزیر اعظم برما، اور مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر عدل وانصاف حکومت برما کی خدمت میں ”نذرانہ تشکر“ کرتا ہے، اور دعاء گو ہے کہ ایشیا کا یہ نونہال ملک اپنے مخلص رہنماؤں کے زیر سایہ رہ کر ایشیا کے لئے باعث صد افتخار ہو۔

اس رقم خطیر کی یکمشت وصولیابی بھی تاریخی ہونے کے ساتھ وابستگان ومخلصین دارالعلوم کی مسرتوں میں ایک مستقل مسرت کا سبب بن رہی ہے اس لئے سفر برما کے اس کامیاب نتیجے کے موقعہ پر ہم یہ مختصر سفرنامہ پیش کرتے ہیں اور دعاء کرتے ہیں کہ علوم دینیہ کی اس عظیم دانش گاہ کی ہر ”آج“ اس کی ہر ”کل“ سے بہتر وفزوں تر ہو۔ آمین!

چار سال قبل ۱۹۵۲ء میں جناب اسمٰعیل محمد باگیا صاحب کا دعوت نامہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو برما سے موصول ہوا، جس میں موصوف نے نہایت اخلاص مندی سے مسلمانان برما کی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ آں محترم کی ذات گرامی سے جو ایک فیض عظیم آج ہندوپاک کے مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے وہ دلائل سے بالاتر ہے علم وعرفان کے ممتاز رہنماؤں سے، جس قدر سرزمین ہندوستان بانصیب ہے اسی درجہ میں سرزمین برما ضرورت مند! اس لئے آں محترم قیمتی وقت کا ایک مختصر حصہ ہمیں عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔ اور اس کے ساتھ ہی رنگون کی معزز خواتین کی جانب سے اہلیہ محترمہ حضرت مہتمم صاحب کو دعوت دی

گئی۔ اس دعوت کی محرک دراصل وہ خواتین تھیں کہ جو سنین گذشتہ میں آں محترمہ کے ساتھ سفر حج میں طویل عرصہ تک ساتھ رہ چکی تھیں، اور اسی وقت سے بذریعہ مراسلت اس دعوت کی تجدید وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھیں۔

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے حسب عادت اس طلب صادق پر لبیک فرمایا اور برما کا یہ سفر منظور فرمالیا۔ لیکن آج کی قانونی دنیا میں ان ''فائلوں'' کا پیٹ بھرنا ضروری ہے کہ جو کاغذی ہونے کے باوجود آہنی پردوں سے کم نہیں ہوتے۔ ''دارالعلوم دیوبند'' سیکولر ہندوستان میں اپنے روایتی طرز و انداز کے ساتھ تعلیم و تعلم کے مقدس کام میں مصروف ہے، اور یہ وہی دارالعلوم ہے کہ جس نے سب سے پہلے ہندوستانیوں کو گم شدہ دولت آزادی کی اہمیت وحقیقت بتلا کر طوق غلامی نکال ڈالنے کی ترغیب دی، اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کو خوش دلی کے ساتھ جان پر کھیل جانے کا مقدس سبق دیا، شاملی کے میدان کے خوں آشام ذرے جنگ آزادی کی اولین قربان گاہ ہونے کی آج بھی شہادت دے رہے ہیں، مظفرنگر جیل کے قید وسلاسل آج بھی اعلاء کلمۃ الحق کے لئے ابھرنے والے ہاتھوں کو مجبوراً کریدنے پر خون کے آنسو رو رہے ہیں اور دیوبند کا ذرہ ذرہ آج بھی اس پر سر ابھار کر تاریخی سچائی کے ساتھ اس کا مدعی ہے کہ اس نے فرنگی استبداد اور رسمی اقتدار کو خاطر میں نہ لا کر آزادی کی اس روح اور فکر کی اس حریت کو دلوں میں زندہ وتابندہ رکھا، اس کے بزرگوں نے جان و مال کی گرانباز قیمتیں ادا کر کے آزادی کے تصور، حفاظت کی اور بخت و وقت نے جس لمحے میں اجازت دی اسی لمحے میں یہ دولت، امتیاز مذہب وملت ہندوستان کے ایثار پسندوں کو بانٹ دی گئی۔ یہ ہی نہیں سفید فام چوروں کی ہوسناک نظروں سے بچا کر یہ قیمتی سرمایہ ''ریشمی رومال'' میں کر کے افغانستان پہنچایا گیا، اور حریت فکر کے ان مفلس سرمایہ دار امینوں کو فرنگیوں نے چور قرار دے کر عالم کی سب سے بڑی امن گاہ ''مکۂ مکرمۂ'' میں بھی مأمون دیکھنا گوارا نہ کیا اور بالآخر بدانیش غیر ملکی سفید فام سوداگروں نے

اپنی دانست میں ''مالٹا'' کو اس کا مدفن بنانے کی ٹھان لی، لیکن ساڑھے پانچ سال میں ان کے سامنے یہ تجربہ تلخ حقیقت بن کر سامنے آ گیا کہ فکر کے اس سرمایہ کو جتنا زیادہ دبایا گیا اتنا ہی یہ ہندوستان گیر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس آتشیں فکر نے جب جامۂ عمل پہنا تو ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو روشن ترصبح کو خاک پاک ہند کے بینا سپوتوں نے فرنگیوں کو نابینا دیکھا۔

مستقبل کے مؤرخ کے قلم کے ساتھ اگر دیانت ہمرکاب رہتی تو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دارالعلوم دیوبند کی حریت نواز تاریخ کے ذکر کے بغیر وہ اپنی کاوشوں پر نامکمل ہونے کا ایک واقعی الزام لینا ہرگز گوارا نہ کرے گا۔

''دارالعلوم دیوبند'' کی اس باعظمت تاریخ اور امن وسلام اور وطن دوستی کی اس بے مثال درس گاہ کے شاندار ماضی کے عملی اعتراف کے باوجود آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر ایک حقیقت ہے کہ اسی محسن دارالعلوم کے ذمہ دار اعلیٰ حضرت مہتمم صاحب کی پاسپورٹ کی درخواست قانون کی پر پیچ اور طویل وادیوں سے گذرے بغیر نہ رہ سکی کیوں کہ آئین بہرحال آئین ہے، اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر کے غیر ملکی سفر ہمیشہ ہندوستان کے لئے باعث عزت رہے ہیں۔ خود حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ۱۹۲۹ء میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے افغانستان سے خراج عقیدت وصول کیا، اور ۱۹۳۴ء میں حجاز کے مرحوم بادشاہ سلطان ابن سعود رحمۃ اللہ علیہ کی ہندوستان کیلئے نیک تمنائیں ایک بلند مرتب ہندوستانی کی حیثیت سے حاصل کیں۔ آج برما کے باعزت شہری اسی مؤقر شخصیت کے واسطہ سے ہندوستان کے لئے اپنے خلوص ومحبت کا ہدیہ بھیجنا چاہتے ہیں، لیکن اس محبت کی قدردانی میں دفتری نظم باعث تاخیر بنا۔

وقت گذرتا چلا گیا، ایک دو تین چار سال گذر گئے، انٹرنیشنل پاسپورٹ کا مسئلہ صوبوں سے مرکز نے لے لیا، برما کے داعیٔ محترم اس عرصہ میں مسلسل اس سفر پر مصر رہے، پاسپورٹ کی جدوجہد کا از سر نو آغاز ہوا اور مہینوں کی مسلسل تگاپو دیوبند سے دہلی تک کے ان

گنت سفروں کے بعد وہ پاسپورٹ ملا کہ جو چار سال تک فائلوں کی گود میں سوتا رہا۔

بہر حال اس کشاکش بے سبب کے بعد ہی سہی پروانۂ راہداری مل گیا اور بیسویں صدی کا برقی کبوتر ہوا کے دوش پر یہ مژدۂ جانفزا لے کر آنکھ جھپکتے میں رنگون پہنچ گیا۔ ویزا کے مراحل طے ہوئے اور ۱۸؍دسمبر ۱۹۵۶ء کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ بمعہ اہلیہ محترمہ عازم رنگون ہو گئے اور والدین محترمین کے شرف رفاقت کا قرعہ فال بنام راقم الحروف نکل آیا۔

اساتذہ ومتوسلین دارالعلوم اور اہل شہر نے دیوبند اسٹیشن پر نصرت وکامرانی کی مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا۔ شب میں دہلی قیام کے بعد علی الصباح ''کالکا ایکسپریس'' سے کلکتہ روانہ ہو گئے، اور ۲۰؍دسمبر کو بخیریت یہ سفر پورا ہوا۔ ہاوڑہ اسٹیشن پر عالی جناب شیخ غلام رسول صاحب، مفتی محمد احمد صاحب اور دوسرے معززین موجود تھے۔ کلکتہ سے رنگون تک انتظام سفر شیخ غلام رسول صاحب کے سپرد تھا، حضرت مہتمم صاحب نے ہدایت فرمائی تھی کہ انتظام سفر بحری جہاز سے کیا جائے، کیونکہ حضرت موصوف کو طبعاً ہوائی جہاز کا سفر ناپسند ہے، لیکن کوشش کے باوجود بحری جہاز میں سیٹوں کا بکنگ نہ ہو سکا، اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ لے لئے گئے۔ ۲۲؍دسمبر روانگی کے لئے طے ہو گئی، لیکن ۲۱ کو اچانک اطلاع ملی کہ بحری جہاز ''ایم، ایس، سانتھیا'' میں فرسٹ کلاس کی تین سیٹیں فارغ ہو گئیں۔ حاجی صاحب موصوف نے فوراً جدوجہد کر کے وہ ریزرو کرالیں اور اس طرح حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی اس خواہش کی تکمیل کا بھی حق تعالیٰ نے سامان فرمادیا۔

۲۶؍دسمبر ۱۹۵۶ء کو یہ جہاز کلکتہ سے روانہ ہوا، اور پرسکون بحر ذخار میں سفر کو پرلطف بناتا ہوا ۲۹؍دسمبر ۱۹۵۶ء کو ۳؍بجے بندرگاہ رنگون پر لنگر انداز ہو گیا۔ بندرگاہ پر داعیٔ محترم مسٹر اسمٰعیل صاحب باگیا، یوسف صاحب باگیا، ایوب صاحب باگیا باوا صاحب، مولانا مفتی اسمٰعیل گورا صاحب، مولانا مفتی محمود داؤد یوسف صاحب ناظم دارالعلوم تانبو سے رنگون بمعہ طلبائے مدارس عربیہ اور شہر کے دیگر معزز تجار وعلماء اور عوام کا مجمع عظیم موجود تھا،

جہاز سے اتر کر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نیچے تشریف لائے تو فضاء ''حضرت مولانا محمد طیب صاحب زندہ باد!'' ''دارالعلوم دیوبند زندہ باد!'' کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی، پرتپاک وباحترام استقبال کے ساتھ مخلصین کا یہ مجمع قیام گاہ تک لایا، باگیا فیملی کی مستورات بھی دیگر معزز خواتین کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کی اہلیہ محترمہ کے استقبال کے لئے گودی پر موجود تھیں، جو بالا بالا ان کو قیام گاہ پر لے گئیں، باگیا خاندان خصوصاً اور اہل رنگون عموماً حضرت مہتمم صاحب کی اس قدم رنجہ فرمائی پر نہایت مسرور وشاداں نظر آرہے تھے، صبح سے شام تک ہمہ وقت ایک مجمع مصروف استفادہ رہتا، میزبان محترم نے طویل سفر کی رعایت فرماتے ہوئے تین روز تک کوئی پروگرام نہیں رکھا، بلکہ مجالس مذاکرہ پر اکتفاء کو جاری رکھا، تین روز کے بعد پروگرام بنایا گیا، رنگون کی روایات کے مطابق ضروری تھا کہ ہر ہر اسٹریٹ میں روزانہ جلسہ ہو، اور ہر ہر اسٹریٹ کی جانب سے قبل از وقت دعوت نامہ موصول ہو چکے تھے، لیکن حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ بلافصل روزانہ تقریر نہیں کر سکوں گا، اور روزانہ بھی اگر ہو تب بھی ہر اسٹریٹ کی دعوت منظور کر لینے کی صورت میں تو قیام کے لئے پانچ ماہ بھی ناکافی ہوں گے، اس لئے تقریریں فصل سے رکھی جائیں، اسمٰعیل باگیا صاحب نے از راہ مہمان نوازی اس کو منظور فرمایا اور پروگرام یہ بنایا کہ ایک روز جلسہ عام ہو، اور ایک روز مجلس مذاکرہ ہے، جس میں لوگ اپنے علمی وفکری مسائل کا حل دریافت کریں۔

پروگرام کے مطابق تین روز بعد یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی اولین تقریر ''سورتی سنی جامع مسجد'' میں ہوئی، یہ پروگرام داعی محترم اسمٰعیل صاحب کی کوششوں کے باوجود طوالت سے نہ بچ سکا اور اوسطاً یومیہ تقریر کی رنگونی روایات غالب آکر رہیں۔

محمد سالم قاسمی

دارالعلوم دیوبند

یکم جنوری ۱۹۵۶ء: نمازِ عشاء کے بعد رنگون کے دیندار مسلمانوں کا ایک عظیم مجمع سورتی سنی جامع مسجد میں جمع ہوگیا اور ساڑھے نو بجے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے تقریر شروع فرمائی۔

یہ تقریر تمہید کے بعد ''عظمت نبوت'' اور ''عظمت انسانیت'' کے تمام گوشوں پر نہایت جامعیت و دلکشی کے ساتھ اڑھائی گھنٹے جاری رہی اور تشنہ علوم قلوب کے لئے ہر ہر لفظ آب حیات کا حقیقی مصداق بنتا رہا۔

۲ جنوری: کا دن پروگرام کے مطابق تقریر سے فارغ رہا، البتہ مجلس مذاکرہ صبح آٹھ سے بارہ بجے تک، اور رات کو ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک جاری رہی اور مختلف پیچیدہ علمی مسائل اور اہلسنت والجماعت کے متفق علیہ مسلک سے علیحدہ بعض جدید نقطہ ہائے فکر زیر بحث آئے، جیسے انکار حجیت حدیث یا بعض غالی اہلحدیث حضرت کے اقوال سے پیدا ہونے والے شبہات پر لوگ سوالات کر کے جوابات حاصل کرتے رہے۔

۳ جنوری: تیسرا روز ہے، جلسہ عام کا انتظام ''بنگالی مسجد سولی پگوڈا روڈ'' میں ہے، صبح کی مجلس مذاکرہ میں بعض حضرات نے درخواست کی کہ آج کے اجتماع میں حضرت ''حجیت حدیث'' کے موضوع پر ہی تقریر فرمائیں جسکو منظور فرمایا۔ ''بنگالی مسجد'' رنگون کی بڑی اور مرکزی مساجد میں سے ایک ہے اور اس مسجد سے علمی طبقہ کی وابستگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں ایک طویل عرصہ سے مفسر قرآن حضرت مولانا دین محمد صاحب ڈھاکوی فاضل دیوبند اپنے دل کش انداز میں درس قرآن دے رہے ہیں، اور فن تفسیر کا درس کچھ مولانا موصوف کے ساتھ اپنا لازم ہوگیا ہے کہ اگر اس کو موصوف کی فصل ممیز کہد یا جائے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ موصوف اس زمانہ میں ڈھاکہ گئے ہوئے تھے اوائل فروری میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی موجودگی ہی میں تشریف لے آئے تھے، اور قلبی محبت و مدارات کے ساتھ ملتے، اور آتے جاتے رہے۔

شب میں ۹ بجے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ جلسہ گاہ پہنچے، مجمع عظیم محوِ انتظار تھا، تلاوت وغیرہ کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے ''حجیت حدیث'' کے موضوع پر جامع ترین تقریر فرما کر سامعین کو محظوظ و مطمئن فرمایا۔

۵ جنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ''مدرسہ مجیدیہ'' کا معائنہ فرمایا اور اس میں بعض طلبہ کا امتحان بھی لیا، اور اس کے کافی دیر بعد تک علمی مجلس جاری رہی، اور تعلیم کے ارتقائی منازل پر مبسوط تقریر فرمائی جس سے اراکین مجلس محظوظ بھی ہوئے اور مستفید بھی، اور قریباً اڑھائی گھنٹے اس میں صرف ہوئے۔

۶ جنوری: بعد نماز عشاء ''پاکستان کنفکشنری'' کی دعوت پر فریزر اسٹریٹ میں حضرت مہتمم صاحب نے خطاب عام فرمایا جس میں اسلام کی حقیقت اور اس کے عناصر ترکیبی پر تفصیلی روشنی ڈالی، سامعین ہمہ تن گوش اور محو تھے، یہ معرکۃ الآراء تقریر تین گھنٹے جاری رہی۔

جلسہ کی صدارت عالی جناب مسٹر خلیل الرحمٰن صاحب سفیر پاکستان برائے برما نے فرمائی۔

احقر راقم الحروف اس جلسہ میں شریک نہیں ہوسکا کیوں کہ ''سریَم'' جانے کے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہاں حاضری دینی تھی، سریم ''رنگون'' سے چند میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے، جو اہل رنگون کے لئے سیر گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوری بستی سرسبز شاداب ہے، جانے کا راستہ صرف بحری ہے، اسٹیمر چلتے ہیں، احقر کو عالی جناب مسٹر اسمٰعیل لسنیا صاحب تاجر رنگون لے گئے اس قافلے میں بیس پچیس دیگر مقررین کو بھی موصوف نے مدعو کیا تھا، بالخصوص داعی محترم اور جناب مولوی محمد ایوب گورا باوا صاحب خطیب جامع مسجد ماسال کی خصوصی عنایت و کرم فرمائی رہی اور پورا سفر بڑی دلچسپی کے ساتھ گذرا۔ بعد ظہر داعی محترم کی فرمائش پر احقر نے تقریر کی اور نماز عصر کے بعد یہ پورا مجمع رنگون واپس آیا۔

۷ جنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی تشریف آوری کے بعد سے ہر ادارے کی یہ

خواہش تھی کہ حضرت مہتمم صاحب وہاں ضرور تشریف لے جائیں۔ چنانچہ تمام مسلم اداروں میں حضرت مہتمم صاحب نے تشریف لے جاکران کی خواہش پوری کی۔

اسی ذیل میں آج آپ نے ''ذمہ دار ادارہ ڈاکٹر ملا محمد صاحب'' کی فرمائش پر مسلم فری ڈسپنسری کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ اس عظیم ادارے کو رنگون کے باخبر مسلمان تاجر بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ چلا رہے ہیں، لاکھوں روپے کی ضروریات یہ ہی حضرات پوری فرماتے ہیں، اس میں ہر قسم کا علاج معالجہ اونچے پیمانے پر ہوتا ہے، قیمتی مشینیں اور ضرور سامان اس میں مہیا ہے اور مختلف اس کے سیکشن ہیں، کہیں آنکھ کا علاج ہوتا ہے، کہیں دانت کا، مختلف اسپیشلسٹ مسلم ڈاکٹروں نے اپنی رضا کارانہ خدمات ڈسپنسری کو دے رکھی ہیں، اور خلق خدا کی اس خدمت سے وہ حضرات اپنی آخرت سنوار رہے۔ جزاہم اللہ۔

ہمارے میزبان محترم مسٹر اسمٰعیل باگیا صاحب بھی اس کے خصوصی اراکین میں ہے، اور دیگر اجتماعی خدمات کی طرح اس میں بھی پوری پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب نے معائنہ کے بعد کارکنان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور مسرت کا اظہار فرمایا۔

جیسا کہ سابق میں بھی ذکر کر چکا ہوں کہ برما کے مسلم وزراء کی عوام و خواص سے یکساں بے تکلفی آج کے دور میں مثالی کہی جاسکتی ہے، آج وزیر معدنیات حکومت برما عزت مآب مسٹر عبدالرشید صاحب بغرض ملاقات حضرت مہتمم صاحب کے پاس قیامگاہ پر تشریف لائے، موصوف ایک ذی ہوش و مدبر کی حیثیت سے اپنی اہم ذمہ داریوں اور اس میں پیش آنے والی الجھنوں کے بارے میں مختلف سوالات کے ذریعہ دینی رہنمائی حضرت مہتمم صاحب سے حاصل کرتے رہے۔

حق تعالیٰ ان صالحانہ جذبات وعمل میں برکت عطا فرمائے، آج کے دور میں یہ تو اور غنیمت ہی غنیمت ہیں۔

۸/جنوری: شب میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ۳۰/اسٹریٹ میں تقریر فرمائی

عوام کے بے تحاشا مجمع کا حقائق وعلوم سے گہرا تأثر چہروں سے ظاہر ہورہا تھا اور طلب صادق کا صحیح اندازہ وہیں ہوتا ہے کہ جہاں لوگوں کو مواقع کم میسر آتے ہیں۔

۹/جنوری: راقم الحروف کا مقصد رفاقت بامر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ یہ ہی تھا کہ عوامی اجتماعات میں بیانات کے تسلسل کی گرانباری میں فی الجملہ اور بقدر بساط فرومایہ ہلکا کرنے کا فرض انجام دے سکوں۔ چنانچہ آج ارکانی جامع مسجد رنگون کی جانب سے احقر کو دعوت نامہ موصول ہوا، اور بعد نماز عشاء احقر نے وہاں طالب علمانہ معروضات پیش کیں۔

دن میں ۱۰/بجے حضرت مہتمم مدظلہ مولانا المحترم ابراہیم احمد صاحب مظاہری، اور عزت مآب مسٹر عبدالرشید صاحب کی خصوصی دعوت پر ''زینت بوائز'' تشریف لے گئے، یہ علمی ادارہ وزیر موصوف کی حمایت اور مولانا مظاہری صاحب کے زیر قیادت برمی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ کا اہم فرض انجام دے رہا ہے۔ مولانا مظاہری کے علاوہ اس خدمت کی انجام دہی میں مولانا غازی ہاشم صاحب اور بعض دیگر علمائے کرام مصروف عمل ہیں، ترجمہ نہایت جانفشانی تحقیق اور اطمینان بخش طریقے پر کیا جارہا ہے۔ برمی زبان میں حقائق قرآنیہ کی صحیح تعبیر کے لئے چوں کہ الفاظ کی کمی ہے، اس لئے ان حضرات کو اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ وضع اصطلاحات میں لگانا پڑا، لیکن اس مرحلے سے فراغت کے بعد اب کام تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے، حق تعالیٰ ان حضرات کی مخلصانہ محنتوں کو نافع ومقبول فرمائے۔

ترجمہ کے ذیل میں جو علمی اشکالات پیدا ہوتے ہیں اوپر یہ حضرات پوری تحقیق کرتے ہیں، حضرت مہتمم صاحب کی تشریف آوری کے بعد ان حضرات نے بہت سے پیچیدہ مسائل میں حضرت موصوف سے استفادہ علمی فرمایا اور مطمئن ہوئے حضرت مہتمم صاحب بھی ان حضرات کی علمی کاوش وخدمت سے بیحد متأثر ہوئے وزیر موصوف اس دلچسپ علمی مجلس میں از اول تا آخر شریک رہے اور محظوظ ہوتے رہے۔

اس معائنہ کا دراصل مقصد ہی اشکالات تھا، داعی حضرات نے ایک مرتبہ پھر تشریف

آوری کی حضرت مہتمم صاحب سے درخواست کی جسکو آپ نے بخوشی منظور فرمایا۔لیکن کثرت مشاغل کی وجہ سے اس کا موقع پھر میسر نہ آسکا۔

۱۰رجنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ”جماعت تبلیغ برما“ کی دعوت پر مجمع عام میں تقریر فرمائی، حضرت موصوف کی تقریر ”تبلیغ دین“ ہی کے موضوع پر ہوئی، جس میں آپ نے تبلیغ کی ضرورت، نتائج اور قرآنی طریقہ تبلیغ پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی۔دن میں دس بجے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ”راندیہ ہائی اسکول“ کا معائنہ فرمایا۔یہ اسکول بھی دوسرے اسکولوں کی طرح دینی تعلیم کا پورا اہتمام کرتا ہے، اور اطمینان بخش طریقہ پر خدمت دین کررہا ہے، جناب احمد حسین مشہدی صاحب پرنسپل راندیہ ہائی اسکول نے حضرت مہتمم صاحب کی تشریف آوری پر شکریہ ادا فرمایا۔

۱۲رجنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ۱۲۶، اسٹریٹ میں خطاب عام فرمایا، موضوع تقریر ”حقیقت ایمان“ تھا۔

دن میں آپ نے ”برما مسلم ہائی اسکول“ کا معائنہ فرمایا اور ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں چند قیمتی مشورے دئے۔

۱۳رجنوری: جن جذبات اخلاص کا ظہور ارباب اقتدار کی جانب سے متعدد بار ہو چکا ہے، ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آج عزت مآب مسٹر عبدالرشید صاحب وزیر معدنیات حکومت برما نے حضرت مہتمم صاحب کے اعزاز میں رنگون کے معزز شہریوں کو عظیم پیمانہ پر مدعو فرمایا، نماز مغرب حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے وزیر موصوف کے بنگلہ پر ادا فرمائی اور قرآن کریم کی نفلوں میں تلاوت کے معمول کو پورا فرمایا، اس کے بعد وزیر موصوف نے حاضرین سے حضرت مہتمم صاحب کی ملاقات وتعارف کا فرض انجام دیا۔وزیر موصوف کی اس مہمان نوازی کے پورے کردار میں جو دینی روح کررہی تھی وہ ہر ہر قدم پر نمایاں نظر آرہی تھی، اور یہ ہی چیز درحقیقت اس پوری مجلس کی روح تھی جس سے ہر شخص اپنے قلب

میں ایک ناقابل اظہار مسرت محسوس کررہا تھا، وزیر صاحب کی گراں قدر روایات میزبانی ناقابل فراموش ہیں۔

وزیر موصوف اصلاً ہندوستانی ہیں، آپ کا وطن الہ آباد یوپی ہے، آپ کے والد نے اولاً برما سکونت اختیار فرمائی، اور ہونہار صاحبزادے نے اس نئی وطینت کا اپنا گرانقدر ملی اور وطنی خدمات سے حق ادا فرمایا اور فرمارہے ہیں۔

۱۴رجنوری: دارالعلوم تانبوے رنگون کے ناظم عالی جناب مفتی محمود داؤد یوسف صاحب کی دعوت پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ مدرسہ میں تشریف لے گئے، جہاں طلبائے مدرسہ کو کپڑے تقسیم کئے گئے۔

وہاں سے واپس آکر آپ نے ”مدرسہ رونق الاسلام“ کا معائنہ فرمایا شب میں بعد نماز عشاء آپ نے ۲۹، اسٹریٹ میں تقریر فرمائی۔

۱۵رجنوری: مولانا ابراہیم صاحب مظاہری نے اپنے موقر اخبار ”دورجدید“ کے دفتر میں آنے کی حضرت مہتمم صاحب کو دعوت دی، جہاں چائے وغیرہ سے تواضع فرمانے کے بعد مولانا موصوف نے دفتر اور پریس دکھلایا۔”دورجدید“ برما میں واحد سنجیدہ مسلم اخبار ہے، جو اردو میں نکلتا ہے، جس میں مولانا مظاہری صاحب کے جدت طراز قلم سے نکھری ہوئی اردو میں وقت کے اہم سیاسی اور اجتماعی مسائل پر سنجیدہ مضامین نکلتے، اردو ادب کا بلند ترین مذاق شاید سرزمین برما میں مولانا مظاہری ہی کی خصوصیت ہے، شگفتہ وپرمزاج گفتگو، متین ووقیع انداز نگارش اور غیر دینی ماحول میں مسلک صحیح پر ادنی سے ادنی، اونچ نیچ گوارہ نہ کرنا مصوف کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

دورجدید کے ساتھ ایک ہفت روزہ ”استقلال“ بھی مولانا مظاہری صاحب کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا، جس کو اب آپ نے ایک ”دینی ماہنامے“ میں نئے مذاق کے مطابق تبدیل کردیا ہے، دورجدید سے عام مسلمانان برما کو علمی اور دینی فوائد کے علاوہ اکابر

واردین وصادرین سے بھی استفادے کا موقع مل جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم نے برما کے ہر علاقہ میں مولانا کے لئے عوام میں جذبات ممنونیت پائے۔

۱۶رجنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ''چائنا اسٹریٹ'' میں خطاب عام فرمایا جس میں راقم الحروف کسی وجہ سے شرکت نہ کرسکا۔

۱۸رجنوری: ''مغل اسٹریٹ'' کے باشندگان نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو عوامی جلسہ میں بعد نماز عشاء دعوت دی، جسے قبول فرمایا، اور شب میں تقریر ہوئی، جس میں تخلیق بنی آدم کے مقصد پر حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالی۔

نماز ظہر کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق مجلس اصلاح نسواں رنگون کی جانب سے اہلیہ محترمہ مہتمم صاحب کے اعزاز میں خواتین رنگون کا عظیم الشان اجتماع ''برما مسلم ہائی اسکول'' میں منعقد ہوا۔

اس تاریخی اجتماع کی تفصیل جنرل سکریٹری مجلس اصلاح نسواں محترمہ زکیہ خانم صاحبہ کی رپورٹ مطبوعہ ماہنامہ ''استقلال'' رنگون شمارہ فروری ۱۹۵۷ء سے بلفظہ ماخوذ ہے، جس کو تاریخ اور تسلسل بیان کی خاطر یہاں کی بجائے اخیر صفحات میں دیا جارہا ہے۔

۱۹رجنوری: دن میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے سورتی برادری رنگون کے ''مدرسہ نورالاسلام'' کا معائنہ فرمایا، اس مدرسہ میں زیادہ تعداد سورتی برادری ہی کے بچوں اور بچیوں کی ہے، حضرت مہتمم صاحب نے بعض بچوں کا امتحان لیا، اور اس کے بعد کچھ مناسب مشورے پیش فرمائے۔ مدرسہ میں دینی تعلیم کو اہمیت حاصل ہے، اور ساتھ ہی معاشی علوم، اور مقامی زبان کی تعلیم بھی معتدبہ انداز میں دیجاتی ہے سورتی برادری کے ہر فرد کو اس درس گاہ سے وابستگی ہے، اور ہر ہر فرد اس کی ہر خدمت کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے، مسٹر اسمٰعیل باگیا صاحب بھی اس کے خصوصی ارکان ومعاونین میں ہیں۔

بعد نماز مغرب عالی جناب شیخ محمد بشیر صاحب مالک برما ربڑ فیکٹری نے حضرت مہتمم

صاحب مدظلہ کے اعزاز میں نہایت بلند پیمانہ پر دعوت طعام دی، جس میں وزراء، امراء، تجار، عوامی رہنما اور تمام مسلم برادریوں کے معززین کو شاندار طریقہ پر مدعو کیا گیا۔ دعوت باغیچہ میں دی گئی، بجلی کے مختلف الالوان قمقموں سے باغیچہ کو بقعۂ نور بنایا گیا تھا، ساتھ ہی تقریر کے لئے دوسرے لان میں عمدہ پیمانے پر انتظام تھا، نماز مغرب اور معمولات سے فارغ ہوکر کھانا کھایا گیا، کھانے کی میزوں میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی میز پر تین کرسیاں لگائی گئیں، ایک حضرت قبلہ کی اور اس کے دوطرفہ وزراء کی، ایک جانب مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر عدل وانصاف حکومت برما، اور دوسری جانب مسٹر عبدالرشید صاحب وزیر معدنیات حکومت برما، اول الذکر دیر سے تشریف لائے اس لئے حضرت ممدوح کا تخاطب وزیر صاحب معدنیات سے ہی رہا، اسی گفتگو میں دارالعلوم کی رقم چندہ کی منتقلی کی بنیاد پڑی، حضرت ممدوح نے وزیر صاحب سے فرمایا کہ اہل برما کے دلی جذبات دارالعلوم کی مالی خدمت کے لئے ابھرے ہوئے ہیں، انہوں نے رقوم کی فراہمی شروع کردی ہے، اور تیزی سے اس کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوجائیں گے، اور دارالعلوم کی ایک بڑی خدمت ہوجائے گی لیکن ان خدمات کو کامیاب بنانا آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ چاہیں تو اس خدمت کو بے نتیجہ اور بے اثر بنادیں اور چاہیں تو نتیجہ خیز، اس پر ممدوح اک دم متوجہ ہوئے حضرت قبلہ نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اہم مسئلہ فراہمی رقوم کا نہیں بلکہ منتقلی رقوم کا ہے کہ وہ برما سے ہندوستان منتقل ہوجائیں، اور یہ بلاشبہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ (حضرت نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا) مجھے اس سے انکار نہیں کہ مصارف خیر برما میں بھی کافی ہیں اور یہاں کے غریب باشندے یہاں کی رقوم کے اولین مستحق بھی ہیں، مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ ملک کی رقم بہت حد تک ملک ہی میں رہنی چاہئے (یہ نظریہ چوں کہ یہاں کی حکومت کا بھی تھا اور پبلک کے عام سربرآوردہ لوگوں کا بھی، اس لئے اس کی رعایت سے مذکورہ جملے فرمائے گئے) لیکن میں سمجھتا ہوں اور جناب

بھی غالبًا یہی سمجھے ہونگے کہ دارالعلوم دیوبند جیسا مرکزی ادارہ اس سے مستثنیٰ ہونا چاہئے، کیونکہ شاخوں کی قوت مرکز ہی سے ہوتی ہے، اگر سرچشمہ خشک ہوجائے تو شاخوں میں تری باقی نہیں رہ سکتی، اس لئے ہر اس مقام کا جو اس مرکز سے کسی درجہ میں بھی مستفید ہو، ناگزیر فریضہ مرکز کی تقویت واعانت ہے، اسی لئے عامۃً مسلم حکومتوں نے بھی باوجود مذکورہ نظریہ رکھنے کے اپنی اعانتوں سے دارالعلوم کو فراموش نہیں کیا حالانکہ وہاں بھی اہل ضرورت کی کمی نہ تھی۔ افغانستان نے پچاس ہزار روپے سے اس کی امداد کی جبکہ میں کابل پہنچا۔ سعودی حکومت نے سلطان سعود کی تشریف آوری ہند پر دارالعلوم کو پچیس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔ میری حاضری حجاز کے موقع پر مکہ مکرمہ کی پبلک کے بعض حساس لوگوں نے دارالعلوم کو پانچ ہزار روپیہ دیا۔ مصر کی حکومت نے سال گذشتہ دارالعلوم کو بیس ہزار روپیہ عنایت فرمایا۔ ترکی حکومت کے سلطان (رشاد خامس) نے اپنے دور خلافت میں دارالعلوم کو قیمتی کتابوں اور خرقۂ مبارک کے عطیہ سے نوازا نہ اس لئے کہ ان حکومتوں میں مستحقین نہ تھے بلکہ اس لئے کہ ایک علمی اور عرفانی مرکز جو پوری دنیائے اسلام کو علمی روشنی پہنچا رہا ہے ہر ہر جگہ کی اعانت کا براہ راست مستحق ہے کہ اس کی روشنی سے کوئی خطہ محروم نہیں ہے، آج برما کے علمی ادارے بلاشبہ برما کی اعانتوں کے مستحق ہیں لیکن جبکہ انہی علمی اداروں میں فیض رسانی کرنے والی شخصیتیں خود دارالعلوم اور اس کی شاخوں کے فضلاء کی ہیں تو اس صورت میں دارالعلوم کی اعانت درحقیقت ان مقامی اداروں ہی کی اعانت ہے ورنہ اگر مرکز کمزور ہوجائے اور وہیں فضلاء کی پیداوار بند ہوجائے تو فروعات کی زندگی ہی کب تک قائم رہ سکتی ہے؟ اس لئے مرکز کی اعانت میرے نزدیک اس نظریہ کے خلاف نہیں کہ ملک کی رقم ملک ہی کے ادارں میں جائے جبکہ یہ ادارے مرکز ہی سے بنتے ہیں، اور اس کی سرسبزی سے سرسبز رہ سکتے ہیں اس لئے آپ اس نظریہ کے حامی رہتے ہوئے بھی مرکز کی اعانت سے دست کش نہیں ہوسکتے۔ اس پر وزیر موصوف صاحب نے متأثرانہ لہجے میں فرمایا کہ بلاشبہ میرے نزدیک بھی دارالعلوم بہرحال ہماری ہر

اعانت کا حق دار ہے اور میں منتقلی رقوم کے سلسلہ میں کوشش کروں گا۔ مناسب ہوگا کہ اس سلسلہ میں مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر عدل وانصاف سے بھی تذکرہ فرمالیا جائے۔

اس پر حضرت قبلہ نے فرمایا کہ ان سے میں عرض کرچکا ہوں اور مکرر عرض کرونگا یہیں سے اس مسئلہ (منتقلی رقوم) کے حل ہونے کی بنیاد پڑی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد داعی محترم شیخ محمد بشیر صاحب نے مخلصانہ انداز سے فرمائش کی کہ ہم حضرت کی زبان سے مسئلہ توحید کی حقیقت اور دارالعلوم کی تفصیلی تاریخ سننا چاہتے ہیں، پہلے سے یہ پروگرام اگرچہ حضرت قبلہ کے علم میں نہیں تھا۔ لیکن منظور فرمالیا، اور دونوں موضوعات پر نہایت جامع تقریر فرمائی، یہ پہلی تقریر تھی کہ جس نے باشندگان رنگون کو دارالعلوم کی عظمت سے واقف کیا، اس نئی حقیقت کے علم میں آنے سے ہر شخص مسرت وحیرت، اور دارالعلوم کے لئے جذبات عقیدت وعظمت لیکر رخصت ہوا۔ **فالحمد للّٰہ علی ذالک.**

۲۰ر جنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے جناب مولانا مفتی محمود احمد صاحب سرپرست مدرسہ کی دعوت پر دارالعلوم تانبوے رنگون کے عظیم الشان اجتماع میں شرکت فرمائی جو حضرت مہتمم صاحب کے خیر مقدم میں دارالعلوم ہذا کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا، مدرسہ کا ہال اور برآمدے حاضرین سے پُر تھے۔ صبح ۵ر بجے یہ جلسہ شروع ہوا۔ اجلاس کی صدارت جناب مولانا مفتی اسمٰعیل محمود گورا صاحب نے فرمائی، قرأۃ قرآن کریم کے بعد طلبہ نے ایک عربی ترانہ پڑھا۔ اس کے بعد بعض طلبہ نے عربی مکالمہ پیش کیا، اور پھر ایک عربی تقریر کی، بعد ازاں مولانا فضل اللہ صاحب مدرس دارالعلوم نے ایک تحریر جو تشکر و امتنان اور کوائف مدرسہ پر مشتمل تھی، پڑھی۔ اس کے بعد سرپرست مدرسہ کی جانب سے درج ذیل اشعار تہنیت پیش کئے گئے۔

☆☆

گلہائے تہنیت

● بعالی جناب حکیم الاسلام خطیب ملت حضرت علامہ قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی

مہتمم اعلیٰ جامعہ عالیہ دارالعلوم دیوبند

(پیش کردہ: محمود داؤد یوسف (خادم جامعہ عربیہ دارالعلوم تانبوے رنگون)

اے میر کاروانِ حق اے حامل قرآں
تو ہے جہانِ علم و ہدایت کا اک نشاں
لیتا ہے تجھ سے درس زمانہ حیات کا
اب مٹ رہا ہے دم سے ترے جہل کا نشاں
حاصل ہے تجھ سے علم نبوت کو اب فروغ
سیراب تجھ سے رشد و ہدایت کے تشنگاں
انسانیت کو ناز ہے تیرے وجود پر
سنتی ہے خلق تجھ سے شرافت کی داستاں
محبوب تھانویؒ ہے تو اے مرد باخدا
آماجگاہ خلق رہا جن کا آستاں
اس قاسمِ علوم کا ورثہ تجھے ملا
جو تھا قلوب اہل معارف یہ حکمراں

کیونکہ نہ تیری مدحت بے لوث ہے عزیز
قائل ہے تیری عظمت و رفعت کا اک جہاں
تھی منتظر ورود سعادت کی یہ زمیں
آمد سے تیری ہوگئی ہمرنگِ آسماں
معمور فرّخی ہے فضاء لطیف آج
ارباب جامعہ بھی ہیں مسرور و شاداں
کرتا ہے رشک ہم پہ زمانہ اسی لئے
ہم میں ہے آج ایک خطیب سحربیاں
محمود کی دعاء ہے بہت پُرخلوص یہ
سایہ دراز تیرا کرے رب دو جہاں
ہر وقت ہوجہاں میں ترقی سے ہمکنار
اور نگاہ اہل خرد میں عظیم شاں
تجھ پر نوازشوں کی یہ بارش رہے مدام
تاحشر تیرے فیض سے سیراب ہو جہاں
ہوجائے ہر نفس تیرا اسلام کے لئے
حاصل ہو ہر قدم پہ رضائے خدائے جاں
رحمت خدا کی سایہ فگن تجھ پہ ہو مدام
سیراب تجھ سے ہوتی رہے خلق صبح و شام

☆☆

اور پھر خود سر پرست صاحب نے مندرجہ ذیل نامۂ سپاس پیش فرمایا

اعزازیہ

● بعالی مرتبت مفکر ملت، خطیب ملت حضرت علامہ حافظ قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی
مہتمم اعلیٰ جامعہ عالیہ دارالعلوم دیوبند

مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدرس جامعہ مذکور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی قدر! آج اس مسرت زا موقع پر ہمارے قلوب فرحت وانبساط کے لطیف احساسات سے معمور ہیں کہ ہمیں دین محمدی کے مخلص وجاں سپار خادم فرزندان توحید کے ممدوح، ایشیا کے عظیم علمی و مذہبی دارالعلوم کے مہتمم، عاشق زار محمد، افکار اسلام کے بحر محیط، مجاز حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور امت مسلمہ کے ایک باوقار خطیب ادیب کو خوش آمدید کہنے کا زریں اور قابل فخر موقع میسر ہو رہا ہے، یہ ہماری انتہائی سعادت نصیبی ہے کہ ہند کے ایک باوقار زعیم، اور ملت اسلامیہ کے ایک عظیم مفکر کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

حبّذا اہلاً و سہلاً مرحبا خوش آمدید
گردنِ ماہست زیر بار احسانِ شما!

ترجمان ملت! ایک طویل عرصہ سے یہ آنکھیں ان نورانی صورتوں کے دیدار کے لئے مضطرب تھیں، بحمد للہ وہ روز سعید آ پہنچا، آج ہماری بے چین نگاہیں ہند کے عظیم دینی رہنما کی دید سے فیض یاب ہو رہی ہیں اور ہماری تمناؤں کی شاداب کلیاں مسکرا رہی ہیں، اس

وقت ہمارے قلوب کیف ونشاط کے وجد آفریں جذبات سے لبریز ہیں کہ ایشیا کی عظیم ملی درس گاہ کے مدیر اعلیٰ ہم میں تشریف فرما ہیں اور بزم رنگین کی نزہتیں ان پر نثار ہو رہی ہیں۔

خطیب امت! ایشیا کے اس عظیم علمی و مذہبی دارالعلوم کے فیوض وبرکات کا کون انکار کرسکتا ہے جس کے آپ مہتمم اعلیٰ ہیں، آج اس نیر ضوفشاں کی ضیا پاش کرنیں دنیا کے گوشے گوشے کو منور کر رہی ہیں۔ ہمیں اس اعتراف پر ناز ہے کہ ہمارا دارالعلوم بھی اسی شجرہ طیبہ کے خوشہ چینوں میں سے ایک ہے جسے قاسم علم وعمل نے لگایا تھا، ہمیں کہنے دیجئے کہ دارالعلوم دیوبند کو بام عروج تک پہنچانے کے پس پشت آپ کی مخلصانہ دینی وعلمی کاوشیں نمایاں طور پر کارفرما رہی ہیں۔

مفکر ملت! ہمارا آپ کو خوش آمدید کہنا ان کہنہ اور فرسودہ روایات کا حامل نہیں ہے جن میں سے کسی بھی مہمان کو اس کی علمی، ادبی، سیاسی خدمات کے پیش نظر ایک عدد سپاس نامہ نذر کر دیا جاتا ہے، بلکہ ہمارے اس ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے پس منظر خلوص ومودت کے وہ انمٹ، تعلقات کارفرما ہیں جو آپ کے اور اساتذہ جامعہ کے درمیان قائم ہیں۔ ہم قلبی اخلاص کے ساتھ مولانا محمد سالم صاحب قاسمی کو بھی خوش آمدید کہتے ہیں جن کی علمی کاوشیں فرزندان ہند کو سیراب کر رہی ہیں۔ اخیر میں ہم آنجناب اور مولانا محمد سالم صاحب کی اس تکلیف فرمائی پر بصمیم قلب ممنون وشکر گذار ہیں اور دعواتِ صالحہ کے متمنی۔ انتہائی خلوص قلب سے ہماری دعاء ہے کہ جناب اور جناب کے رفقاء دین ودنیا کی ترقیوں سے ہمیشہ ہمکنار ہوں، ہمارے اور آپ کے درمیان روابط قلبی اور روحانی میں اضافہ ہوتا رہے، اور فرزندان توحید تاابد آپ کے فیوض وبرکات سے مستفید ومتنفع ہوتے رہیں۔

''ایں دعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد''

(پیش کردہ: ادارۂ جامعہ عربیہ دارالعلوم تانبوے رنگون)

جس کے جواب میں حضرت مہتمم صاح مدظلہ نے جوابی تقریر فرمائی جو تشکر وامتنان

کے ساتھ مقصد علم اور منصب علماء کے اہم حقائق پر مشتمل تھی۔ یہ تقریر دو گھنٹے جاری رہی۔

شب میں سہ روزہ معمول کے مطابق شہری اجلاس عام ایڈورڈ اسٹریٹ میں منعقد ہوا۔ چونکہ آج دن میں بھی ایک طویل تقریر دارالعلوم تانبوے میں ہوچکی تھی اس لئے حضرت مہتمم صاحب نے ''ایمان کامل'' کے موضوع پر اور ایام کے مقابلہ میں بلحاظ وقت کم لیکن جامع اور ماقل ودل تقریر ارشاد فرمائی، جوالحمدللہ، سامعین کے لئے نہایت ہی نشاط اور ایمانی فرحت کا سبب ثابت ہوئی۔ ۱۱ر بجے یہ اجلاس ختم ہوگیا۔

۲۱؍جنوری: جناب حاجی غلام محمد صاحب (تاجر رنگون) اور رکن خصوصی جماعت تبلیغ کی دعوت پر حضرت مہتمم صاحب نے عورتوں کے خصوصی اجتماع کو بعد ظہر خطاب فرمایا۔ رنگون میں ویسے تو ہر اجتماع میں مستورات کے لئے انتظام ہوتا تھا لیکن مستورات کا صرف یہ پہلا ہی اجتماع تھا جس میں میمن اور سورتی برادری کی مستورات بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئیں اور حضرت مہتمم صاحب کی دل نشیں تقریر سے ترقی ایمانی، اور جذبۂ عمل کا عظیم سرمایہ لیکر واپس ہوئیں۔ دو روز کی مسلسل اور بلافصل تقریروں سے چوں کہ تعب ہوگیا تھا، اس لئے شب کے اجتماع عام منعقد بازار بلاک ۲۵؍اسٹریٹ میں تقریر کے لئے راقم الحروف کو امر فرمایا گیا جس کی تعمیل کی گئی۔ احقر کی تقریر کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے چند کلمات تبرکاً فرمائے اور پھر دعاء پر کارروائی جلسہ ختم کردی گئی۔

۲۲؍جنوری: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ تقریر سے احتراز فرمانا چاہتے تھے لیکن محبین کے اصرار پر بہرحال آمادہ ہونا پڑا، اور کانڈوگلے اسٹریٹ میں اجلاس عام کو آپ نے خطاب فرمایا۔

آج رنگون میں قیام کا پچیسواں روز ہے۔ کل ۲۳؍ سے بیرون رنگون کا سفر شروع ہوا رہا ہے۔ جس میں سب سے پہلے مانڈلے روانگی طے کی گئی ہے۔

''مانڈلے'' برما کا رنگون کے بعد دوسرا بڑا شہر ہے، اور رنگون سے قبل برما کی راجدھانی

بھی مانڈلے ہی رہی ہے، راجائی دور کے آثار قدیمہ ابھی تک وہاں کھڑے ہوئے درس عبرت دے رہے ہیں، میلوں میں پھیلا ہوا قدیم شاہی قلعہ اپنی شکستہ دیواروں اور ویران محلات شاہی کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی و بے دوامی کا دوامی ماتم کر رہا ہے، قدیم بدھسٹ عبادت گاہوں کیلئے بھی یہ شہر مشہور ہے۔ بدھسٹ عبادت گاہیں جس کو برمی زبان میں ''پھیا'' اور انگلش میں ''پیگوڈا'' کہتے ہیں، یہاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں، اور اسی طرح بدھ مذہب کا تارک الدنیا طبقہ جسے ''پھونگی'' کہتے ہیں یہاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ پھونگیوں کا لباس زرد رنگ کا ہوتا ہے، ایک زرد لنگی باندھے ہوئے اور ایک زرد لنگی اوڑھے ہوئے یہ تارکین دنیا اس پلید دنیا کی ہر ''عبرت گاہ'' جیسے سینما، تھیٹر، ہوٹل، رقص گاہوں، بازاروں، پارکوں، کلبوں وغیرہ میں یہ تعداد کثیر تشریف لے جاتے ہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ روزانہ اور بلا ناغہ کی، ان عبرت پذیریوں سے ان کے قلوب کس قدر مصفّٰی اور مزکّی ہو چکے ہوں گے۔ اور بالخصوص جبکہ ان کے روٹی کپڑے کا غم دنیا کی قوم کے ذمہ ہے اور قوم کی تفریحی مصیبتیں ان غریبوں کے ذمہ پڑی ہوئی ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

۲۳؍جنوری: مانڈلے کا سفر عالی جناب مفتی اسمٰعیل محمود صاحب فاضل دیوبند خطیب سورتی سنی جامع مسجد مانڈلے کی خصوصی دعوت پر ہوا۔ حضرت مہتمم صاحب نے اس سفر میں اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا لیکن مفتی صاحب موصوف مانڈلے سے ہوائی جہاز سے بذات خود تشریف لائے اور اہلیہ محترمہ کو ساتھ رکھنے پر اصرار فرمایا اور مانڈلے کی مستورات کی جانب سے عمومی دعوت پیش فرمائی، جس پر حضرت مہتمم صاحب تیار ہوگئے، رنگون سے صبح ۶؍ بجے بذریعہ ریل مانڈلے کے لئے روانگی ہوئی۔

۲ کمپارٹمنٹ ریزرو کرالئے گئے تھے، ایک میں حضرت مہتمم صاحب بمعہ اہلیہ محترمہ اور راقم الحروف تھے، اور دوسرے میں رفقاء سفر یعنی جناب مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری مفتی محمود داؤد یوسف صاحب، اسمٰعیل باگیا صاحب یوسف گورا صاحب تھے، رنگون سے

مانڈلے کی مسافت قریباً ۴۵؍میل ہے لائن چھوٹی ہے اور ریل سست رفتا، اور مزید برآں یہ کہ رات کو باغیوں کی، ہلاکت خیز سرگرمیوں کی وجہ سے ریل نہیں چل سکتی، اس لئے صبح چھے بجے رنگون سے چل کر گاڑی شام کو چھ بجے ''پمنا'' جنکشن پر رات بھر کھڑی رہتی ہے، اور صبح چھ بجے پھر چل کر شام کو ساڑھے چار بجے مانڈلے پہنچتی ہے۔ اس طرح یہ سفر اچھا خاصہ طویل سفر بن جاتا ہے۔ رفقاء سفر کی خوش مذاقی نے سفر کو کافی دلچسپ بنائے رکھا، بالخصوص مولانا مظاہری صاحب اس پورے سفر کی تمام تر دلچسپیوں کی روح رواں رہے اور برما کے مختلف علاقوں کی رنگ برنگی اردو کے نادر نمونے جب وہ اپنی شگفتہ مزاجی کے ساتھ پیش فرماتے ہیں تو مجلس زعفران زار بن جاتی ہے، مثلاً رنگونی اردو کا ایک نمونہ بطور نمونہ از خسروارے ملاحظہ ہو، تذکیر و تانیث کے جھمیلوں اور حاضر و غائب کے فرق سے رنگونی اردو بری ہے۔ ایک ملاقاتی جب کسی دوسرے سے محض ملاقات کی غرض سے بلا کسی ضرورت کے جاتا ہے، تو صاحب خانہ اس سے استفسار کرتا ہے۔

صاحب خانہ: کیا واسطے آیا بھائی؟ آنے والا: بس کھالی کھالی آیا! صاحب خانہ: نہیں کائیکو آیا؟ آنے والا: بس جھوٹ موٹ آیا ہے! اور جھوٹ موٹ پر صاحب خانہ مطمئن ہو جاتا ہے، جھوٹ موٹ کے ان معانی کی دریافت سرزمین برما کے علاوہ ہندوستان کے کسی علاقہ میں نہیں ہو سکتی۔ شام کو چھ بجے ''پمنا'' اسٹیشن پر مقامی مسلمانوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا چوں کہ پروگرام ''دور جدید'' میں بالتفصیل شائع ہو چکا تھا، اس لئے اس شب گذاری کی قیمت کے طور پر شہر میں جلسہ عام کا انتظام کرایا گیا تھا چنانچہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ تشریف لے گئے اور بعد نماز عشاء جامع مسجد پمنا میں آپ نے تقریر فرمائی۔ ۱۱؍بجے واپس اسٹیشن پہنچ کر گاڑی میں آرام فرمایا۔

۲۴؍جنوری: شام ۴؍بجے مانڈلے پہونچے، یہاں حضرت مہتمم صاحب کے میزبان محترم عالی جناب سیٹھ موسیٰ بھیکو صاحب تھے، موصوف اپنی عالی حوصلگی اور دینداری کی وجہ

سے علاقہ کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، چھ روز قیام میں آپ نے روایتی انداز میں حق میزبانی ادا فرمایا، اور اپنی بے تکلف و سادہ منشی اور دلچسپ انداز گفتگو سے بہت جلد سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا، نیز دارالعلوم کی مالی اعانت میں آپ نے سب سے پہلے اقدام فرما کر دوسروں کے لئے ایک اسوہ حسنہ قائم فرمایا جس کے نتائج نہایت کامیاب رہے۔

مانڈلے میں حضرت مہتمم صاحب کی اولین تقریر جامع مسجد سورتی میں ہوئی جس نے پورے شہر و اطراف میں ایک دینی چہل پہل پیدا کر دی، داعی محترم جناب مفتی اسمٰعیل صاحب مدظلہ اس مسجد میں خطیب ہیں، موصوف اس دور و دراز مقام پر ایک فاضل دارالعلوم دیوبند کی حیثیت سے بڑی پختگی کے ساتھ اکابر کے مسلک صحیح اور ان کی روایات صلاح کو تھامنے ہوئے ہیں۔ جس کے طبعی نتیجہ کے طور پر مانڈلے اور اس کے اطراف کے لوگ مولانا موصوف سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔

مفتی صاحب موصوف نے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے مالی معاونت کے سلسلے میں جو شب روز لگ کر عظیم خدمات اس عرصہ میں انجام دیں وہ لائق صد ہزار تشکر ہیں۔ یہ موصوف ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ مانڈلے اور اطراف سے صرف چھ روز کے عرصہ میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی شخصیت سے عوام کی غیر معمولی وابستگی کو دیکھ کر دارالعلوم کی مالیات کے سلسلہ میں بروقت فائدہ اٹھاتے ہوئے اس علاقہ سے بیالیس ہزار روپیہ کی رقم جمع فرمائی۔ فجزاہم اللہ عنا احسن الجزاء

۲۵؍جنوری: مانڈلے کے قیام میں، قیام مختصر ہونے کی وجہ سے بلافصل ہر روز تقریریں ہوئیں، قیام کے اس اختصار ہی کی وجہ سے مفتی اسمٰعیل صاحب مدظلہ نے شہر کے صرف مرکزی مقامات ہی کا پروگرام مرتب و منظور فرمایا تھا۔ شہر کی مختلف نواح کی کثیر دعوتوں کو رد کر دینے کے باوجود حضرت مفتی صاحب وعدے کے باوجود درمیان کا کوئی دن فارغ نہ رکھ سکے، اور خود حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے بھی مفتی صاحب کی پرجوش مساعی کا

احترام فرماتے ہوئے پروگرام میں ترمیم نہیں فرمائی، اور بلاناغہ تقریروں پرخلاف عادت آپ تیار ہوگئے، اطراف سے کثیر تعداد میں آنے والے حضرات کی پرزور خواہش تھی کہ اپنے اپنے مقامات پر بھی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو لے جائیں لیکن قلت وقت کے باعث صرف چند مقامات کا جانا اس طرح طے ہوا کہ دن میں بذریعہ کار ان قریبی مقامات پر جانا ہوگا اور قبیل مغرب واپسی ہوجایا کرے گی۔ چنانچہ اپر برما کے درج ذیل شہروں میں اسی طرح جانا ہوا کہ صبح گئے اور شام کو واپس آگئے۔

۲۶؍جنوری: سگائیں: یہ ایک غریب اور زلزلے سے تباہ حال بستی ہے، حضرت مدظلہ کی تشریف بری سے سے یہاں کے لوگوں میں ایک حوصلہ وامید پیدا ہوئی۔

میمیو: یہ اپر برما کا پہاڑی شہر ہے، نہایت سرسبز وشاداب پہاڑ ہے، اور آبادی نہایت قریب سے ہے، یوپی اور پنجاب کے کافی لوگ برمی شہری کی حیثیت سے آباد ہیں اور خوش حال ہیں۔ یہاں راقم الحروف کے سفر حج ۱۹۵۴ء کے برمی رفیق محمد اسمٰعیل اوبالے سٹی مجسٹریٹ سے ملاقات ہوگئی نہایت محبت و مدارات سے پیش آئے، لیکن ملاقات کے اس اختصار نے دونوں ہی کو متاثر کیا۔

۲۷؍جنوری: چوکسے: یہ ایک مختصر سی بستی ہے، یہاں کے داعی جناب محمد حسین صاحب تھے جن کا بستی کے اعیان میں شمار ہوتا ہے، موصوف نہایت باخیر لوگوں میں سے ہیں، آپ کا اصل وطن صوبہ سرحد (پاکستان) تھا، لیکن وسائل معاش نے یہاں پہنچا دیا اور اب یہیں کے ہو رہے، اور بحمد للہ عزت وخوش حالی سے ہمکنار ہیں۔ اسی طرح اور بھی چند مقامات پر صبح سے شام تک سفر ہوا، لیکن ہر شب میں مانڈلے واپسی اور تقریر بلاناغہ رہی جس سے الحمد للہ ہر طبقہ متاثر بھی ہوا، اور ارباب دین کے لئے مستقبل کی اچھی توقعات بھی قائم ہوگئیں۔

۳۱؍جنوری: صبح چھ بجے مانڈلے سے روانگی ہوئی، فرسٹ کلاس کے دو کمرے محفوظ تھے، جس کمرے میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے سفر فرمایا، اس کو محبتیں نے رات بھر

پھولوں سے سجایا اور شب بھر کی اس گلکاری سے ریل کے اس ڈبے کو باغ وبہار بنا رکھا تھا، سیٹوں پر، پنکھوں پر، اوپر کی برتھ پر، دروازوں پر غرض ہر سمت سے یہ ڈبہ پھولوں سے لدا ہوا تھا، ہوا کا ہر جھونکا ان پھولوں سے گذر کر شمیم محبت واخلاص سے روحوں کو خوش گام بنا رہا تھا۔

دن بھر سفر جاری رہا، چھ بجے سر شام حسب قاعدہ گاڑی ٹانگو اسٹیشن پر صبح تک کے لئے ٹھہر گئی، اہل شہر نے جامع مسجد میں جلسہ کا انتظام کر رکھا تھا، چنانچہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں قفل لگا کر شہر چلے گئے، جلسہ سے فراغت کے بعد ۱۲؍بجے آکر گاڑی ہی میں آرام فرمایا۔

یکم؍فروری: یہ دن بھی سفر ہی میں گذرا، راستہ میں معلوم ہوا کہ رنگون سے چالیس میل ادھر شہر ''پیگو'' کا اسٹیشن باغیوں نے ڈائنامیٹ سے اڑا دیا ہے جس سے سب لوگوں کو زیادہ تشویش اس لئے ہوئی کہ اسی اسٹیشن سے گذر کر رنگون پہنچنا تھا جہاں چند گھنٹے لیٹ ہوجانے سے بعض اہم پروگراموں پر غیر معمولی اثر پڑ سکتا تھا۔

مولانا مظاہری صاحب نے اس بارے میں تحقیق شروع کی، فون کیا بڑے عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ واقعہ تو صحیح ہے لیکن اتنا ہولناک نہیں ہے جتنا بتایا گیا، یعنی اسٹیشن کا ایک کمرہ اڑا دیا گیا ہے، اور چار آدمی اس حادثے میں ہلاک ہوئے جن میں ایک اسٹیشن ماسٹر بھی شامل تھا۔ ساڑھے تین بجے شام کو رنگون پہنچے، جہاں باگیا فیملی کے ممبران اور دیگر حضرات منتظر تھے۔

۳؍فروری: پروگرام کے مطابق ''مولمین'' جانا تھا، نماز صبح سے پہلے ۵؍بجے میزبان محترم اسمٰعیل باگیا صاحب اپنی موٹر میں لیکر ایرپورٹ روانہ ہوگئے، آدھ گھنٹے میں ہم لوگ رنگون کے جدید ترین خوبصورت ایرپورٹ پہونچ گئے، رخصت کرنے والوں میں باگیا فیملی کے تمام ممبر شامل تھے، ساتھ جانے والوں میں مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری جو اپنی باہمہ بے ہمہ فطرت کے لحاظ سے سراپا انجمن، ان کی اس قافلے میں شمولیت نے سفر کے

لطف کو دو بالا کر رکھا تھا، مفتی محمود صاحب اسمٰعیل باگیا صاحب اور چند دیگر ممتاز حضرات تھے، ہوائی اڈے پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گذارا، اور پونے آٹھ بجے ہمارا جہاز مائل پرواز ہوا، ستّر میل کی مسافت بیس منٹ میں طے کرنے کے بعد ''پیگو'' شہر سے آگے بڑھ کر اچانک جہاز کی ٹنکی سے تیل گرنا شروع ہوا۔ اس خطرناک صورت حال کو ہوشیار پائیلٹ نے فوراً بھانپ کر بلا تاخیر جہاز کا رُخ واپس رنگون موڑ دیا اور اس کے بعد بہت نرم لفظوں میں باہر نکل کر مسافروں کو اس کی اطلاع دی، صورت حال فی نفسہ خطرناک تھی، قدرتی طور پر لوگوں میں ہراس پیدا ہوا، لیکن بحمد للہ تھوڑی دیر کے بعد جہاز بخیرت رنگون ایئرپورٹ پر اتر گیا، زبان خلق نے عمومی طور پر اسکو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی عنداللہ کرامت شان پر محمول کیا۔ اولاً یقین دلایا گیا کہ جہاز نصف گھنٹہ میں ٹھیک ہوجائیگا اس کے بعد ایک گھنٹہ پھر ڈیڑھ گھنٹہ، غرض اسی طرح ساڑھے گیارہ بجے تک، حضرت مہتمم صاحب اور آپ کے رفقاء سفر نے انتظار کیا، اس دوران میں متعدد حضرات نے چاہا کہ واپس چلے چلیں، لیکن حضرت مہتمم صاحب ہر مرتبہ یہی فرماتے رہے کہ وعدے کی پابندی ضروری ہے مولمین کے حضرات کو ہم لوگوں کے نہ پہنچنے سے سخت اذیت ہوگی، اس لئے انتظار فرمایئے، یہاں تک کہ پونے بارہ بجے اعلان کیا گیا کہ جہاز اتنا بگڑ گیا ہے کہ وہ جانے کے قابل نہیں ہے اس لئے اُسے کینسل کر دیا گیا، اب مجبوراً واپس ہونا ہی پڑا، اور حضرت صاحب ''**الخیر فیما وقع**'' (جو ہوا بہتر ہوا) فرما کر عازم قیام گاہ ہوگئے۔ جیسے ہی لوگوں کو حضرت کی واپسی کی خبر ملی اور واقعہ معلوم ہوا، فوراً آنے شروع ہوگئے، اور حق تعالیٰ کے شکریہ کے بعد حضرت کو بخیریت واپسی پر مبارکباد پیش کی۔

اسی قدرتی مانع کے پیش آجانے پر اگرچہ نہ جانا غیر ارادی تھی، لیکن ''مولمین'' میں صبح ۵ر بجے سے اڑھائی ہزار کا بھوکا پیاسا مجمع عظیم دو بجے تک اسی آس میں ہوائی اڈے پر بیٹھا رہا کہ شاید کسی طیارے سے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی تشریف آوری ہوجائے اور ان کی

مشتاق دیدنگاہیں زیارت سے مشرف ہوجائیں۔ لیکن ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے''۔ ادھر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ جہاز کے ٹھیک ہوجانے کی امید پر بارہ بجے تک زحمت انتظار فرماتے رہے، لیکن جب یہ اعلان ہوگیا کہ آج جہاز نہیں جائے گا تب بادل نخواستہ اور مولمین کے حضرات کی اس تکلیف پر غیر معمولی طور پر متاثر واپس قیامگاہ تشریف لائے، جہاز کے کینسل ہوجانے کی اطلاع مولمین ۲ر بجے دی گئی، تب وہاں کا مجمع انتہائی تاسف کے ساتھ واپس ہوا، جس میں ہائی کمشنر، اور کلکٹر ضلع، دیگر سرکاری مسلم افسران، عوامی غیر مسلم نمائندے اور بلا تخصیص مذہب عوام سب ہی شریک تھے، مولمین کے داعی جناب حافظ محمد حسین صاحب کا تار ملا کہ ''مولمین'' کی تاریخ میں اتنا بڑا غیر معمولی مجمع ایرپورٹ پر کبھی نہیں ہوا، ڈیڑھ سو موٹر کاروں پر جلوس نکالنے کا پروگرام تھا، جو تمام ہوائی اڈے پر آچکی تھیں، اور کوئی ممتاز شہری ایسا نہ تھا کہ جو ہوائی اڈے پر نہ پہنچ گیا ہو، ڈیڑھ سو میل کی دریائی مسافتیں طے کر کے لوگ شرکت کے لئے آئے تھے، سرکاری آفیسران دوسرے شہروں سے ہوائی جہاز سے استقبال کے لئے پہنچ چکے تھے، لیکن اللہ کا ارادہ سب کے ارادوں پر غالب ہے، اب درخواست ہے کہ مولمین کے لئے کوئی دوسری تاریخ دی جائے، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے یہی فرمایا کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا ایک روز کے لئے آپ کے یہاں حاضر ہوں گا، اور میں خود انتہائی متاسف ہوں، یہ مضمون بذریعہ خط مولمین روانہ کیا گیا۔

۶ر فروری: بعد نماز مغرب جناب مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر عدل حکومت برما (برمی نام او کھے ماؤں لا) قیام گاہ پر تشریف لائے، آپ نے حضرت قبلہ سے درخواست کی کہ برما میں جو علماء و بزرگ آتے ہیں وہ بڑے بڑے شہروں ہی سے واپس ہوجاتے ہیں، ڈیلٹا کے چھوٹے شہروں میں کوئی نہیں جاتا، وہاں کے لوگ ہم سے اس کی شکایت کرتے ہیں، اس لئے آپ براہ کرم میرے ہمراہ پانچ روز دورہ ڈیلٹا کا کریں، یہ سفر میرے سرکاری اسٹیمر میں ہوگا، اس لئے انشاء اللہ راحت و آرام، اور تفریح کے ساتھ ہوگا، حضرت قبلہ نے

اس پیشکش کو قبول فرمایا، اور پروگرام یہ طے ہوا کہ ۷؍کی صبح کو لطیف صاحب کے ہمراہ ان کے اسٹیمر سے ڈیلٹا کا دورہ ہو، اور ۱۲؍کو رنگون واپسی، پھر ۱۳؍کی صبح بذریعہ طیارہ ''مولمین'' جائیں جس میں لطیف صاحب بھی شریک سفر ہوں گے، وہاں سے ۱۵؍کو طیارے ہی سے واپسی رنگون ہوگی، پھر ۱۶؍کو طیارے ہی سے اکیاب جائیں، اور ۱۸؍کو واپس پھر رنگون آئیں گے۔

سلیمان مدھا صاحب نے حضرت قبلہ کے اعزاز میں ایک شاندار ڈنر دیا، ۸؍بجے شب کو رنگون کے ممتاز علماء اور تجار کے علاوہ مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر معدنیات حکومت برما نے شرکت فرمائی۔ پونے نو پربا گیا صاحب واپس قیام گاہ پر لے آئے، بعد نماز عشاء حسب معمول علمی مجلس ہوئی، جو ۱۱؍بجے تک جاری رہی۔

۷؍فروری: روداد سفر ڈیلٹا (برما): ۴؍بجے صبح اٹھ ہم نے تیاری سفر کی، اور ۵؍بجے موٹر سے بندرگاہ پہنچ گئے اسی وقت وزیر صاحب موصوف بھی پہونچ گئے، موٹر لانچ میں سوار ہوئے، حفاظتی انتظامات سرکاری طور کئے جاچکے تھے اور باضابطہ مختلف مقامات پر وائرلیس سے اطلاعات بھی دی جاچکی تھیں اور برابر دی جارہی تھیں، یہ دومنزلہ نہایت خوبصورت اور محفوظ ترین لانچ تھی، وزیر صاحب موصوف نے اپنا خاص کمرہ حضرت قبلہ کو دیا اور خود نیچے کی منزل میں رہے، نماز فجر لانچ میں ہی پڑھی، یہ منظر نہایت روح پرور تھا کہ وزیر صاحب موصوف بذات خود نماز کے اہتمام میں مشغول تھے، صفیں وغیرہ خود بچھائیں، نماز کے بعد ناشتہ کیا گیا، اور پھر سب لوگ اپنے کمروں میں چلے گئے، راقم الحروف کا کمرہ وزیر صاحب کے کمرے سے متصل تھا۔ اور اس سے متصل مولانا مظاہری تھے بعض احباب اوراوپر آرام فرمارہے تھے، رفقاء سفر جناب عبداللطیف، مولانا نور محمد صاحب، مولانا فضل الرحمٰن صاحب، قاری احسن صاحب، برادر وزیر موصوف صاحب اور چند دیگر احباب تھے۔
۹؍بجے اسٹیمر ''مئوبن'' پہنچا، یہ ضلع کا صدر مقام ہے، یہاں وائرلیس کی اطلاع پر حضرت

قبلہ اور وزیر صاحب کے استقبال کے لئے کلکٹر ضلع اور سٹی مجسٹریٹ اور دیگر ملٹری آفیسر اور معزز اہل شہر نے اسٹیمر پر آکر خوش آمدید کہا، بیس منٹ بعد یہ لوگ رخصت ہوئے اور پھر اسٹیمر روانہ ہوا، ۲؍بجے مقام ''واکھیما ضلع میاؤں'' پہنچے، یہاں کے حضرات نے بھی پرجوش استقبال کیا، یہاں جہاز سے اترے اور شہر میں نماز ظہر مسجد میں ادا کی، نماز کے بعد مقامی جمع شدہ حضرات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے سربراہ نے کہا کہ حضرت مہتمم صاحب کی تشریف آوری ہماری خوش قسمتی ہے ورنہ اس غیر معروف بستی میں ہمیں کبھی اس کا تصور بھی نہ ہوتا تھا کہ ہم حضرت کی زیارت سے مشرف ہوسکیں گے، یہ وزیر صاحب موصوف کا کرم اور مولانا مظاہری کی عنایت ہے، مقرر نے مزید کہا کہ ۳؍فروری ۱۹۵۷ء کو مولمین جاتے ہوئے حضرت کا ہوائی جہاز بگڑ گیا یہ حضرت کی کرامت کی دلیل ہے، کہ تیل ٹپکنے کے باوجود بخیریت رنگون پہنچ گیا ورنہ ایسے میں حادثہ یقینی ہوتا ہے۔

الحمد لله علی ذالک.

اس کے بعد لوگوں نے حضرت مہتمم صاحب سے اپنے یہاں کے لئے وقت کا مطالبہ کیا جس پر وزیر صاحب نے واپسی میں ۱۰؍کے ضروری چند گھنٹے دئے، راستے میں ایک ہوٹل میں چائے پلائی گئی، اس کے بعد پھر ۳؍بجے اسٹیمر میں سوار ہوئے، مقامی ایک بڑا مجمع رخصت کرنے کے لئے گودی پر آیا، اسٹیمر روانہ ہوا، اور راستے میں پھر حسب سابق حفاظتی گشتی جہازوں نے چاروں طرف گھومنا شروع کردیا، یہ تماشہ بذات خود ایک دلفریب منظر پیش کررہا تھا، جس سے برآمدے میں بیٹھے ہوئے سب حضرات لطف اندوز ہورہے تھے، اور مسٹر عبداللطیف بے حد مسرور اور خوش نظر آرہے تھے۔

شام کو ۵؍بجے ہم لوگ ''میاؤں میا'' پہنچے، یہ ایک کھلا ہوا سرسبز وشاداب شہر ہے اور ضلع کا صدر مقام ہے، گودی پر عمائدین شہر اور سرکاری افسران کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، جنہوں نے ہار پھول پہنا کر حضرت مہتمم صاحب کا استقبال کیا۔ ''میاؤں میا'' وزیر

موصوف کا وطن بھی ہے، یہاں ان کے والد صاحب اور بھائی صاحبان رہتے ہیں، قیام سرکاری ڈاک بنگلہ پر ہوا، نمازِ عصر جامع مسجد میں پڑھی، اور پھر قیام گاہ پر چند منٹ ٹھہر کر وزیر موصوف کے مکان پر تشریف لے گئے وزیر موصوف کے والد محترم نے حضرت مہتمم صاحب کو خوش آمدید کہا، اور فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہوگئے، یہ خاندان ہندوستانی الاصل ہے فیض آباد کا رہنے والا ہے، اس لئے اردو صاف بولتے ہیں، رات کا کھانا یہیں کھایا، قبل عشاء قیام گاہ پر آ گئے اور طے ہوا کہ ۹ر تاریخ کو یہاں اجتماع ہوگا اور حضرت مہتمم صاحب بسین سے واپسی میں یہاں خطاب فرمائیں گے، اگرچہ انتظام آج بھی تھا، لیکن طویل سفر کے باعث آج کی شرکت جلسہ سے حضرت قبلہ نے معذرت فرمائی، اور وزیر موصوف کے فرمانے پر احقر راقم الحروف نے اس جلسہ میں تقریر کی۔ علی الصبح پھر یہ قافلہ اسٹیمر پر سوار ہوگیا اور عازم ''بسین'' ہوگیا۔ کیونکہ نماز جمعہ وہیں ادا کرنی تھی۔

۸ر فروری: صبح سات بجے یہ خوبصورت اسٹیمر یا بقول مولانا مظاہری ''دریائی گھوڑا'' اپنی دریائی رفتاری کے ساتھ ''بسین'' کی جانب روانہ ہوگیا، ساڑھے دس بجے ''بسین'' کے کنارے لگا، یہاں متعدد ممبران پارلیمنٹ ''پھاساپالا (برسرِ اقتدار پارٹی) کے ممتاز رہنما اور دیگر عمائدین تجار اور علماء نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کا پرتپاک استقبال کیا، جن سے مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر تعارف کراتے رہے، اسٹیمر سے اتر کر حضرت مدظلہ کو بمع رفقاء سرکٹ ہاؤس (قیام گاہ) لے جایا گیا، یہ لکڑی کی بنی ہوئی نہایت خوبصورت دومنزلہ عمارت ہے، بڑے ہال میں حضرت مہتمم صاحب، مولانا مظاہری ابراہیم احمد صاحب اور راقم الحروف قیام پذیر ہوئے اور برابر کے کمرے میں رنگون کے میزبان محترم مسٹر اسمٰعیل باگیا صاحب، جناب یعقوب صاحب (تاجر رنگون) قاری محمد احسن صاحب، مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدرس دارالعلوم تانبوے رنگون، مولانا نور محمد صاحب ممبر اسلامک کونسل ٹھیرے اور اس سے متصل کمرے میں خود وزیر موصوف کا قیام تھا، بارہ بجے تک مختلف

حضرات، حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات کے لئے آتے رہے، اور مختلف علمی مسائل پر گفتگو رہی، نماز جمعہ حضرت مہتمم صاحب نے جامع مسجد بسین میں پڑھائی وقفۂ آرام کے بعد ۴ر بجے تکونی جھیل کے کنارے وزیر صاحب کی جانب سے چائے کا انتظام کیا گیا، یہ ایک طویل وعریض تالاب ہے، اس کے کنارے پر دومنزلہ ہوٹل ہے، تالاب کے اوپر سے ایک پُل بنایا گیا ہے اور وسط میں برآمدہ ہے، جس میں سیٹیں بچھی ہوئی ہیں، یہاں دیر تک اس ''تجری من تحتها الانهار'' کے دلکش منظر سے یہ قافلہ محظوظ ہوتا رہا۔ اس مادی کیف کے بعد وہ وقت آ گیا کہ جہاں شہر کا ایک بڑا مجمع بنگالی جامع مسجد میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے پیچھے نماز مغرب پڑھنے، اور روحانی کیف کے حصول کے لئے منتظر تھا، عشاء کی نماز کے بعد جامع مسجد میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ایک عظیم مجمع کو خطاب فرمایا جس میں آپ نے ''ایمان واعتقادات'' کی شرعی حیثیت پر ایک جامع تقریر ارشاد فرمائی، آپ نے فرمایا کہ انسانی فطرت میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک ''مبدأ'' سے متعلق یعنی وہ کہاں سے آیا ہے؟ دوسرے ''معاد'' سے متعلق کہ وہ کہاں جائے گا؟ تیسرے ''نبوات'' سے متعلق کہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے، شریعت اسلام نے ان ہی تینوں مسائل کا شافی حل فرمایا ہے، مذکورہ تینوں عنوانات پر دو گھنٹے سیر حاصل بحث دلنشیں اور عام فہم اپنے مخصوص انداز میں فرمائی، اور اس عنوان کے تحت آپ نے مقامی طور پر جو اعتقادی گمراہیاں پھیلی ہوئی تھیں ان کی اصلاح فرمائی جس کا مقامی حضرات نے توقع سے زیادہ اثر لیا، جلسہ کے آغاز میں مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر عدل نے برمی زبان میں حضرت مہتمم صاحب اور ''دارالعلوم دیوبند'' کا وقیع الفاظ میں تعارف کرایا، جس میں حضرت مدظلہ کی شیریں بیانی، وسعت علم ونظر اور دارالعلوم کی تاریخی عظمت وخدمات کا ذکر کیا۔

یہ بات ہم سب کے لئے اس سفر میں انتہائی مسرت کا باعث رہی کہ وزیر موصوف نہ صرف دینی رجحانات ہی رکھتے ہیں بلکہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ عملاً بھی بغیر کسی

احساس برتری کے کسی ادنیٰ خدمت میں بے تکلف لگ جاتے ہیں، اسٹیمر میں سب لوگوں کی وضوء وغیرہ کا انتظام، نماز کے لئے صفوں کا خود بچھانا اور اٹھانا، مجلس وعظ میں دو گھنٹے تک تمام لوگوں میں مل جل کر بیٹھنا، دینی مکاتب کی بقاء، ترقی اور قیام کے سلسلہ میں بلا کسی اطلاع کے معمولی طریقہ پر خود بخود مکاتب میں پہنچ جانا، عوام سے ایک بے تکلف بھائی کی طرح ملنا، اس منصب رفیع کے ساتھ دور حاضر میں ایک نادر چیز اور بسا غنیمت طرز زندگی ہے، اور یہ ہی بے تکلف معاشرت، احکام دین کی پاسداری اور دینی سلسلوں سے ذاتی دلچسپی اور عملی جدوجہد ہم نے دوسرے مسلم وزیر عزت مآب مسٹر عبدالرشید صاحب وزیر معدنیات حکومت برما میں پاکر قلبی مسرت محسوس کی۔ مسلم ممالک کے مدعیان اسلام، وزراء اور ارباب حکومت بھی ایک غیر مسلم حکومت کے مسلم وزراء کے طرز عمل سے کوئی سبق لے سکتے، اور ان کو بھی اپنی غیر اسلامی زندگی پر نظر ثانی کرنے کی توفیق ہوتی، شب کو آرام کے بعد صبح ۵؍ بجے پھر یہ قافلہ واپس میاؤں میا کو روانہ ہوا۔

۹؍فروری: صبح پانچ بجے نماز سے فارغ ہوکر پھر اسٹیمر پر آگئے، دس منٹ بعد وزیر موصوف بھی پہنچ گئے اور اسٹیمر واپس ''میاؤں میا'' کی جانب روانہ ہوگیا، یہاں آج شب میں ایک جلسہ عام کو حضرت مہتمم صاحب خطاب فرمائیں گے، دوران سفر میں حسب عادت حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کا سلسلۂ تصنیف جاری ہے، ساڑھے دس بجے اسٹیمر ''میاؤں میا'' پہنچا، گودی پر وزیر صاحب کے بھائی محمود خاں صاحب حنیف خاں صاحب (جو ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں) اور دوسرے سرکاری افسران ومعززین شہر موجود تھے، قیام گاہ ڈاک بنگلہ پر پہونچے، دوپہر کو دعوت طعام شہر کے ایک معزز تاجر صاحب کے یہاں پہلے سے وزیر صاحب نے منظور کر رکھی تھی، نماز ظہر کے بعد کچھ دیر آرام کیا، ۳؍ بجے وزیر صاحب موصوف نے فرمایا، کہ اس شہر سے دو میل کے فاصلہ پر برما کی ایک مشہور قوم ''کرن'' کے لوگوں نے حکومت کی مدد کے بغیر اپنا ایک ہسپتال اور کالج قائم کر رکھا ہے، اسلئے مجھے

اسوقت اسی کے لئے جانا ہے، حضرت مہتمم صاحب سے انہوں نے فرمایا کہ اس میں جانا آپ کیلئے کوئی ضروری نہیں ہے، آپ اگر آرام فرمانا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر مجھے آرام کا موقع دیدیا جائے تو بہتر ہے، لیکن وزیر صاحب موصوف نے راقم الحروف اور مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری سے ساتھ چلنے کے لئے فرمایا۔ ساڑھے تین بجے ہم لوگ روانہ ہوئے اور قریباً ایک گھنٹے تک اس چھوٹی سی مثالی بستی کو دیکھا، کرن قوم قبائلی لوگ ہیں، محنت و جفاکشی میں مشہور ہیں، تعلیمی لحاظ سے بھی یہ قوم دوسری برمی اقوام سے آگے ہے، یہاں پانچ مشہور قومیں آباد ہیں، جن کے نام یہ ہیں: چھن، کچھن، کرن، شان اور برمی، اس میں بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ نہایت ایثار سے خدمت کررہے ہیں، اور معمولی ٹٹوں اور لکڑیوں کے مکانات میں یہ لوگ اپنی قوم کی خدمت میں مصروف ہیں، مسلمان یہاں بھی ہر منزل میں پسماندہ ہی نظر آتے ہیں، کرن قوم کی اکثریت اس وقت حکومت سے باغی ہے، جس کی وجہ سے ملک کا اکثر حصہ امن سے محروم ہے، اس کی بڑی وجہ یہ بتلائی گئی کہ برمی قوم نے کرن قوم پر ماضی قریب میں شدید مظالم کئے، اسکولوں کو ہر جانب سے بند کرکے آگ لگادی جس سے کرن بچے جل گئے، ان کی بستیوں میں قتل عام کیا، کیوں کہ برما میں برمی قوم اکثریت میں ہے اور بقیہ تمام اقلیتیں ہیں، جس میں بڑی اقلیت جس سے برمی قوم خائف ہے ''کرن'' ہے۔ ۴؍ بجے لکڑی کے مشہور تاجر مسٹر ابراہیم صاحب نے حضرت مہتمم صاحب کو چائے پر مدعو کیا، ہم لوگ براہ راست کرن بستی سے ابراہیم صاحب کے یہاں پہنچے، اور مولانا مظاہری حضرت کو لینے کے لئے قیام گاہ گئے۔

اس دوران میں وزیر صاحب موصوف نے تصویر کے مسئلہ پر احقر سے سوال کیا، اور کہا کہ آج تصویر عام ہوچکی ہے، بہت سے سرکاری کام تصویر پر موقوف ہیں، اگر یہ بالکل ناجائز ہے تو ہم لوگ اس گناہ سے کیسے بچیں؟ احقر نے عرض کیا کہ تصویر کو اسلام نے بالکل ناجائز قرار دیا ہے، آلات تصویر کے بدل جانے سے حکم نہیں بدلا کرتا۔ پہلے قلم سے تصویریں بنتی

تھیں، آج کیمرہ سے بنتی ہیں، البتہ اسلام چونکہ مذہب فطرت اور دین دوام ہے اس میں ہر دور کے لئے لچک موجود ہے، جن صورتوں میں آپ تصویر اتروانے پر مجبور کر دئے گئے ہوں یا بے اختیار ہوں وہاں اس کا گناہ آپ پر نہیں آئے گا، لیکن اختیار صورت میں یہ فعل گناہ ہی رہے گا، یہ ایک اصول ہے، اب اس کی جزئیات کہ کہاں آپ مجبور ہیں اور کہاں مختار، اس کا فیصلہ بروقت آپ ہی کو کرنا ہوگا، کیوں کہ حالت اضطراری میں حرمت شئے حلت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور گناہ ساقط ہوجاتا ہے، جیسے مضطر کے لئے اکل خنزیر وشرب خمر حلال ہوجاتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ اب مسئلہ صاف ہوگیا، تاہم بڑی الجھن میں پھنسے ہوئے تھے اس کے بعد حضرت قبلہ پہنچ گئے، وہاں سے فارغ ہوکر نماز عصر پڑھی، نماز کے بعد حنیف صاحب (وزیر صاحب کے بھائی) سینٹرل جیل دکھانے لے گئے جیلر صاحب نے نہایت تفصیل سے جیل کا معائنہ کرایا۔ قیدیوں کی صنعت گاہیں دکھلائیں، اور متعدد قیدیوں سے ملایا، قریب مغرب واپس قیام گاہ آئے، نماز مغرب ادا کی، کچھ دیر آرام کے بعد نماز عشاء قیام گاہ پر پڑھ کر جلسہ گاہ پہنچے، جہاں ایک بڑا مجمع منتظر و مشتاق بیٹھا تھا، تلاوت کلام پاک کے بعد حضرت مہتمم صاحب سے وزیر صاحب نے درخواست کی کہ جس موضوع پر کل "بسین" میں آپ نے تقریر فرمائی اسی کو آج بھی اختیار فرمائیں، وہ بہت اہم موضوع ہے اور اس سے بہت سے لوگوں کی اعتقادی اصلاح ہوئی۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے "ایمان واعتقاد" کے مسئلہ پر ایک دوسرے عنوان سے مفصل روشنی ڈالی، جس کو بہت پسند کیا گیا، بعد میں اس کا برمی ترجمہ مولانا نور محمد صاحب نے فرمایا، ۱۱ر بجے واپس پہنچے، صبح فجر بعد قبرستان فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لے گئے جس میں وزیر صاحب ساتھ رہے، اور ۸ر بجے پھر اسٹیمر پر سوار ہوکر "واکھیما" روانہ ہوگئے۔

۱۰ر فروری: دس بجے "واکھیما" پہنچ گئے، یہاں بھی گودی پر مخصوص حضرات موجود تھے جن سے وزیر صاحب نے تعارف کرایا، طے پایا کہ قیام گاہ اسٹیمر ہی رہے گا اس لئے

سامان وغیرہ اس میں چھوڑ دیا گیا، اور داعی صاحب کے مکان پر پہنچ کر مختلف حضرات سے ملاقاتیں اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر ساڑھے گیارہ بجے پھر اسٹیمر پر آرام کرنے کے لئے آگئے، ایک بجے "چولیا مسجد" میں جلسہ عام رکھا گیا تھا، اس لئے نماز ظہر وہیں پہنچ کر ادا کی گئی، اور نماز کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے یہاں کے مسلمانوں کو خطاب فرمایا، چونکہ آجکل "برما" میں جنرل الیکشن، کی ہماہمی ہے اس لئے حضرت مہتمم صاحب نے الیکشن ہی کو تمثیلی موضوع قرار دیکر فرمایا کہ "الیکشن کا حاصل یہ ہے کہ جیتنے والے لوگ برسر اقتدار آجائیں اور صدر کا تقرب حاصل کریں، اور عوام ووٹ دے کر اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ اہل آدمی ہے اس کو ملک کا انتظام سپرد کردینا ملک کی فلاح کا باعث ہوگا۔ لیکن کامیاب ہونے والے کو اس شہادت کے حاصل کرنے میں بڑی محنت بھی کرنی پڑتی ہے، اور دولت بھی خرچ کرنی پڑتی ہے، اسی طرح سمجھئے کہ ایک پورے عالم کا بھی عمومی اور یقینی الیکشن ہونے والا ہے، جس کو اصطلاح شریعت میں یوم حشر ونشر "قیامت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس میں ہر ہر شخص کے بارے میں ملائکہ شہادت دیں گے، کہ یہ اللہ کے تقرب کا اہل ہے یا نہیں، پھر خود اس کے اعضاء اس کے حق میں شاہد بنیں گے اس کا نامۂ اعمال اس کا شاہد ہوگا، اور بلا کسی ادنیٰ ظلم کے کامل ترین انصاف کے ساتھ اس کے اہل یا نا اہل ہونے کا فیصلہ ہوگا، کامیاب ہونے والے عالم جنت میں بااقتدار ہوں گے، اور ناکام ہونے والے جہنم میں عذاب ذلت میں مبتلا ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کوئی تمثیلی تصور ہی نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے کہ جنت کے میدان "مزید" میں حق تعالیٰ جلوہ افروز ہوں گے اور اس کے قریب کرسیاں ہوں گی، جس پر انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور اس کے بعد اولیاء کاملین ہوں گے اور پھر الامثل فالامثل کی ترتیب نشستوں میں ہوگی، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر عبادات کی مشقت اسی مقربین کے مجمع میں نشست حاصل کرنے کے لئے ہے، آپ نے مزید فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کے ان معمولی انتخابات میں تو سر توڑ محنت کے

بعد کچھ اقتدار میسر آئے اور احکم الحاکمین کی باجبروت بارگاہ میں بلا کسی محنت کے مقام رفیع مل جائے، اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی اس انتخابی وقت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرلے۔ تقریر اپنے موضوع پر نہایت جامع اور پسندیدہ رہی اور ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی، بعد میں مولانا نور محمد صاحب نے بالتفصیل اس کا ''برمی'' میں ترجمہ کیا، جس کے انہوں نے نوٹ لے لئے تھے، یہاں سے فارغ ہوکر نماز عصر بنگالی مسجد میں پڑھی، اور عصر سے مغرب تک واکھیما شہر کو تفریح کے ذیل میں دیکھا۔ آبادی کھلی کھلی ہے، برما کے عام دستور کے مطابق اکثر مکانات لکڑی کے ہیں، یہ شہر باغیوں کی سرگرمی کا اکثر شکار ہوتا رہتا ہے، کیوں کہ اس کے قرب وجوار میں بہت سی خفیہ کمین گاہیں ہیں، ہم لوگوں کے پہنچنے سے قبل بھی مضافات شہر پر حملہ ہو چکا تھا، برما کے شہروں کی عمومی اور نظروں میں بے حد کھٹکنے والی گندگی یہاں بھی کم نہیں بلکہ کچھ سوا نظر آئی، نماز مغرب ''چولیا مسجد'' میں ادا کی گئی، اور کھانے سے فارغ ہوکر نماز عشاء کا وقت قریب تھا، اس لئے وہیں پڑھ کر اپنی قیام گاہ ''اسٹیمر'' پر سب لوگ آگئے۔ نویں شب کا چاند اپنی پوری تابانیوں سے سمندر کی رونق کو بڑھا رہا تھا، اور اسٹیمر کے خوشنما برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر ہم سب ہمسفر لطف اندوز ہو رہے تھے، جس میں مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری کے پر مزاج فقرے بطور خاص، اور رنگون کے تاجر اسمٰعیل اوبائیں صاحب کی پُرخوری کی نئی سے نئی توجیہات جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد بھوک سے بے تاب ہوجاتے تھے، دل چسپی کا باعث بنی رہیں، صبح ۵؍بجے اسٹیمر رنگون کے لئے روانہ ہوا، کیونکہ درمیان کے شہر ''منٹوبن'' کا پروگرام کینسل کردیا تھا، اور ''واکھیما'' سے براہ راست ''رنگون'' ہی جانا طے ہوا تھا، لیکن پندرہ بیس میل چلنے کے بعد سمندر پر نہایت گہرا کہرا چھا گیا جس سے کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، مجبوراً ایک درمیانی چھوٹے سے اسٹیشن پر رکنا پڑا، یہاں تک کہ پونے دس بجے کہرا کم ہوا اور اسٹیمر روانہ ہوا، خیال تھا کہ ۴؍بجے رنگون پہنچیں گے ـــــ اس کی اطلاع وائرلیس کے ذریعہ مختلف مقامات کو دیدی گئی تھی، لیکن جہاز

ایک گھنٹہ لیٹ پہنچا۔

۱۱؍فروری: اسٹیمر باد مخالف اور کہرا کی وجہ سے واکھیما سے بارہ میل کے فاصلہ پر تین گھنٹے رکے رہنے پر مجبور ہوا، ساڑھے دس پر کہرا چھٹا، دھوپ کی شکل نظر آئی، اور سفینہ خراماں عازم منزل ہوگیا، گھٹا اور ٹھنڈی ہوا نے لطف سفر کو دوبالا کر کے رکھا تھا، اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے وزیر عدل مسٹر عبداللطیف صاحب حضرت قبلہ مہتمم صاحب مدظلہ، مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری اور راقم الحروف اپنے اپنے کمروں سے اوپر برآمدے میں آکر بیٹھ گئے، پھر بقیہ رفقاء بھی نہ رہ سکے اور سب وہیں جمع ہوگئے اور مختلف علمی، اخلاقی، تمدنی امور پر گفتگو ہوتی رہی، قریباً بارہ بجے تک یہ دلچسپ تفریحی مجلس جاری رہی، اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور مسئلہ ''علم غیب'' پر جو رسالہ تصنیف فرما رہے ہیں پھر اس میں مشغول ہوگئے، آپ نے بتلایا کہ ڈیلٹا کے اس پرسکون اور پر تفریح سفر میں پانچ روز میں، میں نے شب وروز لگ کر ایک ماہ کا کام کرلیا، دس اور گیارہ کی درمیانی شب میں چونکہ نیند نہیں آئی، اس لئے دو بجے سے صبح ساڑھے پانچ تک آپ مسلسل لکھتے رہے۔ اس رسالہ میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل انداز میں بحث کی جارہی ہے۔ یقین ہے کہ یہ رسالہ اپنے موضوع پر ایک مکمل رسالہ بن جائے گا، اس کو بالاقساط ماہر القادری صاحب اپنے رسالہ ''فاران'' میں شائع کررہے ہیں۔ ایک قسط دیوبند سے ہی روانہ کی جاچکی تھی، دوسری کے لئے ان کا تقاضا دیوبند ہوتا ہوا رنگون پہنچا، جس پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے یہاں کے کثیر مشاغل کے باوجود اس کی تکمیل شروع فرمادی، ادارۂ تاج المعارف اسکو کتابی صورت دے گا۔ شام کو پانچ بجے یہ سفینۂ علم رنگون پہنچ گیا، یہاں باگیا خاندان کے حضرات اور دوسرے بعض لوگ موجود تھے، قیام گاہ پر پہنچ کر نماز عصر ادا کی، اور گذشتہ پانچ روز کی جمع شدہ ڈاک دیکھی جس میں ۳؍فروری ۱۹۵۷ء کے سفر ''مولمین'' کے دوران ہوائی جہاز کی خرابی کے باوجود بخیریت رنگون پہنچ جانے پر جناب

نائب مہتمم صاحب دارالعلوم اور دارالعلوم کے مختلف شعبہ جات سے مبارکباد کے متعدد تار اور خطوط بھی تھے۔

نماز مغرب اور عشاء کے بعد حسب معمول لوگوں کی آمد و رفت اور مجمع شروع ہوگیا، یہ مجلس مذاکرہ ۱۱؍بجے تک جاری رہی، کل بارہ بجے تک رنگون قیام رہے گا۔ اور ۱۳؍کو صبح ۱۰؍بجے بذریعہ ہوائی جہاز ''مولمین'' جانا ہے۔

۱۲؍فروری: صبح ۸؍بجے حسب معمول لوگ آنے شروع ہوگئے، اور حضرت مہتمم صاحب کی علمی مجلس شروع ہوگئی، رنگون کی مصروفیات کی وجہ سے ارادہ کیا گیا کہ اکیاب کا سفر ملتوی کردیا جائے اور مولمین سے واپسی کے بعد رنگون ہی میں قیام کیا جائے، لیکن مولانا عبدالرحمٰن صاحب فاضل دیوبند، مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری، مفتی محمود صاحب وغیرہ نے جانے ہی پر اصرار کیا اور بتلایا کہ برما کے مسلمانوں کی اکثریت صوبۂ ارکان ہی میں رہتی ہے اور اکیاب اس کا دارالسلطنت ہے نہ جانے سے لوگوں کو بڑی مایوسی ہوگی، ان کے روزانہ بلاناغہ تار و خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ چنانچہ پھر مجبوراً ارادہ کرلیا گیا، دوپہر کو جناب یوسف پٹیل صاحب نے حضرت مہتمم صاحب کو دعوت طعام دی جس میں دیگر معزز علماء اور تجار کے علاوہ وزیر عدل مسٹر عبداللطیف صاحب کو مدعو کیا۔ وزیر صاحب حضرت قبلہ سے غیر معمولی طور پر اثر انداز ہیں، ان کا نیاز مندانہ تعامل یہاں کے حضرت کے لئے باعث فخر و ابتہاج ہے۔ نماز ظہر کے بعد آرام کیا، اور عصر بعد چند منٹ کے لئے مختلف تجار نے حصول برکت کے لئے حضرت کو دعوت دی، ان دکانوں پر تشریف لے گئے اور دعاء فرمائی، درمیان میں جناب حاجی عبداللطیف صاحب باوانی آف کراچی سے ملاقات ہوگئی، جو اپنے بھائی احمد ابراہیم باوانی صاحب کے لڑکے کی شادی میں شرکت کے لئے رنگون آئے ہیں، اور خود کراچی کے لئے حضرت مہتمم صاحب کے پُر زور داعی بھی ہیں، آج تقریر کا پروگرام دوسری اسٹریٹ میں تھا لیکن باوانی صاحب کے اصرار پر انہی کی اسٹریٹ

میں پروگرام رکھدیا گیا، جسکو محترم میزبان اسمٰعیل باگیا صاحب نے مان لیا۔ مغرب کے بعد حضرت مدظلہ کو دیگر معززین کے ساتھ جناب حاجی اسمٰعیل داؤد یوسف صاحب (مفتی محمود صاحب کے چچا) کے صاحبزادے محمد صاحب نے مدعو کیا۔ تقریر کے روز شب میں قبل از تقریر حضرت مہتمم صاحب کھانا نہیں تناول فرماتے لیکن اس میں دوسرں کی مجبوری کی وجہ سے یہ تکلف شرکت کرنی پڑی۔ نماز مغرب وہیں ادا کی، قاری شبیر حسن صاحب دیوبندی جو ۲۴؍سال سے یہیں مقیم ہیں بطور خاص میزبانی کرتے رہے، داعی صاحب محترم کا پورا خاندان جن میں مفتی محمود صاحب بھی ہیں اسی باغیچہ میں اپنے ذاتی بنگلوں میں رہتے ہیں جو بہت خوبصورت بنے ہوئے ہیں، اور شہر سے فاصلہ پر تانبوے میں ہونے کی وجہ سے پُر سکون بھی ہیں۔ نماز عشاء واپس آکر قیام گاہ پر پڑھی، جلسہ گاہ قیام گاہ سے بالکل متصل تھی اس لئے فوراً ہی لوگ لینے کے لئے پہنچ گئے، حضرت نے اس موقع پر ''ذکر اللہ'' کی حقیقت پر نہایت جامع تقریر فرمائی اور دلائل ساطعہ سے ذکر اللہ کو بقائے عالم کا سبب قرار دیا۔ حاضرین انتہائی طور پر متأثر تھے اور نہایت سمع قبول کے ساتھ یہ مجمع عظیم اس تقریر کو سن رہا تھا، دو گھنٹے بعد تقریر ختم ہوئی اور اس کے اسٹیج ہی پر باوانی برادران دیر تک حضرت سے محو گفتگو رہے، ساڑھے گیارہ پر واپسی ہوئی، صبح کو ''مولمین'' کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز ہے، اس کے لئے ضروری تیاری کی، اور اس سے فارغ ہوکر ۱۲؍بجے آرام کے لئے لیٹ گئے، راقم الحروف نے یہ تقریر بھی ضبط کرلی ہے۔

۱۳؍فروری: آج ''مولمین'' روانگی کا پروگرام ہے شب میں مفتی محمود صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ جہاز صبح کو ۱۱؍بجے پرواز کرے گا، سوا دس بجے ایرڈروم پہنچے کا ٹائم دیا گیا ہے، سویرے ہی سے ضروری تیاری سفر مکمل کرلی گئی، دس بجے مفتی صاحب نے پھر فون کیا کہ جہاز ۱۲؍بجے جائے گا، اور آدھے گھنٹے بعد اطلاع ملی کہ ساڑھے بارہ بجے روانہ ہوگا۔ دن بھر یہ موضوع گفتگو رہا کہ ''مولمین'' کے سفر کے روز یہ تعویق ضرور پیش آتی ہے۔

۱۳؍فروری کو جہاز نصف راستے سے واپس آ گیا، اور آج ۱۳؍ کو بجائے صبح ۷؍بجے کے ۱۱؍بجے ہوا پھر ۱۲؍بجے اور اب ڈھائی بجے کا وقت ہوگیا۔ آج صبح سے مطلع صاف نہیں تھا، دس بجے کافی تیز گھٹا چھا گئی، اور ۱۱؍بجے بارش بھی ہلکی ہلکی شروع ہوگئی۔ اس بارش اور گھٹا کی وجہ سے یہ بھی امکان ہونے لگا کہ جہاز ہی نہ جائے، بہر حال راضی برضاء، ضروری ڈاک لکھنے میں حضرت مہتمم صاحب اور راقم الحروف مصروف ہوگئے، آج دوپہر کو رزق کے جن دانوں کے ''مولمین'' میں حاصل کرنے کا انسانی تصور تھا وہ رنگون ہی میں مقسوم تھے، ایک بجے کھانے سے فراغت حاصل کی، نماز کی تیاری شروع کی، ابھی وضو ہی کر رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ مفتی محمود صاحب وغیرہ ہوائی اڈے پہنچ چکے ہیں، جلدی جلدی وضو سے فارغ ہوئے، بارش نہایت زور شور سے پڑ رہی تھی اسی میں بھیگتے ہوئے نیچے آ کر موٹروں میں سوار ہوئے، ۲؍بجے ہوائی اڈے پر پہنچے، جہاں مفتی محمود صاحب، ان کے دونوں صاحب زادے خالد و سلیم سلمہا، قاری شبیر حسن صاحب دیوبندی، مولوی کبیر احمد صاحب مدرس دارالعلوم تانبوے، اور جاودت صاحب (تاجر رنگون جن کا اصل وطن مولمین ہے قیام ان ہی کے مکان پر ہوا) اور ادھر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ راقم الحروف کے علاوہ ساتھ میں قاسم باگیا (بابو بھائی) رنگون کے میزبان اسمٰعیل باگیا صاحب کے برادر خورد بھی تھے، اب سب لوگ مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری کے منتظر تھے لیکن جہاز میں سوار ہونے کا اعلان ہوگیا اور وہ نہ پہنچ سکے جن کا سب کو بے حد افسوس رہا تھا، ٹھیک اڑھائی بجے طیارہ پرواز کر گیا، اور پورے ۴۵؍منٹ کے بعد ''مولمین ایرپورٹ'' پر بخیرت اتر گیا، یہاں اڑھائی تین ہزار کے قریب مسلمانوں کا عظیم مجمع مختلف جھنڈے لئے ہوئے دو گھنٹے سے منتظر تھے، سب سے پہلے جہاز سے اترتے ہی جناب حافظ محمد حسین صاحب داعی مولمین نے خوش آمدید کہا، اور اس کے بعد صف بستہ کھڑے ہوئے معززین سے ملاقات و تعارف کرایا جن میں سب سے پہلے کمشنر صاحب تھے اور اس کے بعد ملٹری آفیسر، پھر مقامی کانگریس کمیٹی (بھارت)

کے صدر، اور پھر علماء و تجار حضرات تھے، ان مخصوصین سے ملاقات کے بعد جب باہر نکلے، تو ان ہزاروں محبین نے ہجوم کیا اور ہر ایک اس کا خواہش مند تھا کہ حضرت مہتمم صاحب سے مصافحہ کر لے۔ مجبوراً ویٹنگ روم کے بڑے ہال میں حضرت کو اور ان کے رفقاء کو لے جایا گیا اور آمد و رفت کے دو دروازے معین کر کے پولیس کا پہرہ لگایا تا کہ لوگ ایک جانب سے آ کر مصافحہ کریں اور دوسری جانب سے نکل جائیں، اس کے باوجود بھی بمشکل مجمع کو قبضے میں رکھا جا سکا۔ سوا تین بجے سے ۴؍بجے تک اسی حال میں مصافحوں کا بلا فصل سلسلہ جاری رہا، چار بجے بذریعہ کار قیام گاہ روانہ ہوئے۔ ''ایم جاودت'' صاحب کے یہاں قیام ہوا۔ یہ مکان سورتی سنی جامع مسجد سے قریب ہی واقع ہے، قیام گاہ میں حضرت کے تمام رفقاء کیلئے نہایت سلیقہ سے انتظام قیام کیا گیا تھا، عصر بعد جناب مولانا محمد صالح پانڈور صاحب کی درخواست پر حضرت مہتمم صاحب نے ان کے مدرسے مدرسہ عربیہ یتیم خانہ اسلامیہ مولمین کا معائنہ فرمایا، مولانا پانڈور نے اہل مولمین کو حضرت کی تشریف آوری پر مبارکباد دی، اور حضرت کا شکریہ ادا کیا، مولانا موصوف نے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور علامہ عثمانیؒ سے ڈابھیل میں دورۂ حدیث پڑھا ہے، اس لئے غایت درجہ تعلق کا اظہار فرمایا۔ معائنہ مدرسہ کے بعد یہاں کی مشہور بدھسٹ عبادت گاہ ''پگوڈا'' جو پہاڑ پر واقع ہے اور تفریح گاہ ہے، وہاں گئے، نماز عشاء کے بعد سورتی مسجد میں عظیم الشان اجتماع ہوا، جس میں حضرت مہتمم صاحب نے ۳؍فروری ۱۹۵۷ء کو 'مولمین' نہ آ سکنے پر معذرت پیش فرمائی، اور معذرت و قبول ہی کے موضوع پر دو گھنٹے سلسلۂ تقریر جاری رہا۔

۱۴؍فروری: نماز فجر کے بعد ''چولیا ایسی ایشن'' کی طرف سے اس کے صدر ''داؤد نانا'' صاحب نے چائے پر مدعو کیا، وہاں سے فارغ ہو کر صبح ۸؍بجے مولانا نذیر احمد صاحب ناظم مدرسہ اشاعت العلوم بڈویں گوں ضلع چیمر وعلاقہ ''مولمین'' کی دعوت پر ۲۲؍میل کی مسافت طے کرنی تھی، ۷؍بجے جیلر صاحب کی دعوت پر حضرت مہتمم صاحب نے مع رفقاء

''سینٹرل جیل''، مولمین کا معائنہ فرمایا، ہر کلاس کے قیدی قطار کی صورت میں اپنی اپنی جیلوں کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوئے تھے، بعض ملزمین نے اپنی بے گناہی پیش کر کے دعاء چاہی۔ سیاسی قیدیوں میں کرن قوم کے سربراہ لیڈر بھی تھے جو حکومت کی نظر میں غدار سمجھے جاتے ہیں، ان کو بھی حضرت مہتمم صاحب نے ترجمانی کے ذریعہ فرمایا کہ برما کی موجودہ بغاوت سے صرف پبلک کو نقصان پہونچ رہا ہے، اور آپ کا اختلاف حکومت سے ہے اس لئے آپ لوگوں کو توڑ پھوڑ کی اس پالیسی کو ترک کر کے مصالحت کی راہ اختیار کرنی چاہئے، جس کی ایک مختصر سی مثال یہ بھی ہے کہ ہمیں مولمین آنے کے لئے ہوائی سفر اختیار کرنا پڑا، اور خواہ مخواہ کثیر مصارف ہوئے کیوں کہ ریلوں کے سفر کو آپ لوگوں نے پورے ملک میں مخدوش بنا رکھا ہے، یہ پبلک ہی کا نقصان ہے حکومت کا نہیں۔ آٹھ بجے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ مدرسہ اشاعت العلوم بڈویں گوں ضلع چیمر و روانہ ہوگئے، یہ مولمین سے ۲۲؍میل کے فاصلے پر ہے۔ مدرسہ کی عمارت کے باہر سڑک پر تمام طلباء اور مدرسین دو رویہ صف میں کھڑے ہوئے تھے، پرتپاک استقبال کے ساتھ وہ حضرات اندر لے گئے، یہاں ایک مجمع عظیم دیر سے منتظر بیٹھا تھا، جس میں دور دراز سے لوگ پیدل اور موٹروں سے سفر کر کے آئے تھے۔ یہاں حضرت مہتمم صاحب نے طلباء کو خطاب فرماتے ہوئے عالم دین کی شرعی ذمہ داری پر بسیط تقریر فرمائی۔ ۱۱؍بجے یہ اجتماع ختم ہوا، پھر واپس مولمین یہ قافلہ روانہ ہوا۔ راستے میں سڑک کے دونوں طرف ''ربڑ'' کے درختوں کے خوشنما اور سرسبز باغات تھے، جنہوں نے اس سڑک کی رونق دوبالا کر رکھی ہے، ظہر کے بعد آرام کیا، اور قبیل عصر بیس میل کے فاصلے پر صنعتی چھوٹے سے شہر ''مونگڈون'' تشریف لے گئے، بیس بائیس حضرات معیت میں تھے، پانچ چھ کاروں پر یہ سفر طے ہوا۔ عصر کی نماز مونگڈون میں ادا کی، مقامی مسلمان جو ۳؍فروری ۱۹۵۷ء کو استقبال کے لئے مولمین ہوائی اڈے پر پہونچے تھے لیکن ملاقات نہ ہوسکنے کی وجہ سے ملول خاطر واپس آئے تھے، وہ سب جمع ہوگئے، کچھ دیر

ان سے ملاقات رہی، پھر ایک چینی فرم میں گئے جو عمدہ قسم کی چادریں، سوتی کمبل، پلنگ پوش، میز پوش وغیرہ بنانے میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ مغرب کی نماز چوں کہ مولمین پڑھنی تھی، اس لئے جلد واپسی ہوگئی، مغرب بعد ایک مجمع عظیم نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور داخل سلسلہ ہوئے۔ نماز عشاء کے بعد واپس قیام گاہ تشریف لائے یہاں ایک مسرت بخش اطلاع یہ ملی کہ ایک بدھسٹ خاندان حضرت کے ہاتھ پر قبول اسلام کے لئے منتظر ہے، اس میں ایک نوجوان مرد، بمعہ اپنی بیوی اور والدہ اور دو بچوں کے موجود تھا۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ان کو مسلمان کیا، اور نصف گھنٹے تک ان کو مبادیات اسلام کی تعلیم ترجمان کے ذریعہ دی، اور اس کے بعد سب نے مل کر ان کی استقامت کے لئے دعاء مانگی، ادھر جلسہ گاہ میں بے چینی سے حضرت مدظلہ کا انتظار ہو رہا تھا، اس لئے فوراً تشریف لے گئے، یہاں تقریر اڑھائی گھنٹے جاری رہی، لیکن راقم الحروف اس روز بوجہ ناسازیٔ طبیعت کے اسے ضبط نہیں کر سکا۔

۱۵؍فروری: پاکستان ایسوسی ایشن نے صبح چائے پر مدعو کیا، وہاں سے فارغ ہو کر حضرت قبلہ مہتمم صاحب مدرسہ امداد العلوم چیمبر و تشریف لے گئے، یہ مقام مولمین سے ۱۸؍میل کی مسافت پر ہے، مدرسہ کے ناظم اور مدرسین فضلاء دارالعلوم دیوبند ہیں۔ ناظم مدرسہ نے اولاً سپاس نامہ پیش فرمایا اور اس کے بعد کہا کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے دارالعلوم میں حضرت سے مشکوۃ شریف پڑھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس مدرسہ کے شرکاء مشکوۃ بھی کتاب الایمان کی پہلی حدیث آں مخدوم سے پڑھ لیں، حضرت نے منظور فرمایا اور پون گھنٹہ حضرت مہتمم صاحب نے ''حدیث جبریل'' کے اسرار و علوم بیان فرمائے، یہ درس اگرچہ طلباء کے لئے تھا، لیکن اس میں ایک بڑا مجمع عظیم بھی استفادہ کر رہا تھا۔ یہ علمی مجلس بھی یادگار مجلس بن گئی، ساڑھے دس بجے جمعہ کی وجہ سے واپسی پر عجلت فرمائی، قیام گاہ پر صبح سے لوگ منتظر بیٹھے تھے جس میں کچھ حضرات بعض علمی سوالات لئے بیٹھے تھے، اور

بہت سے خواستگاران دعاء تھے، پونے بارہ بجے بمشکل اٹھ کر نماز جمعہ کی تیاری کی، کھانا کھانے سے عذر پیش کیا، مگر داعی صاحب لے چلنے پر مصر ہوئے، چند منٹ وہاں شرکت کر کے مسجد پہنچ گئے، نماز سے فارغ ہوتے ہی موٹر تیار تھی، مسجد سے ہی ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہوئے۔ حضرت نے مسجد میں اعلان کرادیا تھا کہ ہوائی اڈے پر جو حضرات آنے کے لئے کہہ رہے تھے وہ تکلیف نہ کریں دھوپ اور گرمی کا وقت ہے، لیکن اس کے باوجود لاریوں، ٹیکسیوں وغیرہ سے قریباً ایک ہزار کا مجمع وہاں جمع ہو گیا، ریل اور ہوائی جہاز کی عام سروس چونکہ پورے برما میں پابند وقت نہیں ہے، اس لئے ایک گھنٹہ انتظار کے بعد جہاز آیا، لوگوں نے دعاء کرائی اور بادیدۂ تر رخصت کیا۔ اڑھائی بجے جہاز نے پرواز کی اور ۴۵رمنٹ میں ٹھیک سوا تین بجے رنگون ایرپورٹ پر بخیریت جا اتارا، یہاں مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری اور دوسرے حضرات موجود تھے، قیام گاہ پہنچ کر نماز عصر ادا کی، پھر ملاقاتوں کے لئے مختلف حضرات آتے رہے، عشاء کے بعد وزیر عدل مسٹر عبداللطیف صاحب بمع مولانا مظاہری اور دوسرے رفقاء کے اچانک تشریف لے آئے، موصوف کی اسی بے تکلف روش نے انہیں عوام میں مقبول بنا رکھا ہے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹے حضرت مہتمم صاحب کی علمی مجلس میں شریک رہے، ۱۱ربجے یہ مجلس برخاست ہوگئی، اور علی الصباح اکیاب (ارکان) کے ہوائی سفر کی تیاری کی اور اس کے بعد آرام کیا۔

۱۶رفروری: اکیاب کے سفر میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی ہمراہی میں راقم الحروف اسمٰعیل باگیا صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب رنگونی فاضل دیوبند تھے، صبح ۴ربجے میزبان محترم اسمٰعیل باگیا صاحب نے بیدار کر دیا، وضوء وغیرہ سے فارغ ہو کر ساڑھے چار بجے موٹر سے روانہ ہوئے، رات کی مجلس میں چونکہ وزیر عدل عزت مآب مسٹر عبداللطیف صاحب نے ہوائی اڈے تک ساتھ چلنے پر اصرار کیا تھا، اس لئے سیدھے ان کی کوٹھی پہنچے، وہ تیار بیٹھے تھے، وہیں نماز فجر ادا کی، ہوائی اڈے پر الوداع کہنے کے لئے

میزبان صاحب کے گھر کی مستورات بھی آئی تھیں، اسماعیل صاحب نے ٹکٹ اپنی اہلیہ صاحبہ کو دے رکھے تھے، لیکن وہ لانا بھول گئیں جس سے بڑی پریشانی پیدا ہوگئی، فوراً آدمی گھر روانہ کیا گیا، ادھر یہ بھی معلوم ہوا کہ برما سے باہر جانے والے ہوائی جہاز میں اندرون برما میں بھی غیر ملکی لوگوں کو سفر کرتے وقت پاسپورٹ دکھانا لازم ہے اور ہم لوگوں کے ساتھ اس وقت وہ بھی نہیں تھا، کیوں کہ اس سے قبل مولمین کے سفر کے وقت بھی اس کی ضرورت پیش آئی تھی، اس وقت ضابطہ کے لحاظ سے تقریباً سفر ناممکن ہو گیا تھا، لیکن وزیر صاحب موصوف کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت مہتمم صاحب کی اطلاع کے بغیر خود جا کر تمام مراحل عدم موجودگی ہی میں طے کرادئے، ان کے فرمانے پر محض دفتر کی لسٹ پر نام کی وجہ سے سفر کی اجازت دے دی گئی، لیکن کچھ عرصہ بعد ٹکٹ آ گئے، جہاز یہاں سے عام دستور برما کے مطابق بجائے ساڑھے چھ بجے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد پونے آٹھ پر روانہ ہوا۔ اس عرصہ میں وزیر صاحب نے خود ساتھ لے کر ہوائی اڈے کی سیر کرائی، اور مولانا مظاہری صاحب کے دلچسپ جملے پورے عرصہ میں دلچسپی اور تفریح کا باعث بنے رہے، اور رنگون کی دلچسپ اردو کے نمونے سناتے رہے، پونے آٹھ پر ہم لوگ سوار ہوئے اور جہاز نے پرواز شروع کی۔ دو گھنٹے کا یہ طویل ہوائی سفر کافی دلچسپ رہا۔ راستہ میں سرسبز و شاداب پہاڑوں کا طویل وخوشنما سلسلہ ہے، اس علاقہ پر جہاز کی بلندی غیر معمولی ہو جاتی ہے، جہاں سے پتھروں کے یہ عظیم پیکر بچوں کے گھروندے معلوم ہوتے ہیں، پہاڑی سلسلہ ختم ہوتے ہی میدانی علاقہ میں نہروں کا عجیب وغریب جال بچھا ہوا ہے جو سب کی سب سمندر میں جا گرتی ہیں، اس منظر کی دل کشی بے مثل معلوم ہوتی ہے، یہاں سے گذر کر اب جہاز کی پرواز عین سمندر کے اوپر شروع ہوگئی، جو اس کی علامت تھا کہ اب اکیاب قریب آ گیا۔ دو گھنٹے کا یہ وقفہ پورا ہوا، اور ٹھیک پونے دس بجے جہاز اکیاب ایرپورٹ پر اتر گیا، یہاں جہاز اترنے کی سڑک جالیدار لوہے کی بنی ہوئی ہے جس پر جہاز کے اترنے سے عجیب جھنجھناہٹ

کی آواز پیدا ہوتی ہے، جہاز سے اترے تو سب سے پہلے مولانا محمد حسین صاحب اکیابی فاضل دیوبند ناظم مدرسہ تکمیل العلوم اکیاب نے استقبال ومصافحہ کیا، اور پھر دیگر مدرسین و علماء کرام نے، ارکان کے پورے علاقہ میں ہزاروں کی تعداد میں فضلاء دارالعلوم موجود ہیں جو سب کے سب اس موقع پر موجود تھے، ان کی مسرت ان کے چہروں پر کھیل رہی تھی، منگڈ و اور بوتھیڈ نگ سے علماء کا بڑا مجمع یہاں کئی روز سے آیا ہوا تھا۔ ہوائی اڈے کے میدان میں ہزاروں کی تعداد میں مجمع عظیم موجود تھا، ارکان کی سرحد مشرقی پاکستان سے ملتی ہے، یہاں ہزاروں کی تعداد میں تقریباً ایک صدی سے بنگالی حضرات آباد ہیں، جو اس طویل عرصے میں اگرچہ ضابطے کے لحاظ سے برمی بن چکے ہیں لیکن ابھی تک انہوں نے زبان کو سنبھال رکھا ہے، اور عام طور پر طرز معاشرت ارکان وبنگال کا قریب ہی قریب ہے۔ یہاں اصل برمی قوم ''نمگ'' ہے جو نہایت وحشی اور جاہل ہے، ساتھ متعصب بھی، مگوں کی اکثریت وغلبہ کی وجہ سے یہاں کے مسلمان پریشان حال بھی ہیں اور غریب بھی۔ شام تک ملاقاتوں وغیرہ کا سلسلہ جاری رہا، قیام جناب مارکن صاحب کے مکان پر ہوا جو یہاں کے ممتاز شہری اور تاجر ہیں۔ نماز عشاء کے بعد جامع مسجد اکیاب میں عظیم الشان اجتماع ہوا، جس میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے اڑھائی گھنٹے تقریر فرمائی، تقریر پر یہاں کے علماء نے بطور خاص اپنے تأثر ومسرت کا اظہار فرمایا۔

۱۷ر فروری: ۸ر بجے صبح کو داعی صاحب اور دیگر حضرات نے موٹر سے پورے شہر کی سیر کرائی، جس میں میزبان صاحب آفس، مختلف سمندری گودیاں، جہازوں کے ٹھیک ہونے کے بڑے بڑے کارخانے، چاول کے لدان کے اسٹاک، ہال وغیرہ شامل تھے۔ دس بجے مولانا محمد حسین صاحب کی دعوت پر براہ راست ''مدرسہ تکمیل العلوم اکیاب'' تشریف لے گئے، جہاں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے یہاں کی منتہی جماعت طلبہ کو ''مشکوٰۃ'' کا نصف گھنٹہ درس دیا، اس میں خود مولانا محمد حسین صاحب فاضل دیوبند بانی

مدرسہ، اور دیگر علماء وفضلاء دارالعلوم جو اس وقت یہاں کے بڑے علماء میں ہیں جماعت طلبہ کی صف میں جا کر بیٹھے اور چند منٹوں کے لئے پھر ''دارالعلوم'' کی سی زندگی ان کے لئے لوٹ آئی۔ جس پر وہ بے حد مسرور تھے۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ''**انما الاعمال بالنیات**'' پر پون گھنٹہ تقریر فرمائی، مدرسہ ہذا میں اسی سال سے مشکوٰۃ شریف کا درس شروع کرنے کی تجویز ہوئی۔ باضابطہ درس آئندہ سال ہوگی لیکن طلباء کو آئندہ سال مشکوٰۃ شریف پڑھنی ہے۔ اس موقع پر تبرکاً حضرت مہتمم صاحب سے آغاز درس حدیث کرایا گیا، اس درس میں عوام کا بھی ایک بڑا مجمع شریک تھا۔ مدرسہ ہی میں اس وقت حضرت کو دعوت طعام دی گئی جس میں تمام معززین شہر اور بیرونی ومقامی علماء کو مدعو کیا گیا تھا، درس کے بعد وہیں کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے اور واپس قیام گاہ تشریف لے گئے۔ دو گھنٹے آرام کے بعد نماز ظہر پڑھ کر پھر مدرسہ مذکور پہنچے جہاں اس وقت جلسہ عام کا انتظام تھا۔ مدرسہ کا عظیم میدان مجمع کے لئے ناکافی ہوگیا طلبہ نے عربی، اردو، اور برمی زبانوں میں تقریریں کیں، اس کے بعد مولانا سعید احمد صاحب فاضل ندوۃ العلما لکھنو مدرس مدرسہ ہذا نے سپاس نامہ پیش کیا جس میں ارکان میں اسلام میں داخل ہونے کی تاریخ عمدہ ترتیب سے پیش کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے نہایت جامع تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ ارکان کی اسلامی تاریخ معلوم کر کے مجھے بے حد مسرت ہوئی، لیکن واقعات فی نفسہ کوئی چیز نہیں، ان کو دیکھنے میں انسان وحیوان برابر ہیں، دن رات کے ٹوٹ پھیر کو وہ بھی دیکھتے ہیں اور ہم بھی لیکن واقعات سے عبرت ونصیحت اور نتیجہ آفرینی اصل چیز ہے، یہ ہی انسان کا امتیاز ہے، عنوان کی دلچسپی اور بیان کی جامعیت نے اس تقریر کو ایک تاریخی اور یادگار تقریر بنادیا۔ حضرت کی تقریر کے اختتام پر ''جمعیۃ العلماء'' ارکان کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا گیا، جس پر دوبارہ حضرت نے مختصر سی تقریر شکریہ فرمائی۔ نماز عصر پڑھ کر یہاں کی لب سمندر کی مشہور اور تفریح گاہ چلے گئے جہاں سمندر کی موجیں سمندر کے متصل پہاڑی ٹیلوں سے ٹکرا

رہی ہیں، یہیں ایک خوبصورت مینارہ بنایا گیا ہے جس سے منظر کی دلکشی کئی گنا بڑھ جاتی ہے، کچھ دیر یہاں ٹھہر کر اس کے قریب ہی کے اس تاریخی پہاڑی پر تشریف لے گئے جہاں تاریخی ثبوت سے صحابۂ کرامؓ تشریف لائے اور قیام فرمایا۔ بتلایا گیا کہ اس کنارے پر صحابہؓ کا جہاز خراب ہوگیا تھا اور وہ حضرات قیام پر مجبور ہوئے۔ پہاڑ کے اس حصے پر اس وقت ایک قبہ بنا ہوا ہے برابر میں ایک مسجد بھی ہے، یہاں دیر تک ٹھہرے، اور صحابہ کرامؓ کے جذبۂ اعلاء کلمۃ الحق کے ذوق پر عبرت خیز گفتگو ہوتی رہی۔ قبیل مغرب واپس آئے، جامع مسجد میں ایک بڑا مجمع داخل سلسلہ ہونے کا منتظر تھا، اور عشاء کے بعد سے ۱۱ ربجے تک حسب معمول علمی مجلس جاری رہی، جس میں اکابر دیوبند کے واقعات زیر تذکرہ آتے رہے۔

۱۸ رفروری: نماز فجر کے بعد معمولات سے فارغ ہوکر ناشتہ کیا، اور اسکے بعد مارکن صاحب (داعی) کے دفتر میں گئے جو دریا کے کنارے واقع ہے، دفتر سے گودی پر جانا ہوا، واپسی میں ''مدرسہ دار العلوم'' ناظر پاڑہ گئے، یہ ایک معتد بہ مدرسہ ہے، جس میں فضلاء دار العلوم ہی مصروف خدمت ہیں، یہاں مختصراً درس مشکوۃ شریف ہوا، ۱۰ ربجے قیام گاہ پر آکر جناب سلطان احمد صاحب مل مالک کا پرچہ ملا جس میں انہوں نے حضرت قبلہ کو اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی تھی لیکن داعی صاحب کی اور سلطان صاحب کی باہمی مخاصمت تھی، اس لئے انہوں نے پرزور مخالفت کی، لیکن حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ہمارا تعلق بواسطہ دار العلوم ہے اور دار العلوم سب کا ہے، اس لئے میں ضرور حاضر ہوتا، لیکن اب جبکہ روانگی میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے، اور ملاقات کرنے والے ہجوم کر کر کے یہاں آرہے ہیں، میں اس صورت میں نہیں جاسکوں گا۔ اگر وہ ملنا چاہیں تو ہوائی اڈے پر تشریف لے آئیں۔ چنانچہ سلطان صاحب وہاں پہنچے لیکن حضرت مہتمم صاحب تک نہیں پہنچ سکے جس کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔

ساڑھے بارہ بجے ہوائی اڈے کے لئے روانگی ہوئی، بہت سے حضرات خود حضرت

مہتمم صاحب کے ساتھ موٹروں میں روانہ ہوئے اور باہر سے آئے ہوئے علما وفضلاء دار العلوم اپنے طلباء اور رفقاء کے ساتھ پیدل ہی پہنچ چکے تھے، نیز شہر کا ایک عظیم الشان مجمع کافی دیر پہلے وہاں جمع ہو چکا تھا، حضرت مہتمم صاحب کے پہنچنے پر ''ایرڈروم زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھا، اس مظاہرہ اخلاص کے بعد لوگ جمع ہوگئے، اور سادہ لوح لیکن بااخلاص غرباء نے ایک اور دو دو روپیہ دار العلوم کے لئے پیش کرنا شروع کیا، یہ وقت اگرچہ اس کا نہیں تھا، لیکن حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ان کی دلداری کیلئے بذات خود مختلف چھوٹے چھوٹے پرچوں پر ان بے لوث غرباء اور مساکین کے پتے لکھ کر یہ چندے جو مقدار میں ہلکے ہونے کے باوجود خلوص کا بیکراں وزن رکھتے تھے، قبول فرمائے، اور حضرت بانی دار العلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی الہامی وصیت کے مطابق برکت وامداد غیبی کے سرچشمے انہی سے پھوٹتے ہیں، جہاز ایک گھنٹہ لیٹ پہنچا، اس لئے یہ سلسلہ طویل تر ہوگیا اور تقریباً دو اڑھائی سو روپے ان حضرات نے پیش فرمایا، جہاز آیا اور الوداع ملاقاتوں کے بعد پرشور نعروں کے ساتھ ان محبین نے رخصت کیا، دو گھنٹے کا یہ ہوائی سفر سوا دو بجے دوپہر کو شروع ہوا، اور ٹھیک سوا چار بجے رنگون ایرپورٹ پر جہاز بخیریت اتر گیا، اس سفر میں حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ راقم الحروف اور میزبان محترم مسٹر اسماعیل باگیا صاحب تھے، قیام گاہ پہنچ کر جمع شدہ ڈاک دیکھی، نماز عصر کے بعد ملاقات کے لئے لوگ آنے شروع ہوگئے، اور یہ سلسلہ حسب معمول گیارہ بجے شب تک جاری ہے۔

۱۹ رفروری: ناشتہ سے فراغت کے بعد مختلف حضرات آتے رہے دس بجے مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری تشریف لائے، اور اپنے قائم کردہ ''بوڑھوں کے گھر'' لے گئے، اس کے پیچھے ایک عبرتناک تاریخ ہے اور وہ یہ کہ امریکن عیسائی مشنری نے سب سے پہلے اس قسم کا ایک گھر قائم کیا اور ہر قسم کی رہائشی آسائشیں اس میں مہیا کیں اور اس میں مفت

خدمت و رہائش کا انتظام کر کے ہر قوم و مذہب کے لاوارث و پریشان بوڑھوں کو رکھنے کا انتظام کیا رفتہ رفتہ اس میں سات بوڑھے مسلمان بھی پہنچ گئے، جن میں ایک حافظ قرآن بھی تھے، اوران سہولتوں کا معاوضہ یہ وصول کیا گیا کہ ان مسلمانوں کو بھی گرجا گھر میں لے جا کر اوران کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر عیسائی، بنا لیا گیا جب اس کی اطلاع مولانا مظاہری صاحب کو ہوئی تو طبعاً انہیں تجسس پیدا ہوا، اور رنگون ہی کے ایک مخیّر تاجر شیخو بھائی صاحب کی معاونت سے اسی طرز پر یہ بوڑھوں کا گھر قائم کیا، اور بڑی رسہ کشی کے بعد ان ساتوں بوڑھوں کو وہاں سے نکال لیا جہاں چند روٹیوں کے عوض ان کی متاع ایمان خریدی جا رہی تھی، ان میں بعض ہندوستان کے تھے اور بعض پاکستانی، ان کی خواہش پر ان کیلئے اپنے اپنے وطن جانے کا انتظام کر دیا گیا۔ اس وقت تین بوڑھے وہاں موجود ہیں جن کی پوری خدمت بھی ہو رہی ہے اور ان کو مختصراً دینی معلومات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ عمارت ایک باغیچہ میں ہے، جہاں ساتھ ہی ایک بچہ کا مکتب، اور مسجد بھی ہے۔ حضرت مہتمم صاحب نے ان حضرات کی اس خدمت کو بہت زیادہ سراہا، واپس آ کر ظہر بعد آرام کیا، اور عصر کے بعد جناب سلیمان اسحاق بھومدت صاحب کی دعوت پر پاک لین باغیچے میں گئے، جھیل کے کنارے داعی صاحب نے نہایت خوبصورت بنگلہ تعمیر کیا ہے، نہایت خوش منظر جگہ ہے، یہ دعوت حضرت مہتمم صاحب کے اعزاز میں نہایت وسیع پیمانے پر دی گئی جو جس میں دوسو سے زائد معززین شہر کے علاوہ دونوں مسلم وزراء عزت مآب عبدالرشید صاحب اور عزت مآب عبداللطیف صاحب بھی شریک تھے قبیل مغرب جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب فاضل دیوبند نے حضرت مدظلہ کی خدمت میں عربی سپاس نامہ جو نہایت وتسبیح کلمات پر مشتمل تھا۔ جس کے جواب میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے تقریر پون گھنٹہ ارشاد فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ مولانا محترم نے سپاس نامے میں دو چیزیں ارشاد فرمائی ہیں، ایک میری ذات سے متعلق کلمات توصیف ہیں جو مولانا موصوف کے حسن ظن اور کریم النفسی کی دلیل ہیں کہ

انہوں نے اپنے ایک بھائی کی عزت افزائی فرمائی۔ دوسرے میری نسبت سے متعلق، سو اس سے مجھے انکار بھی نہیں کیوں کہ وہ میرا اپنا کمال نہیں ہے، اور نسبتوں کی توقیر خود منشاء شریعت ہے۔ قرآن نے فرمایا کہ اولاد میں اگر امین موجود ہو تو مراتب میں ترقی دیکر ان کو صالح ماں باپ کے مساوی کر دیا جائے گا۔ ایسے ہی کتاب اللہ، رسول اللہ بیت اللہ کی عظمت کی وجہ نسبت مع اللہ ہے۔ ذرہ میں چمک آفتاب کی ہوتی ہے، اس کا کمال صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ آفتا سے منہ نہ موڑے، تو ہمارا وصف کمال بے کمالی کے ساتھ صرف یہ ہی ہے کہ ہم نے جماعت مقبولین کے آفتابوں سے منہ نہیں موڑا، اور اس پر ہم حق تعالیٰ کے شکر گزار ہیں۔ مغرب کے وقت یہ تقریر ختم ہوئی، یہ تقریر اختصار کے باوجود نہایت مؤثر ثابت ہوئی۔ کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد دونوں مسلم وزراء نے خلوت میں دیکھ کر حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات کی۔ جس میں مختلف علمی اور فقہی مسائل زیر تذکرہ آئے، ساتھ ہی ان دونوں نے دارالعلوم کی جمع شدہ رقم کے بارے میں پوری سہولتیں مہیا کرنے کا وعدہ فرمایا۔ عشاء بعد قیام گاہ پر پھر حسب معمول مجلس مذاکرہ رہی، جو گیارہ بجے تک جاری رہی۔

۲۰ رفروری: صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ اچانک میزبان محترم مسٹر اسمٰعیل باگیا صاحب نے سلیمان مدھا صاحب کے صاحبزادے مسٹر موسیٰ مدھا کے گذشتہ رات میں اغوا کئے جانے کے افسوسناک واقعہ کا اطلاع دی یہ ایک انتہائی طریقہ یہاں باغیوں نے جاری کر رکھا ہے کہ کسی مالدار و سربرآوردہ شخص کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور پھر بذریعہ ڈاک متعلقین سے ایک زبردست رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، جو اگر اچانک وقت مقررہ پر ادا کر دی گئی تو چھوڑ دیتے ہیں ورنہ قتل کر ڈالتے ہیں۔ مدھا صاحب چھتری و صابن کے کارخانے دار اور کروڑ پتی لوگوں میں ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتے ہیں، حضرت مہتمم صاحب بمع راقم الحروف اور باگیا صاحب مدہا صاحب کے یہاں مواساۃ کے لئے تشریف لے گئے، ضعیف العمری میں مدھا صاحب کے لئے یہ حادثہ

انتہائی صبر آزما ہے، تقریباً نصف گھنٹہ وہاں ٹھہر کر موعودہ پروگرام پر روانہ ہوئے۔ ۹ربجے جناب بخشش احمد صاحب (فیض آباد) سیکرٹری مسلم انجمن رنگون کی دعوت پر انجمن کے خصوصی اجلاس میں تشریف لے گئے، سیکرٹری صاحب نے نہایت وقیع الفاظ میں تعارف کرایا اور ممبران سے ملایا۔ پھر حضرت مہتمم صاحب سے درخواست کی کہ ہمیں کچھ نصیحت فرمایئے، حضرت مہتمم صاحب نے ایک مختصر تقریر موضوع اجتماعیت پر فرمائی اور اس کی شرعی حیثیت اور مطلوبیت کو دلنشیں انداز میں واضح فرمایا، اور اراکین کو اس اجتماعی خدمت پر مبارک باد کے ساتھ خلوص نیت کی تلقین فرمائی۔ بعد میں سیکرٹری صاحب نے انجمن کی اجتماعی تاریخ اور خدمات بیان کیں اور پھر ممبران انجمن کی جانب سے مبلغ اٹھارہ سو روپے دارالعلوم دیوبند کے لئے پیش فرمائے۔ جزاہم اللہ

۱۱ربجے قیام گاہ واپس آکر آرام کیا، عصر کے بعد جناب حاجی محمد سلیمان خانجی تاجر کی طرف سے اسی پاک لین میں اعزازی دعوت دی گئی، اس میں بھی شہر کے تمام ہی معززین موجود تھے، اس موقعہ پر بھی وزیر عدل مسٹر عبداللطیف صاحب اسی بے تکلفی کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ سے علمی استفادہ کرتے رہے۔ آٹھ بجے واپس آئے، آج ۹ربجے حضرت کی الوداعی تقریر کلی ۲۶رمیں ہے، اس لئے نماز سے فارغ ہوکر حضرت مہتمم صاحب اجلاس میں تشریف لے گئے، جہاں آپ نے اہل رنگون اور اہل برما کی مہمان نوازی پر نہایت لطیف پیرائے میں شکریہ ادا فرمایا اور ساتھ ہی ''حقیقت شکر'' پر مبسوط علمی تقریر فرمائی جس میں مراتب وثمرات شکر پر حقائق شرعیہ بیان فرمائے جس پر متعدد ارباب علم نے بیساختہ کہا کہ شکر کی حقیقت ہم پر آج منکشف ہوئی ہے۔ یہ عظیم الوداعی نسبت تاثیر وتأثر کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ اور حاضرین تأثر کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کی واپسی وطن پر بادیدۂ ترمل کر اظہار عقیدت و نیاز کر رہے تھے۔ ۱۱ربجے واپسی ہوئی، سامان سفر کی تیاری کی کیونکہ کل شام کو روانگی ہے صبح سے مسلسل پروگرام ہیں جس میں

تیاری کا موقع نہیں ملے گا۔

۲۱رفروری: آج رنگون سے روانگی کا دن ہے، ۵ربجے شام کو ''ایس، ایس، سانتھیا'' بحری جہاز پر سوار ہو جانا ہے جو رات کو رنگون بندرگاہ پر کھڑا اور اعلی الصبح روانہ ہوگا۔ نماز فجر کے متصل بعد جناب ایس ایم بھیات صاحب (ٹریولنگ ایجنٹ) نے چائے پر مدعو کیا، موصوف ہی نے حضرت کے اس جہاز سے ٹکٹوں وغیرہ کا انتظام کیا تھا، وہاں سے فراغت کے بعد بعض دوسرے محبین چند چند منٹ کے لئے اپنے اپنے مکانات پر بغرض حصول برکت لے گئے، ۸ربجے ایچ اے عزیز اینڈ کو مالک جو حکیم صاحب کے نام سے مشہور ہیں اپنے کارخانہ لے گئے، یہ رسّے بنانے کا کارخانہ ہے، جہازوں کی لنگر اندازی کے زبردست رسّے یہاں مشین تیار کر رہی ہیں۔ یہ کارخانہ نہایت عظیم الشان ہے عجلت کے باوجود ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ پھر ۹ربجے کا وقت جناب شیخ بشیر صاحب (جو پنجابی الاصل ہیں لیکن اب برمی ہیں) نے اپنا ربڑ کا کارخانہ دکھلانے کے لئے باصرار لے رکھا تھا، وہاں جانا پڑا، اس کارخانے میں ربڑ اور کپڑے کے جوتے اور سائیکل کے ٹیوب بنتے ہیں، یہ برما بھر میں سب سے بڑا کارخانہ ہے، اس میں قریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگا، یہاں سے واپسی پر ۱۱ربجے کا وقت بغرض ملاقات وزیر اعظم برما جناب اونو صاحب نے لے رکھا تھا، حضرت مہتمم صاحب براہ راست مقررہ وقت پر وہاں تشریف لے گئے، موصوف اس سے قبل خود تشریف لاکر ایک شادی کے موقعہ پر ملاقات کر چکے تھے، مذہباً بدھسٹ ہیں، لیکن مذہبی رجحانات بہت زیادہ رکھتے ہیں، اپنے مذہب کی پوری پابندی کرتے ہیں، اور ساتھ ہی دیگر مذاہب کے مذہبی لوگوں سے گہری دلچسپی ہے، چنانچہ حضرت مہتمم صاحب سے مذہبی موضوع پر دیر تک ترجمان کے ذریعہ گفتگو کرتے رہے، اور دارالعلوم دیوبند کی علمی تاریخ بڑی دل چسپی سے سنتے رہے، واپسی کے وقت نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مبلغ دو ہزار روپیہ دارالعلوم کے لئے پیش فرمایا جس پر حضرت مہتمم صاحب نے وقیع الفاظ میں موصوف کا شکریہ ادا کیا۔

آج شب میں وزیر عدل مسٹر عبداللطیف صاحب نے حضرت مہتمم صاحب کے اعزاز میں زبردست دعوت پہلے سے دے رکھی تھی، کیونکہ سابقہ اطلاع یہ تھی کہ جہاز پر چڑھ جانے کی اطلاع مل چکی تھی، لیکن وزیر موصوف نے خصوصی طور پر حضرت مہتمم صاحب اور ان کے رفقاء کے لئے استثناء کرایا اور رات کو ۱۱ر بجے دعوت وتقریر سے فراغت کے بعد جہاز پر جانا طے ہوا۔ چنانچہ سامان ۵ر بجے ہی چند حضرات لے گئے، اور حضرت مہتمم صاحب کو بندرگاہ تک جانے کی زحمت نہیں دی گئی۔ اسی طرح وزیر موصوف نے کسٹم کے عمومی ضابطہ سے بھی حضرت مہتمم صاحب کے سامان کو مستثنیٰ کرانے کا آڈر جاری فرمایا۔ خیال تھا کہ رات کو ۸ر بجے جہاز گودی چھوڑ دے گا، اور پانی کی کمی کی وجہ سے نصف میل کے فاصلے پر کھڑے ہوکر رات گذارے گا، اس پر وزیر صاحب نے حضرت مہتمم صاحب کو بمع رفقاء جہاز تک پہونچانے کا اپنی سرکاری موٹر لانچ کے ذریعہ انتظام فرمادیا۔ نہایت اطمینان سے نماز مغرب قیام گاہ پر ادا کی، جہاں مولانا مظاہری اور مفتی محمود صاحب کے علاوہ ایک بڑا مجمع موجود تھا، معمولات سے فارغ ہوکر حضرت مہتمم صاحب بمع ان تمام حضرات کے جو سب کے سب وزیر صاحب کے یہاں مدعو تھے روانہ ہوئے، وزیر صاحب کا بنگلہ جو ایک خوبصورت باغیچے میں واقع ہے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، اور ایک بڑا مجمع منتظر تھا، ادھر زنانخانے میں بیگم لطیف صاحبہ نے حضرت مہتمم صاحب کی اہلیہ محترمہ کے اعزاز میں خواتین کو مدعو کیا تھا، یہ دعوت ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی، کھانا کھلانے کے فرائض خود وزیر صاحب موصوف اپنے ملازمین کے ساتھ گھوم پھر کر انجام دے رہے تھے اور ان کی یہ بے تکلفی قابل رشک نظر آرہی تھی، دعوت کے بعد باہر لان میں تقریر کا انتظام تھا، آل برما ریڈیو کی ٹرانسمیٹر لاری لاؤڈ اسپیکر سے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کا ریکارڈنگ کرنے کے لئے منگائی گئی تھی، حضرت مہتمم صاحب کی تقریر شکر وامتنان پر مشتمل تھی، اختتام تقریر پر وزیر صاحب نے یہ ریکارڈ سنایا جو نہایت صاف اور طبعی آواز میں تھی۔ روانگی کے وقت

وزیر بنفس نفیس بندرگاہ تشریف لائے اور جہاز پر اوپر تک آکر الوداع کہا۔ بندرگاہ پر ایک بڑا مجمع موجود تھا۔ جہاز کے اندر تک آنے والوں میں پورا باگیا خاندان تھا اور اس کے علاوہ مولانا مظاہری، مفتی محمود صاحب، وزیر صاحب اور دیگر معززین تھے، یہ سب حضرات نہایت محبت واحترام کے ساتھ رخصت کر کے ساڑھے گیارہ بجے واپس ہوگئے۔

۲۲ر فروری: رات بھر بندرگاہ رنگون پر کھڑے رہنے کے بعد جہاز صبح ۸ر بجے روانہ ہوا۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے حسب معمول تصنیفی کام شروع فرمادیا۔ آپ کی اکثر تصانیف دروان سفر میں تحریر ہوئی ہیں کیوں کہ اس میں ہی لمحات فرصت زیادہ میسر آتے ہیں اور اس میں ریل کی حرکت بھی مانع نہیں بنی، اور یہاں تو پانی کے جہاز میں حرکت ہی نہیں محسوس ہوتی اور پھر قیام تین چار روز مسلسل، اس لئے آپ نے زیر تصنیف رسالہ ''علم غیب'' کی محققانہ تکمیل اس سفر میں شب وروز لگ کر فرمالی۔ جس کا ایک حصہ دوران سفر ہی میں راقم الحروف کو بھی سنایا۔ اسی جہاز میں مولوی عبدالحمید صاحب جماعت تبلیغ کی جانب سے جاپان سے واپس آرہے تھے، وہ بھی بعض اوقات استفادہ فرماتے۔ ان کے ساتھ ایک جاپانی مسلمان تھے جن کو تربیت کے لئے ہندوستان لایا گیا تھا۔

۲۳ر فروری: بحری سفر جاری رہا، اور سلسلۂ بفراغ وقت چلتا رہا۔

۲۵ر فروری: ایک سعادت عظمیٰ اور بشارت کبریٰ حضرت ابی محترم مدظلہ کا ایک مبارک خواب!

سفر رنگون سے واپسی میں ۲۴ر رجب ۷۶ھ ۲۵ر فروری ۱۹۵۷ء یوم دوشنبہ کو اخیر شب میں جہاز ہی میں حضرت قبلہ مدظلہ نے یہ خواب دیکھا جو احقر کو صبح ہی سنایا۔ فرمایا:

''میں نے دیکھا کہ میں اور تم (یعنی احقر محمد سالم) کسی دوسرے شہر میں ہیں، مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود ہیں، یہ سنکر میں تنہا ان کو تلاش کرتا ہوا ان تک پہنچ گیا، ملاقات ہوئی تو نہایت بزرگانہ شفقت سے پیش آئے، ملاقات کے بعد یہ

یقین خواب ہی میں ہوگیا کہ میں تابعی بن گیا کیوں کہ عیاناً ایک صحابی ومقرب کی زیارت سے مشرف ہوگیا، اس پر اللہ کا شکر ادا کیا، اور ساتھ ہی دل میں یہ داعیہ بھی پیدا ہوا کہ تمہیں (محمد سالم) بھی ملاؤں تو قیام گاہ واپس آیا، اور تم سے کہا کہ اس شہر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ موجود ہیں میں نے زیارت کرلی اور الحمدللہ تابعی بن گیا، تم بھی یہ شرف حاصل کرلو، یہ سنکر تم بڑے شوق سے میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئے، اب معلوم ہوا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تو مکان بھی یہیں ہے، تو میں اور تم ان کے مکان پر ہی حاضر ہوئے، وہاں جاکر دیکھا تو وہ اپنا ہی قدیم جدی مکان ہے (حضرت نانوتویؒ والا) اور وہاں اماں عائشہ بھی موجود ہیں اور ان کی والدہ بھی، یعنی بڑی دادی بو، یہ دیکھ کر ہمیں اور بھی زیادہ خوشی ہوئی، اور اماں عائشہ نے بھی یہ ہی کہا کہ ہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہیں رہتے ہیں، اور ابھی تشریف لاتے ہیں، تھوڑی ہی دیر میں حضرت علیؓ تشریف لے آئے، تو میں نے نہایت ادب سے ملاقات کی تو پھر انتہائی شفقت فرمائی، اس کے بعد میں نے کہا کہ حضرت! یہ سالم آیا ہے، تو اس پر تم سے ملاقات کے لئے اس طرح بڑھے کہ جیسے منتظر ہی تھے، تم نے ادب سے جھک کر ملاقات کی، تو میں نے کہا کہ معانقہ کرو، تم بڑھے اور ادب کی وجہ سے رک گئے، تو فرمایا، کہ بس ٹھیک ہے اور خود سے انہوں نے ہی معانقہ کیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا بھی حضرت علیؓ ہی کے گھر سے جاتا تھا، تو میں نے (حضرت قبلہ) عرض کیا کہ حضرت! ہمیں ان برتنوں کی زیارت کرادیجئے کہ جن میں حضورؐ کا کھانا جاتا تھا، فرمایا بہت اچھا، اور یہ فرما کر اندر سے ایک مونجھ کا پیالہ لائے جس میں اندر بال سے کھڑے ہوئے ہیں، اور فرمایا، اس میں حضورؐ کا کھانا جاتا تھا، تو ہم نے اس پیالے کو چوما اور ادب سے سر پر رکھا، اور دیر تک اس سے اکتساب فیض کیا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی، حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

احقر سے بعد میں حضرت قبلہ نے فرمایا کہ یہ خواب میرے اور تمہارے حق میں انشاء

اللہ فالِ نیک ہے، اور فرمایا، اماں عائشہ اور دادی بو کی مقبولیت کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ (محمد سالم قاسمی)۔

جہاز تین بجے پہنچ گیا تھا، لیکن کسٹم وغیرہ کے انتظار میں کچھ وقت لگا کلکتہ بندرگاہ پر حاجی عارف صاحب، بابو صاحب وصاحبزادہ حاجی غلام رسول صاحب اور ان کی فرم کے دوسرے حضرات کاریں لئے ہوئے تھے، کسٹم کے جدید ضوابط کی رو سے کسٹم ہاؤس میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں، اس لئے خیال تھا کہ سامان وغیرہ کی دیکھ بھال اسی طرح سے ہوگی جس سے عام طور پر ہوتی ہے، لیکن اچانک ضابطہ کے نمبر کے خلاف بہت سے لوگوں کو چھوڑ کر خود بخود کسٹم والے حضرت مہتمم صاحب کی جانب متوجہ ہوئے اور نہایت متانت سے ایک دو اعداد کو سرسری دیکھ کر بقیہ تمام کو پاس کردیا۔ اور بسہولت یہ مرحلہ طے ہوگیا۔

کلکتے کے محبین ومخلصین سے باہر آکر ملاقات ہوئی، قبیل مغرب قیام گاہ (دولت کدہ عالی جناب شیخ غلام رسول صاحب) پر پہنچے، نماز مغرب کے بعد مختلف حضرات بغرض ملاقات تشریف لاتے رہے۔

۲۶/فروری: نماز فجر کے بعد جناب مولانا ضیاء الدین صاحب فاضل دیوبند نے حضرت مہتمم صاحب کو دعوت چائے دی جس میں مولانا حمید الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ بمع دیگر حضرات علماء نے شرکت فرمائی۔ ۱۰/بجے قیام گاہ مولانا سعید احمد صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ بغرض ملاقات تشریف لائے اور دیر تک دل چسپ علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

۴/بجے شام کو مولانا حمید الدین صاحب نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو مدعو فرمایا۔ اس میں بھی پرنسپل صاحب مولانا ضیاء الدین صاحب، مولانا محمود حسن صاحب اور بعض معززین شریک تھے، اس میں علم حدیث کے بعض اہم موضوعات زیر تذکرہ آئے اور اس غذائے روحانی نے اس قدر طول پکڑا کہ عصر عشاء تک وقفہ نماز کے علاوہ مسلسل یہ مجلس جمی

رہی اور استفادہ کا موقعہ ملتا رہا۔

نماز عشاء کے بعد آج کولوٹولہ جامع مسجد کلکتہ میں مولانا ضیاء الدین صاحب کے زیر انتظام جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ستائیسویں رجب کی مناسبت سے مسئلہ معراج پر نہایت جامع اور مبسوط تقریر فرمائی۔ اڑھائی گھنٹے اس عارفانہ تقریر کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔

۲۷رفروری: آج کا دن فارغ رہا، سامان وغیرہ کی درستگی اور بعض ضروری چیزوں کی خرید کے بعد ملاقاتوں کے لئے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ مختلف حضرات کے مکانوں پر تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں عالی جناب شیخ غلام رسول صاحب ڈھاکہ گئے ہوئے تھے جن سے ملاقات نہ ہونے کا بڑا افسوس رہا۔ آپ کے صاحبزادے جناب شیخ زین العابدین صاحب نے نہایت مدارات کے ساتھ میزبانی فرمائی، لیکن ۲۷رکو ۱۱ربجے اچانک حاجی صاحب ڈھاکہ سے کلکتہ پہنچ گئے اور ان کی ملاقات سے بے حد مسرت ہوئی اور اسی طرح حضرت مہتمم مدظلہ کے قیام سے وہ خود بھی نہایت خوش ہوئے۔ شب میں دس بجے دہلی اکسپریس سے روانگی تھی، حاجی صاحب نے سامان وغیرہ کچھ لوگوں کے ہمراہ پہلے روانہ کر دیا، اور حضرت مہتمم صاحب کو خود لے کر تقریباً پونے دس پر اسٹیشن پہنچے۔ شہر کے اور بھی متعدد حضرات الوداع کہنے کے لئے تشریف لے آئے اور گاڑی چلنے تک سب حضرات وہیں رہے۔ دورات اور ایک دن کا یہ سفر پورا کر کے یکم مارچ کی صبح کو غازی آباد سے گاڑی تبدیل کی۔

۲۸رفروری: یہ دن مسلسل سفر میں گذرا، جس میں حضرت مہتمم صاحب کا حسب معمول تصنیف جاری رہا۔

یکم رمارچ: نماز فجر غازی آباد اسٹیشن پر ادا کر کے دوسری گاڑی میں سوار ہو گئے، پونے دس بجے گاڑی مظفر نگر اسٹیشن پر پہنچی، یہاں راقم الحروف کے دونوں بھائی عزیزی

مولوی محمد اسلم سلمہٗ ومولوی محمد اعظم کے علاوہ قاری اخلاق احمد صاحب صدیقی منیجر ادارۂ تاج المعارف دیوبند، مولانا محمد احمد صاحب گل ناظم شعبۂ تنظیم وترقی دارالعلوم دیوبند، سید محبوب صاحب رضوی نگراں شعبۂ محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند، مولوی عبدالواحد صاحب ناظم محاسبی دارالعلوم دیوبند، سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے متعدد اراکین دارالعلوم دیوبند پر مشتمل ایک بڑا مجمع استقبال کے لئے آیا تھا۔

نصف گھنٹے بعد دیوبند پہنچے تو اسٹیشن پر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ بلیاوی شیخ المعقول دارالعلوم، حضرت نائب مہتمم صاحب، مولانا معراج الحق صاحب مدرس دارالعلوم، مولانا خالد سیف اللہ صاحب ناظم دارالصنائع دارالعلوم اور دیگر حضرات مدرسین وکارکنان دفاتر دارالعلوم اور طلبائے دارالعلوم کا ایک مجمع عظیم خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھا۔ یہ تمام حضرات نہایت محبت واخلاص کے ساتھ ایک عرصے سے حضرت مہتمم صاحب کی تشریف آوری کے بے چینی سے منتظر تھے، قریباً ایک گھنٹے تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب زنانخانے میں تشریف لے گئے۔ آپ کی والدۂ محترمہ دو ماہ سے سخت علیل ہیں۔ ان کی علالت کی اطلاع پر ہی حضرت مہتمم صاحب نے واپسی میں عجلت فرمائی اور بہت سے ضروری پروگراموں کو ملتوی فرمایا۔ طویل بیماری نے ان کو نہایت کمزور کر دیا ہے، عمر بھی اسّی سال سے متجاوز ہے۔ انہوں نے اس بیماری میں بذریعہ خطوط اس آرزو کا اظہار فرمایا کہ ”میں چاہتی ہوں کہ ایک مرتبہ تمہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرلوں“۔ سعادت مندی کی یہ مثال بھی مشکل سے ملتی ہے، والدۂ محترمہ اپنے عظیم المرتبت بیٹے کی اس سعادت، طویل مفارقت کے بعد ملاقات پر فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہوئیں اور دیر تک دعائیں دیتی رہیں، شام کو ۴ربجے برمی طلبائے دارالعلوم نے جن کی تعداد ۵۰رکے قریب ہے حضرت مہتمم صاحب کو دعوت دی، جس میں اکابر اساتذہ کو بھی بلایا، اور سپاسنامہ پیش کیا۔ جواباً حضرت مہتمم صاحب نے شکریہ واحوال شکر پر مشتمل تقریر فرمائی۔

مختصراس لئے کیا کہ آج ہی نماز عصر کے بعد طلبائے دارالعلوم نے حضرت مہتمم صاحب سے اس کی درخواست کی تھی کہ ہمیں بھی تفاصیل سفر سنائی جائیں۔ چنانچہ نماز عصر کے بعد سے مغرب تک حضرت مہتمم صاحب نے برمی مسلمانوں کے دارالعلوم کے لئے گرانقدر عطیہ اور مہمان نوازی، اطراف برما کے سفر، وزیر اعظم اونو کی کرم فرمائی وغیرہ کا تذکرہ فرمایا جس پر سب حضرات نے حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

۲/مارچ: آج بعد نماز ظہر ناظم صاحب محاسبی دارالعلوم مولوی عبدالواحد صاحب نے منجانب شعبۂ محاسبی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو بخیر و کامیاب مراجعت پر دفتر اہتمام میں ایک بڑے مجمع کے ساتھ دعوت چاء دی جس میں اپنے خلوص و محبت کو نظم میں پیش فرمایا۔ نظم ملاحظہ ہو۔

ترحیب بخدمت فخر الاماثل حضرت مولانا الحاج القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند:

السلام اے طیبِ عالی مقام
السلام اے ماہتاب اہتمام
السلام اے قائد دارالعلوم
اے تو شمع ملت خیرالانام
السلام اے یادگارِ قاسمی
السلام اے مایۂ نازِ کرام
مرحبا اہلاً و سہلاً مرحبا
از سفر واپس شدی باخیر تام
دائما فخر الاماثل بودۂ
امتیاز تو مسلّم در انام

طرز تصنیفِ تو از حد دل پسند
درخطابت بے گماں ہستی امام
ساقیٔ صہبائے علم و معرفت
باہمی خواہیم از تو دورِ جام
خطرۂ طیارہ از تو دور شد
فضلِ خاصِ ایزد است ایں لا کلام
شکر ایں انعام ربِّ ذوالمنن
فرض برآباد شد ہر صبح و شام
دائما باشی تو در حفظ خدا
حق تعالیٰ دارَدَتْ فائز مرام
مہرِ اقبالت ہمیشہ در عروج
فیض تو سایہ فگن برما مدام
واحدِ شیریں سخن تاریخ گفت
آمدی باز آمدی باخری تام

۱۳۷۶ ہجری

(از نیازمند: احقر عبدالواحد ناظم محاسبی دارالعلوم دیوبند، المتخلص بہ آباد)

☆☆

مجلس اصلاح نسواں کا ایک دینی اور تاریخی اجتماع

۱۸/جنوری ۱۹۵۷ء کا مبارک دن بھی ہماری مجلس کے ممبروں اور میرے لئے خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اس دن کی بہت سی باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں، اسلئے آج میں ''استقلال'' کے صفحۂ خواتین کے ذریعہ اپنی بہنوں کی خدمت میں اس دن کی ڈائری کا ایک ورق پیش کررہی ہوں، یہ وہ پر مسرت دن کی مبارک گھڑی تھی جبکہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی اہلیہ محترمہ ہماری مجلس میں تشریف لا رہی تھیں، صبح ہی سے انجمن کے اراکین پارٹی کی تیاری میں برما مسلم ہائی اسکول پہنچی ہوئی تھیں، یہ اسکول رایل لیک کے سامنے ایک بہت ہی پرسکون جگہ واقع ہے وہیں پر ہماری مجلس اکثر منعقد ہوا کرتی ہے کیونکہ انجمن اصلاح صدر دفتر میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ وہاں پر زیادہ مہمان جمع ہوسکیں، اس لئے ۱۹۵۱ء سے جبکہ ہماری مجلس کی ابتدائی بنیاد پڑی تھی وہاں کے پرنسپل جناب صالح احمد کوتوال صاحب نے وہاں ہماری مجلس منعقد کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اب بھی جبکہ وہاں پر نئے پرنسپل آئے ہیں ان کے بھی خلوص وتعاون سے ہم آج تک وہیں پر مجلس منعقد کیا کرتے ہیں۔

اس دن حسب پروگرام دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد تقریباً اڑھائی بجے جناب اسمٰعیل محمد باگیا صاحب کی کار اسکول کے احاطے میں داخل ہوئی، ممبران مجلس کی منتظر نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں، بیگم طیب صاحبہ معہ اپنے معزز میزبان بیگم اسمٰعیل محمد باگیا صاحب اور دیگر معزز خواتین کے ہمراہ تشریف لائیں اور تمام بہنوں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی، تنگی وقت اور

چند اہم مصروفیتوں کی وجہ سے اپنی بستی کے اطراف کے تمام مسلم بہنوں کو آپ سے تعارف کرانے کے لئے مدعو نہیں کرسکی کیونکہ صرف ممبران مجلس ہی کو اخبار کے ذریعہ اطلاع دیکر بلایا تھا مگر آپ سے ملنے کے اشتیاق میں اطراف کی بہت سی بہنیں بھی شامل ہیں جو کبھی ایسی مجلسوں میں شریک نہیں ہوسکیں مگر ہماری معزز مہمان سے ملنے کا اشتیاق انہیں آج یہاں کھینچ لایا، خدا کرے کہ آپ کے خلوص اور نیک باتوں کو سن کرانہیں آئندہ اس طرح کی مجلسوں سے دلچسپی پیدا ہوجائے اور کبھی کبھا مذہبی اور اصلاحی جلسوں میں شریک ہوا کریں۔ ہم نے اپنی بہنوں سے آپ کا تعارف کرایا۔ انجمن کی جانب سے خوش کہتے ہوئے انجمن کے اغراض مقاصد مختصر الفاظ میں بیان کئے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی اہلیہ محترمہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ مجھے تو کوئی لمبی چوڑی اسپیچ دینی نہیں ہے، اور نہ میں زیادہ کچھ کہنا چاہتی ہوں، پھر بھی انجمن اصلاح نسواں کی بہنوں کے خلوص ومحبت سے متاثر ہوکر کچھ کہنے کی جرأت کرتی ہوں۔ میں خواتین برما کی اسلام پسندی کی داد دیتی ہوں، اور شکر گزار ہوں کہ وہ میرے ساتھ اتنی محبت سے پیش آئیں، اس سے میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ آپ نے یہاں کی بہنوں کی تعلیم وغیرہ کی بھی تعریف کی مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنے کے لئے فرمایا کہ آپ تمام بہنوں میں جہاں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں ایک خامی بھی ہے اور وہ خامی یہ ہے کہ خواتین میں قرآن شریف کو صحیح طرح سے پڑھنے والیاں بہت کم ہیں مثلاً ش اور ق وغیرہ برابر ادا نہیں کرتیں۔ تلفظ اور ہجے کی بعض ذرا سی غلطی سے مطلب بدل جاتا ہے اور اس سے گناہ کا اندیشہ ہے، لہٰذا میں اراکین اصلاح نسواں سے خصوصاً التماس کرتی ہوں کہ وہ اس اصلاح کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ آپ نے انجمن کے اغراض ومقاصد کو بہت پسند فرمایا، اور بانیان انجمن کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے دعاء فرمائی کہ خدا آپ کی انجمن کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی دے، ہر ملک کے مسلمانوں میں ایسے اصلاحی کاموں کی ضرورت ہمیشہ کم وبیش محسوس ہوتی ہے، آپ نے فرمایا کہ اصلاحی بہنوں کو ہمت نہ ہارنا چاہئے اور خدا کے بھروسے پر اس کام کو جاری رکھیں۔

ایسی مجلسوں میں صرف دو ہی بہنیں شریک ہوں تب بھی اپنا کام جاری رکھیں، اگر یہ دو بہنیں ہی ان باتوں کوسنکر عمل کریں گی تو آپ کوان سینکڑوں کی شرکت سے زیادہ فائدہ ہوگا جوصرف سنتی ہیں اورعمل نہیں کرتیں، اس لئے خدا کے سہارے آپ کام کرتی ہیں انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ میری نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔آپ کی مؤثر تقریر کے جواب میں، جومیں نے ایک مختصر سی تقریر کی تھی، اسے یہاں نقل کررہی ہوں:

میری قابل فخر بہن! آج آپ جیسی قابل فخر ہستی سے ملنے کا یہ پہلا موقع ہے یعنی آج ہم سب نے آپ سے ملاقات کی، اور آپ کی باتیں سنی ہیں مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پہلے ہی سے واقف ہیں۔ آپ سے مل کر ہمیں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی، ہمیں ایسا کیوں محسوس ہورہا ہے اور آپ کے اور ہمارے جذبات کیوں ایسے ہیں؟ اس لئے کہ ہم سب مسلمان ہے، مسلمان چاہے دنیا کے کسی خطے میں ہو، چاہے کسی گوشے میں ہوں مگر جب آپس میں ملتے ہیں تو وہ ایک ساتھ بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے سےاس طرح گفتگو کرتے ہیں گویا یہ سب اپنے ہی قریبی رشتہ دار ہیں۔ آج ہم بھی اپنے معززمہمان سے مل کر ایسا ہی محسوس کرتی ہیں جیسے کہ آپ ہماری سرپرست ہیں، آپ نے جوہمیں نیک مشورے دئے ہیں انہیں ہم نہایت ہی مسرت کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اپنی بہنوں میں بھی پہنچانے کی کوشش کریں گے، ہمیں تعلیم یافتہ ہستیوں کے نیک مشوروں کی سخت ضرورت ہے۔ ان بزرگوں کی مثال ان بڑے بڑے جہازوں کی سی ہے جو بڑے بڑے دریاؤں اورسمندر میں سے بآسانی گذر کرمنزل مقصود پر پہونچ جاتے ہیں، اور ہماری مثال ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی مانند ہیں جو دریا میں تو چلتی ہیں مگر بڑے بڑے دریاؤں اورسمندروں میں سے گزرنا ان کے لئے سخت دشوار اور محال ہے کیونکہ ہم بڑے بڑے طوفانوں اور بادِمخالف کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں، یہ دنیا کی خطرناک ہوائیں ہمیں ہر طرف سے گھیر کر ہماری کمزور کشتی کو یا تو ڈبو دیتی ہیں یا برباد کردیتی ہیں، اس لئے ہر سمجھ دار

کشتی بان کا فرض ہے کہ وہ ان بڑے جہازوں کے ذریعہ ان کے نقش قدم پر چل کر منزل مقصود پر پہنچنے کوشش کرے۔ یہ بڑے بڑے جہاز ہماری وہ تعلیم یافتہ ہستیاں ہیں جو ہمیں دین کا سیدھا راستہ دکھلاتی ہیں اور منزل مقصود تک پہنچاتی ہیں یعنی خدا سے ملاتی ہیں، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم ایسی قابل فخر ہستی سے ملکر نیک مشوروں سے فیضیات ہورہے ہیں۔

انجمن اصلاح نسواں کے فرائض کی انجام دہی میں زیادہ تعداد ایسی نوعمر لڑکیوں کی ہے جو کہ اپنے گھریلو فرائض کی انجام دہی سے کسی قدر آزاد ہیں، بڑی عورتیں اپنے گھر کی فرائض کی انجام دہی، اولاد کی پرورش نیز دوسرے خانگی امور میں مصروف رہتی ہیں اسلئے ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے کاموں میں زیادہ حصہ لے سکیں، لہٰذا ہماری نوعمر اصلاحی بہنوں کا فرض اولین یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے بتلائے ہوئے اصولوں پر سختی سے کاربند ہوکر اپنی دوسری بہنوں کو بھی اپنے ساتھ سیکھنے اور سکھانے پر آمادہ کریں اور اپنی بہنوں کو صحیح معنوں میں مسلمہ بنانے کی کوشش کریں، ہمیں کسی اچھی بات کے سیکھنے اور اچھے کام کے کرنے میں ذرا بھی نہیں شرمانا چاہئے، مجھے اور آپ کو ابھی بہت کچھ سیکھنا اور کرنا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں آپ کی استاد بن کر آپ کو سکھا پڑھا رہی ہوں، نہیں آیئے میں اور آپ مل کر اس کام کو کریں، اس راہ پر چلیں جس کا حکم جس کی ترغیب جس کی اجازت ہمارا خدا، ہمارا رسول، ہمارا مذہب اسلام دیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہماری معززمہمان بیگم محمد طیب صاحب اپنے وطن تشریف لے جاکر ہمیں اپنے قلب سے قریب ہی محسوس کریں گی۔ اس پر بیگم طیب صاحب نے بڑے ہی جوش اور مسرت سے انشاء اللہ ضرور کہا، اتنے میں عصر کی اذان ہوگئی، اسکول کے احاطہ میں جومسجد تھی وہاں سے زینت بوائز ہوم کے ایک چھوٹے سے لڑکے نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی، اذان کے سننے کے بعد تمام بہنوں نے یکے بعد دیگرے آپ سے ملاقات کی اور آپ بھی نہایت ہی تپاک اور محبت سے اپنی بہنوں سے ملیں، آپ کو لینے کیلئے جو کار آنے والی تھی وہ نہیں پہنچی تھی، اس

لئے آپ نے وہیں پر عصر کی نماز ادا کی، اور آپ کے ساتھ دوسری کئی بہنوں نے بھی۔ تقریباً ۵؍بجے آپ کو لینے کے لئے موٹر آ گئی اور آپ ہم بہنوں کے دلوں میں محبت و مسرت کے جذبات چھوڑ کر اور خود بھی لے کر ہم سے رخصت ہوئیں، رفتہ رفتہ تمام بہنیں بھی رخصت ہوگئیں، ہم سب بھی اپنے مکان واپس ہوئیں، اور اس دن ہمیں اتنا سکون، اتنی مسرت محسوس ہوئی کہ شاید ہی کسی دوسری تقریبات سے لوٹنے کے بعد حاصل ہوئی ہو، اور میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ اس کی وجہ ہمارے معزز مہمان کا وہ پاک جذبہ وہ خلوص وسادگی تھی جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تھی، اور ہمارے اندر ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں میں اسی طرح تا قیامت اتفاق واتحاد، خلوص ومحبت اور مساوات قائم رکھے۔ آمین۔

تجویز شکریہ مسلمانانِ برما!:

حضرت مہتمم صاحب کے سفر برما سے دارالعلوم کی مالی مشکلات میں جو سہولت پیدا ہوئی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اس کو خاص طور پر قابل تحسین سمجھتی ہے۔ اور برما کے جن حضرات نے اعانت اور امداد فرمائی مجلس ان کے متعلق حسب ذیل تجویز شکریہ منظور کرتی ہے۔

’’مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا یہ اجلاس مسلمانانِ برما کے اس عظیم ترین عطیہ کو جو انہوں نے ایشیا کی عظیم مرکزی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کو عنایت فرما کر اپنی اسلام دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیا ہے بہ نظر قدر واستحسان دیکھتا ہے اور اس پر اپنے گہرے جذبات تشکر وامتنان پیش کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو سفر برما کی دعوت دیکر دو لاکھ سے اوپر کی رقم خطیر دارالعلوم کے لئے پیش کی۔

مسلمانانِ برما کا یہ گراں قدر عطیہ جہاں دارالعلوم کی بین الاقوامی محبوبیت کی دلیل ہے وہاں مسلمانانِ برما کے دینی شعور کی بیداری کا بھی قابل غبطہ اعلان ہے مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس اس مبارک خدمت پر بصمیم قلب معاونین برما کی خدمت میں مخلصانہ شکریہ پیش کرتے ہوئے دعا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانانِ برما کو عموماً اور معاونین کو خصوصاً دارین

میں اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)۔

مجلس شوریٰ خصوصی طور پر عالیجناب سیٹھ اسمٰعیل محمد باگیا کی خدمت میں جنہوں نے حضرت مہتمم صاحب کو دعوت برما دی اور تحصیل سرمایہ میں پیش پیش ہو کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور خود بھی گراں قدر رقم سے دارالعلوم کی امداد فرمائی۔ نیز عالیجناب مفتی محمد اسمٰعیل صاحب خطیب جامع مانڈلہ جن کی ان تھک سعی سے مانڈلے کی عظیم رقم وصول ہوئی اور جناب محترم حافظ محمد حسین صاحب خطیب جامع مولمین جنہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے مولمین سے ایک بھاری رقم دارالعلوم کے لئے فراہم فرمائی اور عالیجناب محترم مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری مدیر اخبار ’’دور جدید‘‘ جنکی ذات گرامی اور ان کے اخبار و رسالہ نے دارالعلوم کو پورے ملک میں روشناس کرایا اور حضرت مہتمم صاحب کے پروگراموں سے ملک کو مستفید ہونے اور معاون بننے کا موقعہ دیا۔ اور عالیجناب اونو وزیر اعظم برما جنہوں نے اپنی جیب خاص سے دارالعلوم کی لائبریری کو ایک کثیر رقم عنایت فرمائی۔ اور عزت مآب جناب محترم مسٹر عبداللطیف صاحب وزیر عدل وانصاف حکومت برما جنکی سعی گراں مایہ سے یہ رقم دارالعلوم تک پہنچ سکی۔ اور عزت مآب جناب محترم مسٹر عبدالرشید صاحب وزیر معدنیات حکومت برما جن کے مخلصانہ تعاون سے یہ عظیم رقم سرکاری طور پر منتقل ہوسکی۔ کی خدمت میں تہ دل سے ہدیۂ سپاس وتشکر پیش کرتی ہے۔

مولانا مفتی محمود داؤد یوسف مفتی برما، جیسے برما کے مفتی اور وہاں کے معتمد علیہ اشخاص میں سے ہیں، ایسے ہی وہ دارالعلوم کے معاونین خصوصی اور اکابر دارالعلوم کے خصوصی وابستگان میں سے بھی ہیں۔ برما کی عظیم امداد کے حصول اور اس کے دارالعلوم میں منتقل ہونے کے سلسلہ میں مولانا ممدوح کی مستقل خدمات اور مساعی شامل ہیں جن پر مجلس خصوصیت سے مولانا ممدوح کی شکرگذار اور ان کے حق میں دعا گو ہے۔‘‘

☆☆

روھنگیا مسلمانوں کا قتل عام

برمی حکومت کے دلخراش مظالم

● مولانا محمد صدیق ارکانی

قارئین کرام! حکومت برما شروع ہی سے ارکانی وروہنگیا مسلمانوں کو مرتد بنانا یا ملک سے باہر نکالنا چاہتی ہے، اس لئے وقتاً فوقتاً ان کی نسل کشی اور قتل عام کرتی ہے اور ان پر اتنی پابندیاں عائد کردی گئیں جن کا تصور بھی آزاد ملک میں نہیں کیا جاسکتا، مثلاً صنعت وتجارت پر پابندی، سیاست وجمہوریت پر پابندی، اسلامی نام رکھنے پر پابندی، اعلیٰ تعلیم پر پابندی، نئی مسجد ومدرسہ کی تعمیر پر پابندی، مذہبی جلسے پر پابندی، قربانی میں ناقابل ذکر روکاوٹیں، حج میں روکاوٹیں، بغیر پرمٹ ایک بستی سے دوسری بستی میں جاکر رات گذارنے پر پابندی، اسلامی کتب وجرائد کی اشاعت پر پابندی، کسی بھی شخص کا کسی اور کے گھر رہنے پر پابندی، ہر ہفتہ ہر گھر کے جملہ افراد کی حاضری اور تین غیر حاضری پر اس کے نام کی کٹوتی اور بھاری رشوت کے بغیر دوبارہ آنے پر پابندی، برما کے دیگر صوبوں اور شہروں میں بھاری رشوت اور پرمٹ کے بغیر جانے پر پابندی، کسی قسم کا اسلحہ یا تلوار رکھنے پر پابندی، غیر ملکی سفر پر پابندی، اظہار مافی الضمیر پر پابندی، اسلامی طریقے سے شادی بیاہ پر پابندی، جبری محنت اور مفت مزدوری وکلی کے انکار پر موت کی سزا، اسلامی جماعتوں کے داخلے پر پابندی، وقتاً فوقتاً ہر گھر میں رات کو چھاپہ مار کر بے پردگی کے ساتھ شناختی کاروائی، داڑھی رکھنے پر پابندی، سرکاری اسکولوں میں مسلم طلبہ کے لئے غیر اللہ کو سجدے کی پابندی، بیع وفروخت کا امتیازی اور

ظالمانہ طریقہ، ہر گھر کی مسلم خواتین کی تصویریں کھینچ کر لیجانا وغیرہ بے شمار ظالمانہ پابندیاں ارکانی مسلمانوں پر عائد کردی گئیں جن کی وجہ سے وہ حیوان سے بدتر زندگی گزارنے اور اپنے آپ کو غلام سمجھنے پر مجبور ہوگئے۔

قارئین کرام! ''برمی حکومت کے دلخراش مظالم'' آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں ظالم وجابر برمی حکومت کے ان مظالم کی ایک جھلک پیش کی جارہی ہے جو وہ وقتاً فوقتاً ارکانی وروہنگیا مسلمانوں پر ڈھاتی آرہی ہے، جرمن ریڈیو کا یہ تبصرہ بالکل بجا اور برمحل ہے کہ ''پوری دنیا میں سب سے زیادہ ستائی ہوئی قوم روہنگیا مسلمان ہیں'' یہی تبصرہ اقوام متحدہ نے کیا ہے، تاہم اب تک ان مظالم میں اضافہ تو ہوا ہے، لیکن کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ بس ان مظالم کے اختتام کا ایک ہی حل ہے جو کہ عملی جہاد ہے، جب تک عملی جہاد کا آغاز نہ ہوگا تب تک ان مظالم میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔

اے ارکان میں رہنے والے مسلمانو! تمہاری شہادت اور قتل عام کا سلسلہ جاری ہے، شاید آگے بھی جاری رہے، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ امریکہ، اقوام متحدہ، اسلامی ممالک، مسلم سربراہان اور عالمی وقومی جماعتیں تمہاری مدد کے لئے برمی حکومت سے ٹکرلیں گی یا ارکان سے باہر رہنے والے ارکانی حضرات تمہارے دفاع میں جہاد کریں گے اور خاطر خواہ تمہاری مدد کریں گے تو تمہاری یہ سمجھ نہ صرف غلط ہے بلکہ زمانہ اور تجربہ نے اسے غلط ثابت کیا ہے، لہٰذا تم اپنے اندر قوت بازو پیدا کرو اور ڈٹ کر مقابلہ کرکے سینکڑوں غیر مسلموں کو مارو پھر جام شہادت نوش کرلو۔ کیونکہ شہادت ہی جب مقدر ہے تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کے بجائے کچھ کرکے مرو تاکہ تاریخ تمہیں اچھے ناموں سے یاد کرے اور تمہارے خون سے انقلاب آنے کے ساتھ قوم کا سر فخر سے بلند ہو۔

اے ارکان کے مسلم باشندو! کئی صدیوں سے تمہارا خون بہایا جارہا ہے، مسجدوں کو شہید کیا جارہا ہے، مدارس اور خانقاہوں کو مسمار کیا جارہا ہے، ماؤں، بہنوں کی عزتیں تار تار

کی جا رہی ہیں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی تہہ تیغ کیا جا رہا ہے اور تم سے غلاموں سے بدتر سلوک کیا جا رہا ہے پھر بھی کوئی تمہاری مدد کے لئے نہ پہنچا اور نہ پہنچنے کی امید ہے اس لئے خواب خرگوش اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو جاؤ اور اٹھ کر بزدل مگھوں اور ڈرپوک بدھوں کو ماضی کا سبق سکھا دو ورنہ یہ عذاب تمہارے اوپر مسلط رہے گا۔ ایسی نازک صورت حال میں لڑ کر مرنا جینے سے بہتر ہے، اپنا دفع کرنا اور جام شہادت نوش کرنا وقت اور شریعت کا تقاضہ ہے، جب ہم دور افتادہ ملک میں رہ کر تمہاری نازک حالت زار پر مضامین لکھتے ہیں تو آزاد ملک کے باشندے اسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ یہ مضامین مبالغہ آمیز اور یکسر غلط ہیں اس لئے ان کتابوں اور رسالوں سے کایا پلٹنے اور انقلاب آنے کی امید بہت کم ہے۔

اے ارکان سے باہر مختلف ممالک میں رہنے والے روہنگیا مسلمانو! اور ارکانی لوگو! تم نے ارکان کو چھوڑ کر بہت پیسہ کمایا، عمارتیں بنوائیں، کاریں خریدیں اور لاکھوں کروڑوں کے مالک بن کر عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہو، تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ تمہارے برادری کے لوگ، اعزا واقربا، رشتہ دار، دوست واحباب اور کمزور ولاچار مسلمان ’’ارکان‘‘ میں حیوان سے بدتر اور غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں، کیا تم نے ان کے لئے کبھی سوچا ہے؟ کبھی مالی مدد فراہم کی؟ برمی حکومت سے عملی جہاد کرنے کی تیاری کی ہے؟ اور ان کو ظالموں سے نجات دینے کی کوئی ترکیب سوچی ہے؟ اگر اب تک ایسا نہیں کیا تو یاد رکھو کہ اس سے بڑی مصیبت تم پر بھی آسکتی ہے، اس وقت تمہارا مددگار بھی کوئی نہ ہوگا۔

قارئین کرام و باشندگان ارکان ۱۹۸۹ء سے میں اس موضوع پر مسلسل لکھ رہا ہوں، نہ جانے کتنے مضامین شائع کئے، کتنی کتابیں تالیف کیں اور کتنے رسائل طبع کئے، اب جوانی الوداع کہہ رہی ہے، بڑھاپہ مسلط ہونا چاہتا ہے، بہاریں خزاں میں تبدیل ہو رہی ہیں، امیدیں ناامیدوں کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں، بال اور داڑھی میں سفیدی کے آثار نظر آرہے ہیں، زندگی برف کی طرح پگھل رہی ہے، عمر اختتام پذیر ہے، دل خون کے آنسو

رو رہا ہے، قویٰ اور اعضاء کمزور ہوتے جا رہے ہیں، قلب وجگر غمزدہ ہیں، خوشیاں اور مسرتیں افسانہ میں تبدیل ہوگئیں، اس لئے اب مجھے امید کی کرن نظر نہیں آرہی ہے اور نہ ہی ارکان آزاد ہوتا ہوا نظر آرہا ہے، کیونکہ بیرون ارکان رہائش پذیر ہر جماعت، تنظیم اور بے شمار افراد ارکان سے ہر قسم کے فوائد حاصل کررہے ہیں، لیکن ارکانیوں کو ان کے حقوق دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے، البتہ یہ حضرات ارکانیوں کی نسل کشی اور قتل عام کی صورت میں مظاہرے کرتے ہیں، ریلیاں نکالتے ہیں، احتجاج کرتے ہیں اور دوسروں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں کہ وہ آکر ارکان آزاد کرائیں گے، لیکن خود عیش وعشرت میں لطف اندوز ہو رہے ہیں اور دولت اکٹھی کررہے ہیں۔

عرب ویب سائٹ اسکائی نیوز کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں بارہ ممالک ایسے ہیں جہاں بسنے والے مسلمانوں کو خانہ جنگی، فرقہ واریت، امتیازی سلوک، نقل مکانی، بدامنی، انتہا پسند تنظیموں اور حکومتوں کی جانب سے پابندیوں اور مظالم کا سامنا ہے جن میں آٹھ اسلامی ممالک اور چار غیر اسلامی ممالک ہیں، آٹھ اسلامی ممالک یہ ہیں۔ شام، سوڈان، فلسطین، صومالیہ، نائیجیریا، یمن، تیونس اور شمالی مالی اور چار غیر اسلامی ممالک یہ ہیں۔ برما، سری لنکا، جرمنی کا دارالحکومت برلن اور چینی صوبہ شنکیانگ۔ ان بارہ ممالک کے 60 لاکھ مسلمان گھر سے بے گھر ہو کر خیموں اور مہاجر کیمپوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ (روزنامہ امت کراچی ۱۹؍اگست ۲۰۱۲) زیر نظر کتاب میں برمی حکومت کے مظالم کے چند سیاہ ترین باب شامل نہیں ہیں جو یہ ہیں۔ (الف) ۱۹۴۲ء کا قتل عام جس کو عرف میں ’’مگھ کاڑا کاڑی‘‘ کہا جاتا ہے اور اس کی تفصیل مسٹر خلیل الرحمنؒ کی کتاب ’’کربلائے ارکان‘‘ اور راقم کی تالیف ’’ارکان کی خونی داستان‘‘ میں ہے۔ (ب) ۱۹۴۲ء میں برما سے انڈین مسلمانوں اور ارکان سے روہنگیا مسلمانوں کی ہجرت کی المناک داستان، جس کی تفصیل راقم کی کتاب ’’اشک مسلمانان ارکان برما‘‘ میں ہے۔ (ج) ۱۹۷۸ء میں ارکانی مسلمانوں کا قتل

عام اور ہجرت کی کہانی: جس کی تفصیل مولانا ولایت حسین صاحب کی کتاب ''خونیں سرگزشت'' میں ہے۔ (د) ۱۹۹۱ء میں ارکانی مسلمانوں نے ہجرت کی ہے اس کی تفصیل راقم کی کتاب ''مرحوم ارکان کے مظلوم مسلمان'' میں ہے اور تاریخ ارکان برما پر مطلع ہونے کے لئے راقم کی کتاب ''تذکرۂ ارکان برما'' ملاحظہ ہو جبکہ ارکان و برما کی شخصیات و مشائخ کے لئے ''اکابرین ارکان برما'' نامی کتاب مطبوع ہے۔

پوری دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم قوم:
ارکان اور برما سے متعلق چند ضروری معلومات

☆ برما کا محل وقوع: اس کے مشرق میں تھائی لینڈ، لاؤس اور چین کے کچھ علاقے، مغرب میں آسام، بنگلہ دیش، بھوٹان، خلیج بنگال، جنوب میں ملیشیا، بحر ہند اور شمال میں سلسلہ کوہ ہمالیہ ہے۔

☆ برما کا موجودہ نام: قدیم تاریخی کتابوں میں اس کا نام ''برمانیا'' ملتا ہے، مئی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک ''یونین آف برما'' بولا گیا اور ۱۹۹۶ء سے اب (اگست ۲۰۱۲ء) تک ''میانمار'' (مشترکہ ملک) بولا جارہا ہے۔

اس وقت برما میں ۵۰/لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ (ہفت روزہ ضرب مومن کراچی، ۲۲/جون ۲۰۱۲ء) سنڈے میگزین ایکسپریس ۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء کے مطابق برما وارکان میں ۳۵ لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ دعوۃ ہائی لائٹس شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء اور ماہنامہ ضیائے آفاق لاہور، شمارہ جولائی ۲۰۱۲ء کے مطابق برما اور ارکان میں ۸۵ لاکھ مسلمان ہیں جن میں ۳۵ لاکھ روہنگیا مسلمان ہیں اور اکثر روہنگیا مسلمان ارکان میں آباد ہیں۔

☆ ارکان پر قبضہ: ارکان شروع سے ۱۷۸۴ء تک ایک آزاد اسلامی ملک تھا، جس پر ۱۷۸۴ء میں برمی راجہ بودوپھیہ نے قبضہ کرلیا، اس وقت سے اب تک یہ برما کے زیر تسلط

ہے اور برما کے سات صوبوں میں سے ایک ہے۔

☆ ارکان کی کل آبادی: ارکان کی کل آبادی چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے، جن میں ۳۰ لاکھ مسلمان آباد تھے، لیکن نیرنگی تقدیر کے تحت پندرہ سولہ لاکھ مسلمان مختلف ممالک کی طرف ہجرت کرگئے اور لاکھ دو لاکھ شہید ہوگئے، یوں اب (اگست ۲۰۱۲ء) ۱۲ لاکھ مسلمان ارکان میں موجود ہیں، ارکان میں ۷۰ فیصد مسلمان، ۲۵ فیصد بدھ مت اور پانچ فیصد دیگر اقلیات ہیں۔ (بورما الخبر والعیان- تذکرۂ ارکان برما، روزنامہ اسلام کراچی، ۱۹/جولائی ۲۰۱۲ء) برما اور ارکان کے مسلمانوں کی صحیح مردم شماری حکومت برما کبھی شائع نہیں کرتی اس لئے صحیح اور یقینی تعداد معلوم کرنا امر محال ہے۔

☆ تعداد ارکانی مہاجرین: حکومت کے مظالم سے تنگ آکر ارکانی مسلمانوں نے ۱۹۴۸ء سے ہجرت شروع کی، البتہ یہ ہجرت ۱۹۷۸ء، ۱۹۹۱ء اور ۲۰۱۲ء میں بڑے پیمانے پر ہوئی، اخبارات کے مطابق کل سولہ لاکھ ارکانی مہاجرین بیرون ارکان ہجرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ (ہفت روزہ ضرب مومن کراچی، ۲۲/جون ۲۰۱۲ء)

جن ممالک میں ارکانی مہاجرین آباد ہیں ان میں سے بنگلہ دیش میں سات لاکھ (جدید وقدیم ملاکر) پاکستان میں ساڑھے تین لاکھ، سعودی عرب میں چار لاکھ، عرب امارات، تھائی لینڈ اور ملیشیا میں ایک لاکھ ہیں۔ (بورما الخبر والعیان، تذکرۂ ارکان برما، سنڈے ایکسپریس کراچی، ۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء)

جامع مسجد منگڈو کی حالت زار:

جامع مسجد منگڈو کا اذان خانہ ۱۹۸۳ء کے لگ بھگ جناب امان اللہ بن قربان علی برمی (مشہور سونے کی دکان کے مالک) مقیم حال مکۃ المکرّمہ نے دو منزلہ بنا کر دیا تھا، اوپر خوبصورت گنبد تھا، لیکن اب حکومت نے گنبد شہید کردیا، نیچے گیٹ اور دکانیں ہیں اور اوپر مؤذن اور امام کے کمرے ہیں، نو وارد آدمی نہیں سمجھ پائے گا کہ یہ اذان خانہ (شعائر اسلام

میں سے ہے) یا کمرے اور دکانیں ہیں۔۱۹۸۲ء اور۱۹۸۳ء دو سال میں نے یہاں ختم تراویح کی نماز پڑھائی، ایک سال میرے ساتھ حافظ مولانا عبدالحئی بن مولانا ابوبکر صدیق منگنی پاڑوی اور دوسرے سال حافظ محمد اسحاق بن مولانا عبدالقدوس تبلیغ والے تھے۔اس وقت تک یہاں لاؤڈاسپیکر پر اذان ہوتی تھی۔

منگڈو شہر کی سب سے بڑی اور پرانی مسجد یہی ہے، چونکہ یہ ٹاؤن کے وسط میں ہے جہاں ہر وقت مسافروں اور مقامی لوگوں کا ایک جم غفیر رہتا ہے اس لئے یہ زیادہ اہمیت کے حامل ہے اور حکومتی پابندی کے مطابق اس مسجد کا دروازہ اذان کے ساتھ کھلتا اور نماز کے تھوڑی دیر کے بعد بند کر دیا جاتا ہے۔اس جیسی مسجد کا اکثر اوقات مقفل رہنا مصلیوں کو نماز سے روکنے کے مترادف ہے کیونکہ مسافرین دور دراز سے ہر وقت مارکیٹ آتے ہیں اور وقتاً فوقتاً نماز پڑھتے ہیں، قریب میں کوئی دوسری متبادل مسجد بھی نہیں ہے جہاں حسب خواہش نماز ادا کی جاسکے۔

۱۹۸۲ء میں یہ کہہ کر لاؤڈاسپیکر پر اذان دینے کی پابندی لگادی گئی کہ اس سے ہماری نیند خراب ہوتی ہے، سوتا بچہ چونکتا اور ڈرتا ہے، حالانکہ مارکیٹ کی دکانوں میں ہر وقت اونچی آواز سے گانے بجائے جاتے ہیں، اس پر پابندی نہیں جب کہ اذان چوبیس گھنٹوں میں صرف پانچ مرتبہ ہوتی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اوقات اذان میں کون بے وقوف سوتا ہے نہ ہی وہ سونے کا وقت ہے۔

اب ارکان کی تمام مسجدوں میں لاؤڈاسپیکر پر اذان کی پابندی ہے حالانکہ بہت سی مسجدیں ایسی ہیں جو علاقوں اور بستیوں سے دور ہیں، وہاں کون سوتا ہے؟ پتہ چلا کہ یہ ایک بہانہ ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک لومڑی نے مرغا سے کہا کہ تم نے ایک سال پہلے مجھے گالی دی تھی اس لئے میں تمہیں ابھی کھاجاؤں گی، مرغا نے کہا کہ جناب میری عمر تو چھ ماہ ہے،

میں ایک سال پہلے موجود ہی نہیں تھا، لومڑی نے کہا کہ پھر وہ تمہارا رشتہ دار ہوگا، یہ کہہ کر اسے چٹ کرگئی۔

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت
تو قادر ہے و عادل ہے، مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بندہ مزدور کے اوقات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اسلامی نام رکھنے اور لکھنے کا مسئلہ اور ''اونو'' قوانین کا مسودہ:

جنوری ۲۰۰۱ء میں نماز سے فارغ ہوکر میں امام صاحب کے کمرہ میں چلا گیا تا کہ امام سے ملاقات کروں، امام صاحب سے نام پوچھا تو انہوں نے برمیز نام بتایا، میں نے پوچھا کہ آپ عالم دین ہونے کے باوجود برمیز نام بتارہے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میرا اسلامی نام حمید اللہ ہے، رنگون کا فارغ التحصیل ہوں، نافتر ڈیل کا باشندہ ہوں، چونکہ سرکاری کاغذات میں میرا یہی نام ہے اس لئے اجنبی لوگوں کو یہی نام بتاتا ہوں تا کہ کوئی چغلی نہ کردے۔

یہاں اسلامی نام رکھنے اور بولنے پر پابندی ہے، اسلامی نام سے کوئی نوکری، عہدہ حتی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمت بھی نہیں مل سکتی اور نہ عدالت سے انصاف مل سکتا ہے۔ (سنڈے ایکسپریس، ۱۵رجولائی ۲۰۱۲ء) خود برمی حکومت نے ارکان کے تمام علاقوں اور رائج اسلامی ناموں کو ختم کر کے برمیز نام رکھ دیا تا کہ اسلامی شناخت بھی ختم ہوجائے، جیسے اس صوبہ کا نام ''ارکان'' ہے، حکومت نے اس کا نام ''رکائنگ پری نے'' رکھ دیا اور

اخبارات والے'' رکھنی'' وغیرہ لکھ رہے ہیں، اس صوبے کے دارالحکومت کا اصل نام ''اکیاب'' ہے،حکومت نے اس کا نام''سیٹوے'' رکھ دیا۔اس طرح تمام شہروں، علاقوں، صوبوں اوراہم مقامات کے اسلامی ناموں کوختم کرکے شرکیہ برمیز نام رکھ دئے گئے اس لئے اب اس کی پہچان مشکل ہوگئی۔۱۹۴۸ء میں جب مسٹراونو برما کی وزارت اورصدارت پر براجمان ہوا تھا تواس نے رنگون میں ایک جلسہ عام (جہاں بارہ ہزارافرادشریک تھے) میں بارہ اصلاحات اورقوانین کی تنفیذ کا اعلان کیا تھا جن میں سے ایک اسلامی نام نہ رکھنا بھی ہے،اونوقوانین کا مسودہ یہ ہے۔

(۱) قرآن پاک کےحروف عربی کے بجائے برمی حروف میں لکھے جائیں۔(۲) دینی مدارس واداروں میں برمی زبان نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔(۳) بلاکسی امتیاز رنگ ونسل اورمذہب وملت مسلم خواتین اوربدھسٹوں میں شادی بیاہ ہو۔(۴) مسلمان سمیت ہر فرد پرضروری ہے کہ وہ برمیز نام رکھے، اسلامی نام رکھنےاور بولنے سے پرہیز کیا جائے۔ (۵) خواتین پردہ سے اجتناب کریں۔(۶) بغیراجازت گائے، بیل، بکری اوربھینس کا ذبح کرنا ممنوع ہے،اس سے قربانی پرخود پابندی لگ گئی (۷) بدھ عورتوں کی طرح مسلم خواتین بھی خاوند کوطلاق دے سکتی ہیں۔(۸) ہندو کی طرح مردہ کو دفن کے بجائے جلا دیا جائے۔(۹) برما کے تمام باشندوں کوبدھسٹ مذہب کے مطابق چلنا ہوگا۔(۱۰) قانونی حیثیت سے مسلمان اگر یہاں کی شہریت حاصل کربھی لیں توبھی حکومت جب چاہے نکال سکے گی۔(۱۱) برمی حکومت دستور بوذی کے مطابق چلائی جائے گی۔(۱۲) حکومت جب بھی کسی کوکسی کام کے لئے کہےتواس پراس کی بجاآوری ضروری ہے۔(تذکرہ ارکان:ص: ۱۵۰،داستان ارکان مخطوطہ:ص:۴۲)

غرض حکومت چاہتی ہے کہ یہاں کے باسیوں اورعلاقوں کے نام بوذی ہو اسلامی نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حکومت باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت علاقوں اوربستیوں کے سابقہ قدیم

اسلامی ناموں کوختم کرکے حکومتی کاغذات اور دستاویزات میں برمیز نام درج کر رہی ہے۔دینی مدارس، جامعات اوراسکول کے رجسٹروں میں بھی قانوناً برمیز نام درج کرنا ضروری ہے،اسکول میں تواسلامی نام سے داخلہ ہی نہیں ملتا،البتہ مدارس والے تساہل سے کام لیتے ہیں اگرچہ قانوناً یہ بھی جرم ہے۔اگر اسلامی نام لکھ کرکسی عدالت میں کسی بھی نوعیت کی درخواست دائرکی جائے یاکسی بھی لین دین کے سلسلے میں کاغذات بنوانے ہوں تو اسلامی نام درج ہونے سے وہ درخواست اور کاغذات نہ صرف مسترد ہوجاتے ہیں بلکہ متعلقہ شخص کوسزابھی دی جاتی ہے

اے فاختہ پرواز کناں برسر سرو
حال دل مرغان گرفتار چیست چہ دانی
شب تاریک بیم گردابہا چنیں ہائل
کجا دانند حال ماسبکساران ساحلہا

ترجمہ: سرو کے درختوں کے اوپرآزادی کے ساتھ پرواز کرنے والی فاختہ! توکیا جانے قید وبند میں گرفتارشدہ پرندوں کے دل کی حالت، تیز رفتاری سے دریا پار کرجانے والوں کوان لوگوں کی حالت زار کا کیاعلم ہوگا جولوگ تاریک رات میں خوفناک موج اور خطرناک بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔

کچھ منگڈو کی مارکیٹ، زادی، بینک اورجیل خانہ کے بارے میں:

جنوری ۲۰۰۱ء کومیں منگڈو مارکیٹ دیکھنے نکلا اوردیکھا کہ مغرب تک تمام دکانیں بند ہوگئیں البتہ ہوٹل وغیرہ کھلے ہوئے ہیں، دریافت کرنے پرلوگوں نے بتایا کہ عشاء کے بعد ناساکا کے اہلکار یہاں آتے تھے، اب چونکہ برما اور بنگلہ دیش کے فوجوں کے درمیان جھڑپیں ہورہی ہیں اس لئے عصر کے بعدفوج آجاتی ہے، اس کے خوف سے بھی لوگ

جلدی گھر چلے جاتے ہیں، بسا اوقات فوج سامان اٹھانے کے لئے بھی ٹاؤن سے مسلمانوں کو پکڑتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ مارکیٹ دو لائن کی شکل میں ہے، ہر دکان میں نمبرات درج ہیں، 90% دکانیں مسلمانوں کی ہیں، البتہ اہم ہوٹلوں اور دکانوں کے مالک مگھ ہیں، جامع مسجد منگڈو کی شمالی سڑک کے مغرب میں مگھ راہباؤں کی زادی (معبد بوذی، کیانگ) ہے، ۱۹۷۰ء کے بعد اسے اس لئے مقفل کر دیا گیا تھا کہ اس کے کنویں میں حرامی مردہ بچے بکثرت پائے گئے تھے حالانکہ ان کے مذہب میں زنا کی ممانعت ہے اور راہباؤں کے لئے شادی بیاہ کی بھی اجازت نہیں ہے۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

اب اسے نہ صرف کھول دیا گیا ہے بلکہ اسے مزین بھی کیا گیا اور اس کے سامنے ایک اور زادی بنائی گئی، زادی کے سامنے گوتم بدھ کا مجسمہ سنہرے کلر برہنہ حالت میں موجود ہے، جس کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے اور مجسمے بھی ہیں، مگھ لوگ وہیں جا کر عبادت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بینک بھی تعمیر کیا گیا ہے جبکہ ایک بینک پہلے ہی سے جامع مسجد کی مغربی جانب موجود ہے، اس نئے بینک میں فون کی بھی سہولت ہے، سرکردہ حضرات بھی فی منٹ ایک ہزار ٹیاں دے کر بیرون ارکان فون کر سکتے ہیں، البتہ ان بینکوں میں پیسہ رکھنا مسلمانوں کے لئے ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے مسلمان وہاں رقم نہیں رکھتے بلکہ کٹھن شرائط کے باعث رکھ بھی نہیں سکتے، ہاں تعلقات والے حضرات (آٹے میں نمک کی طرح) رکھتے ہیں۔

پرانے بینک کی جنوبی جانب جیل خانہ ہے جو فرزندان توحید کا مسکن ہے، جب میں جیل خانہ کے دروازے (گیٹ) کے سامنے روڈ میں گیا تو ایک شخص کو اندر سے آتے

ہوئے دیکھا، پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میرا بیٹا چھ ماہ سے جیل میں ہے، ملاقات کے لئے گیا تھا، اس پر دہشت گردی کا الزام ہے۔

جب میں نے اس سے جیل خانہ کی اندرونی کیفیت پوچھی تو وہ ایک سرد آہ کھینچی اور روتے ہوئے بولا کہ اندر مچھر اور کھٹمل کی بھرمار ہے، پانچ کی جگہ میں آٹھ رکھے گئے چونکہ جگہ کی تنگی ہوتی ہے اس لئے باری باری سونا پڑتا ہے۔

کھانا ناقابل بیان ہے عموماً دال اور ساگ ہوتا ہے، اگر کبھی گوشت اور مچھلی کا سالن بھی دیا جائے تو اس میں یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ حلال گوشت ہے یا حرام، اسی طرح مچھلی کا حال ہوتا ہے اور قیدیوں سے بھاری بھاری کام لئے جاتے ہیں اور ان سے جو ناروا سلوک کیا جاتا ہے اس کے تذکرے سے انسانی سر شرم کے مارے جھک جاتے ہیں۔ ہر ہفتہ ملاقات کی سہولت ہے، لیکن افسروں اور چوکیداروں کو راضی (رشوت دے کر) رکھنا پڑتا ہے۔

جو لوگ دہشت گردی کے الزام میں یا مجاہد پارٹی سے تعلقات کے الزام میں پکڑے جاتے ہیں، انہیں نوکیلے کیل دار تختوں پر لٹایا اور کھڑا کیا جاتا ہے، منہ میں گرم پانی ڈالا جاتا ہے، مادر زاد حالت میں کھڑا کر کے ایک کا آلہ تناسل دوسرے کے منہ میں ڈالنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ داڑھی والوں کی داڑھی منڈوادی جاتی ہے، زدوکوب کر کے ان سے الٹا سیدھا بیان لیا جاتا ہے اور سادے کاغذ پر دستخط لیا جاتا ہے۔

جیل کے اندر ایک کنواں ہے جس میں گندہ پانی، سانپ، بچھو اور مختلف النوع حشرات الارض ہیں، کبھی کبھی قیدیوں کو اس میں بھی ڈالا جاتا ہے، ایک گرم تنور بھی ہے، جس کے اوپر گرم بٹن ہے اس پر لٹایا جاتا ہے، ناخن نکالا جاتا ہے، کبھی استری کے ذریعے جسم کاٹ کر اس میں لال مرچ اور نمک ڈالا جاتا ہے، بسا اوقات قیدی سے الٹا سیدھا بیان ریکارڈ کر کے دوسرے معصوم لوگوں کو بھی اس میں پھنسایا جاتا ہے، سالوں یہ لوگ یہیں

پڑے رہتے ہیں لیکن مقدمہ یا تو چلتا نہیں اگر چلایا بھی جائے تو دبی چال کے حساب سے۔
اسی جیل خانہ میں ذوالحجہ ۱۴۲۰ھ/ مارچ ۲۰۰۰ء میں مولانا عطاء اللہ مولود ۱۹۶۱ء انیس (۱۹) دن رہ چکے ہیں جس کی تفصیل ''الرباط'' جولائی ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں آچکی ہے، موصوف نے بتایا کہ ۱۶ آدمی کے لئے تین کلو چاول پکتا تھا اور وہاں اکثر مسلمان ہیں۔

یکے رابر زنداں درش دوستاں
کجا ماندش عیش در بوستاں

یعنی: اگر کسی کا دوست قید خانہ میں ہو تو اس کو باغ میں بھی عیش کہاں۔

یہ عیدگاہ کیوں مقفل ہے؟:

اس کے بعد میں (جنوری ۲۰۰۱ء) جامع مسجد سے متصل جنوب میں موجود عیدگاہ کے گیٹ تک پہنچا، دیکھا کہ گیٹ بند ہے اور میدان کوڑا کرکٹ، کچرا اور خودرو گھاسوں سے بھرا پڑا ہے، دریافت کرنے پر موجود لوگوں نے بتایا کہ اس میں نماز عید کی اجازت نہیں ہے حالانکہ شروع ہی سے یہ میدان بطور عیدگاہ استعمال ہوتا آ رہا ہے، نہ جانے کتنے اللہ والوں اور نیک لوگوں نے اس میدان میں سجدے کئے ہوں گے، آج وہ میدان گندگیوں میں تبدیل ہو کر اراکانی مجاہدین اور امت مسلمہ کو پکار رہا ہے، ہے کوئی مرد مجاہد جو اسے دوبارہ عیدگاہ میں تبدیل کردے۔
اس میدان کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ کر میں آگے حانری پاڑہ چوک تک گیا جہاں ایک منارہ بشکل مجسمہ نصب ہے، اسی کے ساتھ مچھلی، ترکاری اور سبزیوں کی مارکیٹ ہے، اس مارکیٹ کی مغربی جانب قدیم پرانا جیل خانہ ہے اور ایک سرکاری اسکول ہے، جو صفائی اور ستھرائی اور نظافت میں اپنی مثال آپ ہے۔
اس وقت مغرب کی اذان ہو چکی تھی، نماز پڑھنے کے لئے ''حانری پاڑہ'' کی ایک

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

مسجد میں گیا جس کی در و دیوار، محراب اور شکل و صورت دیکھ کر رونا آ گیا، وہیں مغرب کی نماز پڑھ کر میں سیدھا ہوٹل پہنچا، کھانا کھایا، چائے پی اور ایک پان کا پڑیا کھایا، اس کے بعد رات گزارنے کے لئے جیٹی کے قریب شوے ہوٹل پہنچ گیا۔

ساحلی پٹی کی چوکیداری اور پیغام رسانی کا انوکھا طریقہ:

اتفاق سے دوران شب باشی شوے ہوٹل میں بندے کو ایک ایسا جان پہچان والا شخص ملا جو برمیز زبان کا ماہر ہے اور وضع قطع اور ظاہری لباس و تشخص سے مگھ معلوم ہوتا ہے، اس نے بتایا کہ رات عشاء کے بعد منگڈو جیٹی سے شمال کی جانب بلی بازار بلکہ اس سے بھی آگے تک اور جنوب کی جانب علی ٹائینگو سے آگے تک دریائے ناف کے ساحل کے ساتھ مسلم نوجوان کچھ کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر پہرہ دیتے ہیں تا کہ بنگلہ دیش کی طرف سے آمدہ متوقع مجاہدین اور چور ڈاکوؤں کی نگرانی کی جا سکے۔
یہ کلمہ گو مسلمان پوری رات اسی طرح کھڑے رہتے ہیں جیسے لائن در لائن درختوں کی قطار ہے، ان کے پاس حکومت کی طرف سے عطاء کردہ مخصوص قسم کا اجازت نامہ ہوتا ہے، اگر رات کو تفتیش کے دوران ایسا شخص ملے جس کے پاس اجازت نامہ نہ ہو اور کوڈ نمبر بھی معلوم نہ ہو تو اس پر قیامت آ جاتی ہے۔ ایسے نوجوان مسلم ملازمین ہر علاقہ سے باری باری لئے جاتے ہیں، ان کے فرائض میں مندرجہ ذیل امور داخل ہیں:
(الف) ہر شخص اتنے فاصلے پر ہو کہ جہاں تک ایک آدمی کی آواز جا سکتی ہو، معسکر میں موجود ایک سرکاری اہلکار کوئی پیغام قریب میں موجود کسی ملازم کو دیتا ہے، وہ چیخ کر یہ پیغام دوسرے کو پہنچاتا ہے، دوسرے تیسرے کو، اس طرح شمال سے جنوب تک منہ در منہ یہ پیغام پہنچ جاتا ہے، یوں مظلوم مسلمانوں کی دلخراش آوازوں سے ساحلی پٹی گونج اٹھتی ہے۔
اس مشینی دور میں مسلمانوں سے وائرلیس اور ٹیلیفون کا کام لیا جانا اور انہیں بطور کھمبوں کے

استعمال کرنا درندگی اور سفاکی کے علاوہ کچھ نہیں۔

(ب) اگر ہنگامی طور پر کسی فوجی دستے کو دوسرے معسکر (یا کسی اور جگہ) جانا ہو تو ان کے حربی ساز و سامان اور اشیاء متعلقہ کی منتقلی ان بے چاروں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ (ج) چونکہ اکثر و بیشتر مسلم گودیوں پر قبضہ کیا جا چکا ہے اس لئے ان کی حفاظت اور مچھلیوں کی نگرانی ان بے کسوں کے فرائض میں شامل ہے۔ (د) خورد و نوش کا سامان لانا اپنی ذمہ داری میں ہے۔ وغیرہ۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ کھانا گھر سے کھا کے آئیں گے، یہاں ان کو نہ کھانا دیا جاتا ہے اور نہ ہی اجرت دی جاتی ہے، بالجملہ یہ باتیں مذکورہ آدمی سے جب میں نے سنیں تو میرے دل میں شوق پیدا ہوا، ایسا کیوں نہ ہو کہ ان بے یار و مددگار افراد کو میں بھی ایک مرتبہ دیکھ لوں، چنانچہ میں اس شخص کو لے کر عشاء کے بعد گونہ پاڑہ (جو منگڈو ٹاؤن سے متصل شمالی جانب اور ساحل دریائے ناف کی مشرقی جانب واقع ہے) کی طرف روانہ ہوا، جب گونا پاڑہ پل تک پہنچا تو دیکھا کہ پل کی جنوبی جانب کچھ مگھ درندے اپنی چوکی میں بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے ہیں۔

ان میں سے ایک نے ہماری طرف دیکھا لیکن کچھ تعرض نہ کیا، پل پار کر کے جب ہم ساحل کی طرف گئے (وہ خفیہ راستے راہبر کو معلوم ہیں) تو دیکھا کہ حسب مذکور مسلم نوجوان حکومت کی پہرہ داری میں مصروف ہیں، یوں مذکورہ تفصیل کی تصدیق ہوگئی، بلکہ ایک چوکیدار نے تو مجھے اور زیادہ دکھ درد کی کہانی سنائی۔ ع

کہ مردار چہ ساحل است اے رفیق
نیا ساید و دوستانش غریق
من از بے نوائی نیم روئے زرد
غم بے نوایاں دلم خستہ کرد

ترجمہ: یعنی اے رفیق! مرد اگرچہ ساحل کے کنارے پر ہو پھر بھی وہ آرام نہیں پا سکتا جب کہ اس کے دوست ڈوب رہے ہوں، میں بے سروسامانی سے زرد رو نہیں ہوں بلکہ بے نواؤں کے غم نے میرا دل زخمی کر دیا۔

شقدار پاڑہ کی مقبوضہ زمینیں اور منہدم شدہ تبلیغی جامع مسجد:

بندے نے جنوری ۲۰۰۱ میں دیکھا کہ حازی پاڑہ چوک سے چند قدم مشرق کی طرف سڑک کی شمالی جانب فٹبال اسٹیڈیم ہے جہاں دیگر صوبوں سے بھی کھلاڑی کھیلنے کے لئے آتے ہیں اور سڑک کی جنوب میں کاشت کی زمینیں ہیں جو مسلمانوں کی ہیں، زمینوں کا یہ سلسلہ شقدار پاڑہ چوک تک ہے، تقریباً لمبائی میں تین کلو میٹر سے زیادہ اور عرضاً ڈیڑھ کلو میٹر کے قریب ہے، یہ انتہائی زرخیز زمینیں ہیں۔ ۱۹۸۲ء کو یہاں مگھوں کی ایک زادی بنی، مالک زمین (مسلمان) نے بہت فریاد کی اور اکیاب تک جا کر کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی بالآخر اس زمین میں دیکھتے ہی دیکھتے شاندار زادی (معبد بوذی) تعمیر ہوگئی، مالک زمین کو نہ متبادل زمین ملی نہ ہی رقم۔ میں نے دیکھا کہ اس چوک سے شقدار پاڑہ چوک تک جملہ زمینوں میں حکومت کے مختلف النوع دفاتر اور مکانات قائم ہوگئے جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر لیتی ہے، ساتھ میں موجود والد محترم بتا رہے ہیں کہ یہ اسپتال ہے، یہ فلاں کا دفتر ہے وغیرہ وغیرہ لیکن میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور رومال سے منہ ڈھانپ لیا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔

ابھی میں اسی خیال میں گم تھا کہ اچانک آواز آئی کہ بیٹا! دائیں طرف دیکھو، تو میں نے مولانا عبدالقدوسؒ کی وہ عظیم تبلیغی مسجد دیکھی جو شقدار پاڑہ چوک میں دو راستوں کے درمیان واقع تھی اور اس کی جنوبی جانب ہائی اسکول ہے، آج یہ عظیم مسجد شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر امت مسلمہ سے فریاد کر رہی ہے کہ اے مسلمانو! مجھے کس جرم میں منہدم کیا گیا،

تمہاری غیرت کب جاگے گی اورتم میری مدد کو کب پہنچوگے

اکنوں کرا دماغ کہ پرسید زباغبان
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

ترجمہ: یعنی ابھی کس یہ دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا، پھول نے کیا سنااور صبانے کیا تباہی مچائی۔

یہ مسجد دومنزلہ تھی جہاں ہروقت مصلیوں کا جم غفیر رہتا تھا، شب جمعہ کوتو ٹھاٹھیں مارتا ہواسمندر رہتا تھا کیونکہ تبلیغی حضرات اورطلباء شب جمعہ کو یہاں آتے تھےاور مارکیٹ کی وجہ سے بھی نمازی زیادہ ہوتے تھے۔مسجد کی مشرقی جانب امیر تبلیغ مولانا عبدالقدوس مظاہریؒ (تبلیغ والے) کا مکان تھا جوآمدہ وفود اورعلماء کرام کے مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، یہ مسجد آزادی برما (۱۹۴۸ء) کے متصل یہاں قائم ہے،اس مسجد میں تین ہزار مصلیوں کی گنجائش تھی۔۱۹۹۵ءکوحکومت برمانے یہ کہہ کر مسجد کو مقفل کردیا کہ یہاں مارکیٹ بنے گی (جبکہ مارکیٹ کچھ فاصلے پر پہلے ہی سے موجود ہے) اوراسے روڈ میں شامل کیا جائے گا، ۱۱؍مارچ ۱۹۹۸ءکو ظالموں نے مسجد کے صحن اور برآمدے کو منہدم کرنے کے لئے مسلم ملازمین لائے،ان کے انکار پرانہیں زدوکوب کیااورحکومتی اہلکاروں نے مسجد کے صحن کوشہید کردیااوررات کومسجد کے اندرونی حصہ میں شراب وکباب اورزنا کا بازار گرم کیا گیا: ع

مقام پرورش آہ ونالہ ہے یہ چمن
نہ سیر گل کے لئے نہ آشیاں کے لئے

میں وہیں جاکررکشہ سے اترا اورمحراب کے قریب جاکر کچھ دیر کے لئے کھڑا ہوکر خوب جی بھرکررویا اور ماضی کی حسین یادوں میں گم ہوگیا،آہ! یہی تو وہ مسجد تھی جہاں شب جمعہ کو میں نماز پڑھتا تھا اورامیر تبلیغ مولانا عبدالقدوس مظاہری رحمہ اللہ کے گھر کھانا کھاتا تھا، میں نے دیکھا کہ محراب کوتوڑ دیا گیا ہے، جہاں ایک پائپ لائن نصب کردیا گیا جس

میں ہروقت پانی ہوتا ہے، میں نے دیکھا کہ مگھ بچے مادرزاد حالت میں وہیں نہارہے ہیں اورمحراب میں بیٹھ کر ہرقسم کی شرارت کررہے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ ارکان میں (خصوصاً منگڈواور دیہی علاقوں میں) پائپ لائن کا دستورنہیں ہے بلکہ لوگ کنوؤں سے پانی لاتے ہیں اور ہرگھر میں کنواں کھودا جاتا ہے، لیکن باقاعدہ سازش کے تحت یہاں پائپ لائن نصب کردیا گیا ہے تاکہ اس کی خوب بے حرمتی ہوسکے، مسجد کی پہلی منزل کودفتر اوردوسری منزل کو پولیس ہیڈکوارٹر بنادیا گیا۔مسجد کی شمالی جانب جومسلم بستی تھی اسے اٹھادی گئی جس میں اندازاً ۵۰ کےلگ بھگ مکانات تھے، جنہیں متبادل جگہ دی گئی اور نہ ہی پیسہ دیا گیا، مسجد کی مشرقی جانب کے مکانات بھی اٹھا دئے گئے جن میں مولانا عبدالقدوس مظاہریؒ کا مکان بھی تھا، یہ کارروائی اس لئے کی گئی تاکہ انہدام مسجد کے سلسلے میں کوئی ردعمل نہ ہوسکے۔

شقدار پاڑہ کے چوک سے مشرقی جانب پل تک (تقریباً ایک کلومیٹر) سڑک کے دائیں بائیں چند گنے چنے مسلمانوں کے مکانات (بامنگ کونسلر کا مکان وغیرہ) تھے بقیہ کاشت کی زمینیں تھیں اب ان زمینوں پر معبد بوذی، گوتم بودھ کا مجسمہ، شیر کا مجسمہ ودیگر حکومتی ادارے بن گئے ہیں، البتہ درمیان میں کہیں کہیں مسلمانوں کے مکانات بھی ہیں، سڑک کی شمالی جانب کا حصہ تو خالصۃً حکومت کے قبضہ میں ہے۔شقدار پاڑہ چوک اورروڈ کی شمالی جانب چند قدم کے فاصلے پر نافتر ڈیل کی طرف جاتے ہوئے ایک جامع مسجد ہے جوعرف عام میں میر گیٹا کی جامع مسجد سے معروف ہے۔باخبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ اس کوبھی مقفل کردیا گیا ہے،عنقریب اسے بھی مسمار کردیا جائے گا۔

انڈاگکلوم سے بلی بازارتک کی پہاڑی پٹیوں اورچراگاہوں پرحکومت کا قبضہ:

بندہ جنوری ۲۰۰۱ء میں جس رکشہ پرسفر کررہا تھا وہ رکشہ اب مشرقی جانب کائندہ کاٹا

کی طرف رواں ہے،شقدار پاڑہ کی حدود ختم ہوتے ہی پل ہے، پل کے ساتھ چیک پوسٹ ہے، جہاں چند مسلح بندے چوکس کھڑے رہتے ہیں، چیک پوسٹ تک جا کر رکشہ والے نے کہا کہ یہاں اتر کر آگے پیدل جانا ہے کیونکہ چیک پوسٹ کا یہی معمول ہے کہ وہیں سے بندہ اتر کر نظر جھکائے پیدل جائے، جس پر شبہ گزرے اسے تحقیق وتفتیش کے لئے بلا لیا جائے گا۔

الحمدللہ ہم نے خیریت سے چیک پوسٹ عبور کیا پھر دوسری طرف جا کر رکشہ میں بیٹھ گئے، چار میل تک گئے، پھر چار میل چیک پوسٹ (جو بڑا ہے اور خطرناک بھی ہے) سے چند قدم آگے رکشہ شمال کی جانب موڑ لیا تا کہ پہاڑ کے قریبی راستہ کلیجہ بھانگہ تک جائے، یہی وہ راستہ ہے جسے ۱۹۴۲ء میں برطانیہ نے چار میل سے بلی بازار تک بنایا تھا، جواب تک قابل استعمال ہے، حکومت نے اسے ناکارہ بنا کے رکھا تھا تا کہ مسلمان فائدہ نہ اٹھا سکے، اب جب جگہ جگہ مگھ بستیاں بسائی گئیں تو اس روڈ کو قابل استعمال بنایا جا رہا ہے، وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے :ع

بحمد للہ گرچہ از ریش ایمنم
چو ریشے بہ بینم بلرزد تنم

الحمدللہ اگر چہ زخم سے محفوظ ہوں لیکن جب کوئی زخمی دیکھتا ہوں تو میرا جسم کانپ اٹھتا ہے۔آگے میں نے دیکھا کہ میدان اور ہموار زمین میں آم اور ٹام کے پودے اگے ہوئے ہیں، چار میل سے کلیجہ بھانگہ تک تقریباً چار پانچ کلومیٹر کی اس پوری پٹی کا یہی حال ہے۔ درمیان درمیان میں کہیں کہیں سرکاری چوکی بھی ہے جہاں چوکیدار رہتے ہیں تا کہ ان درختوں کی حفاظت ہو سکے، والد محترم فرمانے لگے کہ یہ فلاں مسلمان کی زمین ہے، یہ فلاں کا میدان ہے حکومت نے جبراً چھین کر درخت لگادئے اور درمیان میں جو مگھوں کے مکانات نظر آرہے ہیں وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے بنے ہوئے ہیں۔

آہ! کیسی ظالم حکومت ہے کہ اتنی بڑی پہاڑی پٹی بھی لے لی اور حفاظتی چوکیاں بھی مسلمانوں کو بنا کر دینا پڑیں اور بہانہ یہ تھا کہ یہاں باغات کا انتظام کیا جائے گا۔والد محترم نے بتایا کہ چار میل سے کوار بیل اور منگنامہ سے آگے تک پہاڑی پٹی کا یہی حال ہے، چونکہ اس پٹی پر ہمیشہ حکومت کے کارندے رہتے ہیں اس لئے مسلمانوں (لکڑ ہارا) کے لئے پہاڑ پر جانا مشکل ہوگیا اور چرا گاہیں بھی معدوم ہوگئیں، اب بے چارے کسان اور دہقان اپنی بکریاں اور گائے بیل کہاں چرائیں گے۔

ابھی میں ان باغوں اور درختوں کو دیکھنے میں مصروف تھا کہ رکشہ والا بولا کہ انڈا نگ کلوم سے لے کر بلی بازار اور شاپ بازار تک مشرقی جانب پہاڑی سلسلہ ہے اس سلسلہ کی پوری پٹی پر حکومت کا قبضہ ہے۔اسی طرح اس سلسلہ پہاڑ کی مشرقی پٹی جو بوسیدنگ میں ہے اس پر بھی حکومت نے قبضہ کرلیا، گویا پہاڑی سلسلہ کی مغربی اور مشرقی پٹیوں پر حکومت کا قبضہ ہوگیا ہے۔

شادی کی شرائط:

شادی بیاہ کا طریقہ نہایت آسان اور سیدھا سادھا ہے، لیکن حکومت برما نے ارکانی مسلمانوں کی اسلامی شادی کے لئے اتنی زیادہ شرطیں اور پابندیاں عائد کردیں ہیں کہ اسلامی طریقے سے شادی کا مرحلہ طے کرنا ہی مشکل ہوگیا ہے۔چند شرائط یہ ہیں۔(الف) عمر اٹھارہ سال ہو، اب چوبیس سال کردیا (ب) شادی سے قبل چار مختلف محکموں میں درخواست دی جائے جس میں بھاری رشوت دینی پڑتی ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔(ج) شادی سے قبل طبی معائنہ کے بہانہ سے چند ایام حکومت کے اداروں (اسپتالوں، فیملی پلاننگ اینڈ کونسلنگ سنٹرز) میں لڑکی کو تنہا (بغیر کسی محرم) رہنا پڑتا ہے، جس میں حکومت کے افراد اس کی عزت وناموس پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔پھر اس قیام کے لئے ایک بڑی رقم بھی

لی جاتی ہے۔(د) شادی حکومت کے دفتر میں ہوتی ہے، اس میں صرف لڑکی اور میاں بغیر حجاب حاضر ہو سکتے ہیں، کسی اور شخص کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، حالانکہ عقد نکاح سے قبل اجنبی لڑکے اور لڑکی کا اس طرح میل ملاپ شرعاً جائز نہیں ہے، بسا اوقات حکومت یہ کہہ دیتی ہے کہ تم لوگ آج فلاں کمرہ میں ٹھہرو، کل نکاح ہوگا، اس طرح جب ایک اجنبی لڑکی اور ایک اجنبی لڑکے کے درمیان تنہائی ہوگی تو کیا زنا سے بچا جاسکتا ہے بس حکومت کا مقصد بھی یہی ہے۔(ہ) عموماً حکومت کے کارندے نکاح کے امور سرانجام دیتے ہیں اور بسا اوقات گواہان بھی نہیں ہوتے، اس صورت میں شرعاً نکاح بھی منعقد نہیں ہوگا۔(و) بوقت نکاح دونوں کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں وہ بھی حیاء سوز طریقے سے (ز) کسی بھی مجبوری کے تحت کسی بھی مسلمان کے لئے ایک سے زائد خاتون سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔اگر کسی کی بیوی وفات پاجائے تو وہ تین سال تک دوسرا نکاح نہیں کرسکتا، تین سال کے بعد مذکورہ کٹھن مراحل سے گزر کر دوسری شادی کرسکتا ہے۔ع

نخواہم کہ بیند خرد مند ریش
نہ بر عضو مردم نہ بر عضو خویش
منغض بود عیش آں تندرست
کہ باشد بہ پہلوئے بیمار است

ترجمہ: بس نہیں پسند کرتا کوئی عقل مند ایسا ہو جو اعضاء وجوارح اور اوروں کے جسم پر زخم دیکھے پھر بھی کچھ نہ کرے، اس تندرست آدمی کا عیش بھی مکدر ہو جاتا ہے جس کے پہلو میں سست بیمار شخص موجود ہے۔(ح) بوقت عقد نکاح یہ حلف نامہ داخل کرنا پڑتا ہے کہ وہ تین سے زیادہ بچے پیدا نہیں کریں گے۔(دعوۃ ہائی لائٹس، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء ماہنامہ ضیائے آفاق لاہور، شمارہ جولائی ۲۰۱۲ء)

اب ایک مسلمان کے لئے مذکورہ شرائط پر عمل پیرا ہونا کہاں جائز اور گنجائش ہے، جو

اس پر عمل نہیں کرتا اسے عبرتناک سزا دی جاتی ہے، چنانچہ جولائی ۲۰۰۰ء میں گشتی پولیس نے والیدنگ سے ایک نو ماہ کی حاملہ خاتون کو گھر سے گھسیٹ کر تھانہ لے گئی اور عصمت دری کے بعد خاتون کو شہید کردیا۔اس خاتون کا جرم یہ تھا کہ اس نے حکومت کو اطلاع دئے بغیر شادی کرلی تھی۔اس دل خراش داستان کی تفصیل دوماہی رسالہ ’’الرباط‘‘ شمارہ نومبر ۲۰۰۰ء میں آچکی ہے۔

قارئین کرام! حکومت برما کے مذکورہ قوانین پر آپ ذرا غور فرمائیں اور تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، جن لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں مل رہا ہے وہ دس ہزار ٹیاں بطور رشوت کہاں سے دیں گے، پھر نکاح کے متعلقات میں بھی اچھا خاصہ خرچہ ہوتا ہے، اتنی رقم کہاں سے لائیں گے، مطلب یہ کہ شادی نہ ہو بلکہ زنا میں مبتلا ہو۔

مختلف وجوہات کی بناء پر ارکان کے لوگ کم عمری میں اپنی لڑکیوں کی شادی کروادیتے ہیں تا کہ وہ حکومتی درندوں کے ہوس کا نشانہ بننے سے محفوظ ہوجائے، اس کے رد عمل کے طور پر حکومت نے اٹھارہ سال اب چوبیس سال عمر کی قید لگادی، چونکہ ارکان کے لوگ انتہائی باپردہ ہیں، آزادانہ میل ملاپ سے بچتے ہیں، اس لئے حکومت نے قانون بنادیا کہ بے حجاب و بے پردہ قبل از نکاح صرف متوقع بیوی اور میاں دفتر جائیں گے جہاں ان کی تصویریں کھینچی جائیں گی۔۲/اگست ۱۹۹۷ء کو رہیدہ دھومبائی کے مولوی لال محمد کو اس لئے زدوکوب کرکے جیل میں ڈال دیا گیا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کو عقد نکاح سے پہلے فوجی کیمپ نہیں لے گئے تھے۔(الرباط، شوال ۱۴۱۸ھ):ع

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آسماں سے ہم
ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستاں میں
ہمیں بھی یاد کرلینا چمن میں جب بہار آئے

شادی سے متعلق ایک دلگداز خط:

مولانا مفتی عبدالشکور صاحب گارد بیلوی استاذ الحدیث جامعہ دارالسنۃ نہیلہ کاکس بازار بنگلہ دیش اواخر ربیع الاول ۱۴۲۲ھ اواخر جون ۲۰۰۱ء کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ چند جوان عورتیں اور ان کے والدین وسرپرستان مع علاقائی حکمران وممبران شادی کی اجازت کے سلسلہ میں ''ناسا کا حکمرانی زون نمبر ۵ ناکھورہ شمالی منگڈو ارکان'' فوجی چھاؤنی گئے اور شادی کے سلسلہ میں اجازت چاہی۔

مگھ افسران نے دولہا اور دلہن سے الگ الگ طور پر مجمع عام میں پوچھا کہ تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو، انہوں نے اثبات میں جواب دیا، پھر پوچھا کہ پہلے ہی سے تمہارے آپس میں تعلقات وروابط ہیں یا نہیں؟ انہوں نے مجبوراً ہاں کہا، پھر ان سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے قول کے سچے ہو تو مجمع عام میں ایک دوسرے کو پیار ومحبت کا بوسہ دو ورنہ اجازت نہیں ملے گی۔ چونکہ شریعت مطہرہ کے لحاظ سے قبل النکاح اس طرح کے تعلقات، جنسی روابط اور بوس وکنار ناجائز ہے اس لئے انہوں نے بوس وکنار سے انکار کیا جس پر انہیں شادی کی اجازت نہیں دی گئی۔ مفتی صاحب مزید قمطراز ہیں کہ حال ہی میں حکومت برمانے شادی کے متعلق مندرجہ ذیل قوانین کا اعلان کیا ہے۔

(۱) آئندہ تین سال تک شادی پر پابندی ہے۔

(۲) پہلے شادی کے لئے عورت کی عمر اٹھارہ سال اور مرد کی عمر ۲۴ سال ضروری تھی، اب اس عمر میں اضافہ کر کے عورت کے لئے ۲۵ سال اور مرد کے لئے ۳۰ سال کر دیا گیا۔ تاکہ تڑپے جوانی اور عنفوان شباب کے تقاضہ کے مطابق نئی نسل زنا پر مجبور ہو۔

(۳) ایک سے زائد خاتون سے شادی کی اجازت نہیں۔

(۴) مذکورہ شرطیں اگر پائی جائیں تو حکومت کے پاس درخواست دینے کی اجازت

مجموعہ القاسم: جلد ششم　　تیری عظمتوں کو سلام

ہے، حکومت اس پر غور وفکر کے بعد مناسب فیصلہ کرے گی، ظاہر بات ہے کہ درخواست اور فیصلہ ہونے میں بھی اچھا خاصہ وقت لگے گا۔

مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ حال ہی میں ''ناسا کا زون نمبر ۲ شمالی منگڈو'' فوجی کیمپ میں چند جوڑے اجازت نکاح کے سلسلے میں گئے اور ان سے وہی سوالات کئے گئے جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، ان جوڑوں نے چاروناچار ان سوالات کے وہی جوابات دئے جو حکومت کو پسند ہے۔ آخر میں افسر نے کہا کہ تم لوگ اس سے پہلے وطی اور مجامعت کے مراحل سے گزر چکے ہو یا نہیں؟ چونکہ قبل النکاح جماع اسلام سمیت تمام مذاہب میں ناجائز اور حرام ہے اس لئے انہوں نے نفی میں جواب دیا، جس پر انہیں کہا گیا کہ پہلے تجربہ کی خاطر یہ کام کر کے آؤ، ورنہ اجازت نہیں ملے گی یہاں چونکہ مرد وعورت کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے اس لئے ہیرا پھیرا کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

ڈرائیوروں کیلئے حکومت کے قوانین اور ارتدادی پلان کا نرالا طریقہ:

جنوری ۲۰۰۱ء کو میں جس رکشہ پر سفر کر رہا تھا اس رکشہ کے ڈرائیور نے جب حکومت کی گاڑی آتی دیکھی تو وہ ڈرائیور رکشہ سے اترا اور رکشہ کو راستہ کے ایک کنارہ پر لے گیا اور ادباً کھڑا ہو گیا، سڑک کشادہ ہونے کے باوجود رکشہ بالکل کنارہ پر کھڑا کر دیا، اگر دو انگل بھی اس طرف ہو جائے تو رکشہ نیچے گر جائے، میں نے دیکھا کہ جیپ میں حکومت کے کچھ افراد سوار ہیں اور گاڑی کو رکشہ کے بالکل قریب سے گزار لیا، اگر معمولی سا بھی اور قریب ہو جاتی تو رکشہ ٹوٹ جاتا حالانکہ دوسری طرف کافی جگہ ہے۔ خیر وہ گاڑی چلی گئی، میں نے رکشہ ڈرائیور سے اس کی وجہ پوچھی، ڈرائیور نے کہا کہ جب بھی حکومت کی گاڑی سامنے آئے تو ہمارے لئے حکم یہ ہے کہ گاڑی رکوا کر ادباً کنارہ پر کھڑے ہو جاؤ ورنہ سزا دی جائے گی۔ اگر میں بالکل اس طرف کنارہ کی آخری سرحد پر کھڑا نہ کرتا تو اسے ٹکر دے دیا جاتا،

ایسے متعدد واقعات پیش آ چکے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ رکشہ بالکل نیا ہے، میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ ایسی نئی گاڑی کہاں سے ملی ہے؟ اس نے کہا کہ یہاں کچھ فرائی (عیسائی جماعتیں) لوگ آئے ہوئے ہیں۔ جو بے حد رحم دل اور سخی ہیں، وہ لوگ غریبوں کو مختلف چیزیں (ضروریات زندگی کی جملہ چیزیں) یا تو مفت دیتے ہیں، یا آسان قسطوں اور کم پیسوں میں دیتے ہیں، یہ رکشہ بھی میں نے قسطوں پر لیا ہے اور اس کے لئے ایک فارم پر کر کے دفتر میں جمع کرانا پڑتا ہے اور چند فائلوں میں دستخط اور انگوٹھے کے نشان بھی ثبت کرنے پڑتے ہیں۔

نہ کردن رغبت ہنر پروران
بشادیٔ خویش از غم دیگراں

یعنی: ہنرمندوں نے غیروں کے غموں کی وجہ سے اپنی خوشی میں بھی رغبت ظاہر نہیں کی۔ میرے کہنے پر اس نے پر شدہ فارم کی ایک فوٹو کاپی دی جو انگریزی اور برمیز زبان میں تھی، یہ ایسا فارم ہے جیسا کسی مدرسہ (یا کسی حکومت ملازمت ونوکری) میں داخلہ لینے کی صورت میں ایک فارم پر کرنا ڑتا ہے، جس میں ادارہ کے قونین وضوابط درج ہوتے ہیں اور ان کی پابندی متعلقہ فرد پر لازمی ہوتی ہے، جب میں نے وہ فارم دیکھا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص عمداً وقصداً اس فارم پر مکتوب قوانین کو سمجھ کر دستخط کر کے وہ سامان لے تو اس کا ایمان جاتا رہے گا۔ کیونکہ اس فارم کو پر کرنا اور اس میں موجودہ قوانین کو تسلیم کرنا اپنے آپ کو عیسائی مذہب میں شامل کرنا ہے، چونکہ ارکان کے غریب طبقہ افراد دنیاوی تعلیم (خصوصاً برمیز) سے محروم ہوتے ہیں، اس لئے وہ لوگ اسے پڑھے بغیر پیٹ کی خاطر اس پر دستخط کر دیتے ہیں اور وہ سامان آسان قسطوں پر حاصل کر لیتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد ہماری گاڑی نافتر ڈیل تک پہنچی وہاں دیکھا کہ ایک بے انتہا خوب صورت اسکول ہے، پوچھنے پر ڈرائیور نے بتایا کہ یہ اسکول بھی انہی لوگوں (عیسائیوں)

کا ہے۔ اس طرح کے اسکول تقریباً ہر بستی میں ہیں، یہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اور والدین کی مدد بھی کی جاتی ہے اس لئے اکثر لوگ اپنی اولاد کو مدرسہ میں داخل کرنے کے بجائے اسکولوں میں داخل کروا دیتے ہیں۔ عیسائی اسکولوں میں نونہالوں کو داخل کرنے میں کئی فوائد ہیں۔ بچہ تعلیم یافتہ اور مہذب بن جاتا ہے، والدین کو تعاون ملتا ہے، حکومت کے نزدیک ایسے لوگوں کی وقعت اور عزت ہوتی ہے۔

قارئین کرام! غور فرمائیں کہ جو چھوٹا سا ننھا خالی الذہن لڑکا عیسائی اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا وہ اسلام کا مبلغ بن کر نکلے گا یا عیسائی بن کر۔

ایک معتبر عالم دین نے بتایا کہ وہاں مختلف انداز میں پیغمبر اسلام محمد ﷺ اور اللہ تعالیٰ سے بچوں کو دور کیا جاتا ہے اور عیسائی مذہب کی تلقین کی جاتی ہے، ہم نے خود دیکھا کہ ایک مسز آتی ہے اور کہتی ہے کہ بچو! آنکھیں بند کر کے اپنے رب سے کاپی اور پنسل مانگو، بچے مانگتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ مطلوبہ چیزیں نہیں دیتے پھر مسز کہتی ہے کہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے عیسیٰ اور پوپ سے مانگو، چنانچہ بچے ایسا ہی کرتے ہیں تو عیسائی عورتیں ان کے ہاتھوں میں مطلوبہ چیزیں دیتی ہیں، بچے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں عیسیٰ یا پوپ نے دی ہیں۔

عیسائی لوگ اپنی خوبرو اور تعلیم یافتہ نوجوان لڑکیوں کو علاقہ میں بھیجتے ہیں جو گھر گھر جا کر لوگوں کو عیسائی اسکول میں داخلے کے فوائد بیان کرتی ہیں اور گھر میں بھی ٹیوشن پڑھانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں ہر ایک سے بہت جلد مانوس ہو جاتی ہیں، جب کہ برمی حکومت نے بھی اعلان کیا ہے کہ اگر یہاں رہنا ہے تو برمیز زبان جاننا اور سیکھنا ضروری ہے۔

یوں نوجوان غلط راہ میں پڑ گئے اور یہ عیسائی لڑکیاں مسلم کنواریوں کو بہلا پھسلا کر صنعتی ترقی کے بہانے اسکول اور اپنے متعلقہ دفتر میں لے جاتی ہیں جہاں مشینی کام کا انتظام ہوتا ہے اور رات کو انڈین فحش فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں، حکومت نے بھی پابندی لگا دی ہے

کہ نوجوان لڑکیوں کا ایسے دفتروں میں جانا اور کام سیکھنا ضروری ہے۔ ورنہ سزا دیجائے گی، رکاوٹ بننے والے لوگوں کو بھی سخت سزا دی جائے گی۔

مفتی اعظم ارکانؒ ودیگر علماء کی داڑھیاں کیوں منڈوادی گئیں:

دسمبر ۱۹۹۳ء کا واقعہ ہے کہ حکومت نے ایک سمن (حکم نامہ) جاری کیا تھا جس میں آرڈر تھا کہ منگڈو کے علاقوں میں سے ہر علاقہ سے بیس بیس خوبصورت غیر شادی شدہ کنواری دوشیزائیں میر کھالی فوجی چھاؤنی پہنچادی جائیں، ہر ایک لڑکی کو اس کا باپ یا محرم لے کر آئے، ان لڑکیوں کو چھ ماہ تک اس چھاؤنی میں رہنا ہوگا، اس مدت میں لڑکیاں نہ کہیں جاسکتی ہیں نہ ان سے کوئی محرم مل سکتا ہے، لڑکیوں کو وہاں صنعت وحرفت اور دستکاری وغیرہ ہنر سکھائے جائیں گے۔

حکومت نے ایسی لڑکیوں کی ایک فہرست بھی جاری کی تھی جس میں سرکردہ حضرات اور نامی گرامی علماء کرام کی لڑکیوں کے نام بھی شامل تھے، یہ حکم نامہ جاری ہوتے ہی عوام نے مفتی اعظم ارکان مولانا سلطان احمد بن امام شریف ریدہ والے سے مسئلہ پوچھا، حضرت نے عدم جواز کا فتویٰ صادر کیا، خود اس فہرست میں حضرت کی لڑکی کا نام بھی شامل تھا۔

فتویٰ کے بموجب جب لوگ اپنی لڑکیوں کو لے کر جانے کے بجائے خود حاضر ہوگئے تو فوج نے سب کو گرفتار کیا، خوب پٹائی کی اور سب کو جیل میں ڈال دیا اور نامی گرامی علماء کرام کی داڑھیاں منڈوادی گئیں اور ان پر جو قیامت ڈھائی گئی اس کی تفصیل ''الرباط'' شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ مطابق نومبر ۱۹۹۴ء اور شمارہ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ مطابق جولائی ۲۰۰۰ء میں آچکی ہے۔

جو علماء کرام اس ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) مفتی اعظم ارکان مولانا سلطان احمدؒ (۲) تبلیغی جماعت کے امیر جناب نبی حسین (۳) مولانا جعفر علی صاحب (۴) مولانا ظفر احمد صاحب (۵) مولانا ابوالحسین صاحب (۶) مولانا نور احمد صاحب (۷) مولانا ضیاء الحکیم صاحب داماد مولانا مفتی میر احمد صاحب اور مولانا محمد اسلام صاحب وغیرہ۔ یہ تو وہ مشہور نام ہیں جو ہمیں تلاش وتحقیق کے بعد ملے، ورنہ وہ نام جو غیر معروف ہیں وہ تو بے شمار ہیں، ایسے واقعات وحادثات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں۔ کتنے افراد ایسے ہیں جنہوں نے ناقابل بیان ظلم برداشت کیا لیکن زبان حرکت میں نہیں لائی، کتنے ہی علماء ایسے ہیں جن پر قیامت برپا کی گئی لیکن ان کے منہ پر شکایت کے کلمات نہیں آئے۔

چیک پوسٹوں کی کثرت، شجاع پاڑہ مسجد کی شہادت اور عدالت کے انوکھے فیصلے:

بندہ جنوری ۲۰۰۱ء کو منگڈو ٹاؤن سے صبح اپنے تایا جان حاجی حکیم علی مولود ۱۴۲۶ء بن محمد شفیع (مولود ۱۸۹۲ء متوفی ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء) شجاع پاڑہ کے پاس جانے کے لئے دوہزار ٹیاں سے ایک جیپ کرایہ پر لی اور چل پڑا۔ ابھی گاڑی گنہ پاڑہ کے پل تک ہی پہنچی تھی کہ گاڑی روک دی گئی اور ہمیں کہا گیا کہ پل پیدل عبور کیا جائے۔ پل کے ساتھ چیک پوسٹ ہے جہاں چند بندے مسلح چوکس کھڑے ہیں جو آنے جانے والوں سے تلاشی اور انٹرویو لیتے ہیں، لیکن الحمدللہ میں دعا پڑھتے ہوئے پولیس کے نزدیک سے پل پار کرلیا کسی نے پوچھا نہیں۔

ایسے چیک پوسٹ دلیہ پاڑہ کے ساتھ شقدار پاڑہ کے بعد مینگ کھالی پل کے ساتھ، نوراللہ پاڑہ کے بعد خیرادنگ پل کے ساتھ موجود ہیں، غرض ہر پانچ کلومیٹر کے بعد ایک چیک پوسٹ ہے، جس پر شبہ گزرتا ہے یا جس کی مخبری ہوجاتی ہے اس کی تلاشی لی جاتی ہے، رات کو یہاں سے گزرنا قیامت صغریٰ کا منظر پیش کرتا ہے، اس لئے لوگ رات کو آمدورفت کم کرتے ہیں۔

بہر حال میں چیک پوسٹ کو عبور کرتا ہوا شجاع پاڑہ تایا جان کے گھر تک پہنچ گیا، میں نے دیکھا کہ تایا جان کے پلاٹ کے ایک طرف ناسا کا فوج کی چھاؤنی ہے اور دوسری طرف تایا جان کا مکان ہے، گھر جانے کے لئے فوجی چھاؤنی کے سامنے سے جانا پڑتا ہے، فوجی چھاؤنی میں پانچ سو کے لگ بھگ افراد رہتے ہیں اور یہاں حربی ساز وسامان بھی وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔

ہم کھانا کھانے کے بعد اس تاریخی مسجد میں گئے جس کو ظالم حکومت نے اپریل ۲۰۰۰ء میں شہید کر دیا تھا، میں نے دیکھا کہ عمارت توڑ دی گئی، لیکن فی الحال ایک جھونپڑی بنی ہوئی ہے جہاں لوگ نماز پڑھتے ہیں، جب میں نے مسجد کی حالت اور شہادت کے نشانات دیکھے تو کیا بتاؤں میرے دل میں کیا کچھ آرہا ہے، بہر حال مسجد کے مشاہدہ کے بعد ہم (تایا جان، جناب محمد یاسین بن تایا جان، جناب چچا محمد حسین، والد محترم) مسجد کے قریب موجود مدرسہ کے خالی کمرہ میں بیٹھ گئے، میں نے تایا جان سے شہادت کی وجہ پوچھی تو وہ روتے ہوئے گویا ہوئے۔

۱۶۶۰ء کے لگ بھگ شہزادہ شجاع برادر عالمگیر یہاں آیا اور مسجد کی بنیاد ڈالی اس لئے علاقہ کا نام شجاع پاڑہ ہو گیا، بعد میں گردش زمانہ کی وجہ سے مسجد کے نشانات مٹ گئے۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ والد محترم جناب محمد شفیع رحمہ اللہ نے ایک خواب دیکھا جس میں ایک بزرگ نے والد رحمہ اللہ سے فرمایا کہ یہاں مسجد تعمیر کرو، چنانچہ میں (حاجی حکیم علی) نے ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ اس زمین کو خرید کر مسجد کی بنیاد ڈالی جس کے پہلے امام مولانا حسن علی اور برگوز وبیل کے مولانا ابوشمع ہوئے، کچھ عرصہ تک مولانا عبدالحمید شجاع پاڑوی رحمہ اللہ نے بھی امامت کی۔

۱۹۸۴ء میں آپ (راقم الحروف) امام مقرر ہوئے، اسی سال میرے بیٹے محمد یاسین نے اکیاب جا کر مسجد کے سلسلے میں کاغذات اور دستاویزات بنوائے جس کا علم آپ کو بھی

مجموعہ القاسم: جلد ششم   تیری عظمتوں کو سلام

ہے۔ جب اس کی اطلاع منگڈو کے افسروں کو ہوئی تو انہوں نے میری زمین (جو دس ایکڑ کے لگ بھگ ہوگی) کے دو تہائی حصے یوں کہہ کر لے لئے کہ یہاں فوجی چھاؤنی بنے گی۔ چنانچہ ۱۹۸۶ء میں یہاں فوجی چھاؤنی بنی جو آپ کے سامنے ہے۔

تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغ جگر سے نورانی

مارچ ۲۰۰۰ء میں محمد یاسین نے اکیاب جا کر مسجد کو دو منزلہ کرنے کے لئے کاغذات بنوائے اور تعمیر شروع کر دی، تعمیر فوجی افسروں کے سامنے ہی ہوئی لیکن کسی نے نہ اعتراض کیا اور نہ تعرض، بلکہ وہ اس دوران ہم سے کھانے پینے کے ساز وسامان بھی لیتے رہے، جب مسجد پکی تعمیر ہوگئی تو فوجی افسران آئے اور اجازت نامہ طلب کیا، ہم نے اجازت نامہ پیش کر دیا۔ اجازت نامہ دیکھ کر افسروں نے کہا کہ آپ لوگوں کو جتنی بڑی مسجد بنانے کی اجازت ملی یہ مسجد اس سے ایک بالشت بڑی ہے۔ چنانچہ اگر دیوار کو بھی شامل کیا جائے تو واقعتاً ایک بالشت بڑی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے خلاف قانون کہتے ہوئے جرم قرار دے کر منہدم کر دیا، یہ اپریل ۲۰۰۰ء کی بات ہے، یہ مسجد شجاع پاڑہ میں موجود ناسا کا فوجی چھاؤنی کے سامنے سڑک کی مغربی جانب واقع ہے: ع

ہوا ہے گو تندو تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

جون ۲۰۰۰ء کو ہم فریاد لے کر دوبارہ اکیاب پہنچے اور فریاد کی، اکیاب نے فیصلہ دیا کہ چونکہ آپ لوگوں نے جرم کیا ہے اس لئے اس کی سزا یہ ہے کہ سابقہ طرز پر دوبارہ جھونپڑی بنائی جائے۔ اب پکی تعمیر کی اجازت نہیں ہے، یہ ہے عدالت کا فیصلہ، تاہم ہم پکی عمارت بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، جس وقت مسجد توڑی جا رہی تھی تو اس وقت مسجد سے رونے کی آواز آئی اور یہ صدا بھی ہم نے سنی کی یہ مسجد کس کے حکم پر شہید کی جا رہی ہے۔ اس

کی پوری تفصیل ماہنامہ ''الرباط'' شمارہ نومبر ۲۰۰۰ء اور ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ لاہور' دسمبر ۲۰۰۰ء میں آئی ہے۔

قارئین کرام! برما کی عدالتوں کے فیصلوں پر ذرا غور فرمائیں کہ عدالت نے کس طرح بے باکی سے یہ فیصلہ کردیا کہ اس جرم کی سزا یہ ہے کہ مسجد پکی نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ۱۰/جون ۱۹۹۷ء میں رات کے وقت تین برمی فوجیوں نے صاحب بازار (شاپ بازار) نامی بستی کے ایک مکان میں گھس کر ایک باعفت خاتون کی عزت سے کھیلا، جب عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا تو عدالت نے فیصلہ دیا کہ اگر اس کا شوہر یہ کام (جماع) روزانہ کرسکتا ہے تو اگر مسافرین (فوجی) کبھی کبھار یہ کام بہ تقاضۂ جوانی کرلیں تو کوئی جرم نہیں ہے۔

۱۹۸۳ء میں اکیاب کے ایک مسلم طالب علم نے ہیڈ ماسٹر کے پاس درخواست دی کہ فلاں مگھ طالب علم روز مجھے تنگ کرتا ہے، ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواب دیا کہ اگر مغرب کے بعد ایک کنواری لڑکی اوباش لڑکوں کے سامنے سے گزرے تو اوباش لڑکے جملے کستے ہیں اور اسے تنگ کرتے ہیں، لیکن لڑکی یہ سمجھتی ہے کہ اگر میں نے جواب دیا تو یہ میری ناموس وعفت سے کھیلیں گے اس لئے وہ سنی ان سنی سیدھی چلی جاتی ہے، یہی حال آپ لوگوں (مسلم طلباء) کا بھی ہے۔

گھر تلاشی کا طریقہ اور مخبری کا نتیجہ:

گھر تلاشی کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اچانک کسی علاقہ کا گھیراؤ (نصف رات کے بعد) کرلیا جاتا ہے، لوگ خواب خرگوش میں ہوتے ہیں، حکومت کے دس مسلح اہلکار علاقہ کے کونسلر (چیئر مین، اوکاٹا) کو ساتھ لے کر ہر گھر میں جاتے ہیں، پانچ بندے گھر کے اردگرد ہوتے ہیں اور پانچ بندے اوکاٹا کو ساتھ لے کر گھر میں داخل ہوجاتے ہیں، گھر کے تمام

افراد کو ایک کمرہ میں بند کر کے حاضری لی جاتی ہے، پھر وہاں وہاں تلاشی لی جاتی ہے جہاں جہاں ان کی مرضی ہوتی ہے، البتہ تلاشی کے وقت کونسلر اور گھر کے مربی ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر اجنبی آدمی ملے یا کوئی کم ہو تو پوچھ گچھ کا لمبا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور مہمان ومیزبان کو گرفتار کر کے لے جاتے ہیں۔

حکومت نے ہر علاقہ میں کچھ جاسوس اور مخبر مقرر کئے، ان جاسوسوں کا تعلق عموماً انہیں علاقوں سے ہوتا ہے تا کہ علاقہ کے ہر فرد کو پہچان سکے اور مخبری میں آسانی ہو، عموماً علاقہ کے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علاقہ میں فلاں فلاں مخبر ہیں۔ ان کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ علاقہ میں نئے آنے والے افراد، مشتبہ حضرات اور دہشت گرد (مجاہدین) کی اطلاع فوری طور پر متعلقہ تھانہ تک پہنچائیں اور علاقہ میں ہونے والے واقعات، حادثات یعنی علاقہ کی پوری رپورٹ یومیہ حکومت کو دیں۔ بہت سے جاسوس اچھے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہر خبر کی اطلاع حکومت کو نہ دی جائے تاہم وہ مجبوراً دیتے ہیں کیونکہ ان کے پیچھے کچھ اور بندے ہوتے ہیں جو ان کی نگرانی کررہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ صحیح اطلاع نہ دیں تو ان لوگوں کی شکایت پہنچائی جائے گی، اس صورت میں ان جاسوسوں پر آفت آئے گی اور ان میں سے بہت سے لوگ تنگدست اور مجبور ہوتے ہیں اس لئے بھی اس فعل بد کے لئے تیار اور آمادہ ہوتے ہیں۔

تایا جان حاجی حکیم علی کے ایک داماد تفضّل پرامپور میں رہتے ہیں، ان کی اہلیہ محترمہ رشیدہ (راقم کی تایازاد بہن) نے بتایا کہ ۱۹۹۲ء کو میرے بیٹے...... کو حکومت نے مجاہد کے الزام میں گرفتار کیا اور ناک، کان اور ہاتھ کاٹ دئے، آنکھیں نکال لی گئیں اور مثلہ حالت میں تین دن تک بھری مارکیٹ میں یہ نعش رکھ دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ جہاد اور جاسوس کا یہی انجام ہوتا ہے، اس طرح سینکڑوں واقعات ہیں: ع

چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

نمی بینی کہ گاوے در علف زار

بیالاید ہمہ گاوان دہ را

یعنی جب پوری قوم میں سے ایک آدمی نے کوئی بے وقوفی کی تو نہ بڑے کی عزت باقی رہتی ہے نہ چھوٹے کی، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ایک گائے کسی کھیت میں گھس کر نقصان کر دیتی ہے لیکن بدنامی تمام گایوں کی ہوتی ہے۔

ارکانی مدارس کی حالت زار اور قابل ستائش تعلیمی معیار:

جنوری ۲۰۰۱ء کو میں ایک دینی مدرسہ (مدرسہ امداد الاسلام شجاع پاڑہ) پہنچا اور جامعہ کا جائزہ لینا شروع کر دیا، ایک درسگاہ میں گیا جہاں مولانا عبدالحمید کلیجہ بھانگوی مختصر المعانی پڑھا رہے ہیں، میں نے حضرت سے پوچھا کہ آپ کونسی شرح مطالعہ فرماتے ہیں؟ حضرت نے انتہائی تعجب سے استفسار کیا، کیا اس کی شروحات بھی ہیں، بعد میں مسکراتے ہوئے فرمایا: کہ شرح تو بعد کی بات ہے ہمارے پاس تو اصل درسی کتابیں بھی نہیں ہیں، چنانچہ جب میں نے کلاس میں بیٹھے ہوئے طلبہ پر ایک نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر تعجب کی انتہا نہ رہی کہ ہر طالب علم کے پاس کتاب نہیں ہے، بلکہ پانچ پانچ طلبہ کے سامنے ایک ایک کتاب ہے جو درسگاہ ہے وہی رہائش گاہ بھی ہے، ایسا نہیں ہے کہ درسگاہیں الگ ہوں اور رہائش گاہیں الگ اور استاذ محترم سبق پڑھانے کے لئے جس جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسے دیکھ کر قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور طلبہ کرام جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں اسکی منظر کشی اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے، پیوند پر پیوند لگے کپڑے پہننے والوں کی داستان سنی تھی اب مشاہدہ کر لیا۔

میں درسگاہ اور رہائش کو دیکھتے ہوئے کتب خانہ (مدرسہ کی لائبریری) گیا تاکہ مکتبہ میں موجود کتابوں کو دیکھوں، وہ مکتبہ کیا تھا بلکہ صرف نام تھا، کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں، پرانی پھٹی چند کتابیں پڑی ہوئی ہیں، کچھ رسائل بھی ہیں اور مکتبہ ضروری الماریوں و دیگر

ساز و سامان سے خالی ہے، دریافت کرنے پر ناظم کتب خانہ نے بتایا کہ یہ کتابیں بھی ہم نے بڑی محنت و مشقت سے جمع کیں، یہاں کچھ شروحات ہیں جنہیں اساتذہ اور طلبہ باری باری مطالعہ کرتے ہیں بلکہ طلبہ کو تو شروحات مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

کتب خانہ کا معائنہ کرنے کے بعد میں مطبخ پہنچا، دیکھا دال پک رہی ہے، وہ دال کیا ہے بلکہ زرد پانی ہے، شاید اسی کے بارے میں یہ مقولہ مشہور ہے "یجوز الوضوء بہ" یعنی اس سالن سے وضو بھی جائز ہے، ایک سنجیدہ لڑکے سے میں نے کھانے پینے اور ناشتہ کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: یہاں ناشتہ کا تصور نہیں ہے بلکہ پیٹ بھر کر کھانا ملنا بھی بہت خوش نصیبی کی بات ہے، مطبخ میں اکثر و بیشتر دال پکتی ہے، کبھی کبھی مچھلی بھی پکتی ہے، مہینہ دو مہینہ کے بعد گوشت بھی پکایا جاتا ہے، اس میں دال مکس ہوتی ہے، جس دن گوشت پکے اس دن تو عید کا سماں ہوتا ہے اور طلبہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماپاتے، گوشت پکنے کا موقع سال میں ایک دو دفعہ ہی آتا ہے۔

مطبخ میں لکڑیوں سے سالن پکایا جاتا ہے، رسوئی گیس کے نام سے بھی یہ لوگ واقف نہیں ہیں، کتابیں اور دال و چاول خریدنے کے لئے رقم نہیں ہوتی تو لکڑیاں خریدنے کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ اس لئے سال بھر جلانے کی لکڑیاں طلبہ پہاڑ میں جا کر کندھوں پر اٹھا کے لاتے ہیں، آج کل تو پہاڑوں، جنگلوں، چراگاہوں اور میدانوں پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا ہے، اس لئے پہلے کی طرح آزادانہ طریقہ سے لکڑیاں لانا بھی مشکل ہے، پہلے سے پرمٹ حاصل کرنا پڑتا ہے، چونکہ یہ پہاڑ مدارس سے کئی میل دور واقع ہیں۔ اس لئے طلبہ مہینہ دو مہینہ کے بعد صبح سویرے چاقو (ڈا) ہاتھ میں لئے پہاڑ کی طرف جاتے ہیں، دو گھنٹے پیدل چلنے کے بعد پہاڑ میں پہنچتے ہیں، پھر تین چار گھنٹے لکڑیاں کاٹتے اور تلاش کرتے ہیں، اس کے وہ لکڑیاں کندھوں پر اٹھا کے مدرسہ لاتے ہیں، عشاء تک مدرسہ پہنچتے ہیں، پھر پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں، ایسے ہی موقع پر بیل ذبح کیا جاتا ہے، چونکہ وہاں گاڑی اور

سواری کا انتظام نہیں ہے اس لئے یہ پر مشقت راستہ پیدل طے کیا جاتا ہے۔

جب میں نے طلبہ سے کہا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو روزانہ مدرسہ کی طرف سے ناشتہ دیا جاتا ہے، وظیفہ کے نام سے ہر ماہ طالب علم کو پیسہ دیا جاتا ہے، دو تین مہینہ کے بعد کپڑے اور صابن وغیرہ دئے جاتے ہیں، موسم سرما میں کمبل دیا جاتا ہے، کتابیں مدرسہ کی طرف سے مہیا کی جاتی ہیں، امتحانات میں اول، دوم اور سوم آنے والوں میں انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں، طلبہ کی درسگاہیں الگ ہیں اور رہائش گاہیں الگ اور اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو اس کا علاج و معالجہ مدرسہ کے ذمہ ہے اور روزانہ صبح گوشت پکایا جاتا ہے اور شام کو دال یا سبزی پکائی جاتی ہے، ہر کمرہ میں بجلی، ٹیوب لائٹ، پنکھا (بلکہ ایئر کنڈیشن) اور مختلف النوع آرائش کے ساز وسامان موجود ہیں۔

جب میں نے گفتگو ختم کی تو طلبہ پر ایک نظر دوڑائی اور مجھے یہ احساس ہوا کہ طلبہ میری باتوں کو مبالغہ آرائی اور خیالی پلاؤ پر محمول کر رہے ہیں، ان کے نزدیک یہ چیزیں اس فانی دنیا میں ناممکنات میں سے ہیں، میں نے دیکھا کہ مغرب کے بعد چھ چھ اور آٹھ آٹھ طلبہ ایک چراغ (یالالٹین) کے اردگرد بیٹھے ہوئے تکرار کر رہے ہیں اور طلبہ باری باری اس میں مٹی کا تیل ڈالتے ہیں، بعض نادار طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی باری کے موقع پر تیل مہیا نہیں کر پاتے۔

پاکستان اور دیگر آزاد ملکوں میں گٹر لائن کا نہ صرف رواج ہے بلکہ ضروریات زندگی میں شامل ہے، وہاں میں نے دیکھا کہ مدرسہ کے کمروں سے کچھ فاصلے پر خندقیں کھودی گئیں جہاں طلبہ اور اساتذہ قضائے حاجت کے لئے جاتے ہیں، چونکہ یہ خندقیں جلد پر ہو جاتی ہیں اس لئے تین چار دن کے بعد (یا جمعرات کی رات) طلبہ ہی ان بیت الخلاؤں کی صفائی کرتے ہیں، صفائی کیا بلکہ ٹوکری اور بالٹی بھر بھر کر پائخانہ اٹھا کر دور پھینکنا ہے، وہاں نہ صرف بھنگی کا دستور نہیں بلکہ یہ لوگ بھنگی کے نام سے بھی ناواقف ہیں، اس کار

خیر میں چھپکے چھپکے بہت سے اساتذہ بھی حصہ لیتے ہیں۔

حکومت کے مظالم کی انتہاء دیکھئے کہ مدارس والوں پر ضروری ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کی مکمل فہرست متعلقہ تھانہ میں پہنچا دی جائے اور مدرسہ کی سالانہ آمدنی اور حسابات کی تفصیل بھی پہنچانی ہے، وقتاً فوقتاً حکومتی کارندے رات کو آ کر حاضری لیتے ہیں، اگر کسی کو غیب یا غیر حاضر پائے تو اس پر دہشت گردی اور جہادی پارٹی سے تعلق کا الزام لگ جاتا ہے، پھر اس خوب خبر لی جاتی ہے، اگر کوئی طالب علم زیادہ نظر آئے تو اس کی بھی باز پرس کی جاتی ہے۔

غرور وناز مٹ جاتا ہے جاہ ومال والوں کا
خدا ساتھی ہوتا ہے استقلال والوں کا

جب مدارس والے سالانہ آمدنی کی تفصیل جمع کرانے جاتے ہیں تو ان سے تحقیق وتفتیش کی جاتی ہے کہ اتنی رقم کہاں سے آئی؟ سعودیہ، پاکستان، دبئ و دیگر ممالک سے تم لوگوں کا رابطہ کیسے ہوا؟ وہاں پیسہ لینے کون جاتا ہے اور کیسے جاتا ہے، اگر اطلاع مل جائے کہ فلاں مولانا ہر سال سفیر بن کر مختلف ممالک کا دورہ کرتے ہیں تو اس پر اور اس کے خاندان پر قیامت آجاتی ہے، نیز ارکان کے علماء اور عامۃ الناس کا کسی بیرونی ممالک جانا ناممکن ہے بلکہ ایک بستی سے دوسرے بستی میں جانے کے لئے بھی پرمٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ارکان کے علماء چوری چھپے بنگلہ دیش آتے ہیں پھر سفر پہ جاتے ہیں، اس کے بعد بڑی رقم بطور رشوت دے کر ارکان آتے ہیں، چونکہ اب یہ آسانی بھی نہیں رہی اس لئے ارکان کے رہنے والے بنگلہ دیش میں مقیم کسی ارکانی عالم دین کو چندہ اٹھانے بھیجتے ہیں۔ بہت سے نامی گرامی علماء ایسے ہیں جو کسی ضرورت (چندہ سفر) کے تحت بنگلہ دیش آئے تھے پھر واپس نہیں جاسکے بلکہ بنگلہ دیش ہی ان کا وطن عارضی قرار پایا، مصلحت کے تحت ان علماء کے نام حذف کئے جا رہے ہیں۔

قارئین کرام! الحمدللہ مجھے کم از کم دس دینی اداروں میں جانے اور وہاں کے حالات دیکھنے کا موقع ملا، تقریباً سب کا یکساں حال ہے، البتہ بعض مدارس میں کچھ کچھ سہولتیں موجود ہیں، کوئی یقین کرے یا نہ کرے خدا کی قسم! میں نے ایک ایسے طالب علم کو دیکھا جس کے لباس میں جگہ جگہ شگاف تھے اور بعض شگاف کو اس نے تار (بجلی کی تار کی طرح) سے سلائی کی ہوئی تھی، پھر پوچھنے پر بتایا کہ اس کے پاس سوئی دھاگہ خریدنے کے لئے پیسہ نہیں ہے، اس لئے تار سے سلائی کی گئی اور یہ تار وہاں در دیوار میں ملتے ہیں۔

اپنے لہو سے روشن کردی گلیاں اس ویرانے کی
گرچہ تنگ تھیں گلیاں شہر وفا کو جانے کی

ارکانی مدارس کے ذرائع آمدنی:

ارکان کے دینی اداروں اور اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے، آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے اور ممکنہ ذرائع آمدنی یہ ہیں۔

(الف) بیرون ممالک سے آمدہ چندے کی رقم۔ (ب) اندرون ملک سے وصول شدہ چندے۔ (ج) فصل (چاول) کی کٹائی کے وقت دھان اور چاول اٹھائے جاتے ہیں، ایسا سال میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔ (د) متمول حضرات طلبہ کو صبح وشام کھانے دیتے ہیں جسے جاگیر کہا جاتا ہے، یوں مطبخ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ (ہ) موقوفہ زمینوں کی محصولات اور آمدنی۔

حکومت نے باقاعدہ منصوبہ بندی اور منظّم سازش کے تحت مذکورہ ذرائع بالواسطہ اور بلاواسطہ بند کردئے، یوں بہت سے دینی مدارس بند ہوگئے یا تعلیمی معیار برقرار نہیں رہا، بیرون ممالک کے سفر پر پابندی لگنے کی وجہ سے بیرون ممالک سے آمدہ بہت سی رقم تعطل کا شکار ہوگئی۔

چونکہ ارکان میں مہنگائی آسمان سے بات کررہی ہے، ہوش ربا قحط سالی عروج پر ہے اور مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی آمدنی کے دروازے بند ہیں۔ اس لئے یہ لوگ چندہ دینے اور کھانا دینے کے اہل نہیں رہے، بلکہ انہیں خود پیٹ بھر کر کھانا نہیں مل رہا ہے، اس لئے اب مطبخ کی ضرورت پیش آگئی۔ اب مسجد ومدارس کی موقوفہ زمینوں پر حکومت کا تسلط ہوگیا ہے، وقف کو جرم قرار دیا گیا اور مساجد ومدارس کی تعمیرات پر پابندی لگادی گئی، میں نے جنوری ۲۰۰۱ء میں ایسے بہت سے مدارس ومساجد کی تعمیرات دیکھی جو نیم پختہ ہیں اور تکمیل کی اجازت نہیں مل رہی ہے، لیکن اس کے باوجود ان مدارس کے تعلیمی معیار اتنا بلند ہے کہ اس پر رشک آتا ہے۔ میں دورے کے درمیان مدرسہ محمدیہ منگلا جی پرامپور میں دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے طلبہ صیغوں اور تعلیلات کے سلسلے میں مناظرے کررہے ہیں، ایک طرف سے ایک طالب علم اٹھ کر کوئی مشکل صیغہ پوچھتا ہے یا تعلیل پوچھتا ہے، سوال ختم ہوتے ہی جواب حاضر۔ یہاں کے طلبہ صیغے اور تعلیلات اور علم نحو وصرف میں اتنی مہارت رکھتے ہیں جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔

غیر رجسٹر شدہ مساجد ومدارس اور سالانہ جلسے پر پابندی:

حکومت برملا نے اعلان کیا کہ تمام مساجد ومدارس کا رجسٹرڈ ہونا ضروری ہے اور جو غیر رجسٹرڈ ہو وہ قابل انہدام ہے، جب کہ فی الحال رجسٹرڈ (مساجد ومدارس کے لئے) پر پابندی ہے اور نہ موجودہ مدارس ومساجد رجسٹرڈ شدہ ہیں، نہ پہلے اس کا رواج ودستور تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مختلف حیلوں بہانوں سے موجودہ مدارس ومساجد ایک ایک کرکے شہید کردئے جائیں گے، چنانچہ اس پر عمل شروع ہوچکا ہے بہت سے ادارے شہید ہوچکے ہیں، جن کی تفصیل الگ عنوان کے تحت ہے۔

ارکان میں زمانہ قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ سال میں ایک مرتبہ سالانہ جلسہ

عام کیا جاتا ہے جس میں لوگ بڑھ چڑھ کر پیسہ دیتے ہیں، جو کم از کم نصف سال خرچ کے لئے کافی ہوتے ہیں اور وقتاً فوقتاً علماء کرام مختلف علاقوں میں جا کر وعظ او رتقریر کرتے ہیں تا کہ عوام الناس کی اصلاح ہو اور مدرسہ کے لئے بھی کچھ چندہ کیا جائے ،لیکن اب حکومت نے دینی محفل اور خطابت وتقریر کے جلسوں پر پابندی لگا دی ہے اگر بمشکل کسی کو دینی محفل گرم کرنے کی اجازت مل بھی جائے تو وہاں حکومت کے اہلکار پہنچ جاتے ہیں تا کہ حکومت کے خلاف یا جہاد کی فضیلت پر وعظ نہ ہو سکے، اگر جذبہ میں کوئی عالم دین ایک دو جملہ حکومت کے خلاف یا جہاد پر کہہ دے تو اسی وقت انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

بہ بانگ دہل خواجہ بیدار گشت
چہ داند شب پاسباں چوں گزشت
خورد کاروانے غم بارخویش
نسوزد دلش برخر پشت ریش

ترجمہ: ڈھول کی آواز پر (فجر کی اذان کے بعد) صاحب بیدار ہوا، وہ کیا جانے کہ چوکیدار نے رات کیسی گزاری، قافلہ کو اپنے بوجھ کی فکر ہے کہ کس طرح منزل مقصود تک پہنچ جائے ،زخمی گدھے پر اس کا دل نہیں جلتا۔

دینی رسائل کی اشاعت اور تعلیم پر عائد پابندیاں:

ارکان کی زمین جس طرح زرخیز ہے اسی طرح مردم خیز بھی ہے، یہاں کے باسی انتہائی ذہین وفطین ہوتے ہیں، یہ لوگ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں،لیکن ظالم حکومت نے ان کے لئے تعلیم وتعلم کے تقریباً سارے دروازے بند کر دئے، دینی اداروں اور مدرسوں کا حال تو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، اب دینی کتب کی اشاعت اور سرکاری اسکولوں کا حال لکھتے ہیں۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے مسٹر محمد رفیق نے ۱۹۱۱ء میں ''الرفیق'' نامی روزنامہ رنگون برما سے (اردو میں) شائع کیا تھا،اس کے بعد اور بھی بے شمار رسائل، اخبارات اور مختلف النوع جرائد علماء کی ادارت میں شائع ہونے لگے تھے جیسے روزنامہ ''دورجدید'' زیر ادارت مولانا محمد ابراہیم مظاہری رحمہ اللہ، روزنامہ ''نگار'' زیرادارت محمد صالح محشر برمی ۱۹۵۲ء اخبار''پکار''،''پرواز'' اور''برق'' زیرادارت محترم علوی صاحب، مجلّہ''الاشراق'' زیر ادارت مصطفیٰ رومی، ماہنامہ ''تہذیب الاسلام'' زیرادارت مولانا محمد موسیٰ بن مولانا محمد یونس ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء مجلّہ ماہنامہ''المحمود'' زیرادارت مفتی اعظم برما الشیخ محمد داؤد یوسف بن حاجی داؤد ہاشم، روزنامہ ''مجاہد، روزنامہ رنگون برما مسلم، شیر رنگون، الفاروق، روزنامہ استقلال، ۱۹۴۸ء اور برمی زبان میں ''نیولائٹ آف برما'' وغیرہ۔تفصیل کے لئے''تذکرہ ارکان برما'' ملاحظہ ہو۔اور ارکانی و برمی علماء کرام نے بہت سی کتابیں اردو میں لکھیں اور شائع کیں جن کی تفصیل''تذکرہ ارکان برما'' ص:۱۸۱ پر موجود ہے، برمی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ اشاعتی اور سیاسی وتعلیمی میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں تو ہرقسم کی کتاب، رسالہ روزنامہ او ہفت روزہ کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ یوں مذکورہ تمام رسائل دیکھتے ہی دیکھتے بند ہو کر افسانہ میں تبدیل ہو گئے۔

اب روزنامہ اور رسالہ وکتاب شائع کرنا تو دور کی بات ہے،حکومت کی طرف سے برمیز زبان میں جو اخبارات شائع ہوتے ہیں ان تک بھی ہرکس وناکس کی رسائی نہیں ہوتی۔اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ جنوری ۲۰۰۱ء میں راقم نے منگڈو میں ایک ممتاز عالم دین (مولانا حافظ محمد انور بن رشید احمد کلیچہ بھانگوی) سے کہا کہ مجھے ایک برمیز اخبار لا کر دو، تا کہ استفادہ کروں اور ریکارڈ میں محفوظ کرلوں، مولانا نے جواب دیا کہ یہاں اخبار نہیں ملتا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے شہر میں اخبار کیوں نہیں ملتا؟ کیا یہاں موجود حکومت کے دفاتر میں اخبارات نہیں آتے؟

انہوں نے جواب دیا کہ حکومتی دفاتر میں اخبارات آتے ہیں، ان سے وہ لوگ استفادہ کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی خریدتے اور پڑھتے ہیں جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور حکومت سے بھی تعلق ہوتا ہے، ابھی بھی اخبار لینے جاؤں گا، انٹرویو دے کر اخبار لانا پڑے گا اور نظروں میں بھی آجاؤں گا حالانکہ مولانا صاحب منگڈو ہی میں رہتے ہیں اور منگڈو ٹاؤن میں ان کی دکان بھی ہے۔

سرکاری برمیز اسکولوں میں تعلیم:

ایک طرف تو حکومت یہ کہتی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ برمیز تعلیم حاصل کریں، ورنہ انہیں غیر ملکی قرار دیا جائے گا، جب ارکانی مسلمانوں نے برمیز زبان سیکھنا شروع کردیا اور اپنے نونہالوں کی توجہ برمیز اسکول کی طرف کردی تو حکومت نے ان بے چاروں کے لئے تعلیم کے تمام دروازے بند کردئے اور ایسی شرائط عائد کردیں جن کے تحت نہ وہ مسلمان رہتے ہیں نہ ہی حکومت کی ملازمت حاصل کرسکتے ہیں۔

اولاً تو ہر علاقہ (بلکہ شہر میں بھی) مناسب اسکولز نہیں ہیں۔ پورے ارکان میں صرف اکیاب میں ایک کالج ہے، منگڈو، بوسیدنگ و دیگر شہروں میں ابتدائی اسکولز ہیں، جہاں نو کلاس تک تعلیم ہوتی ہے، شقدار پاڑہ منگڈو کے ہائی اسکول میں بھی نو کلاس تک ہے، دس کلاس کے لئے اکیاب جانا پڑتا ہے، اکیاب جانا ہر طالب علم کا کام نہیں ہے، اس کے لئے اجازت نامہ، سفارش اور موٹی رقم چاہئے، ارکان میں یہ بھی قانون ہے کہ کتب ممتحنہ میں سے کسی ایک کتاب میں بھی اگر ایک نمبر بھی کم ملے تو پورا درجہ دہرانا پڑتا ہے۔ سنا ہے کہ ۱۹۶۲ء تک حکومت کرنے والا فوجی سربراہ مسٹر ''نے وین'' بھی نو کلاس پاس ہے۔

پاکستان ودیگر ممالک کی طرح ایسا نہیں ہے کہ فیل شدہ کتاب کا ضمنی امتحان دیا جائے، چوتھی کلاس کا امتحان سرکاری اور سخت ہوتا ہے، بہت سے طلبہ اس میں ناکام

ہوجاتے ہیں، آٹھویں کلاس امتحان بھی سرکاری ہوتا ہے، دسویں کلاس کا امتحان بھی سرکاری ہے۔ جو طالب علم مسلسل ایک درجہ میں تین سال تک فیصل ہوجائے تو اس کے لئے اسکول کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، اکثر طلبہ نویں کلاس میں فیل ہوجاتے ہیں بلکہ مسلم طلبہ کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت فیل کیا جاتا ہے تاکہ آگے ترقی نہ کرسکے۔

میرے بھائی محترم محمد قاسم بن مولانا حسن علی کلیجہ بھانگوی نے مسلسل تین سال شقدار پاڑہ ہائی اسکول میں نویں کلاس کا امتحان دیا اور فیل ہوگئے، حالانکہ وہ شروع سے نویں تک کسی بھی درجہ کے کسی بھی امتحان میں فیصل نہیں ہوئے۔ بالآخر اس نے تعلیم چھوڑ دی۔

اسکول میں داخلے کی چند شرائط ہیں:

(الف) اسلامی نام چھوڑ کر برمیز نام رکھنا (ب) داڑھی منڈ والینا، انہی دونوں شرائط پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے بوسیدنگ کے مشہور لیڈر پروفیسر محمد زکریا نے تعلیم وتدریس چھوڑی۔ (ج) وضع قطع غیر اسلامی ہو۔ (ہ) کبھی سور کا گوشت اور مردہ مرغی کا گوشت کھلایا جاتا ہے، انکار کی سکت ومجال نہیں (د) عموماً سالن اور گھی میں سور کی چربی ملادی جاتی ہے۔ (ز) روزانہ صبح وشام اسکول کے طلبہ اور اساتذہ برمی قومی ترانہ پڑھتے ہیں اس وقت جھک کر رکوع اور سجدہ کی حالت میں برمی پرچم کی تعظیم کرنا پڑتا ہے۔

اسکولوں میں برمی مسلم طلباء سے جو ناانصافیاں اور ناروا سلوک کیا جاتا ہے ان کو برداشت کرنا ہر طالب علم کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان سب مشقتوں اور محنتوں کے باوجود اگر کوئی شخص تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اسے ابتدائی اسکول تک محدود رکھا جاتا ہے، ترقی نہیں دی جاتی اور بہتوں کو ملازمت بھی نہیں ملتی۔

میرے ماموں ماسٹر نذیر احمد مولود ۶؍جون ۱۹۳۴ء بن مولانا عزیز الرحمٰن نے منگڈو اسکول میں ۳۰ سال تک سرکاری اسکول میں تدریسی خدمات سرانجام دیں، لیکن ترقی نہیں

مل سکی، بالآخر ۱۹۹۵ء میں پنشن لے لی۔ اگر کسی طالب علم کے بارے میں اطلاع مل جائے کہ وہ جمہوریت کی تعریف کرتا ہے، موجودہ حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور حکومت وقت کی ناانصافیاں بیان کرتا ہے تو اس کو نہ صرف اسکول سے نکال دیا جاتا ہے بلکہ اسے سخت سزا بھی دی جاتی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگائیں۔

۱۹۹۰ء کو برما میں انتخابات ہوئے اور انتخابات کے نتیجہ میں جمہوریت پسند جماعت N.L.D (زیر قیادت محترمہ آنگ سانگ سوچی بنت اونگ سائنگ) نے واضح اکثریت حاصل کی تھی، لیکن فوجی حکومت نے اسے حکومت سپرد نہیں کی بلکہ قائدین کو حوالہ زنداں کر دیا، اس زمانہ میں کالج کے طلباء نے مارشل لاء کے خلاف ہڑتالیں کی تھیں اور مظاہرے کئے تھے لیکن فوجی حکومت نے ہزاروں طلبہ کو کال کوٹھری میں ڈال دیا اور سینکڑوں طلبہ کو نااہل قرار دے کر انہیں اسکول میں داخلے پر پابندی لگادی، یہ تو میٹرک کے اوپر کے درجات کے طلبہ کی سزا تھی، میٹرک کے نیچے کے طلبہ کے لئے قانون بنادیا کہ وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد تین سال تک دوسرے درجہ کے لئے داخلہ نہیں لے سکتے۔

اب میٹرک پاس کرنے کے بعد تین سال تک کون انتظار کرے گا؟ نتیجہ تعلیم سے محرومی ہے۔ (ماہنامہ ’’الرباط‘‘ جنوری ۲۰۰۰ء)۔

تجارت، کاشت اور زراعت پر پابندیاں:

میں نے جنوری ۲۰۰۱ء میں مختلف علاقوں میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملاقاتیں کیں جو کسی زمانے میں امیر ترین افراد میں شامل تھے، لیکن آج وہ ٹکڑوں کے محتاج ہیں، جب میں نے اس بے کسی و بے چارگی کی وجہ پوچھی تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا کہ ہمارے ذرائع آمدنی، تجارت اور کاشت ہے، تجارت پر اتنی پابندیاں عائد کردی گئیں کہ تجارت کرنے سے نہ کرنا بہتر ہے۔

مختلف شہروں اور ملکوں سے سامان لانے کی اجازت نہیں ملتی، اگر سفارش اور رشوت کی بناء پر اجازت نامہ مل بھی جائے تو آمد و رفت کے وقت حکومتی اہلکار سادہ لباس میں تنگ کرتے ہیں اور امیگریشن والے اتنا ٹیکس لیتے ہیں جس کا ہم متحمل نہیں ہو سکتے اور جگہ جگہ حکومت کی چوکیاں اور ناسا کا فوج کے کیمپ ہوتے ہیں، یہ لوگ بھی جی بھر کر لوٹتے ہیں۔

اگر کوئی سوداگر اپنی دکان میں غیر ملکی سامان (بلا پرمٹ) رکھے یا بنگلہ دیش سے انسانی ضروریات کی چیزیں (مٹی کا تیل، سرسوں کا تیل، موم بتی، ماچس، بسکٹ اور دوائی وغیرہ) لاکر رکھی جائیں تو حکومت کے وحشی درندے چھاپہ مار کر دکانیں اور جملہ سامان ضبط کر لیتے ہیں، کبھی یہ سامان واپس نہیں کرتے اور کبھی بھاری رقم کے عوض واپس کر دیتے ہیں۔

اور کبھی ایسا بھی کرتے ہیں کہ رات کو چوری چھپے مسلمانوں کی مارکیٹ جلادیتے ہیں، پھر الٹا الزام دکانداروں پر عائد کیا جاتا ہے کہ تم لوگوں نے اس کی حفاظت کیوں نہیں کی؟ اس الزام کے تحت بسا اوقات دکانیں کسی اور (مگھ) کو دے دی جاتی ہیں، چنانچہ منگڈو ٹاؤن کی مارکیٹ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۹۰ء کم از کم چار دفعہ جلائی جا چکی ہے، خود میرے سامنے دو دفعہ ایسے واقعات ہو چکے ہیں، یوں تجارت اور بیوپاری کے دروازے مسلمانوں کے لئے بند ہو گئے ہیں: ع

یاد ماضی ہے عذاب جان یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

رہ گئی زراعت اور کاشت کی آمدنی، سواس میں بھی اتنی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں جن کے تحت نفع کے بجائے نقصان اٹھانا پڑتا ہے، سب سے پہلے مختلف حیلوں، بہانوں سے مسلمانوں کی کاشت کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا، خرید و فروخت ممنوع قرار دی گئی اور وراثت پر پابندی لگادی گئی، نیز جگہ جگہ مگھ بستیاں بسادی گئیں۔

موسم برسات میں ہر زمیندار سے ایک راضی نامہ لیا جاتا ہے، جس میں لکھا جاتا ہے

کہ میں سرکار کو اتنا اتنا غلہ اتنی قیمت پر (جو عام قیمت سے بہت کم ہوتی ہے) فروخت کروں گا، اس پر زمیندار سے جبراً وقہراً دستخط لئے جاتے ہیں۔

اب فصل تیار ہوتے ہی مقررہ ٹیکس الگ لیا گیا، ہنگامی چندہ الگ وصول کیا گیا اور بچا ہوا دھان کم قیمت پر وصول کرلیا گیا۔ یوں زمیندار چاول اور دھان سے محروم ہوگیا حالانکہ پورے سال کی خورد ونوش کی چیزیں انہیں اسی زمین سے حاصل کرنی ہیں، اب تو عیسائی جماعتیں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت فصل کٹائی سے پہلے مارکیٹ کی قیمت یا زیادہ قیمت پر دھان خرید کر ذخیرہ اندوزی کرلیتی ہیں پھر قحط سالی کے وقت مفت تقسیم کرکے یا کم قیمت میں فروخت کرکے سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان اور ضمیر خرید لیتی ہیں۔

مولانا مفتی عبدالشکور صاحب گارڈ بیلوی لکھتے ہیں کہ ارکان کو دھان سے خالی کرکے مسلمانوں کو بھوکوں مارا جارہا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) مسلمانوں کی زرعی زمینوں پر غیر مسلم بستیاں بسائی جارہی ہیں اور حکومت کے دفاتر اور رفاہی ادارے (برائے نام) قائم کئے جارہے ہیں۔ (۲) رہی سہی زمینوں کو نوآباد غیر مسلموں پر تقسیم کی جارہی ہے۔ (۳) اتنا ٹیکس مقرر کردیا گیا جتنا زمین میں ہوتا ہی نہیں۔ (۴) کاشت وزراعت کے آلات واوزار رکھنے پر پابندی عائد کردی گئی۔ (۵) کھاد و دیگر سامان کی درآمد و برآمد پر پابندی۔ (۶) مسلمان غیر مسلموں کی زمین میں کاشت نہیں کرسکتے۔ (۷) کام کرنے والے جوانوں کو باغی یا کسی مجاہد پارٹی سے تعلق کے الزام میں گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (۸) مساجد ومدارس کی موقوفہ زمین چھین کر حکومت کی تحویل میں لے لی گی یا غیر مسلموں میں تقسیم کردی گئی۔ (۹) سرکاری خریداری (جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے) کے نام پر پیداوار کا بڑا حصہ چھین لیا گیا۔ (۱۰) انعامی فروختگی اور پھر فاضل دھان کی خریداری کے نام پر دھان وصول کرلیا گیا۔ (۱۱) تماوا باما خریداری کے نام پر ایک اور حصہ لے لیا گیا، پھر ناسا کا فوجی اور غیر مسلم والنٹر وں کی غذا

اور خوراک کے نام پر ایک اور حصہ لے لیا گیا۔ (۱۲) اسکول، کالج، رفاہی ادارے اور دیگر سرکاری عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے نام پر ایک اور حصہ چھین لیا گیا۔ (۱۳) سرکاری ضروریات وتعمیرات کے نام پر ہزاروں ایکڑ زمینوں پر قبضہ کرلیا گیا۔

حج اور قربانی پر پابندی کا مسئلہ اور ایک غلط فہمی کا ازالہ:

حج اسلام کے بنیادی ارکان خمسہ میں سے ایک ہے جس پر ۱۹۶۲ء سے پابندی لگادی گئی، حکومت کا کہنا ہے کہ اس سے زرمبادلہ نقصان ہوتا ہے، سعودی حکومت کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۲ء تک برما سے کوئی شخص حج کے لئے نہیں آیا، اس غیر انسانی ناروا سلوک پر جب حکومت کی خوب بدنامی ہوئی اور ہورہی ہے تو اب حکومت چند گنے چنے افراد کو مندرجہ ذیل شرائط کے تحت حج پر جانے کی اجازت دے رہی ہے۔

(۱) براہ راست برما سے نہیں جاسکتا بلکہ تھائی لینڈ سے ہوکر جاسکتا ہے، چنانچہ اب جو حضرات بھی برما سے حج کے لئے آرہے ہیں وہ تھائی لینڈ سے ہوکر آتے ہیں۔

(۲) یومیہ ایک ڈالر کے حساب سے رقم جمع کرنی ہوگی۔

(۳) اعلیٰ سفارش یا بھاری رقم بطور رشوت چاہیے۔

(۴) حج پر جانے والا شخص بے داغ ہو یا حکومت کا پسندیدہ شخص ہو اور برمی حکومت کے مظالم وبربریت پر کہیں نہ بیان جاری کرے گا اور نہ ہی اس کا تذکرہ کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ برما سے حج پر آنے والے حجاج کرام یا تو برما کی تعریف کرتے ہیں یا کم از کم خاموشی اختیار کرتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ان کے پیچھے جاسوس موجود ہیں جو پل پل کی اطلاع حکومت کو دیتے ہیں، اگر ہم نے حکومت کی تعریف یا ظلم وستم کی نفی نہ کی تو ارکان میں جینا ہمارے لئے مشکل ہوجائے گا اور دوبارہ حج پر آنے کی پابندی ہوگی۔

تازہ ترین رپورٹ کے مطابق ارکانیوں کا رنگون جانا تقریباً محال ہے۔ اولاً بارہ لاکھ

ٹیاں کی ضرورت ہے، پھر سفارش الگ اور دیگر پابندیاں الگ ہیں، یہی وجہ ہے کہ خال خال ہی اکا دکا کوئی فرد ارکان سے رنگون جانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

دوران بقا چو باد صحراء بگذشت
تلخی وخوش وزشت وزیبا بگذشت

ترجمہ: صبح کی ہوا (بادنسیم) کی طرح زندگی گزر جائے گی، خوشی اور پریشانی کے ایام بھی گزر جائیں گے۔

حکومت برما نے قربانی پر یہ کہہ کر پابندی لگادی کہ اس سے جانور کا ضیاع ہوتا ہے، مالی نقصان ہوتا ہے اور کاشت کے بیل میں کمی آجاتی ہے، لیکن اب دباؤ کے تحت کچھ شرائط کے تحت قربانی کی اجازت دے دی گئی:

(الف) جانور سن رسیدہ ہو اور ہل جوتنے کے قابل نہ ہو۔ (ب) دبلا پتلا اور لاغر ہو۔ (ج) متعلقہ تھانہ سے اجازت نامہ حاصل کیا جائے۔ متعلقہ تھانہ سے اجازت نامہ حاصل کرنا خود ایک مشکل کام ہے۔ (د) برسر عام ذبح نہ کیا جائے۔ (ہ) بوقت مطالبہ متعلقہ تھانہ کے افراد کو گوشت اور کھال دے دی جائے۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

غرض شریعت مطہرہ کے لحاظ سے قربانی کے عدم جواز کے جو نقائص اور عیوبات ہیں وہ حکومت کے نزدیک ذبح کی شرائط ہیں۔

دریاؤں اور نمک کے خزانوں پر قبضہ:

سرزمین ارکان کے چھوٹے بڑے دریا مختلف النوع قیمتی مچھلیوں سے بھرے پڑے ہیں اور بعض زمینوں سے مختلف انداز میں مختلف طریقوں سے مختلف موسم میں نمک حاصل

کئے جاتے ہیں، لیکن اب ان سب پر حکومت کا کنٹرول ہے، اس سلسلے میں جو بھی کام درکار ہو وہ مسلمانوں سے مفت جبراً کرائے جاتے ہیں، ہر پروجیکٹ پر پولیس اور حکومت کے درندے متعین ہوتے ہیں جو نگرانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اگر موسمی اختلاف ودیگر وجوہات کے تحت مقررہ نمک اور مچھلیوں میں کمی آجائے تو بے چارے مسلمانوں پر چوری کا الزام لگا کر انہیں گرفتار کرلیا جاتا ہے، ارکان کے بہت سے لوگوں کا پیشہ مچھلی کا شکار ہے، اب چونکہ دریا پر حکومت قابض ہو چکی ہے اس لئے یہ لوگ اس پیشہ سے بھی محروم ہوگئے۔

دل مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں
ہوا ہوں اس قدر افسردہ رنگ باغ ہستی میں
ہوائیں فصل گل کی بھی نشاط افزا نہیں ہوتیں

پیسوں اور روپوں کی بندش:

جب حکومت نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پاس پیسے زیادہ آگئے تو اچانک پچاس، سو اور ہزار کے نوٹوں کی بندش کا اعلان کردیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اتنی مدت (بہت ہی کم مدت) میں رقم بینک میں جمع کرائی جائے، حکومت نئے نوٹ دے گی۔ مدت گزرنے کے بعد حکومت ذمہ دارانہ ہوگی، اس مہذب اور شائستہ ڈاکے سے ارکان کے متمول مسلمان پیسوں سے محروم ہوجاتے ہیں۔

جمع شدہ رقم کا عوض ملنا تو دور کی بات ہے بلکہ زیادہ رقم جمع کرانا ہلاکت اور مصیبت کو دعوت دینا ہے:

(ا) حکومت پیسہ جمع کرانے کے لئے جو مدت مقرر کرتی ہے وہ اتنی مختصر ہوتی ہے کہ

اس میں تمام لوگوں کا پیسہ جمع کرانا تقریباً محال ہے اور وہ بھی مخصوص اوقات میں جمع کرانے ہوتے ہیں۔۱۹۸۲ء کو جب نوٹوں کی بندش کا اعلان ہوا تھا تو میں نے خود دیکھا کہ منگڈو بینک کے سامنے بہت سے لوگ بستر لگائے پیسوں کی تھیلی لے کر روڈ اور نالوں کے کناروں پر پڑے ہوئے تھے تاکہ صبح جلدی لائن میں کھڑے ہوسکے۔

نیز پورے منگڈو میں ایک بینک ہے اور ۲۰۰۰ء میں ایک اور بینک وجود میں آیا، انڈا نگ کلوم سے بلی بازار اور تمبرو تک کے لوگوں کو یہاں رقم جمع کرانی ہے۔ یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا کہ وہ پیسوں کی تھیلی لے کر روڈ میں سوئے ہوئے تھے، مگھ ڈاکو اور اوباش قسم کے لوگ آکر تھیلی لے کر بھاگ گئے تھے اور یہ لاچار لوگ رو رہے تھے۔

(۲) ہر ایک کا بینک میں جاکر پیسہ جمع کرانا مشکل ہے کیونکہ وہاں کے بہت سے لوگ بینک کے قوانین اور چکروں سے ناواقف ہیں اور ہر گھر میں مرد بھی نہیں ہوتے بلکہ ان کے مرد بیرون ممالک ہوتے ہیں، اب خواتین کا بینک جانا اور پیسہ جمع کرانا ناممکن ہے۔

(۳) جمع کراتے ہی فوراً عوض نہیں دیا جاتا بلکہ وقت دیا جاتا ہے لیکن مقررہ وقت میں حاضر ہونے سے اسے بتایا جاتا ہے کہ رنگون سے اب تک پیسہ نہیں آیا، فلاں وقت میں آجاؤ، اس طرح وعدوں اور چکروں سے اسے تنگ کیا جاتا ہے لیکن پیسہ اسے نہیں ملتا اگر مل بھی جائے تو بہت ہی کم۔

(۴) جو لوگ پیشہ جمع کراتے ہیں ان کی الگ فہرست تیار کرلی جاتی ہے پھر انہیں سخت تحقیق وتفتیش کے مراحل سے گزارا جاتا ہے، ان سے اتنے سوالات کئے جاتے ہیں جن کے جوابات سے وہ عاجز ہوتے ہیں، مثلاً تمہاری نوکری کیا ہے؟ اتنی رقم کہاں سے کیسے ملی؟ بیرون ممالک تمہارے کون بندے ہیں؟ وہ کیسے وہاں گئے؟ اجازت کہاں سے لی؟

غرض ان کٹھن سوالات کے جوابات دینے کے بجائے وہ پیسہ جمع کراکر غائب

ہوجاتے ہیں، یوں وہ پیسوں سے محروم ہوجاتے ہیں، میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بوری بھر کر پیسہ جمع کرانے کے لئے منگڈو بینک لائے تھے لیکن پیسہ جمع نہ کراسکنے کی وجہ سے وہ لوگ پیسوں کی بوری واپس گھر لے جارہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہاں جمع کرانا بھی مشکل ہے اور جمع کرانے کے بعد بھی ملتا کچھ نہیں الٹا حساب کتاب کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس سے بہتر یہ ہے کہ ان روپوں سے سگریٹ اور بیڑی بنا کر استعمال کرلیں گے یا تکیہ بنا کر سوئیں گے۔

اس طرح کا شائستہ ڈاکہ وقتاً فوقتاً ڈالا جاتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خفیہ طور پر مگھوں کو رقم واپس دے دی جاتی ہے بلکہ ان کی فہرست بھی الگ بنتی ہے اور اوقات بھی الگ ہوتے ہیں، اس پابندی کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہوتا ہے اس بندش کی زد میں آکر مدارس کی جمع شدہ رقم زیادہ ضائع ہوجاتی ہے اس طرح کے واقعات ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کم از کم تین مرتبہ ہوئے۔

قدرتی پہاڑوں پر بھی حکومت کا قبضہ:

ارکان کے غریب لوگ قدرتی پہاڑوں سے لکڑی اور بانس وغیرہ کاٹ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں، چھری چاقو لے کر صبح پہاڑوں کی طرف جاتے ہیں، گرمی میں دن بھر لکڑیاں اور بانس کاٹتے ہیں اور شام کے وقت کاندھوں کے اوپر لے کر کئی میل پیدل چل کر گھر لاتے ہیں، پھر دوسرے دن صبح اس بوجھ کو لے کر شہر میں لے جاکر فروخت کرتے ہیں لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جس نے وہ لکڑیاں خریدیں، بیچنے والے غریب کی ذمہ داری میں یہ بھی ہے کہ وہ پھر کندھوں پر اٹھا کے خریدار کے گھر تک پہنچادیں اگرچہ وہ کئی کلومیٹر دور ہی کیوں نہ ہو۔

قارئین کرام! اندازہ لگائیں کہ اس غریب نے ایک دن ضائع کر کے وہ لکڑیاں پہاڑ سے لائیں، پھر کندھوں پر اٹھا کے کئی کلومیٹر پیدل طے کر کے اس کو شہر لے گئے پھر خریدار

کے گھر پہنچائیں۔

قارئین کرام! یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت حال کا اظہار ہے۔ میرے بھائی ماسٹر محمد قاسم خود انہی مراحل سے گزرے ہیں، وہ ہفتہ اور اتوار (یہ دونوں دن برما میں سرکاری طور پر تعطیل کے ایام ہیں) کو پہاڑ پر جا کر لکڑیاں لاتے اور پیر کو اسکول جاتے وقت کتابوں کی تھیلی اور لکڑی کا بوجھ لے کر پہلے منگڈو شہر جاتے تھے پھر فروخت کر کے اسکول حاضر ہوتے تھے، چونکہ آٹھ بجے صبح اسکول حاضر ہونا ہے اس لئے صبح اذان سے پہلے وہ گھر سے نکل جاتے تھے، پہلے منگڈو شہر جا کر لکڑی فروخت کرتے پھر پیسہ جیب میں لے کر آٹھ بجے شقدار پاڑہ اسکول حاضر ہوتے تھے، پھر چار بجے شام جب اسکول کی چھٹی ہو جاتی تھی تو وہ پھر منگڈو شہر پیدل جا کر اشیاء خورد ونوش خریدتے تھے پھر گھر آتے تھے، وہ بمشکل عشاء تک گھر پہنچتے تھے، ہم سب ان کے انتظار میں ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے آنے سے چاول آئے گا پھر پکے گا، پھر ہم کھائیں گے، اس رقم سے تعلیمی خرچہ بھی بچا کر رکھنا ہے تا کہ قلم، کاغذ اور کتابیں وغیرہ خریدی جاسکیں، خدا کی قسم! وہ صبح سویرے پہاڑوں کی طرف جاتے تھے اور عشاء کے بعد لکڑیاں لے کر گھر واپس آتے تھے، بسا اوقات جب زیادہ رات ہو جاتی تھی تو والدہ محترمہ عشاء کی نماز پڑھ کر جائے نماز میں بیٹھ کر روتی تھیں اور دعاء کرتی تھیں، یا اللہ! میرے بیٹے کو شیر اور حکومت کے درندوں سے بچا کر جلدی گھر بھیج دیجئے۔ جب وہ واپس آتے تھے تو پھر ہمارے چہروں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔

میں تو صرف کلیجہ بھانگہ کی بات کر رہا ہوں، بے شمار طلبہ کو اربیل اور منگنامہ سے پیدل شقدار پاڑہ آتے تھے پھر پڑھ کر واپس پیدل جاتے تھے اور بہت سے لکڑ ہارا لکڑی اور بانس کے بوجھ لے کر منگنامہ سے منگڈو پیدل آتے پھر اسے خریدار کے پاس چھوڑ نے شجاع پاڑہ و دیگر علاقوں میں جاتے تھے، منگنامہ سے منگڈو تک کم از کم دس بارہ کلومیٹر ہوں گے۔ پیدل تین گھنٹے کا سفر ہے۔ پھر منگڈو سے شجاع پاڑہ تک دو تین میل کا سفر ہے، گویا وہ غریب

لکڑ ہارے نے دس پندرہ کلو میٹر پیدل پر مشقت راستہ طے کر کے ایک دن لکڑی لائی اور دوسرے دن پندرہ بیس میل راستہ طے کر کے لکڑی فروخت کی اور رقم لے کر گھر کی ضروریات لائے، اگر وہ رقم راستہ میں حکومتی شیطانوں کے حوالے ہو جائے تو کیسا لگے گا، لیکن اب تو حکومت نے پہاڑوں پر قبضہ کر لیا تا کہ یہ غریب لوگ لکڑی کاٹ کر بھی پیٹ نہ پال سکے۔

قبرستان کو بھی نہیں بخشا گیا:

ظالم برمی حکومت نے مسلمانوں کے قبرستانوں کو بھی نہیں بخشا بلکہ ۱۹۸۲ء میں ان قبرستانوں پر یہ کہہ کر قبضہ کر کے ان میں مختلف النوع درخت اور پودے لگا دئے اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم بھی بدھوں اور ہندوؤں کی طرح مردوں کو جلا کر حوالہ دریا کر دیا کرو۔ اس سیاہ قانون کے تحت بہت سے قبرستانوں پر قبضہ کیا جا چکا ہے جیسے ناکپورہ جھمنک کھالی، تنگ بازار وغیرہ کے قبرستان۔ ایسے بہت سے قبرستانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خوب رویا۔

دھوکہ دہی کا ایک نرالا طریقہ اور آزادی کا اقرار نامہ:

جب برمی حکومت نے مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے میں اخلاقی اور انسانی سرحدیں پار کر لیں اور مظالم کی تھوڑی بہت جھلک دنیا کے سامنے آنے لگی تو انسانی حقوق کی جماعتوں، مسلم تنظیموں اور انصاف پسند ملکوں نے سخت ردعمل ظاہر کیا اور برما کو اس غیر اخلاقی سلوک سے باز آنے کی ہدایت کی بصورت دیگر پابندیاں عائد کرنے کی دھمکیاں دیں۔ اب برما کو بھی فکر ہوئی کہ ہماری خوب بدنامی ہو رہی ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم عالمی برادری سے کٹ کر تنہا ہو جائیں اور اقتصادی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے، اس پابندی اور بدنامی سے بچنے کے لئے حکومت برما نے مختلف النوع حربے استعمال کرنا شروع کر دئے۔

(۱) ریڈیو اور اخبارات میں مضامین نشر اور شائع کرنے لگے کہ برما کی ہر اقلیت کو مکمل مذہبی آزادی، انسانی رواداری اور امن وامان کی زندگی میسر ہے، اس غرض کے حصول کے

لئے برمانے زرخرید ناقص الفہم مسلمانوں کی خدمات حاصل کیں۔

(۲) بہت سے مسلمانوں سے جبراً قہراً من گھڑت مضامین اور بے سروپا بیانات لئے گئے جن کو ویڈیو اور ریڈیو میں محفوظ کرکے اطراف عالم میں پھیلا رہی ہے تاکہ یہ تاثر دیا جاسکے کہ یہاں مسلمانوں کو مکمل مذہبی اور انسانی آزادی حاصل ہے۔

مولانا مفتی عبدالشکور گارڈ بیلوی صاحب یکم جولائی ۲۰۰۱ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ جون ۲۰۰۱ء میں رنگون سے ایک سرکاری وفد آکر منگڈو کے ملحقہ علاقوں میں سے ہر علاقہ سے پچاس پچاس سرکردہ مسلمانوں (اوکاٹا، سکریٹری وغیرہ) کو جمع کیا اور سب کو ایک ایک تحریری کاغذ کی فوٹو کاپی پکڑوادی اور انہیں ہدایت دی گئی کہ سب حضرات کھڑے ہوکر اس تحریر شدہ کاغذ کو اس طرح ہاتھ میں لیں کہ دیکھنے والا یہ سمجھ جائے کہ یہ لوگ زبان ہلاکر یہ مضمون پڑھ رہے ہیں۔

اس کے بعد اوپر ویڈیو نصب کیا گیا تاکہ یہ دلگداز منظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہاں محفوظ ہوجائے، اس کے بعد اوکاٹا شمس العالم کو ہدایت دی گئی کہ آپ اس مضمون کو زور زور سے پڑھیں اور بقیہ حضرات ہونٹ ہلائیں تاکہ دیکھنے والا سب کو قارئین سمجھے۔ چنانچہ اوکاٹا شمس العالم نے مجبوراً مجمع عام اور ویڈیو کے سامنے تحریر شدہ کاغذ بلند آواز سے پڑھ کر سنایا اور آواز ویڈیو میں محفوظ ہوگئی، مضمون مندرجہ ذیل ہے: ہم عرصہ دراز سے منگڈو ٹاؤن شپ اور ارکان کے دیگر علاقوں میں مقیم ہیں، ہم روہنگیا قوم نہیں ہیں بلکہ مسلم قوم ہیں، موجودہ وسابقہ حکومت سے بغاوت کرکے جو مسلمان دیگر ممالک میں پناہ لئے ہوئے ہیں وہی روہنگیا قوم ہیں جو باغیوں کا ایک فسادی ٹولہ ہے۔

اب حکومت اس منظر کو دنیا کے سامنے پیش کرکے دنیا کو یوں باور کرارہی ہے کہ دیکھو! ارکان برما کے مسلم باشندے خود اقرار کررہے ہیں کہ ہمارا سب کچھ آزاد ہے اور ہمیں مذہبی وانسانی حقوق حاصل ہیں۔

عیسائی اسپتال اور ان میں عیسائی مہر:

شقدار پاڑہ میں ایک مشہور اسپتال ہے جہاں جدید تقاضوں کے مطابق علاج کے متعلقہ تقریباً ہر قسم کے آلات، اوزار، دوائیاں اور ممکنہ طبی سہولیات حاصل ہیں، یہاں فیس بھی کم ہے اور عملہ وکارکنان بھی بے انتہا بااخلاق ہیں، غریب لوگ اور نادار افراد یہاں علاج کے سلسلے میں جاتے ہیں، چونکہ مجھے معلومات حاصل کرنی تھیں اس لئے میں بھی مریض بن کر بازاری لباس میں ملبوس ہوکر جنوری ۲۰۰۱ء میں بغرض علاج پہنچ گیا، وہاں موجود کارکنوں اور نرسوں (عیسائی خواتین) نے جس حسن سلوک سے میرا معائنہ کیا میں اگر اسے فراموش کرنا چاہوں تو نہیں کرسکتا، یوں محسوس ہورہا تھا کہ یہ نرسیں میری قدیم خادمائیں ہیں جو میرے لئے جان قربان کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ میں ایک میز کے قریب کرسی میں بیٹھ گیا جہاں انگریزی، برمیز اور اردو زبان میں مختلف النوع لٹریچر اور کتابچے ہیں جن میں خوبصورت تصاویر، دعائیں اور عیسائی مذہب پر مشتمل مضامین ہیں، جو شخص ان کتابچوں کو پڑھے گا اور عملہ کے اچھے اخلاق کا مشاہدہ کرے گا تو اس کا دل خودبخود عیسائیت کی طرف مائل ہوجائے گا، وہاں موجود ایک جہاندیدہ شخص نے بتایا کہ ڈاکٹر لوگ پہلے مریضوں کو غلط دوائیاں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، اس طرح دو تین دن گزر جاتے ہیں لیکن بیماری صحیح نہیں ہوتی کیونکہ دوائی غلط ہے جس کا اندازہ مریضوں کو نہیں ہوتا، اس کے بعد صحیح دوائیاں دی جاتی ہیں اور انہیں تلقین کی جاتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور پوپ کا نام لے کر استعمال کرو۔

چنانچہ مریض ایسا کرتے ہی فوراً شفایاب ہوجاتے ہیں، اب ان کا ذہن یہ بن گیا ہے کہ اللہ کے نام سے کچھ نہیں ہوتا سب کچھ عیسیٰ کی برکت اور پوپ کی دعاء سے ہوتا ہے اور مسلمانوں سے عیسائی لوگ اچھے ہیں اور ان کا مذہب صحیح ہے ورنہ یہ لوگ اتنے بااخلاق

کیوں؟ جولوگ عیسائی بن جاتے ہیں ان کواوران کے خاندان کووافر مقدار میں مدددی جاتی ہے اوران کے رانوں میں ایک مہر لگادی جاتی ہے جوعیسائی ہونے کی نشانی ہوتی ہے،اس طرح مریضوں کے ساتھ بھی بے خبری میں ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔

یہ راز اس وقت آشکارا ہوا جب ایک شخص کا انتقال ہوااوراسے لے جانے اور دفنانے کے لئے عیسائی گاڑی پہنچ گئی،مسلمان وارثین کا کہنا تھا کہ یہ مسلمان ہے اس لئے اسے مسلم قبرستان میں دفنایا جائے گا،عیسائیوں کا کہنا تھا کہ یہ ہم سے مدد لیتا تھااور عیسائی بن گیا تھا نشانی مہر ہے،جواس کی ران میں لگی ہوئی ہے،جب کپڑے اتار کر دیکھا گیا تو واقعتہً مہر لگی ہوئی تھی،خدا کی قسم یہ مہر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی البتہ میں نے جو مہر دیکھی وہ ایک چھ سالہ لڑکی کے پیٹ میں تھی۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ ارکانی لوگ اسپتال کے نام سے بھی ناواقف تھے،صرف منگڈو ٹاؤن میں ایک سرکاری بلکہ نیم سرکاری اسپتال تھا جہاں تک کی رسائی بہت مشکل تھی،عموماً غیر قانونی ڈاکٹر حضرات چوری چھپے گھر گھر جا کر علاج کرتے تھے،خود میرے والد صاحب کا شمار ایسے ڈاکٹروں میں ہوتا ہے،لیکن اب زمانہ بدل گیا،جگہ جگہ عیسائیوں کے اسپتال قائم ہوگئے۔ جہاں طبی سہولیات تو ہیں لیکن ارتدادی جال بھی ہے۔ یاد رہے کہ مہر میں صلیب کا نشان ہوتا ہے۔(ماہنامہ ’’الصحیۃ‘‘ چارسدہ پشاور،جنوری ۲۰۰۱ء)

بندرگاہ اور مسلم خواتین:

منگڈو ٹاؤن کی بندرگاہ بہت مشہور ہے، بلی بازار، اکیاب، بوسیدنگ اور بنگلہ دیش جانے کے لئے بحری جہاز یہاں سے روانہ ہوتے ہیں،لیکن یہاں تحقیق وتفتیش کا جو مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ قیامت کا منظر پیش کرتا ہے خصوصاً مسلم خواتین کے ساتھ انتہائی بدترین سلوک کیا جاتا ہے،انہیں ہر ممکن حربہ سے بے پردہ اور بے آبرو کیا جاتا ہے،تحقیق وتفتیش کے

بہانے انہیں الگ کمرہ میں لے جا کر حیاء سوز طریقے سے ان کی تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ وہ بھی نصف بدن کھلوا کر،خود میرے رشتہ دار خواتین ان مشکل مراحل سے گزر چکی ہیں۔

محترمہ...... نے مجھے بتایا کہ یوں کہہ کر کپڑے اتارے جاتے ہیں کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تمہارے ران اور پستان کے قریب ہیروئن اور افیون وغیرہ ہے،کھول کر دکھاؤ،جب غیر تعلیم یافتہ بے زبان خاتون ہیروئن اور افیون کا نام سنتی ہے جس کی سزا قید وبند کی صورت میں ملتی ہے تو مجبوراً فوراً کپڑے کھول کر دکھلانے پر مجبور ہوتی ہے ورنہ اسے مختلف دیگر الزامات میں پھنسا کر بے آبرو کیا جائے گا۔ پھر اس دوران تصویر کھینچ لی جاتی ہے اور بھی بہت کچھ۔

محترمہ...... نے بتایا کہ اگر ڈاکو کسی پاکدامن دوشیزا کو اغوا کر کے لے جائے پھر ہفتہ عشرہ کے بعد اس خاتون کو واپس والدین کے پاس چھوڑ دے اور اس خاتون سے حالت اغوا کی تفصیل پوچھی جائے تو وہ مجبوراً یوں کہے گی کہ میری عزت اور عفت پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا بلکہ مجھے الگ کمرے میں رکھا گیا تھا،ڈاکوؤں کا مقصود تو پیسہ تھا اور میرے والدین بھی حتی الامکان اس واردات کو چھپائیں گے کیونکہ مشہور مقولہ ’’ماضٰی فیہ قضی‘‘ جو ہوا سو ہو گیا، کے مصداق جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا،اب کہنے سے عزت تو لوٹ کر نہیں آئے گی اور نہ ہی ان ظالموں سے انتقام لیا جا سکے گا۔ بلکہ خواہ مخواہ تفصیل بتا کر بدنامی اپنے سر پر لینی ہے اور خاتون کی شادی کو ناممکن بنانا ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ حکم الٰہی سمجھ کر اسے چھپا دیا جائے۔

دوستو آپ یقین کریں یا نہ کریں حالات یہی ہیں،ورنہ ارکان میں کتنی ہی وارداتیں ہو رہی ہیں اور کتنی ہی ماؤں اور بہنوں کی عفتیں تار تار کی گئیں اور کی جا رہی ہیں لیکن دنیا اب تک ان سیاہ کارناموں پر مطلع نہیں ہے اور نہ ہی قارئین وسامعین ایسی باتوں کو سمجھنے اور یقین کرنے کے لئے تیار ہیں،کوئی یقین کرے یا نہ کرے ہم نے مشاہدہ کر کے بلاکم وکاست پوری تفصیل بتا دی،سوہم نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی۔

بیع وفروخت کا ایک ظالمانہ طریقہ:

جنوری ۲۰۰۱ء کو میں نے وہاں دیکھا کہ گنجان مسلم آبادیوں کے درمیان مگھ بستیاں اوران کی کھیتیاں ہیں، کھیتوں میں خربوزے، تربوز، کھیرا وغیرہ ہیں اور باغات میں آم، جامن ودیگر مختلف النوع پھل لدے ہوئے ہیں، دریافت کرنے پر معتمد علیہ لوگوں نے بتایا کہ یہ زمینیں مسلمانوں کی ہیں، جوان سے مختلف الزامات کے تحت چھین لی گئیں۔

مسلمانوں سے زمینیں لے کر مگھوں اور بدھوں کو دے دی گئیں، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ کاشت کے سلسلے میں نووارد مگھوں سے مکمل تعاون کیا جائے، ہل جوتنے کے آلات، کھاد ودیگر ضروریات فراہم کئے جائیں، ورنہ سخت ترین سزا دی جائے گی، چنانچہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔

زمین مسلمانوں کی، محنت ومشقت فرزندان توحید کی، لیکن پھل مگھوں کے، اب جب کہ کھیتوں اور باغوں میں مختلف النوع سبزیاں، ترکاریاں اور پھل فروٹ پیدا ہوتے ہیں تو مسلمان للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ تو سکتے ہیں لیکن خرید کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ دوسری طرف چونکہ وہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لئے خریدنے والے بھی مسلمان ہیں، اگر مسلمان نہ خریدیں تو یہ چیزیں ضائع ہو جائیں گی۔

اب جب حکومت نے دیکھا کہ مسلمان پھل فروٹ اور سبزیاں مگھوں سے نہیں خرید رہے ہیں جس سے مگھوں کا اچھا خاصہ نقصان ہو رہا ہے اور یہ چیزیں دور دراز علاقوں تک لے جانا بھی مشکل ہے کیونکہ دیہات بلکہ ٹاؤن میں بھی گاڑیوں کا انتظام نہیں ہے۔ اس لئے اب حکومت یہ طریقہ اپنا رہی ہے کہ فصل تیار ہونے کے بعد ہر گھر میں دس پندرہ کلو کے حساب سے پھل فروٹ دے کر چلی جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کی اتنی رقم ہے، ہم رقم لینے فلاں تاریخ کو آئیں گے۔ اس میں انکار کی گنجائش نہیں ہے، یوں جبراً مسلمانوں کو وہ

مجموعہ القاسم: جلد ششم — تیری عظمتوں کو سلام

سامان خریدنے پر مجبور کیا گیا۔

کھیتوں اور باغوں میں تو بیع وفروخت کا یہ ظالمانہ طریقہ اپنایا گیا ہے، لیکن پرچون کی دکان، جنرل اسٹور، کپڑے کی دکان وغیرہ میں بیع وفروحت کا دوسرا طریقہ روا رکھا گیا ہے، حکومت کے اہلکار مسلم دکانداروں سے سامان خرید کریا تو رقم دیتے نہیں اگر دینا بھی پڑے تو رنگون کے نرخ کے حساب سے رقم ادا کرتے ہیں، حالانکہ مسلم دکانداروں کو اس نرخ پر یہ سامان ملا ہی نہیں کیونکہ ان کو سامان لانے میں ٹیکس، رشوت، اجازت نامہ کے حصول میں رقم، دکان کا کرایہ، ٹاؤن شپ ٹیکس، چوکیدار ٹیکس اور گاڑی کا کرایہ وغیرہ زائد پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں تو یہ بے چارے رنگون کے نرخ پر سامان کیسے فروخت کریں گے۔

داڑھی رکھنا ممنوع اور غیر اللہ کو سجدہ ضروری ہے:

مولانا مفتی عبدالشکور گارڈ بیلوی صاحب اپنے ایک مکتوب مورخہ یکم جولائی ۲۰۰۱ء میں لکھتے ہیں کہ ارکان اسٹیٹ نمبر۲ حکمران اعلیٰ لیفٹیننٹ جنرل...... سرکاری دورے پر منگڈو آیا اور منگڈو کے جملہ سرکاری عہدیداروں، علاقوں کے سرگرداں اراکین وعمائدین سلطنت کے سامنے مندرجہ ذیل قوانین کا اعلان کیا:

(۱) سرکاری ونیم سرکاری تمام عہدیداروں کے لئے داڑھی رکھنا ممنوع ہے، جن کی داڑھیاں ہیں انہیں ایک ماہ کی مہلت دی جارہی ہے، ایک ماہ کے اندر اندر داڑھی صاف کرلی جائے ورنہ انہیں عہدوں سے معزول کردیا جائے گا۔

(۲) ہر سرکاری دفاتر، اسکولز وغیرہ کے دروازوں پر گوتم بدھ کا مجسمہ نصب کیا گیا جس کے سامنے گزرتے وقت رکوع وسجدہ کی حالت میں گزرنا ضروری ہوگا، خلاف ورزی کی صورت میں سخت ترین سزا دی جائے گی۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ سرکاری اسکولوں میں ہر صبح وشام برمی آزادی کے ترانے پڑھے جانے کے وقت تمام طلبا واساتذہ پر ضروری ہے کہ

جھک کر رکوع کی حالت میں برمی پرچم کی تعظیم کریں۔

یہی حال کاکس بازار بنگلہ دیش کے کیمپوں میں مقیم ارکانی مسلمانوں کا ہے، راقم الحروف نے شوال المکرّم ۱۴۲۱ھ مطابق جنوری ۲۰۰۱ء میں ان کیمپوں کا تفصیلی دورہ کیا اور تصویریں بھی کھینچ کر لائیں، کیمپوں کا دروازہ بمشکل سوا تین ہاتھ ہے، اندر جاتے وقت رکوع کی حالت میں جانا پڑتا ہے، بندہ خود اس طرح داخل ہوا جس کی تفصیل ''الرباط'' شمارہ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ/مئی ۲۰۰۱ء میں آچکی ہے۔ گویا یہ سب کچھ غیر مرئی طور پر غیر اللہ کو سجدوں کے مختلف النوع طریقے ہیں۔

ان مسجدوں کی محرابیں اور مینارے کہاں؟:

ریاض سعودی عرب سے شائع ہونے والے رسالہ ''الدعوۃ'' کی ایک رپورٹ سے یہ دلچسپ اور حقیقت پسندانہ انکشاف ہوا ہے کہ فرانسیسی وزارت داخلہ نے اپنی ایک رپورٹ میں اعتراف کیا ہے کہ جس محلّہ میں مسلمان مساجد تعمیر کرتے ہیں وہاں جرائم حیرت انگیز طور پر کم ہوجاتے ہیں اس لئے فرانسیسی حکومت مسلمانوں کو مساجد تعمیر کرنے کے لئے خوشی سے اجازت دے رہی ہے۔ (تعمیر حیات لکھنؤ - جون ۲۰۰۱ء صفحہ ۲۵)

لیکن اس کے برخلاف حکومت برما ارکان برما کی مسجدوں اور مدرسوں کو مسمار کرنے میں مصروف ہے، اگست ۲۰۰۱ء میں حکومت برما نے واشگاف الفاظ میں مندرجہ ذیل قوانین کا اعلان کیا ہے۔

(۱) ہر محلّہ (چھوٹا ہو یا بڑا) میں ایک مسجد کی اجازت ہے وہ بھی بغیر محراب اور بغیر میناروں کے، اگر کسی علاقہ میں ایک سے زائد مسجدیں ہیں تو انہیں توڑ دیا جائے گا چنانچہ اس پر عمل شروع ہو چکا ہے۔

(۲) منگڈو سے لے کر شمال کی طرف تمبرو تک تین مدارس باقی رکھے جائیں گے۔

اسی طرح منگڈو ٹاؤن سے انڈانگ تک بھی صرف تین دینی اداروں کو باقی رکھا جائے گا ان کے علاوہ دیگر مدرسوں اور اداروں کو مسمار کر دیا جائے گا۔ (العیاذ اللہ)

شناختی کارروائی اور بے پردگی:

قارئین کرام اس وقت (۳۱/جولائی ۲۰۰۱ء مطابق ۹/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ) میرے سامنے محترم مولانا کبیر احمد بن عبدالرحیم وارنچنگی (سیوجا، برمی زبان میں) بوسیدنگی اور ان کی والدہ محترمہ ام خدیجہ صاحبہ کی طرف سے آمدہ مراسلہ پڑا ہوا ہے، آدھا خط پڑھا اور بقیہ نصف پڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے، مولانا لکھتے ہیں کہ ہم بوسیدنگ کی مشہور بستی وارنچنگ (سیوجا) کے رہنے والے ہیں، کچھ عرصہ سے یہاں شناختی نامی آپریشن ہو رہا ہے، اس آپریشن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سال میں ایک مرتبہ اچانک حکومت کے اہلکار بستی میں موجود اسکول اور مدرسہ کے دفاتر میں آکر اعلان کرتے ہیں کہ آج شناختی ہوگی، ہر گھر کا ہر فرد دفتر میں آکر حاضری دے، چنانچہ حسب ہدایت مرد، عورت، بچے اور بوڑھے سبھی فوراً حاضر ہو جاتے ہیں اس کے بعد نام پکار پکار کر ایک ایک کو ہزاروں لوگوں کے سامنے بلایا جاتا ہے اور اس سے انٹرویو لیا جاتا ہے، کہ نام کیا ہے؟ والد کا نام کیا ہے؟ کس بستی کے رہنے والا ہے؟ کس باغی جماعت سے تعلق ہے؟ کس کس باغی جماعت یا باغیوں (مجاہدین) کا علم ہے؟ وغیرہ وغیرہ سوالات۔

باشندگان برما کے بائیں ہاتھ کے بازو پر شناختی نشانی (دو نشانیاں جو انجکشن اور ٹیکہ لگوا کر ثبت کی جاتی ہیں) ہوتی ہے، قمیص اتار کر وہ نشانی دیکھی جاتی ہے اور عورتوں کو بے پردہ کر کے حیاء سوز انداز میں ہزاروں نامحرم مردوں کے سامنے بے آبرو کر کے نشانی دیکھی جاتی ہے، اگر کوئی مرد یا عورت غیر حاضر رہے یا پردہ اور قمیص اتارنے میں پس و پیش کرے تو اسے نشان عبرت بنا دیا جاتا ہے، بہت سی باپردہ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو اول مرحلہ میں ہزاروں اجنبی مردوں کے سامنے برقعہ اور پردہ اتارنے میں ہچکچاتی ہیں، انہیں فوراً حوالہ

زندان کردیا جاتا ہے یا عبرتناک سزادی جاتی ہے۔

ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ مطابق جولائی ۲۰۰۱ء میں بھی حسب معمول شناختی کارروائی ہوئی، اس شناختی کارروائی میں جب مولانا جمال حسین صاحب، مولوی شبیر احمد اور محترمہ سلمہ خاتون بنت عمر سلطان وارتھنگی نے معمولی سا پس وپیش سے کام لیا تو انہیں انتہائی زدوکوب کے بعد کال کوٹھری میں ڈال دیا۔ اسی طرح جب مولانا حمید اللہ بن مولانا الیاس اور ان کی زوجہ محترمہ نے قمیص اور برقعہ اتارنے میں لیت ولعل سے کام لیا تو انہیں برسرعام ننگا کیا گیا اور خوب پٹائی گئی۔ آخر میں مولانا لکھتے ہیں کہ آہ میں اپنی کہانی کس کو سناؤں اور کون سنے میری اور میری والدہ (اسی طرح دیگر بہنوں) کی حالت اس سے بھی بدتر صورت میں ظاہر ہوئی جس کا تذکرہ کرنا دوسروں کو رلانا ہے۔

رجسٹریشن اور حصول پرمٹ:

برمی حکومت نے روہنگیا مسلمانوں کے لئے رجسٹرین اور پرمٹ کا کالا قانون جاری کیا، ہر کام کی رجسٹریشن ہو اور پرمٹ حاصل کیا جائے، اگر کوئی مہمان آجائے یا مہمان رات گزارنا چاہے تو بغیر پرمٹ نہیں ہوسکتا، گھر میں کتنے جانور، گائے، بیل، مرغیاں اور بکرے وغیرہ ہیں ان کے لئے بھی پرمٹ اور رجسٹریشن ہو، شادی بیاہ، قربانی، گائے وبکرے ذبح کرنا، ایک بستی سے دوسری بستی جانے کے لئے رجسٹرین اور پرمٹ چاہئے۔ گھر کی مرمت، مسجد ومدرسہ کی مرمت وتعمیر کے لئے رجسٹریشن اور پرمٹ چاہئے، غرض کوئی بھی کام بغیر رجسٹریشن اور پرمٹ کے نہیں ہوسکتا اور رجسٹریشن وپرمٹ کے حصول کے لئے بطور رشوت بھاری رقم دینی پڑتی ہے اور اچھا خاصہ وقت بھی لگتا ہے۔

جبری مزدوری:

حکومت کو کوئی بھی کام کرنا ہو تو اس کے لئے روہنگیا مسلمان بلائے جاتے ہیں اور

مفت کام لیا جاتا ہے، انکار پر موت کی سزا متعین ہے، سڑکیں تعمیر کرنے، فوجی چھاؤنیاں بنانے، مگھ بستیاں بسانے، پل بنانے، فوج کے ساز وسامان منتقل کرنے، ڈیم بنانے، حکومتی دفاتر تعمیر کرنے اور ہر بستی میں رات کو چوکیداری دینے میں مسلمانوں سے مفت کام لئے جاتے ہیں، لیکن پیسہ تو دور کی بات ہے کھانا بھی گھر سے لے جانا پڑتا ہے جس کا مشاہدہ راقم متعدد بار کرچکا ہے، گویا یہ لوگ حکومت کے غلام ہیں اس لئے انہیں ہر وقت کام میں مصروف رکھنا ہے۔

صدر ایوب خان، کرنل قذافی، صدر ضیاء الرحمٰن اور ارکان:

تاریخ میں ایسے چند مسلم سربراہوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے ارکانی وروہنگیا مسلمانوں کی مدد اور حمایت کی خاطر برمی حکومت سے ٹکر لینے کی کوشش کی لیکن نیرنگئی تقدیر کے تحت اس کی نوبت نہیں آسکی، وہ مسلم حکمران درج ذیل ہیں۔

(۱) صدر ایوب خاں: صدر محمد ایوب خان نے پاکستان میں ۲۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۵/مارچ ۱۹۶۹ء تک حکومت کی، ان کے دور میں جب روہنگیا مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے تو صدر محمد ایوب خانؒ نے یہ بیان جاری کیا ’’کیا برمی حکومت یہ پسند کرے گی کہ ہماری فوج صبح ڈھاکہ سے روانہ ہو اور غروب آفتاب سے قبل رنگون پہنچ جائے‘‘ اس بیان کا اثر یہ ہوا کہ جب تک ایوب خان حکمران تھے تب تک روہنگیا مسلمانوں پر مظالم بہت کم ہوئے۔

(۲) قذافی: معمر کرنل قذافی نے لیبیا میں ستمبر ۱۹۶۹ء سے ۲۰/اکتوبر ۲۰۱۱ء تک حکمرانی کی اور ضیاء الرحمٰنؒ نے بنگلہ دیش میں ۱۹۷۷ء سے ۲۰/مئی ۱۹۸۱ء تک حکمرانی کی، ان دونوں مسلم حکمرانوں نے بھی روہنگیا مسلمانوں کی مدد کرنے حکومت برما کو سبق سکھانے اور ارکان کو آزاد کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا لیکن اسے عملی جامہ پہنایا نہیں جاسکا، اس کی تفصیل

یہ ہے کہ ۱۹۷۸ء کو جب برمی حکومت نے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف ''ناگامن آپریشن'' شروع کیا جس کے نتیجے میں ایک لاکھ مسلمان شہید اور پانچ لاکھ بے گھر ہوئے، تو کرنل قذافی نے صدر ضیاءلرحمٰن کو یہ پیغام دیا کہ برمی حکومت کے خلاف جہاد شروع کرنے کے لئے جملہ جنگی ساز وسامان، آلات حرب وضرب اور اخراجات میں برداشت کروں گا اور تم افراد تیار کرکے ارکان کے اندر داخل کردو، چونکہ یہی خواہش صدر ضیاء الرحمٰنؒ کی بھی تھی اس لئے انہوں نے اس پیغام کو غنیمت سمجھا اور اس کی کوشش شروع کردی۔ صدر ضیاء الرحمٰنؒ نے سب سے پہلے بنگلہ دیش کے خطیب اعظم وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام مولانا صدیق احمد چاٹگامیؒ، متوفی ۲۱رمضان ۱۴۰۷/ اپریل ۱۹۸۷ء کو بلایا اور تبادلہ خیال کے بعد ان سے کہا کہ بنگلہ دیش میں موجود ارکانی جماعت ''روہنگیا جمعیت علماء'' اور R.P.F کے قائدین کو اعتماد میں لے کر جہاد ارکان کا آغاز کردیا جائے، ان کو یہ پروگرام دے کر بنگلہ دیشی آرمی کو پروگرام دیا کہ بنگلہ دیش کے مہاجر کیمپوں میں موجود روہنگیا نوجوانوں کی عسکری تربیت شروع کردی جائے تاکہ یہی لوگ قریبی مدت میں ارکان کے اندر جاکر جہاد شروع کرسکیں۔

حسب ہدایت مہاجر کیمپوں میں نوجوانوں کی عسکری تربیت جوش وخروش سے شروع ہوگئی اور مولانا صدیق احمدؒ نے روہنگیا جمعیت علماء کے قائدین مولانا محمد عقیل صاحبؒ اور مولانا عبدالقدوس مظاہریؒ وغیرہ کو بلاکر پوری تفصیل بتائی اور فرمایا کہ جہاد ارکان علماء کی قیادت میں ہوگا، البتہ R.P.F کے حضرات کو ملاکر رکھنا ہوگا تاکہ وہ لوگ مخالفت نہ کریں، اس کے بعد مولانا صدیق احمدؒ نے جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مذکورہ دونوں جماعتوں کے قائدین پر مشتمل ایک حتمی اور آخری فائنل میٹنگ رکھی جس میں جہاد ارکان کے آغاز سے متعلق ایک متفقہ معاہدے میں روہنگیا جمعیت علماء کے قائدین اور R.P.F کے قائد بی اے جعفر حبیب کو دستخط کرنے ہیں، اس کے بعد ارکان میں جہاد کا آغاز کرنا ہے، لیکن اس

حتمی میٹنگ میں جعفر حبیب نہیں آئے بلکہ انہوں نے اپنا نمائندہ غفار کو بھیج دیا، اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کسی بھی حکمت کے تحت جعفر حبیب جہاد ارکان میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے اس لئے دستخط کی خاطر وہ خود نہیں آئے، اس پر خطیب اعظم مولانا صدیق احمدؒ نے فرمایا کہ آج سے جہاد ارکان کے آغاز تک برمی حکومت کے ہاتھوں جو روہنگیا مسلمان مارے جائیں گے ان کا خون جعفر کی گردن پر ہوگا، یوں جہاد ارکان کا آغاز نہ ہوسکا اور روہنگیا مسلمان اب تک ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی ایک جھلک:

آزادی برما کے سلسلے میں جس طرح مسٹر اونگ سائینگ نے قربانیاں دیں اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے محبوب قائد مسٹر عبدالرزاق (سیاجی) کی قیادت میں جانوں کا نذرانہ پیش کیا بلکہ یہ نہتے مسلمان آزادی کے ہراول دستہ میں شامل تھے جس کا اقرار خود مسٹر اونگ سانگ اور مسٹر اونو نے کیا تاہم شروع ہی سے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں سے ناروا سلوک کیا گیا اور انہیں ہر حکومتی عہدوں سے باہر رکھا گیا۔

یوں تو ارکانی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی فہرست بے حد طویل ہے جس پر راقم کی مستقل کتاب ہے، تاہم بطور نمونہ چند اہم تاریخی واقعات اور خون آلود حادثات کا اجمالی خاکہ پیش کررہے ہیں تاکہ عالم اسلام کے باشندوں کو معلوم ہو کہ کرۂ ارض میں ارکانی اور روہنگیا مسلمانوں سے زیادہ مظلوم اور کوئی قوم نہیں ہے اس لئے یہ مقہور مسلمان عالم اسلام کی توجہ اور مدد کے زیادہ مستحق ہیں۔

(۱) ۱۷۸۵ء میں برمی راجہ بودوپھیہ کے حکم پر ہزاروں ارکانیوں کو مانڈلے میں ''منگون پگوڈا'' تعمیر کرنے کے لئے لے جایا گیا پھر مزید تین ہزار کو ''مکٹیلا جھیل'' کھودنے کے لئے لے جایا گیا لیکن ان میں سے ایک بھی واپس نہیں آیا۔

(۲) ۱۷۸۷ء کے لگ بھگ حکومت برما کے مظالم سے تنگ آ کر پچاس ہزار ارکانیوں نے چاٹگام کی طرف ہجرت کی۔ جب کہ راجہ کی فوج نے مساجد و مدارس کو شہید کر ڈالا، علماء کو قتل کیا اور اسلامی لائبریریوں کو جلا ڈالا، مؤرخین کے مطابق ۱۷۸۴ء سے ۱۸۲۴ء تک برمی مظالم سے تنگ آ کر دو لاکھ مسلمانوں نے بنگال کی طرف ہجرت کی۔ (دعوۃ ہائی لائٹس، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء ماہنامہ ضیائے آفاق لاہور، جولائی ۲۰۱۲ء) روزنامہ اسلام کراچی ۷/اگست ۲۰۱۲ء کے مطابق راجہ بودوپھیہ نے ان تمام روہنگیا علماء کو قتل کر دیا تھا جنھوں نے سور کا گوشت کھانے اور شراب پینے سے انکار کیا تھا۔

(۳) ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ دوم شروع ہوئی اور نومبر ۱۹۴۱ء تک جاپان نے ہانگ کانگ سے سنگاپور تک کے علاقوں اور ملکوں کو قبضہ کرتا ہوا برما پر بھی قبضہ کر لیا۔ چونکہ اس وقت برما میں خانہ جنگی کی کیفیت تھی اس لئے غیر مسلموں نے برما اور ارکان میں موجود مقیم مسلمانوں کو ملک سے نکالنے اور بے دخل کرنے کے لئے مظالم کا سلسلہ شروع کیا جس سے ہزاروں اور لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے انڈیا پہنچ گئے جس کی تفصیل ''اشک مسلمانان ارکان برما'' میں ہے۔

(۴) ۱۹۴۱ء میں عالمگیر جنگ دوم شروع ہونے کی وجہ سے برما وارکان میں کوئی قابل ذکر مستحکم حکومت نہیں تھی اس لئے مقامی غیر مسلموں اور اکیاب کے ڈپٹی کمشنر متعصب مگھ افسر ''او چوکھائن'' نے تھاکن پارٹی نامی تنظیم کو دوبارہ فعال کیا تاکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو ملک سے نکالنا آسان ہو، چنانچہ اسی جماعت نے ۲۶/مارچ ۱۹۴۲ء میں ارکانی مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا جو جون ۱۹۴۲ء تک رہا، اس دوران ایک لاکھ مسلمانوں کو شہید اور پانچ لاکھ افراد کو ہجرت پر مجبور کیا گیا جبکہ پچاس ہزار مسلمان شہادت معنویہ پر فائز ہوئے، اس خونی داستان کو عرف عام میں ''مگھ کاڑا کاڑی'' (قتل مگھ و مسلم) کہا جاتا ہے۔ (ارکان کی خونی داستان)

(۵) ۱۹۴۲ء میں جب مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو باشندگان ارکان نے ''شوبیر نگر رنگپور'' اور ''مہیما گنج'' (یہ دونوں علاقے فی الحال بنگلہ دیش میں ہیں) کی طرف ہجرت شروع کی اور ۴۳ ہزار مسلمانوں نے ہجرت کی جس کی تفصیل ''اشک مسلمانان ارکان برما'' میں ہے۔

(۶) جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے اختتام کے بعد جب برما پر برطانیہ کا دوبارہ قبضہ ہوا اور برما کو آزادی دینے کی تیاریاں ہونے لگیں تو اس وقت آزاد برما پارلیمان کے لئے الیکشن کرایا گیا، اس الیکشن کے نتیجہ میں تنظیم بھاسا بالا وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئی، اس کے بعد برمی پارلیمان نے آزاد برما کے لئے جنرل اونگ سائنگ کی رہنمائی میں مسلمانوں کی مدد سے دستور اساسی مرتب کی، اس دستور اساسی میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، سماجی اور تمدنی حقوق کی حفاظت کا کہیں اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا گیا جس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا لیکن بے فائدہ- بعد میں حکمرانی کا جو نقشہ اور خاکہ تیار کیا گیا اس میں بھی مسلمانوں کے حقوق کے متعلق کوئی شق نہیں رکھی گئی اور نہ مسلمانوں کے لئے کسی عہدہ کا ذکر کیا گیا۔

(۷) ۱۹۴۷ء میں حکومت برما نے مسلمانوں کو عام انتخابات کے موقع پر رائے شماری میں حصہ لینے سے منع کئے، جب بھی برما میں انتخابات ہوئے ان میں مسلمانوں کو خاطر خواہ نمائندگی نہیں دی گئی بلکہ انہیں ہر ممکن حربوں سے پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔

(۸) ۱۹۴۷ء میں جب متحدہ جمہوریہ برما کا شاہی جھنڈا بنایا جا رہا تھا تو اس میں کل چھ ستارے نصب کئے گئے تھے، ہر ستارہ سے برما کی ایک ایک اقلیت قوم کی طرف اشارہ تھا، درمیان میں ایک بڑا چمکدار ستارہ نصب تھا جس سے برما کی شاہی اکثریتی قوم بدھ مت کی طرف اشارہ تھا، پانچ اقلیتی اقوام یہ ہیں: شان، کچن، کایانگ (کرین) کو سولونی (کایا، کایاہ) اور کیانگ۔ لیکن برما کی مؤثر اقلیت مسلمانوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کوئی ستارہ نصب نہیں کیا گیا، جس پر مسلمانوں کی جماعت با، ما، کا (برما مسلم کانگریس) کے قائد

سیدعبدالرزاق، جنرل سکریٹری مسٹرعبداللطیف (اوکین ماؤلا) اوراس کے ۳۱ممبروں اور دیگر سرکردہ مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی لیکن بے سود، بلکہ مسٹراونگ سائنگ نے یہ کہہ کرمسلمانوں کو دھوکہ دیا کہ چونکہ مسلمانوں کی قربانی قابل ستائش ہےاس لئے درمیان میں نصب شدہ بڑے چمکدار ستارے میں بدھ مت کے ساتھ مسلمان بھی شامل ہیں، یوں مسلمانوں کے لئے شاہی جھنڈا میں الگ کوئی ستارہ نصب نہ ہوسکا۔

۱۹/جولائی ۱۹۴۷ء میں ایگزیکٹوکونسل کا اجلاس رنگون پارلیمنٹ ہاؤس میں ہورہا تھا جس میں اچانک چند مسلح افراد (پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر) آئے اور مسٹراونگ سائینگ، سیدعبدالرزاق اوراونگ سائینگ کے بھائی باؤن ودیگرافراد (کل چھ افراد) کوگولیوں سے بھون ڈالا۔

(۹) ۴/جنوری ۱۹۴۸ء صبح چار بج کر بیس منٹ پر برما کی آزادی عمل میں آئی اور مسٹر اونو برما کے پہلے منتخب وزیراعظم ہوئے، جب مسلمانوں نے مسٹراونو کو شاہی جھنڈے کے سلسلے میں مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بات کی اور مسٹراونگ سائینگ کا وعدہ یاددلایا تو اونو نے جواب دیا: کہ چمکدار ستارہ میں صرف بدھ مت شامل ہیں، مسلمانوں کو مات دینے کے لئے اونگ سائینگ نے ویسے ہی یوں کہہ دیا تھا کہ اس میں مسلمان بھی شامل ہیں، اس لئے یہاں مسلمانوں کے کوئی حقوق نہیں۔

(۱۰) بھا، ساپالا کی وزارت میں دستوریہ کا پہلا اجلاس رنگون اسمبلی میں (۱۹۴۸ء کے لگ بھگ) منعقد کیا گیا تھا، اس اجلاس میں شرکت کے لئے ارکان سے مندرجہ ذیل مسلم پارلیمان ممبروں کو مدعو کیا گیا تھا، جناب سلطان احمد بی اے- بی ایل سابق ایم پی اے پارلیمنٹری سکریٹری جناب مسٹرعبدالغفار بی، اے بی، ٹی، ایم پی اور مسٹرابوالبشر بی، اے ایم پی۔ یہ حضرات رنگون جانے کے لئے دعوت کے مطابق اکیاب پہنچے، لیکن باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت انہیں رنگون جانے کے لئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہیں دیا گیا اور رکاوٹیں

حائل کردی گئیں۔ انہوں نے باقاعدہ بار بار ٹیلی گرام کے ذریعہ رنگون سے رابطہ کیا اور شکایت کی لیکن بروقت اس کی کارروائی نہیں کی گئی، بعد میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبات پیش کئے گئے تھے انہیں ٹوکریوں کے حوالے کردیا گیا۔

(۱۱) باقاعدہ سازش کے تحت ۱۹۴۸ء کے بعد مسلمانوں کی دکانیں، مارکیٹیں، مکانات، پکی فصلیں ودیگراملاک کو نذر آتش کرنے کا سلسلہ شروع کردیا گیا، آزادی برما کے بعد عظیم یونیورسٹی جامعہ اشرف العلوم نوراللہ پاڑہ کو جلا کر خاکستر کردیا گیا، چونکہ آتشزدگی کا واقعہ اچانک اور مسلمانوں کی بے خبری میں پیش آتا ہے اس لئے قیمتی دستاویزات اور جملہ املاک راکھ کے ڈھیر ہوجاتے ہیں اور الٹا الزام مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے۔

(۱۲) یوں تو ۱۹۴۸ء سے ہی مسلمانوں کو غیرملکی قرار دیا جارہا ہے، لیکن ۱۹۸۲ء سے ان کے شہری اورانسانی حقوق بھی سلب کرلئے گئے، حالانکہ مسلمان برما کے اصلی باشندے ہیں جس کی تفصیل ''تذکرہ ارکان برما'' میں ہے۔

(۱۳) اونوحکومت نے ۱۹۴۹ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے خلاف بی ٹی ایف کے نام سے ایک عسکری جماعت تشکیل دی۔ اس فوجی جماعت نے مسلمانوں پر مظالم کے جو پہاڑ ڈھائے ان کی دردناک داستان ہے۔ دعوۃ ہائی لائٹس اسلام آباد، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء اور ماہنامہ ضیائے آفاق لاہور شمارہ جولائی ۲۰۱۲ء کے مطابق اس حکومتی آپریشن میں تیس ہزار روہنگیا مسلمانوں کو شہید کیا گیا ہے۔

(۱۴) ۱۹۵۰ء میں ۳۰ ہزار مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کی، جب کہ ۱۹۵۴ء میں ''مون سون'' کے نام سے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف خطرناک آپریشن شروع کیا گیا جو دوسال جاری رہا۔ (روزنامہ امت کراچی ۱۸/اگست ۲۰۱۲ء) ۱۹۵۶ء میں ۱۳۰۰۰ ہزار اور ۱۹۶۲ء میں ۲۵۰۰۰ روہنگیا مسلمانوں نے ہجرت کی۔ (دعوۃ ہائی لائٹس اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء)

(۱۵) ارکان میں (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) چاولوں کی ارزانی اور کثرت ہے لیکن باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ارکان کو دھان اور چاول سے خالی کیا گیا اور ارکان کے دھان رنگون پہنچنا شروع ہوگئے یوں ارکانی مسلمان وقت کے محتاج ہوگئے۔

(۱۶) ۱۹۷۴ء کے بعد ایک ارکانی وزیر ورکن اپر کونسل برما ''کرنل تان سین'' نے بطور احتجاج ارکانیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ارکان کے صرف فاضل اور زائد دھان وچاول رنگون بھیجے جائیں اور بقیہ حصے ارکان میں رکھا جائے، اس مطالبہ پر کرنل صاحب کو وزارت سے معزول کردیا گیا اور اس کے ہمنواؤں کو حوالہ زنداں کردیا گیا۔

(۱۷) ۱۹۷۸ء میں حکومت برما نے ارکان میں ''کنگ ڈریگن'' یا ''ناگامن'' نامی آپریشن شروع کیا جس کے نتیجے میں ایک لاکھ مسلمان شہید اور پانچ لاکھ بے گھر ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں تین ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو تھیلوں میں بند کرکے سمندر میں پھینک دیا گیا، ۲۰ رہنماؤں کو زندہ دفن کردیا گیا، صرف ایک مسجد سے ۱۲۰ عورتوں کی لاشیں ملیں اور صرف اکیاب میں آٹھ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ (دعوۃ ہائی لائٹس اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء مزید تفصیل کے لئے کتاب ''خونیں سرگزشت'' ملاحظہ ہو۔

(۱۸) ۱۹۹۱ء میں تین لاکھ ارکانی مسلمانوں نے بنگلہ دیش کی طرف ہجرت کی جس کی تفصیل ''مرحوم ارکان کے مظلوم مسلمان'' میں ہے اور ہجرت کا یہ سلسلہ جاری ہے، چنانچہ اب (۲۰۱۲) بھی چار پانچ لاکھ ارکانی مہاجرین بنگلہ دیش میں موجود ہیں۔

۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء کے دوران ۱۸۰۰ سے زائد مسلم آبادیوں کو نذر آتش کردیا گیا، ۲۰۰ سے زائد مساجد کو اصطبل خانہ اور ملٹری کیمپس میں تبدیل کیا گیا، صرف ۲۰۰۲ء میں ۴۰؍ مساجد کو مسمار کیا گیا۔ (دعوۃ ہائی لائٹس اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء) اور ۱۹۷۴ء میں ۲۰۰ خاندانوں کو سمندر میں ڈبو کر شہید کرڈالا گیا، ۵؍اپریل ۱۹۹۲ء کو صرف ایک مسجد میں ۲۰۰

مسلمانوں کو شہید کرڈالا گیا۔ فرانسیسی میگزین "Le Navilobservation" نے ۲۳؍اپریل ۱۹۹۸ء کو ایک رپورٹ میں بتایا کہ ٹارچر کے دوران میں برمی فوجیوں نے مسلمان عورتوں کی چھاتیاں تک کاٹ دیں، بنگلہ دیشی میگزین "Bichitra" کے مطابق ۱۹۷۸ء تک ۲۶۰۰ خواتین کی عصمت دری ہوچکی تھی۔

(۱۹) جنوری ۲۰۰۱ء کو ''اکیاب'' میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا جس کی تفصیل مختلف النوع اخبارات اور جرائد میں آچکی ہے۔ ماہنامہ ضیاء آفاق لاہور شمارہ جولائی ۲۰۱۲ء دعوۃ ہائی لائٹس اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء کے مطابق اس فسادات میں ۸۰۰ مسلمانوں کو شہید اور ۷۰۰ نوجوانوں کو اغوا کرلیا گیا۔

(۲۰) ارکان کے دارالحکومت اکیاب میں بے شمار فیکٹریاں اور رائس میلیں تھیں جہاں ہزاروں مسلمان، ملکی اور غیر ملکی کمپنیاں کام کرتی تھیں جس سے مسلمان ترقی کررہے تھے، لیکن حکومت نے سازش کے تحت اکیاب کی تمام فیکٹریوں کو بند کردیا یوں اکیاب سنسان ہوگیا اور مسلمان بھوکوں مرنے لگے۔

(۲۱) مسلمانوں کی ہر قسم کی سیاسی، رفاہی اور فلاحی جماعتوں کو ختم کردیا گیا اور انہیں ہر ممکن طریقہ سے دبانے کی کوشش کی گئی اور کی جارہی ہے، یہاں تک کہ بی بی سی لندن کے نمائندوں کو بھی ارکان کے داخلے اور رپورٹنگ پر پابندی لگادی گئی تاکہ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر اسلام مطلع نہ ہوسکے۔

(۲۲) مسلمانوں کی زمینوں کو چھین لینا، مساجد ومدارس کو مسمار کرنا، وقتاً فوقتاً انہیں ہجرت پر مجبور کرنا، گنجان مسلمان آبادی کو اٹھا دینا، آمد ورفت کے دوران بندرگاہوں میں مسلم خواتین کی حیاسوز تصویریں کھینچنا، دہشت گردی کا الزام لگا کر مسلم جوانوں کو حوالہ زندگی کرنا اور جگہ جگہ مسلم بستیوں کے درمیان مگھ، بستیاں بسانا، اب تو حکومت کا معمول بن چکا ہے۔

(۲۳) یکم جون ۲۰۱۲ء سے ایک ماہ تک ارکان کے مسلمانوں کا قتل عامہ ہوا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عشرت ہانی نے کیا خوب کہا ہے: ع

شہر میں امن ہو دشوار نظر آتا ہے
اب تو ہر شخص پر اسرار نظر آتا ہے
ایسے حالات سے دوچار ہوئے ہیں ہم لوگ
جس کو دیکھو وہی بے زار نظر آتا ہے
شل ہوجاتے ہیں اعصاب جواں مردوں کے
شہر آفت میں گرفتار نظر آتا ہے
بوالہوس خود مرے احباب ہوئے ہیں جب سے
شکوہ غیروں کا تو بے کار نظر آتا ہے
بیچنے کا تو ہمیشہ سے وہ عادی ہے ضمیر
جو ہمیں صاحب کردار نظر آتا ہے
دور حاضر میں ضرورت تھی جبھی تو ہانی
بے ضمیروں کا بھی بازار نظر آتا ہے

نوٹ: اس مضمون کے تحت انتہائی اختصار کے ساتھ حکومت برما کے مظالم کے چند واقعات درج کئے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک پر مستقل مفصل کتاب لکھی جاچکی ہے، تفصیل کے لئے راقم کی کتاب ''تذکرہ ارکان'' ملاحظہ ہو۔

ارکان برما – مسمار شدہ مساجد و مدارس کی ایک فہرست:

(۱) کیاندنگ کی حاجی اسماعیل مسجد- بتاریخ ۱۹۵۵ء- یہ بوسیدنگ کے شمال اور مایو

کے مغرب میں واقع ہے۔

(۲) تولاتولی بستی کا انخلاء اور مسجد کی شہادت- بتاریخ ۱۹۵۵ء- یہ گنجان مسلم آبادی بلی بازار سے دو تین میل دور شمال میں فورماندی کے مغرب میں واقع ہے۔

(۳) چار میل کی جامع مسجد- بتاریخ ۱۹۶۳ء- یہ منگڈو سے چار کلومیٹر دور مشرق میں واقع ہے۔

(۴) بوسدنگ ٹاؤن نیا بازار کی مسجد- بتاریخ یکم مئی ۱۹۶۵ء- بہت سی مزاحمتیں ہوئیں لیکن ناکامی ہوئی۔

(۵) اکیاب ٹاؤن کی تبلیغی مرکز کی مسجد نذر آتش- بتاریخ فروری ۱۹۷۸ء- بڑی مشکل سے مسلمانوں نے آگ بجھائی۔

(۶) ہائی اسکول منگڈو کے احاطہ کی مسجد مقفل- بتاریخ ۱۹ر نومبر ۱۹۹۰ء- بعد میں اسے منہدم کردیا گیا۔

(۷) لاوادنگ کی سات مساجد ومدارس- بتاریخ ۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء- یہ علاقہ بوسیدنگ میں ہے۔

(۸) مردہانگ قدم علی جی مسجد- بتاریخ ۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء- یہ علاقہ پتھری قلعہ میں ہے۔

(۹) مزار علی پاڑہ منگڈو کے مدرسہ انوار العلوم پر قبضہ- بعد میں اسے فوجی چھاؤنی میں تبدیل کردیا گیا۔

(۱۰) تائمنگ کھالی کا مدرسہ اور علاقہ- بتاریخ محرم ۱۴۲۰ھ/ اپریل ۱۹۹۹ء- یہ بوسیدنگ سے ۵ میل دور شمال مغرب میں واقع ہے۔

(۱۱) اکیاب کی چار مسجدیں، شفیع خان مسجد نزد ہوائی اڈہ، تبلیغی مرکزی مسجد ناظرہ پاڑہ میں، مولوی پاڑہ کی مسجد اور ناظرہ پاڑہ کی پکتھولی مسجد- بتاریخ ۲۹ر نومبر ۱۹۹۴ء- اب یہاں سرکاری چھاؤنیاں اور عمارتیں کھڑی ہیں ان چار مساجد کے ملحقہ مدارس اور علاقے بھی

منہدم کردئے گئے۔

(۱۲) خواندنگ کا انخلاء اور مسجدیں مسمار- بتاریخ ۱۹۹۷ء- یہ انتہائی گنجان مسلم آبادی تھی جو بوسیدنگ اور دریائے مایو کے مشرق میں تھی۔

(۱۳) چکی پاڑہ اکیاب کا انخلاء اور مسجدیں مسمار- بتاریخ ۱۹۹۰ء- حالانکہ اکیاب ارکان کا دارالحکومت ہے۔

(۱۴) ناگپورہ کا مدرسہ اور عیدگاہ- بتاریخ ۱۰/اپریل ۱۹۹۵ء- یہ علاقہ آٹھ نو میل دور منگڈو کے جنوب میں دریائے ناف کے سائٹ میں واقع ہے۔

(۱۵) ساپرانگ پاڑہ اکیاب کے ۵ سو مکانات انخلاء- مکانات کے انخلاء سے مسجد کا انہدام لازمی امر ہے۔

(۱۶) علاقہ والیدنگ کی دو جامع مسجد- بتاریخ...... یہ علاقہ بوسیدنگ کے شمال اور مایو دریا کے مغرب میں چھ سات میل دور واقع ہے۔

(۱۷) شقدار پاڑہ کی مشہور تبلیغی جامع مسجد- بتاریخ ۱۱/مارچ ۱۹۹۸ء- یہ علاقہ منگڈو کے مشرق میں دو میل دور واقع ہے، مسجد دو منزلہ تھی۔

(۱۸) مانڈلے کی اٹھارہ مسجدیں- بتاریخ ۱۵/مارچ ۱۹۹۷ء- مانڈلے اپر برما کا دارالحکومت ہے۔

(۱۹) مانڈلے کی چھ سو سالہ پرانی سندھی خان مسجد- بتاریخ ۱۹۹۷ء- مانڈلے اپر برما کا دارالحکومت ہے۔

(۲۰) رنگون کی دس مساجد- بتاریخ ذوالحجہ ۱۴۱۷ھ/ اپریل ۱۹۹۷ء- رنگون برما کا دارالحکومت ہے۔

(۲۱) بڑا شقدار پاڑہ کی مسجد اور مدرسہ بحرالعلوم- بتاریخ ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء- یہ علاقہ شمالی منگڈو کی مشہور بستی ناگپورہ کے قریب دریائے ناف کے سائٹ پر واقع ہے۔

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

(۲۲) ام ٹلہ کی مسجد- بتاریخ- یہ علاقہ منگڈو تھانہ کی آخری سرحد لیموسری مارٹ کے جنوب میں واقع ہے۔

(۲۳) ٹائیچونگ کی مسجد- بتاریخ...... یہ منگڈو کی آخری شمالی سرحدی علاقہ ہے۔

(۲۴) تو وائنگ پتھری قلعہ کا انخلاء اور مسجد مسمار- بتاریخ ۱۹۹۸ء- اب یہاں معبد بوذی قائم ہے۔

(۲۵) شجاع ڈیا کی مسجد، متولی حاجی حکیم علی- بتاریخ اپریل ۲۰۰۲ء- یہ علاقہ منگڈو سے دو میل شمال میں واقع ہے، اب یہاں جھونپڑی نما مسجد بنائی گئی ہے۔

(۲۶) زامبونیا کی مسجد- بتاریخ ۱۲/مئی ۲۰۰۰ء- یہ ۵ میل دور منگڈو کے شمال میں واقع ہے۔

(۲۷) ناگپورہ کے مدرسہ مصباح العلوم مقفل- بتاریخ........... یہ آٹھ نو میل دور شمالی منگڈو میں واقع ہے۔

(۲۸) راجہ بیل کی مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۰ء یہ علاقہ دریائے مایو کے دائیں کنارے پر کماندگ ندی کے دہانے سے ۵ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۲۹) تاگیدار رنگون کی مسجد- بتاریخ ۲۲/مئی ۲۰۰۰ء............

(۳۰) وسط رنگون کی ایک مسجد- بتاریخ ۲۶/مئی ۲۰۰۰ء............

(۳۱) چار کمبو کی دو منزلہ مسجد- بتاریخ اگست ۲۰۰۰ء- یہ منگڈو سے آٹھ میل دور جنوب میں واقع ہے۔

(۳۲) کیاندنگ کے مدرسہ وحفظ خانہ- بتاریخ ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ بوسیدنگ کے شمال اور دریائے مایو کے مغرب میں ہے۔

(۳۳) جامعہ عربیہ دارالعلوم تنگباز بوسیدنگ- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- فی الحال مقفل یعنی تعلیم پر پابندی لگادی گئی ہے۔ یہ علاقہ بوسیدنگ اور دریائے مایو کے مشرق میں واقع ہے۔

(۳۴) باغگونہ کے پانچ ابتدائی ووسطانی مدارس مع ملحقہ حفظ خانہ- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ منگڈو سے تیل میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔

(۳۵) نلبینہ کے ایک مکتب وحفظ خانہ- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ڈھائی میل جنوب میں واقع ہے۔

(۳۶) گدوسرا کے پانچ ابتدائی ووسطانی مدارس مع ملحقہ حفظ خانہ- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ منگڈو سے جنوب کی طرف چھ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۳۷) کیاندنگ بازار کی جامع مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ بوسیدنگ کے شمال میں واقع ہے۔

(۳۸) دھووائنگ پچھّم پاڑہ کی تین سو سالہ پرانی مسجد (تبلیغی مسجد)- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ منگڈو کے شمال میں بلی بازار سے جنوب کی طرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ اس ٹاؤن کی سب سے بڑی پرانی تبلیغی مسجد تھی۔

(۳۹) نلبینہ پاڑہ کی جامع مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈوا کے جنوب میں ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔

(۴۰) گدوسرا کی سات مساجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- گدوسرا منگڈو کے جنوب میں ۶ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۴۱) ارکان برما کی ۱۴ مساجد مسمار- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- روزنامہ ایکسپریس کراچی ۲۳ رمئی ۲۰۰۱ء

(۴۲) ممتاز العلوم کی تعمیرات روک دی گئیں۔ بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ مدرسہ جنوبی بوسیدنگ کی بستی سیندنگ میں ہے۔

(۴۳) خیراعدن (کیلی ونگ) کی دو مسجدیں- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ منگڈو سے چار میل دور جنوب میں نوراللہ پاڑہ کے بعد واقع ہے۔

(۴۴) قادر بیل کی دو مسجدیں- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ منگڈو سے پونے تین میل دور جنوب میں مینگ کھالی پل کے بعد واقع ہے۔

(۴۵) راجہ بیل مشرقی محلّہ کی ایک مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ علاقہ منگڈو کے مشرق میں تین کلومیٹر کے فاصلے پر علاقہ چار میل سے قبل واقع ہے۔

(۴۶) گھرا کھالی کی ایک مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو کے جنوب میں ۱۸ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۴۷) شیتا فریکہ کی دو مسجدیں- مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو کے جنوب میں بیس میل دور واقع ہے۔

(۴۸) باصرہ (برسراہ) کی ایک مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۲۸ میل دور واقع ہے۔

(۴۹) برگوزو بیل کی ایک مسجد ومکتب- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو کے شمال میں ۹ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۵۰) بوڑھا شقدار پاڑہ کی ایک مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۸ میل دور شمال میں واقع ہے۔

(۵۱) بلی بازار کی ایک مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ شہر منگڈو سے ۱۵ میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔

(۵۲) کھلار بیل کی ایک مسجد- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۸ میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔

(۵۳) میر اللہ کی دو مسجدیں شمالی وجنوبی- بتاریخ مئی ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۲۵ میل دور جنوب میں واقع ہے۔

(۵۴) انڈانگ کی دو مسجدیں- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء یہ منگڈو سے ۲۵ میل دور جنوب

میں واقع ہے۔

(۵۵) علی ٹائینگو ڈیل پاڑہ کی مسجد- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ شہر منگڈو کے جنوب میں ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۵۶) کلیجہ بھانگہ کی مشرقی مسجد- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ راقم الحروف کا پیدائشی علاقہ ہے جو منگڈو سے ۳ میل کے فاصلے پر شمال مشرق میں ہے۔

(۵۷) قمرالڈیل کی ایک مسجد- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ کلیجہ بھانگہ سے متصل شمال میں واقع ہے۔

(۵۸) اودنگ کی دو مسجدیں- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۱۸ میل دور جنوب میں واقع ہے۔

(۵۹) چھوٹا گوزوبیل کی دو مسجدیں- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو کے شمال میں ۷ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۶۰) کلوم کی ایک مسجد- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۲۷ میل دور جنوب میں واقع ہے۔

(۶۱) رامیور گونہ کی ایک مسجد- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو کے شمال میں ۶ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۶۲) ہتالیہ کی ایک مسجد- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو کے شمال مشرق میں ۲ میل کے فاصلے پر ہے۔

(۶۳) کائندہ کاٹا کی دو مسجدیں اور ایک مکتب- بتاریخ جون ۲۰۰۱ء- یہ منگڈو سے ۳ میل دور مشرق میں واقع ہے۔

(۶۴) دو مسجد اور ایک مدرسہ- بتاریخ ماہنامہ الفاروق صفر ۱۴۲۳ھ/ اپریل ۲۰۰۲ء- رنگون کے نشریاتی ادارے رنگون براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے پیچھے۔

(۶۵) سوسالہ پرانی مسجد- بتاریخ الفاروق صفر ۱۴۲۳ھ/ اپریل ۲۰۰۲ء- رنگون عزیز گارڈن گڈلف۔

(۶۶) شہر ٹاؤنگو کی ایک مسجد شہید دیگر ۱۳ مساجد مقفل- بتاریخ ۱۴/ مئی ۲۰۰۱ء- رنگون سے دو سو میل کے فاصلے پر۔

(۶۷) کرن اسٹیٹ کے ایک گاؤں مع جملہ مساجد شہید- بتاریخ رمضان ۱۴۲۲ھ/ نومبر ۲۰۰۱ء۔

(۶۸) میگزی بوسیدنگ کی جامع مسجد شہید- بتاریخ ۱۸/ جون ۲۰۱۲ء- یہ پیر مظفر صاحبؒ کی مسجد ہے۔

(۶۹) شہر ''کھائیک جتاؤ'' کی چار مسجدیں مسمار- بتاریخ ۱۵/ اگست ۲۰۱۲ء- یہ شہر مغربی ارکان میں ہے۔

نوٹ: مصدقہ اطلاع کے مطابق ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۰ء تک ۹۰۰ سے زائد مساجد و مدارس شہید یا مقفل کر دئے گئے، دو لاکھ پچاس ہزار سے زائد قرآن پاک و دیگر کتب نذر آتش، ۸۹۵ بستیاں تباہ، سات ہزار مکانات نذر آتش، دو ہزار پانسو ایکڑ سے زائد زمینیں ضبط، دس ہزار ملازمین برطرف، کروڑوں روپے مالیت کی جائیداد بحق سرکار ضبط- (ملاحظہ ہو: ''تذکرہ ارکان برما'' صفحہ: ۳۱۱، ۳۷۹، ۳۸۹)

یہ تو ۱۹۴۲ء تا ۱۹۸۰ء کی اجمالی فہرست ہے۔ ۱۷۹۷ء تا ۱۹۴۲ء- اسی طرح ۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۲ء تک کتنی مسجدوں کو شہید کیا گیا، کتنی مسلم بستیاں اجاڑ دی گئیں، کتنی کتابوں اور قرآن پاک کے نسخوں کو نذر آتش کیا گیا، اس کی صحیح تعداد اور مستند تفصیل معلوم نہیں ہوسکی، البتہ ایک ماہنامہ کی رپورٹ ہے کہ ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء کے دوران ۲۰۰ سے زائد مساجد کو اصطبل خانہ اور ملٹری کیمپس میں تبدیل کیا گیا، صرف ۲۰۰۲ء میں ۴۰/ مساجد کو مسمار کیا گیا۔

(دعوۃ ہائی لائٹس اسلام آباد شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء)

پندرہ روزہ ’’نشور‘‘ کراچی شمارہ یکم اگست ۲۰۱۲ء کے مطابق ۱۹۳۰ء میں ۱۱۳ مساجد کو شہید کیا گیا ہے۔ ذہن میں رہے کہ مذکورہ شہید شدہ اور منہدم شدہ مساجد میں سے بعض مسجدیں دوبارہ معرض وجود میں آگئیں جبکہ اکثر مسجدیں افسانہ میں تبدیل ہوگئیں۔ نیز یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح پاکستان سمیت بہت سے ممالک میں ہر مسجد کے الگ الگ نام ہوتے ہیں اس طرح ارکان کی مسجدوں کے نام نہیں ہوتے بلکہ وہ مسجدیں علاقوں کے ناموں سے معروف ہیں جبکہ حکومت برمانے علاقوں کے سابقہ قدیم معروف اسلامی ناموں کو ختم کر کے نئے اور برمیز نام رکھ دئے، اس لئے عام آدمی کے لئے اس کی پہچان مشکل ہے۔

اس کے علاوہ جون ۲۰۱۲ء کے قتل عام کے دوران جن مساجد و مدارس کو جلا دیا گیا یا مسمار کر دیا گیا ان کی فہرست الگ ہے اور اس کا اجمالی خاکہ بعنوان ’’ارکان کا ایک خونی باب جون ۲۰۱۲ء‘‘ میں ہے۔

کیا میں مسلمان ہوں؟:

کیا میں مسلمان ہوں؟......الحمدللہ! کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ، رسول اکرم ﷺ اور قرآن مجید کی محبت میرے دل میں ہے؟......جی ہاں! کیا قرآن کی رو سے یہود ونصاریٰ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن ہیں؟...... بالکل ہیں! کیا یہود ونصاری اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں؟......جی ہاں! کیا انہیں کھلی چھٹی دی جائے؟......نہیں بالکل نہیں! پھر میرے جیسا مسلمان کیا کرے؟...... بالکل آسان! ان دشمنوں کی رگ جان کاٹوں مگر میں اتنا خوش نصیب کہاں؟ تو پھر میں ان کی معیشت کی جڑ کاٹوں تاکہ 75 لاکھ سے زائد مسلمانوں کے خون کا کچھ بدلہ ہی لے سکوں!

☆ مغربی ممالک کے موبائل فون کنکشن بدل کر وہ کنکشن لوں گا جن کے مالک مسلمان ہیں جیسا کہ ’’الوارد‘‘ اور ’’یوفون‘‘۔

☆ اپنی زبان کے ذائقے اور Status کی قربانی دیتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ میں شامل ممالک کی اشیاء کی ممکن حد تک بائیکاٹ کروں گا نیز اپنے بیڈ روم، ڈرائینگ روم، باتھ روم اور کچن سے ان اشیاء کو نکال دوں گا۔

☆ اپنے چہرے پر سنتِ رسول ﷺ سجاؤں گا اور باعمل مسلمان بننے کی کوشش کروں گا۔

☆ زیادہ سے زیادہ رشتہ داروں اور دوستوں کو اس سلسلہ میں متحرک کروں گا اور اس پیغام کو آگے بھی پہنچاؤں گا۔

میرا یہ عمل بے شک دیکھنے میں چھوٹا لگتا ہے مگر ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے اثرات ضرور دکھائے گا۔

ارکانی شہداء......لہو ہمارا بھلا نہ دینا:

راقم مئی سے ۵؍جون ۲۰۱۲ء تک بنگلہ دیش اور ارکان کے مغربی علاقوں میں تھا، ۳؍جون سے ارکانی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور آٹھ جون سے خبریں اخبارات میں چھپنے لگیں، مگھوں اور برمی فوجوں نے سب سے پہلے مشرقی ارکان کے مسلمانوں کو قتل کرنے، نوجوانوں کو گرفتار کر کے قید کرنے اور مسلم بستیوں کو جلا کر خاکستر کرنے کا آغاز کیا، چونکہ ان علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، نہتے ہیں اور میڈیا کا وجود نہیں ہے اس لئے ان کی خبریں بہت دیر میں عام لوگوں تک پہنچیں، جبکہ بہت سے لوگ ان خبروں کو افواہ قرار دیتے رہے، اس لئے دیگر مسلم علاقوں کے مسلمانوں نے اپنے دفاع اور بچاؤ کے لئے کوئی تیاری نہیں کی بلکہ دریافت کرنے پر بتاتے رہے کہ ’’الحمدللہ‘‘ ہمارے ہاں امن ہے۔

مشرقی ارکان کے علاقوں کو ختم کرنے کے بعد مغربی ارکان کے علاقوں کی طرف یہ دہشت گرد متوجہ ہوئے (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) اور قسطوں کے انداز میں قتل عام شروع کیا جواب (۲۵؍اگست ۲۰۱۲ء) تک جاری ہے۔ دریائے ناف کے مشرقی

علاقوں کے درجنوں ماہی گیروں نے راقم کو بالمشافہ اور فون پر بھی بتایا کہ ہم دریائے ناف ودیگر دریاؤں میں جالی پھینکنے اس لئے نہیں جارہے ہیں کہ جال میں انسانی سر اور اعضاء وجوارح آرہے ہیں، اس طرح ارکانی مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ (روزنامہ امت کراچی، ۱۸/اگست ۲۰۱۲ء)۔

۷/جون ۲۰۱۲ء میں اکیاب اور منگڈو کے بڑے پادری (ٹور، مذہبی پیشوا) نے برملا اعلان کیا کہ مسلمانوں کو قتل کرنا جائز ہے اور ان سے لین دین حرام ہے، اس مذہبی غلط فتویٰ کے بعد مگھوں اور بدھوں میں بیحد اشتعال پیدا ہوا اور انتہائی تیزی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا گیا، حالانکہ مذکورہ فتویٰ بدھ مت تعلیمات کے خلاف ہونے کے ساتھ انسانیت کے بھی خلاف ہے، اس لئے ان پادریوں کو ہیگ کی عالمی عدالت میں پیش کر کے سربیائی کمانڈر میلا سووچ کی طرح عبرتناک سزا ملنی چاہئے، کیا حکومت برما بین الاقوامی مجرم نہیں ہے کیونکہ اس نے ارکان کی تمام مسجدوں میں نماز جمعہ، عشاء کی نماز اور تراویح کی نمازوں پر پابندی لگادی، لاؤڈ اسپیکر میں اذان دینا، تراویح میں قرآن سنانا اور سننا، پانچ آدمی کا جمع ہونا، بوقت سحری اعلان کرنا اور چولہے جلانا، گھروں سے باہر نکل کر سودا سلف خریدنا اور کاروبار کرنا، برسر عام ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا وغیرہ کو ممنوع قرار دیا۔ جواب (۲۹/اگست ۲۰۱۲ء) تک ممنوع ہے۔ ایسے متعدد واقعات سامنے آئے کہ بعض زخم خوردہ اور پریشان زدہ مسلمانوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور ان کے ہاتھ کاٹ دئے گئے۔
(سنڈے ایکسپریس کراچی، ۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء)

برمی فوجی، لونگ ٹنگ (رینجرز) پولیس اور حکومتی کارندے وقتاً فوقتاً مسلم بستیوں میں جا کر گشت کرتے ہیں اور حسب خواہش مسلم لڑکیاں لے جاتے ہیں اور مزاحمت پر کہتے ہیں کہ ہم مسافر ہیں، بیویوں سے دور ہیں اور تمہاری حفاظت کے لئے یہاں گشت کر رہے ہیں اس لئے کھانے پینے کے ساتھ شب باشی کے لئے لڑکیاں فراہم کرنا یہ بھی تمہاری ذمہ

داری ہے، نیز ان عورتوں سے ان کے شوہر روزانہ یہ کام (جماع) کرتے ہیں۔ اگر کبھی ہم بھی کرلیں تو چیخنے چلانے اور واویلا مچانے کی کیا بات ہے۔

تنگبازار کے ایک جوان نے بتایا کہ میں بوسیدنگ کے ایک پہاڑ کے خندق میں ایک ماہ تک مقید تھا جہاں سے مجھے گھر والوں نے بھاری رقم دے کر چھڑالیا، اس خندق میں میں نے ہزاروں مسلمانوں کو ہاتھ پیر باندھے ہوئے دیکھا۔

خندق کے اوپر سے ایک سوراخ ہے جہاں سے برائے نام کھانے پینے کے سامان ڈالے جاتے ہیں اور یہ لوگ مختلف علاقوں سے لائے گئے تھے۔ اس خندق میں متعدد ایسی خواتین کی لاشیں بھی دیکھیں جن کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں تھیں اور بعض لاشوں کے دبر میں ڈنڈے ڈال دئے گئے تھے، جبکہ بعض جوان عورتوں کی شرمگاہوں میں یہ کہہ کر آگ (بڑی وسگریٹ اور پوسی کی آگ) ڈالی جارہی تھی کہ اسی شرمگاہ سے مسلم بچے پیدا ہوتے ہیں۔ (روزنامہ امت واسلام کراچی، ۱۳/اگست ۲۰۱۲ء) کیا یہ کوئی کم ظلم ہے کہ حکومت برما نے ارکانی مسلمانوں کو عیدگاہ جانے اور نماز عید پڑھنے سے منع کیا ہے یوں یہ مظلوم ومقہور مسلمان عید کی خوشیوں اور مسرتوں سے بھی محروم ہیں حالانکہ عید کے موقع پر خوشی منانا ہر قوم کا بنیادی حق ہے: ع

عید آمد وافزود غم راغم دیگر
ماتم زدہ راعید بود ماتم دیگر

اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ قتل عام اور نسل کشی کا سلسلہ ۳/جون سے شروع ہوا اور ۱۷/اگست ۲۰۱۲ء تک کسی بھی بیرونی تنظیم اور جماعت یا کسی حکومت کے فرد کو متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنے اور ان کی مدد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، اس کے بعد جب بعض تنظیم اور حکومت کے افراد دورے پر گئے تو انہیں اپنی نگرانی میں بعض متاثرہ ایسے علاقوں کے دورے کرائے گئے جن کے اثرات مٹائے جاچکے تھے اور انہیں تنہائی میں کسی ارکانی ستم

رسیدہ مسلمان سے ملنے اور فریاد سننے کا موقع نہیں دیا گیا۔

راقم کی چھوٹی بہن شفیقہ کے شوہر جناب محمد ایوب کا مکان منگڈو شہر میں ہے اور دکان بھی منگڈو میں ہے، یہ صاحب باقاعدہ حکومت برما کی اجازت سے سرحدی پاسپورٹ کی بنیاد پر یکم جون کو بنگلہ دیش آئے اور ۴ رجون کو جب دوبارہ ارکان جانے کی کوشش کی تو اجازت نہیں ملی، یوں اب (۲۵ راگست) تک وہ بنگلہ دیش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جب کہ ان کی دکان لٹ چکی ہے، مکان تباہ ہو چکا ہے اور اہل وعیال بھوک کے مرنے کے قریب پہنچ گئے، اس طرح سینکڑوں خاندان ہیں۔

ارکان میں روہنگیا مسلمانوں کے لئے موبائل فون استعمال کرنے کے لئے متعدد شرطیں ہیں جن کو پورا کرنا ہر ایک کی بس کی بات نہیں پھر کیمرہ والا موبائل استعمال کرنا تو قیامت صغریٰ ہے اس لئے وہاں مسلمان عام فہم موبائل استعمال نہیں کر پاتے، البتہ دریائے ناف کے قریبی علاقوں میں جہاں بنگلہ دیش کا نیٹ ورک چالو ہے یہ لوگ چوری چھپے بنگلہ دیش کے نیٹ ورک کے تحت موبائل استعمال کرتے ہیں، اگر پکڑے جائیں تو بطور جرمانہ بھاری رشوت لی جاتی ہے اور سخت زدوکوب بھی کیا جاتا ہے۔

اب حالیہ قتل عام اور نسل کشی کے ہزاروں دلدوز مناظر میں سے بعض مناظر کو بعض حضرات نے کسی طرح موبائل فون کیمرے سے محفوظ کرلیا اور یہ مناظر دلگداز تصویریں انٹرنیٹ میں جاری کریں پھر دنیا اس پر مطلع ہوئی ورنہ اس سے قبل بہت سے اخبارات اور جرائد والے اسے افواہ اور مبالغہ قرار دیتے رہے جبکہ یہ تصاویر اور مناظر بلا مبالغہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں کیونکہ ارکان میں کسی قسم کا کوئی میڈیا نہیں ہے اور حکومت نے یہ کام خفیہ انداز میں کیا ہے جب کہ وہاں کیمرے والا موبائل گنے چنے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، بہر حال راقم کو انٹرنیٹ اور عالمی جرائد و میڈیا کے توسط سے دوسو سے زائد ایسی دل دہلا دینے والی تصویریں ملیں جن میں سے ہر تصویر کو دیکھ کر سنگ دل سے سنگ دل آدمی بھی

خون کے آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راقم نے ان تصاویر پر مشتمل دو کتابیں شائع کیں جو دنیا کو رلانے اور جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہیں۔

ایک عرب جریدے نے رپورٹ دی کہ ارکان میں مذہب کی تبدیلی کے لئے زبردستی فارم بھروائے جارہے ہیں، حالیہ فسادات میں مسلمانوں کی سات سو بستیاں مکمل جل گئیں جہاں انسانی زندگی کا نام ونشان تک باقی نہیں ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۱۹ راگست ۲۰۱۲ء)

آج مجھے بعض ارکانی اکابرین کا وہ مقولہ یاد آرہا ہے جو میں نے اپنے نانا مولانا عزیز الرحمٰنؒ سے ۱۹۷۸ء کے لگ بھگ سنا تھا کہ ''ناف دریا مازے مسلمانر ماتھا سریم ماسر خلا باشے فان باشی بو'' یعنی ایک وقت ایسا آئے گا کہ دریائے ناف میں ارکانی مسلمانوں کی لاشیں اس طرح ہوں گی جس طرح سریم مچھلی (جو سانپ کی طرح ایک مچھلی ہے اور دریا میں سر پانی سے باہر نکال کر تیرتی ہے) کے سر دریا میں نظر آتے ہیں۔ یہ مقولہ آج مجھے سچ نظر آرہا ہے، کیونکہ دریائے ناف میں ارکانی مسلمانوں کی اتنی لاشیں گرائی گئیں کہ گنتی سے باہر ہے۔

جون ۲۰۱۲ء میں مسلمانوں کے قتل عام کے اسباب:

اب ارکان میں مسلمانوں کے قتل عام کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ بھی سابقہ مسلم کش پالیسی کا ایک حصہ ہے، اس تازہ خونی داستان اور لہولہان ارکان کا اجمالی پس منظر کچھ یوں ہے کہ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں برما میں انتخابات ہوئے جس میں چودہ مسلم اراکین منتخب ہوئے اور اپریل ۲۰۱۲ء کے ضمنی الیکشن میں آنگ سانگ سوچی کو بھاری اکثریت کے ساتھ کامیابی ملی اور اس سے جمہوریت کا خاکہ اور نمونہ سامنے آگیا جس کی وجہ سے ارکانی مسلمانوں کو بھی تھوڑی بہت آزادی ملی، اسی آزادی کے تحت مسلمانوں کے لئے اکیاب ورنگون اور برما کے دیگر صوبوں کی طرف جانا آسان ہوا جب کہ اس سے قبل ارکانی مسلمانوں کے لئے رنگون اور اکیاب جانا موت کو دعوت دینا تھا۔

اسی آزادی کے تحت مبلغین اور تبلیغی جماعت کے افراد برما کے مختلف صوبوں کی طرف جانے لگے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے لگے جس کے نتیجے میں بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کرلیا اور کررہے ہیں، جب متعصب مگھ لیڈروں اور بدھ افسروں نے دیکھا کہ ارکانی مسلمان دوبارہ سر اٹھارہے ہیں اور تبلیغ کے نتیجے میں غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہورہے ہیں اس لئے خفیہ منصوبہ کے تحت ارکانی مسلمانوں کا قتل عام کرنا چاہئے اور انہیں ارکان سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ حکومت برما دوبارہ امن وامان کا بہانہ بنا کر حسب سابق مسلمانوں کو دیگر صوبوں کی طرف جانے پر پابندی لگادے۔

اس سازش کے تحت اواخر اپریل ۲۰۱۲ء میں چند مگھوں نے دونوں مسلم لڑکیوں کو قتل کرکے لاشیں سڑک پر پھینک دیں، اس کے بعد یہ اعلان کیا گیا اور کثیر تعداد میں پمفلٹ شائع کئے گئے کہ ان لڑکیوں کو مسلمانوں نے اجتماعی زیادتی کے بعد قتل کردیا ہے، حالانکہ ان عورتوں کو اسلام لانے کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے تاکہ آئندہ کوئی غیر مسلم اسلام لانے کی جرأت نہ کرے اور اس کا الزام بھی مسلمانوں پر عائد کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی آزادانہ نقل حرکت پر حسب سابق پابندی عائد ہو۔ جب مذکورہ اعلان ہوا اور مگھ بستیوں میں پمفلٹ شائع ہوئے جس میں بدھ بھکشوں کے دستخط بھی تھے تو مگھوں اور غیر مسلموں کے اندر انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے جب کہ اس دوران خفیہ سازش کے تحت بعض مگھ بستیوں کو نقصان بھی پہنچایا گیا جس سے ارکان کے طول وعرض میں لڑائی اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔

صدر برما کا زہریلا بیان:

روہنگیا مسلمانوں کے متعلق برمی حکومت کے خطرناک عزائم کیا ہیں اور حکومت کیا چاہتی ہے اسے سمجھنے کے لئے میانمار کے موجودہ صدر تھائی شین کا وہ انٹرویو اور کھلا بیان کافی ہے جو بہت سے جریدوں اور اخباروں میں طبع ہوچکا ہے جو یہ ہے کہ روہنگیا مسلمان برما

کے شہری نہیں ہیں بلکہ یہ غیر ملکی ہیں اس لئے وہ تمام مسلمانوں کو یہاں سے نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، کیونکہ میانمار میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، اس لئے ان کے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ عام شہروں سے نکل کر مہاجر بستیوں میں چلے جائیں یا ملک چھوڑ دیں، اگر اقوام متحدہ کو ان کا درد کھائے جارہا ہے تو یہ عالمی ادارہ ان دہشت گردوں (مسلمانوں) کے لئے اپنے خرچ پر ہماری سرحد کے پاس کیمپ لگائے تو اس صورت میں ہم جگہ دیں گے۔
(روزنامہ امت کراچی ۱۵؍جولائی ۲۰۲۱ء)

صدر برما نے مزید گل افشانی کرتے ہوئے کہا کہ میانمار میں بدھ مت کے علاوہ کسی اور کو رہنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اگر یہاں امن قائم کرنا ہے تو اس کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان یہاں سے نکل جائیں، برمی صدر نے اقوام متحدہ کے مندوب برائے پناہ گزین ''انٹونیوگیٹر یز'' سے ملاقات کے دوران کہا کہ روہنگیا مسلمان برما کے شہری نہیں ہیں اور نہ ہم ان کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں۔ ہم ان کو شہری نہیں مانتے، ہم انہیں شہروں میں رہنے نہیں دیں گے اور انہیں ہر صورت میانمار سے نکال دیا جائے گا۔ (روزنامہ اسلام کراچی ۲۱؍جولائی ۲۰۱۲ء)۔

جون ۲۰۱۲ء میں مظالم کے چند دلگداز سانحات:

جون ۲۰۱۲ء میں بدھسٹوں اور مگھوں نے جس بے دردی سے ارکانی مسلمانوں کو قتل کیا، مسلم بستیاں جلائیں اور عورتوں وبچوں کو تہہ وتیغ کیا وہ نہ صرف انسانیت کے خلاف ہے بلکہ سفاکیت وبربریت اور حیوانیت کے بھی خلاف ہے، شاید، ہٹلر ومسولینی اور چنگیز خان نے بھی ایسا بے نظیر ظلم نہ کیا ہوگا، بطور نمونہ صرف چند اخباری رپورٹیں اور خون آلود واقعات کی خبریں پیش خدمت ہیں۔

(۱) ارکان کے چاروں صوبوں (ضلعوں) میں سے ایک ضلع بنام ''ساڈوے'' ہے

جس کے درج ذیل تین شہر بہت مشہور ہیں۔ گوا، ناپلی اور رتنگوک شہر، تنگوک (Tonggoke) شہر کے پہاڑی راستے اور سرائے خانے قابل دید ہیں، اسی شہر کی ایک جامع مسجد میں تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا اور اس میں شرکت کے لئے ۳۷ تبلیغی افراد پر مشتمل ایک وفد بس میں سوار ہوکر آرہا تھا جس کی اطلاع اوباش غیر مسلموں کو مل گئی تھی، اس اطلاع کے بعد ''تنگوک'' کے شر پسند غیر مسلموں نے خفیہ میٹنگ کی اور ان تبلیغی حضرات کو شہید کرنے کا خونی منصوبہ تیار کیا، جب ۱۲؍رجب ۱۴۳۳ھ/۳؍جون ۲۰۱۲ء بروز اتوار ۳۷ تبلیغی حضرات پر مشتمل یہ بس ''تنگوک'' شہر میں داخل ہوئی تو غیر مسلم ڈرائیور نے بھی ان مسلمانوں کو قتل کرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کو بھی قتل کردیا گیا۔ بعد میں اس اندوہناک قتل عام کا سبب یہ بتایا گیا کہ اواخر اپریل ۲۰۱۲ء میں مسلمانوں نے جو دونوں مسلم عورتوں کو اجتماعی زیادتی کے بعد قتل کردیا تھا، یہ اس کا انتقام ہے حالانکہ ان کو غیر مسلموں نے اسلام لانے کی پاداش میں قتل کیا ہے، نیز نو مسلم عورتوں کے قتل کا واقعہ تنگوک شہر میں پیش نہیں آیا تھا پھر تنگوک شہر میں تبلیغی حضرات کو کیوں قتل کیا گیا، اس پر بھی اتفاق ہے کہ شہید ہونے والے دس تبلیغی حضرات کا تعلق نہ تنگوک شہر سے تھا اور نہ ہی اس بستی سے تھا جس میں نو مسلم عورتوں کے قتل کا سانحہ پیش آیا ہے پھر ان بے قصوروں کو کیوں قتل کیا گیا؟

بہرحال دس مسلمانوں کے قتل عام کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی اور پورے ارکان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔

(۲) ۸؍جون ۲۰۱۲ء کو ہاتھی پاڑہ (منگڈو کے شمال میں ایک مسلم بستی ہے) میں لڑائی ہوئی جس میں تین مسلمان شہید اور سات زخمی ہوگئے۔ اسی دن منگڈو شہر کی بڑی جامع مسجد (منشی کی مسجد) کو مقفل کیا گیا اور لڑائی کے نتیجے میں آٹھ مسلمان شہید ہوگئے، جبکہ منگڈو شہر کے اطراف میں متعدد مگھ بستیوں کو نذر آتش بھی کردیا گیا، قتل عام اور دست بدست لڑائی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۳) ۱۰؍جون ۲۰۱۲ء کے بنگلہ دیشی اخبارات کے مطابق حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب اور ڈاکٹر نجم الدین صاحب کو شہید کردیا گیا، ۲۷؍بستیاں نذر آتش کردی گئیں اور نو سو مسلمان شہید اور ایک سو مگھ قتل ہوئے۔ ''ہفت روزہ ضرب مومن'' کراچی ۲۹؍جون کے مطابق برمی حکومت نے سات سو مسلمانوں کو ہاتھ پیر باندھ کر سمندر (دریائے ناف) میں پھینک دیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ روزنامہ امت کراچی ۲۹؍جون کے مطابق اب تک سات سو مسلم بستیاں نذر آتش کردی گئیں، نوے ہزار روہنگیا مسلمانوں نے ہجرت کی، اکیاب کی تمام مسلم بستیاں جلادی گئیں اور پچاس ہزار سے زائد افراد مارے گئے، ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۴) رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ تباہی اکیاب میں آئی، مسلم بستیاں نذر آتش کردی گئیں، مساجد و مدارس جلادئے گئے، لوگوں کو گھروں سے نکال دیا گیا، صرف اکیاب میں پانچ سو کے لگ بھگ مسلمان شہید اور تین سو کے لگ بھگ غیر مسلم مقتول ہوئے جبکہ انتقاماً مگھوں کے معبد خانے بھی جلادئے گئے۔ برمی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ قتل عام کا سلسلہ شروع ہوگیا تو حکومت نے ہر بستی میں مسلح افراد بھیج دئے، یہ مسلح افراد ہوائی فائرنگ کرتے ہیں، غیر مسلموں کی مدد کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو بھی مسلمان گھروں سے نکلیں گے ان کو گولیوں سے بھون ڈالا جائے گا، یوں مسلمان بے دست وپا ہوگئے اور گھروں میں مقید ہوکر بھوکوں مرنے لگے۔

(۵) ۱۵؍جون ۲۰۱۲ء بروز جمعہ حکومت برمانے اعلان کیا کہ تاحکم ثانی ارکانی مسلمان نماز جمعہ کے لئے مسجدوں میں نہ آئیں بلکہ گھروں میں پڑھ لیں کیونکہ مجمع جمع ہونے سے امن وامان متاثر ہوگا، اسی طرح عشاء اور فجر کی نمازوں کے لئے بھی مسجدوں میں آنے سے پرہیز کیا جائے، خلاف ورزی کی صورت میں سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اس اعلان سے ارکان کی بہت سی مسجدوں میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی گئی اور نہ ہی لوگ گھروں سے باہر

نکلے۔ بہر حال ہفتہ عشرہ کے بعد جب یہ خونی مقدمہ عالم اسلام تک پہنچا اور میڈیا میں لاشوں کی تصویریں شائع ہونے لگیں تو برمی افسروں نے مسلم علاقوں کے سرکردہ مسلمانوں اور لیڈروں کو یہ کہہ کر بلانا شروع کردیا کہ ضروری میٹنگ میں حاضر ہونا ہے، جب یہ سرکردہ لوگ میٹنگوں میں پہنچنا شروع ہوئے تو خفیہ ایجنسی نے بہت سے افراد کو غائب کردیا جواب تک لاپتہ ہیں۔

(۶) ۱۸؍جون ۲۰۱۲ء بوسیدنگ میں مینگزی نامی ایک زرخیز اور مردم خیز مسلم علاقہ ہے جہاں ایک بہت بڑا دینی ادارہ بنام ''جامعہ ریاض العلوم'' ہے، جس میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے اور ہزاروں طلبہ علمی پیاس بجھاتے ہیں، اس جامعہ کے بااختیار مہتمم اور بنیادی کردار شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے آخری خلیفہ (برما میں) مولانا پیر مظفر احمد مینگزیؒ، متوفی ۲۱؍ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ/۲۲؍جنوری ۲۰۰۶ء تھے۔ اتنے بڑے جامعہ اور ملحق جامع مسجد کو برمی درندوں نے شہید کردیا ہے، اس طرح اور بھی بہت سی مسجدوں اور مدرسوں کو شہید کردیا گیا ہے۔

(۷) ۱۲؍جون ۲۰۱۲ء میں اندرون ارکان کے بعض معتبر دوستوں نے فون پر بتایا کہ برمی فوج مسلم بستیوں سے لڑنے کے قابل مسلم نوجوانوں کو چھاپے مار کر گرفتار کرکے لے جارہی ہے اور اب تک ہزاروں سے زائد نوجوانوں کی گرفتاری عمل میں آچکی ہے۔ گرفتاری کے بعد ان کو مختلف طریقوں سے ماردیا جاتا ہے، چنانچہ سات سو مسلمانوں کی لاشیں دریائے ناف کے مغربی کنارے میں ملیں جن کو بنگلہ دیشی عوام وحکام نے اٹھایا اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے تھے۔

(۸) ایک معروف یورپی خبر رساں ادارے ''ریڈ فری یورپ'' (بحوالہ امت، کراچی ۲۶؍جون ۲۰۱۲ء) کی رپوٹ کے مطابق بنگلہ دیشی ساحلوں سے ملحق سمندر میں برمی حکومت گن شپ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے ان کشتیوں کو تباہ کررہی ہے جن سے روہنگیا

بغرض پناہ بنگلہ دیش فرار ہورہے ہیں، اس طرح مسلمانوں سے بھری بہت سی کشتیاں سمندر میں ڈوب گئیں اور ان میں موجود سارے مسلمان غرق آب ہوگئے۔

حکومت بنگلہ دیش اور ارکانی مہاجرین:

ارکان کے مغرب میں مسلم ملک بنگلہ دیش ہے جہاں اس وقت نسوانی (حسینہ واجد کی) موت ہے، ارکانی مسلمانوں کے لئے جائے پناہ، جائے ہجرت اور جائے فرار یہی ملک ہے، اس لئے یہ لوگ برمی حکوت کے مظالم سے تنگ آکر جان بچانے کی خاطر وقتاً فوقتاً اس طرف ہجرت کرتے ہیں، اس وقت بنگلہ دیش کے چند کیمپوں (محسنی کیمپ اور کتو پلنگ کیمپ وغیرہ) میں لگ بھگ پانچ لاکھ ارکانی مہاجرین خاردار احاطہ میں مقید ہوکر ۱۹۹۱ء سے زندگی کے بدترین لمحات گن رہے ہیں، جس کی المناک داستان کتاب ''مرحوم ارکان کے مظلوم مسلمان'' میں ہے۔

یہ مسلم ملک فوجی اور معیشت کے اعتبار سے نہایت کمزور ہے اور انڈیا کے ماتحت ہے اس لئے یہ ملک ارکانی مہاجرین کو بحیثیت انصار وہ حقوق نہیں دے پارہا ہے جو ان کا حق ہے، اس لئے مہاجرین یہاں آکر مزید ظلم وستم کی چکی میں پستے ہیں، اس دفعہ (جون ۲۰۱۲ء میں) بھی بہت سے ارکانی مسلم مہاجرین نے یہاں آنے کی کوشش کی لیکن ان کو یہاں آنے سے روک دیا گیا اس لئے یہ مہاجرین دریا میں غرق ہوگئے اور بہت سے برمی فوجوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

بنگلہ دیش کے بعض دینی اداروں کے سرکردہ لوگوں اور سیاسی لیڈروں نے بنگلہ دیش میں ارکانی مسلمانوں کے حالیہ ظلم وستم کے حوالے سے مظاہرے کئے اور احتجاج کیا لیکن حکومت بنگلہ دیش نے اس طرح کے مظاہروں پر پابندی لگادی اور جامعہ دار السنۃ نہیلہ کا کس بازار کے مہتمم مولانا افسر الدین جان سمیت بہت سے سرکردہ حضرات کو گرفتار کرکے

جیل میں ڈال دیااور ان پر یہ الزام عائد کیا کہ یہ لوگ مظاہرے کرکے ارکانی مسلمانوں کو جنگ کے لئے ابھار رہے ہیں، یوں بنگلہ دیش کے انصاف پسند مسلمان بھی صدائے احتجاج بلند کرنے سے قاصر رہے۔

کاش حکومت بنگلہ دیش انسانیت کے ناطے اور اسلام کے رشتے کے پیش نظر انصار کے حقوق ادا کرتی، ارکانی سرحد میں فوج نہ بھیجتی، جان بچاکر آنے والے ارکانی مسلمانوں کو پناہ دیتی، بنگلہ دیش میں موجود تربیت یافتہ مجاہدین کو ارکان جانے دیتی اورارکانیوں کا مقدمہ عالمی عدالت میں لے جاتی تو آج ارکان کا نقشہ کچھ اور ہوتا، لیکن یہ تمنائیں خاک میں مل کر رہیں۔

مصدقہ اطلاع کے مطابق حکومت بنگلہ دیش نے ارکان اور بنگلہ دیش کے درمیان سرحد میں فوج بھیج دی اور بنگلہ دیش میں موجود ارکانی مہاجرین کے کیمپوں کو گھیراؤ میں لے لیا تاکہ یہاں سے کوئی مسلمان ارکان جاکر مجروح مسلمانوں کی مدد نہ کرسکیں اور نہ ہی ارکانی مسلمان بغرض پناہ ہجرت کرکے یہاں آسکیں، چنانچہ ۱۲/جون ۲۰۱۲ء کو روزنامہ امت کراچی کے مطابق تین سو ارکانی مسلمان برما کے مظالم سے بچنے کے لئے آٹھ کشیوں میں سوار ہوکر دریائے ناف پار کرکے بنگلہ دیش آرہے تھے لیکن حکومت بنگلہ دیش نے انہیں پناہ دینے سے انکار کردیا اور انہیں دوبارہ موت کے منہ میں جھونک دیا، بنگلہ دیشی بارڈرز کے میجر شفیق الرحمٰن نے بتایا کہ خواتین وبچے زاروقطار رو رہے تھے، اس طرح ارکانی مسلمانوں کے لئے ارکان تنگ ہونے کے ساتھ بنگلہ دیشی زمین میں بھی تنگ ہوگئی اور لوگ تڑپ تڑپ کر جان دینے پر مجبور ہوگئے، دوسری طرف عالم اسلام اور مسلم ممالک بھی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

اب ہم چند معروف اخبارات کی رپورٹیں شائع کررہے ہیں جن سے حکومت بنگلہ دیش کی سنگ دلی کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ بنگلہ دیشی اخبار ''اتفاق'' اور ''نیوز'' ۲۴/جون ۲۰۱۲ء کے مطابق بنگلہ دیشی وزیراعظم حسینہ واجد کے احکامات پر سیکورٹی فورسز نے بنگلہ دیش پہنچنے والی کم ازکم چار سو کشتیوں (جن میں روہنگیاں مسلمان تھے) اور ان میں سوار ہزاروں روہنگیا مردوں، عورتوں اور بچوں کو واپس بھیج دیا اور انہیں پناہ دینے سے صاف انکار کردیا۔

☆ بنگلہ دیشی جریدہ ''اتفاق'' (بحوالہ امت، کراچی ۲۶/جون ۲۰۱۲ء) کے مطابق بنگلہ دیشی وزیرخارجہ دیپو موتی نے سخت الفاظ میں کہا ہے کہ بنگلہ دیش میانمار (ارکان برما) سے بنگلہ دیش آنے والے روہنگیا پناہ گزینوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے نہیں دے گا، جب وزیر موصوف سے اقوام متحدہ کے ادارے یواین ایچ سی آر نے مطالبہ کیا کہ وہ ان کو پناہ کیوں نہیں دے رہا ہے؟ تو اس پر وزیر موصوف نے کہا کہ بنگلہ دیش کسی کی پرواکئے بغیر قطعاً پناہ نہیں دے گا۔

☆ اقوام متحدہ اور امریکی تنظیموں نے بنگلہ دیش سے مطالبہ کیا کہ وہ ان پناہ گزینوں کو پناہ دے لیکن بنگلہ دیش نے صاف انکار کردیا۔

☆ امریکی جریدہ ''لاس دیگاس سن'' نے رپورٹ شائع کی کہ بنگلہ دیشی سیکورٹی فورسز حیرت انگیز طور پر پناہ لینے کے لئے آنے والے روہنگیا مسلمانوں کی کشتیوں کو پکڑ پکڑ کر میانمار کی سیکورٹی فورسز اور نیول سیکورٹی فورسز کے حوالے کررہی ہے۔ ہمیں اس پر زیادہ افسوس نہیں ہے کہ عرصۂ دراز سے ارکانی مسلمانوں کو قتل کیا جارہا ہے اور ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جارہا ہے، اس پر بھی زیادہ دکھ نہیں ہے کہ ارکانی مسلمانوں کو ہر قسم کے حقوق سے محروم کردیا گیا ہے، لیکن افسوس صد افسوس اس پر ہے کہ ارکانی مسلمانوں کا یہ خونی مقدمہ اب تک عالمی عدالت میں کیوں نہیں پہنچا؟ عالمی میڈیا اور اخبارات وجرائد میں شہ سرخیوں کے ساتھ اس سانحۂ عظمی کی خبر کیوں شائع نہیں ہوئی؟ دنیا کے کسی بھی گوشے اور کونے میں ظلم وستم کا جب بھی کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس کی خبر عالمی میڈیا کی زینت بن جاتی ہے لیکن

ارکانی مسلمان اب تک اس حق آزادی سے محروم کیوں؟ ہم عالم اسلام کے غیور حکمرانوں، مسلم لیڈروں، انصاف پسند افسروں اور این جی اوز کے کارندوں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ اس نازک صورت حال کا نوٹس لیا جائے، برمی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور ارکانی مسلمانوں کی جان اور عزت وآبرو کی حفاظت کی پوری کوشش کی جائے ورنہ روز محشر اللہ کے سامنے اس کا حساب دینا ہوگا۔

حسینہ واجد کا غیر انسانی کردار:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بنگلہ دیش کے علماء وعوام روہنگیا مسلم مہاجرین کے حتی المقدور تعاون اور مدد کرنا چاہتے ہیں اور کرنے کی کوشش بھی کررہے ہیں، لیکن بنگلہ دیش کی موجودہ سیکولر نسوانی (حسینہ واجد) حکومت اس میں سد سکندر بنی ہوئی ہے، یہ حکومت ان بے چاروں پر رحم کے بجائے سفاکیت اور بربریت کا مظاہرہ کررہی ہے، کاش یہ حکومت انصار مدینہ کا کردار ادا کرتی یا کم از کم پاکستان کے نقش قدم پر چلتی تو ان مظلوموں کو سہارا ملتا اور ارکان آزاد ہوتا۔ یہ نسوانی حکومت نہ صرف خود مدد نہیں کررہی ہے بلکہ جو مسلم تنظیمیں اور عالمی انصاف پسند جماعتیں بنگلہ دیش میں موجود ارکانی مہاجرین کی مدد کررہی تھیں یا تعاون کرنا چاہ رہی تھیں ان سب پر یہ کہہ کر پابندی عائد کردی کہ ان تنظیموں کی مدد سے ارکانی مہاجرین مزید یہاں آئیں گے۔ اس لئے جماعت اسلامی کے موجودہ صدر جناب منور حسن صاحب نے بیان جاری کیا کہ حسینہ واجد انسان کہلانے کے مستحق بھی نہیں ہے۔
بحوالہ روز نامہ امت کراچی ۴؍اگست ۲۰۱۲ء۔

دیکھئے ۱۹۹۱ء سے ارکان مہاجرین کی بنگلہ دیش آمد جاری ہے، اس وقت بہت سی اسلامی تنظیمیں اور عرب جماعتیں ان مہاجرین کی مدد کی غرض سے وہاں پہنچیں اور مہاجرین کی مدد کے ساتھ حکومت بنگلہ دیش کی مدد بھی شروع کردی لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد حکومت بنگلہ

دیش نے تمام اسلامی رفاہی جماعتوں پر پابندی لگادی اور درجنوں سے زائد تنظیموں کے سربراہوں کو جیل بھیج دیا جس کی زندہ مثال ایک رفاہی جماعت ''خدام القرآن'' ہے، اس کے امیر مولانا ساجد پنجابی نے ۱۹۹۶ء سے کام شروع کیا، بنگلہ دیش میں ۵۰۰ کے لگ بھگ مکاتب قائم کئے اور ساتھ ارکانی مہاجرین کی مدد بھی شروع کردی، لیکن حکومت بنگلہ دیش نے اس پر پابندی عائد کردی اور امیر صاحب سمیت درجنوں افراد کو ۱۹۹۷ء میں گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔ اب یہ لوگ ''خدام القرآن'' کے نام سے کراچی میں کام کررہے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ بنگلہ دیش میں اسلامی جماعتوں پر پابندی عائد کرکے عیسائی جماعتوں کو کام کرنے کی سہولت عطا کی گئی یوں بنگلہ دیش کے طول وعرض پر عیسائی این جی اوز اور غیر مسلم جماعتیں پہنچ گئیں جو غربت اور افلاس ختم کرنے کی آڑ میں سادہ لوح مسلمانوں اور ارکانی مہاجرین کے ایمان خریدنے کے ساتھ نئی نسل کو غیر مسلم بنارہی ہیں۔ خود عیسائی کا بیان ہے کہ یہ ملک عیسائیت کی تبلیغ کے لئے نہایت موزوں ہے۔

۱۹۹۰ء سے حکومتی اجازت سے یہاں تین جماعتیں کام کررہی تھیں جو یہ ہیں (الف) فرانس کی تنظیم ڈاکٹرز ود آؤٹ بارڈرز۔ (ب) ایکشن اگینسٹ ہنگر۔ (ج) برطانیہ کی مسلم ایڈ کو۔ یہ عالمی ادارے ارکانی مہاجرین کو صحت کی سہولیات، تربیت، ہنگامی خوراک اور پینے کا پانی وغیرہ فراہم کرتے ہیں، لیکن حسینہ واجد کی حکومت نے یکم اگست ۲۰۱۲ء میں ان پر پابندی عائد کردی تاکہ ارکان مہاجرین کی مدد نہ ہوسکے اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ یہ ادارے ارکان سے روہنگیا مسلمانوں کی بنگلہ دیش آمد کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ (روزنامہ امت کراچی ۳؍اگست ۲۰۱۲ء) حسینہ واجد کا یہ بیان بھی روزنامہ امت کراچی ۳۰؍جولائی ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے کہ بنگلہ دیش کسی بھی طرح ارکانیوں کو قبول نہیں کرے گا۔ یہی بیان صدر برما کا بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ لوگ پھر کدھر جائیں، درمیان میں تین چار کلومیٹر چوڑا دریائے ناف ہے، وہیں غرق ہوجائیں۔

کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ بنگلہ دیش میں لاکھوں کی تعداد میں مگھ، غیر مسلم اور ہندو آباد ہیں اور انہیں ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں لیکن ارکانی مسلمانوں کو دھتکارا جاتا ہے۔اس ناانصافی اور امتیازی سلوک کا عنوان کیا ہو؟

ارکانی مسلمانوں پر نئی پابندیاں:

قارئین کرام! آپ کو معلوم ہے کہ برمی حکومت، آرمی اور مگھ دہشت گردوں نے ۳؍جون ۲۰۱۲ء سے روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا جس کا سلسلہ تاحال (۱۰؍اگست ۲۰۱۲ء) جاری ہے۔اس قتل عام کے خونی مناظر، تڑپتی لاشوں، خاکستر شدہ نوجوانوں، روتی عورتوں، جلتی ہوئی مسلم بستیوں، نذرآتش شدہ دکانوں ومکانوں، پناہ گزین ارکانیوں، زخم خوردہ مسلمانوں، بلبلاتے بچوں، چلاتے بوڑھوں اور سسکتی ہوئی انسانیت کے دل دہلا دینے والے مناظر عالمی میڈیا، انٹرنیٹ اور اخبارات وجرائد میں آچکے ہیں جس سے ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل غمزدہ ہے۔نہ جانے یہ سلسلہ مزید کب تک جاری رہے گا؟ اور امت مسلمہ کب تک خاموش تماشائی بنی رہے گی۔مصدقہ رپورٹ کے مطابق ۵؍جولائی ۲۰۱۲ء سے برمی حکومت نے ارکانی مسلمانوں کے استیصال کا جو طریقہ ایجاد کیا ہے وہ مستند ذرائع کے مطابق درج ذیل ہے۔

☆ ہر بستی سے ان نوجوانوں کو گرفتار کرکے لے جانا پھر ماردینا جن کی عمریں بیس اور پچاس سال کے درمیان ہیں، اس طرح ہزاروں افراد کو گرفتار کرکے مارا جاچکا ہے۔بعض جوانوں کو بھاری رقم (بری ٹیاں چالیس وپچاس لاکھ) لے کر چھوڑ بھی دیا جاتا ہے، لیکن اتنی بڑی رقم کم لوگ ہی ادا کرپاتے ہیں، اس گرفتاری سے بچنے کے لئے ہزاروں باقی ماندہ نوجوان پہاڑوں اور دریا کے کناروں میں رات گزارنے یا فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔
(روزنامہ امت کراچی ۵؍جولائی ۲۰۱۲ء۔ارکان سے مصدقہ رپورٹ)

☆ ارکان کی تین سو حساس مسجدوں میں عشاء، فجر، جمعہ اور تراویح کی نمازیں باجماعت پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔یوں یہ مسجدیں عملاً مقفل ہوگئیں، بعض مسجدوں میں لوگوں نے جمعہ، عشاء اور تراویح کی نمازیں پڑھنے کی کوششیں کیں لیکن برمی فوجوں نے ان کو گرفتار کرلیا اور ماردیا۔(عرب ویب سائٹ المحیط، امت کراچی ۱۹؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ سحر وافطار کے اعلانات پر پابندی لگادی گئی، گھروں میں بھی تراویح میں قرآن سنانے اور سننے کو ممنوع قرار دیا گیا اور کسی بھی مسجد میں لاؤڈاسپیکر پر اذان دینے سے منع کردیا گیا اور خلاف ورزی کی صورت میں سخت سزا دینے کا اعلان ہوا یوں ارکان کی مسجدیں مقفل اور نمازیوں سے خالی ہوگئیں۔(عرب ویب سائٹ المحیط، روزنامہ امت کراچی ۱۹؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ ۱۴؍جولائی ۲۰۱۲ء میں منگڈو شہر کے بڑے پادری (مذہبی عالم وٹور) نے منگڈو وبوسیدنگ کے تمام سرکردہ مگھوں کو جمع کرکے اعلان کیا کہ مسلمانوں کو خورد ونوش کے سامان نہ فروخت کئے جائیں اور نہ ہی خریدے جائیں۔اس خطرناک اعلان سے مسلمان بھوکوں مرنے پر مجبور ہوگئے۔اگر اکا دکا سامان فروخت اور خریدا بھی جارہا ہے تو وہ مہنگے داموں اور چھپ چھپائے۔(روزنامہ امت کراچی ۲۹؍جولائی ۲۰۱۲ء) مصدقہ اطلاع کے مطابق جو مسلمان سامان خریدنے جاتے ہیں ان سے وہ سامان چھین لئے جاتے ہیں۔

☆ بوقت سحری اور رات میں چولہے جلانے پر پابندی عائد کردی گئی، جس سے سحری کا کھانا یا تو دن میں پکالینا پڑتا ہے یا بغیر سحری روزے رکھنے پڑرہے ہیں۔(روزنامہ امت کراچی ۲۹؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ حکومت برما مسلم نوجوانوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے گرفتار کرکے قتل کررہی ہے اور بہتوں کو عقوبت خانوں میں ڈال رہی ہے، روزنامہ اسلام کراچی کی رپورٹ کے مطابق اب تک ہزاروں مسلم نوجوانوں کو غائب کیا جاچکا ہے۔عرب ویب سائٹ المحیط کے مطابق

مصدقہ اطلاع کے مطابق پانچ ہزار سے زائد افراد کو غائب کیا جا چکا ہے۔ الجزیرہ ٹی وی کے مطابق پانچ ہزار سے زائد مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر کے یا تو مار دیا گیا یا عقوبت خانوں میں ڈال دیا گیا۔ (روزنامہ امت کراچی ۴؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ پوری دنیا سے کٹا ہوا ارکان: حکومت برما اپنے کالے قانون کے تحت کسی بھی میڈیا، اخباری نمائندہ، صحافی، مضمون نگار، رفاہی جماعت، خیری تنظیم وغیرہ کو ارکان جانے نہیں دیتی اس لئے وہاں کی خبریں دنیا تک بہت ہی کم اور بعد میں پہنچتی ہیں اور اب جو عالمی تنظیمیں موجودہ ارکانی متاثرین ومہاجرین کے لئے امداد بھیج رہی ہیں وہ حکومت برما وصول کرتی ہے اور اکثر حصہ اپنے پاس رکھ کر برائے نام امدادی کیمپوں (جو عالمی اداروں کے قائم کردہ ہیں) میں دیتی ہے لیکن اس کا نوٹس لینے والا کوئی نہیں۔ (مصری جریدہ الوطن، روزنامہ امت کراچی ۲۹؍جولائی ۲۰۱۲ء روزنامہ اسلام کراچی، ۵؍اگست ۲۰۱۲ء) دیکھئے انصار برنی ٹرسٹ انٹرنیشنل کے سربراہ انصار برنی نے ارکانی مسلمانوں کا معائنہ ومشاہدہ کرنے اور انٹرویو لینے کی غرض سے برما جانے کے لئے میانمار ایمبیسی میں ویزہ کی درخواست دی جو مسترد ہوگئی۔ (روزنامہ جنگ کراچی ۵؍جولائی ۲۰۱۲ء) البتہ ۱۹؍اگست ۲۰۱۲ء میں عالمی دباؤ کے تحت برمی صدر نے OIC اور دیگر بعض تنظیموں کو ارکان جانے اور امدادی کارروائی شروع کرنے کی اجازت دی ہے۔

ارکانی مسلمانوں کے قتل عام پر چند عالمی تنظیموں کا سخت ردعمل:

برمی حکومت نے ۳؍جون ۲۰۱۲ء سے ارکانی مسلمانوں کی نسل کشی اور قتل عام کا جو سلسلہ شروع کیا وہ تا حال (۱۰؍اگست ۲۰۱۲ء) جاری ہے۔ اس منظّم نسل کشی اور علانیہ قتل عام کو دیکھ کر انصاف پسند جماعتیں اور غیر مسلم تنظیمیں بھی حکومت برما کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے مظاہرے کرنے اور مذمتی بیان جاری کرنے پر مجبور ہوگئیں۔

آیئے اس طرح چند جماعتوں کا اجمالی خاکہ درج کرتے ہیں۔

☆ جرمن ریڈیو: جرمن ریڈیو ڈوچے ویلے نے اپنی نشریات میں کہا کہ روہنگیا مسلمان روئے ارض پر سب سے زیادہ ستائی ہوئی قوم ہے۔ (روزنامہ امت کراچی ۱۵؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ اقوام متحدہ کا ایک ادارہ: اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے کی سربراہ ناوی پلے نے کہا کہ روہنگیا مسلمانوں کے قتل عام میں برمی آرمی بھی شریک ہیں۔ (روزنامہ امت کراچی، ۳۰؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ ایمنسٹی انٹرنیشنل: انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' نے اپنی حالیہ رپورٹ میں کہا ہے کہ برمی فورسز اور مگھ دہشت گرد مسلمانوں کے خلاف سنگین امتیازی کارروائیاں کر رہے ہیں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ان کو کھلی چھٹی دے دی ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اب تک دس ہزار سے زائد روہنگیا نوجوان لاپتہ اور ۹۰ ہزار افراد نے ہجرت کی۔ (ہفت روزہ ضرب مومن کراچی ۲۷؍جولائی ۲۰۱۲ء روزنامہ اسلام کراچی ۳۰؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ ہیومن رائٹس واچ: انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ''ہیومن رائٹس واچ'' نے ۵۶ صفحات پر مشتمل ایک تحقیقاتی رپورٹ جاری کی ہے جس کے چند اقتباسات یہ ہیں۔ برما کی فوج مسلمانوں کے قتل عام اور مسلم خواتین کی بے حرمتی کی مجرم ہے، دوشیزاؤں سے جنسی زیادتی کرنے، مسلمانوں کے املاک کو نقصان پہنچانے، مسلم بستیوں کو جلانے، قتل وغارت گری کرنے میں برمی حکومت برابر شریک ہے۔ (روزنامہ اسلام کراچی، ۳؍جولائی، ۳؍اگست ۲۰۱۲ء)

☆ جرمن جریدہ: جرمن جریدے دار اسپی جیل نے لکھا ہے کہ روئے ارض پر فی الوقت سب سے زیادہ ستائی جانے والی قوم روہنگیا مسلمان ہیں، جن کے بارے میں عالمی ادارے،

حکومتیں اورخودامت مسلمہ کی خاموشی افسوسناک امر ہے۔(روزنامہ کراچی،۵/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆اقوام متحدہ: عالمی ادارہ اقوام متحدہ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ مشکلات کے شکار روہنگیا قوم ہے۔(روزنامہ امت کراچی،۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ لارڈ نذیر احمد: برطانوی ہاؤس آف لارڈز کے تاحیات رکن لارڈ نذیر احمد نے برما میں مسلمانوں کی نسل کشی اورقتل عام پر سخت احتجاج کیا ہے اورایک احتجاجی خط برمی سفیر کے پاس بھی روانہ کیا ہے۔(روزنامہ جنگ واسلام کراچی،۲۸، جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ جریدہ الوطن: مصری جریدہ الوطن نے لکھا ہے کہ برما میں مسلمانوں کی نسل کشی ہورہی ہے۔قتل عام ہورہا ہے، برما کے اندر موجود امدادی کیمپوں میں مسلمانوں کو سور کا گوشت کھانے اورشراب پینے پر مجبور کیا جارہا ہے، مسلم لڑکیاں عزت وعفت بچانے کی خاطر خودکشی کررہی ہیں اوراپنے آپ کو دریا کے حوالے کررہی ہیں۔

برمی حکومت عالمی تنظیموں کو برما کے اندر جانے نہیں دیتی، خصوصاً ارکان میں، اب تک کی اطلاع کے مطابق ۷۰۰ مسلم بستیوں کو جلا دیا گیا۔۲۰۰ دیہات اور ۱۶۰۰ مکانات نذرآتش کردئے گئے۔(ہفت روزہ سمندر پار، روزنامہ اسلام کراچی، ۱۷/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ انڈونیشی عوام وعلماء نے برما میں مسلمانوں کے قتل عام سے متعلق زبردست احتجاج کیا اور برمی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے۔ (روزنامہ امت کراچی ۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ ریڈوآسٹریلیا نے اپنی نشریات میں کہا ہے کہ میانمار کی فورسز مسلمانوں کی نسل کشی، قتل عام، املاک کونقصان پہنچانے، بستیوں کوجلانے اورنوجوانوں کوگرفتار کرنے میں ملوث ہیں۔(روزنامہ امت کراچی ۱۵/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆امریکی تنظیم: ایک امریکی ادارے نے جنوری ۲۰۱۲ء میں ایک رپورٹ شائع کی، جس میں کہا گیا کہ برما سرکار کی ریکارڈ میں روہنگیا مسلمانوں کے ۴۰ ہزار بچوں کے نام تک

درج نہیں ہیں۔۱۹۸۲ء کے قانون کے مطابق روہنگیا مسلمان برما کے باشندے اورشہری نہیں ہیں اور دو سے زائد بچے پیدا کرنے پر بھی پابندی ہے۔(جنگ سنڈے میگزین کراچی،۲۲/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆اوآئی سی: اسلامی تنظیم اوآئی سی کا ایک ہنگامی اجلاس گزشتہ اتوار کوسعودی عرب کے شہر جدہ میں منعقد ہوا جس میں مسلم ممالک کے مندوبین کثیر تعداد میں شریک ہوئے اورسب نے متفقہ قرارداد میں کہا کہ عالم اسلام برمی مسلمانوں کی مدد کریں اورعالم دنیا کو برما کے مظالم پر آگاہ کریں۔تنظیم کے سکریٹری جنرل پروفیسر اکمل الدین احسان اوگلو نے برمی مسلمانوں کے وحشیانہ قتل عام پر سخت الفاظ میں احتجاج کیا ہے۔(روزنامہ اسلام کراچی ۲/اگست ۲۰۱۲ء)

☆ جماعت اسلامی: ارکانی مسلمانوں کی نسل کشی اور قتل عام پر سب سے اہم اور بنیادی احتجاج اورمظاہرہ جماعت اسلامی نے کیا ہے۔

☆ وفاق المدارس: وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے سخت مذمتی بیان جاری کیا ہے جوروزنامہ اسلام کراچی، ۲۰/جولائی ۲۰۱۲ء سمیت مختلف اخبارات میں شائع ہوا۔

☆ جمعیت علمائے اسلام پاکستان: اس اسلامی جماعت نے بھی اس مسئلے پر سخت مذمتی بیان جاری کیا، مظاہرہ واحتجاج کیا اور ریلیاں نکالیں بلکہ پاکستانی قومی اسمبلی میں مذمتی قرارداد منظور کرائی۔(ہفت روزہ دور فتح کراچی، ۱۳/جولائی ۲۰۱۲ء)ہفت روزہ رفقاء کراچی، ۱۳/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆سوشل ویب سائٹس: ارکانی مسلمانوں کے قتل عام کے خونی مناظر، دلدوز تصاویر اور اجتماعی لاشیں اس ویب سائٹ میں دکھائی گئیں۔(روزنامہ اسلام کراچی، ۱۶/جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ انٹرنیشنل ختم نبوت: اس جماعت نے بیان جاری کیا کہ برما میں مسلمانوں کا قتل عام المیہ ہے اور مسلم دنیا کوغفلت کی روش پر نظرثانی کرنی ہوگی۔(روزنامہ امت کراچی، یکم جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ دفاع کونسل پاکستان: اس جماعت نے بھی ارکانی مسلمانوں کے قتل عام پر سخت نوٹس لیا، مظاہرہ کیا اور مذمتی بیان جاری کیا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۱۲؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ سپاہ صحابہ پاکستان: اس جماعت کے امیر مولانا محمد احمد لدھیانوی نے سخت انداز میں حکومت برما کی مذمت کی اور ارکانی مسلمانوں کے ساتھ ہر ممکن مدد کی یقین دہانی کرائی۔ (روزنامہ اسلام کراچی، ۲۵؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ جماعۃ الدعوۃ: اس جماعت کے امیر پروفیسر حافظ محمد سعید نے بھی ارکانی مسلمانوں کی نسل کشی کا سخت نوٹس لیا، مظاہرہ کیا اور احتجاج کیا۔ (روزنامہ اسلام کراچی، ۳۰؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ تنظیم اسلامی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی اس جماعت نے ارکانی مسلمانوں کے قتل عام کا سخت مذمتی بیان جاری کیا اور ارکانی مہاجرین کے ساتھ ہر ممکن مدد کی یقین دہانی کرائی۔ (روزنامہ جنگ کراچی یکم اگست ۲۰۱۲ء)

☆ جمعیت علماء پاکستان: اس جماعت کے امیر ڈاکٹر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر نے حکومت برما کی سخت مذمت کی اور مسلم سربراہان کی خاموشی کو مجرمانہ فعل قرار دیا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۳۰؍جولائی ۲۰۱۲ء)

☆ سالانہ امریکی رپورٹ: دنیا بھر میں مذہبی آزادی کے حوالے سے جاری کردہ سالانہ امریکی رپورٹ کے مطابق میانمار (برما) کے روہنگیا مسلمانوں کو بدترین امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ وہ صحت اور تعلیم جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں جب کہ رہائشی علاقوں سے ان کے بلا اجازت نکلنے پر بھی پابندی ہے، انہیں مستقل شہریت کے بجائے عارضی رہائشی پرمٹ دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ شادی اور بچوں کی پیدائش کے لئے بھی حکومت اجازت درکار ہوتی ہے۔ (روزنامہ اسلام کراچی، ۵؍اگست ۲۰۱۲ء)

☆ OIC (آرگنائزیشن اسلامک کانفرنس): یعنی اسلامی سربراہی کانفرنس مسلم

ممالک کے سربراہوں کی ایک عالمی تنظیم ہے جس کا مکمل تعارف راقم کی کتاب ''عالمی تحریکات ومنظمات'' میں ہے، روز قیام (ستمبر ۱۹۶۹ء) سے اب تک اس کے صرف دو مرتبہ غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا، پہلا غیر معمولی اجلاس ۱۹۸۱ء میں چار روزہ اور دوسرا ۷؍دسمبر ۲۰۰۵ء میں ہوا اور اب ۲۵؍رمضان ۱۴۳۳ھ/ ۱۴؍اگست ۲۰۱۲ء کو مکہ مکرمہ میں تیسرا غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شام کے صدر بشارالاسد کے علاوہ دیگر تمام اسلامی ممالک کے سربراہان شریک ہوئے جن کی تعداد ۶۰؍ کے لگ بھگ ہے۔

دوروزہ اجلاس کے اختتام پر اعلامیہ جاری ہوا کہ برمی حکومت روہنگیا مسلمانوں کی جو نسل کشی اور قتل عام کر رہی ہے اس کی پرزور مذمت کی جاتی ہے، ان مسلمانوں کی فوری مدد کی جائے، اس سلسلے میں تمام مسلم ممالک اپنا کردار ادا کرے۔ اسلامی ممالک اپنا وفد ارکان بھیجے تاکہ وہ متاثرین کا جائزہ لے اور ساتھ امدادی سامان بھی تقسیم کرے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یہ مسئلہ اٹھایا جائے گا۔ (روزنامہ جنگ کراچی ۱۵؍اگست ۲۰۱۲ء)

جس طرح اس تنظیم نے شام کی رکنیت عرب دول سے معطل کرنے کی سفارش کی اس طرح اسلامی ممالک سے یہ سفارش کرنی چاہی تھی کہ ہر اسلامی ملک فوری طور پر برمی سفارت خانہ بند کردے اور اس وقت تک بند رکھا جائے جب تک برمی حکومت معافی نہ مانگے اور آئندہ ایسے مظالم نہ کرنے کی یقین دہانی نہ کرائے۔

ترکی وفد کا دورہ ارکان: ترکی حکومت نے ۷؍اگست ۲۰۱۲ء میں وزیر خارجہ احمد داؤد کو میانمار (برما) بھیجا تاکہ وہ متاثرہ علاقوں کا دورہ کریں اور اس سلسلے میں حکومت برما سے مذاکرات کریں، ان کے ساتھ وفد میں ترک وزیر اعظم طیب اردگان کی اہلیہ آمنہ بھی تھیں جو کسی بھی اسلامی ملک کی وہ پہلی خاتون سربراہ ہیں جو ارکانی مسلمانوں کی حالت زار کا مشاہدہ کرنے کے لئے میانمار گئیں۔ اس وفد نے اکیاب کے چند متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا، امدادی سامان تقسیم کیا اور واپس آ گیا، واپس آنے کے بعد اس وفد نے جو تاثرات

پیش کئے وہ الجزیرہ ٹی وی، المحیط، عرب ٹی وی اور ترکی ٹی وی سمیت مختلف اخبارات وجرائد میں آچکے ہیں۔ اس کے چند اقتباسات روزنامہ امت کراچی، ۱۳؍اگست ۲۰۱۲ء کے حوالے سے پیش خدمت ہیں۔

(الف) برمی حکومتی رہنما مسلمانوں سے متعلق کسی بھی غیر ملکی یا سرکاری عہدیدار سے بات چیت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے حکومتی اہلکار طرح طرح کے بہانے تراشتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت برما کی مسلمانوں کے قتل عام میں خاص دلچسپی ہے۔

(ب) آمنہ متاثرین میں سامان تقسیم کرتے ہوئے مسلسل روتی رہیں اور کہا کہ ذرائع ابلاغ نے روہنگیا مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا عشر عشیر بھی ظاہر نہیں کیا، آمنہ کے رونے اور امدادی سامان تقسیم کرنے کی ویڈیو ایک عرب ٹی وی نے بنائی جس کو دیکھ کر آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اسی ویڈیو نے لاکھوں افراد کو رونے پر مجبور کر دیا۔

(ج) بڑی بڑی بستیاں جلادی گئیں، گھروں کے اندر مسلمانوں کو جلا دیا گیا، غیر ملکی امداد براہ راست تقسیم کرنے پر پابندی لگادی گئی، انسانی حقوق کی تنظیموں کو داخل ہونے پر پابندی لگادی گئی اور ارکان کی حالت شام کی حالت سے زیادہ نازک ہے۔ الجزیرہ ٹی وی کے مطابق اب (۷؍اگست ۲۰۱۲ء) تک حملے جاری ہیں۔

☆ برطانوی وفد کا دورۂ ارکان: برطانوی ٹی وی چینل کے ایک وفد نے ارکان کے بعض ان علاقوں کا خفیہ دورہ کیا جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، دورہ کے بعد بتایا کہ صرف سیٹوے (اکیاب) میں دس ہزار گھر اور مکانات جلائے گئے اور ساٹھ ہزار مسلمانوں کو بے دخل کیا گیا۔ (روزنامہ امت کراچی، ۱۶؍اگست ۲۰۱۲ء)

☆ بھارت نے بھی سرحد بند کردی: ارکانی مسلمانوں نے سب سے پہلے بنگلہ دیش کی طرف ہجرت کی کوشش کی لیکن بنگلہ دیش نے نہ صرف سرحد بند کردی بلکہ مہاجرین کو گرفتار

کرکے برمی فورسیز کے حوالے کئے اس لئے انہوں نے بھارت کی طرف ہجرت کی کوشش کی، اگرچہ بھارت غیر مسلم ملک ہے لیکن بھارت نے بھی میزورم اور منی پور نامی دونوں سرحدیں بند کردیں کیونکہ یہ دونوں سرحدیں برما سے ملحق اور ۱۵۰ سے زائد ارکانی مہاجرین کو گرفتار کرلیا، اس کے بعد بھارت نے بنگلہ دیش سے ملحق سرحد بھی بند کردی تاکہ یہاں سے بھی کوئی ارکانی مہاجر بنگلہ دیش نہ آسکے۔ (روزنامہ امت کراچی، ۱۳؍اگست ۲۰۱۲ء)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی جماعتوں اور تنظیموں نے برمی مسلمانوں کی حمایت اور حکومت برما کی سخت مذمت میں بیانات جاری کئے، مظاہرے کئے اور مضامین شائع کئے۔

ارکانی شہدا اور جانی و مالی نقصان کا تخمینہ:

قارئین کرام: برمی حکومت نے ۳؍جون ۲۰۱۲ء سے ارکانی مسلمانوں کا قتل عام، جلاؤ گھیراؤ، گرفتاری اور املاک کو نقصان پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا ہے جو اب (۱۰؍اگست ۲۰۱۲ء) تک جاری ہے۔ اس دوران کتنے مسلمان شہید ہوئے، کتنے لاپتہ ہوئے، کتنی مساجد ومدارس مسمار ہوئے، کتنی مسلم بستیاں نذر آتش ہوئیں اور کتنی خواتین کی عصمت دریاں ہوئیں اس کا صحیح اندازہ اور یقینی تخمینہ شاید کبھی منظر عام پر نہ آئے، کیونکہ ارکان میں ہر قسم کے صحافی اور میڈیا وغیرہ پر پابندی ہے اس لئے کس علاقہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے وہ دوسرے علاقہ والوں کو پتہ نہیں چلتا۔ پھر برما کے نیٹ ورک کے تحت وہاں موبائل رکھنا اور استعمال کرنا ہر ایک کی بس کی بات نہیں ہے۔ البتہ دریائے ناف کے کنارے میں موجود حضرات چوری چھپے بنگلہ دیشی نیٹ ورک استعمال کرتے ہیں جو قانوناً جرم ہے۔ اس لئے عام فہم انداز میں موبائل کے ذریعہ خبریں پہنچانا مشکل ہے تاہم جو بھی خبریں آرہی ہیں وہ موبائل ہی کے ذریعہ سے ہیں۔

☆☆

متفرقات

فسادمعاشرہ کے اسباب

● مولانا انور جمال قاسمی مظفر پوری

یہودیوں کو فلسطین میں از سرنو آزاد خود مختار سکونت حاصل ہوئی، عظمت رفتہ وشوکت مفقود کے باز یافت کا موقع ملا، افراد وقوم میں تیزی سے اضافے ہوئے اور مادی طاقتوں کے خزانے زمین سے ابل پڑے، دولت وثروت ان کے قدم چومنے لگی اور ان کی مردہ قومی زندگی میں نئی روح پیدا ہوگئی، عقائد واخلاق، تہذیب ومعاشرہ کی بہ اطمینان اصلاح وصفائی کا موقع ملا اور مشرکانہ رسوم ورواج، عادات واخلاق، معاشرہ وماحول سے پاک وصاف ہونے کا سنہری فرصت حاصل ہوئی اور حال ومستقبل کو توراتی خطوط پر استوار کر کے قومی زندگی تابناک بنانے کا غیبی چانس ان کو دیا گیا اور اللہ کا وعدہ ”**ثم رددنا لكم الكرة عليهم وامددنكم باموال و بنين وجعلناكم أكثر نفيرا. ان أحسنتم أحسنتم لانفسكم و ان اسأتم فلها**“ کا منظر ان کے اندر نظر آنے لگا۔

یہودی جس کی سرشت میں کج روی اور خمیر فتنے فساد کی تھی، انھوں نے اللہ کی طرف سے بطور ابتلاء وامتحان کے ملے انعام واکرام کو اصلاح معاشرہ وماحول اور تہذیب اخلاق و عادات سے کام نہ لے کر خدا مخالف کاموں میں استعمال کیا، اس سے اس کی شیطنت و شرارت میں تیزی آئی، اس کے گناہوں وبرائیوں کے گراف بڑھتے گئے اور تین ساڑھے تین صدیوں کی طویل ترین مدت ومہلت بھی مشرکانہ طرز زندگی، رسوم ورواج، اخلاق و عادات، تہذیب ومعاشرہ سے کلی اجتناب کے لیے ناکافی ہوئے اور ان کے جرائم اجتماعی

سطح پر اسی نقطے پر انھیں پہنچا دیا، جس نے قدرت کی مختلف سزاؤں کا انھیں مستحق بنا دیا اور ان پر آخری ودائمی عتاب الٰہی مسلط ہونے کا آغاز ہوا۔

ایرانی حکومت کا ستارۂ اقبال گردش میں آ گیا اور ٹھیک اس کے مخالف سمت مغرب سے یکے بعد دیگرے تین جواں نفس وتازہ دم طاقتوں کے عروج کا آغاز ہوا، شام وفلسطین ان تینوں طاقتوں کے تیغ وتفنگ آزمائی کا میدان بنا، پہلے وہ سکندر اعظم کے حملوں کے شکار ہوئے، پھر اس کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے انھیں اپنی فتوحات میں ضم کیا، اس سے وہ ہوش وحواس میں کیا آتے اور اسے اپنے کردہ گناہوں کا سزا تصور کرتے، اس نے رومیوں کی اباحیت کی انتہا کو پہنچی تہذیب کو گلے لگا لیا، مشرکانہ رومی تہذیب نے یہودیوں میں بچی ہوئی توراتی چنگاریوں کو بجھا دی، جس کی آخری سزا ''ٹیٹومس'' رومی کے حملوں سے ملی، اس خونخوار اباحیت پسند جابر بادشاہ نے یروشلم پر ایسے ہولناک حملے کئے، جس کی نظیر تاریخ انسانی میں مشکل سے ملے گی، ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا، ہزار ہا قیدی بنائے گئے، ۶۷/ ہزار غلام بنا کر فروخت کئے گئے، کئی ہزار مصری کانوں میں بامشقت کاموں پر لگا دیئے گئے ۲۷/ ہزار مختلف شہروں میں جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زنوں کے مشق تماشہ بنانے کے لیے بھیجے گئے، تمام دراز قامت خوب رو لڑکیاں فاتحین میں تقسیم کردی گئی، یروشلم اور ہیکل سلیمانی کی بنیاد کھود ڈالی گئی، یہودیوں کا یہ آخری فساد و بگاڑ تھا اور اس کی یہ آخری ابدی پاداش وسزا تھی۔

محررہ بالا لمبی تحریروں میں دو باتیں صاف طور پر پوری تحریر پر چھائی دیکھائی دیتی ہے، ایک تو ماضی میں یہودیوں نے جب بھی مذہبی عقیدے اور دوسرے اپنے تہذیبی و معاشرتی اقدار وعناصر کو زندگی میں برتنے سے گریز کیا، تو وہ قومی سطح کے مصائب وآفات سے دوچار ہونے سے نہیں بچے ہیں۔

جیسا کہ پہلے تفصیل سے بتایا گیا ہے، کہ قرآن کا یہودیوں کی تاریخ زوال وعذاب

بیان کرنے سے اس کا مقصد اس قوم کو سنانے سے زیادہ مسلمانوں کو ان کی تہذیب ومعاشرہ اپنانے سے متنبہ کرنا تھا اور گردش زمانہ سے پیدا ہونے والے نئے حالات سے نمٹنے میں اس کو نقوش راہ نہ بنانے کا درس دینا تھا۔

آج کی جدید دنیا کے نئے حالات، تیز ترین وسائل آمد ورفت اور حیرت خیز ذرائع مواصلات وترسیل نے دنیا کے ملکی حدود اور جغرافیائی خطوط مٹا کرا سے ایک شہر کی شکل دیدی ہے، قوموں کی ترقیوں کے حصول کے ذرائع وطریقوں میں انقلاب عظیم آ گیا ہے، طاقتور و حوصلہ مند حکمرانوں کی توسیع پسندی کے جذبے کو نئے عالمی حالات نے لگام لگا دیئے ہیں، پھر بھی اس طرح کے جذبے و ذہن رکھنے والی اقوام نے دوسری قوموں کو اپنا ذہنی وفکری غلام بنانے کے طریقے بدل دیئے ہیں اور اب وہ اپنی تہذیب ومعاشرہ، تعلیم وثقافت کے دل فریب جال میں انھیں پھانس رہی ہیں اور دوسری طرف سے ان قوموں کے درمیان اپنے منصوبوں و پلان کے نفاذ کے لیے ان کے مقتدر ومعتبر افراد کی خرید میں یورو وڈالر کی تجوریاں کھولے ہوئی ہیں۔

اس میں سب سے زیادہ پیش پیش وہی قوم ہے، جو دور قبل مسیح سے اپنے گندے طبع و گھناؤنے کرتوت و عادات کے سبب خدا کی ملعون ومغضوب بنی ہوئی ہے اور صدیوں غیروں کے ہاتھوں میں قید وبند کی ذلت ورسوا کن زندگی گزا چکی ہے اور آج تک اس کے آثار واثرات سے آزاد ہوئی نہ پاک وصاف ہو سکی ہے، اس نے نئے حالات سے فائدہ اٹھا کر اسی قدیم مشرکانہ تہذیب ومعاشرہ کے بتوں کو نئے لباس و پوشاک میں پوری دنیا پر مسلط کرنے کے دھن میں لگی ہوئی ہے اور دانستاً پوری انسان برادری کو روشن خیال ومہذب بنانے کے جنون میں اخلاقیات کے وہ حدود توڑ رہی ہے، جس پر انسانیت شرم سار اور شرافت چاک چاک ہے۔

مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی آباد ہیں، وہاں وہ اکثریت واقلیت کی حیثیت میں

ہیں، ان جگہوں میں وہ غیر اسلامی عقیدے و معاشرے کے دباؤ میں جی رہے ہیں، جن ملکوں میں ان کے اپنے حکمراں ہیں، اپنی حکومت و انتظامیہ ہے، اپنے حفاظتی و تعلیمی ادارے ہیں، ہر طرح سے آزاد و خودمختار ہیں، ایسے ملکوں میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی اسلامی ثقافت و معاشرہ، تہذیب و تعلیم میں ڈھلی ہوئی اور وہ دوسری قوموں کے لیے اس کا نمائندہ و آئیڈیل ہوتیں، ان سے اسلامی ثقافت و معاشرہ کی افادیت، اس کی رواداری اور انسانیت کی بنیاد پر احترام انسان و خیرخواہی کے جذبے دنیا کے سامنے ظاہر ہوتے، وہ ان قوموں کو اسلام کے قریب ہونے، اس کو سمجھنے و پرکھنے کے ذہن پیدا ہونے کا سبب بنتے، لیکن ایسا کہیں نظر نہیں آتا، سوئے اتفاق ان ملکوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی عنان مغربی تعلیم یافتہ اور اس کی تہذیب و ثقافت کے پروردہ ہاتھوں میں ہے، انھوں نے خود کے ذہنی رجحان اور اپنے مغربی تہذیب و اخلاق کے علم بردار آقاؤں کے دباؤ میں ان مسلم ملکوں کی اسلامی تعلیم و ثقافت، تہذیب و معاشرہ کو بہ تدریج دبانے اور مغربی طرز زندگی و تہذیب کے نفاذ کے عمل میں اپنے اختیار کے تمام وسائل استعمال کر کے اسے یورپی تہذیب و ثقافت کا ماڈل بنادیا ہے۔

وہ مماک جن میں مسلمان قلیل تعداد میں ہیں، ان کی تہذیبی و معاشرتی زندگی زیادہ حساس و نازک موڑ سے گزر رہی ہے، ان ملکوں میں وہ اسلام مخالف تہذیبوں و معاشروں کے نرغے میں ہیں، ایک تو ان ملکوں کی مقامی تہذیب و کلچر ہے، جسے زندہ و بارآور بنانے کی تحریک دوسری جگہوں کی طرح وہاں بھی چل رہی ہے؛ اس سے متاثر اس کا باوزن طبقہ مسلمانوں پر ملکی سماجی و قانونی دباؤ ڈال رہا ہے اور انھیں ان مقامی تہذیبوں کو قبول کر کے اس کے مطابق زندگی بنانے پر مجبور کر رہا ہے اور مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں کی راہوں میں خودساختہ مختلف نوع کے روڑے ڈالنے میں کوشاں نظر آتا ہے، دوسری طرف پرنٹ و الیکٹرانک ذرائع ابلاغ و ترسیل سے مغربی تہذیب مسلمانوں کے گھروں میں داخل

ہو کر ان کے بچوں و جوانوں کے قلب و ذہن کو مسخ کر رہی ہے اور یہ مسلمان نئی نسلیں اس کی نقالی میں بڑی تیز گامی سے اس کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ اکیسویں صدی کے مواصلاتی آلات کے اسکرین پر منعکس ہونے والے قوموں کے حالات موٹی سرخیوں میں بتا رہے ہیں کہ ایک طرف مسلمان اپنے مذہبی عقیدے، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی سرمائے کو بچانے کی جدوجہد کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ان پر ہو رہے غیر اسلامی متحدہ تہذیبی وار سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ پوری دنیا اسلامی و غیر اسلامی معاشرتی بلاک میں بٹ گئی ہے اور ان دونوں میں مختلف سطح پر جاری جنگیں دہشت گردی کے ناموں سے پورے خطۂ ارض کو لپیٹ لیا ہے۔

افغان عراق جنگوں کے بعد اسلامی صفوں میں یورپی و امریکی مسلمانوں کے اضافے کی حقیقت کے اقرار کے باوجود یہ کہنے کی بات نہیں ہے، کہ ہر جگہ کے مسلمان تعلیمی و تہذیبی اور معاشرتی محاذ پر شکست خوردہ پوزیشن میں ہیں اور ان کی کوئی شئی محفوظ نہیں ہے، وہ شئی جو ان کی ہے وہ بھی ان کی نہیں رہی، تعلیم و تدریس کے نصاب و نظام اور اس کے نفاذ کے طریقے دوسروں کے تیار کردہ ہیں، مذہبی رسومات و عبادات کی ادائگی میں مختلف شکل کے قدغن لگ رہے ہیں، ان کے مذہبی مقامات و ادارے کی تعمیر و ترقی غیروں کی اجازت کا دست نگر ہو چکے ہیں، وہ اپنے جان و مال کی حفاظت و سلامتی کی ضمانت کی بھیک اغیار سے مانگ رہے ہیں، ان کے زمینی دولت و ثروت کے ذخائر ان کے عقیدوں کے حفاظتی دستوں کی نگرانی میں ہیں، ان کی عزت و ناموس اور جان و ضمیر کی خرید انتہائی آساں و ارزاں ہوگئی ہے، اپنے ملکوں میں ان کی شہریت کسی وقت بھی سپر طاقتوں کی نگاہ خصمگیں سے جلاوطنی میں بدل جاتی ہے۔

یہ ناگفتہ بہ حالات اس قوم کی بنی ہوئی ہے، جس کو نبی اسرائیل کے بعد عالمی قیادت کی ذمہ داریوں کے شرف سے نوازا گیا تھا، اسے عالمی سیادت اور عالمی معاشرہ و ماحول

کے اصلاح وصفائی کی مسئولیت دی گئی تھی، اس کو تا قیامت انسانی برادری کے تعلق سے قلب کا مرتبہ عطا ہوا تھا، اس کی صحت وصفائی سے انسانی دنیا کی صحت وصفائی اور اس کے بگاڑ سے ارضی مخلوقات میں فساد پیدا ہونے کو جوڑا گیا تھا، لیکن ان تمام فضائل سے نوازے جانے کے باوصف مسلمانوں کی قومی زندگی ان تمام مقام ومرتبہ سے گر کر بدترین اخلاق و عادات کی عادی بن رہی ہے، جس پر پوری دنیا خندہ زن ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں یہودیوں کی تاریخ قومی ادبار سنا کر مسلمانوں کو جن اخلاقی وتہذیبی بیماریوں سے ہوشیار رہنے کی سختی سے تاکید کی تھی، انھوں نے ان تنبیہات خداوندی کو پس پشت ڈال کر یہودیوں کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں اور ان تمام اعتقادی، اخلاقی اور تہذیبی بیماریوں اور اس کے جرثومے کو اپنے اندر داخل ہونے کے تمام دروازے کھول دیئے ہیں، اسی کے نتیجے میں ان کی زندگی قبل مسیح یہودیوں کی ذلیل ترین غلامانہ قومی زندگی کا زیروکس بن چکی ہے۔

"فاعتبروا یا أولی الأبصار".

☆☆

786 کا استعمال اور اس کی حقیقت

● سلمان عبدالصمد

786 کو ایک عرصے سے مسلم علاقے میں بڑی مقبولیت حاصل ہے، اور یہ ایک شرعی مقام کا حامل بن چکا ہے۔ لوگ اپنے رسالوں، خطوں، کتابوں، یہاں تک کہ اپنی گاڑیوں اور کاروں میں لکھ کر آویزاں کرنے لگے ہیں، اپنے تمام کاموں کا آغاز اسی ۷۸۶ سے کرتے ہیں اس کے استعمال کو عین شریعت تصور کرتے ہیں حالانکہ تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ اعداد وارقام سے کسی چیز کی افتتاح کی گئی ہو، اسلام ہی نہیں، بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کا تذکرہ کیا ہے جس کا آغاز بھی بسم اللہ سے کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ **"انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔**

اسی طرح جب آقائے مدنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ جاں نثار صحابہ کرام کی معیت میں عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو کفار ومشرکین نے راستہ روک دیا آپ کو اور آپ کے صحابہ کو عمرہ کرنے کی اجازت نہ دی حالات ناخوشگوار ہوگئے، قریب تھا کہ جنگ ہوجاتی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ قریشیوں نے حضرت عثمان غنی کو نظر بند کر دیا، لیکن ادھر آپ کے قتل کئے جانے کی خبر عام ہوگئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت عثمان غنی کے خون کا قصاص لینا فرض قرار دے دیا اور صحابہ کرام سے اس بات کی بیعت لے لی، تمام صحابہ کرام نے جوش اور ولولہ انگیزی کے ساتھ جاں نثاری اور قربانی کا عہد کرلیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔

بالآخر قریش نے صلح کی بابت گفتگو کرنے کے لئے عمرو بن سہیل کو سفیر بنا کر بھیجا اور ان سے فرمایا کہ صلح اس شرط پر ہوگی کہ آپؐ اس سال واپس چلے جائیں۔ سہیل بن عمروؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلح کی بابت گفتگو ہوتی رہی بالآخر آپ واپس جانے پر راضی ہوگئے اور حضرت علیؓ کو صلح نامہ تحریر کرنے کا حکم دیا، حضرت علیؓ نے عنوان پر ''**بسم الله الرحمن الرحیم**'' لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ ابتدا میں ''**باسمک اللھم**'' لکھنے کا تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے واقف نہ تھے۔ اس بنا پر سہیل نے کہا کہ بسم اللہ کے بجائے وہی قدیم الفاظ'' **باسمک اللھم**'' لکھے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور فرمالیا اور عہد نامہ کا آغاز **باسمک اللھم** سے ہوا۔ اس سے دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں، ایک یہ کہ قدیم زمانے میں بھی اعداد وارقام کے لکھنے کا کوئی رواج نہ تھا اور نہ ہی شریعت محمدی میں جیسا کہ عہد نامے کے عنوان سے معلوم ہوا۔

یہی ایک نمونہ ہمارے سامنے نہیں بلکہ آپ کے وہ تمام خطوط ہمارے سامنے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے شہنشاہوں کی طرف اپنا دعوتی پیغام روانہ فرمایا ان تمام خطوط کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا گیا ہے (مزید تفصیل کے لئے ''**الرحیق المختوم میں مکاتبة الملوک والامراء**'' کا مطالعہ کریں) حالانکہ آپ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ یہ خطوط کافروں اور مشرکین کے ہاتھوں میں جائیں گے اور وہی اس کے مخاطب بھی تھے اس کے باوجود اس کا آغاز اور انتہا اللہ کے مقدس نام سے کیا گیا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنی باتوں اور تحریروں کا آغاز **بسم اللہ** ہی سے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریائے نیل کے نام خط لکھا تو اس کا آغاز بھی بسم اللہ سے کیا گیا ہے۔ ان تمام واقعات وروایات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ٧٨٦ کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض جہال ٧٨٦ کو استعمال کرنے کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ یہ اعداد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے عدد کے برابر ہیں جو مستند نہیں ہے۔ گویا ساری تاویلات صرف قیاسات کی بنیاد پر قائم ہیں، حقیقت سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے، یہ سب یہودیوں کی ایجاد اور ان کی تخریب کاری کا نتیجہ ہے جو صرف ہمارے عقیدے کو خاک میں ملانے کی ایک ناپاک کوشش ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں اعداد وارقام کے گرداب میں الجھا کر ہمارے عقیدے کو مسخ کیا جارہا ہو، کیونکہ اسلام دشمن طاقتیں ہمیں اسلام کا لیبل لگا کر گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں، اس لئے ہمیں سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں ہمیشہ اسی کوشش میں لگے ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب سے دور ہوجائیں اور اس کو ایجاد کرکے یہی ان کی پلاننگ ہے کہ مسلمان بسم اللہ کے انوار وبرکات سے محروم ہوجائیں۔

ہمیں ان دانا دشمنوں اور نادان دوستوں کی روش کو چھوڑ کر سنت رسول صحابہ کرام تابعین اور ائمہ دین کے عمل کو اختیار کرنا چاہئے۔ جو لوگ ٧٨٦ کو **بسم اللہ** کا نعم البدل سمجھ رہے ہیں، وہ درحقیقت شریعت اسلام کی توہین کررہے ہیں۔ لہذا، ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے عقلوں کو بیدار کریں اور مسلم سماج کو ان خطرات سے بچائیں اور معاشرے میں ٧٨٦ کے بجائے **بسم اللہ** کو عام کریں، کیونکہ یہی اصل ہے اور ٧٨٦ یہودی تخریب کاری کا نتیجہ ہے۔ اللہ ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

☆☆

تبلیغی جماعت کا نام
القاعدہ سے جوڑنا منظّم سازش کا حصہ

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

تبلیغی جماعت کے تعلق سے وکی لیکس نے یہ عجیب وغریب انکشاف کیا کہ اس کے بھی ’القاعدہ‘ اور دیگر دہشت پسند جماعتوں سے روابط ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہندوستانی ذرائع ابلاغ نے وکی لیکس کے اس بیان کو بڑی ذمہ داری سے شائع کیا۔ ٹائمز آف انڈیا نے خبر کے ساتھ حضرت نظام الدین واقع تبلیغی جماعت کے مرکز کی تصویر بھی چھاپی۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر لوگوں کو وکی لیکس کا یہ انکشاف پھسپھسا لگا، اور انہوں نے اس کی صداقت پر یقین کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ جبکہ ملک بھر کی مذہبی اور ملی جماعتوں نے ایک غیر متنازعہ خالص مذہبی جماعت کو دہشت پسند تنظیموں سے جوڑنے پر شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی مذمت کی۔ قابل غور امر یہ ہے کہ آخر وکی لیکس نے دنیا میں موجود چند متحرک بڑی اسلامی تحریکات میں تبلیغی جماعت کو ہی اپنا ٹارگیٹ کیوں بنایا؟ جب ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی جستجو کریں گے تو سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس وقت برصغیر ہندو پاک ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں جس تحریک نے جہد مسلسل، یقین محکم اور عمل پیہم کے ذریعہ پورے عالم کو اپنی گرفت میں لے لیا، وہ تبلیغی تحریک ہے جس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ (1886-1944) ہیں۔

بلاتفریق مذہب وملت اور مسلکی اختلافات سے بالاتر ہو کر اپنے زریں اصول وضوابط پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہوئے جس رفتار سے یہ جماعت اپنی منزل مقصود کی سمت گامزن ہے اس کی نظیر فی الوقت عالم اسلام کی کسی اور تحریک میں نہیں ملتی۔ تبلیغی جماعت کی اسی مقبولیت اور کامرانی سے دشمنان اسلام خائف ہیں۔ عیسائی، یہودی اور دوسری مشینریوں کے خیمہ میں ہلچل پیدا کرنے والی یہ واحد دینی تحریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اس سادہ لوح جماعت کو اپنے دین و مذہب کیلئے سب سے بڑا خطرہ تصور کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ اب بھی منصف پسند لوگوں کا یہی خیال ہے کہ تبلیغی جماعت دراصل صرف مسلمانوں میں تبلیغ کے فریضہ کو انجام دے کر نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان، غیر نمازی کو نمازی بنانے میں اپنا زیادہ تر وقت صرف کرتی ہے۔ جبکہ بانی تبلیغ کا اس بارے میں نقطہ نظر انتہائی واضح تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نماز روزہ سیکھ لینے اور ذکر واذکار کی پابندی ہی کافی نہیں ہے، بلکہ وہ پوری ملت اسلامیہ کو بیدار کر کے، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کو اسلامی بنانے کی فکر رکھتے تھے۔

’’ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے، اسلام کے پورے علمی وعملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا۔ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ ونماز کی تلقین وتعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی اب ت ہے۔‘‘

یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جن علماء کرام نے بھی تبلیغی جماعت کی نمائندگی یا پوری زندگی اس سے وابستہ رہے ان سب کی زندگی اتباع سنت کا کامل نمونہ تھی۔ عجز وانکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مولانا محمد الیاسؒ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ان کو دیکھ کر شیخ الہند مولانا محمود حسن فرمایا کرتے تھے کہ میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہ کرام یاد آجاتے ہیں۔ آج بھی دنیا کے بکھیڑوں سے تبلیغی جماعت کے لوگ خود کو الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ ان کے خلوص وللّٰہیت اور سادگی سے متاثر ہو کر دیر سویر ایمان والے

جماعت کا دامن تھام لینے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ جماعت کے دائرہ کار میں وسعت و بے پناہ مقبولیت اور عام لوگوں میں دینی فریضہ کے تئیں احساس پیدا کرنے کے سبب تبلیغی جماعت معاندین اسلام کی نگاہ میں کھٹکنے لگی ہے۔ وکی لیکس کے ذریعہ تبلیغی جماعت کو 'القاعدہ' سے جوڑنے کے پیچھے دراصل یہی مقصد کارفرما ہے۔

یہ بات بھی انتہائی سنجیدگی سے سوچنے کی ہے کہ القاعدہ چیف اسامہ بن لادن کی موت کے محض چند دنوں بعد ہی وکی لیکس نے تبلیغی جماعت کو اس بدنام زمانہ تنظیم سے منسلک کرنے کا انکشاف کیوں کیا؟ آخر اسے کس بات کی عجلت تھی یہ سمجھ سے پرے ہے، مگر مبصرین وکی لیکس کے بیان کو منظم سازش کا حصہ اس وجہ سے قرار دے رہے ہیں کہ جن طاقتوں نے صدیوں سے مذہب اسلام کے خلاف اپنی خفیہ مہم چھیڑ رکھی ہیں اور اسلام جیسے سچے مذہب کی امن پسندانہ تعلیم کو دہشت گردی سے تعبیر کرنے کی جدوجہد میں مصروف بہ عمل ہیں ان طاقتوں کی توجہ اب تبلیغی جماعت کی طرف مرکوز کردینا ایک بڑی چال ہے، جسے سمجھنا اور ان کے ناپاک عزائم کو طشت ازبام کرنا امت مسلمہ کی عظیم ذمہ داری ہے۔

مگر صد افسوس کہ! یہودیوں کی اس سازش کو بے نقاب کرنا تو دور خود مسلمانوں کی ایک جماعت اسلام مخالف قوتوں کے جال میں پھنستی نظر آرہی ہے۔ اس کی سادگی اور حماقت پر جتنا رویا جائے کم ہے۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوسکتی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان وکی لیکس کے بے بنیاد الزامات پر انگشت بدنداں ہیں، اور ادھر ممبئی میں واقع رضا اکیڈمی نے وکی لیکس کے اس بیہودہ انکشاف پر اس لئے اظہار تشویش کیا ہے کہ تبلیغی جماعت سے وابستہ لوگوں کا دہشت گردوں سے گہرا تعلق ہے، اس لئے حکومت ہند اس پر فوری پابندی عائد کرے، کیونکہ یہ امن پسند جماعت نہیں ہے۔ اکیڈمی کی جانب سے جو پریس ریلیز اخبارات کو بھیجی گئی اسے دیکھ کر کہیں سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ اہل علم اور مہذب افراد کی انجمن ہے یا سر پھروں کی۔ یہاں اس پریس بیان کا صرف ایک پیراگراف

پیش کرنا انتہائی ضروری ہے۔

''سنی مسلمانوں کی تنظیم رضا اکیڈمی نے آج وزیر داخلہ پی چدمبرم کو میمورنڈم پیش کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ اس جماعت کی نقل وحرکت پر ہندوستان میں فوراً روک لگائی جائے۔ اس جماعت نے مسلمانوں کو انتشار وافتراق میں مبتلا کردیا ہے۔ آگے مبارک حسین کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ حکومت اس انکشاف کا نوٹس لے اور جماعت کے خلاف کارروائی کرے۔ ابن عبدالوہاب نجدی وہ شخص ہے جس نے سعودی عربیہ میں سب سے پہلے دہشت گردی کا بیج بویا اور آج تک اس کے متبعین دہشت گردانہ کارروائیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔''

اس قسم کے سوچ کے افراد کسی مذہبی اکیڈمی کے نمائندہ ہیں یا تخریب کاروں کے آلۂ کار یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ایسی شخصیات چاہے وہ جس مسلک کے بھی متبعین ہوں ان پر بروقت لگام نہیں لگائی گئی تو یہ اپنے زہریلے ڈنک سے ملت کے اتحاد کو ڈس کر پارہ پارہ کرنے کی مہم جاری رکھیں گے۔ قوم میں اس فکر کے افراد کی موجودگی وکی لیکس کے خبطی بانی جولین اسانج سے زیادہ مضر ہوسکتی ہے۔ بتادیں کے وکی لیکس کے اس انکشاف پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر اور ماہر اسلامیات جناب اختر الواسع نے جو بیان دیا ہے وہ پوری قوم کیلئے اہمیت کا حامل ہے اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ انہوں نے تبلیغی جماعت کا نام دہشت گرد تنظیموں بشمول القاعدہ سے جوڑنے کو مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ایک بڑی سازش کا حصہ قرار دیا ہے۔ وکی لیکس کے انکشافات پر سخت حیرت ظاہر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس جماعت پر دہشت گرد تنظیموں کی رکنیت کا گھناؤنا الزام لگانے والوں کو پتہ ہی نہیں کہ اس جماعت کی رکنیت ہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا کہ تبلیغی جماعت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، جس کا مخالفین بھی شکوہ کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت مسلمانوں میں افراد کی سطح پر دین کا شعور پیدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ ایسی جماعت کو اس طور پر بدنام

کرنے کی سازش ازخود مظہر ہے کہ سازشیوں کو تیسری دنیا کے ملکوں اور عالم اسلام میں خلفشار اور عدم استحکام پیدا کرنا مقصود ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وکی لیکس کے بانی جولین اسانج 188 ممالک کی پولس کو مطلوب ہیں۔ان کے بارے میں یہ بات بھی کافی مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ سے شکی اور خبطی ہیں۔ایک طرف جہاں امریکی حکومت کے وکلاء جاسوسی کے الزام میں اسانج پر مقدمہ چلانے کے متعلق غور کررہے ہیں، وہیں یورپی یونین انہیں سوڈین میں دو خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کے الزام میں تلاش رہی ہے۔انٹرپول نے ریڈ نوٹس جاری کرتے ہوئے افغانستان سے لے کر زمبابوے تک 188 ملکوں کو مطلع کردیا گیا ہے کہ اسانج پولس کو مطلوب ہیں۔ ایسے مجنوں اور عقل سے ماورا شخص پر جلد کارروائی بہت بڑے فتنہ کا خاتمہ ہوگی۔

☆☆

بہشتی زیور اردو میں نسائی ادب کی اولین کتاب

● عظیم اختر

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ سچ ہے کہ یونیورسٹیوں میں انگنت قسم کی پابندیوں اور پیشہ ورانہ بندشوں کی وجہ سے کم ازکم اردو زبان کے پروفیسر حضرات کے طبعی جوہر نہیں کھلتے، ان پابندیوں، بندشوں اور ضابطوں کی وجہ سے ہمارے پروفیسر حضرات کی اکثریت Low Profile رکھتے ہوئے صرف درسی کتابیں پڑھانے یا پھر ترتیب وتالیف کے کام سے ہی سروکار رکھتے ہیں۔سمیناروں اور اس قسم کے جلسوں میں پڑھے گئے دوسروں کے مضامین کو جمع کر کے کتاب مرتب کرنا سچ پوچھئے تو ادبی دنیا میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اردو ادبیات کے چھوٹے بڑے پروفیسروں کی اکثریت نے ترتیب وتالیف کے اس کٹھن اور مشکل کام کو تحقیق وتنقید کی نئی جہتوں سے روشناس کرا کر سند واعتبار کا درجہ بخشا ہے اور کتاب نویسی کی اس صنف کو عام کیا ہے جس کا چلن محدود تھا اور اردو دنیا میں بچوں کے لیے تالیف کی گئی مولانا اسماعیل میرٹھی کی کتابوں کے بعد ایسی کتابیں خال،خال ہی نظر آیا کرتی تھیں۔اس لیے یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آج کی اردو دنیا میں ترتیب وتالیف اور مرتبین و مؤلفین کی Rapid Growth کا تمام تر کریڈٹ یونیورسٹیوں کے اردو پروفیسروں کے سر ہی جاتا ہے لیکن اس کے باوجود زبان وادب کی خدمت کا ان کا جذبہ اور ادبی تنظیمی صلاحیتوں کے جوہر صرف رٹائرمنٹ کے بعد ہی کھلتے ہیں۔ ملازمت کی بندشوں اور پیشہ ورانہ مجبوریوں کی وجہ سے یہ صلاحیتیں اور جوہر عام طور پر گہنایا ہوا ہی رہتا ہے لیکن ملازمت

کی بندشوں سے آزاد ہوکر اردو کے کسی نیم سرکاری ادارے یا کسی ریاستی اردو اکادمی میں پہنچ کر اردو ادبیات کے پروفیسر کھل کھیلتے ہیں اور ٹھوس علمی و ادبی کام کرنے کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جذبہ سمیناروں کی شکل میں ابلنے لگتا ہے۔ ٹھوس علمی و ادبی کام کرنے کی لگن میں اردو ادبیات کے یہ ریٹائرڈ پروفیسرز کولمبس بن کر ان یک روزہ، دوروزہ اور سہ روزہ سمیناروں کے لیے ایسے نادر عنوان اور موضوع ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور قابلیت کو سلام کرنا ہی پڑتا ہے۔

دہلی میں گنگا جمنی تہذیب اور اردو زبان و ادب کو فروغ و تحفظ دینے کے بنیادی مقصد سے قائم کی جانے والی اردو اکادمی بھی ایک ایسا ہی نیم سرکاری ادارہ ہے جس کے پلیٹ فارم سے اردو ادبیات کے ریٹائرڈ پروفیسرز اردو میں شخصی ادب، پاپولر ادب اور اردو ادب میں پیروڈی جیسے نادر موضوعات پر کئی کئی روزہ سمینار منعقد کر کے اردو کی ٹھوس علمی و ادبی خدمت کر چکے ہیں اور کچھ ''اردو غزل- آزادی کے بعد''،''اردو زبان کی موجودہ صورت حال'' اور ''نسائی ادب'' کے موضوع پر سہ روزہ کل ہند سمینار منعقد کر کے ہندی والوں کی زبان میں ''اتی آویشک اور اُچ کوٹی'' کی خدمات انجام دے رہے ہیں، اسی طرح دیتے رہیں ہمیں ان سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، ہمیں صرف سمینار کے موضوع سے دلچسپی تھی۔ سمینار کا دعوت نامہ دیکھ کر اور سمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کے عنوان دیکھ کر ہمیں معاً ''اردو میں بچوں کے ادب کی اینتھولوجی'' نامی کتاب یاد آ گئی جسے بھاگلپور یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے ساہتیہ اکادمی جیسے موقر ادارے کے لیے مرتب کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی اس تالیف میں بچوں کے ادب کے علاوہ دنیا جہاں کی نثر اور شاعری موجود تھی اور جوش کتاب نویسی میں فراق گورکھپوری کی رباعیوں، اختر الایمان اور ساحر لدھیانوی کی نظموں اور میرؔ و غالبؔ، داغ و مومنؔ، جوشؔ، جگرؔ، فانیؔ، ساغر، جذبی اور مجازؔ جیسے شعراء کی غزلوں کو اردو ادب میں بچوں کے لیے لکھی گئی نظم و نثر کے

نمونوں کے طور پر پیش کر کے پروفیسر موصوف نے اپنی ادبی قابلیت اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا تھا۔ دہلی اردو اکیڈمی کے اس سمینار میں سمینار سب کمیٹی کے کنوینر اور دہلی یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر نے بھی نسائی ادب کے نام پر مقالوں کے لیے ''اردو فکشن میں عورت کا بدلتا ہوا کردار''، ''رشید جہاں کے یہاں عورت''، ''داستانوں میں عورت کا کردار''، ''ہم عصر خواتین افسانہ نگار''، ''پاکستان میں خواتین کی شاعری''، ''عصمت چغتائی کا افسانوی فن''، ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں عورت کا کردار''، ''1940 کے بعد خواتین ناول نگار'' جیسے موضوعات مرتب کر کے اسی علمی و ادبی قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے جو پروفیسر ہرگانوی صاحب کی تالیف کردہ کتاب کے ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ سمینار سب کمیٹی کے کنوینر پروفیسر صاحب نے ''نسائی ادب'' پر اس سمینار کا چوتھا اجلاس تین ایسی خواتین قلم کار کے نام کو Dedi Scate یا معنون کر دیا تھا جن کا ادبی سفر ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور اعلیٰ سماجی حیثیت کے برتے ہر معروف قلم کاروں سے کہہ سن کر اور اخلاقی دباؤ ڈال کر اپنی ادبی شخصیت یا افسانوں اور ناول پر مضامین اور مقالے لکھوا لینے سے ادبی اور نیم ادبی رسائل و جرائد میں نام تو چھپ جاتا ہے لیکن ادبی مقام متعین نہیں ہوتا۔ یہ تینوں خواتین قلم کار ابھی اپنے ادبی سفر کی ابتدائی منزلوں میں ہیں۔ اردو اکیڈمی جیسے مؤقر ادارے کے سمینار کا ایک اجلاس کو نو واردان ادب سے منسوب کر کے سمینار سب کمیٹی کے کنوینر نے بدترین دوست نوازی اور خویش پروری کا مظاہرہ کیا ہے۔ سمینار سب کمیٹی کے کنوینر اور ریٹائرڈ پروفیسر صاحب اپنے ذاتی پیسے سے کسی کو بھی نوازیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن سرکاری پیسے سے دوست نوازی اور خویش پروری کے مظاہرے کو بدترین ادبی بددیانتی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ ترنم ریاض کے ناول ''برف آشنا پرندے''، ثروت خاں کی تخلیق ''اندھیرا پگ'' اور شہناز نبی کی نظموں کو نسائی ادب کے زمرے میں رکھنا اور اسی حوالے سے آنکنا زیادتی ہی نہیں بلکہ ان پر تہمت لگانے کے مترادف ہے۔ ان

خواتین قلم کاروں کی مدح سرائی کرتے ہوئے مقالہ نگار حضرات خواہ کچھ بھی کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان خواتین کی تخلیقات کو ابھی بی گریڈ یا دوسرے درجے کی تخلیقات سے زیادہ کوئی اور درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

عجب تماشہ ہے کہ اردو زبان میں نسائی ادب لکھا ہی نہیں گیا لیکن سمینار سب کمیٹی کے لائق صد احترام پروفیسر صاحب نے خواتین کی لکھی ہوئی تخلیقات کو نسائی ادب کا نام دے دیا۔ عام طور پر بچوں کے ادب سے صرف وہ شعری اور نثری تخلیقات مراد لی جاتی ہیں جو بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے بالخصوص رقم کی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے نسائی ادب کی تعریف میں صرف وہی شعری اور نثری تخلیقات کو شامل کیا جاسکتا ہے جو خواتین کی روز مرہ کی زندگی اور ان کے مسائل سے متعلق ہو اور بالخصوص خواتین کے لیے ہی لکھا گیا ہو۔ نسائی ادب کی تعریف کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اردو زبان میں اب تک صرف ایک ہی کتاب خواتین کے لیے لکھی گئی ہے اور وہ ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ''بہشتی زیور'' جس کی مخاطب صرف خواتین ہیں۔ بہشتی زیور کو اردو میں نسائی ادب کی اولین کتاب کا نام دیا جاسکتا ہے جو آج سے ساٹھ ستر برس قبل شادی کے موقع پر لڑکی کو رخصت کرتے ہوئے جہیز میں ضرور دیا جاتا تھا جس کو پڑھ کر ہماری اور آپ کی نانیوں اور دادیوں نے نہ صرف کامیابی سے گھر چلائے بلکہ اپنے بچوں کی اس نہج پر ذہنی تربیت کی اور وہ شمعیں جلائیں جس کی روشنی آج بھی ہمارے اور آپ کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے۔

نسائی ادب کے نام پر ان سمینار میں جن قلم کار خواتین اور شاعرات پر مقالے پڑھے گئے اور ان کی تخلیقی کاوشوں کا تجزیہ کیا گیا۔ انہوں نے زبان و ادب کے عام قارئین کے لیے شعری و نثری ادب تخلیق کیا تھا اور کررہی ہیں، نسائی ادب کے نام کچھ نہیں لکھا اور نہ نسائی ادب سے ان کا کوئی سروکار ہے، نسائی ادب کے نام پر اس سمینار کو صرف عوامی پیسے کی بربادی کا ہی نام دیا جاسکتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے لایعنی موضوعات پر سمیناروں سے

میرؔ و غالبؔ کی دھرتی پر اردو زبان کو اگلے پچاس ساٹھ سال تو کجا سوڈیڑھ سو برسوں میں بھی کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے، ہاں اردو کے ریٹائرڈ پروفیسر حضرات اسی طرح دوست نوازی اور خویش پروری کو فروغ دیتے رہیں گے۔

☆☆

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں آج جو مدارس و مکاتب قائم کئے جارہے ہیں یہ دراصل انسانی خصوصیت کو اجاگر کیا جارہا ہے۔ انسانی کی افضلیت کو برقرار رکھنے کیلئے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔ اگر یہ مدارس قائم نہ کئے جائیں، یہ جوامع قائم نہ کی جائیں اور تعلیم نہ دی جائے اور فرض کیجئے کہ تعلیم مٹ گئی تو انسانیت مٹ گئی۔ یہ تعلیم و تعلم کا سارا جھگڑا انسان کی بقا کے لئے ہے کیونکہ یہ خصوصیت ہے۔

اس لحاظ سے جامعہ کا قائم ہونا یہ ایک سعادت ہے اور مبارک علامت ہے۔ یہ انسانیت کے برقرار رکھنے کا ایک سلسلہ ہے۔ جتنا مضبوط ہوگا اتنی انسانیت مضبوط ہوگی۔ جتنی نیک نیتی اور اخلاص سے تعلیم دی جائے اتنا ہی فی الحقیقت آدمیت کو اونچا بنایا جائے گا۔ حضرت نانوتویؒ کی شان یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند قائم کر کے جہاں جہاں گئے مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ امروہہ میں مدرسہ قائم کیا، مرادآباد میں مدرسۃ الغرباء قائم کیا، انبیٹھہ، شاہجہاں پور اور بریلی میں مدارس قائم کئے۔ اپنے شاگردوں اور مریدین کو تاکید کی کہ جہاں رہو مدرسے قائم کرو۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں مدارس ہیں وہیں کچھ علم کی روشنی پائی جاتی ہے۔

(خطبات حکیم الاسلام جلد۔۶)۔

☆☆

مغرب کا نیا ایجنڈا

مذاکرات بین المذاہب

● مولانا عتیق الرحمٰن (اے ایم یو)

ادھر عرصہ سے عالم اسلام اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ غور وفکر اور بحث کے لئے خود اپنا ایجنڈا متعین نہیں کرتے، بلکہ مغرب کی طرف سے ان پر مسائل تھوپے جاتے ہیں اور پھر ساری دنیا میں خاص کر مسلم دنیا میں وہ غور وفکر کا موضوع بن جاتا ہے، مغرب چاہتا تھا کہ پوری دنیا کو اخلاقی قدروں سے آزاد کر دیا جائے اور انسان کے لئے نفس کی پرستاری میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے، اس کے لئے پہلے عورتوں کی آزادی کا عنوان قائم کیا گیا اور بحث ہونے لگی کہ جب مرد گھر کے باہر نکل سکتے ہیں، تو عورت کو گھر کی چہار دیواری میں کیوں مقید رکھا جائے گا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازاروں، آفسوں اور کارخانوں میں عورتیں پہنچ گئیں، بچے ماں کی ممتا سے اور شوہر ازدواجی زندگی کے سکون سے محروم ہوگئے، لیکن مغربی تہذیب جو کچھ چاہتی تھی، اس کے لئے اتنی سی بات کافی نہیں تھی، اس سے یقیناً اس کو کارکنوں اور مزدوروں کی بڑی تعداد حاصل ہوگئی لیکن نفس کی ہوسناکی کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ستر ولباس کی قید بھی ختم ہوجائے، صنفی تعلق میں بھی نکاح کی قید باقی نہیں رہے، تجارت کو فروغ دینے اور معیشت کو ترقی کی منزل پر پہنچانے کے لئے عورت کے جسم کو تشہیر کا ذریعہ بنایا جائے، اس لئے اب دوسرا نعرہ 'شخصی آزادی' کا لگایا گیا اس لئے ہر انسان اپنی نجی زندگی کے بارے میں آزاد ہے، وہ لباس پہنے یا بے لباس رہے جیسا لباس

چاہیے استعمال کرے جس مرد یا عورت سے چاہے تعلق رکھے، اس کو پانے، جسم کی نمائش کا پورا پورا اختیار ہونا چاہیے، اب شخصی آزادی کا یہی نعرہ پوری دنیا میں غور وفکر کا موضوع بن گیا ہے۔

دنیا میں مظلوموں کو دبانے اور ان پر مزید ظلم کرنے اور اپنے تحفظ کے نام پر لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر دینے کا حق حاصل ہے لیکن کسی مظلوموں اور ستم زدہ کو ہمارے خلاف احتجاج نہیں کرنا چاہیے، اگر وہ مجبور شخص ہم پر پتھر بھی اٹھا کر پھینکے تو وہ دہشت گرد ہے یہ واضح طور پر انصاف کا دہرا پیمانہ ہے، اسرائیل کا فلسطینیوں کے زمین وجائداد پر قابض ہوجانا اور دن رات ظلم کا کا بازار گرم کرنا حفاظت خود اختیاری ہے اور فلسطینیوں کا پتھر پھینکنا اور ظالموں کے خلاف جوابی کارروائی کرنا دہشت گردی ہے۔ مغرب نے اس ایجنڈے کو عالم اسلام پر اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ آج مسلم ممالک، اسلامی ادارے اور مسلمانوں کی مذہبی تنظیمیں بھی دہشت گردی کو سب سے اہم عنوانات بنائے ہوئی ہے اور اس موضوع پر سیمینار و کانفرنس منعقد کر رہی ہیں۔

اسی طرح اب ایک نیا موضوع مذاہب کے درمیان مذاکرات (حوار بین المذاہب) کا شروع ہوا ہے، مختلف مسلم ممالک اس موضوع پر بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں اور مسلم ممالک میں اس پیش پیش بھی ہیں، اگر آئندہ ہندوستان میں مسلم تنظیمیں اس موضوع پر بھی سیمینار اور جلسے کرنے لگیں، تو یہ حیرت کی بات نہیں ہوگی! کیونکہ مغرب کی طرف سے جو ایجنڈا دیا جاتا ہے، ہم دانستہ یا نادانستہ اسی کھلونے سے کھیلتے رہتے ہیں، حالانکہ جس چیز کو مذاکرہ کہا جارہا ہے وہ حقیقت میں مذاکرہ نہیں ہے۔ مذاکرہ تو دو ایسے فریقوں کے درمیان ہوتا ہے جو طاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مد مقابل ہوں اور فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں، ایسی دو قومیں جن کے درمیان طاقت کے اعتبار سے کوئی ہاتھی اور شیر میں مقابلہ اور مصالحت کی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن شیر اور بکری میں صلح کے کوئی معنی نہیں،

یہ تو کمزوروں کو جھکانے اور ان کو تابع فرمان بنانے کا ایک خوبصورت عنوان ہے ایسے نام نہاد مذاکرہ میں جو فریق طاقتور ہوتا ہے وہ اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتا ہے اور اسی پر ظالم و مجرم ہونے کی تہمت بھی نہیں لگتی اور کمزور فریق کا فائدہ یہ ہے کہ اسے تو اپنے مقابل کے سامنے جھکنا اور ہتھیار ڈالنا ہی تھا لیکن اب یہ اس کام کو ایک حد تک باعزت طریقہ پر کر لیتا ہے اور ظاہری رسوائی سے بچ جاتا ہے، لیکن بہر حال اسے فریق مقابل کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔

اس وقت مذاہب کے درمیان مذاکرات کی یہی صورت ہے، یہودی، عیسائی اور ان کی اتباع میں دوسری قوموں کے لئے مذاہب کی حیثیت موم کی ناک کی ہے، اسے جس طرح چاہے موڑا جا سکتا ہے، وہ انسان کے کسی عمل میں رکاوٹ نہیں بنتا، کیونکہ ان مذاہب کے ماننے والوں نے گرجوں، چرچوں اور عبادت گاہوں میں مذہب کو قید کر دیا ہے اسے زندگی کے دوسرے میدانوں میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے، اکثر مذاہب میں نشہ سے منع کیا گیا ہے، سور کو حرام قرار دیا گیا ہے، تمام مذاہب زنا اور جنسی انحراف کے ممنوع ہونے پر متفق ہیں، برہنہ پن اور عریانیت کسی مذہب میں قابل قبول نہیں سمجھی گئی ہے۔ سود، ناانصافی اور استحصال کی ایک شکل ہے، اس لئے ہر مذہب اس سے روکتا ہے، خود بائبل میں بھی صراحتاً اس کو منع کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی اہمیت اور احترام کی تعلیم ہر مذہب کا حصہ ہے لیکن آج ان لوگوں نے بھی ان تعلیمات کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے، جو زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مذہب کا متبع اور پیروکار کہتے ہیں وہ ایک طرف مذہب کا اقرار بھی کرتے ہیں اور انہوں نے مذہب کو اپنی زندگی اور سماج سے نکال باہر بھی کر رکھا ہے یہ ایک کھلا ہوا تضاد ہے جس سے مغربی معاشرہ دوچار ہے۔

مسلمان اگر اس رویہ کو قبول کرنے کو تیار ہو جائیں کہ وہ مذہب کو مسجد کی چہار دیواری سے باہر نکلنے نہیں دیں گے تو مغرب کو مسلمانوں سے صلح کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوگی، اس وقت مذہبی مذاکرات کے ایجنڈے کا اصل مقصد اہل مغرب کے نزدیک یہی ہے، اب

یہ دیکھئے کہ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے بھی اعلان کیا ہے کہ وہ مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور دنیا کے چھ بڑے مذاہب عیسائیت، یہودیت، اسلام، بدھ مت، ہندوازم اور سکھ ازم کے درمیان مذاکرات کو فروغ دینے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کریں گے، حالانکہ یہ وہی ٹونی بلیئر ہیں جنہوں نے افغانستان اور عراق میں امریکہ کے ساتھ مل کر لاکھوں بے قصور انسانوں کا قتل عام کیا ہے اور وہ اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں عراق پر حملہ کے وقت انہوں نے مذہب کو مرکزی نقطہ بنایا تھا، (دیکھئے 31 مئی 2008 کے اخبارات) اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اس جنگ کو اسلام اور عیسائیت کے درمیان جنگ سمجھا تھا اور اسی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے عراق کے خلاف معرکہ آرائی کی تھی، ایسے لوگ کس نوعیت کی مذہبی ہم آہنگی چاہیں گے اور کن اصولوں پر مذاکرات کریں گے؟ وہ ظاہر ہے۔

مذاکرات کی بنیاد وہ ہونی چاہیے جس کا قرآن مجید کی سورت نمبر 109 'کافرون' میں ذکر آیا ہے آج کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ مشرکین مکہ نے اسلام اور اس وقت کے مروجہ مشرکانہ تصورات کے درمیان مذہبی ہم آہنگی کے دو فارمولے پیش کئے اور اس پر حضورؐ سے گفتگو کی ایک یہ کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو بھی اپنی عبادت میں شریک کر لیں اور مسلمان بھی ان کے بتوں کو پوجنے کے لئے آمادہ ہو جائیں، روزانہ اس طریقہ پر پرستش ہوا کرے دوسری صورت یہ ہے کہ ایام متعین کر لئے جائیں، ہفتہ میں چند دن مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق خدا کی عبادت ہو اور چند دنوں مشرکین کے بتوں کی، یہ دو فارمولے تھے جو مشرکین مکہ کی طرف سے پیش کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے ذریعہ اس کا جو جواب دلوایا، وہ یہ تھا کہ تم لوگ جن چیزوں کو پوجتے ہو مسلمان ان کو معبود کا درجہ نہیں دے سکتے اور ہم جس خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں تم اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو، کیونکہ توحید اور شرک دو متضاد نظریات ہیں، جن کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا اس طرح یہ دونوں فارمولے رد

کردیئے گئے۔

اس کے مقابلہ قرآن مجید نے ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا، اور وہ یہ تھا کہ جب ہم ایک دوسرے کی فکر سے اتفاق نہیں کرسکتے تو ہم ایک دوسرے کے معاملہ میں دخل دیئے بغیر اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں، مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور مشرکین۔ جب تک اللہ کی طرف سے توفیق ہدایت حاصل نہ ہوجائے اپنے طریقہ پر قائم رہیں اور ایک فریق دوسرے فریق کے معاملہ میں مداخلت سے گریز کرے، **لکم دینکم ولی دین.** واقعہ یہ ہے کہ مذہبی ہم آہنگی کے لئے جو نسخہ قرآن مجید نے تقریباً پندرہ سو سال پہلے پیش کیا تھا آج بھی وہی قابل عمل ہے اور اسی پر عمل کرتے ہوئے دنیا میں امن وآشتی کا قیام ممکن ہے، ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو سبق پڑھائیں اور اس سے آگے بڑھ کر مجبور کریں کہ انہیں یہ کرنا چاہیے اور یہ نہیں چاہیے، یقیناً امن قائم کرنے اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں رکاوٹ ہے اور اس سے ٹکراؤ اور تصادم کی فضا پیدا ہوگی۔

اس وقت مغربی اقوام کی طرف سے جس مذہبی ہم آہنگی کا مطالبہ ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ مسلمان اسلامی افکار وقدار پر اصرار نہ کریں اور دوسری اقوام کی طرح مذہب کے محدود ترین تصور کو قبول کرلیں، ظاہر ہے مسلمانوں کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں ہوسکتی، کیونکہ قرآن مجید مسلمانوں کو پوری طرح اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے تابع ہوکر زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے: '**یا ایھا الذین اٰمنوا ادخلو فی السلم کافۃ**' (البقرہ:208) اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کا جینا اور مرنا بھی اللہ ہی کے لئے ہو: **ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین** (الانعام:162)۔

مذاہب کے درمیان مذاکرات اور ہم آہنگی میں دو باتیں بنیادی کردار ادا کرسکتی ہیں۔ باہمی احترام اور باہمی اشتراک، باہمی احترام سے مراد یہ ہے کہ تمام مذہبی شخصیتوں اور تمام

مذاہب کے مقدس مقامات کے بارے میں بے احترامی اور اہانت کے رویہ سے بچا جائے، کیونکہ کوئی بھی شخص ایسی شخصیتوں کی اہانت کو برداشت نہیں کرسکتا جن سے اس کا تعلق عقیدت واحترام کا ہو، اسلام میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے شریعت اسلامی نے غیر مسلموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک اہل کتاب دوسرے کفار ومشرکین۔ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ایمان ایسی شخصیتوں اور کتابوں پر ہو جن کے نبی اور کتاب آسمانی ہونے کی تصریح خود قرآن مجید کرتا ہو۔ ظاہر ہے مسلمانوں کو بھی اجمالی طور سے ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے، اسی لئے ان کے بارے میں نہ وہ کوئی اہانت آمیز بات کرسکتا ہے اور نہ اسے برداشت کرسکتا ہے۔ دوسرا گروہ عام غیر مسلموں کا ہے، وہ جن شخصیتوں پر ایمان رکھتے ہیں چونکہ ان کا عہد ماقبل تاریخ کا ہے اور ان کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ کوئی مصدقہ بات نہیں ہے اس لئے اس بات کا امکان موجود ہے کہ شاید وہ اپنے عہد کے پیغمبر ہوں اور ان کے متبعین نے ان کی تعلیمات میں ملاوٹ پیدا کردی ہو، اس لئے ہمیں ان کے بارے میں اپنی زبان طعن دراز نہیں کرنا ہے اور اہانت سے بچنا ہے، بلکہ جن بتوں اور مورتیوں کو یہ پوجتے ہیں۔ حالانکہ ان کا باطل ہونا بالکل واضح ہے لیکن ان کو برا بھلا کہنے سے چونکہ مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں اور عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اس لئے ان کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے: **ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبون اللہ عدوا بغیر علم.** (الانعام: 108).

لیکن آج مغربی دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ ایک طرف مذہبی مذاکرات اور مذہبی ہم آہنگی کی بات کرتی ہے دوسری طرف پیغمبر اسلامؐ کی ذات والا صفات پر حملہ کرنے والے سرپھرے مصنّفین کو انعامات سے نوازتی ہے، انہیں پناہ دے کر مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکتی ہے، مضحکہ خیز کارٹون شائع کرتی ہے، انٹرنیٹ کے ذریعہ کعبۃ اللہ کو میزائل کا نشانہ بناتے ہوئے دکھاتی ہے قرآن مجید کو گولیوں کا نشانہ بناتی ہے جن ملکوں میں ہولوکاسٹ پر

زبان کھولنا اور قلم اٹھانا جرم ہے اور جہاں اسامہ بن لادن اور طالبان کی حمایت میں اپنا نقطہ
نظر پیش کرنا بھی دہشت گردوں میں شامل ہونا ہے، وہیں اظہار خیال کی آزادی کے نام پر
مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی اجازت ہے اس طرح کیسے مذہبی ہم آہنگی پیدا
ہوسکتی ہے؟

مذاہب کے درمیان مذاکرات اور ہم آہنگی کے لئے دوسری بنیاد ’باہمی اشتراک ہے،‘
بہت سی اخلاقی قدریں مذاہب کے درمیان مشترک ہیں، کوئی مذہب زنا کی اجازت نہیں
دیتا، کوئی مذہب غریبوں کے استحصال کو جائز نہیں کہتا، کوئی مذہب ہم جنسی کی شادی کو گوارہ
نہیں کرتا، کوئی مذہب محض شبہ کی بنیاد پر قتل وخون کا قائل نہیں ہے کسی مذہب میں اس کی
گنجائش نہیں ہے کہ عورتوں اور بچوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جائے۔ یہاں تک کہ انہیں ایذائیں
دی جائیں، کسی مذہب میں بے قصوروں کا اغوا جائز نہیں ہے۔ آج دنیا محتاج ہے کہ مذاہب
کی ان مشترک تعلیمات کو عام کیا جائے، اس سے دنیا میں امن پیدا ہوگا اور انسانیت فلاح
وکامیابی سے ہم کنار ہوگی، لیکن جو مذاہب انسان کی نفس پرستی کے سامنے ہتھیار ڈال چکے
ہوں، جو اس بات سے قاصر ہوں کہ انسان کے نہ ختم ہونے والی بے جا خواہشات پر کوئی
روک لگا سکیں، کیا وہ مذاہب کی ان مشترکہ قدروں کو اپنی کوششوں کا حصہ بنا سکتے ہیں؟......
ہرگز نہیں!۔

مسلمانوں اور مسلم ممالک کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مذہبی مذاکرات اور ہم
آہنگی کا عنوان تو بڑا خوبصورت ہے لیکن اس کے پس پردہ مقاصد ومحرکات بڑے خطرناک
ہیں، اس کا مقصد مسلم معاشرہ میں مغربی تہذیب کو فروغ دینا، مسلم ممالک میں عیسائی
مشنریز کے لئے مذہبی تبلیغ کے مواقع فراہم کرنا، سعودی عرب اور خلیجی ملکوں میں چرچ وگرجا
بنانے کی اجازت حاصل کرنا ہے، جس کا مطالبہ امریکہ بھی کر چکا ہے اور پوپ پال بھی روم
کی مسجد کا حوالہ دیتے ہوئے کر چکے ہیں لیکن یہ قطعاً غلط استدلال ہے، روم میں مسلمانوں کا

تعمیر مسجد کا مطالبہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد روم میں آباد ہے، چنانچہ جن
مسلم ممالک میں عیسائی آباد ہیں وہاں ان کی عبادت گاہیں موجود ہیں، اس کے برخلاف خلیج
کے بعض ممالک وہ ہیں جہاں صدفی صد مسلمان آباد ہیں وہاں ظاہر ہے کہ کسی اور مذہب کی
عبادت گاہ کی تعمیر بے محل بات ہوگی۔

افسوس کہ عالم اسلام کے فرمانرواؤں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مغرب کے بعض مطالبات کو
قبول کر کے وہ ان کی خوشنودی حاصل کرلیں گے اور نفرت وعناد کی موجودہ فضا کو محبت کی فضا
سے تبدیل کرلیں گے لیکن یہ محض خوش فہمی ہے، قرآن مجید نے یہود ونصاریٰ کی جو نفسیات
بتائی تھی۔ کہ جب تک تم اپنے وجود کو ان کے وجود میں ضم نہیں کردوگے اور فکر وعمل میں پوری
طرح ان کی غلامی کو قبول نہیں کرلوگے، وہ تم سے خوش نہیں ہوسکتے: ’**لن ترضی عنک
الیھود والا النصاری حتی تتبع ملتھم** ‘(البقرہ:120)......آج بھی اسی طرح
قائم ہے۔ **لا تبدیل لکلمات اللہ۔**

☆☆

اصلاح معاشرہ

شخصیت کی تعمیر میں مسجد کا کردار

● حکیم محمد عمر فاروق شیخ

اسلام نے معاشرہ کی اصلاح، لوگوں کی تعلیم وتربیت، مسلمانوں کو باہمی طور پر منظّم ومربوط کرنے، ان کی اجتماعیت قائم کرنے اور ان کے آپس کے روابط قائم و مستحکم کرنے کا جو بہترین نظام دیا، اس کا ایک بنیادی ادارہ 'مسجد' ہے۔ یہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اظہار بندگی کی جگہ ہے تو دوسری طرف معاشرے کی دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح اور اسے اسلامی اقدار پر قائم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔ مسجد دراصل مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کا ایسا مرکز ومحور ہے، جہاں سے ان کے ذہنی، اخلاقی، تعلیمی تمدن، تہذیبی، سیاسی اور اجتماعی امور کی راہ نمائی ہوتی ہے۔

مسجد کا یہ کردار اسلامی تاریخ کے آغاز میں پوری طرح جاری وساری رہا، چنانچہ اس دور میں مسلمانوں کے علمی، دینی، تہذیبی اور معاشرتی معاملات مسجد ہی میں انجام دیے جاتے تھے، نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں مسجد دارالخلافہ سے غربا کی قیام گاہ تک تھی۔ جب تک مسجد کا یہ مقام باقی رہا، مسلم امہ، امت واحد کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دیتی رہی لیکن جب یہ رشتہ کمزور ہوا اور اجتماعی زندگی کی مرکزیت مسجد سے منتقل ہوکر دوسری اطراف اور دیگر مراکز میں چلی گئی تو امت افتراق وانتشار کا شکار ہوگئی۔

مسجد کی یہ حقیقت نبی اقدسؐ کے زمانے سے صدیوں بعد تک قائم رہی، چنانچہ اسلام

کے مثالی دور میں مسجد عدل وانصاف کا مرکز تھی، خود نبی اقدسؐ، خلفائے راشدینؓ اور اس کے دور کے تمام حکام مسجد ہی میں بیٹھ کر بیشتر امور انجام دیا کرتے تھے، تعلیم وتعلم کا سلسلہ مسجد نبوی میں صفہ سے شروع ہوا، جو صدیوں ہر مسجد کے ساتھ قائم رہا، بلکہ آج تک قائم ودائم ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم ترین ادارے جامعۃ الازہر اور بعض دیگر مشہور تعلیمی ادارے مسجد میں قائم ہوئے اور مسجدوں میں ہی انہوں نے ترقی وارتقاء کے جملہ مراحل طے کئے، مسلمانوں نے اپنے مثالی دور میں جتنے شہر اور بستیاں آباد کیں، ان میں مسجد کو مرکزیت حاصل رہی، چنانچہ کوفہ، بصرہ اور اندلس وغیرہ کی بنیادیں جب ڈالی گئیں تو ان کے نقشے میں مسجدوں کو مرکزی مقام دیا گیا۔

قرآن حکیم اور احادیث میں مسجد تعمیر کرنے، اسے آباد کرنے، اس کی دیکھ بھال کرنے اور اس کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ نیز جو لوگ مسجدوں کی خدمت کرتے اور مسجد کی ہر قسم کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ان کے لئے بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے، مسجد میں حاضری کو مسلمانوں کے لئے ایمان کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے: جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جس نے مسجد بنانے کا عہد کرلیا ہے تو تم اس کے ایمان دار ہونے کی گواہی دو، کیونکہ مساجد کی تعمیر وہی افراد کرتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ (جامع ترمذی)۔

اسلامی حوالے سے تعمیر شخصیت، کردار سازی اور اصلاح معاشرہ میں مسجد کا بڑا اہم کردار ہے اور اس کی حیثیت ایک مرکزی ادارے کی ہے لہٰذا اس ادارے کو وہی اہمیت، درجہ اور مقام دیا جائے جو رسول اکرمؐ نے دیا تھا اور بعد میں صحابہ کرام نے اسے مزید بڑھایا، آج بھی اگر مسجد کے کردار کو مرکزی اہمیت دی جائے تو معاشرے کی بہت سی خرابیاں ختم ہوجائیں، نیکیوں اور بھلائیوں کا دور دورہ ہوجائے۔ آج ہم اسلامی نظام کے قیام واجراء کی بات کررہے ہیں اور دل میں تمنا وخواہش بھی رکھتے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے

کہ اس کے لئے عملی اقدام کریں، اس عمل کی ابتدا اس طرح ہوگی جس طرح نبی اقدسؐ نے کی تھی اور اس کی ابتدا مسجد سے ہوئی تھی۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں مسجد کو وہ مقام ومرکزیت دینا ہوگی جو رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین نے دی تھی۔

معاشرے کی اصلاح کے لئے مسجد کو مرکز بنانے سے بہت سے ایسے فتنے یقیناً ختم ہوجائیں گے جنہوں نے معاشرے کو کھوکھلا اور تہس نہس کردیا ہے، جیسے علاقائیت، لسانیت، طبقہ واریت اور صوبائیت وغیرہ۔ نیز اس سے لوگوں کے دلوں سے حسد، بغض، کینہ، نفرت وکدورت کا قلع قمع ہوگا، پھر اس سے امیر وغریب، افسر وماتحت، مخدوم وخادم، اعلیٰ وادنیٰ، چھوٹے اور بڑے کے درمیان جو خود ساختہ امتیازات ہیں، وہ ختم ہوجائیں گے اور پھر وہی دور عود کر آئے گا جس میں اخوت ومساوات، ہمدردی وغم خواری یک جہتی اور ایک مساویانہ زندگی تھی۔

مسلم معاشرے میں مساجد کی ایک حیثیت اسلام کی چھاؤنیوں کی ہے جن کے ذریعہ زمین پر پھیلنے والے چھوٹے بڑے فتنوں، برائیوں اور خرابیوں کے خلاف جہاد کیا جاتا ہے، ان مراکز میں افراد کی روحانی، ذہنی، جسمانی، اخلاقی اور اصلاحی تربیت کرنے کے بعد انہیں عملی میدان میں لایا جاتا ہے، مسلمان دراصل اللہ کا سپاہی ہے، جس کا مرکز اور چھاؤنی مساجد ہیں، لہٰذا مسجد میں اس کی پانچ وقت حاضری اور نماز باجماعت کی پابندی لازم قرار دی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک فوجی سپاہی کی اپنی چھاؤنی میں حاضری لازمی ہے اور اس کی غیر حاضری کو کسی حالت میں برداشت نہیں کیا جاتا، اسی طرح مسجد سے غیر حاضری کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

مسجد کی یہ حیثیت پیش نظر رکھتے ہوئے اس مرکز سے اصلاح معاشرہ کا عظیم کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ مرکزی حیثیت نظر رہے اور اس کو کام کو اسی نہج اور ترتیب سے شروع کیا جائے جس سے نبی اقدسؐ نے شروع کیا تھا۔ ایک ایسی تجاویز پیش کی جارہی ہیں،

جنہیں سامنے رکھ کر نہ صرف مسجد کی علمی وعملی حیثیت بحال کی جاسکتی ہے، بلکہ اس سے اصلاح معاشرہ کا کام بھی بہترین انداز میں لیا جاسکے گا۔

مسجد سے روحانی وعباداتی تعلق کا احیاء ہر مسلمان کو مسجد سے گہرا تعلق ہونا چاہیے اور یہ تعلق اتنا مضبوط ہو کہ پانچ وقت کی فرض نماز مسجد میں جاکر ادا کرے، اکثر اوقات سنت ونوافل بھی مسجد میں جاکر ادا کرے، نماز سے کچھ وقت پہلے وہاں جاکر بیٹھے، تلاوت قرآن کرے، ذکر واذکار، مسنون اوراد وظائف پڑھے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ نماز کا انتظار کرنا (بھی) نماز (ہی) میں سے ہے۔ (مشکوۃ)۔

مومن کا مسجد سے صرف نماز کا تعلق قائم ہی نہ بلکہ وہ اپنے لیے دنیا میں بہترین جگہ مسجد ہی کو سمجھے اور اس سے لگاؤ رکھے اور جب مسجد میں آئے تو اعتکاف کی نیت کرلے، لہٰذا وہ جب تک مسجد میں بیٹھے گا اسے اعتکاف کا ثواب ملتا رہے گا۔ شریعت مطہرہ نے مسجد سے تعلق کی اس لیے تاکید کی ہے کہ بندہ جب تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہے، بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ نیکیاں کماتا رہتا ہے۔ مسلمان کے لئے مسجد سے تعلق اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ مسجد کی خدمت کرے، مسجد کے کام کاج میں خادموں کا ہاتھ بٹائے، صفائی وانتظام میں ان کی مدد کرے، لوگوں کو اللہ جل شانہ ونبی اقدسؐ کی باتیں بتائے اور کوئی دینی کتاب پڑھ کر سنائے، یا خود دین کا علم حاصل کرے۔ یہ سب اصلاحی کام سنت کے مطابق ہیں۔

مسجد کو باہمی اخوت ومحبت کا ذریعہ بنانا۔ اللہ تعالیٰ اور نبی اقدسؐ نے مسجد میں پانچ وقت حاضری اور جمعہ کے روز نماز جمعہ کی ادائیگی کا تاکیدی حکم اس لئے دیا ہے کہ مسجد میں آکر نماز پڑھنے سے مسلمانوں کے باہمی اخوت ومحبت کے تعلقات مستحکم ہوتے ہیں۔ جب تمام مسلمان ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں جن میں شاہ وگدا، امیر وغریب، حاکم ومحکوم، آقا وغلام، عالم وجاہل، پیر ومرید، اور چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں رہتا، پھر سب ایک امام کے پیچھے اس کی پیروی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور

سجدہ ریز ہوتے ہیں تو تمام امتیازات ختم ہوتے ہیں اور سب کے سب ایک اللہ کے بندے بن کر عبادت کرتے ہیں تو ان سے بہت سی کدورتیں، نفرتیں، تعصّبات، اونچ نیچ کے جھوٹے گھمنڈ، ذات پات کے فرق نسلی ولسانی، علاقائی، طبقاتی اور مسلکی تعصّبات اور تمام اختلافات ختم ہوجاتے ہیں اور مسلمان اس فرمان خداوندی کے مطابق ہوجاتے ہیں۔ پس تم اس کی مہربانی کی وجہ سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ (سورہ آل عمران)

مسجد میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے سلام کرتا ہے اور خیر وعافیت معلوم کرتا ہے، اگر کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو دوسرے لوگ اس کی ہمدردی ودل جوئی کرتے ہیں اس کی تکلیف کا مداوا کرنے کی فکر کرتے ہیں، اس طرح معاشرے میں ایک دوسرے سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ نیز مسجد کے طفیل معاشرتی مساوات قائم ہوتی ہے۔ اللہ کا گھر ایسی مساوات کی جگہ ہے جہاں نہ رنگ ونسل کا فرق ہے، نہ ذات پات کا اور نہ دھن دولت کا یہاں آکر سب کلمہ گواخوت کے رنگ میں گرایک ہوجاتے ہیں۔

دلوں کو مرکزِ مہرو وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تونے
اسے بازوے حیدرؓ بھی عطا کر

(علامہ اقبالؒ)

☆☆

معذرت نامہ

تیرے آستاں سے اونچا نہ میرا غبار ہوگا

● مولانا محمد یوسف متالا، انگلینڈ

حضرت مولانا محمد یوسف متالا صاحب دامت برکاتہم (بانی ومہتمم دارالعلوم ہولکمب بری (برطانیہ) خلیفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ) نے یہ دلکش اور معلومات افزا خط 'رابطہ ادب اسلامی' کے سہ روزہ پروگرام جو جامعہ علوم القرآن جمبوسر گجرات میں 22 تا 24 جنوری کو منعقد ہوا تھا کیلئے تحریر فرمایا تھا۔ جملہ مہمانان ومندوبین اور معزز علماء کرام کی موجودگی میں محبت وعقیدت سے لکھی یہ تحریر پڑھی گئی۔ قابل ذکر ہے کہ اس موقع پر مدبر اسلام حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، عالم جلیل مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا عبداللہ حسنی ندوی، مولانا یعقوب اسماعیل قاسمی ڈیوزبری، حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری، حضرت مفتی عبداللہ پٹیل مظاہری ہانسوٹ، قاری اسماعیل بسم اللہ کفلیہ، مفتی عباس بسم اللہ ڈابھیل، مفکر ملت مولانا عبداللہ کاپودروی، مولانا مفتی احمد دیولوی، مولانا عبدالعزیز بھٹکلی، مولانا نذر الحفیظ ندوی اور مولانا اقبال ندوی غازیپوری کے علاوہ ہندوستان کی تقریبا 19 ریاستوں اور 11 بیرون ممالک کے مقتدر علماء، اہل علم، ائمہ مساجد اور دینی مدارس کے ذمہ داران ونمائندے موجود تھے محترم قارئین کی دلچسپی اور افادات کے پیش نظر بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد یوسف متالا مدظلہ العالی کی یہ علمی، ادبی ومعلوماتی تحریر شائع کی جارہی ہے۔

(بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی)

☆☆

حضرت مفتی احمد صاحب مدیر رابطہ ادب اسلامی جامعہ علوم القرآن جمبوسر کی طرف سے منعقدہ سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ پہنچا۔ شرکت سے معذرت پر انہوں نے فرمایا کہ یہی معذرت آپ تحریر میں ارسال کردیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا تقی الدین صاحب مدظلہ (ابوظبی) نے اس پر اصرار فرمایا مگر شاید شدت تعلق مجھ جاہل بے ادب کی عدم استطاعت پر نظر کرنے سے مانع رہا اور میں نے سوچا کہ مفتی احمد صاحب نے خانقاہ خلیلیہ سہارنپور کی رفاقت میں شاید دیکھا ہوگا کہ قطب وقت سے اس شخص کو کتنا قرب حاصل ہے مگر پھر بھی اس کی خوئے بے ادبی اصلاح پذیر نہیں ہورہی۔

اسی طرح ان کے برادر اصغر امام اہل مدینہ مولانا محمد صاحب نے اپنے قیام مدینہ کے دوران طویل عرصہ روزمرہ کی کئی ایک مجالس میں ہزاروں دفعہ دیکھا ہوگا کہ ہم طلبہ جامعہ ٔ کلیۃ القرآن' ہر وقت منظوم قواعد رٹنے کے کتنے مبارک عمل میں مصروف رہتے ہیں اور یہ محض 'ریاض الجنۃ' کے پیچھے دائیں بائیں بیٹھے حاجیوں کے ساتھ تضیع وقت میں لگا رہتا ہے۔ کاش کہ ان دو برادران کی طرح اس جاہل کو مودب یا ادیب بنانے کے لئے کوئی قوی النسبۃ زور لگاتا جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا طلحہ صاحب مدظلہ کا حضرت مولانا علی میاں صاحب کی حیات میں جب لکھنؤ کا سفر ہوا اور حضرت مولانا علی میاں صاحب حضرت مولانا طلحہ صاحب کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور خدام پیچھے پیچھے۔ ان میں سے کسی نے دوران گفتگو دوسرے سے کہا کہ مولانا طلحہ صاحب......فوراً حضرت مولانا علی میاں صاحب پیچھے کو مڑے اور زور سے ڈانٹ کر فرمایا حضرت مولانا نہیں کہہ سکتے۔

میں ان دونوں بھائیوں کا دل سے بے حد ممنون ومشکور ہوں کہ ماضی بعید کے مجھ بے ادب کے ان کارناموں کو دیکھ کر انہوں نے سوچا کہ اس کو مودب بنانے کے لئے یہ ایک اچھا موقع ہے کہ ادبی مجلسوں میں اس کو بلایا جائے مگر شاید انہیں یہ اندازہ نہیں کہ اس قطب وقت

مجموعه القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

کی سفر وحضر کی طویل صحبت اور سہارنپور فیصل آباد اور افریقہ اور حرمین کی طویل مجاورت کے بھی نیک نتائج حسب تمنا وآرزو دیکھنے میں نہیں آئے۔ بلکہ اس قطب دوراں، برکۃ الزماں کے بعد بھی ہر سال ماہ مبارک کے اعتکاف اور غیر رمضان کے طلبہ دورہ حدیث کے اعتکاف اور چلہ کشی کی مصاحبت بھی بے ادب کے زنگ آلود قلب کے لئے صیقل کا کام نہ دے سکی۔ اگرچہ ہمارے یہاں مایوسی کفر ہے، مخلص با ادب بنانے کے لئے کوشاں رہیں میری تمنا ضرور ان کا ساتھ دے گی۔

ان کے آتے ہی میں نے دل کا قصہ چھیڑ دیا
الفت کے آداب مجھے آتے آتے آئیں گے

جو شخص بنیادی ادب انسانی سے اس حد تک ناآشنا ہو اسے علمی وادبی مجالس، شعراء وعلماء اور آداب صوفیاء سے آشنائی کب ہوسکتی ہے؟ بالخصوص جب کہ وہ غباوت کا اس درجہ تک مریض ہو کہ مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ اور حضرت مولانا محمد رابع صاحب ہجاء کے ذریعہ بھی گل رعنا ایک نام طویل مشقت کے بعد سمجھ پایا ہوں۔

یہ کام تو ان حضرات کے شایان شان ہے جن کی طرف آپ نے اپنے اس رابطہ اور مجلس کا انتساب کر رکھا ہے۔ وہ مفکر اسلام وہ مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ جن کے ہر قول وفعل سے ادب اور علم ہی ٹپکتا ہو، اس پر ہمارے مخلص دوست حضرت صوفی اقبال صاحب کا قصہ یاد آیا، وہ فرماتے تھے: کہ جب میں پنجاب سے لکھنؤ پہنچا اور حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ابتدائی کتب پڑھنے لگا، تو ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر حضرت نے ان کلمات سے تنبیہ فرمائی: کہ کل اگر آپ نے سبق نہ سنایا تو پھولوں کی چھڑی سے پٹائی کریں گے، اس پر آئندہ کے لئے صوفی جی کے لئے باب علم کس قدر وا ہوگیا ہوگا؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ ایک دفعہ حضرت مولانا علی میاںؒ آکسفرڈ تشریف لائے ہوئے تھے، میں نے دارالعلوم کے بعض اساتذہ کی وساطت سے استقبال، زیارت، وملاقات کے لئے

حاضر نہ ہوسکنے پر معذرت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ، مجھے دردسر اور چکر کا عارضہ ہے جس کی بنا پر معذرت پیش خدمت ہے اور حضرت کی دارالعلوم تشریف آوری کا متمنی ہوں، مگر اللہ رے ان اللہ والوں کی شفقت خلق، کہ حضرت مع اپنے رفقاء کے اگلے روز تشریف لے آئے اور مجھے عام صحت مند لوگوں کی طرح چلتا پھرتا دیکھ کر شکوہ یا استعجاب کو ان کلمات کے ذریعہ ظاہر فرمایا۔ ''ہمارے ذہن میں تصور تھا کہ مولانا یوسف صاحب تکیہ پر سر رکھے لیٹے ہوں گے، مشکل سے اٹھ کر مل پائیں گے'' اور ساتھ ہی علاج کے سلسلہ میں مشورہ کے طور پر ارشاد فرمایا، مولوی یوسف تم کسی اچھے ہومیو پیتھک سے علاج کیوں نہیں کراتے ؟ کہ ہومیو پیتھک علاج معجزہ سے کم نہیں، اس دن سے اپنے لئے اور دوستوں کے لئے امراض سے نجات اور صحت کا ایک جدید باب کھل گیا اور سینکڑوں دفعہ حضرت کے کلمات میں نے دہرائے ہوں گے کہ' ہومیو پیتھک علاج معجزہ سے کم نہیں'۔ ان وزنی کلمات ہی نے اس علاج کی طرف متوجہ کیا، ورنہ ذہن میں یہ راسخ تھا کہ اس قدر سستا علاج بڑے بڑے امراض کے لئے کیا مفید ہوسکتا ہے؟ مگر پچاسوں مریضوں کو کینسر اور ڈپریشن وغیرہ جیسے موذی امراض سے اسی طریقہ علاج سے نجات ملی۔ ذاتی اور متعلقین کے علاج میں ہومیو پیتھی کو اولیت کا درجہ دینا پڑا، اگرچہ اس میں قلبی اور روحانی مناسبت کو بھی شاید دخل ہو کہ اوائل ستینات میں حضرت کی تصانیف کے ذریعہ تعارف تھا، بعد میں 62-1961 میں سورت کے میمن ہال میں حضرت کا بیان ہوا جس کی خود تو سننے کی نوبت نہیں آئی، مگر بواسطہ طلبہ ورفقاء جو یہ بیان سن کر آئے اور اس تقریر اور اس کی تاثیر کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے رہے کہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ محبت کا بیج بونے میں ان شرکاء کا تقریب میمن ہال کا بڑا حصہ ہے۔

ان کا نقل کردہ جملہ اب تک یاد ہے کہ حضرت فرماتے تھے معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے دماغوں پر فالج پڑا ہوا ہے کہ لاکھوں کے خرچ سے عالی شان مساجد بنانے کا شوق ہے...... الخ۔ اگرچہ یہاں لطیفہ کے طور پر عرض کرسکتا ہوں کہ اس میمن ہال کی تقریر کے بارہ تیرہ

برس بعد جب مفکر اسلام ہمارے گاؤں نانی نرولی:

بیت الحبیب ذات الجمال
نانی نرولی فی کل حال

(حضرت مولانا عبدالمنان صاحب میوانیؒ)

تشریف لائے اور نئی تعمیر شدہ جامع مسجد میں نماز پڑھی، تو حضرت بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ کاش کہ یہ مسجد لکھنؤ میں ہوتی، میمن ہال والا جملہ اور یہ پسندیدگی کا اظہار دونوں میں تطبیق کے لئے صحیح بخاری کے تراجم اور احادیث مذکورہ میں تطبیق والے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ جو حضرات تطبیق نہ دے پائیں اور اعتراض سمجھیں ان شاء اللہ ان کی تسلی کے لئے یہ شعر کافی ہے۔ ع

میری خاک بھی اڑے گی باادب تیری گلی میں
تیرے آستاں سے اونچا نہ میرا غبار ہوگا

دیکھئے بے ادب کی جہالت کا اندازہ آپ کررہے ہوں گے کہ مفکر اسلامؒ کے ساتھ بیتی سرگزشت کا تفصیلی بیان شروع ہوگیا مگر جیسا کہ قلبی وروحانی مناسبت کا لفظ میں نے استعمال کیا تھا اس کی بنا پر مجبور ومعذور سمجھیں اور یہ یک طرفہ نہیں بلکہ جانبین سے تھا۔ ایک مرتبہ سہارنپور کی حضرت شیخ کے یہاں کی حاضری پر حضرت مولانا تقی الدین ندوی صاحب سے حضرت مولانا علی میاں صاحب نے یہ کلمات فرمائے'' مولوی یوسف کو حضرت شیخ سے......الخ۔ وہ کلمات نہ میں زبان پر لاسکتا ہوں اور نہ اپنے قلم سے لکھ سکتا ہوں جو مولانا تقی الدین صاحب نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی طرف سے نقل فرمائے۔

بہت سے شرکاء رابطہ ادب اسلامی کو شاید اندازہ نہ ہو کہ اس رابطہ کی نسبت حضرت مفکر اسلام مولانا علی میاں کی طرف کیوں ہے؟ ان کی اطلاع کے خاطر عرض ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں موجود شارع ملک عبدالعزیز کے مبدا پر جہاں عمارۃ الاوقاف رقم تھی، وہاں

فٹ پاتھ پر قبیل مغرب حضرت اپنے رفقاء کے ساتھ کسی کے انتظار میں کھڑے تھے، پھر معلوم ہوا کہ آج ادباء وشعراء کے ساتھ فلاں جگہ نعتیہ مشاعرہ، عربی ادب کی مجلس کا انعقاد ہے جس کی صدارت کے لئے حضرت تشریف لے جارہے ہیں۔ سبعہ معلقہ کی جماعت کو میں حضرت رحمۃ اللہ کی سبعہ معلقہ کی تدریس کے قصہ کے ساتھ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا بیت بازی کا قصہ سنایا کرتا تھا۔

قطب الاقطاب حضرت شیخ مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ کا قصہ بیان فرمایا تھا کہ ایک دفع ہم چند ساتھیوں نے جن میں مولوی اکرام بھی تھے۔ عشاء کے بعد بیت بازی شروع کی تھوڑی دیر بعد استنجاء کے لئے جانا ہوا، میں نے آسمان کی طرف نگاہ کی تو ایک روشنی دیکھ کر حیران ہوگیا۔ سب کو آواز دی وہ بھی دیکھ کر تعجب کرنے لگے کہ یہ کیسی روشنی ہے؟ اتنے میں موذن کی اللہ اکبر پر تنبہ ہوا کہ یہ تو صبح صادق ہے۔ ایسے مشغلوں میں رات اس طرح کٹ جاتی ہے۔

اس کے کئی سال بعد ایک سفر میں اسی سڑک پر ایک ہوٹل میں حضرت کا قیام تھا جس کے قبلہ کی جانب بقیع کی جہت کھڑکی سے اہل بقیع کی زیارت ہوسکتی تھی اس ہوٹل میں چند نامور علماء وفضلاء حضرات سے اجازت حدیث کے لئے پہنچے اور حضرت نے اپنی اسناد حدیث بیان فرمائی اور عربی میں حدیث کے علمی اشتغال کے قصے سنائے۔

مدینہ منورہ کے حضرت کے اسفار کا ایک اور قصہ یاد آیا کہ مسجد نور میں ہفتہ واری تبلیغی اجتماع تھا جس میں حضرت نے عربی میں بیان فرمایا۔ مضمون یہ تھا کہ اگر کسی کے سامنے شیر کی تصویر کھینچی جائے یا شیر پر کئی صفحہ کا مضمون لکھ کر کسی کو سنا دیا جائے تو جو حقیقی شیر کا سامنا ہونے پر کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا ایک ذرہ بھی اس تحریر وتصویر سے حاصل نہیں ہوسکتا، فرمایا یہی حال آج ہمارا رہ گیا ہے کہ ہم ماضی کی تاریخ اور گزشتہ اوراق سنا کر لوگوں کو ڈرانا چاہتے ہیں، جب تک ہمارے اسلاف کے ان اوصاف کو ہم اپنے اندر پیدا نہ کریں وہاں

تک اسلام ومسلمانوں کے اعداء کو ڈرانے کا خواب ہی رہ جائے گا۔ گھنٹہ ڈیڑھ کا یہ بیان تھا اس کے بعد رات کو حضرت مولانا سعید خان صاحب کے ساتھ تمام امور سے ہم اور وہ فارغ ہوتے تو مجلس رہا کرتی تھی، اس رات حضرت مولانا سعید خان صاحب کو ہم نے پایا کہ وہ حضرت مولانا علی میاں کے اس بیان سے بڑے متاثر تھے، وہ فرمانے لگے کہ ہماری جماعت میں روانی اور طلاقت کے ساتھ عربی بولنے والے میرے نزدیک سب سے پہلے حضرت مولانا علی میاں صاحب ہیں، ان کے بعد حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی ہیں اور ابھی ابھی حبشہ سے ہوکر پاکستان کی جماعت میں جو مفتی شاہد کراچوی آئے ہوئے ہیں، وہ تیسرے نمبر پر ہیں۔ جیسے حقیقی شیر اور تصویر کے حال پر تقریر کا ذکر ہوا، اسی طرح ایک دفعہ حق جل مجدہ کے سامنے حضرت مفکر اسلام کی فریاد بھی ان کانوں نے سنی، 1969 کے ماہ رمضان المبارک کا پہلا یا دوسرا عشرہ تھا اور حضرت شیخ انور مرقدہ قبل عصر صولتیہ سے وین میں حرم شریف لاتے تھے، اس وقت کے باب ابراہیم سے وہیل چیر کے ذریعہ داخل ہوکر حرم کی ترکی عمارت میں حطیم اور رکن یمانی کے محاذات میں تشریف رکھتے، عصر کے بعد حضرت چند پارے سناتے، اور قبل مغرب میں طواف میں مشغول ہوجاتا اور قبل افطار ملتزم پر پہنچ کر دعا کا معمول تھا۔ ایک روزہ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ غلاف پکڑے حضرت مولانا علی میاں صاحب سسکیوں کے ساتھ روتے ہوئے ان کلمات کے ساتھ دعا گو ہیں۔ **اللھم خذ ھم اخذ عزیز مقتدر اللھم نکس اعلامھم وفل اسلحتھم** ۔ ماثور دعاء سے ہٹ کر داعی کی اپنی زبان میں **اللھم نکس اعلامھم وفل اسلحتھم** پہلی مرتبہ مولائے بے نیاز کے ساتھ راز ونیاز اور یہ شکوی وشکایت ملتزم پر حضرت کی زبان سے سن کر پھر میں نے بھی اس کی نقل کی کوشش شروع کی شاید اسی کا نتیجہ ہو کہ 1970-71 میں کسی جگہ کی قیامت پر برطانیہ سے حضرت شیخ کی خدمت میں میرا خط پہنچا ہے اور اسی مضمون اور اسی تاثر کا رائے بریلی سے حضرت مولانا علی میاں کا خط حضرت شیخ کو پہنچتا ہے

جس میں یہ آیت لکھی ہوتی ہے **وانا لا ندری اشر اید بمن فی الارض ام اراد بھم ربھم رشدا** ۔اور یہی آیت اسی تاثر کے ساتھ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے بھی لکھی تھی، حضرت مولانا تقی الدین ندوی صاحب راوی ہیں کہ حضرت شیخ نے فرمایا کہ یہ لونڈا......الخ۔(وہ کلمات لکھے نہیں جاسکتے جو مولانا تقی الدین نے نقل فرمائے ہیں)

حضرت مولانا ندوی کے ساتھ باہم ربط ومناسبت کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ ملاقات پر فرمانے لگے کہ آپ کے جو مضامین ’معارف‘ اعظم گڑھ میں آرہے ہیں......ان کی حضرت نے تحسین فرمائی، نیز انہی مضامین کی دوسری شکل مشائخ احمد آباد جب چھپی ہے تو حضرت کے بعض خدام کی روایت کے مطابق حضرت نے کتاب کی تحسین فرمائی اور تعجب یہ ہوا کہ مجھ سا اردو اور تاریخ سے نابلد اور کون ہوگا؟ اور روایت کی تصدیق کے لئے بھی طبیعت آمادہ نہیں تھی۔

جیسا کہ میں نے شروع میں یہ عرض کیا کہ ان کے ہر قول فعل سے شعروادب علم وتاریخ کے موتی جھڑتے تھے جن کے سمجھنے اور قدر وآشنائی کے لئے ذوق ولطافت چاہیے۔
حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ کا 1979 میں جب انگلستان میں پہلا سفر ہوا اور برطانیہ سے حضرت شیخ سہارنپور پہنچے اور حضرت مولانا علی میں صاحب حضرت شیخ کی زیارت وملاقات کے لئے سہارنپور تشریف لائے تو مجھ سے ملاقات ومصافحہ کے ساتھ ہی فرمانے لگے۔’’
آپ حضرت شیخ کو برطانیہ لے گئے، آپ یوسف فاتح ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ شعروسخن علم وادب اور اسلامی تاریخ سے ہمارا رشتہ استوار فرمائے۔
آمین۔ **و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.**

☆☆

شعلہ بار صحراء میں جنت کی آس ہے ماں

● سہیل اختر قاسمی

جس طرح انسانی دنیا کی نسلی افزائش ’ماں‘ کا احسان ہے اسی طرح اس کی اخلاقی، جسمانی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی تربیت بھی اسی کی دین ہے۔انسانی دنیا میں ماں کے بنیادی کردار سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، اس نے نہ صرف نسل انسانی کی حفاظت کی ذمہ داری نبھائی؛ بلکہ اس کی تعمیر وتشکیل میں بھی بحسن وخوبی حصہ لیا۔یہی وجہ ہے کہ انہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔صالح معاشرہ میں ایک ماں کا جو کردار ہوتا ہے وہ اس معنی میں کافی اہم ہوتا ہے کہ اسی کی تربیت معاشرہ کی آئندہ زندگی میں نتیجہ کن ہوتی ہے، اگر ماں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں برتی اور بچے کی تربیت میں اپنے طور پر کوئی کسر نہیں چھوڑی تو اس کے بہترین نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں اور اگر ماں نے کسی بھی طرح کی کوئی چوک کی اور اپنی ذمہ اریوں سے فرار چاہا تو یہی نتائج کو پلٹ دیتے ہیں اور ہمیں برے انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج ہمارا معاشرہ جس راہ پر گامزن ہے اس سے نہ صرف یہ کہ اقدار پر اثر پڑا ہے، بلکہ اس نے ایک ماں کو اس کی ذمہ داریوں سے فرار ہونے کے مواقع بھی فراہم کئے ہیں۔ ’گلوبلائزیشن‘ اور ’کرلو دنیا مٹھی میں‘ کے پرفریب اعلانات سے خواتین میں جس طرح کی بے راہ روی اور انارکی پائی جارہی ہے اور سوشل ورکنگ کے نام پر جو غلط نظام زندگی اپنائی جارہی وہ افسوسناک ہے۔روایت پسندی کے خلاف جو جنگ جاری ہے اور خواتین کے

حقوق کی جو پر کشش آواز اٹھائی جا رہی ہے وہ بالتدریج معاشرہ میں ایک 'اچھی ماں' کا تناسب ختم کر رہا ہے۔

دراصل ماں کا لفظ اپنے عمومی اور بنیادی مفہوم میں ایک ایسی ہستی کے لئے ادا کیا جاتا ہے جس سے کسی بچے کی ولادت ہوئی ہو؛ یعنی بچے کے والدین میں سے مونث رکن کو ماں کہا جاتا ہے۔ انسانی نسل کو آگے بڑھانے کے لئے عورت اور مرد کا جنسی اختلاط لازمی ہے۔ معاشرے میں اس قسم کے اختلاط کی قانونی شکل کو شادی کا نام دیا جاتا ہے، جس کی تقریباً تمام مذاہب میں تفصیل موجود ہے۔ اس جنسی ملاپ کے دوران ماں ایک بیضۂ مخصبہ (ovumfertilized) کا حمل اٹھاتی ہے، جس کو ابتدا میں جنین (embryo) اور پھر 9 ہفتے کے بعد سے حمیل (fetus) کہا جاتا ہے۔ حمل اٹھانے کا وہ مقام جہاں حمیل اپنی پیدائش یا ولادت تک رہتا ہے اسے رحم (uterus) کہتے ہیں،۔ پیدائش کے بعد ماں کے پستان میں دودھ تخلیق پاتا ہے اور جسے وہ اپنے بچے کو غذا فراہم کرنے کے لئے پلاتی ہے اس عمل کو رضاع (lactation) کہا جاتا ہے۔ پیدا ہونے والے بچے کے لئے وہ عورت اور شریک مرد بچے کے حیاتیاتی اور معاشرتی باپ اور ماں کہلائے جاتے ہیں۔ ماں کے لئے دیگر الفاظ اماں، امی، ممی، ماما اور مادر وغیرہ آتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا لفظ دنیا کی متعدد زبانوں میں خاصا یکسانیت رکھنے والا کلمہ ہے اور اس کی منطقی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ماں کے لئے اختیار کئے جانے والے الفاظ کا اصل الکلمہ ایک کائناتی حیثیت کا حامل ہے اور اسے دنیا کی متعدد زبانوں میں اس دنیا میں آنے کے بعد انسان کے منہ سے ادا ہونے والی چند ابتدائی آوازوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب بچہ رونے اور چلانے کی آوازوں کی حدود توڑ کر کوئی مخصوص قسم کی آواز نکالنے کے قابل ہوتا ہے اور بولنا سیکھتا ہے تو عام طور پر وہ اُم اُم، ماما، مم مم، مما مما اور پاپا وغیرہ جیسی سادہ آوازیں نکالتا ہے اور محبت اور اس طرح پیار کے جذبے سے سرشار والدین نے ان ابتدائی آوازوں کو اپنی جانب رجوع

کرلیا۔ ماں کے لئے ایسی آوازوں کا انتخاب ہوا جو نسبتاً نرم سی ہوتی ہیں یعنی میم سے شروع ہونے والی؛ اور باپ کے لئے عموماً 'پ' سے ابتدا کرنے والی آوازیں دنیا کی متعدد زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ماں کو عربی زبان میں اُم کہتے ہیں، اُم قرآن مجید میں 84 مرتبہ آیا ہے، اس کی جمع اُمھات ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں گیارہ مرتبہ آیا ہے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ ''لفظ اُم جامد ہے اور بچہ کی اُم اُم وغیر کی آواز سے مشتق ہے کیونکہ جب وہ بولنا سیکھتا ہے تو آغاز میں اُم اُم وغیرہ ہی کہتا ہے اس سے اس کے اولین معنی ماں کے ہوگئے۔ ویسے اُم کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی اصل''۔ جاپانی زبان میں یہ معاملہ معکوس معلوم ہوتا ہے، آج کل کی جدید جاپانی میں ماں کے لئے 'اوکا' کا لفظ اختیار کیا جاتا ہے جسے مہذب انداز میں اوکاساں کہتے ہیں (جیسے اردو میں امی سے امی جان) جبکہ ماں کے لئے جاپانی زبان میں ایک اور لفظ آج بھی مستعمل ہے وہ ہے 'ہاہا'، یہ قدیم جاپانی میں 'پاپا' تھا جو کہ ہاہا میں تبدیل ہوا۔ یعنی اس سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ گویا معاملہ الٹ ہے کہ پے سے شروع ہونے والا لفظ ماں کے لئے اختیار کیا گیا؛ لیکن بنیادی طور پر ماخذ بچے کی ابتدائی آوازوں سے ہی نکلا ہے۔ جاپانی میں مم یا مما وغیرہ جیسے آواز کو ماں کے بجائے بچے کی غذا یا دودھ مانگنے کا خاموش انداز سمجھا گیا کیونکہ عام طور پر بچہ دودھ پیتے یا چوسنے سے قبل اس قسم کی آوازیں بھی نکالتا ہے۔ خلیل نحوی کا قول ہے ''ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات سما جائیں، وہ ان کی اُم کہلاتی ہے۔ جیسے لوح محفوظ کو اُم الکتاب کہا گیا، کیونکہ وہ تمام علوم کا منبع ہے۔ مکہ مکرمہ کو اُم القری کہتے ہیں، کیونکہ وہ خطہ عرب کا مرکز ہے۔ کہکشاں کو 'اُم النجوم' کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بہت سے ستارے سمائے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی وہ شخص جو بہت مہمانوں کو جمع کرے اسے 'اُم الضیاف' کہتے ہیں، ماں کی اسی لغوی اہمیت کی بناء پر تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب تمام شعبہائے حیات میں صرف 'ماوں' کی ہی حکومت تھی۔ سنا گیا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام سے تقریبا 7000 سال قبل مادری

نظام رائج تھا ،مادری نظام یا Matriarchy دو الفاظ کا مجموعہ ہے "M atri ماں" اور Archi رانی۔قبل از تاریخ کے عہد معاشرہ کے سیاسی، علمی، معاشی اور فنی شعبوں پر خواتین کی گرفت قائم تھی ۔اس دور میں ملکیت ، وراثت ،نسبت ،حقوق اور فرائض خواتین سے وابستہ تھے،گھر سے لیکر باہر تک انکی سربراہی قائم تھی۔آرکیالوجی کے معروف مغربی ماہر ڈیورنٹ اپنی کتاب ’’انسانی تہذیب کا ارتقاء‘‘میں تحریر کرتے ہیں’’ابتدائی معاشرے میں معاشرتی ترقی کا انحصار مرد کے بجائے عورت پر تھا‘‘۔الغرض ماں کی تاریخ کچھ بھی ہو وہ انسانی زندگی میں ایک بنیادی اور نہ محو ہونے والا شعوری وجود کا نام ہے،ماں ایک مسلسل احساس کا نام ہے،دوڑتی زندگی کی تازہ روح ہے،چلچلاتے صحراء میں چھاوں کا ایک آنچل ہے اور دنیائے جہنم میں جنت کی آخری آس بھی۔یوم مادر کے موقع پر’ماں‘ کی شخصیت کو یاد کرنے کی وجہ نہیں ہوسکتی ہے،ماں کو کسی مخصوص دن یاد کرنا’ممتا‘ کا سب سے بڑا مذاق ہے ؛مگر شاید یہ مذاق صرف ان لوگوں کے لئے کیا گیا ہے جو ماں کو نہیں جانتے ہیں اور شاید ان لوگوں کے لئے بھی جو ماں کو ختم کررہے ہیں۔

روحانی نظر خرد سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارے معاشرہ کی جو صورتحال ہے اور جس طرح کی بے راہ روی ہے وہ ماووں کو ختم کررہی ہے،وہ ماں کی ممتا کو ختم کررہی ہے۔یہ حقیقت ہے کہ جب ماں ختم ہوتے رہیں گے،رحم فنا ہتا رہے گا،انسانیت خشک ہوتی رہے گی اور جب ماں نہیں رہیگی تو آدم نہیں رہے گا،انسان نہیں رہیں گے، فرشتے نہیں رہیں گے،صرف شیطان ہوگا اور اسکی ابلیسیت ہوگی۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس احساس کو لیکر دنیا بھر میں انسانیت کے ان پجاریوں کو جگایا جائے جو’شمع روشن‘ کرنے کے نام پر محبت کی ان دیویوں کے دامن خدائی کو نذر آتش کررہے ہیں۔

☆☆

نیکی ضائع نہیں ہوتی

●مولانا محمد یوسف انور

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں سات باتیں اختیار کرنے کا حکم دیا اور سات کاموں سے روکا، پھر انہوں نے بیمار کی عیادت کرنے، جنازے میں شرکت کرنے، چھینکنے والے کا جواب دینے، سلام کا جواب دینے، مظلوموں کی مدد کرنے ،دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنے اور قسم کھانے والے کو قسم سے بری کرانے کا بیان کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلسل کوشش کی کہ معاشرے سے ظلم وزیادتی ختم ہو اور کسی پر ظلم نہ ہونے پائے، عدل وانصاف کا معاشرہ قائم ہو اور لوگ امن وسکون اور سلامتی وعافیت سے زندگی گزاریں، چناں چہ آپ ﷺ نے مظلوموں اور ظلم وستم میں پسے ہوئے لوگوں سے تعاون کرنے اور مجبوروں اور بے بسوں کی فریادرسی کرنے کے لیے ہدایات دیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت بیان کردہ تمام باتیں ایسی ہیں جو معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان پر مسلمان کسی کسی حد تک عمل بھی کرتے ہیں، البتہ وہ کام ایسے ہیں کہ ان کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے، ایک مظلوم کی مدد کرنا اور دوسرے کسی شخص کی ضروری ذمے داری کی ادائیگی میں مدد کرنا، جب کہ اسلام نے ظلم اور مصیبت میں مبتلا شخص کی مدد کرنے ،اس سے ہمدردی کرنے اور اسے ظلم سے چھٹکارا دلانے پر بہت زور دیا ہے، بلکہ ظالم ومظلوم دونوں سے خیر خواہی کرنے کا حکم دیا ہے۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا’’تو اپنے بھائی کی مدد کر، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ایک

شخص نے کہا اللہ کے رسول ﷺ مظلوم ہونے کی صورت میں تو اس کی مدد کروں گا، لیکن اس کے ظالم ہونے کی صورت میں کس طرح مدد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے ظلم کرنے سے روک دو، یہی اس کی مدد کرنا ہے۔ غور کیجئے کہ آپ ﷺ نے کس طرح ظالم و مظلوم دونوں سے خیر خواہی کرنے اور ان کو برائی سے بچانے کی ترکیب بتائی اور دونوں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ابھارا۔ سنن ابوداؤد کی ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اسے اس کے دشمن کے حوالے کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی دور کرے گا تو اللہ اس کے بدلے قیامت میں اس کی تنگی دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔ مسلمان کی ایک ذمے داری یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی عزت و آبرو کی غائبانہ اور پس پشت حفاظت کرے اور اسے نقصان و بربادی سے بچائے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مومن مومن کا آئینہ ہے، اور مومن مومن کا بھائی ہے، وہ اسے بربادی سے بچاتا ہے اور پیٹھ پیچھے اس کی حفاظت کرتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک اسرائیلی مظلوم کی مدد کرنے کا تذکرہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا ہے'' اس ارشاد سے دو مسئلے ثابت ہوئے، وہ یہ کہ مظلوم اگرچہ کافر یا فاسق ہی ہو، اس کی امداد کرنا چاہیے، دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم اور ظالم کی مدد کرنا جائز نہیں۔ مومن مومن کا آئینہ ہے۔ یہ حدیث جوامع الکلم کی قسم سے ہے۔ یعنی الفاظ تھوڑے مفہوم زیادہ۔ اس کی تشریح میں آئینہ دیکھنے والے اور آئینے کا تصور کیجئے تو کئی باتیں ذہن میں آئیں گی۔

(۱) آدمی جب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے اور وہ کوئی عیب بتاتا ہے تو آئینہ والا اسے توڑتا نہیں، بلکہ اپنا عیب دور کرتا ہے۔

(۲) آئینے کو اپنے چہرے کے سامنے رکھتا ہے، تب شکل نظر آتی ہے، اسی طرح اپنے بھائی کی بات سننے کے لیے اسے اپنے برابر کا سمجھے۔

(۳) آئینہ اتنا ہی بتائے گا جتنا ہوگا، کبھی بھی گھٹا بڑھا کر نہیں بتائے گا۔

(۴) جب آئینے کی طرف انسان رجوع کرے گا، تب اس کی شکل بتائے گا۔

(۵) پھر آئینہ جب سامنے سے ہٹ جائے گا تو پھر عیب کسی اور سے بیان نہیں کرے گا، یعنی غیبت اور عیب جوئی نہیں کرے گا۔

اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کی چند باتیں نکات کی صورت میں درج ذیل ہیں:

(۱) اگر قوت ہو تو برائی اور ظلم کو ہاتھ سے روکنا چاہیے۔

(۲) بصورت دیگر برائی اور ظلم کو زبان سے برا کہنا چاہیے۔

(۳) اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اپنے دل میں اسے برا سمجھنا چاہیے۔

(۴) مظلوم کی مدد کے کئی طریقے ہیں، جیسے ان کو مجاز اتھارٹی کے پاس لے جانا، اس کی فریاد حکام بالا تک پہنچانا، صحیح مشورہ دینا۔

(۵) اسے ظلم سے بچنے کا مشورہ دینا، اس کی رہنمائی کرنا۔

(۶) جماعتوں، تنظیموں اور طاقت ور گروہوں کو ظلم سے روکنے کے لیے ترغیب دینا۔

(۷) مظلوم سے کم از کم زبانی ہمدردی کرنا۔

(۸) مظلوم کی مالی، قانونی و اخلاقی امداد کرنا جس سے وہ ظلم سے بچ سکے۔

(۹) آج کل کے دور میں اسے میڈیا تک لے جانا۔

یہ سب وہ ذرائع ہیں، جن کے ذریعے ہم معاشرے سے ظلم و جبر کے خاتمے، لوگوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کی دادرسی کے لیے اپنا مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

☆☆

نیت جس پر تمام اعمال کا دارومدار ہے

● ڈاکٹر عمر حیات عاصم سیال

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول ﷺ ہی کے لیے ہوگی اور جس شخص نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ (بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کی فضیلت و اہمیت پر محدثین کی رائے ایک ہے، بعض محدثین اور علمائے کرام نے اس حدیث کو نصف علم کا درجہ دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص جیسی نیت کرے گا، ویسا ہی اس کا اجر پائے گا، چناں چہ ایک عمل میں جتنی نیت کرے گا اتنے ہی ثواب اسے حاصل ہوں گے، مثلاً اگر کوئی شخص اپنے عزیز کی مدد اس نیت سے کرتا ہے کہ غربت کی مدد کرنا کارِ ثواب ہے تو اسے اسی کا ثواب ملے گا، لیکن اگر اس کے ساتھ ہی صلۂ رحمی کی بھی نیت کرتا ہے کہ غربت کی مدد کرنا کارِ ثواب ہے، مگر اس سے میرے رشتے دار کی پریشانی دور ہو جائے گی، تو اب محض یہ نیت کر لینے سے اسے دو ثواب ملیں گے۔ مسجد میں جانے کی کئی نیتیں ہیں اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ ثواب ملتا ہے۔ مثلاً ایک شخص مسجد جاتے وقت یہ نیت کرے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، جہاں آنے والا گویا اللہ کی زیارت کو آتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اور کریم کے لیے مہمان کی خوشی ضروری ہوتی ہے، لہٰذا میں بھی یہ

مجموعہ القاسم: جلد ششم　　تیری عظمتوں کو سلام

خواہش رکھتا ہوں تو اسے یہ ثواب حاصل ہو جائے گا اور اگر نیت کرے جماعت کے انتظار کا، چونکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جماعت کا انتظام کر رہا ہے وہ گویا حالت نماز میں ہے، پس اس نیت سے اس کا ثواب بھی مل جائے گا۔

اگر کوئی شخص مسجد میں آتے ہی اعتکاف کی نیت کرے۔ اعتکاف کی مدت کم سے کم ایک ساعت ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت اعتکاف کی نیت کر لے، اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ایک نعمت ہے جو بغیر محنت کیے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح مسجد آتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت مسنون دعائیں پڑھنا اور رسول ﷺ پر درود بھیجنا سعادت کا باعث ہے، اگر مسجد میں داخل ہوتے وقت اس کی نیت کر لے، تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔ اگر مسجد میں داخل ہوتے وقت اللہ کا ذکر، تلاوت قرآن مجید اور وعظ و نصیحت کی نیت کر لے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔ حدیث میں آیا ہے جو شخص صبح مسجد میں ذکر و نصیحت کے لیے جاتا ہے، گویا وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔ تلاوت قرآن مجید اور وعظ و نصیحت کرنے والوں پر رحمت خداوندی کا سایا ہوتا ہے۔ اگر وہ نیت کرے مسجد میں مسلمان بھائیوں سے ملاقات کی اور ان پر سلام و رحمت کی، نیت کرے محاسبۂ نفس کی، فکر آخرت اور گناہوں سے استغفار کی۔ ہر حال میں مسجد میں آنے کا عمل ادائیگی نماز ہے، لیکن چوں کہ نیتیں الگ الگ اور بہت زیادہ ہیں، اس کے لیے ثواب ان سب کا حاصل ہوگا، گویا عمل ایک اور نیت کے سبب سے ثواب زیادہ ہوں گے۔

جمعہ کو عام طور پر خوشبو لگانا غسل کرنا سنت ہے، اگر اس کے ساتھ یہ نیت کر لے کہ چوں کہ حضور اکرم ﷺ خوشبو کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے، اس لیے میں بھی خوشبو لگاتا ہوں اور یہ نیت کرے کہ خوشبو لگانے سے مسجد کی تعظیم بھی ہوگی نیز یہ کہ جو شخص میرے قریب بیٹھے گا خوشبو محسوس کر کے خوش ہوگا اور یہ کہ کوئی شخص میرے خوشبو نہ لگانے کی وجہ سے بدبو کے باعث میری غیبت کرے گا اور میں خوشبو لگا کر اسے گناہ سے باز رکھتا ہوں، یہ نیت

کرے تازہ خوشبو سے میرا دماغ تازہ ہوگا، میں جس علمی محفل میں بیٹھوں گا، ماحول اور خوشبو کی وجہ سے کام کی باتیں اچھی طرح ذہن نشیں ہوں گی۔ یہاں خوشبو لگانے کا عمل ایک ہی ہے، جس جس کا تعلق محض انسانی جذبے اور خواہش سے ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ یہ تمام نیتیں کر لی جائیں تو ان پر الگ الگ ثواب ملے گا۔ اسی طرح ہر عمل میں شریعت اسلامیہ کے مزاج کے مطابق مختلف نیتیں ہو سکتی ہیں، جن پر بے شمار ثواب کا ثمرہ مرتب ہو سکتا ہے۔ جو ہر مسلمان کی اشد ضرورت ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ اگر کوئی عمل محض نفسانی خواہشات کے لیے کرتا ہے تو ثواب کی دولت سے تو محروم رہے گا، بلکہ مستحق ملامت وعتاب ہوگا، جو بتدریج جرم کی طرف رغبت کا سبب بنے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل کا مدار، یعنی اس پر ثواب ملنا نیت کے درست ہونے پر ملے گا، جیسی نیت ہوگی، ویسا ہی اس کا ثمرہ مرتب ہوگا۔

بغیر نیت کے اعمال کا اعتبار نہ ہوگا۔ نیت کے مسائل میں شریعت اسلامیہ میں جن اعمال سے پہلے نیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ایسے اعمال جو شریعت میں مطلوب ومقصود ہیں، جیسے نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اس قسم کے اعمال بغیر نیت کے معتبر نہیں ہوں گے اور نہ اللہ کے نزدیک قابل قبول ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیت کی ضرورت اور احتیاج اعمال مقصودہ ہے کیونکہ بغیر نیت کے اعمال کی کوئی حقیقت نہیں، البتہ بعض اعمال جن کا کرنا مقصد نہ ہو، بلکہ ان کا کرنا کسی خارجی حکم کی بناء پر ہو، مگر ضروری ہو جیسے غسل اور وضو جو فی نفسہ مقصود نہیں ہوتے، بلکہ غسل کی ضرورت طہارت کے لیے لازم ہے اور وضو نماز کے لیے لازم ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک غسل اور وضو بغیر نیت کے بھی درست ہوں گے، کیونکہ ان کے نزدیک نیت فرض نہیں ہے، بلکہ سنت اور مستحب ہے، لہٰذا اگر وضو یا غسل بغیر نیت کے کیا گیا تو ادا ہو جائے گا۔

شریعت اسلامیہ میں نیت مراد اللہ کی قربت کا ارادہ کرنا ہے، یعنی جو کام کرے صرف اللہ کے لیے کرے اور اس کے حکم کو پورا کرنے اور اللہ کی رضا کو طلب کے لیے کرے۔ نیت

مجموعہ القاسم: جلد ششم
تیری عظمتوں کو سلام

کے معنی دل سے قصد کرنے کے ہیں۔ دل سے کی جاتی ہے زبان سے کہنا شرط نہیں۔ عبادات میں اگر محض زبان سے کہا اور دل میں نیت نہیں کی تو عبادت درست نہ ہوگی۔ صرف زبان سے کہنے کا اعتبار نہیں ہوگا۔ نیت کا اثر عبادات میں مرتب ہوتا ہے کہ حرام کام میں نیت کا اعتبار نہیں ہوتا اور نہ اس کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ نیت کے لیے کئی چیزیں شرط ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی عبادت مقبول ہوتی ہے، کافروں کی عبادت نہ تو صحیح ہوتی ہے اور نہ مقبول ہوتی ہے۔ دوسری بات عقل اتنی رکھتا ہو کہ عبادات اور غیر عبادت میں فرق سمجھتا ہو، اسی لیے دیوانے اور تمیز نہ کرنے والے کی عبادت معتبر نہیں ہوتی۔ علم، یعنی جس چیز کو کر رہا ہے، اس کی حقیقت اور اہمیت جانتا ہو۔

عبادت کے علاوہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں دل سے نیت کرنے کا سرے سے اعتبار ہی نہیں ہوتا، بلکہ ان میں زبان سے کہنا ضروری ہے اور کافی ہوتا ہے، مثلاً طلاق، ایک شخص اگر اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے، لیکن زبان سے نہیں کہتا، صرف دل میں نیت کر لیتا ہے مگر زبان سے نہیں کہتا، اس طرح طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس طرح یہاں صرف زبان سے کہنے کا اعتبار کیا جائے گا اور محض زبان سے کہنا کافی وضروری ہوگا۔ ایک شخص کسی مسلمان سے کسی ناراضی یا لڑائی کی بناء پر ملاقات نہ کرے تو یہ اس کے حق میں حرام ہے، ہاں اگر اس کا ملاقات نہ کرنا اس بناء پر نہ تھا، اس صورت میں اگر بہت عرصے تک بھی ملاقات نہ کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک شخص کو کوئی چیز پڑی ہوئی ملی، اگر وہ شخص اس چیز کو اس نیت سے اٹھاتا ہے کہ اس کے مالک کو ڈھونڈ کر یہ چیز اس کے حوالے کر دوں گا تو یہ جائز ہے اور اگر اس نیت سے اٹھاتا ہے کہ اس کے ماک کو نہیں دوں گا، بلکہ اپنے پاس رکھوں گا تو یہ ناجائز ہے اور یہ شخص وہ چیز اٹھا کر غاصب اور گناہ گار ہوگا۔

☆☆

احیاء سنت کا جذبہ

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کی تحریکِ اصلاح

● حضرت مولانا اسیر ادرویؒ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو خاندان ولی اللّٰہی کے بزرگوں سے والہانہ عقیدت تھی ان میں سے کسی کا بھی تذکرہ ہوتا تو زبان ودل دونوں روحانی لذتوں سے سرشار ہوجاتے تھے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا جب ذکر فرماتے جیسا کہ اپنی کتاب میں لکھا ہے: 'حجۃ اللہ فی العالمین، خاتم المحدثین والمفسرین، عمدۃ المتکلمین، زبدۃ المناظرین مولانا شاہ عبدالعزیزؒ' عشق کی حد تک عقیدت وارادت حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ سے تھی، مجلس میں اگر کسی نے شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ذکر چھیڑ دیا تو اس کی بات کاٹ کر خود ان کا تذکرہ والہانہ انداز میں شروع کردیتے تھے اور شاید یہ ذہنی وفکری مناسبت کا نتیجہ تھا:

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا واقعہ:

حضرت شاہ اسماعیلؒ اور حضرت نانوتویؒ دونوں میں ذہن ومزاج، طریق کار، جوش وجذبہ، جفاکشی ومحنت احیاء سنت کا جذبہ، فراواں، بدعات وخرافات، ہندوانہ رسم ورواج کی بیخ کنی کا حوصلہ مشترک تھا، دلی جذبات کے اس خزانے میں سے اگر نصف اسماعیل شہیدؒ کو

عطا کیا گیا تو نصف خزانہ حضرت مولانا نانوتویؒ کے دامن ڈال دیا گیا، یہ قدرت کی فیاضی تھی، دونوں میں تواضع وانکساری اور سادگی یکساں تھی، دونوں ننگے پاؤں چلنے کے عادی، دونوں کے حالات بھی بیشتر ایک ہی جیسے پیش آئے۔ بطور مثال دونوں شخصیتوں کے ایک ایک واقعہ کو آپ بھی سن لیں۔

مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ پھلت ضلع مظفرنگر میں عقدِ بیوگان پر تقریر فرمارہے تھے۔ یہ بری رسم ہندوؤں سے مسلمانوں میں آئی تھی۔ ہندوؤں کی اونچی ذات میں شادی ممکن نہ تھی، مسلمانوں کے بھی ایک طبقہ میں یہی برہمنیت کی بیماری آگئی تھی، بیواؤں کی شادی کی جو بات کرتا تو اس کی گردن بھی ناپی جاسکتی تھی۔ حضرت شاہ شہیدؒ نے جب اپنی تقریر میں بیواؤں کی شادی پر زور دیا۔ تو ایک صاحب نے غرور برتری میں کھڑے ہوکر کہا کہ مولانا مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے، آپ سمجھ گئے کہ یہ 'مسلمان برہمن' کیا کہنا چاہتا ہے۔ آپ نے اس کا اعتراض سنے بغیر کہا کہ میں کچھ دیر بعد آپ کی بات سنوں گا۔ اسٹیج سے اترے اور پھلت سے سیدھے دہلی اپنے گھر آئے اور اپنے بیوہ بہن کے قدموں پر اپنا عمامہ اتار کر ڈال دیا کہ اگر آپ چاہیں کہ اسماعیلؒ وعظ کہے تو آپ میری بات منظور کرلیجئے ورنہ میں وعظ نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے حیران ہوکر پوچھا بتاؤ تو سہی، تب مولانا نے فرمایا کہ تمہارا عقد نہ کرنے کی وجہ سے میرا وعظ بے اثر ہوجاتا ہے، ان کے شوہر مولوی عبدالرحمٰن صاحب کا انتقال ہوچکا تھا وہ جلد ہی بیوہ ہوگئی تھیں، وہ بوڑھی ہوچکی تھیں، ان دنوں کچھ بیمار چل رہی تھیں لیکن جب صورت حال ایسی پیدا ہوگئی تو انہوں نے حضرت شہیدؒ کی بات مان لی اور اسی وقت مولانا عبدالحئی صاحب سے ان کا نکاح پڑھا دیا جو پھلت ہی کے رہنے والے تھے جہاں آپ کی تقریر پر اعتراض کیا گیا تھا، معترض نے اپنے دل میں جو اعتراض چھپا رکھا تھا شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اس کا جواب زبان کے بجائے عمل سے دے دیا اور پھر پھلت جاکر اپنی تقریر تمام کی۔

حضرت نانوتویؒ کا واقعہ:

بالکل اسی طرح کا واقعہ حضرت نانوتویؒ کے ساتھ دیوبند میں ہوا۔ قصبہ دیوبند شیوخ کا مرکز تھا ان کو اپنی عظمت و برتری کا احساس اتنا ہی تھا جتنا کسی برہمن کو دوسرے ہندوؤں کے مقابلہ میں احساس برتری ہوتا ہے، اس لئے برہمنوں میں بیوہ کی شادی جرم اور عزت وشان کے منافی تھی تو یہ معزز مسلمان ایسی ذلت کا کام اپنے معاشرہ میں کیسے روا رکھتے، بیوہ کی شادی سے ان کی مصنوعی برتری پر حرف آتا تھا اور وہ اس کی سخت مخالفت کرتے تھے، کئی بار اس کا مظاہرہ بھی وہ کر چکے تھے۔

مولانا وحید الدین مظفرنگری ایک عالم باعمل تھے، دیوبند کے شیوخ میں ان کو عزت واحترام بھی حاصل تھا، دیوبند میں ان کے مواعظ بھی ہوتے رہتے تھے اور لوگ عقیدت کے ساتھ ان کے وعظوں میں حاضر بھی ہوتے تھے ایک دن اثناء وعظ میں انہوں نے عقد بیوگان کا مسئلہ چھیڑ دیا، ابھی تمہید ہی شروع کی تھی کہ ایک رئیس زادہ دوڑتا ہوا آیا اور برسر منبر مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ڈانٹتے ہوئے کہا بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو۔ عرب ہو یا ہندوستان، دونوں جگہ قبیلہ کے چودھری ہی حق کی آواز دبانے کے لئے پہلے آگے بڑھتے ہیں۔ دیوبند کے کسی فرد نے مولوی صاحب کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ شیخ زادے کی یہ حرکت گویا ہر ایک کے جذبات کی ترجمانی تھی۔

اسی دیوبند اور اسی ماحول میں حضرت نانوتویؒ نے عقد بیوگان پر تقریر فرمائی، ابتداء میں تو صرف چہ می گوئیاں ہوئیں، لوگ چونکے، کچھ لوگوں نے مخالفت کرنے کا ارادہ کیا مگر عملی طور پر اس کا ظہور نہیں ہوا۔ آپ مسلسل اپنی تقریروں میں بیواؤں کی دوسری شادی کے بارے میں لوگوں کو سمجھاتے رہے پھر ایسی تقریروں کا نظم کیا گیا کہ خواتین تک حضرت نانوتویؒ کی باتیں پہنچ جائیں اور وعظ سن لیں، اس طرح مردوں اور عورتوں کے کانوں تک

بات پہنچائی گئی اور عملاً یہ کیا کہ دیوبند کے سب سے معزز گھرانے کے فرد حاجی محمد یٰسین جو دیوان جی کے نام سے مشہور تھے اور حضرت نانوتویؒ سے بیعت تھے ان سے فرمایا کہ آپ اپنی بیوہ بہن کا عقد ثانی کر دیں چنانچہ عقد ثانی ہو گیا۔

اتفاقاً آپ جب یہ اصلاحی تحریک چلا رہے تھے کہ آپ کی ہمشیرہ بیوہ ہو گئیں۔ اس کا تفصیلی واقعہ حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی زبانی سماعت فرمائیے۔

’حضرت نانوتویؒ محلّہ دیوان میں نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے تھے اثناء وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے، حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کریں گے۔ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہریں، مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت وعظ کی چوکی سے اترے اور گھر میں تشریف لے گئے، مجلس اپنی جگہ جمی رہی، گھر میں پہنچ کر اپنی بیوہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھی اور کافی ضعیف ہو چکی تھی، پیر پکڑ کر لجاجت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسولؐ زندہ ہوتی ہے اور میں احیاء سنت کے قابل ہو سکتا ہوں، بہن نے گھبرا کر کہا بھائی ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑ دو۔ میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسولؐ کے احیاء کا سبب بنوں، فرمایا کہ آپ نکاح کر لیں، اس پر بہن نے کہا بھائی! تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں، سر سفید ہو چکا ہے، نکاح کی عمر نہیں ہے، فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیاء کے لئے ہوگا، کسی طبعی ضرورت کی بنا پر نہیں، اس بات پر بہن راضی ہو گئیں، اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے، مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہوئے تھے، پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں .... آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہوئی ہے۔ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ

بیٹھی ہیں ان کے نکاح کے گواہ تو اسی مجلس میں موجود ہیں۔ چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس سے تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے بڑھی‘۔حضرت نانوتویؒ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے، نام نہاد شرفاء نے اپنی شرافت کی نمائش کے لئے ہندوؤں سے بہت سی رسمیں مستعار لے رکھی تھیں ان کو بیخ وبن سے اکھاڑ دینے کا عزم بالجزم کئے ہوئے تھے۔آپ نے ایک اہل علم کو ان کے خط کے جواب میں ہندوؤں کی رسموں کو اختیار کر لینے پر کتنے درد سے یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

”کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے کو بھلا کہہ سکتے ہیں۔“

لڑکیوں کو حق وراثت:

مسلمان جاگیرداروں، زمینداروں اور مالداروں نے ہندوؤں سے ایک اور رسم بھی لے رکھی تھی۔ ہندو مذہب میں لڑکیوں کو حق وراثت حاصل نہیں ہے۔مسلمانوں نے بھی اسلام کے بیان کردہ احکام وراثت کو ٹھکرا کر ہندو مذہب کی اس غلطی کو خود اپنے یہاں رائج کر لیا تھا اور پوری سختی سے اس پر کاربند تھے،شرعی قانون وراثت کی کھلم کھلا مخالفت کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ لڑکیوں کو حق وراثت حاصل نہیں ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی مجلس میں ایک بار قصبہ جلال آباد ضلع مظفرنگر کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ وہاں لڑکیوں کا حق جو شریعت نے مقرر کر دیا ہے نہیں دیا جاتا ہے اس لئے جلال آباد کے مسلمانوں کی جائداد کا خریدنا جائز نہیں ہے، پھر آپ نے شریعت کی اس خلاف ورزی کو مٹانے کی مہم چلائی اور مظفرنگر سہارنپور اور مغربی اضلاع سے غیر شرعی رسم اور لڑکیوں پر ہونے والے ظلم کو معاشرہ سے ختم کیا۔ میں حضرت نانوتویؒ کی اصلاح مہم کی تفصیلات کو پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی نے اصلاح

کی جو ہندوستان گیر مہم چلائی تھی اور ان دونوں بزرگوں کی شہادت کے بعد یک لخت بند ہوگئی تھی اور کروٹ لیتا ہوا معاشرہ پھر ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا تھا۔اسی جسد بے روح میں حضرت نانوتویؒ ایک نئی روح ڈال رہے تھے اور اس کو ایک نئی زندگی دینے کی کوشش میں مصروف تھے،حضرت نانوتویؒ سے کچھ دنوں پہلے مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ اور مولانا مملوک علی نانوتویؒ مردہ اصلاحی تحریک کو زندہ کرنے کی ایک مہم چلا چکے تھے،اس کو نئی زندگی دینے کا آغاز ہی کیا تھا کہ یہ دونوں حضرات سفر آخرت پر روانہ ہوگئے پھر حضرت نانوتویؒ نے میدان عمل میں آکر مسیحائی کی تو اس تحریک میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی اور اس کے جسم میں نئی توانائیاں آئیں اور پھر پورے ملک میں یہ تحریک ایک سیلاب کی طرح بڑھی اور پھیلی اور آج جو کچھ اسلامی معاشرہ میں اصلاح کے اثرات نظر آتے ہیں اس میں سب سے بڑا ہاتھ حضرت نانوتویؒ کی مختلف الجہات کوششوں کا ہے،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جس طوفان میں اپنی کشتی ڈالی تھی وہ حالات کے شورانگیز تموج کی تاب نہ لاکر شکست وریخت کا شکار ہوگئی،اسی کشتی کے مسافروں میں ذہنی وفکری طور پر حضرت نانوتویؒ بھی شریک تھے اور شکستہ کشتی کے Ÿیزبان کو جب صورت حال معلوم ہوئی تو سخت پریشان ہوئے کسی میں ہمت نہیں تھی کہ حاضر ہو کر عرض کرے،جلال کی کیفیت طاری تھی، آخر میں سید مہربان علی صاحب نے اس فقیر کو تلاش کرایا اور اس کو پانچ روپے دیئے اور کہا کہ تم جا کر ہماری طرف سے معذرت کرو اور حضرت کو راضی کرو۔اس نے حکم کی تعمیل کی تب آپ راضی ہوئے اور آکر وعظ فرمایا:

بے تکلفی:

حضرت نانوتویؒ کی شخصیت میں جلال و جمال دونوں رنگ تھے جلال کا ایک منظر آپ نے دیکھا شان جمالی کی بھی ایک جھلک آپ دیکھ لیں۔حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

''مولانا محمد قاسم صاحب کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب چلتا رہتا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ایک یار باش ہیں۔'' ایک اور روایت بھی سماعت فرمائیں جو آپ کے ایک سوانح نگار نے لکھی ہے ان کی کتاب شائع نہیں ہوسکی اور آخر تک قلمی ہی رہ گئی اور اس کی ابتدا اور آخر کے اوراق بھی غائب ہوگئے لیکن پورا مسودہ مل گیا اس کے مرتب حاجی فضل حق تھے جو دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں میر منشی تھے اور چند دنوں کے لئے دارالعلوم کے مہتمم بھی بنائے گئے تھے وہ اپنی قلمی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''حضرت نانوتویؒ کی مجلس کے ارکان ان کے تلامذہ اور تعلق وارادات رکھنے والے ہوتے، ان سب سے اس طرح پیش آتے جیسے یاروں کے یار، ایسی تعظیم وتوقیر فرماتے جیسے کوئی مرید یا شاگرد اپنے شیخ یا استاد کی کرتا ہے۔ ہر ایک کا پورا نام لیتے، بلکہ ''میاں'' اور آخر میں ''صاحب'' بھی بڑھاتے تھے، کبھی کسی شاگرد یا مرید کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ میرا شاگرد ہے یا مرید ہے بلکہ فرماتے یہ مرا دوست ہے، میرے مہربان اور میرے عنایت فرما ہیں۔''

ہم عمروں میں بے تکلفی ذرا اور بھی بڑھ جاتی تھی، حماسہ، سبعہ معلقہ کے شارح اپنے دور کے مشہور ادیب اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل علامہ شبلیؒ کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ حضرت کے ہم عمر بھی تھے اور دونوں ایک ہی پیر حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے مرید وخلیفہ بھی تھے، دونوں کو اپنے اپنے علم وفن میں جتنا کمال حاصل تھا اتنی ہی دونوں میں بے تکلفی بھی تھی، ایک بار مولانا فیض الحسن صاحبؒ سہارنپوری نے حضرت نانوتویؒ سے فرمایا:

''اے جاگنوار کے لونڈے، تجھے علم وفن سے کیا واسطہ تو جا کر ہل جوت، کھیتی کر''

مولانا فیض الحسن صاحب لحیم وشحیم اور رنگ سانولا تھا حضرت نانوتویؒ نے ترکی بہ ترکی

جواب دیا اور ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''ہاں ایک بھینسا تو مل گیا دوسرا مل جائے گا تو کام شروع کردوں۔''

رواداری:

بڑے بڑے اہل علم بھی اپنے مخالفین کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے احتیاط کم ہی کرتے ہیں۔ تلخی کے ساتھ کسی سے پیش آنا ادفع بالتی ہی احسن کے حکم کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ مخالفوں کا ذکر بھی دل آزار لفظوں میں سننا پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بیان ہے کہ:

''ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا نانوتویؒ سے دریافت کیا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب تو مولود شریف کرتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں کرتے ہیں؟

مولوی عبدالسمیع رامپور منہاران ضلع سہارنپور کے تھے، شاعری میں غالب کے شاگرد تھے اور تعلیم مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی سے پائی تھی، انہوں نے رسم ورواج اور بدعات کی حمایت میں ایک کتاب ''انوار ساطعہ'' کے نام سے لکھی تھی جس کے جواب میں ''براہین قاطعہ'' لکھی گئی جس کے مصنف مشہور محدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ تھے مولوی صاحب موصوف کا عقیدہ وہی تھا جو علماء بدایوں اور بریلی کا تھا، حضرت نانوتویؒ نے سائل کے جواب میں فرمایا کہ:

''بھائی! مولوی عبدالسمیع صاحب کو سرور عالمؐ سے زیادہ محبت معلوم ہوتی ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے۔ یہ جواب مولوی عبدالسمیع صاحب کو پہنچا، تو انہوں نے خود حضرت سے کہا کہ ایسے سے بھلا کوئی کیا لڑے؟

حضرت تھانوی کی ایک روایت اور بھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب طبقہ مشائخ

میں سے تھے ان بدعات میں مبتلا تھے جن کے متعلق علماء دیو بند نے فتویٰ دے رکھا تھا۔ وہ حضرت نانوتویؒ کی تعریف سن کر ان سے ملاقات کے لئے آئے۔

''حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے نہایت عزت کے ساتھ ان کو مہمان بنایا اور سب طلبہ کو سمجھا دیا کہ خبردار کوئی گفتگو طریقے کے خلاف نہ کی جائے۔ کیونکہ مہمان کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔''

ایک مولوی فضل رسول بدایونی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادہ کے نیاز مندوں میں تھے۔ علماء دیو بند کے خلاف جتنی سب وشتم علماء بدایوں وبریلی کی طرف سے ہوری تھیں ۔اس سب وشتم کے معلم اول اور مورث اعلیٰ یہ مولوی فضل رسول بدایونی تھے، ظاہر ہے کہ علماء دیو بند کو ان سے بہت دوری رہی ہوگی۔ انہیں مولوی فضل رسول بدایونی کا ذکر کرتے ہوئے ایک بزرگ نے ان کو ''فصل رسول'' سے یاد کیا انہوں نے سمجھا کہ میں نے ایک اہم نکتہ کردیا کہ یہ فضل رسول نہیں، سنت رسول کے کاٹنے والے اور جدا کرنے والے ہیں وہ داد طلب نگاہوں سے حضرت نانوتویؒ کی جانب دیکھ رہے تھے، حضرت نانوتویؒ ان کی توقع کے برخلاف بیان کرنے والے سے دریافت کررہے ہیں کہ لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ لوگ ان کو فضل رسول کہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے برہمی کے انداز میں فرمایا۔ تب تم فصل رسول کیوں کہتے ہو؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

حضرت نانوتویؒ کی بلند نظری، اخلاقی بلندی، رواداری اور حسن اخلاق کی یہ چند مثالیں ہیں:

دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ

استغناء:

آپ ایک گونہ بے سروسامانی کی زندگی بسر کرتے تھے جب تک نانوتہ میں قیام رہا تو ذاتی مکان موجود تھا۔ بلکہ پوری ایک حویلی تھی اس میں رہائش رہی اور جب دارالعلوم کی

مصروفیات نے دیو بند کے قیام پر مجبور کیا تب آپ اہل وعیال کو لے کر دیو بند آ گئے خود چھتہ مسجد کی کوٹھری کو اپنے قیام کے لئے منتخب کرلیا البتہ اہلیہ محترمہ کا میکہ دیو بند تھا۔ آپ دیو بند کے معزز رئیس شیخ کرامت حسین کی صاحب زادی تھیں اور ان کی بڑی سی حویلی پورے دیو بند میں مشہور تھی جس کو دیوان کی ڈیوڑھی کہا جاتا تھا اس لئے وہ اپنے والد کی حویلی میں قیام پذیر ہوگئیں، دیو بند کے خدام، مخلصین، مریدین اور دوسرے جاں نثاروں نے مکان کی پیشکش کی مگر آپ نے کسی کو قبول نہیں فرمایا، ہر بار ہر پیشکش کو ٹھکراتے رہے۔ جیسے آپ مسافرانہ زندگی ہی کو پسند فرماتے تھے'' کن فی الدنیا کانک غریب اوعابر سبیل'' دنیا میں پردیسی یا مسافر کی طرح رہو، کچھ یہی حال حضرت نانوتویؒ کا تھا، جس مکان میں آپ کی اولاد واحفاد مقیم ہے اسی مکان کی پیشکش ایک بار ہوئی تھی مگر آپ نے لینے سے انکار فرمادیا تھا۔

حضرت نانوتویؒ کے ایک جاں نثار خادم خاص بلکہ عاشق زار حکیم مشتاق احمد دیو بندی تھے، وہ بڑے خوشحال اور مالدار تھے، آپ کیلئے یہ بڑے دکھ کی بات تھی کہ آپ کے شیخ ومخدوم کے پاس اتنا بھی گھر نہ ہو کہ جس میں آپ اور آپ کے اہل وعیال گذر بسر کرسکیں، تو انہوں نے حضرت نانوتویؒ کے مزاج کو سمجھ کر تجربہ اور مشاہدہ کے بعد ایک دوسرا طریقہ کار اختیار فرمایا تاکہ حضرت نانوتویؒ کے لئے انکار کی گنجائش نہ رہے۔

انہوں نے اس مکان کو خرید لیا اور حضرت نانوتویؒ کی اہلیہ محترمہ کو مکان ہبہ کردیا اور نامہ لکھ کر قبضہ ودخل دے دیا، اور اس کے بعد یہ ہبہ نامہ حضرت نانوتویؒ کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ راستہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ حضرت نانوتویؒ اپنی ملکیت میں مکان نام کی کوئی چیز رکھنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے اگر مکان کی خریداری یا ہبہ نامہ حضرت نانوتویؒ کے نام ہوتو پھر یہ خدشہ بلکہ یقین تھا کہ رد کردیا جاتا۔ اس لئے ملکیت کا تعلق حضرت نانوتویؒ سے رکھا ہی نہیں، اہلیہ محترمہ نے جب اپنا مکان حاصل کرلیا تو میکہ سے اٹھ کر بال بچوں کو لے کر

اس مکان میں آ گئیں جو آج خاندان قاسمی کی رہائش گاہ ہے، زندگی بھر آپ نے مکان کی تعمیر یا مرمت کے نام پر کبھی کچھ نہیں کیا۔ جب کہ بقول مولانا یعقوب نانوتویؒ اگر حضرت نانوتویؒ چاہتے تو: ”بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ چاہتے تو سونے کی دیواریں بنا لیتے مگر اپنے گھر میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہیں لگوایا“۔

خوداعتمادی:

خوداعتمادی بڑا قیمتی جوہر ہے جو گہرے علم، وسیع مطالعہ انتہائی ذکاوت وذہانت کے عناصر کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے اسی کو رسالت کی زبان میں فیض ترجمان میں فراست مومن کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله: مومن کی فراست سے بچ کے رہو کیوں کہ وہ نور خداوندی سے دیکھتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کی ذات میں یہ جوہر حد کمال تک تھا اور ہر موقع پر اس کی آب وتاب اور چمک ودمک ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ میرٹھ کے مطبع میں آپ کام کرتے تھے اسی دور میں لکھنؤ کے مشہور شیعہ مجتہد حامد حسین میرٹھ آئے، ان کی قابلیت اور طاقت لسانی کی دھوم تھی، ان کی کتاب ”استقصاء الافحام“ جو شیعی مسلک کی حمایت میں بڑی طاقتور کتاب کہی جاتی تھی۔ اس کے مصنف تھے ہر کس وناکس کو ان سے گفتگو کی ہمت نہیں تھی۔ حضرت نانوتویؒ اپنے میلے کچیلے کپڑے میں نواب صاحب کی کوٹھی پر پہونچ گئے جہاں مجتہد صاحب جلوہ افروز تھے۔ آپ تنہا تھے نواب کی کوٹھی پر ان کا کوئی شناسا بھی نہیں تھا وہ سیدھے مجتہد صاحب کے سامنے جا کر بیٹھ گئے اور بطور سائل فدک کے سلسلہ میں کچھ سوالات کئے وہ ایک ان پڑھ دیہاتی سمجھ کر لاپرواہی سے گفتگو فرماتے رہے اور جب آپ نے فرمایا کہ بقول آپ کے کہ فدک غنیمت میں ملی تھی تو ”غزوہ فدک“ کے نام سے تاریخوں میں کسی غزوہ کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ پھر ”فیئ“ کے متعلق سوال کیا تو انہوں

نے جواب میں کہا غنیمت کو کہتے ہیں تب حضرت نانوتویؒ نے قرآن کی آیت ”ماافاء اللہ علی رسولہ“ پڑھ دی اور جب اس کا جواب دیا تو ایک سوال اور جڑ دیا۔ مجتہد صاحب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، پیشانی عرق آلود ہوتی جا رہی تھی، وہ اپنے ہی جوابات کے جال میں کستے جا رہے تھے، اور حضرت نانوتویؒ کا منہ دیکھ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ دیہات کا آدمی خدا جانے کتنا علم رکھتا ہے۔ اب ان میں تاب ضبط نہیں رہی اور مزید رسوائی کے لئے تیار نہیں رہے، گفتگو درمیان ہی میں چھوڑ کر اندر چلے گئے اور اندر جا کر اطمینان کی سانس لی، حضرت نانوتویؒ واپس ہو گئے کسی نے بعد میں بتادیا کہ وہ حضرت نانوتویؒ تھے، حضرت نانوتویؒ نے اسی دن کسی سے مشورہ کئے بغیر مجتہد صاحب کو مناظر کا چیلنج کر دیا اور اسی شب میرٹھ سے رخصت ہو گئے، تحدیث بالنعمة کے طور پر اس واقعہ کی ایک دوست کو اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا:

”این ہیچمداں بہ برکت بزرگاں مفت گوئی سبقت ربود“

ترجمہ: یہ بے علم آدمی اپنی بکواس کی بدولت جیت گیا ڈ

مباحثہ شاہجہاں پور کے موقعہ پر اس جوہر آبدار کی چمک دمک بار بار نگاہوں کے سامنے آتی رہی، سامعین اور اہل علم حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ ایک پادری بڑے جوش وخروش اور بڑے طنطنے کے ساتھ حضرت عیسٰی کی الوہیت پر دلائل دے رہا تھا اور اسی جوش زبان آوری میں اس نے کہا کہ عیسٰی مسیح ذوالجہتین ہیں یعنی ان میں عبدیت کاملہ بھی ہے اور الوہیت کاملہ بھی، جیسے لوہا بھٹی میں جب تپایا جاتا ہے وہ سرخ انگارہ ہو کر آگ بن جاتا ہے اور ہر دیکھنے والا یہی کہتا ہے کہ وہ آگ ہے کوئی اس لوہے کو آگ سے الگ کوئی دوسری چیز نہیں سمجھتا۔

پادری اس مثال سے حضرت عیسٰی کی الوہیت ثابت کر رہا تھا، درمیان کلام ہی حضرت نانوتویؒ نے قطع کلام کرتے ہوئے للکارا پادریو! سن لو! دیکھو تمہارے پادری صاحب

تثلیث سے انکار کررہے ہیں یعنی اپنے مذہب کی بنیاد ڈھا رہے ہیں۔ کسی پادری کی سمجھ میں نہیں آیا وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت پر پادری خود دلیل دے رہا ہے۔ان کی الوہیت سے انکار کہاں سے آ گیا۔ یہ درحقیقت فراست مومن کا مظاہرہ تھا جو شرک کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو یہ روشنی کہاں سے نصیب ہوسکتی ہے۔غرضیکہ کسی پادری کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت سے انکار ہورہا ہے اور جب آپ نے اپنی باری پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تو آنکھیں کھل گئیں، آپ نے کہا:

''لوہا دیکھنے میں ظاہر پرستوں کو ہم رنگ آتش نظر آتا ہے محض پرتو آتش سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے یہ حقیقت میں اس وقت بھی لوہا ہی رہتا، آگ نہیں بن جاتا کیونکہ جب لوہے کو آگ سے نکالو، وہ اپنے رنگ میں آجاتا ہے۔

آپ نے انہیں کی مثال انہیں پر پلٹ دی، جس سے وہ عیسیٰ کی الوہیت ثابت کررہے تھے۔اس مثال سے آپ نے حضرت عیسیٰ کی عبدیت ثابت فرمادی۔اسی کا نام فراست مومن ہے۔

جب آپ دیانند سرسوتی کے تعاقب میں رڑکی تشریف لے گئے تو وہ فوجی ایریا میں قیام پذیر تھے ان کے قیام گاہ تک رسائی میں دشواریاں تھیں، اتفاق سے ایک فوجی افسر نے آپ کی تشریف آوری کا حال سن کر آپ سے ملاقات کرنی چاہی، اس نے آپ کو لینے کے لئے ایک آدمی اور گاڑی بھیج دی، یہ وہ دور ہے جب انگریز ہندوستانیوں کی نگاہ میں ایک خوانخوار درندہ سے کم ہیبت نہیں رکھتا تھا، آپ بلا تکلف اس فوجی افسر کے بنگلے پر تشریف لے گئے، دوران گفتگو پنڈت جی کا ذکر آیا، کرنل نے کہا میں ابھی بلاتا ہوں۔ پنڈت جی جب آئے تو حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ آپ کے جتنے اعتراضات ہیں پیش کیجئے میں جواب دوں گا جب آپ مجمع عام میں مباحثہ نہیں کرسکتے تو یہیں سہی، حضرت نانوتویؒ کو پنڈت جی کے اعتراضات کی خبر نہیں تھی، البتہ اتنا ضرور علم تھا کہ ان کے سارے

اعتراضات بالکل نئے ہیں ان کے دماغ کے پیدا کردہ ہیں اور آج تک کسی نے اسلام پر یہ اعتراضات نہیں کئے تھے نہ علماء سلف کو اس طرح کے الزامات واتہامات کے جواب دینے کی ضرورت پیش آئی تھی اس لئے کتابوں میں پنڈت جی کے سوالات کا جواب تلاش کرنا فضول تھا اس کے باوجود بلا جھجک حضرت نانوتویؒ نے ان کو اعتراض کرنے کا موقع دے دیا اور آپ نے فرمایا، آپ اعتراضات کریں میں جواب دیتا جاؤں گا۔ یہ جرات وہی کرسکتا ہے جس میں خود اعتمادی کا جوہر کامل موجود ہو کیونکہ تشفی بخش جواب نہ ہونے کی صورت میں اسلام کی رسوائی تھی، اس لئے یہ چیلنج جرات ایمانی کا حیرتناک مظاہرہ تھا مگر حضرت نانوتویؒ کے سامنے سے کوئی بھی اسلام دشمن سرخ رو ہوکر نہ جاسکا تو پنڈت جی دیانند سرسوتی کی کیا حیثیت تھی، انہوں نے معذرت کردی کہ میں سوال وجواب کے لئے تیار نہیں ہوں۔اوراس طرح ان کے غبارہ کی ہوا نکل گئی۔

بصیرت اور دوراندیشی:

کسی پودے کو سرسبز وشاداب اور ہرا بھرا رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑوں کو حسب ضرورت پانی دیا جاتا رہے ورنہ کچھ دنوں کے بعد وہ پودا مرجھا جائے گا اس کی نشوونما رک جائے گی، اس کی سرسبزی وشادابی اس سے رخصت ہوجائے گی، یہی اصول فطرت ہے، نظام قدرت انہیں اصولوں پر قائم ہے۔

نخل اسلام کی سرسبزی وشادابی کے لئے دینی مدارس سرچشمہ کی حیثیت رکھتے ہیں یہیں اس کو تازگی اور شادابی کے لئے تازہ پانی ملتا رہتا ہے انہیں مدارس سے اسلام کے ترجمان پیدا ہوتے تھے، اسلامی علوم وفنون اور حقائق ومعارف کے ماہرین اور واقف کار نکلتے تھے جو اسلامی زندگی کے ہر ہر گوشے پر نظر رکھتے تھے اور اسلامی معاشرہ کو اس کی خصوصیات وامتیازات کے ساتھ باقی رکھنے کے لئے بھرپور جدوجہد کرتے رہتے تھے اس

لئے اس ملک میں مسلمانوں نے اقلیت میں رہتے ہوئے بھی اپنی خصوصیات اور امتیازات کو باقی رکھا تھا اور اتنی بڑی غیر مسلم آبادی میں صرف اپنی انفرادیت اور اپنا امتیاز ہی باقی نہیں رکھا بلکہ اپنے معاشرہ کی لطافت و پاکیزگی، اس کی عظمت و برتری کو بھی برقرار رکھا تھا۔ یہ سب کچھ دینی مدارس کی برکت سے تھا۔

غدر 1857 کے بعد وہ شیرازہ ٹوٹ گیا، وہ سرچشمہ ہی بند ہو گیا جس سے نخل اسلام میں سرسبزی و شادابی آتی تھی۔ جاگیردار تباہ ہو گئے، ریاستیں دم توڑ گئیں، مسلمان رئیسوں کے محلات زمیں بوس ہو گئے زندگی کا سکون عنقا ہو گیا۔ وہ مدارس کی سرپرستی کیا کرتے اسی زمانہ میں چند لوگوں نے ایک گم نام بستی دیوبند میں ایک چھوٹے سے دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تو حضرت نانوتویؒ اس مشورہ میں برابر کے شریک تھے اور جب باقاعدہ مدرسہ کھل گیا تو آپ کی دلچسپیاں اس کی طرف اور بڑھیں، زندگی کے اخیر سالوں میں دیوبند میں مستقل قیام اختیار کر لیا تاکہ اس ننھے پودے کو سینچ کر ایک تناور درخت کی شکل میں بنا دیں، دس، پندرہ سال تک اس کو خونِ جگر سے سینچتے رہے، اس نئے طلوع ہونے والے ستارہ کی ہلکی کرنیں اب دور تک پہونچنے لگیں، تب آپ نے اس ننھے منے ستارے کی ہلکی روشنی کو سورج کی تیز شعاعوں میں تبدیل کرنے کا عزم بالجزم کیا، تاکہ اس کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیل جائے، ستاروں کی روشنی، گھٹا ٹوپ اندھیروں کے لئے کافی نہیں ہوگی، ارباب عزیمت نے دین کی راہ میں ناممکن کو ناممکن سمجھ کر ادنی پر کبھی قناعت نہیں کہ بلکہ بلند ترین مرتبہ پانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

مغاں کہ دانہ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

حضرت نانوتویؒ نے ستاروں کو پیس کر کے اس کے خمیر سے آفتاب سازی کا آغاز کر دیا، مدرسہ ایک چھوٹی سی مسجد کی بوسیدہ کوٹھریوں میں تھا پھر اس کو ایک بڑی مسجد میں

منتقل کیا گیا، لیکن مسجد تو مسجد ہے اس کی خصوصیات اپنی جگہ ہیں اس کو نئے دور کی یونیورسٹی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ آج یہ چھوٹا سا مدرسہ جو صرف ''عربی مدرسہ'' کہا جاتا ہے، مستقبل کے لمبے سفر کے لئے اس کے پاس بہت معمولی زادِ سفر ہے جب تک یہ مدرسہ عربی ایک یونیورسٹی اور مرکز العلوم نہیں بن جاتا تب تک ہندوستان میں اسلام کے تحفظ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

آپ نے قصبہ کے باہر ایک کشادہ زمین خریدی تاکہ مستقبل کی اسلامی یونیورسٹی کا اس میں سنگ بنیاد رکھا جائے۔ حاجی عابد حسینؒ اپنے تمام تقویٰ و طہارت، تقدس اور بزرگی کے باوجود ایک دینی مکتب سے زیادہ وہ نہیں سوچتے نہ سوچ سکتے تھے۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس لئے وہ اس منصوبے کے سخت ترین مخالف تھے لیکن حضرت نانوتویؒ نے اس مخالفت سے صرف نظر فرما لیا کیونکہ مستقبل کو حال کی طرح روشنی میں دیکھ لینا حضرت نانوتویؒ کی بصیرت کا کام تھا، حاجی عابد حسین صاحبؒ کے طاہر فکر کی پرواز ایک محدود فضا میں تھی جبکہ ان دس سالوں میں حضرت حاجی صاحبؒ مدرسہ کے نظم و نسق کے ذمہ دار رہے۔

☆☆

اخلاق واعادات، اوصاف وکمالات

● مولانا اسیر ادروی

مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے حالات میں ایک مختصر سی کتاب ’’کمالات رحمانیہ‘‘ ہے اس کے مرتب حافظ تجمل حسین صاحب ہیں جو شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے مریدوں میں سے تھے اور ان کی خدمت میں عرصہ تک رہے تھے ان کا بیان ہے کہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے ایک بار فرمایا کہ:

’’حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب کو نوجوانی ہی میں ولایت مل گئی تھی‘‘۔

جولوگ حضرت نانوتویؒ کے اس دور کے حالات سے واقف ہیں جب آپ دہلی میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور پھر 17 سال کی عمر میں فارغ ہوئے اس کے بعد بھی آپ دہلی میں رہے اسی نوجوانی کی عمر میں جو جذب وکیفیت، اوراد وظائف میں شوریدگی کے حالات سے واقف ہوں گے وہ سلوک ومعرفت کی راہوں میں ان پر جو کیفیات وحالات گذرے ہیں اس کی ایک جھلک آپ کو مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی مرتب کردہ مختصر سوانح عمری میں بھی مل سکتی ہے، وہ حضرت نانوتویؒ کے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھے اور دہلی میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے ان کا جو بھی بیان ہے وہ سب چشم دید حالات پر مشتمل ہے۔

ان کے بیان سے حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ شاید یہ اسی کمال ولایت کا نتیجہ تھا کہ آپ ابناء زمانہ سے بالکل مختلف طور، طریق پر کاربند تھے، نمود ونمائش اور اظہار نفس وکمال سے سخت نفرت تھی، آپ وضع قطع، نشست

وبرخاست، خوراک وپوشاک ہر چیز میں وہی انداز رکھتے تھے جو بہت سی معمولی لوگوں کے یہاں ہوا کرتا تھا، تواضع، انکساری، سادہ مزاجی اور سادہ طبعی کا عالم یہ تھا کہ کوئی شخص آپ کو دیکھ کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ ہیں۔ کچھ اس طرح آپ نے خود کو دنیا کی نگاہوں میں مٹا رکھا تھا۔ لیکن جب دین کا تقاضا ہوتا تھا تو آپ کے فضل وکمال پر جتنے حجابات پڑے رہتے تھے وہ یک بیک اٹھ جاتے تھے اور ظاہر بین نگاہیں بھی اس جوہر قابل کی آب وتاب، چمک ودمک اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والی جلوہ آرائیوں کو دیکھ لیتی تھیں اور حیرت زدہ رہ جاتی تھیں، احساس فضل وکمال اور ہمہ دانی کے غرور سے تنی ہوئی گردنیں بھی آپ کے سامنے خم ہوجاتی تھیں۔ اس کتاب میں بھی آپ نے کئی مقامات پر اس کی جھلک دیکھی ہوگی۔

سادگی:

حضرت نانوتویؒ کی سادگی، معمولی وضع قطع مشہور تھی، بہت ہی معمولی لباس استعمال فرماتے، موٹے کپڑے کا کرتا اور نیلی لنگی، کرتے میں بٹن کبھی نہیں لگواتے تھے، چادر، عمامہ، رومال اور علماء کے مروجہ لباس آپ نے کبھی استعمال نہیں کئے۔ ایک دو جوڑے سے زیادہ کپڑے پاس نہیں رکھتے تھے، اگر فوری طور پر کوئی سفر پیش آگیا تو جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں انہیں کپڑوں میں سفر میں چلے جاتے، صرف ایک نیلی لنگی آپ کے کندھوں پر زائد پڑی رہتی تھی، اگر کپڑے میلے ہوگئے تو لنگی باندھ لی اور کپڑے اتار کر دھوڈالے اور خشک کرکے پہن لئے آپ نے پوری زندگی اسی طرح سے بے سروسامانی میں گذاری، علماء کی وضع قطع، رکھ رکھاؤ سے آپ اپنی ذات کی حد تک بالکل الگ تھلگ تھے۔

آپ کے لباس اور سادگی پسندی کی وجہ سے کبھی کبھی دلچسپ حادثے بھی آپ کو پیش آجاتے تھے۔ آپ اسٹیشن سے اتر کر نانوتہ جارہے تھے، بغیر بٹن کا گاڑھے کا کرتا اور نیلی

لنگی زیب تن تھی، ایک بنکر راستہ میں ملا، اس نے اپنے حلقہ اور برادری کا آدمی سمجھ کر آپ سے پوچھا کہ آج بازار میں سوت کا کیا بھاؤ تھا؟ اس نے سمجھا کہ یہ مال بیچ کر بازار سے واپس آرہے ہیں، آپ نے اس بنکر سے بڑی بشاشت سے فرمایا، بھائی میرا بازار نہیں ہوا، اس لئے مجھے سوت کا بھاؤ معلوم نہیں۔

یہ سادگی آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، آپ خود جانتے تھے کہ آج کے دور میں علماء کس طرح رہتے ہیں، ان کا لباس اور ان کی وضع قطع کیا ہوتی ہے؟ لیکن بالقصد آپ وہ لباس اور وضع قطع اختیار فرماتے تھے۔ چنانچہ خود ہی اپنے ایک خط میں وہ واقعہ لکھا ہے جو میرٹھ میں ایک نواب صاحب کی کوٹھی پر شیعہ مجتہد سے سوال وجواب کرنے کے لئے تشریف لیجانے کے وقت پیش آیا تھا آپ نے لکھا تھا کہ:

''ایک دن بے عمامہ، رومال اور چادر کے جو میری عادت ہے مولوی حامد حسین لکھنوی کی قیام گاہ پر پہنچ گیا''۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نانوتویؒ کے بارے میں اپنے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

آپ کے حجرہ میں کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا چٹائی بھی ایک تھی وہ ٹوٹی ہوئی گویا عمر بھر کے لئے اسی چٹائی کو منتخب کرلیا تھا، نہ کوئی صندوق تھا، نہ کپڑوں کی گٹھری بندھی تھی''۔

حضرت نانوتویؒ کے ایک سفر کے حالات بتاتے ہوئے حضرت شیخ الہندیؒ نے یہ بھی بتایا کہ:

''سفر کے لئے کوئی اہتمام نہیں تھا اگر کبھی ایک آدھ کپڑا ہوا تو کسی کے پاس رکھوا دیا اور اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا جو حضر میں پہنے ہوئے تھے البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی جب کپڑے زیادہ میلے ہوگئے تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار لیتے اور خود ہی دھو لیتے۔''

لباس کے سلسلے میں کچھ مزید تفصیلات بہم پہنچائی ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں: ''بغیر کرتے

کے بندوں دارا چکن یا انگرکھا اور پاجامہ، سردی ہوتی تو مختصر سا عمامہ ورنہ عموماً کنٹوپ تمام سردی میں سر پر رہتا تھا۔''

مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہویؒ حضرت نانوتویؒ کے خاص شاگرد ہیں، آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ میرٹھ میں حضرت نانوتوی سے حدیث پڑھی تھی۔ آپ بھی شاہجہاں پورے کے میلہ خداشناسی میں حضرت نانوتویؒ کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے اور پورے سفر میں ساتھ رہے، انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا جس کو عصر حاضر کے علماء ومشائخ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے وہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ دنیائے علم پر حکمرانی کرنے والے کا یہ انداز بھی ہوسکتا ہے، مولانا احمد حسنؒ محدث امروہوی فرماتے ہیں:

''شاہجہاں پور سے اس گاؤں تک جہاں میلہ خداشناسی تھا، جاتے ہوئے راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی، حضرت نانوتویؒ پیدل تھے اور چند رفقاء آپ کے ساتھ تھے، پاجامہ پہنے ہوئے ندی میں اتر گئے جس سے پاجامہ بھیگ گیا، ندی پار کرنے کے بعد لنگی باندھی اور پاجامہ اتار کر نچوڑا اور پیچھے لاٹھی پر ڈال کر جیسے گاؤں کے رہنے والے ڈال لیا کرتے ہیں، تشریف لے چلے''۔

آپ کا معمول تھا کہ سفر میں آگے نہیں چلتے تھے برابر سب کے ساتھ ملے ہوئے چلتے تھے، اتنا سادہ انداز اور معمولی لباس ہوتا تھا کہ باہر سے کوئی بھی آنے والا حضرت نانوتویؒ کی مجلس میں آتا تو نہ پہچاننے کی وجہ سے دوسروں سے مصافحہ کرتا تھا، آپ سے بھی مصافحہ کرلیتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا ہی نہیں تھا کہ یہی حضرت نانوتویؒ ہیں، چھتری کبھی استعمال نہیں کی، ہمیشہ پیدل سفر کرتے تھے اور طویل سے طویل سفر پیادہ پا طے کرنے کی عادی تھے۔

حضرت نانوتویؒ کے سوانح نگار مولانا یعقوب نانوتویؒ اپنی مختصر کتاب میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اس کمال پر ضبط عنایت فرمایا کہ کبھی کوئی کلمہ خودستائی کا کسی طرح، کوئی صورت رعونت یا خود بینی کی خلوت وجلوت، تنہائی مجمع اپنے بیگانوں میں

کبھی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔''

انہوں نے ہی ایک اور جگہ خود نانوتویؒ کا یہ قول نقل کیا ہے وہ فرماتے تھے کہ: ''یہ دوحرف جاننے کی تہمت لگی ہوئی نہ ہوتی تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا کہ دنیا یہ بھی جانتی کہ قاسم نامی آدمی کوئی پیدا ہوا تھا۔''

تواضع اور انکساری:

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت نانوتویؒ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ کے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کا کام کرتے تھے انہیں دنوں کا یہ واقعہ آپ کے ایک رفیق خاص نے لکھا ہے:

''جن دنوں دہلی میں مولانا احمد علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام حضرت والا انجام دیتے تھے اس زمانہ یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولانا قاسم کہہ کر پکارتے تو آپ بولتے نہیں، کوئی نام لے کر پکارتا تو خوش ہوتے۔''

آپ تعظیم سے بہت گھبراتے تھے، بے تکلف ہر شخص سے رہتے تھے، دیوبند کے ایک بہت ہی غریب آدمی نے آپ کی دعوت کردی، اتفاق سے شام ہی سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تو ختم ہی ہونا نہیں چاہتی تھی، اس غریب نے یہ سمجھا کہ ایسی حالت میں حضرت نانوتویؒ کیا تشریف لائیں گے اس نے کوئی اہتمام نہیں کیا اور بارش کی وجہ سے بلانے کے لئے بھی نہیں گیا، جب دیر ہوگئی تو حضرت نانوتویؒ نے کمبل لیا اور سر پر رکھ کر بدن پر لپیٹ لیا اور جوتے ہاتھ میں لے لئے بارش موسلا دھار ہورہی تھی، گلیوں میں پانی کا ریلا تھا مگر اسی میں آپ اس غریب کے گھر پہونچے، زنجیر کھٹکھٹائی، وہ نکلا اور حضرت نانوتویؒ کو دیکھا تو اسکے ہوش اڑ گئے، حضرت نانوتویؒ نے صورتحال کی نزاکت کو محسوس فرمالیا اور فرمایا گھبرانے کی کیا بات ہے نہ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے، گھر میں کچھ نہ کچھ بچا ہی ہوگا وہی

لاؤ ڈرتا ڈرتا ماش کی کالی دال اور ماش کی روٹی لایا۔ حضرت نانوتویؒ نے اس ذوق وشوق سے کھایا، جیسے بریانی اور قورمہ کھارہے ہیں، غریب کی تسلی وتشفی بھی کرتے جارہے ہیں۔ دعائیں بھی دیئے جارہے ہیں، پھر اسی بارش میں آپ واپس بھی آگئے۔ ثقیل غذا کھانے اور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے کئی دن آپ بیمار رہے، لیکن اپنی تکلیف کسی سے نہیں بتائی کہ ہوسکتا ہے کہ شدہ شدہ یہ خبر اس غریب کو پہنچے گی تو بے چارہ شرمندہ ہوگا۔

حضرت نانوتویؒ کی تواضع اور خاکساری کا کیا عالم تھا؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، دنیا جانتی ہے، ہزاروں لاکھوں انسانوں کا مشاہدہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی تقریروں میں جو معارف وحقائق، توحید ورسالت کے جو دلائل، مشاہداتی، عقلی وتجرباتی حقائق کا جو سیل رواں تھا، اس دور میں ضرب المثل تھا۔ جب حضرت نانوتویؒ کی تقریر کا کہیں اعلان ہوجاتا تو لوگوں کا گھروں میں رہنا دشوار ہوجاتا، دل انہیں مجبور کرکے جلسہ گاہ تک لے جاتا تھا۔ رام پور ریاست میں ایک بار جب آپ تشریف لے گئے اور تقریر کا اعلان ہوا تو بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ پورا شہر امنڈ آیا، سوائے عورتوں اور بچوں کے گھروں میں کوئی نہیں رہا، پادریوں کے خلاف جو تقریر فرمائی جو دلائل وبراہین رڑکی میں آریہ سماج کے خلاف اور اسلام کی حقانیت پر آپ کی جو تقریریں ہوئیں وہ الہامی تقریر کہی جاسکتی ہیں لیکن خود حضرت نانوتویؒ اپنے بارے میں کہتے ہیں، یہی سننے کی بات ہے۔ حضرت تھانویؒ کا بیان ہے کہ:

''حضرت مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے، ایک محقق کا اور ایک بے حیاء کا اور اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں اسلئے وعظ کہہ لیتا ہوں''۔

آپ کے ایک عقیدت مند نے آپ کی خدمت میں شیعوں کے کچھ اعتراضات لکھ کر بھیجے اور ان اعتراضات کے جواب کی درخواست کی تھی اس ارادت مند کے جواب میں

آپ نے تحریر فرمایا:

''افسوس ہے کہ آپ نے کتابوں کے حوالے، صفحہ، جلد، فصل اور باب کا نشان نہ لکھا، یہ مضامین آپ نے کسی اور سے لکھوائے ہوں گے جہاں اتنا لکھوایا تھا اور لکھوا دینا چاہیے، آپ جانتے ہیں کہ میں خود ذی علم نہیں ہوں۔''

اسی طرح ایک اور ارادت کیش نصر اللہ خان صاحب تھے، انہوں نے یزید کے کفر و ایمان کے سلسلہ میں کچھ سوالات آپ کو لکھے تھے اس خط کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

''آپ کا عنایت نامہ پہنچا، یہ عنایت میرے سر پر، مگر میں حیران ہوں کہ میں نہ ایسا عالم، نہ ایسا محقق، مجھ کو آپ نے اس کام کے لئے کیوں تجویز کیا، مجھ کو تو کبھی فتوی لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، نہ میرے پاس اس کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین ومتاخرین کی بیاضیں جو میں اس کام کو سنبھالوں۔''

مہمان نوازی:

جب کسی شخصیت کو مرجعیت حاصل ہوتی ہے تو مہمانوں کی کثرت ہوتی ہے، اکرام ضیف اور مہمان نوازی، محاسن اخلاق میں ایک بلند درجہ رکھتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے یہاں بھی مہمانوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی تھی حالانکہ آپ نے جتنی ملازمتیں کیں ان میں تنخواہیں بہت محدود تھیں بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی تنگی ترشی سے بسر ہوتی آئی لیکن یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ آپ خاندانی جاگیردار تھے اگرچہ سارا علاقہ خاندانی قبضہ سے نکل گیا تھا لیکن آپ کے والد شیخ اسد علی صاحب کی محنت اور جفاکشی کی وجہ سے خود کاشت کی زمینیں اتنی تھیں کہ اس کی پیداوار سال بھر کیلئے کافی ہوتی تھی بلکہ سال کے اختتام پر جب نیا غلہ آنے لگتا تو پچھلے سال کا بچا ہوا غلہ آپ معاشی اعتبار سے کمزور، اپنے عزیزوں

و اقارب میں تقسیم کرا دیتے تھے، پھر جب آپ کی ذات مرجعیت اختیار کر گئی اور عام رجحان آپ کی جانب بڑھا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کا دسترخوان اور بھی وسیع ہوتا چلا گیا، مہمان پہلے بھی آتے تھے بعد میں تو ان کی کثرت ہوگئی جس دن مہمان نہ ہوتے آپ انتظار میں کھانا تک نہیں کھاتے تھے۔

مولانا یعقوب نانوتویؒ نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مہمان نوازی مولوی صاحب پر ختم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہمان بہ کثرت آتے اور ہر طبقہ کے آتے اور ان کی حسب حیثیت خاطر و مدارات حضرت نانوتویؒ فرماتے تھے انہیں کا بیان ہے:

''مہمان آپ کے یہاں دور نزدیک سے امیر، غریب سب ہی قسم کے اکثر ہوتے تھے، جوق در جوق لوگ ہر طرف سے آتے تھے مگر اس کثرت پر کبھی تنگ دل نہ ہوتے اور کشادہ پیشانی سے مہمانوں کی مدارات کرتے جس دن مہمان زیادہ ہوتے اس دن بہت خوشی ہوتی، جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا اس دن انتظار فرماتے۔''

آپ ہمیشہ مہمانوں کے ساتھ کھانا کھاتے، کبھی گھر میں تنہا نہیں کھاتے تھے، دیوبند اور نانوتہ ہر جگہ مہمانوں کا سلسلہ رہتا، نانوتہ مسجد کی سہ دری میں حضرت نانوتویؒ کا قیام زیادہ رہتا تھا اور وہاں مہمانوں کے لئے جگہ تنگ ہو جاتی تو اپنے ماموں کے مکان میں مہمانوں کو اتارتے تھے جو آپ کے مکان کے قریب ہی تھا۔

خود حضرت نانوتویؒ سادگی پسند تھے جس طرح لباس میں سادگی اختیار کرتے تھے اسی طرح کھانے کے معاملہ میں اس سے بھی کچھ زیادہ سادگی پسند تھے، دہلی قیام کے زمانہ میں جب مولانا یعقوب صاحبؒ کے مکان پر رہتے تھے اور وہ ملازمت پر اجمیر چلے گئے تو حضرت نانوتویؒ ایک وقت روٹی پکوا لیتے اور کئی کئی وقتوں تک اسی باسی سوکھی کو بغیر سالن کے چبا کر رہ جاتے تھے، غذا بھی بہت ہی مختصر تھی۔ اس لئے کبھی اپنے کھانے کا اہتمام نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن یہ سادہ طبعی صرف اپنی ذات تک کے لئے تھی۔

مہمانوں کے لئے فراخ دلی اور دریا دلی میں بدل جاتی تھی۔ آپ کی سوانح میں ملتا ہے کہ:

''اپنے نفس کے لئے کبھی تکلف نہ ہوتا مگر مہمانوں کے واسطے بہت تکلف کا کھانا تیار ہوتا تھا۔''

تکلف سے بنے ہوئے کھانے کو بھی اپنے مہمانوں کی حیثیت سے کمتر سمجھتے اور کہتے تھے جیسے دل میں اس سے بہتر کھانا پیش کرنے کا جذبہ تھا۔ بالعموم مہمانوں کے لئے دسترخوان پر ''پلاؤ'' ضرور ہوتا مگر حضرت نانوتویؒ مہمانوں سے فرماتے: ''ہم نے تمہارے لئے ''چاول'' پکانے میں تکلف نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے گھر آمدنی اراضی کے یہی چاول ہوتے ہیں۔''

پلاؤ کے علاوہ اور دوسرے تکلف کے کھانے بھی ہوتے تھے ایک بار دسترخوان پر کھچڑی کے ساتھ بہت سا گھی آیا، دس پندرہ مہمان تھے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اتنا گھی؟ یہ فضول ہے اس میں سے آدھا رکھ لیا اور آدھا گھر میں واپس کر دیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مہمان کے سامنے ہر چیز بڑی فراوانی سے پیش کی جاتی تھی تا کہ مہمان کھانے میں تکلف نہ کرے۔

مہمانوں کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا کسی بھی وقت مہمان آسکتے تھے۔ جب مہمان آتے تو حضرت نانوتویؒ سب سے پہلے یہ دریافت فرماتے کہ کھانا آپ نے کھایا ہے؟ جواب ملنے کے بعد اندر اطلاع بھیج دی جاتی اور کھانا حاضر ہوجاتا، آپ کی دریا دلی نے شہرت اختیار کرلی تھی۔ ایک بار حضرت نانوتویؒ کے سامنے کچھ اکابر میں یہ بات چلی تو حضرت نانوتوی نے اپنے صاحب زادے کا نام لے کر فرمایا کہ:

''یہ ساری فیاضی احمد کی والدہ کی وجہ سے ہے''۔

اکرام ضیف:

حضرت نانوتویؒ کے آخری دور میں مہمانوں کی آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی اور شاید ہی

کوئی دن ناغہ ہوتا جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا تو آپ بہت افسردہ ہوتے۔ حضرت نانوتویؒ کے ایک جاں نثار مرید وخادم حاجی محمد یٰسین صاحب جو دیوان جی کہے جاتے تھے وہی گھر کے سارے نظم کے ذمہ دار تھے۔ لیکن آپ ہر مہمان پر خود بھی نظر رکھتے تھے، انہیں دیوان جی کا بیان ہے۔ ''ایک دن چند مہمانوں کو کھانے کے واسطے ہاتھ دھلانے اٹھے ایک صاحب نے ان مہمانوں کے ہاتھ دھلا دیئے۔ مگر ایک بڈھا مسکین شکستہ حال رہ گیا کسی نے ان کے ہاتھ نہیں دھلائے۔ حضرت نانوتویؒ کی نگاہ پڑ گئی کہ اس بڈھے کو غریب مسکین سمجھ کر اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ بڈھا از خود بڑھا کر لوٹا اٹھا کر ہاتھ دھولے۔ حضرت نانوتویؒ لپک کر آئے اور اس سے پہلے خود ہی لوٹا اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے لوٹا پکڑ کر نہایت ادب کے ساتھ اس کے ہاتھ دھلائے۔'' قیام دہلی کے زمانہ میں حضرت نانوتویؒ کے یہاں کوئی گاؤں کا آدمی مہمان ہوا وہ کھانا کھا کر سو رہا، رات میں اس کو نفخ ہوا اور سخت تکلیف ہوئی۔ حضرت نانوتویؒ اس کی بے چینیوں کو بھانپ گئے۔ اسی وقت دبے پاؤں جا کر چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس غریب دیہاتی کے پاس لائے اور فرمایا آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ میں حقہ پیتا ہوں۔ حالانکہ حضرت نانوتویؒ کو جن چیزوں سے سخت نفرت تھی انہیں چیزوں میں حقہ بھی تھا لیکن اس کراہت کے باجود مہمان کے لئے یہ زحمت بخوشی گوارہ فرمائی۔

امر بالمعروف میں شدت:

غریب مسکین سائل دروازوں پر جاتے ہیں تو رئیس گھرانوں میں اکثر ان کو جھڑکیاں ملتی ہیں اور ان کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایک بار حضرت نانوتویؒ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر تشریف لے گئے۔ آپ کے مرید سید رحیم الدین صاحب گلاؤٹھی کی روایت ہے کہ:

''حضرت نانوتویؒ سید مہربان علی گلاؤٹھی کے نیک، دیندار رئیس کبیر تھے ان کے

یہاں آپ کا قیام ہوا، رات میں حضرت نانوتویؒ کا وعظ ہونے والا تھا، عصر کے قریب کوٹھی پر ایک سائل آیا، ملازمین کے منع کرنے کے باوجود حسب معمول صدا لگاتا رہا غصہ میں کسی ملازم نے سائل کو جھڑکا، اور ایک تھپڑ بھی جڑ دیا، سائل روتا ہوا واپس چلا گیا، کسی طرح یہ خبر حضرت نانوتویؒ کے کانوں تک پہنچ گئی آپ نے ملازم کو غصہ میں ڈانٹا اور پوچھا کہ تم نے اس غریب کو کیوں مارا؟ تم بھی دنیا میں ہمیشہ نہیں رہو گے اور یہ کہہ کر اپنی نشستگاہ کے جانے کے بجائے جنگل کی طرف چل دیئے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

☆☆

اعلیٰ اخلاق کا نام اسلام ہے

● مولانا ابونصر فاروق

ایک آدمی بہت مذہبی بن جاتا ہے۔ خوب عبادت کرنے لگتا ہے۔ ورود و وظائف میں مشغول ہو جاتا ہے یا خوب نمازیں پڑھنے لگتا ہے۔ دین اسلام کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ لوگ اس کو متقی اور پرہیزگار سمجھنے اور کہنے لگتے ہیں۔ ان سب باتوں کا دوسرے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ کسی کے مذہبی یا نمازی بن جانے سے دنیا کو کیا لینا دینا۔ یہ ایک انسان کا اپنا ذاتی عمل ہے۔ اگر یہ عمل درست ہے تو اس کا اجر اور انعام اس شخص کو ملے گا۔ اس کے اہل خاندان، پڑوسی، سماج اور دنیا کو اس سے کیا فائدہ ہوگا جو لوگ اس کی قدر کریں اور اس کا احسان مانیں؟ ایسے لوگ جو نمازیں پڑھنے لگتے ہیں، داڑھی بھی رکھ لیتے ہیں اور ٹوپی بھی پہننے لگتے ہیں اور دین وایمان کی باتیں بھی کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ جھوٹ بھی بولتے ہیں، وعدہ خلافی بھی کرتے ہیں، دوسروں کا حق بھی مار لیتے ہیں، بے ایمانی بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی روش سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ ایسے ہی نمازیوں کو دیکھ کر بے نمازی کہتے ہیں کہ اس نمازی سے تو ہم بے نمازی اچھے جو دوسروں کا نقصان تو نہیں کرتے۔ دوسروں کو تکلیف تو نہیں پہنچاتے۔

دراصل اس وقت دین و مذہب کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ ناقص، ادھورا اور ٹیڑھا میڑھا ہے۔ اسی لئے مذہبی لوگ عام انسانوں کی نظر میں اپنی قدر و منزلت نہیں پیدا کر پا رہے ہیں۔ دنیا والے سمجھتے ہیں کہ مذہبی ہونا ایک بےکار سی بات ہے۔ اس وقت دنیا کے جو مذہب ہیں وہ آدمی کو انسان بنانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ ان ہی کی صف میں اسلام کو

بھی کھڑا کر دیا گیا ہے۔اسلام اور غیر اسلام میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کا نام لینے والوں نے ادھورے اور نامکمل اسلام کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے اور ادھورے اسلام کو پھیلا رہے ہیں اسی لئے اسلام میں عام لوگوں کے لئے کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔کمزوری اسلام میں نہیں ہے بلکہ خرابی ان مسلمانوں میں ہے جنہوں نے پورے اسلام کو اپنایا ہی نہیں ہے۔ وہ اسلام کے صرف اس پہلو کو لے کر چل رہے ہیں جس میں ان کی دنیا کا کوئی نقصان نہیں دکھائی دیتا ہے۔

اسلام ایثار وقربانی چاہتا ہے۔ یہ بھلائی اور خیر خواہی کا دین ہے۔محبت اور ہمدردی کے جذبات سے اس کی خمیر پیدا ہوتی ہے۔خدمت اور غمگساری سے اس میں چمک آتی ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں سے اعلیٰ مثالی کردار کا مطالبہ کرتا ہے۔ان کے اندر بلند اخلاق صفات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ایمان کا دعویٰ کرنے والے اور دم بھرنے والے شاید نہیں جانتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:''کامل ایمان والے وہ مومنین ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔''اس فرمان رسول سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ایک یہ کہ جس کا اخلاق خراب ہے اس کا ایمان بھی ناقص ہے۔دوسرے یہ کہ جس کو اپنے ایمان کی فکر ہوگی وہ سب سے زیادہ اپنے اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کرے گا۔اعلیٰ اخلاق میں سب سے پہلا نمبر زبان کا ہے۔اعلیٰ اخلاق والا مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔غیبت اور چغل خوری نہیں کرے گا۔کسی کو گالی نہیں دے گا۔ کسی کی عیب چینی نہیں کرے گا۔ اپنی زبان سے کسی کی دل آزاری نہیں کرے گا۔کسی پر تہمت نہیں لگائے گا۔کسی کا عیب معلوم ہو جائے تو اس کا چرچا نہیں کرے گا۔زبان سے جب کہے گا تو اچھی بات ہی کہے گا۔

اس کے بعد دوسرا نمبر دل کا ہے۔ایک سچا مومن اپنا دل سبھوں کی طرف سے صاف رکھے گا۔اس کے دل میں کسی کے لئے کینہ اور کپٹ نہیں ہوگا۔وہ چھوٹے دل کا آدمی نہیں ہوگا۔اس کا دل بڑا ہوگا۔وہ بخیل نہیں ہوگا فیاض ہوگا۔وہ لوگوں سے لینا نہیں ان کو دینا

چاہے گا۔اس کو اپنی چیز دوسروں کو دے کر خوشی ہوگی۔وہ دوسروں کے غم میں شریک ہو کر اطمینا محسوس کرے گا۔اس کے دل میں سبھوں کے لئے محبت ہوگی۔وہ اپنے اور بیگانے کا فرق نہیں کرے گا۔وہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گا جس سے تفرقہ بازی اور نفرت وعداوت پیدا ہوتی ہو۔وہ جب بھی کسی پر احسان کرے گا تو بدلے اور شکریے کے لئے نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی کے لئے کرے گا۔وہ کبھی کسی سے انتقام لینے کے لئے وقت کا انتظار نہیں کرے گا۔ بلکہ لوگوں کی کوتاہیوں اور عداوتوں کو معاف کر دے گا۔نفع یا نقصان جو بھی ملے اس کو اپنی قسمت سمجھ کر خوشی خوشی قبول کر لے گا۔

وہ وعدہ کر کے مکر نہیں جائے گا۔ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر کے بھی وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔نقصان سے بچنے کے لئے وہ کبھی کسی کے ساتھ فریب نہیں کرے گا۔کسی کو دھوکہ نہیں دے گا۔کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔جب کسی سے کوئی عہد یا معاہدہ کرے گا تو اس کو بھی ہر حال میں نبھائے گا۔ایسے مومن کو رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ''جس میں چار برائیاں پائی جائیں وہ پکا منافق ہے بات کرے تو جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، عہد کی خلاف ورزی کرے اور جھگڑا کرے تو گالی گلوج پر اتر آئے۔ایسی پاکیزہ صفات کا مومن اپنے خاندان کے لئے، معاشرے کے لئے اور پوری دنیا کے لئے ایک رحمت ہے۔ایسے مومن سے کوئی نفرت کر ہی نہیں سکتا ہے۔ایسا مومن ہی معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔مومن کی نماز نہیں مومن کا اخلاق دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔مومن کی نماز اس کے اپنے لئے ہے اور اس کا اخلاق دوسروں کے لئے ہے۔

ہندونیپال کی سرحد پر رُشد وہدایت اور تعلیم و تبلیغ کی عظیم درس گاہ

جامعۃ القاسم دارالعلوم الإسلامیّۃ

کے خوبصورت مناظر

رواق امام محمد الیاس الکاندھلویؒ

جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ (تعمیراتی کام تکمیل کے مرحلہ میں)

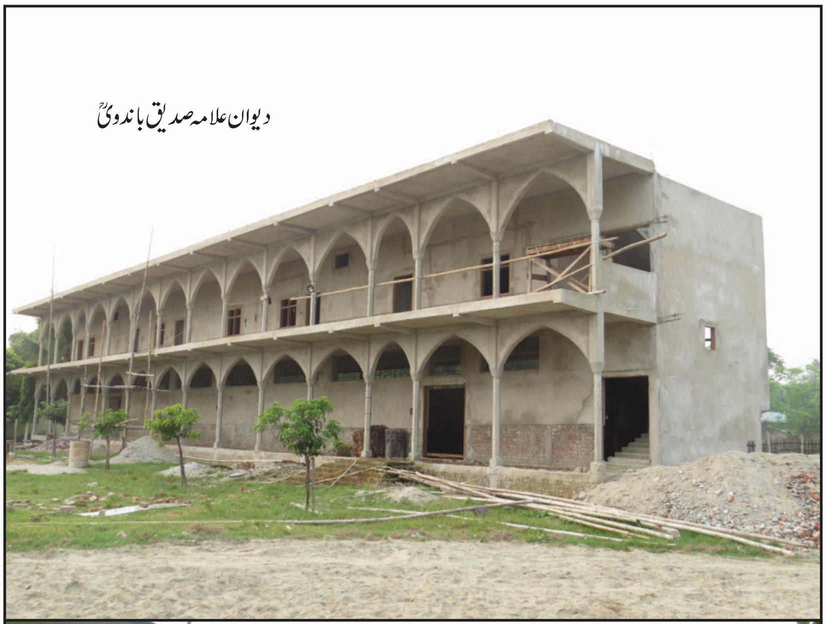

دیوان علامہ صدیق باندویؒ

رواق امام محمد الیاس الکاندھلویؒ

مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

جامعہ عائشہ الصدیقہؓ للبنات

مرکز الامام ابی الحسن علی حسنی ندویؒ الاسلامی

دوسو بیڈ پر مشتمل الامام المحدث محمد زکریا کاندھلویؒ چیری ٹیبل ہاسپیٹل ونرسنگ کالج

''القاسم اسلامک یونیورسٹی'' کے مجوزہ تعمیری منصوبے کی جھلکیاں

انسان کالج • انجینئرنگ کالج • امام الہند مولانا آزادؒ سینئر سکنڈری اسکول وٹیکنیکل سینٹر

ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ

مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیة
Zakir kureshi

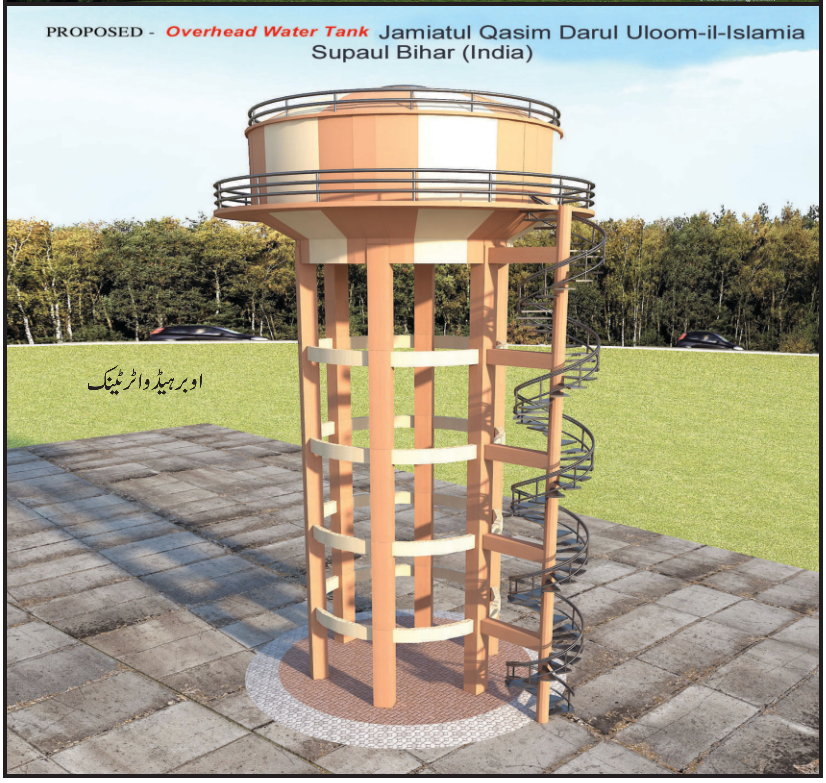
PROPOSED - Overhead Water Tank Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia
Supaul Bihar (India)
اوبرہیڈ واٹر ٹینک

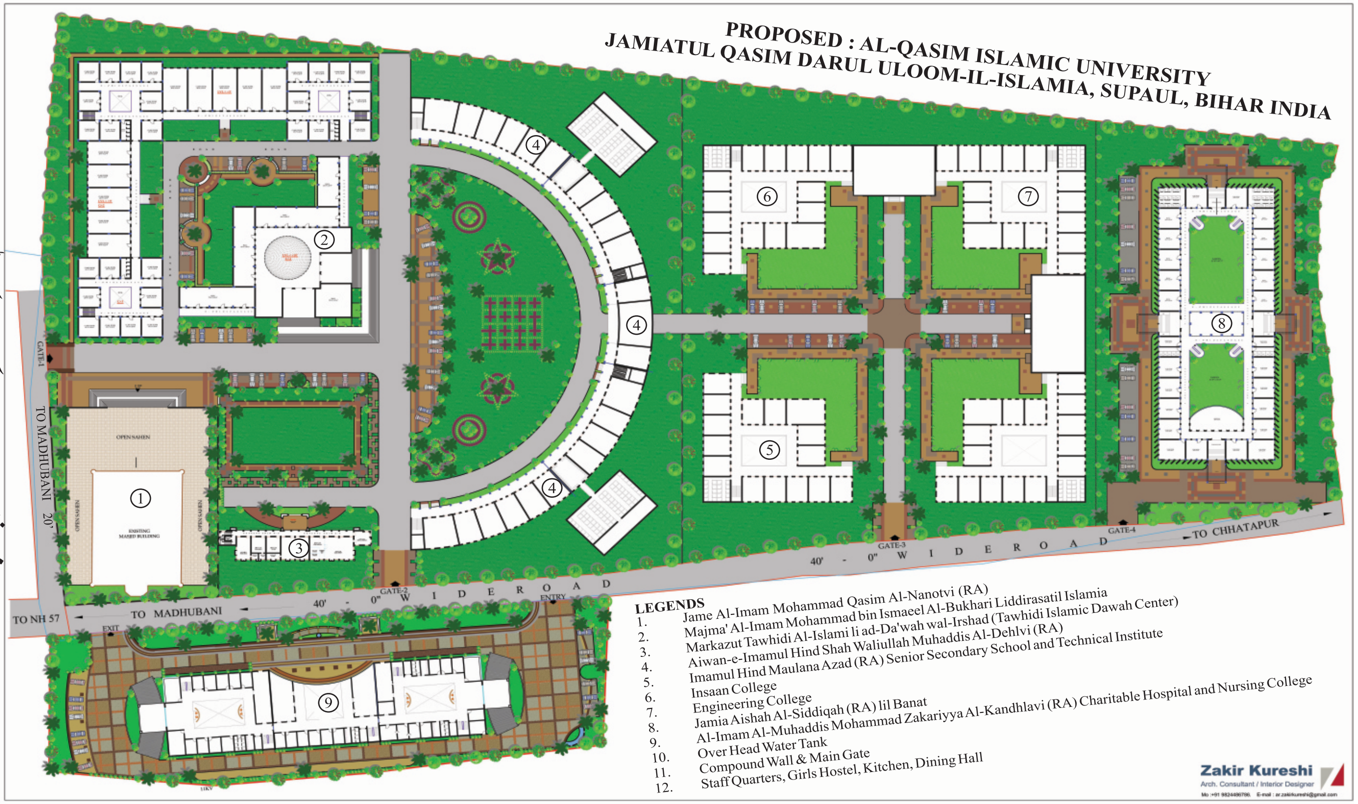

مجوزہ نقشہ: القاسم اسلامک یونیورسٹی

- مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیہ
- ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ
- جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ
- مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

چھ ہزار طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور قیام وطعام کے لئے جامعہ کے تعمیری وترقیاتی منصوبے اور ''القاسم اسلامک یونیورسٹی'' کا تخمینی بجٹ تقریبا 1,50,20,93,768.00 ڈیڑھ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ جو ہی خواہان ملت اسلامیہ، صاحب جود وسخا اور باتوفیق اہل خیر کے تعاون سے اللہ رب العزت ہی پورا کرانے والا ہے۔ حق جل مجدہٗ کا پاک ارشاد ہے:

''جس نے اچھے کام کئے ہوں، ہم کبھی اس کا اجر ضائع نہیں کرتے'' (الکہف: ۳۰، ترجمہ: امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ ''ترجمان القرآن'')

اللہ ہی ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہے۔

Published by:
Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia
At & Po. Madhubani, G.P.O. Partap Ganj, Distt: Supaul - 852125 Bihar (India)
Ph: +91-9811125434, 9931906068, 9931515312
www.jamiatulqasim.com / E-mail: jamiatulqasim@yahoo.com
www.facebook.com/muftimahfoozurrahman.usmani
youtube.com/jamiatulqasim

Delhi Office:
K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave-I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11- 26981876, 26982907 Mob: +91-9899766786
Printed at : M.R. Printers, 2818, Gali Garaiya, Darya Ganj, New Delhi-110002